ایم۔اے ' اُردو ' سال اول

فاصلاتی تعلیم

تیسرا پرچہ

اُردو زبان وادب کی تاریخ

اکائی 1 تا 30

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

گچی باؤلی' حیدرآباد 032 500

مدیر : پروفیسر محمد علی اثر

مضمون نگار :

پروفیسر اشرف رفیع	اکائی.....1,2,5	ڈاکٹر نسیم الدین فریس	اکائی.....10,13
پروفیسر سلیمان اطہر جاوید	اکائی.....3,17,18,28	پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ	اکائی.....12,14
پروفیسر یوسف سرمست	اکائی.....4,8,15	پروفیسر عبدالستار دلوی	اکائی.....19
پروفیسر مغنی تبسم	اکائی.....6	پروفیسر رئیس انور	اکائی.....20,21,29
پروفیسر افضل اقبال	اکائی.....7,16	ڈاکٹر مجید بیدار	اکائی.....24,25,26
پروفیسر محمد علی اثر	اکائی.....9,11,22,23	پروفیسر بیگ احساس	اکائی.....27,30

کورس کوآرڈی نیٹر

ڈاکٹر نکہت جہاں

نظامت فاصلاتی تعلیم

EPABX : 040-23006612-15, Fax : (040) 23006121

ڈائرکٹر

پروفیسر۔ کے آر۔ اقبال احمد Extn. 305

پروفیسر

ڈاکٹر مظہر الدین فاروقی Extn. 304

ریڈر

ڈاکٹر پی۔ فضل رحمٰن Extn.126

اسسٹنٹ ڈائرکٹر

ڈاکٹر علی رضا موسوی Extn. 121

اسسٹنٹ ڈائرکٹر

جناب شہید خان Extn.123

لکچرر

ڈاکٹر نکہت جہاں Extn. 330

اسسٹنٹ رجسٹرار

جناب مہیش کمار ویراگی Extn. 125

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

طبع: 2007

طباعت : Manipal Press Limited, Manipal

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ کسی بھی انداز میں یونیورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

مزید معلومات کے لئے ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی گچی باؤلی، حیدرآباد 500032 سے ربط پیدا کریں۔

ایم۔اے اُردو

سال اول (فاصلاتی تعلیم)

تیسرا پرچہ : اُردو زبان وادب کی تاریخ

ایڈیٹر : پروفیسر محمد علی اثر

اکائی نمبر		مضمون	صفحہ نمبر
اکائی	1	زبان کی تعریف اور ہند آریائی کا ارتقا	5
اکائی	2	اُردو زبان کا آغاز وارتقا، مختلف نظریے	18
اکائی	3	اُردو زبان کا ارتقا: پایۂ تخت کی تبدیلی کے اثرات	28
اکائی	4	دکنی اُردو کی لسانی خصوصیات	37
اکائی	5	لسانیات کا مفہوم۔مصوتے ومصمتے	51
اکائی	6	اُردو املا کے مسائل اور صحتِ املا کی جدید سفارشیں	62
اکائی	7	اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیاءِ کرام کی خدمات	72
اکائی	8	بہمنی دور میں اُردو ادب	84
اکائی	9	قطب شاہی دور میں اُردو ادب	98
اکائی	10	عادل شاہی دور میں اُردو ادب	109
اکائی	11	ولؔی اور سراؔج کے عہد میں اُردو شاعری	124
اکائی	12	شمالی ہند میں اُردو شاعری	139
اکائی	13	فورٹ ولیم کالج سے پہلے اُردو نثر	149
اکائی	14	دہلی کا دبستان شاعری	166

اکائی نمبر		مضمون	صفحہ نمبر
اکائی	15	فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات	181
اکائی	16	فورٹ سینٹ جارج کالج کی اردو خدمات	197
اکائی	17	دلی کالج کی اُردو خدمات	209
اکائی	18	اردو شاعری کا دبستان لکھنؤ	218
اکائی	19	نظیر اکبر آبادی۔ ہندوستانی تہذیب کا نمائندہ	227
اکائی	20	اردو شاعری۔ 1857ء کے بعد	237
اکائی	21	اردو نثر 1857ء کے بعد	250
اکائی	22	انجمنِ پنجاب کی تحریک	264
اکائی	23	علی گڑھ تحریک	273
اکائی	24	اردو شاعری عہد اقبال میں	281
اکائی	25	اردو نثر عہد اقبال میں	303
اکائی	26	بیسویں صدی کے چند اہم تصنیفی اور تعلیمی ادارے	324
اکائی	27	ترقی پسند تحریک	342
اکائی	28	حلقہ ارباب ذوق	362
اکائی	29	جدیدیت اور اردو شاعری	369
اکائی	30	جدیدیت اور اردو نثر	385

پیش لفظ

پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے تحت جنوری 1998ء میں مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا جس میں اس یونیورسٹی کو روایتی اور فاصلاتی دونوں ہی طریقوں سے تعلیم وتدریس کی سہولتیں فراہم کرنے کا استحقاق بخشا گیا۔ اُردو ذریعہ تعلیم کی ملک کی واحد اور منفرد یونیورسٹی ہونے کے ناطے اُردو یونیورسٹی نے ملک کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی تمام تر اُردو آبادی کا احاطہ کرنے اور اس کے فیوض وبرکات سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مستفید کرنے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے یونیورسٹی میں فاصلاتی طریقہ تعلیم کو اولیت دی گئی اس لیے کہ اُردو والے ملک کی ہر ریاست میں آباد ہیں اور یونیورسٹی کے ثمرات اُن تک پہنچانے کے لیے فاصلاتی نظام سے زیادہ موثر اور کارگر کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا۔ اس نظام تعلیم کی اپنی خصوصیات اور امتیازات ہیں جن میں ایک اہم اور کلیدی نکتہ یہ ہے کہ اس میں ہر کورس کے تمام طالب علموں کو مکمل نصابی مواد فراہم کرنا لازمی ہے۔ گویا کسی کورس کے آغاز سے قبل نصابی کتب کی تصنیف و تالیف اور اشاعت کا کام انجام دینا ہوگا۔ اور جب تمام علوم ومضامین کا نصابی مواد اُردو میں مطلوب ہو تو یہ کام مزید وقت طلب اور دشوار گزار ہو جاتا ہے۔ شروع ہی سے یہ چیلنج اُردو یونیورسٹی کے پیش نظر رہا ہے جس سے نپٹنے کے لیے جولائی 1998ء میں ٹرانسلیشن ڈویژن کی داغ بیل ڈالی گئی۔ بظاہر یہ شعبہ ترجمے کی ذمہ داریوں تک محدود معلوم ہوتا ہے لیکن ٹرانسلیشن ڈویژن کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اپنے نام سے مترشح ہونے والے دائرہ کار سے کافی آگے بڑھ کر کام کرتا رہا ہے۔ بنیادی طور پر یہ شعبہ اُردو یونیورسٹی کے لیے درکار نصابی مواد کی تیاری اور اشاعت کا کام انجام دیتا رہا ہے۔ تعلیمی پروگرام کے فوری آغاز کے لیے ابتدا میں ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کا بی اے اور بی ایس سی کا نصابی مواد مستعار لیا گیا اور جزوی ترمیمات کے بعد شائع کر لیا گیا۔ اس کے بعد تراجم پر توجہ کی گئی اور اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کی بی کام کی 54 کتابوں کو انگریزی سے اُردو میں منتقل کیا گیا۔ اُردو میں پہلی بار کامرس میں گریجویشن سطح کی نصابی کتابیں تیار ہوسکیں۔ کمپیوٹنگ کورس کی 12 کتابیں بھی انگریزی سے ترجمے کے بعد شائع کی گئیں۔ اس کے علاوہ ٹرانسلیشن ڈویژن نے انگریزی اور ہندی کے ذریعے اہلیت اُردو کے دو سرٹی فیکیٹ کورس، فنکشنل انگلش کے ایک سرٹی فکیٹ کورس اور بیچ انگلش کے ایک ڈپلومہ کورس کی کتابیں ماہرین کے مرتبہ نصاب کے مطابق تیار کیں۔ اسی طرح یونیورسٹی اب فاصلاتی تعلیم کے گریجویشن سطح کے نصاب کی تیاری میں بھی مصروف ہے تاکہ اس یونیورسٹی کے طلبہ کی ضروریات کے مطابق عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کتابیں تیار ہوسکیں۔

پوسٹ گریجویشن کی سطح پر فاصلاتی طرز پر اُردو یونیورسٹی میں سب سے پہلے ایم اے اُردو کے آغاز کا فیصلہ کیا گیا جس کے لیے مختلف جامعات کے سنئیر اساتذہ نے نصاب تیار کیا۔ یہ نصاب سال اول اور سال دوم کے آٹھ پرچوں پر مشتمل ہے۔ نصابی کمیٹی کا خیال تھا کہ اُردو زبان پر عبور کے لیے فارسی زبان وادب سے کسی حد تک واقفیت ضروری ہے۔ نیز قومی یونیورسٹی کے طالب علموں کو قومی زبان سے بھی قریب تر رکھنے کی ضرورت ہے، چنانچہ ایم اے سال اول میں فارسی اور ہندی کا ایک مشترکہ پرچہ شامل کیا گیا ہے۔ اُردو زبان وادب کی تاریخ، دکنیات، کلاسیکی نثر ونظم، جدید ادب، فکشن، ادبی تحریکات و رجحانات سے متعلق مختلف اہم عنوانات پر ملک کی یونیورسٹیوں سے وابستہ قابل اساتذہ کرام سے اسباق لکھوائے گئے ہیں۔ طالب علموں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ فراہم کردہ نصابی کتابوں کے علاوہ جہاں تک ممکن ہوسکے مشاورتی جماعتوں اور سفارش کردہ کتابوں سے بھی استفادہ کریں گے۔

اگر آپ زیر نظر کتاب میں کوئی غلطی یا کمی محسوس کریں تو ہمیں ضرور مطلع کریں تاکہ ماہرین سے مشورے کے بعد آئندہ اشاعت میں ترمیم کی جاسکے۔

اے ایم پٹھان

(پروفیسر اے ایم پٹھان)

ڈائریکٹر انسٹ

اکائی: 1 زبان کی تعریف اور ہند آریائی کا ارتقا

ساخت

1.1 تمہید

1.2 زبان کی تعریف

1.2.1 زبان اور بولی میں فرق

1.3 ہند آریائی کا ارتقا

1.3.1 ہندوستان میں آریاؤں کی آمد

1.4 قدیم ہند آریائی (1500ق۔م تا 500ق۔م)

1.5 وسطی ہند آریائی (500ق۔م تا 1000ء)

1.5.1 پہلا دور

1.5.2 دوسرا دور

1.5.3 تیسرا دور

1.6 جدید ہند آریائی (1000ء تا حال)

1.6.1 سندھی

1.6.2 لہندا

1.6.3 پنجابی

1.6.4 گجراتی

1.6.5 راجستھانی

1.6.6 مغربی ہندی

1.6.7 مشرقی ہندی

1.7 مغربی ہندی

1.7.1 کھڑی بولی

1.7.2 ہریانی

1.7.3 برج بھاشا

1.7.4 قنوجی

1.7.5 بندیلی

1.8 خلاصہ

1.9 نمونۂ امتحانی سوالات

1.10 فرہنگ

1.11 سفارش کردہ کتابیں

1.1 تمہید

بولنے، بات کرنے، اپنے احساسات، جذبات و خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کے صوتی اور لفظی وسیلے کو زبان کہتے ہیں۔ جو ہماری قوت گویائی اور ترسیلی جبلت کو حقیقی شکل عطا کرتی ہے۔ یہی ہماری قوت گویائی ہے جس کی وجہ سے انسان کو ''حیوان ناطق'' کہا گیا ہے۔

زبان کی دو مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک اس کی ظاہری صورت، دوسرے اس کی معنوی صورت۔ اگر آواز اپنی معنوی حیثیت کو الفاظ کے ذریعے پوری طرح ادا نہ کر سکتی ہو تو زبان کا اصل مقصد یعنی ترسیل و ابلاغ کا عمل پورا نہیں ہو سکتا۔ الفاظ اور معنی میں تال میل اور مناسب ربط و تعلق ہی سے زبان کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔

زبان ایک زندہ حقیقت ہے جس میں مسلسل تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے دوران بولیاں زبانوں میں تبدیل ہوتی ہیں یا پھر تغیرات زمانہ سے زبان، بولیوں کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ زبان اور بولی کے فرق کو ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ زبان کے استعمال کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور بولیوں کا محدود۔ زبان زندگی کے مختلف شعبوں میں تحریری اور تقریری شکل میں کام آتی ہے۔ زبان سے دیگر علوم کے علاوہ ادبی تخلیق کا کام لیا جاتا ہے جب کہ بولی میں یہ صلاحیت بہت کم ہوتی ہے۔ تاہم یہ ایک لسانی حقیقت ہے کہ زبانوں کی تشکیل میں بولیوں کی بڑی اہمیت ہے۔

زماں و مکاں کے اعتبار سے زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں کبھی اشتراک ہوتا ہے تو کبھی اختلاف اور کبھی یکسانیت۔ جس کی وجہ سے زبانوں کے مختلف خاندان ہو گئے ہیں یا انہیں مختلف خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بعض امتیازی خصوصیات کی بنا پر زبانوں کے ہند یورو پی خاندان کی بڑی اہمیت ہے۔ ہندوستان میں ہند یورو پی خاندان کا سلسلہ بڑا دراز ہے۔ یہ خاندان اپنے ارتقائی دور میں ہند ایرانی سے گزر کر ہند آریائی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ہند آریائی کا ارتقا تین مختلف ادوار میں ہوا ہے:

1. قدیم ہند آریائی
2. وسطی ہند آریائی
3. جدید ہند آریائی

جدید ہند آریائی سے تعلق رکھنے والی کئی شاخیں ہیں جن میں سے ایک مغربی ہندی کی بھی شاخ ہے۔ اس شاخ میں پانچ بولیاں شامل ہیں۔ کھڑی بولی اسی شاخ کی ایک بولی ہے جس پر اردو اور ہندی کی بنیادیں قائم ہیں۔ ہماری زبان اردو کی ابتدا اور ارتقا کے لیے ہمیں اوپر بیان کیے گئے مسائل پر اگلے اوراق میں غور کرنا ہوگا۔

1.2 زبان کی تعریف

انسان حیوان ناطق ہے۔ یعنی وہ بول سکتا ہے۔ اپنے جذبات، خیالات اور احساسات کو دوسروں تک پہنچا سکتا ہے۔ زبان کی تخلیق انسان کی سب سے بڑی ایجاد ہے۔ زبان انسانی ذہن کی تخلیقی صلاحیت کا سب سے بڑا اور اولین نمونہ ہے۔ قدیم زمانے میں لوگوں نے زبان سے پہلے اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے اوزار، ہتھیار اور آلات بنائے ضرور تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو آلہ اس نے اپنی زندگی کو سماجی، معاشرتی اور تمدنی طور پر ترقی پذیر بنانے کے لیے تیار کیا وہ زبان ہی ہے۔

علم اللسان میں نہ تو محض خیالات و جذبات کو دوسرے تک پہنچا دینے کو زبان کہتے ہیں، نہ آوازوں کے مجموعے کو۔ معروف ماہر لسانیات ڈاکٹر سید غلام محی الدین قادری زورؔ نے اپنے مضمون ''زبان کی ماہیت، آغاز اور تشکیل'' میں کہا ہے کہ زبان خیالات کا ذریعۂ اظہار ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ لفظوں اور فقروں کے توسط سے انسانوں کے ذہنی مفہوم و دلائل اور ان کے عام خیالات کی ترجمانی کرے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے زبان کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ زبان آوازوں اور الفاظ کا مجموعہ ہے۔ یعنی زبان یا الفاظ خیالوں یا چیزوں کی صوتی علامتیں ہیں اور اس کا مقصد دوسروں تک اپنے خیالات کا پہنچانا ہوتا ہے۔ بے معنی آوازوں کے مجموعے کو زبان نہیں کہہ سکتے۔ زبان، آواز انسان کی اس ترقی یافتہ حالت کا پتا دیتی ہے جب اس نے محض اشاروں اور کنایوں سے آگے بڑھ کر ارتقا پذیر قوتِ گویائی سے کام لینا شروع کیا، جس میں معنی کی قید لگا کر زبان کو جانوروں کی آواز سے الگ کر دیا۔

اس طرح زبان کی دو مختلف حیثیتیں ہوگئیں۔ایک اس کی ہئیت یعنی Form جو مختلف آوازوں کی صورت میں آتی ہے۔دوسری حیثیت اس کی معنوی حیثیت ہے جس کا تعلق ذہن سے ہوتا ہے۔اگر آواز اپنی معنوی حیثیت کو پوری طرح ظاہر نہ کرے تو اس سے زبان کا اصل مقصد یعنی ترسیل و ابلاغ کا مقصد پورا نہیں ہوسکتا۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زبان کی صورت و معنی' ظاہر و باطن دونوں میں گہرا امتزاج لازمی ہے۔زبان کی ان دونوں حیثیتوں کے باہمی ربط کی مضبوطی' طاقت اور تنوع سے وہ ہر قدم پر انسانی عمل سے وابستہ ہوگئی ہے۔انسانی اعمال و حرکات چوں کہ ہر لحہ تغیر' تسخیر اور تحقیق سے عبارت ہیں اس لیے زبان میں بھی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔زبان عام طور پر فطری ارتقا کی پابند ہوتی ہے لیکن انسان کی سماجی ضرورتیں اس کی تشکیل کرتی ہیں اور شعوری طور پر بھی اس میں تبدیلی لاتی ہیں۔

1.2.1 زبان اور بولی میں فرق

لسانی تغیرات کے سلسلے میں زبان کو بولیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔تغیرات زمانہ سے بعض بولیاں' زبانوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور کبھی زبانیں بولی تک محدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔زبان اور بولی میں کیا فرق ہے؟ سیدھے سادے اور عام فہم انداز میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبان کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور بولی کا محدود ہوتا ہے۔زبان کے بولنے والوں کی تعداد دور دور تک پھیلی ہوتی ہے جب کہ بولی بولنے والوں کے مخصوص جغرافیائی حدود ہوتے ہیں۔ذرا سا غور کرنے کے بعد اسی بات کو ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک زبان کے علاقے میں کئی بولیاں بولی جاسکتی ہیں لیکن ایک بولی والے علاقے میں کئی زبانیں نہیں ہوسکتیں۔وسیع تر معنوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان سے ادبی تخلیق کا کام لیا جاتا ہے نیز تعلیمی' انتظامی' عدالتی' سیاسی اور تہذیبی شعبوں میں زبان ہی کام آتی ہے لیکن بولی میں یہ تاب و تواں نہیں ہوتی۔

بعض ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ زبان اور بولی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔بولی ہی ترقی کر کے زبان کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے۔امریکی ماہر لسانیات وٹنے (whitney) کا نظریہ ہے کہ زبان اور بولیوں کا تعلق ایک دائرے کی شکل میں رہتا ہے۔زبان کچھ عرصے بعد بولیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔یہ بولیاں پھر زبان کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔اس طرح یہ چکر برابر چلتا رہتا ہے۔لیب نیز (Leibniz) نے اٹھارہویں صدی کے شروع ہی میں یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ مختلف زبانیں الگ الگ بولیوں کی شکل میں آگے بڑھتی ہیں۔

زبانوں کی تشکیل پر غور کریں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ان میں کبھی اختلاف واضح ہوتا ہے تو کبھی اشتراک یا مماثلتیں واضح اور صاف نظر آتی ہیں۔زبانوں کے آپسی اختلاف' اشتراک اور مماثلتوں کی بنیادوں پر زبان کو چند خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

لسانی خاندانوں کا جو سلسلہ ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے ان میں بعض امتیازی خصوصیات کی بنا پر ہند یوروپی خاندان کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔اس سلسلے کی زبانیں نہ صرف دنیا کے سب سے بڑے رقبے میں بولی جاتی ہیں بلکہ یہ کسی نہ کسی شکل میں ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. زبان کی تعریف کیجیے۔
2. زبان کی دو مختلف حیثیتیں کون سی ہیں؟
3. زبان اور بولی میں کیا فرق ہے؟
4. زبانوں کے خاندانوں کی تقسیم کن بنیادوں پر ہوتی ہے؟

1.3 ہند آریائی کا ارتقا

ہندوستان میں ہند یوروپی زبانوں کا سلسلہ تقریباً 3500 ق۔م (قبل مسیح) سے ملتا ہے۔ہند یوروپی زبانیں ترقی کرتی ہوئی جب 2000 سال ق۔م میں اپنی دوسری منزل پر پہنچتی ہیں تو انہیں ''ہند ایرانی'' کا نام دیا گیا۔ہند یوروپی زبانوں میں ادب اور زبان دونوں حیثیتوں سے ہند ایرانی کو سب سے قدیم اور اہم سمجھا جاتا ہے۔ہند ایرانی آگے بڑھتی گئی تو تین شکلیں اختیار کرتی ہے۔اس زبان کا جو گروہ ایران میں مقیم رہا اس سے ایرانی زبان کا سلسلہ

ملتا ہے۔ کچھ لوگ کشمیر اور اس کے آس پاس تک پہنچ گئے وہاں ''پشاچہ'' زبانوں کا سلسلہ پھیلا اور جب آریوں کا ایک گروہ بڑی تعداد میں اپنے لسانی ورثے کے ساتھ ہندوستان میں آیا تو یہیں سے ہند آریائی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہندوستان کی موجودہ زبانیں اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جن میں اردو بھی ایک ہے۔ اردو کی ابتدا اور ارتقا کا مطالعہ کرنے کے لیے ہند آریائی کے ارتقا کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ جس کا گہرا تعلق ہندوستان میں آریاؤں کی آمد سے ہے۔

آریاؤں کی قدیم کتابوں میں ان کے اصل وطن اور ہندوستان میں ان کی آمد کے سلسلے میں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ زیادہ تر مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ خانہ بدوش لوگ تھے جو دنیا کے مختلف خطوں میں پھیل گئے۔ جہاں بھی گئے وہ کسی منظم شکل میں مقیم نہیں رہے بلکہ تلاش معاش میں جہاں مناسب جگہ ملی وہیں چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو کر آباد ہو گئے۔ ہندوستان ایک زرخیز ملک تھا۔ یہاں خوش حال زندگی گزارنے کے پورے امکانات موجود تھے۔ اس لیے ان کی بڑی تعداد یہاں آ گئی۔ بعض قدیم کتابوں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ آریا لوگ تبت سے ہندوستان میں آئے۔ چند سنسکرت کے عالموں کا خیال ہے کہ یہ ہندوستان ہی کے باشندے تھے جو بعد میں مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ تاہم ان نظریات کے متعلق کوئی تحقیقی ثبوت نہیں ملتا۔ زیادہ تر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ آریوں کا اصل وطن وسطی ایشیا تھا۔ یہ لوگ جنوب مغربی روس کے علاقے سے چل کر عراق، ایران اور افغانستان سے ہوتے ہوئے ہندوستان پہنچے۔

1.3.1 ہندوستان میں آریاؤں کی آمد

ہندوستان میں آریاؤں کے داخلے کا زمانہ 1500 ق۔م مقرر کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں آریاؤں کا سابقہ دراوڑی اور آسٹرک قوموں سے پڑا۔ دراوڑی سے ان کا مقابلہ مغربی اور شمال مغربی ہندوستان میں ہوا۔ جب کہ آسٹرک زیادہ تر مشرقی اور وسطی ہند کے علاقوں میں آباد تھے۔ ان قوموں کو زیر کرنے میں انہیں کافی جدوجہد کرنی پڑی۔ اس جدوجہد کی جھلکیاں رگ وید کے بعض قصوں میں پائی جاتی ہیں۔ فاتح اور مفتوح آخر میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں آریاؤں کا ایک ایسے تمدن سے سابقہ پڑا تھا جو کئی لحاظ سے آریاؤں کے تمدن پر فوقیت رکھتا تھا۔ آریاؤں نے دراوڑی مذہب سے بہت سے عناصر قبول کر لیے بعض دیوی دیوتاؤں کے تصورات اور دیومالا، کچھ کھانے پینے کی چیزیں، پان سپاری، لباس میں دھوتی اور ساری خالص دراوڑی عناصر ہیں۔ ان زبانوں کا آریائی زبان کی قواعد اور صوتیات پر کافی اثر پڑا اور آریائی زبان ''ہند ایرانی'' مرحلے سے گزر کر ''ہند آریائی'' شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہندوستان میں ہند آریائی ارتقا کو عام طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

1. قدیم ہند آریائی — 1500 ق۔م تا 500 ق۔م
2. وسطی ہند آریائی — 500 ق۔م تا 1000ء
3. جدید ہند آریائی — 1000ء تا زمانہ حال

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کا زمانہ اندازاً کیا ہے؟
2. ہند یوروپی زبان ہند ایرانی کس طرح بنی؟
3. ہند ایرانی زبان کا ارتقا ہند آریائی تک کس طرح ہوا؟

1.4 قدیم ہند آریائی (1500 ق۔م تا 500 ق۔م)

اس دور میں ویدک اور سنسکرت زبانوں کا رواج زیادہ تھا جو دراصل سنسکرت کی قدیم شکل کا عہد ہے۔ اس دور میں چاروں وید یعنی (1) رگ وید (2) سام وید (3) یجروید (4) اتھروید ملتے ہیں۔ ہر قسم کے مذہبی اور علمی مطالعے میں سنسکرت کی بڑی اہمیت تھی۔ اس میں بڑے بڑے علما موجود تھے۔ قدیم سنسکرت پر آریاؤں کی آمد کا بڑا اثر پڑا جس کی وجہ سے سنسکرت کے تین مختلف روپ سامنے آتے ہیں۔ اس کا قدیم ترین روپ وہ ہے جب آریا پنجاب کے راستے سے داخل ہو کر شمال کے اکثر حصوں پر قبضہ کر چکے تھے۔ اس وقت شمال میں جو سنسکرت بولی جاتی تھی اس کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ دوسرا روپ سنسکرت کی وسطی بولی کا ہے جب آریا اپنے قدم بڑھا کر مدھیا دیش تک پہنچ چکے تھے۔ تیسرا روپ مشرقی بولی کا روپ ہے جب آریا مشرقی ہند تک

پہنچ چکے تھے ۔ ان علاقوں کی زبانیں دیسی بولیوں سے مل کر اپنا آریائی لہجہ کھو رہی تھیں ۔ مغربی ہندوستان کے آریا انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ''اسوروں'' کی نسل سے تعبیر کرتے تھے۔ان کی زبان کو''براہمنہ'' میں اشدھ کہا گیا ہے۔اس عہد کی بولیوں میں سنسکرت کے الفاظ کا تلفظ مقامی اثر سے بدل گیا تھا اور دراوڑی الفاظ خاصی تعداد میں شامل ہو گئے تھے۔سنسکرت کی اس شکست وریخت کو دیکھتے ہوئے زبان کو نئے سرے سے منظم کرنے کی کوششیں کی گئیں۔مقامی تعصّبات سے الگ ہٹ کر سنسکرت کے ان الفاظ کو ٹکسالی مانا گیا جو سب جگہ رائج تھے۔اب لوگ ادب میں ایک خاص ٹکسالی زبان کا استعمال کرنے لگے اور یہ زبان سنسکرت (شدھ) ہوگئی۔ادبی سنسکرت کی سب سے پہلی جھلک ہمیں آخری براہمنوں' اپنشدوں اور سوتروں میں ملتی ہے۔ابتدا میں لفظ سنسکرت صفت کے طور پر استعمال ہوتا تھا جس کے معنی صاف اور شستہ زبان کے ہیں۔رفتہ رفتہ سنسکرت ایک زبان کا نام ہوگیا۔شستہ زبان ہونے کی وجہ سے ادبی تصنیفات اسی میں ہونے لگیں۔ادبی زبان ہونے کی وجہ سے اس زبان کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ وہ عوام سے ہٹنے لگی ۔تقریباً اسی زمانے میں جین مت اور بدھ مت والوں نے اپنے اپنے مذہب کا پرچار مقامی بولیوں میں کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے مقامی بولیاں چمک اٹھیں۔سنسکرت کے عالموں اور ویدک مذہب کے علم برداروں کو یہ اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں سنسکرت پھر مقامی زبانوں کی زد میں آ کر اپنا روپ نہ کھو دے۔ اس لیے یہ لوگ اپنی زبان کی سختی سے حفاظت کرنے لگے۔نتیجے میں سنسکرت ایک فرقے کی زبان بن کر محدود دائرے میں رہ گئی۔مذہبی رہنماؤں کی وجہ سے ''دیوبانی'' تو بن گئی لیکن عوام میں اس کی مقبولیت کم ہوتی گئی۔یعنی سنسکرت قابل احترام تو بن گئی لیکن قابل استعمال نہ رہی۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. قدیم ہند آریائی کا زمانہ کیا ہے؟
2. قدیم ہند آریائی میں کون کون سے وید ملتے ہیں؟
3. سنسکرت کے معنی کیا ہیں؟

1.5 وسطی ہند آریائی (500 ق۔م تا 1000ء)

اس کے تین دور ہیں:

1.5.1 پہلا دور

500 ق۔م سے مسیحی سنہ کی ابتدا تک کا دور ہے۔یہ دور پالی کا دور ہے جب سنسکرت دیوبانی ہوگئی تو مقامی بولیاں ویدک زبان کے فطری رجحان پر چل پڑیں اور عوام کی زبان ایک مخلوط زبان ہوتی گئی۔یہی پراکرت کا پہلا روپ تھا۔پراکرت کا پہلا ادبی روپ ''پالی'' کا ہے۔پالی کے سب سے قدیم نمونے بدھ اور جینیوں کی مذہبی کتابوں یا پھر اشوک (250 ق۔م) کی لاٹوں پر کندہ کیے ہوئے ملتے ہیں۔لفظ پالی سنسکرت کے لفظ ''پنکتی'' سے نکلا ہے۔ اس پالی کو قدیم مگدھی بھی کہتے ہیں۔پالی میں مذہبی شاعری' کہانیاں اور قواعد ولغت بھی ملتے ہیں۔پالی اس زمانے میں مقبول عام زبان تھی۔اس لیے جین مت اور بدھ مت کی تعلیمات اسی زبان میں دی جاتی تھیں۔

1.5.2 دوسرا دور

وسطی ہند آریائی کا دوسرا دور مسیحی سنہ کی ابتدا سے 500ء تک شمار کیا جاتا ہے۔یہ دور پراکرت کا دور کہلاتا ہے۔پراکرت کسی ایک زبان کا نام نہیں بلکہ کئی ایک زبانوں کے مجموعے کا نام ہے۔پراکرت کے معنی ہیں ایسی زبانیں جو اپنے فطری انداز میں پھل پھول رہی ہوں۔اس عہد میں ادبی اور اہم پراکرتوں کی پانچ واضح شکلیں نظر آتی ہیں جن کے متعلق یہاں مختصر سی گفتگو کی جائے گی۔

1. **مہاراشٹری** : یہ جنوب کی پراکرت ہے۔مراٹھی اسی سے نکلی ہوئی زبان ہے۔یہ شاعری اور موسیقی کی زبان سمجھی جاتی ہے۔سنسکرت کے ڈراموں کے گیت اسی میں لکھے جاتے تھے جس کی وجہ سے اسے ملک گیر مقبولیت حاصل ہوگئی۔اس میں حروفِ علت کی کثرت ہے جس کی وجہ سے لوچ زیادہ آ گیا ہے۔پراکرتوں میں سب سے پہلے مہاراشٹری کی قواعد مرتب ہوئی۔اس میں نظم ونثر کا قیمتی سرمایہ ملتا ہے۔

2. **شور سینی**: اس کا مرکز شورسین یعنی متھرا کا علاقہ تھا۔ سنسکرت کے بعد اعلیٰ طبقے میں اگر کسی پراکرت کا رواج تھا تو وہ یہی زبان تھی جس پر سنسکرت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔

3. **مگدھی**: یہ پورے مشرقی ہندوستانیوں کی بولی تھی۔ اس کا مرکز مگدھ یعنی جنوبی بہار تھا۔ چونکہ یہ آریاؤں کے مرکز سے دور تھی اس لیے اس پر غیر آریائی بولیوں کا شدید اثر ملتا ہے۔ اس لیے آریا اس پراکرت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سنسکرت ڈراموں میں نچلے طبقے کے کرداروں کے مکالمے اسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔

4. **اردھ ماگدھی**: اس کے لفظی معنی آدھی مگدھی کے ہیں۔ اس کا مقام اودھ اور مشرقی اتر پردیش تھا۔ یہ تمام پراکرتوں میں سب سے قدیم ہے۔ اس میں اشوک کی تعلیمات کا بھی پرچار ہوا ہے۔ مغربی ہندوستان کے رہنے والے اسے ''پراچیہ'' کہا کرتے تھے۔ پراچیہ کے تحت مگدھی اور اردھ مگدھی دونوں آ جاتی ہیں۔ اس کا رواج اس زمانے کے شاہی خاندانوں میں بھی رہا ہے۔ شاہی زبان ہونے کی وجہ سے یہ دوسری پراکرتوں پر بھی اثر انداز ہوئی۔ اس میں نظم و نثر دونوں ملتے ہیں۔

5. **پیشا چی**: سنسکرت میں پیشاچی ''بھوت'' کو کہتے ہیں۔ پیشاچی کے معنی ''کچا گوشت کھانے والے'' کے بھی بتائے جاتے ہیں۔ یہ سنسکرت کی ایک ہم عصر بولی ہے۔ یہ زبان بول چال میں زیادہ استعمال ہوتی رہی ہے جس کی وجہ سے اس میں کئی بولیوں کی ملاوٹ عمل میں آئی اس لیے سنسکرت کے علما اسے بڑی حقارت سے دیکھتے تھے۔

1.5.3 تیسرا دور

یہ دور 500 ء تا 1000 ء پر محیط ہے۔ یہ دور اَپ بھرنش کا دور کہلاتا ہے۔ اَپ بھرنش کے معنی بگڑی زبان کے ہیں۔ اَپ بھرنش کا لفظ پہلی بار بھرت کے ''ناٹیہ شاستر'' میں ملتا ہے۔ اس کے بعد کالی داس کے ''وکرم اُروشی'' میں نظر آتا ہے۔

شروع شروع میں لفظ اَپ بھرنش کسی خاص زبان کے لیے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ پڑھے لکھے ان پڑھوں کی زبان کو ''اَپ بھرنش'' یا ''اَپ بھاشا'' کہا کرتے تھے۔ سنسکرت میں اَپ بھرنش کے لیے ''ملیچھ'' بھی استعمال ہوا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خان اپنی معرکتہ الآرا تصنیف مقدمہ تاریخ زبانِ اردو میں لکھتے ہیں کہ لفظ ''اَپ بھرنش'' ایک خاص زبان کے معنوں میں سب سے پہلے ہیم چندر نے استعمال کیا۔ یہ زبان عوام میں اتنی مقبول ہوگئی کہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ گجرات، راجپوتانہ اور دوآبہ میں بولی جانے والی اکثر بولیوں پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ 800ء سے 1000ء تک دوآبہ کی شورسینی اَپ بھرنش ایک طرح سے سارے شمالی ہندوستان کی ادبی زبان بن گئی۔ اپنے آخری دور (1000ء) میں یہ موجودہ زبانوں کی قدیم شکلوں سے ملتی جلتی ہے۔ ہندوستان کی جدید زبانوں کی پیدائش پراکرتوں سے نہیں بلکہ اَپ بھرنش سے ہوئی ہے۔ جس کا سلسلہ (1) شورسینی اپ بھرنش (2) مگدھی اپ بھرنش (3) اردھ مگدھی اپ بھرنش (4) مہاراشٹری اپ بھرنش سے ملایا جاتا ہے ان میں شورسینی اپ بھرنش ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ شورسینی اَپ بھرنش میں مندرجہ ذیل چار بولیاں شامل ہیں:

1. کھڑی بولی یا ہندوستانی (موجودہ اردو ہندی) 2. راجستھانی 3. پنجابی 4. گجراتی

گجراتی اور راجستھانی کا تعلق شورسینی کی اس شکل سے ہے جسے ناگر اپ بھرنش کہتے ہیں۔ 'ناگر اپ بھرنش کو فوقیت حاصل تھی کیونکہ یہ علمی طبقے میں بھی مقبول تھی۔ ناگر نام گجرات کے ناگر برہمنوں کے نام پر رکھا گیا ہے۔

مگدھی اپ بھرنش کا علاقہ وسیع تھا، اس لیے مختلف مقامات پر اس کے مختلف نام پڑ گئے۔ بہار کی تمام بولیاں اس کے تحت آتی ہیں۔ بہار کی بولی کا نام مگہی ہے جو مگدھی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

اردھ مگدھی اپ بھرنش میں پوربی ہندی (اودھی) آتی ہے۔ مہاراشٹری اپ بھرنش کا خاص مرکز موجودہ برار تھا۔ سنسکرت میں اس صوبے کو مہاراشٹر کے نام سے پکارا گیا ہے۔

اپ بھرنش میں سنسکرت کے تدبھو (غیر خالص) الفاظ کی کثرت ہے کہیں کہیں عربی الفاظ بھی تلفظ کی تبدیلی کے ساتھ آ گئے ہیں۔ اپ بھرنش میں لفظ کے آخری مصوتے بہت ہی اختصار سے آتے ہیں۔

شورسینی اپ بھرنش کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اس کی کھڑی بولی ایک سیع علاقے میں بولی جاتی تھی' اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ اس علاقے کی تمام بولیاں ضرور اسی سے نکلی ہوں گی۔ کھڑی بولی کو آج بھی اتنا عروج حاصل ہے کہ ہندوستان کی کسی بھی زبان کو کسی بھی زمانے میں حاصل نہ تھا۔ ادھر راجپوتوں کے زیر اثر دوآبہ کی زبان ''برج بھاشا'' چمکنے لگی اور سارے شمالی ہندوستان میں مقبول ہوگئی۔ اسی دوآبہ کی ایک بولی یعنی کھڑی بولی ہندوستان کی لنگوافرینکا (Lingua Franca) یعنی رابطے کی زبان سمجھی جاتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. وسطی ہندآریائی کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے؟
2. پراکرت کا پہلا ادبی روپ کون سا ہے؟
3. پراکرت اور اپ بھرنش کے معنی کیا ہیں؟
4. شورسینی اپ بھرنش میں کون سی بولیاں شامل ہیں

1.6 جدید ہندآریائی (1000ء تا حال)

قطعی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ جدید ہندآریائی زبانیں کس سنہ سے شروع ہوئیں۔ ایک اندازے کے مطابق 1000ء جدید ہندآریائی کے آغاز کا زمانہ مانا جاتا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں اہم سیاسی اور تہذیبی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ مسلمان حملہ آور تیزی سے ہندوستان میں اپنے قدم جمارہے تھے۔ شمال ومشرق میں یہ لوگ دسویں صدی کے آخری حصے میں آئے اور اس کے بعد سارے ملک میں پھیلتے رہے۔ محمود غزنوی کی حکومت پنجاب میں تقریباً ڈیڑھ سو سال سے زیادہ قائم رہی۔ محمد غوری نے بارہویں صدی میں پرتھوی راج کو شکست دی' تیرھویں صدی کی ابتدا میں غلام خاندان کی بنیاد دہلی میں پڑی' چودھویں صدی عیسوی میں خلجی حکومت دکن تک پھیل گئی اور تغلق حکومت کے خاتمے پر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں انتشار اور بدامنی پھیلنے لگی۔ سولھویں صدی میں جب مغل سلطنت قائم ہوئی تو اس کے بعد ملک میں مضبوط اور مستحکم حکومت کی بنیاد پڑی۔ اس طرح یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ جدید ہندآریائی زبانوں کی تشکیل کا زمانہ سیاسی لحاظ سے سخت الٹ پھیر کا زمانہ تھا۔ اسلامی تہذیب' معاشرت اور مسلمان فاتحین کی زبانوں کا اختلاط یہاں کی مقامی تہذیب وتمدن اور زبانوں سے ہونے لگا جس سے جدید ہندآریائی کے ارتقا میں کافی مدد ملی۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے اپنی کتاب ''انڈو ایرین اینڈ ہندی'' میں لکھا ہے کہ ''اگر مسلمانوں نے ہندوستان میں فتوحات حاصل نہ کی ہوتیں تب بھی جدید ہندآریائی زبانیں پیدا ہوتیں لیکن انہیں جو سنجیدہ ادبی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اس میں ضرور دیر ہوتی'' پروفیسر مسعود حسین خان کے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ ایک نیا تمدن اور ایک نئی زبان کی آمد ہوئی۔ انہوں نے سنسکرت کے فسوں کو توڑ کر بہت جلد ہندوستان کی نئی زبان کو اپنے بل پر کھڑا ہونا سکھایا۔

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ اسی لیے جب جدید ہندآریائی سے مختلف قوموں کا ربط وتعلق بڑھتا گیا تو بہت سی زبانوں اور تہذیبوں کا امتزاج واضح نظر آنے لگا۔ ان میں الگ الگ لسانی خصوصیات ظاہر ہونے لگیں۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے ان کی لسانی خصوصیات کے پیش نظر جدید ہندآریائی زبانوں کو مختلف علاقوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہاں ہم چٹرجی کی تقسیم السنہ کے مطابق جدید ہندآریائی زبانوں کا مختصر سا تعارف پیش کرتے ہیں:

1.6.1 سندھی

یہ صوبہ سندھ کی زبان ہے۔ اس کے بولنے والوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ سندھی میں عربی وفارسی کے الفاظ کثرت سے شامل ہیں۔ پاکستان میں سندھی' عربی رسم الخط میں ہندوستان میں دیوناگری میں لکھی جاتی ہے۔ سندھی میں صوفیانہ ادب کا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ جدید ہند آریائی زبانوں میں یہ واحد زبان ہے جس پر عربی کا راست اثر پڑا ہے۔

1.6.2 لہندا

یہ مغربی پنجابی کی زبان ہے۔ یہ اپنی قواعد اور فرہنگ دونوں اعتبار سے مشرقی پنجابی سے مختلف ہے۔ اس کا اپنا رسم الخط ہے جسے '' لنڈا '' کہتے ہیں لیکن عموماً یہ فارسی رسم الخط ہی میں لکھی جاتی ہے۔

1.6.3 پنجابی

مغرب میں یہ لہندا یا مغربی پنجابی' شمال اور شمال مشرق میں پہاڑی زبانوں اور جنوب میں بیکانیری بولیوں سے گھری ہوئی ہے۔مشرق میں اس کے حدود مغربی ہندی کی دو بولیوں یعنی کھڑی بولی اور ہریانی سے ملتے ہیں۔ پنجابی ہی کی ایک شاخ ڈوگری ہے جو جموں میں رائج ہے۔سکھ مذہب کی وجہ سے پنجابی کو بہت ترقی ہوئی انہوں نے اس کے لیے گرمکھی رسم الخط اختیار کیا۔امرتسر ضلع گرداس پور کی پنجابی معیاری سمجھی جاتی ہے۔ پنجابی فارسی' گرمکھی اور دیوناگری تینوں رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔

1.6.4 گجراتی

یہ گجرات' کاٹھیاواڑ اور کچھ کی زبان ہے۔جدید گجراتی قواعد کے اعتبار سے مغربی ہندی بالخصوص برج بھاشا سے کافی متاثر ہے۔اسماء اور افعال کے اعتبار سے یہ مغربی ہندی کی اتباع کرتی ہے جو دکنی کی بھی خصوصیت ہے۔

1.6.5 راجستھانی

یہ مدھیہ پردیش کی زبان ہے۔یہ شورسینی اَپ بھرنش سے نکلی ہے۔اس میں قدیم ادب کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ہندی کے ویرگاتھا کال کے کئی راسو راجستھانی میں ملتے ہیں راجستھان کی کئی بولیاں ہیں جن میں مارواڑی' جے پوری' میواتی اور مالوی قابل ذکر ہیں۔راجستھان کی تہذیبی زبان ہندی ہے۔

1.6.6 مغربی ہندی

گریرسن نے مدھیہ پردیش کی زبان کو مغربی ہندی کا نام دیا ہے جس نے سب سے پہلے مشرقی اور مغربی ہندی میں فرق کیا ہے۔مغربی ہندی کا براہ راست تعلق شورسینی اَپ بھرنش سے ہے۔مغربی ہندی کی پانچ اہم درج ذیل بولیاں ہیں

1. کھڑی بولی یا ہندوستانی 2. ہریانوی 3. برج بھاشا 4. قنوجی 5. بندیلی

اردو کا سلسلہ بھی انہیں مغربی ہندی کی بولیوں سے ملتا ہے۔اس لیے مغربی ہندی کی ان بولیوں کے بارے میں آگے تفصیل سے ذکر آئے گا۔

1.6.7 مشرقی ہندی

مشرقی ہندی میں ماگدھی' اودھی' بگھیلی اور چھتیس گڑھی بولیاں شامل ہیں۔اودھی لکھنو' فیض آباد اور الہ آباد میں بولی جاتی ہے۔اس کا ادب کسی زمانے میں بہت وقیع تھا۔اس زمانے میں اس بولی کی حیثیت زبان کی تھی۔اس میں جائسی کی پدماوت اور تلسی داس کی رام چرت مانس یعنی رامائن جیسے شاہکار ملتے ہیں۔ بگھیلی' بندیل کھنڈ کی بولی ہے۔چھتیس گڑھی مشرقی مدھیہ پردیش میں چھتیس گڑھ کی بولی ہے۔اس پر مراٹھی اور اڑیہ کا اثر ہے۔مشرقی ہندی بولنے والوں کی تہذیبی زبان ہندی ہے۔ ماگدھی سے تعلق رکھنے والی زبانوں میں آسامی' بنگالی' اڑیا شامل ہیں۔اڑیا ہندوستان کی اہم زبانوں میں شامل کی جاتی ہے جس میں مراٹھی الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔آندھرا پردیش سے قربت کی وجہ سے تلگو الفاظ بھی داخل ہو گئے ہیں۔اڑیا کی قواعد بنگالی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ ماگدھی سے بہاری زبان کا بھی ارتقا ہوا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین کا خیال ہے کہ بہاری بذات خود کوئی زبان نہیں بلکہ یہ تین زبانوں یعنی میتھلی' مگہی اور بھوج پوری کا مجموعہ ہے (عام لسانیات ص 866)۔ بہار میں تین رسم الخط رائج ہیں۔کیتھائی' چھپائی دیوناگری میں ہوتی ہے۔ عام تحریروں میں کیتھی رسم الخط اپنایا جاتا ہے۔

بنگلہ ماگدھی اپ بھرنش کی خاص جانشین ہے۔ادبی اعتبار سے ہندوستانی زبانوں میں اس کا مقام بہت بلند ہے۔ بنگلہ کا اڑیا پر بڑا اثر ہے۔ بنگلہ کے قدیم شاعروں میں چنڈی داس اور جدید شاعروں میں ٹیگور اور نذرالاسلام کے نام لیے جاسکتے ہیں۔اس زبان میں ناول نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ بنگلہ میں ''س'' کا تلفظ ''ش'' اور ''الف' کو مختصر کر کے ''او'' سے بدل دیا جاتا ہے اس کی ادبی زبان سنسکرت سے بہت قریب ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. سنیتی کمار چٹرجی نے جدید ہند آریائی زبانوں کو کن مختلف علاقوں میں تقسیم کیا ہے۔
2. سندھی زبان کی خصوصیات لکھیے۔
3. پنجابی زبان کن تین رسم خط میں لکھی جاتی ہے؟
4. مغربی ہندی میں کون سی پانچ بولیاں شامل ہیں؟ ان کے نام بتائیے۔

1.7 مغربی ہندی

عہد وسطیٰ میں مغربی یوپی کی شورسینی پراکرت (جس کا مرکز متھرا تھا) نے ہندوستان کی ادبی اور معیاری زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔ شورسینی پراکرت کے بعد شورسینی اپ بھرنش کا دور آیا۔ اس عہد میں بھی اس علاقے کی اپ بھرنش کو عروج حاصل رہا۔ دوآبے کی شورسینی اپ بھرنش سارے شمالی ہندوستان کی لنگوافرینکا کی حیثیت رکھتی تھی جو گجرات و مغربی پنجاب سے لے کر بنگال تک رائج تھی۔ 1000ء میں جب ترک پنجاب کے میدان میں داخل ہوئے تو اس وقت شورسینی اپ بھرنش عروج پر تھی۔ اس نے ادبی شکل اختیار کر لی۔ اسی کی بول چال کو گریرسن اور چٹرجی نے ''مغربی ہندی'' کا نام دیا اسی سے ہندوستان کی اکثر جدید زبانوں کا آغاز ہوا۔

اس کے شمال مغرب میں پنجابی زبان ہے اور جنوب مشرق میں مراٹھی اور مشرقی ہندی ہے۔ شمال میں یہ پہاڑی بولیوں سے گھری ہوئی ہے۔ مغربی ہندی کی تمام بولیوں کا تعلق شورسینی اپ بھرنش سے ہے، جس سے بے شمار جدید آریائی زبانیں نکلی ہیں۔

مغربی ہندی کے سلسلے میں پانچ بولیاں آتی ہیں۔

1. کھڑی بولی 2. ہریانوی 3. برج بھاشا 4. قنوجی 5. بندیلی

مشہور ماہر السنہ گریرسن نے مغربی ہندی کی ان پانچ بولیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے گروہ میں (او) یا (اَو) کی بولیاں آتی ہیں۔ دوسرے گروہ میں اَ کی بولیاں شامل ہیں۔ پہلے گروہ میں یعنی (او) یا اَو کی بولیوں میں برج بھاشا، قنوجی اور بندیلی آتی ہیں جب کہ دوسرے گروہ یعنی (اَ) کی بولیوں میں کھڑی بولی اور ہریانی شامل ہیں۔

مغربی ہندی کی بولیوں میں کچھ ایسی صوتی، صرفی اور نحوی خصوصیات ہیں جو انہیں دوسری بولیوں سے ممیّز کرتی ہیں۔ یہ سب حالتِ تفصیلی میں ہیں۔ کھڑی بولی میں یہ رجحان سب سے زیادہ ہے یہاں مغربی ہندی کی ان پانچوں بولیوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

1.7.1 کھڑی بولی

ضلع انبالہ کی تحصیل انبالہ، ضلع بلند شہر کا شمالی حصہ، بجنور، مرادآباد، رام پور، میرٹھ، مظفر نگر اور سہارن پور کے اضلاع دہرہ دون کے میدانی علاقے میں کھڑی بولی کا ہی چلن ہے۔ میرٹھ، مظفر نگر اور سہارنپور کی کھڑی بولی معیاری سمجھی جاتی ہے۔ مظفر نگر میں تشدید (ـّـ) کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ ان علاقوں کی کھڑی بولی میں افعال کی صورت یہ ہے کہ ''میں مارتا ہوں'' کے ساتھ ''میں ماروں ہوں'' بھی کہا جاتا ہے۔ اسماء کی جمع کھڑی بولی میں (اں) سے بنائی جاتی ہے مثلاً عورتاں، قلماں، مکاناں، وغیرہ۔ ضمیر میں تیرا کی جگہ تجھ مجھ بھی ملتا ہے۔ کھڑی بولی کی ابتدائی جھلک اپ بھرنش کی قدیم ترین تصنیفات میں نظر آتی ہے۔ کھڑی بولی ایک طرف دوسری بولیوں کے مقابلے میں قدیم ترین ہے۔ اس کا کوئی نمونہ پندرہویں صدی سے قبل نہیں ملتا تو دوسری طرف مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہ میرٹھ اور مضافات میں بولی جاتی تھی۔ اس کے اثرات ہمہ گیر تھے۔ کھڑی بولی اپنے علاقے سے آگے بڑھ کر پنجابی کو بھی متاثر کرتی رہی ہے۔

پروفیسر گیان چند جین نے اس کا نام ''کھڑی'' ہونے کی وجوہات اپنی معرکتہ الآرا تصنیف ''عام لسانیات'' میں درج ذیل بتائی ہیں:

1. برج کے مقابلے میں کھڑی کا لہجہ (اَ) کا ہے اس لیے اسے کھڑی کہا گیا ہے۔ اردو میں (اَ) یا (آ) اور ہندی میں 37 اور 377 کی ماترا دونوں کھڑے ہیں۔ اس لیے اسے کھڑی کہا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں برج کو جس کا لہجہ (او) کا ہے ''پڑی'' سمجھا گیا۔
2. برج کے مقابلے میں کھڑی میں تشدید کا رجحان زیادہ ہے اور معکوسی مصمتے ڈ، ڑ کا استعمال بھی زیادہ ہے۔ برج میں کھڑی کا ڈ کئی موقعوں پر ڑ اور ر ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے برج میں شیرینی آ گئی ہے۔
3. تیسری توجیہہ کے مطابق کھڑی دراصل کھری ہے۔ کھری بولی یعنی صاف ستھری فصیح۔

اردو اور ہندی دونوں کھڑی بولی کے دو ادبی روپ ہیں۔ اردو کھڑی بولی کا وہ روپ ہے جس میں سنسکرت تت سم الفاظ نہ ہونے کے برابر ہیں اور عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ ہیں:

1.7.2 ہریانی

ہریانی کو بانگڑو اور جاٹو بھی کہتے ہیں۔ دہلی میں یہ زبان جاٹو کے نام سے مشہور ہے کیوں کہ آس پاس کے علاقے میں جاٹوں کی آبادی کثرت سے ہے۔ لوگ اسے گنوارو زبان سے بھی تعبیر کرتے آئے ہیں۔

ہریانی دلی کے شمال مغربی اضلاع کرنال، روہتک، حصار اور گڑگاؤں میں بولی جاتی ہے۔ ہریانہ میں مسلمانوں کی آبادی قدیم زمانے سے پائی جاتی ہے۔ سلاطین دہلی کے لشکروں میں بھرتی عام طور سے اسی علاقے کے جنگجو قبائل سے ہوتی تھی۔ ہانسی، نارنول اور جھجر کو سیاسی اعتبار سے مختلف زمانوں میں اہمیت حاصل رہی نتیجتاً اس علاقے کی زبان میں کافی الٹ پھیر ہوتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ہریانی میں کبھی کھڑی کے افعال استعمال کیے جاتے ہیں تو کبھی پنجابی کے مثلاً یہاں کھڑی کا ''کرتا'' اور ''کہتا'' کے ساتھ پنجابی اور لہندا کا ''کردا'' اور ''کہدا'' بھی ملتا ہے۔ عبدالواسع ہانسوی کی ''غرائب اللغات'' ہریانی زبان کی پہلی تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ ہریانی بھی کھڑی کی طرح (ا) کی بولی ہے۔

1.7.3 برج بھاشا

برج بھاشا کی خاص پہچان یہ ہے کہ اس کے اسما و افعال اور صفات کے آخر میں او یا اُو آتا ہے۔ ماضی میں یہ بولی بحیثیت زبان، کرشن بھگتی کے ادب کے لیے مخصوص تھی۔ برج میں ہندی کے بڑے شاعر سورداس نے شاعری کا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ سکندر لودھی کے وقت سے شاہ جہاں کے عہد تک آگرہ ہندوستان کا پایۂ تخت رہا جس کی وجہ سے اس دور میں برج پورے شمالی ہند کی تہذیبی زبان بننے لگی تھی۔

برج بھاشا، شورسینی اپ بھرنش کی سچی جانشین ہے۔ یعنی برج۔ مغربی ہندی کی دوسری بولیوں کے مقابلے میں شورسینی اپ بھرنش اور شورسینی پراکرت کی مجموعی خصوصیات کی حامل ہے۔ شورسین، متھرا کے علاقے کا قدیم نام ہے۔ (برج کے معنی جانوروں کا ''ہڈا'' ہیں۔ چوں کہ اس علاقے میں گائے کی بڑی اہمیت ہے اس کی وجہ سے برج کا لفظ وجود میں آیا) برج بھاشا کو شورسینی کی سچی جانشین کہنے کے تین اسباب ہو سکتے ہیں:

1. برج بھاشا ادب کی زبان تھی۔ سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش میں جو ادب اور قواعد کی کتابیں لکھی گئیں، ان کے بعد تصنیف و تالیف کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اور درمیان میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس خلا کو برج بھاشا ہی نے پُر کیا۔ برج کے مقابلے میں کھڑی کے ادبی نمونے بہت بعد کے ہیں۔ البتہ کھڑی کا 'پٹ' اپ بھرنش میں بھی نظر آتا ہے۔ مگر خود کھڑی کا اپنا ادب بہت بعد میں وجود میں آیا جب کہ برج نے اپنے ارتقا کی کئی منزلیں طے کر لی تھیں۔

2. برج کی اس اہمیت کا راز بھگتی تحریک میں بھی ہے۔ اس مذہبی تحریک کا اصل مرکز متھرا کا علاقہ تھا، برج بھاشا جہاں کی خاص بولی تھی۔ اس تحریک کے اپدیشک اپنی بانی کو دور دور تک اسی زبان کے ذریعے پھیلاتے تھے۔ اس طرح برج کے اثرات ملک گیر تھے۔ جس طرح شورسینی اپ بھرنش ایک زمانے میں لاہور سے بنگال تک اثر انداز تھی اسی طرح اس کی سچی جانشین کو بھی وہی قدرت و منزلت ملی۔

-3 برج بھاشا کے عروج کو اپنے منتہائے کمال تک پہنچانے کی رہی سہی کوشش بعد کے ادوار میں اس وقت پوری ہوئی جب اکبر اعظم نے راجدھانی کو دہلی سے آگرہ منتقل کیا۔ یہ تبدیلی شاہ جہاں کے دور تک باقی رہی۔ جب شاہ جہاں نے دہلی کو پایۂ تخت بنایا تو شاہ جہاں کے اس اقدام سے قبل برج بھاشا کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ اب بازاروں، منڈیوں، محلات شاہی اور سرکاری دفاتر میں جو زبان بولی جانے لگی وہ کھڑی بولی تھی جس کی بنیاد پر اردو زبان قائم ہے۔ شاہ جہاں کی سرپرستی کی وجہ سے ایک نظریے کے مطابق ہماری زبان کا نام ''اردو'' پڑ گیا۔ اردو کی پہچان برج کے مقابلے میں بڑی آسان ہے۔ برج بھاشا میں ضمائر کے آخر میں ''او'' یا ''و'' آتا ہے۔ برج کا 'تمہارو'، 'تیرو' اردو میں 'تمہارا' اور 'تیرا' ہو جاتا ہے۔ برج کا 'ہمارو' اردو میں 'ہمارا' اور برج کا 'میرو' اردو میں 'میرا' کے طور پر ملتا ہے۔

برج میں فعل 'ماریو'، 'مارو' کی بجائے ماریا یا مارا استعمال ہوتا ہے۔ برج میں مستقبل کی جو مختلف شکلیں ملتی ہیں ان میں 'گو' یا 'ہوں' مروج ہیں مثلاً 'چلوگو' یا 'چلوں ہوں' مگر اردو میں 'چلوں گا' یا 'چلتا ہوں' رائج ہے۔

اردو میں اسما بنانے کے کئی قاعدے ہیں ان میں سے (وں) لگا کر بھی جمع بنائی جاتی ہے۔ برج میں صرف (ن) کے اضافے سے بنائی جاتی ہے مثلاً گھوڑوں سے گھوڑن۔

اردو میں فعل مضارع (تا) لگا کر بنایا جاتا ہے۔ جب کہ برج بھاشا میں صرف (ت) لگا کر بنالیا جاتا ہے۔ مثلاً 'کرتا ہے'۔ 'پھرتا' ہے برج میں کہیں گے 'کرت ہے'۔ 'پھرت ہے' وغیرہ۔

عام طور پر برج میں (ڑ) کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اس کی بجائے (ر) استعمال ہوتا ہے مثلاً کروڑوں کی بجائے کروروں ساڑی کی بجائے ساری کہیں گے۔

برج میں حروف علت کا زیادہ استعمال ہوتا ہے تشدید کی آواز بہت کم آتی ہے اس کی بجائے الف' و' ی' کا استعمال کرتے ہیں۔

برج میں (ل) کی بجائے (ر) کو ترجیح دی جاتی ہے جیسے 'کاجل' سے 'کجرا' 'بادل' سے 'بدریا' وغیرہ۔

امیر خسرو کے عہد میں برج اور کھڑی ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ امیر خسرو کے درج ذیل دو ہے میں برج اور کھڑی بولی دونوں کا خوبصورت امتزاج ہے۔

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چو دیس

1.7.4 قنوجی

مغربی ہندی کی اس بولی کا نام شہر قنوج کے نام پر ہے جو ضلع فرخ آباد میں ہے۔ قنوج ہندوستانی لفظ ہے جسے ہندی میں کنوج کہا جاتا ہے۔ قنوجی شاہ جہاں پور کے شمال میں پیلی بھیت تک بولی جاتی ہے۔ جہاں یہ برج بھاشا سے گھل مل جاتی ہے۔ اس کے مغرب اور شمال مغرب میں برج بھاشا اور جنوب میں بندیلی ہے۔ مشرق اور شمال مشرق میں یہ اودھی سے گھری ہوئی ہے۔ ادبی حیثیت سے یہ برج بھاشا کی وجہ سے پیچھے رہ گئی ہے۔ اس کی اور برج بھاشا کی قواعد میں فرق بھی بہت کم ہے۔ اس کی قواعد کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں برج بھاشا کے برخلاف اُو' او' پر ختم ہوتا ہے۔ برج اور قنوجی دونوں میں حروف صحیح پر ختم ہونے والے الفاظ کے آخر میں (وا) بڑھا دیا جاتا ہے۔ جیسے ہندوستانی 'گھر' قنوجی میں 'گھروا' ہو جائے گا۔ قنوجی میں درمیانی (ہ) گر جاتی ہے جیسے ''کہی ہو'' کی بجائے 'کی او' ہوگا۔

1.7.5 بندیلی

یہ بندیل کھنڈ کی بولی ہے جو شمال میں آگرہ' مین پوری اور ایٹہ کے ضلعوں تک رائج ہے اور شمال مغرب میں' قنوجی اور برج بھاشا سے گھری ہوئی ہے۔ اس کے جنوب مغرب میں راجستھانی بولیاں رائج ہیں۔ جنوب میں اس کے حدود مراہٹی سے ملتے ہیں۔ دوسری بولیوں کے برخلاف اس میں غیر معمولی یکسانیت ہے۔ بندیلی میں ادب کا وسیع سرمایہ ہے۔ بندیلی میں حروف علت میں (ی) عموماً (ے) سے اور (اَو) (اؤ) سے بدل جاتا ہے جیسے گیہوں (گے ہوں) 'اور'۔ 'اَور' (اؤر) ہو جاتا ہے جیسا کہ بھوپالی اردو میں آج بھی رائج ہے۔ مونث بنانے کے لیے (ن) کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے کُتے سے (کتن)۔ ایک لفظ جو ہر جگہ مستعمل ہے وہ ''بہت'' ہے جسے (بھوت) کہا جاتا ہے۔ یہی تلفظ قدیم دکنی میں بھی ادا کیا جاتا تھا اور آج بھی دکن کی بول چال میں رائج ہے۔ ہندی کے مشہور شاعر کیشو داس اور پدما کر نے اسی بندیلی میں شاعری کی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. عہدِ وسطیٰ میں مغربی یوپی کی کس بولی نے ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر لی؟
2. مغربی ہندی کی کتنی بولیاں ہیں؟ نام بتائیے۔
3. کن علاقوں کی کھڑی بولی معیاری سمجھی جاتی ہے؟
4. ہریانی زبان کی پہلی تصنیف کا نام بتائیے۔
5. کیشو داس نے کس زبان میں شاعری کی؟

1.8 خلاصہ

زبان' آواز اور الفاظ کا مجموعہ ہے۔ زبان ہمارے احساسات' جذبات و خیالات کو ادا کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ الفاظ زبان کی ظاہری صورت ہے تو معنی اس کا باطنی حسن ہے۔ الفاظ اور معنی میں باہمی ربط و تعلق اور ہم آہنگی ہی سے ترسیل و ابلاغ میں کامیابی ملتی ہے۔

زبانیں' زماں و مکاں کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ ان کی صوتی' صرفی اور نحوی خصوصیات کی بنا پر انہیں ماہرین لسانیات نے مختلف آٹھ خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان آٹھ خاندانوں میں (1) سامی (2) ہند چینی (3) دراوڑی (4) مُنڈا (5) افریقہ کی بانتو (6) امریکی (7) ملایائی اور (8) ہند یورپی کا شمار ہوتا ہے۔ سامی خاندان میں بہت سی اہم زبانیں آتی ہیں۔ عربی اس کی ایک اہم شاخ ہے۔ عبرانی بھی اسی سے نکلی ہے۔ دراوڑی سے ہندوستان کی بہت سی اہم زبانوں کا سلسلہ ملتا ہے۔ یہ زبانیں جنوبی ہندوستان میں رائج ہیں ٹامل' تلگو' کنڑ اور ملیالم اسی کی مشہور شاخیں ہیں لیکن اردو اور ہندی کا جس خاندان سے تعلق ہے وہ ہند یوروپی ہے۔ ہندوستان میں آ کر یہ خاندان اپنے ارتقائی دور میں ایرانی سے گزر کر ہند آریائی شکل اختیار کر لیتا ہے جسے ہم قدیم ہند آریائی' وسطی ہند آریائی اور جدید ہند آریائی میں تقسیم کرتے ہیں۔

قدیم ہند آریائی دور 1500 ق۔م سے 500 ق۔م تک شمار کیا جاتا ہے۔ اس دور میں ویدک اور سنسکرت زبانوں کا رواج رہا۔ آریاؤں کے مقامی لوگوں سے میل جول کے نتیجے میں سنسکرت زبان' مقامی زبانوں اور بولیوں سے متاثر ہوتی رہی۔ سنسکرت کے عالموں نے اس زبان کے معیاری الفاظ اور لب و لہجے کو نئے سرے سے منظم کر کے اسے ''شدھ'' اور ''پاک'' کیا۔ اسی لیے اسے سنسکرت کا نام دیا جس کے معنی ''پاک کئے ہوئے'' کے ہیں۔

وسطی ہند آریائی کا 500 ق۔م سے 1000ء تک کا زمانہ ہے۔ جسے ماہرین نے اس کے ارتقائی خصوصیات کے لحاظ سے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دور میں ''پالی'' عوام کی مقبول زبان رہی ہے جس میں جین مت اور بدھ مت کی تعلیمات ملتی ہیں دوسرا دور مسیحی سنہ کی ابتداء سے 500ء تک شمار کیا جاتا ہے۔ اس دور میں پانچ پراکرت زبانوں کو بڑی اہمیت حاصل رہی' ان میں (1) مہاراشٹری (2) شورسینی (3) مگدھی (4) اردھ مگدھی اور پیشاچی شامل ہیں۔

تیسرا دور 500ء تا 1000ء پر محیط ہے۔ یہ دور اپ بھرنش کا دور ہے۔ ہندوستان کی جدید زبانیں اپ بھرنش ہی سے پیدا ہوئیں۔ اپ بھرنش سے تعلق رکھنے والی شورسینی اپ بھرنش کو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ شورسینی اپ بھرنش میں چار اہم بولیاں آتی ہیں ان میں کھڑی بولی' راجستھانی' پنجابی اور گجراتی شامل ہیں۔

جدید ہند آریائی کے آغاز کا زمانہ 1000ء سے تا حال مقرر ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان میں مختلف لسانی' تہذیبی اور سیاسی تبدیلیوں کا زمانہ رہا ہے۔ اس زمانے میں سیاسی اور تہذیبی تبدیلیوں اور ان کے میل جول سے ہندوستانی زبانوں میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان کی الگ الگ لسانی خصوصیات کی وجہ سے سنیتی کمار چٹرجی نے جدید ہند آریائی زبانوں کو مختلف علاقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں مغربی ہندی کو اردو کے ارتقا میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مغربی ہندی کی پانچ بولیاں ہیں جو دوآبے کی شورسینی اپ بھرنش سے تعلق رکھتی ہیں۔ پہلی کھڑی بولی دوسری ہریانوی' تیسری برج بھاشا' چوتھی قنوجی اور پانچویں' بندیلی۔ کھڑی بولی پر اردو کی بنیاد قائم ہے۔ دیگر چار بولیوں کا اثر بھی کم و بیش اردو پر کہیں نہ کہیں نظر آتا ہے۔

1.9 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. زبان سے کیا مراد ہے؟ انسانی زندگی میں اس کی اہمیت واضح کیجیے۔
2. وسطی ہند آریائی دور کی لسانی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔
3. ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے جدید ہند آریائی زبانوں کی تقسیم کس طرح کی ہے؟ ان میں سے کن ہی تین زبانوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. زبان اور بولی کا فرق واضح کیجیے۔
2. ہند آریائی کے ارتقا کا جائزہ لیجیے۔
3. ہندوستان میں آریاؤں کی آمد سے یہاں کی زبانوں پر کس طرح کے اثرات مرتب ہوئے؟ بیان کیجیے۔

1.10 فرہنگ

الفاظ	= معنی	الفاظ	= معنی	الفاظ	معنی
ابلاغ	= پہنچانا، اشاعت	امتزاج	= ملاوٹ، ہم آہنگی، آمیزش	تت بھو	= ملواں۔غیر خالص
تت سم	= خالص	ترسیل	= روانہ کرنا، بھیجنا	تنوع	= نیاپن، جدت
مستحکم	= مضبوط	مصمتے	= Consonents جیسے ب پ ت ٹ وغیرہ		

مصوتے = Vowels جیسے ا و ی ـَ ـِ ـُ

ہئیت = بناوٹ، ساخت، شکل وصورت (Form)

صرفی = صَرف سے متعلق (علم صرف میں حروف وحرکات کے تغیر وتبدل اور کلمات کے بنانے کے قاعدے اسم اور فعل کی صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے) مستحکم = مضبوط

نحوی = علم نحو سے متعلق (جس میں کلمات کو ترتیب دینے اور ان کو جدا جدا کرنے کے طور طریق معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک کلمے کا دوسرے کلمے سے ربط وتعلق کیا ہے)

1.11 سفارش کردہ کتابیں

1. مسعود حسین خاں، پروفیسر — مقدمہ تاریخ زبان اردو۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ
2. چٹرجی، سنیتی کمار — ترجمہ: عتیق احمد صدیقی، ہند آریائی اور ہندی۔ ترقی اردو بورڈ۔ نئی دہلی
3. احتشام حسین، پروفیسر — ہندوستانی لسانیات کا خاکہ۔ امین الدولہ پارک۔ لکھنؤ
4. زور، محی الدین قادری، ڈاکٹر — ہندوستانی لسانیات۔ نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ
5. شوکت سبزواری، ڈاکٹر — اردو لسانیات۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ
6. گوپی چند نارنگ، پروفیسر — اردو تعلیم کے لسانیاتی پہلو۔ آزاد کتاب گھر۔ دہلی

اکائی: 2 اُردو زبان کا آغاز وارتقا' مختلف نظریے

ساخت

2.1 تمہید

2.2 مختلف زبانوں کے میل جول کا نتیجہ

2.3 اردو کا آغاز۔ مختلف جغرافیائی حدود میں

2.4 محمد حسین آزاد کا نظریہ

2.5 محمود شیرانی' ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کے نظریات

2.6 پروفیسر مسعود حسین خاں کا نظریہ

2.7 خلاصہ

2.8 نمونۂ امتحانی سوالات

2.9 فرہنگ

2.10 سفارش کردہ کتابیں

2.1 تمہید

اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں مختلف نظریے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان نظریات کا سلسلہ میر امن سے شروع ہوتا ہے۔ اردو کی ابتدا کے بارے میں جتنے بھی نظریات اب تک پیش کیے گئے ہیں' ان میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کا خیال ہے کہ اردو مختلف زبانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی' بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اردو کے آغاز وارتقا کا مطالعہ جغرافیائی اور علاقائی حدود میں کرنا چاہیے۔ اس اکائی میں ہم مختلف اہم نظریات کا مطالعہ کریں گے۔ نیز یہ بھی دیکھیں گے کہ ماہرین لسانیات' اردو کے آغاز وارتقا کا سلسلہ کہاں سے ملاتے ہیں اور اس کی وجوہات کیا ہیں؟

2.2 مختلف زبانوں کے میل جول کا نتیجہ

ہندوستان میں اردو کے آغاز وارتقا کے بارے میں جن لوگوں نے گفتگو کی ہے ان میں اکثریت ایسے اصحاب کی ہے جن کا لسانیات سے کوئی گہرا تعلق نہیں رہا جیسے انشاء اللہ خان انشاؔ' میر امن دہلوی' امام بخش صہبائی' محمد حسین آزاد' مولوی عبدالحق' مولوی نصیر الدین ہاشمی' سلیمان ندوی وغیرہ۔ ماہرین لسانیات میں محمود شیرانی' شوکت سبزواری' ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ اور پروفیسر مسعود حسین خاں کے نظریات کی بڑی اہمیت ہے۔ ان محققین سے قبل اور اُن کے ہمعصر مستشرقین میں سے جارج گریرسن' ہارنلے' جان بیمز' گراہم بیلی اور رڈول بلاک نے بھی اس مسئلے پر قلم اٹھایا ہے۔

اردو کی ابتدا کے بارے میں اب تک جتنے بھی نظریات پیش کیے گئے ہیں ان میں اکثریت ان شاعروں اور ادیبوں کی ہے جنھوں نے اردو کو مختلف زبانوں کے میل جول کا نتیجہ بتایا ہے۔ انشاء اللہ خان انشاؔ (م 1817ء) نے اردو کو عربی' فارسی' ترکی اور برج بھاشا پر مشتمل قرار دیا ہے۔ میر امّن دہلوی (1732-1803ء) نے باغ و بہار کے دیباچے میں لکھا ہے۔

> ''حقیقت اردو زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے' تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اِس خاندان لاثانی کی سُن کر' حضور میں آ کر جمع ہوئے' لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین' سودا سلف' سوال جواب کرتے ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔'' (ص ۷۔۸)

میر امن پہلے اہل قلم ہیں جنہوں نے اردو کو مختلف زبانوں کے میل جول کا نتیجہ بتایا۔

امام بخش صہبائی (دہلی کالج میں فارسی اور عربی کے پروفیسر تھے 1857ء کے ہنگامے میں مارے گئے) نے رسالہ قواعد اردو میں لکھا ہے کہ شاہ جہاں آباد میں فارسی اور ہندی کے خلا ملا سے جو بولی مروج ہوئی اس کا نام اردو ٹھہرا۔ مولوی عبدالحق (1961ء 1870ء) بھی کچھ اسی قسم کی بات ''اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام'' (صفحہ 83-82) میں کہتے ہیں۔ آٹھویں، نویں اور گیارہویں صدی کی زبان کے نمونے پیش کرنے کے بعد مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ بزرگان دین نے اہل ملک سے ارتباط اور میل جول بڑھانے اور ان کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔ اس نظریے سے انہوں نے ان کی اور اپنی زبانوں کو ملانا شروع کیا۔ اس میل اور ارتباط سے خود بخود ایک نئی زبان بنی جو نہ ہندی تھی اور نہ فارسی بلکہ ایک نئی مخلوط زبان تھی جسے اب ہم اردو یا ہندوستانی کہتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اردو کے آغاز وارتقا کے بارے میں جن لوگوں نے گفتگو کی ان میں سے کس کا تعلق لسانیات سے نہیں تھا؟ نام بتایئے۔
2. کن شاعروں اور ادیبوں نے اردو کو مختلف زبانوں کے میل جول کا نتیجہ بتایا ہے؟
3. اردو کے تعلق سے مولوی عبدالحق نے اپنی کس کتاب میں گفتگو کی ہے؟ نام بتایئے۔

2.3 اردو کا آغاز۔ مختلف جغرافیائی حدود میں

بعض عالموں نے اردو کے آغاز کو جغرافیائی یا علاقائی حدود میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ چوں کہ ان کے پاس اس نظریے کی کوئی مضبوط بنیادیں نہیں تھیں۔ اس لیے وہ کسی ایک نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ بلکہ اپنی رائے کی خود ہی تردید و تنسیخ کرنے لگے یا بغیر مستحکم دلائل کے اپنی بات پر اڑے رہے۔

مولانا سلیمان ندوی (1953-1884ء) بڑے عالم تھے ''نقوش سلیمانی'' کے ایک مقالے میں انہوں نے اپنا ایک نظریہ پیش کرنا چاہا کہ اردو سندھ میں پیدا ہوئی۔ دوسرے ایک مضمون میں وہ میر امن کے ہمنوا ہو گئے۔ ان کے بیانات ملاحظہ ہوں۔

> ''مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں۔ اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں، اس کا ہیولیٰ اسی وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہوگا'' (نقوش سلیمانی ص 31)

اس سے پہلے ایک خطبے میں فرماتے ہیں:

> ''اردو زبان کا پیدا ہونا کسی ایک قوم یا قوت کا کام نہیں بلکہ مختلف قوموں اور زبانوں کے میل جول کا ایک ناگزیر اور لازمی نتیجہ ہے'' (نقوش سلیمانی ص 6)

ایک اور مضمون میں انہوں نے یہ رائے قائم کی کہ:

> ''یہ مخلوط زبان، سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبے دار زبانوں سے مل کر، ہر صوبے میں الگ الگ پیدا ہوئی'' (نقوش سلیمانی 251)

مندرجہ بالا تینوں بیانات میں مولانا نے مختلف آرا پیش کیے ہیں جو بیک نظر درج ذیل ہیں!

1. اردو کا ہیولیٰ وادیٔ سندھ میں تیار ہوا۔
2. مختلف قوموں اور زبانوں کے میل جول سے اردو وجود میں آئی۔
3. اردو ایک مخلوط زبان ہے جو، سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال کی زبانوں سے مل کر ہر صوبے میں الگ الگ پیدا ہوئی۔

پہلے نظریے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ماہر لسانیات ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

''.....اس میں کوئی شک نہیں کہ سندھ میں ایک زبان یقیناً ارتقا پاتی رہی مگر وہ اردو نہ تھی۔ وہ اس زبان کی قدیم شکل تھی جو آج سندھی کہلاتی ہے۔'' (ہندوستانی لسانیات ص 92)

مشہور ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں نے سلیمان ندوی کے نظریے کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سید سلیمان ندوی نے اردو کے پہلے ہیولے کے سندھ میں بننے کا ذکر کیا ہے وہ کسی طرح صحیح نہیں۔ اس لیے عربی، فارسی الفاظ کا ہندوستان کی کسی زبان میں داخلہ اردو زبان کی تشکیل کی ضمانت نہیں کرتا۔ سندھی، ہند آریائی ہوتے ہوئے بھی اردو یا ہندی سے مختلف ہے۔ قدیم سندھی میں عربی الفاظ کے داخلے سے جدید سندھی وجود میں آئی نہ کہ اردو۔ اس جدید سندھی اور اردو کے درمیان اشتراک صرف عربی رسم الخط، اسما اور روایات شعر کا ہے'' (مضمون اردو زبان کی ابتداء اور ارتقا کا مسئلہ، مشمولہ ''اردو زبان کی تاریخ'' مرتبہ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ ص 86-85)

ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں کے اس مدلّل بیان کے بعد یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ عربوں نے وادی سندھ میں اپنے قیام کے دوران کسی نئی زبان کو جنم نہیں دیا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اردو کی پیدائش کے تعلق سے سلیمان ندوی کا کیا نظریہ ہے؟
2. ڈاکٹر زور نے سلیمان ندوی کے نظریے کی کس طرح تردید کی؟
3. سلیمان ندوی کے نظریے کی تردید کن ماہرین لسانیات نے کی ہے؟

2.4 محمد حسین آزاد کا نظریہ

''آب حیات'' کے مصنف محمد حسین آزاد (1910-1828ء) کا نظریہ کہ ''اردو زبان برج بھاشا سے نکلی'' بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس نظریے پر عرصہ تک گفتگو ہوتی رہی۔ اس نظریے میں تھوڑی بہت لسانی حقیقت بھی پوشیدہ ہے۔ اس لیے یہاں تفصیل سے بحث کی جائے گی۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ:

''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی۔'' (ص 6)

آزاد کو جس چیز نے یہ سوچنے پر مجبور کیا وہ شاید برج کے شہر آگرہ کی تاریخی اہمیت ہے جسے اکبر اعظم (1605-1556ء) اور جہانگیر (سنہ جلوس 1605- سنہ وفات 1627ء) نے پائے تخت مقرر کیا تھا۔ اور شاہجہاں (1657-1627ء) نے اپنے عہد کا بڑا حصہ گزارا تھا۔ آگرہ کو مرکزیت حاصل ہونے کی وجہ سے یہاں کی زبان برج کو بھی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ اکبر کے نورتن میں سے آٹھ رتن برج کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ تان سین کی وجہ سے سنگیت کا بڑا بول بالا رہا۔ برج تو سنگیت ہی کی زبان تھی۔ علمی حلقوں میں آزاد کے اس نظریے کا بڑا چرچا رہا۔ بعض لوگوں نے تو اردو کو برج کی بیٹی سمجھ لیا۔ ان میں سے ایک شمس اللہ قادری بھی ہیں جن کی تحریروں میں اس نظریے کی گونج سنائی دیتی ہے۔

اردو کے برج بھاشا سے نکلنے کے اس نظریے کی تنقید اور تردید کئی ماہرین لسانیات نے کی۔ محمود شیرانی نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں پروفیسر مسعود حسین خاں نے ''مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو'' میں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ''داستان زبان'' اردو میں پرزور مدلل تردید کی ہے۔ تقابلی مطالعے اور لسانیاتی تجزیے سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ اردو اور برج کا رشتہ ماں بیٹی کا رشتہ نہیں بلکہ بہنوں کا رشتہ ہے۔ کیونکہ اردو اور برج بھاشا میں بعض اہم لسانیاتی اختلافات پائے جاتے ہیں جن کی یہاں مختصراً نشاندہی کی جاتی ہے۔

برج بھاشا میں اسما افعال اور اسمائے صفات کا اختتام عموماً (و/او) پر ہوتا ہے جیسے (اپنو/اپنا) (چلیو/چلا) گھوڑو یعنی گھوڑا۔

اردو اور برج کے ضمائر میں خاصا فرق ہے۔ اردو کا تیرا اور تمہارا برج میں (تیرو) اور (تمہارو) ہوجاتا ہے۔ زمانہ قدیم میں برج میں واحد متکلم کے لیے ''ہوں'' مستعمل تھا۔ دکنی میں محمد قلی قطب شاہ نے اپنی رختیوں میں دو ایک جگہ ''ہوں'' (بمعنی میں) استعمال کیا ہے۔

پیارا نہ کھیچ ، ہوں تو پر واری
ہوں تِل تِل تمن پُر تھے واری ہو پیاری

برج بھاشا میں ضمائر کی جداگانہ شکلیں بھی ملتی ہیں جو اردو میں نہیں ملتیں جیسے تو ہی، تا ہیں، تیراؤں، تمہوں، موہی، موہے، میراؤ، ہماؤں، ویں، وا، واہی

برج بھاشا میں جمع (ن) کے اضافے سے بنتی ہے جیسے ڈھونڈن، روون، اردو میں (تا) کے اضافے سے مضارع بنایا جاتا ہے جب کہ برج بھاشا میں صرف (ت) لگایا جاتا ہے۔ مثلاً کرت، پھرت، آوت، جاوت وغیرہ یہ اور اسی قسم کی کئی اور خصوصیات برج کی ایسی ہیں جن کا اردو سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے وثوق کے ساتھ یہ کہا جاتا ہے کہ اردو برج سے نہیں نکلی۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اردو کے آغاز کے تعلق سے محمد حسین آزاد کا کیا نظریہ ہے؟
2. آزاد کو کن وجوہات کی بنا پر یہ خیال آیا کہ اردو برج سے نکلی ہے؟
3. محمد حسین آزاد کے نظریے کی تردید کن ماہرین لسانیات نے کی؟
4. برج میں جمع بنانے کا کیا قاعدہ ہے؟

2.5 محمود شیرانی، ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کے نظریات

پروفیسر محمود شیرانی نے پنجابی سے اردو کا رشتہ جوڑتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ یہ نظریہ ان سے پیشتر شیر علی خان نے اپنے تذکرہ ''اعجازِ سخن'' میں پیش کیا ہے۔ شیرانی کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے سب سے پہلے سندھ میں حکومت قائم کی۔ یہ ممکن ہے کہ وہاں انہوں نے کوئی ہندوستانی زبان اختیار نہ کی ہو لیکن پنجاب میں جہاں ان کی حکومت ڈیڑھ سو سال سے بھی زیادہ رہی ہو وہاں انہوں نے سرکاری، تجارتی، معاشی اور سماجی اغراض سے کوئی نہ کوئی ہندوستانی زبان اختیار کی ہوگی۔ اس زبان کو وہ دلّی لے آئے۔ ان کے آنے سے قبل دلّی میں کون کون سی زبانیں بولی جاتی تھیں اس کا کوئی باضابطہ ریکارڈ نہیں ملتا۔ ممکن ہے وہ راجستھانی ہو یا برج بھاشا۔ لاہور سے جو زبان آئی وہ پنجابی نما اردو یا اردو نما پنجابی رہی ہوگی۔ دہلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں کے دن رات کے باہمی تعلقات کی بنا پر وہ آہستہ آہستہ ترمیم قبول کرتی رہی اور اردو کی شکل اختیار کرتی گئی۔ شیرانی نے اپنے نظریے کی تائید میں پنجابی اور اردو کی چند اہم مشترک خصوصیات گنائی ہیں:

1. پنجابی اور اردو میں علامت مصدر (نا) مشترک ہے۔

اعتراض۔ یہ علامت صرف پنجابی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دہلی کے اطراف کی بعض دیگر زبانوں میں بھی ملتی ہے۔ پنجابی میں بھی یہی ایک علامت مصدر نہیں ہے بلکہ (نا) کے ساتھ (ن) بھی علامت مصدر کے طور پر ملتا ہے مثلاً گھالنا اور گھالن۔

2. لفظوں کے آخیر میں نون غنہ کا اظہار۔

اعتراض۔ یہ خاصیت بھی پنجابی سے مخصوص نہیں دہلی کے آس پاس کی بولیوں میں قدیم زمانے سے ملتی ہے۔ دلّی والے آج دہی کو (دہیں) کہتے ہیں۔ پروفیسر مسعود حسین، شیرانی کی اس دلیل کے بارے میں لکھتے ہیں۔:

''غنہ آواز کی پیدائش، جدید آریائی زبانوں کی مشترک عالم گیر خصوصیت ہے۔''

3. اسما و صفات 'تذکیر و تانیث اور جمع واحد ان میں اپنے موصوف کی حالت کے تابع ہوتے ہیں۔ مثلاً اردو میں بڑا لڑکا، پنجابی میں وڈا مُنڈا۔
4. خبر 'تذکیر و تانیث واحد، جمع میں اپنے مبتدا کے موافق آتی ہے۔ مثلاً

جدید اردو	یہ بات بھلی نہیں	یہ باتیں بھلی نہیں
پنجابی	اے گل چنگی نئیں	اے گل چنگیاں نئیں

قدیم اردو (دکنی) ..... یو باتاں بھلیاں نیں

5. فعل، تذکیر و تانیث اور واحد جمع میں اپنے فعل کے مطابق آتا ہے۔

اردو	عورت آئی	عورتیں آئیں
پنجابی	بڈھی آئی	بڈھیاں آئیاں
قدیم اردو (دکنی)	.....	عورتاں آئیاں

6. اضافت بھی اپنے فاعل کی تذکیر و تانیث اور واحد و جمع کے مطابق آتی ہے۔ جیسے دکنی میں کہیں گے ''کوٹھریاں رنگ برنگ کیاں ہیں'' پنجابی میں بھی یہی کہیں گے۔

اعتراض۔ یہ خصوصیت بھی اردو اور پنجابی سے مخصوص نہیں۔ دہلی کے قرب و جوار میں آج بھی اسی طرح کہا جاتا ہے۔

7. شیرانی لکھتے ہیں کہ امر کا قاعدہ اردو اور پنجابی میں بالکل ایک ہی ہے یعنی علامت مصدر گرادی جاتی ہے تو امر باقی رہ جاتا ہے۔ مثلاً چلنا سے چل، کرنا سے کر۔

اعتراض۔ ہندوستان کی تمام جدید آریائی زبانوں میں امر اسی طرح بنتا ہے یہ خصوصیت کچھ پنجابی ہی سے مخصوص نہیں۔

شیرانی نے اور بھی کئی مماثلتیں بتائی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ساری مماثلتیں جدید ہند آریائی زبانوں میں کہیں نہ کہیں مشترک ہیں۔ یہ صرف پنجابی، اردو اور دکنی کا ہی خاصہ نہیں ہیں۔

شیرانی کے اس نظریے پر کئی اعتراضات ہوئے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے پنجابی اور اردو کے صرفی و نحوی اختلافات دلائل کے ساتھ پیش کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ اردو پنجابی سے نہیں نکلی۔ ذیل میں ان دونوں ماہرین لسانیات کے چند مضبوط دلائل اختصار کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں:

1. پنجابی (ن) اردو میں (ن) ہوتا ہے۔
2. پنجابی میں تشدید کا رجحان تیز تر ہے جب کہ اردو میں توازن کے ساتھ ہے۔
3. پنجابی میں اردو کے (ب) کی جگہ عموماً (و) استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً بیچ (وِچ) بال (وال) بگاڑ (وگاڑ) برف (ورف)
4. پنجابی میں صیغۂ مستقبل ''گا''۔ ''گی''۔ ''گے'' کی جگہ ''سا''۔ ''سی''۔ ''سے'' آتا ہے۔
5. حروف ربط ''کا''۔ ''کی''۔ ''کے'' کے لیے پنجابی میں ''دا''۔ ''دی''۔ ''دے'' رائج ہے۔
6. حروف ہجا میں اردو کی ''ڈھ''۔ ''جھ''۔ ''گھ''۔ ''بھ'' اور ''دھ'' کا تلفظ استعمال ہوتا ہے جب کہ پنجابی میں مختلف ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ (ہ) پنجابی میں الفاظ کے شروع میں آتی ہے۔ درمیانی (ہ) پنجابی میں عموماً دب کر ہمزہ کی آواز دیتی ہے جیسے شہر (شیئر) لاہور (لاوَر) دھیان (دئیان)۔ لفظ کے آخر میں بلاضرورت (ہ) کا اضافہ ہو جاتا ہے مثلاً جان (جانہہ) رات (راتھ)
7. پنجابی میں اردو کی آواز ''ڑ'' یا ''ڑھ'' (ڈ) یا (ڈھ) میں بدل جاتی ہے۔ مثلاً بوڑھا (بڈھا) ہو جاتا ہے بڑا (بڈا) اور گاڑی (گڈی)
8. پنجابی کے ضمائر اردو سے کہیں مختلف ہیں۔ کسی بھی زبان کے مزاج اور زبانوں کے آپسی رشتے کو سمجھنے میں ضمائر سے بڑی مدد ملتی ہے۔ پنجابی میں جمع متکلم (اسی) آتا ہے جب کہ اردو میں ہمیں، ہم۔ دکنی میں زیادہ تر ہمنا، ہمن، ہمارا آتا ہے۔ پنجابی میں ساڈا، اساڈا کہا جاتا ہے۔ پنجابی میں تُسیں تو دکنی میں تم، پنجابی میں اوہ تو دکنی وو کہا جاتا ہے۔
9. ضمائر کی طرح اعداد سے بھی رشتے کی قربت اور دوری کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں بھی پنجابی، اردو / دکنی میں نمایاں اور دلچسپ اختلاف سامنے آتا ہے۔ مثلاً

اردو/دکنی	پانچ	انیس	اکتیس	پیسٹھ	چالیس
پنجابی	پنج	انی	اکنی	پیٹھ	چالی

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اعداد میں پنجابی میں (س) کا استعمال نہیں کرتے۔

10. پنجابی میں حال ناتمام میں (تا) کے بجائے (دا) آتا ہے جیسے مرتا' کرتا' پیتا کی بجائے مردا ۔ کردا - پیدا وغیرہ

مذکورہ بالا اردو پنجابی کے صرفی ونحوی اختلافات کے مطالعے سے واضح ہوجاتا ہے کہ اردو پنجاب سے نہیں نکلی۔ڈاکٹر زور کا بھی پہلے یہی خیال تھا کہ ''اردو پنجاب سے نکلی''، لیکن بہت جلد انہوں نے اپنا نظریہ بدل لیا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (1962-1905ء) ماہر لسانیات' نقاد' محقق' مورخ' سوانح نگار' مولف' مصنف اور مرتب تھے۔ 1929ء میں لندن سے ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد وہ ڈی۔لٹ کے لیے پیرس پہنچے۔ وہاں پروفیسر ژول بلاک (یہ فرانس میں سنسکرت اور ہندی ادب کے پروفیسر تھے۔ مراٹھی پر انہوں نے فرانسیسی میں کام کیا تھا جس کا مراٹھی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ کسی جدید ہندوستانی زبان پر پہلا لسانیاتی مطالعہ ہے) کی رہنمائی میں'' گجراتی فارم آف ہندوستانی'' پر مقالہ لکھنا چاہا لیکن مقالے کی تکمیل نہ ہوسکی۔لسانیات کے موضوع پر ڈاکٹر زور کی دو اہم کتابیں ہیں ایک ''ہندوستانی فونی ٹیکس''(Hindustani Phonetics) جو 1930ء میں پیرس سے انگریزی میں شائع ہوئی۔ یہ ان کا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ تھا۔دوسری کتاب ہندوستانی لسانیات ہے جو 1932ء میں شائع ہوئی۔ پہلی کتاب میں اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے۔انہوں نے یہ واضح کیا ہے کہ جس زمانے میں اردو پنجاب میں بنی اس وقت پنجاب اور دوآبۂ گنگ وجمن کی زبان میں بہت کم فرق تھا۔ برج بھاشا' کھڑی بولی اور جدید پنجابی زبانیں بعد کو عالم وجود میں آئیں۔دوسری کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کا مشترک سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض باتوں میں پنجابی سے بھی مشابہہ ہے اور بعض میں کھڑی سے۔لیکن مسلمانوں کا صدر مقام صدیوں تک دہلی اور آگرہ رہا ہے اس لیے اردو زیادہ تر کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی۔''(ص94,95)

ڈاکٹر زور جزوی طور پر ایک درست نظریہ تک پہنچ گئے ہیں۔جیسے جیسے لسانیات کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا ' اردو کے مولد کے بارے میں زیادہ سائنٹفک انداز میں غور وفکر کیا جانے لگا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے Ph.D کے لیے یہی موضوع منتخب کیا۔ڈاکٹر شوکت سبزواری' پاکستان کے صفِ اول کے ماہرین لسانیات میں سے ایک ہیں۔ ہمارے موضوع سے متعلق ان کی تین درج ذیل کتابیں ہیں۔

1. ''اردو زبان کا ارتقا'' جو 1956 میں ڈھاکہ سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب ان کا Ph.D کا مقالہ ہے۔
2. ''داستان زبان اردو''
3. ''اردو لسانیات''

اردو زبان کے آغاز کے بارے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کے نظریے کو سمجھنے کے لیے ان کی دوسری کتاب ''داستان زبان اردو'' سے بڑی مدد ملتی ہے۔اس کتاب میں ایک جگہ وہ اپنے نظریے کی وضاحت پر اعتماد طریقے سے اس طرح کرتے ہیں:

> ''نئی تحقیقات کے مطابق' سنسکرت' پالی' شورسینی' مہاراشٹری' مغربی اپ بھرنش ایک زبان کے متعدد ادبی روپ ہیں۔ یہ زبان مدھیہ دیش کے (وسط ملک) بالائی دوآبے میں بولی جاتی تھی جس سے نکھر کر یہ زبانیں بنیں۔اردو یا ہندوستانی 'اپ بھرنش کے اس روپ سے ماخوذ ہے جو گیارہویں صدی کے آغاز میں مدھیہ دیش میں رائج تھی۔''(ص111)

ڈاکٹر شوکت سبزواری کے ان خیالات میں بڑی حد تک سچائی ہے۔انہوں نے ان تمام زبانوں بالخصوص پراکرت اور اپ بھرنش کو سمیٹ لیا ہے جو بالائی دوآبے کی مختلف زبانوں کے ادبی روپ رہے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کھڑی یا ہندوستانی (اردو) بالائی دوآبے میں بولی جانے والی زبانوں کی فطری اور ترقی یافتہ صورت ہے۔اس طرح وہ پروفیسر مسعود حسین خاں کے نظریے سے قریب پہنچ جاتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. کن کن محققین نے اردو کا رشتہ پنجابی سے جوڑا ہے؟ نام بتائیے
2. شیرانی کا کیا نظریہ ہے؟
3. شیرانی کے نظریے پر کن ماہرین لسانیات نے اعتراض کیے ہیں؟
4. ڈاکٹر زور کی دو اہم کتابوں کے نام بتائیے۔
5. اردو کے آغاز کے تعلق سے ڈاکٹر زور کا کیا نظریہ ہے؟
6. شوکت سبزواری کے نظریے پر روشنی ڈالیے۔

2.6 پروفیسر مسعود حسین خاں کا نظریہ

پروفیسر مسعود حسین خاں اردو دنیا میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر زور کے بعد وہ پہلے محقق ہیں جنھوں نے اردو زبان اور اس کے آغاز کے بارے میں سائنٹفک نقطۂ نظر سے غور کیا۔ ان کی کتاب ''مقدمۂ تاریخ زبان اردو'' اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ یہ پروفیسر مسعود حسین خاں کا تحقیقی مقالہ ہے جو علی گڑھ یونیورسٹی میں Ph.D کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ اس کتاب کے اب تک اٹھ ایڈیشن منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن 1948ء میں شائع ہوا اور آٹھواں ایڈیشن 1986ء میں۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب میں اردو کے آغاز سے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے اس میں انھوں نے ہریانی پر زور دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''قدیم دکنی زبان کے مطالعے کے سلسلے میں اب تک ہریانی کو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہی زبان ہے جو قطع نظر شہر دہلی، ضلع دہلی میں آج بھی بولی جاتی ہے'' (ص 279)

اردوئے قدیم سے متعلق لسانی تحقیق کے سلسلے میں جو اہمیت ہریانی کو حاصل ہے اس کی طرف سب سے پہلے اشارہ پروفیسر ژول بلاک نے اپنے مضمون ''ہند آریائی لسانیات کے بعض مسائل'' میں کیا ہے۔ قدیم اردو (دکنی) کا پنجابی پن، ہریانی پن بھی ہے۔ لیکن دکنی کی یہ صوتیاتی اور تشکیلیاتی خصوصیات صرف ہریانی سے ہی مخصوص نہیں ہیں بلکہ جمنا پار کی کھڑی بولی کے علاقے میں بھی یہی خصوصیات مل جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں دونوں کے عناصر پائے جاتے ہیں لیکن چونکہ دہلی مدتوں صدر مقام رہا اس لیے اردو کا تعلق کھڑی بولی سے زیادہ ہے۔

''مقدمۂ تاریخ زبان اردو'' کے آٹھویں ایڈیشن میں پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنے نظریے پر نظر ثانی کر کے اسے قطعیت دے دی ہے۔ ان کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اردو برج، ہریانی اور کھڑی بولی سے مل کر بنی ہے۔ کتاب کا اختتام وہ اس طرح کرتے ہیں:

> ''زبانِ دہلی و پیرامنش'' اردو کا اصل منبع و سرچشمہ ہے اور ''حضرت دہلی'' اس کا حقیقی مولد و منشا''

''زبان دہلی و پیرامنش'' کی اصطلاحی روشنی مسعود صاحب کو حضرت امیر خسرو سے ملی ہے۔ امیر خسرو اپنی مثنوی ''نہ سپہر'' میں ہندوستان کی بارہ زبانوں کے نام گنوائے ہیں۔ ان میں سے ایک ''لاہوری'' اور دوسری ''زبان دہلی و پیرامنش'' ہے۔ زبان دہلی اور پیرامنش سے مراد زبان دہلوی اور اس کے نواح کی کھڑی بولی اور ہریانی کے ہیں۔ اسی پر مسعود صاحب کا نظریہ قائم ہے۔ مسعود صاحب کا کہنا ہے کہ اردو کا ڈھانچہ کھڑی بولی پر تیار ہوا ہے۔ جمنا پار کی ہریانوی اور کھڑی بولی، قدیم اردو/دکنی سے قریب تر ہے۔ جدید اردو اپنے صرف و نحو کے اعتبار سے مراد آباد اور رام پور کے اضلاع کی بولی سے قریب ہے۔ بعد میں برج بھاشا، اردو کا لب و لہجہ متعین کرنے میں اثر انداز ہوئی۔

کھڑی بولی کے دو روپ ہیں۔ ایک روپ وہ ہے جو دوآبۂ گنگ و جمن کے بالائی حصے یعنی سہارنپور، مظفر نگر اور میرٹھ میں رائج ہے۔ دوسرا روپ گنگا پار کے بجنور، رام پور اور مراد آباد کے اضلاع میں بولا جاتا ہے۔ ان اضلاع میں بولی جانے والی کھڑی کو مسعود صاحب اردو سے قریب ترین خیال کرتے ہیں۔ کھڑی اور دکنی کی صوتی و صرفی کئی مماثلتیں مسعود صاحب نے اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

1. دکنی اردو کی طرح کھڑی بولی کی یہ عام خصوصیت ہے کہ اس میں درمیانی (ہ) گرا دی جاتی ہے جیسے کاں (کہاں) کبی (کبھی)۔

2. کھڑی میں اکثر (ڑ) اور (ڑھ) پر ڈاور ڈھ کو ترجیح دیجاتی ہے جو دکنی کی بھی خصوصیت ہے اور پنجابی کی بھی۔ جیسے بوڑھا (بڈھا) گڑھا (گڈا)۔

3. دکنی اردو میں جمع کی علامت (اں) ہے کہیں کہیں (وں) سے بھی جمع بنائی جاتی ہے۔ (اں) کی جمع آج بھی میرٹھ' مظفر نگر اور سہارنپور کے اضلاع میں سنائی دیتی ہے جیسے دناں' کھیتاں' عورتاں وغیرہ۔

4. (نے) کا استعمال دکنی اردو کی طرح کھڑی میں بھی بے قاعدہ طور پر پایا جاتا ہے یعنی یہ فاعلی اور مفعولی دونوں حالتوں میں آتا ہے۔ ویسے دکنی میں نے کا استعمال کم کم ہی ہوتا ہے۔

5. ضمائر میں دکنی اردو کا (یو) آج بھی کھڑی کے علاقے میں مستعمل ہے۔

6. دکنی اردو کا (او) کھڑی میں (اوہ) کی شکل میں ملتا ہے۔

7. دکنی میں عام طور پر اضافی حالت میں میرا اور تیرا کی بجائے مج' منج اور تج استعمال ہوتا ہے۔ دلّی کے قدیم شعرا مثلاً حاتم کے یہاں اس کا استعمال ملتا ہے۔ موجودہ اردو اور دہلی کی بولیوں میں اب یہ متروک ہے۔

8. دکنی کے ضمائر میں سب سے قابل ذکر ''اپس'' ہے جو خود کے معنوں میں مستعمل ہے۔ اس کا تعلق بھی نواح دہلی کی بولیوں سے ہے۔

9 دکنی اردو کے اکثر افعال کی توجیہہ ہریانوی اور کھڑی کے افعال سے کی جاسکتی ہے۔ دکنی اور ادبی اردو میں افعال مثلاً جائے ہے' کھائے ہے' ماروں ہو' آوے' لاوے' کیجو' دیجو' ہووے گا نواح دہلی اور دہلی میں بلا تکلف استعمال کیے جاتے ہیں۔ قدیم اردو میں تو ان کا استعمال عام ہے۔

10. دہلی' نواح دہلی اور دکنی میں انفی آواز آج بھی سنائی دیتی ہے جیسے آنا سے آناں' کھانا سے کھاناں' چاول' چانول وغیرہ۔

11. دکنی زبان کے تقریباً تمام حروف نواح دہلی کی بولیوں میں قدیم زمانے سے رائج ہیں۔ ان میں سے کوں' سوں' سی' منے' لگ' دکنی میں عام طور پر مستعمل تھے۔ 'لگ' تو دہلی کے قدیم شعرا کے یہاں بھی کثرت سے آیا ہے۔

قدیم دکنی کے اکثر غیر مانوس' غریب الفاظ کی توجیہہ بھی مسعود صاحب نے نواح دہلی کی بولیوں سے کی ہے۔ مثلاً:

1. کدھیں (کبھی) اب تک (اب لگ) دہلی اور اس کے اطراف میں مستعمل ہے۔

2. اتاول (اتاولا = جلد باز) قدیم دکنی میں آتا ہے۔ دہلی کے محاورے میں اتاولا ہونا' جلد بازی کرنے کے معنی میں آج بھی رائج ہے۔

3. فکروند (فکرمند) ہریانی میں عام طور سے م (و) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ دلی میں بھی اسی طرح بولا جاتا ہے جیسے چلمن (چلون) دکنی میں آج بھی چلمن کو چلون ہی کہتے ہیں۔

4. 'وستاد' دکنی میں آج بھی ملتا ہے اور میرٹھ کی بولی میں یہ عام ہے۔

5. ''اُپجنا'' (اُگنا) خالص سنسکرت کا لفظ ہے جو دکنی میں ملتا ہے۔ دہلی کا ایک محاورہ ہے۔ بویا گیہوں' اپجا جو۔

6. پتیانا (یقین کرنا۔ بھروسہ کرنا) دکنی میں اب بھی ملتا ہے۔ دہلی کے محاورے میں عام ہے۔ ایک محاورہ ہے ''اندھا جب پتیائے جب دو آنکھیں پائے''

7. ناؤں اور ٹھاؤں (نام' جگہ) قدیم دکنی میں مستعمل ہے۔ دہلی کے دو محاورے غور طلب ہیں۔

1. چھٹے میں پاؤں دفتر میں ناؤں
2. ثابت قدم کو ہر جگہ ٹھاؤں

آگے چل کر ان مماثلتوں کے بارے میں مسعود صاحب لکھتے ہیں کہ مراہٹی زبان کے بعض لسانی اثرات کو چھوڑ کر دکنی اردو کے تمام غریب الفاظ کی توجیہہ نواح دہلی کی تین بولیوں (ہریانی' کھڑی اور برج) سے کی جاسکتی ہے۔ شمالی ہند میں زبان کے ارتقا کی رفتار سیاسی حالات کی وجہ سے تیز تر رہی۔ اس کے برخلاف دکن میں اجنبی بولیوں اور دراوڑی زبانوں کے ماحول میں لسانی ارتقا رک سا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی اردو میں الفاظ کی وہی شکلیں ملتی ہیں جو شمالی ہند میں آج سے چھ سو برس پہلے رائج تھیں۔ اس طرح یہ طے پاتا ہے کہ ہریانی نے قدیم اردو کی

تشکیل میں حصہ لیا۔ کھڑی بولی نے جدید اردو کا ڈول تیار کیا۔ برج بھاشا نے اردو کا معیاری لب ولہجہ متعین کرنے میں مدد دی' مسعود صاحب سے قبل' کسی نے ان زبانوں کا لسانیاتی تجزیہ نہیں کیا تھا۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے اردو زبان کے آغاز وارتقا میں ان زبانوں کے تعاون کا لسانیاتی اور سائنٹفک انداز میں تجزیہ کر کے مدلّل طور پر اپنا نظریہ پیش کیا کہ ''زبان دہلی وپیرامنش اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہے اور حضرت دہلی اس کا حقیقی مولد ومنشا' جو سراسر حقیقت پر مبنی ہے۔''

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اردو کے ارتقا کے تعلق سے پروفیسر مسعود حسین خاں کے نظریے کا خلاصہ پیش کیجیے۔
2. ''زبان دہلی وپیرامنش'' سے کیا مراد ہے؟
3. ''دکنی اردو میں الفاظ کی آج بھی وہی شکلیں ملتی ہیں جو شمالی ہند میں چھ سو برس پہلے رائج تھیں' ایسا کیوں ہوا ہے؟

2.7 خلاصہ

اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں کئی مباحث ونظریات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان نظریات کا سلسلہ میرامّن سے شروع ہوا۔ ابتدا میں جن لوگوں نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا ان کا تعلق لسانیات سے نہیں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اردو کے ممتاز شاعر' ادیب اور اہل قلم تھے۔ ان میں سے بعض کی رائے تھی کہ اردو مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ بعض اصحاب نے اردو کو جغرافیائی اور علاقائی حدود میں دیکھنے کی کوشش کی۔ سلیمان ندوی نے اردو کا سلسلہ سندھ سے ملایا۔ پروفیسر محمود شیرانی کا نظریہ کہ ''اردو پنجاب سے نکلی'' ایک عرصہ تک موضوع بحث رہا۔ مدلّل طور پر حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر زور کے نظریات اس صدی کے نصف اول میں سامنے آئے۔ ڈاکٹر زور نے اردو پر کھڑی اور ہریانی کے اثرات کا ذکر کیا۔ محمد حسین آزاد نے برج پر زور دیا۔ پروفیسر ژول بلاک نے بھی اردو پر ہریانی کے اثرات کی نشاندہی کی۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے صرف ہریانی کی اہمیت پر زور دیا اور نواح دہلی کی دیگر بولیوں کو نظر انداز کر دیا۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے مدلل اور تجزیاتی انداز میں یہ ثابت کیا کہ اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ زبان دہلی اور پیرامنش ہے اور حضرت دہلی اس کا حقیقی مولد ومنشا۔ تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی لیکن ابھی تک اس نظریے کی کوئی تردید نہیں ہوئی۔

2.8 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. ''اردو برج بھاشا سے نکلی'' یہ کس کا نظریہ ہے اور کن دلائل پر مبنی ہے؟ تفصیل سے لکھیے۔
2. محمد حسین آزاد کے نظریے کی تردید کن ماہرین لسانیات نے کن وجوہات کی بنا پر کی ہے؟ بیان کیجیے۔
3. ''کیا اردو پنجابی سے نکلی ہے''؟ اپنے خیالات کا اظہار دلائل کے ساتھ کیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. اردو کے آغاز وارتقا کے تعلق سے ان لوگوں کے نظریات کا جائزہ لیجیے جنہوں نے اردو کو مختلف زبانوں کے میل جول کا نتیجہ بتایا ہے۔
2. اردو کے مولد کے تعلق سے سلیمان ندوی کے نظریے پر روشنی ڈالیے۔
3. سلیمان ندوی کے نظریے کی تردید کن ماہرین نے کی اس کی کیا وجوہات ہیں؟ مدلّل لکھیے۔

2.9 فرہنگ

الفاظ	= معنی	الفاظ	= معنی	الفاظ	معنی
ہیولیٰ	= ڈھانچہ' خاکہ	وثوق سے	= یقین سے' اعتماد سے	آرا	= رائے کی جمع' مشورہ

تردید کرنا = رد کرنا، اعتراض کرنا، نامنظور کرنا تنسیخ = منسوخ کرنا دلائل = دلیل کی جمع، ثبوت، شہادت

بول بالا ہونا = (محاورہ) شہرت ہونا، چرچا ہونا

مراتب بلند ہونا تِل تِل = لمحہ لمحہ اخذ کرنا = لے لینا۔ اختیار کرنا

متعین کرنا = تعین کرنا، مقرر کرنا غریب الفاظ = نامانوس الفاظ

2.10 سفارش کردہ کتابیں

1. زور، محی الدین قادری، ڈاکٹر ہندوستانی لسانیات
2. مسعود حسین خاں، ڈاکٹر، پروفیسر مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو (آٹھویں ایڈیشن)
3. شیرانی، حافظ محمود، پروفیسر پنجاب میں اردو
4. شوکت سبزواری، ڈاکٹر داستان زبان اردو
5. شوکت سبزواری، ڈاکٹر اردو زبان کا ارتقا
6. شوکت سبزواری، ڈاکٹر اردو لسانیات

اکائی : 3 اردو زبان کا ارتقا : پایۂ تخت کی تبدیلی کے اثرات

ساخت

3.1 تمہید

3.2 پس منظر

3.2.1 فتح گجرات

3.2.2 علاء الدین خلجی اور دکن

3.2.3 انتظام سلطنت

3.2.4 معاشرتی میل جول

3.2.5 پایۂ تخت کی تبدیلی

3.2.6 پایہ تخت کی پھر تبدیلی

3.3 پایۂ تخت کی تبدیلی کے اثرات

3.3.1 لسانی تبدیلیاں

3.4 خلاصہ

3.5 نمونۂ امتحانی سوالات

3.6 فرہنگ

3.7 سفارش کردہ کتابیں

3.1 تمہید

گزشتہ اکائی میں ہم نے آپ کو اردو زبان کے آغاز کے بارے میں مختلف اصحاب کے ذریعے دیئے گئے نظریوں سے روشناس کرایا ہے۔

اس اکائی میں ہم محمد تغلق کے پایۂ تخت کی تبدیلی کے باعث' اردو زبان کے ارتقا پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیں گے۔ آپ اس کے پس منظر سے بھی واقفیت حاصل کریں گے۔ علاء الدین خلجی کی فتحِ گجرات' اس کے انتظام سلطنت اور اس کے نتیجے میں ہونے والے معاشرتی میل جول پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔ محمد تغلق کے پایۂ تخت کی تبدیلی کے اسباب ومحرکات سے قطع نظر یہ بات بھی اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے کہ وہ ایک بار پھر دہلی کو اپنا پایۂ تخت قرار دیتا ہے۔ اس کے ردِّ عمل کے طور پر واقع ہونے والی لسانی تبدیلیاں بھی ہمارا موضوع ہیں۔ ہم نے اس اکائی کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے۔

امتحانی سوالات بطور نمونہ درج کیے گئے ہیں۔ فرہنگ کے تحت نئے الفاظ کے معنی بھی دیئے گئے ہیں اور آپ کے مطالعے کے لیے سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ توقع ہے کہ آپ ان سب سے استفادہ کریں گے۔

3.2 پس منظر

پایۂ تخت کی تبدیلی تو 1327ء میں عمل میں آتی ہے لیکن اس سے قبل ہی شمالی اور جنوبی ہندوستان کے مابین معاشرتی تہذیبی اور لسانی

لین دین کا آغاز ہو چکا تھا۔ سیاست بھی ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہی تھی اور معیشت کے اثرات بھی مرتب ہو رہے تھے اور یہ سلسلہ بہت پہلے سے چلا آ رہا تھا۔ محمد بن قاسم کے سندھ پر حملوں سے کہا جاسکتا ہے کہ اس کی ابتدا ہو چکی تھی۔ محمد بن قاسم کے حملوں کے اثرات ممکن ہے اتنے دیرپا نہیں ہوتے لیکن محمود غزنوی کے حملوں اور بعد ازاں سندھ و ملتان سے پنجاب و نواحِ دہلی تک غزنوی حکومت کے باعث ایک دوسرے کو متاثر کرنے اور ایک دوسرے سے متاثر ہونے کا عمل نسبتاً تیز تر ہو گیا۔ خصوصیت کے ساتھ لسانی طور پر مِلا جُلا ایک ہیولیٰ تیار ہونے لگا۔

3.2.1 فتحِ گجرات

غزنویوں کے بعد علاء الدین خلجی نے گجرات و دکن کا رخ کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں شمال سے جنوب کا راستہ بہ راہ گجرات ہی تھا اور دکن تک رسائی حاصل کرنے اور دکن اور نواحِ دکن پر انتظامی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے گجرات کو زیرِ اقتدار رکھنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ علاء الدین خلجی نے 1297ء میں گجرات کو فتح کیا جو ایک صدی کے لگ بھگ دہلی کے زیرِ نگیں رہا۔ گجرات اور دہلی کے ایک دوسرے پر لسانی، تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی اثرات مرتب ہوتے رہے جن میں لسانی اثرات کی نشان دہی گجراتی زبان اور خاص طور پر گجراتی اردو سے ہوتی ہے۔ تہذیبی طور پر بھی ان دونوں علاقوں نے ایک دوسرے سے لیا دیا بھی بہت کچھ۔ ان دونوں علاقوں میں قربت کا یہ لازمی نتیجہ تھا۔

3.2.2 علاء الدین خلجی اور دکن

فتحِ گجرات کو دس بارہ سال ہی گزرے ہوں گے کہ علاء الدین خلجی نے اپنے ایک فوجی جنرل کو بھاری کمک کے ساتھ تسخیرِ دکن کے لیے روانہ کیا۔ دکن کی سلطنتیں اس وقت نہ تو طاقتور تھیں اور نہ متحد۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ خلجی افواج نے 1310ء میں دکن اور مالوے کے سارے علاقوں پر کامیاب فوج کشی کی اور انہیں قلمروئے دہلی میں شامل کر لیا اور یہ سلسلہ علاء الدین خلجی کی وفات یعنی 1316ء تک جاری رہا۔ یہ دکن پر دہلی کی بہت بڑی فتح تھی جس کی صرف جغرافیائی اور سیاسی ہی نہیں، تہذیبی، لسانی اور معاشی اہمیت بھی تھی جس کے اثرات دیر اور دور تک رہے۔ خاص طور پر اردو کے زاویے سے لسانی اثرات نے ان علاقوں کی تہذیبی اور ادبی تاریخ کو بدل دیا۔

3.2.3 انتظامِ سلطنت

دکن فتح کر لینا آسان رہا لیکن دکن پر انتظامی گرفت برقرار رکھنا اتنا آسان نہیں تھا۔ گجرات کی بات اور تھی کہ گجرات دہلی سے بہت قریب تھا اور اس زمانے کے اعتبار سے بھی، سہولتیں تھیں لیکن دکن تک رسائی جغرافیائی حالات، طویل فاصلوں اور موسموں کی وجہ سے خاصی دشوار تھی۔ چنانچہ انتظامِ سلطنت کو مضبوط و موثر بنانے اور دکن پر اپنی گرفت برقرار رکھنے کے لیے علاء الدین خلجی کو کافی تبدیلیاں لانی پڑیں۔ یہ تبدیلیاں ہر چند کہ انتظامی اور قطعی انتظامی نوعیت کی تھیں لیکن اس کے اثرات لسانی نقطۂ نظر سے بھی دوررس اور گہرے مرتب ہوئے۔ علاء الدین خلجی نے دکن اور مالوہ کے جن علاقوں کو فتح کیا تھا ان کے انتظامات کے لیے جملہ علاقے کو سو (100) سو (100) مواضعات میں تقسیم کر کے ہر ایک کو ایک اکائی قرار دیا اور اس اکائی پر اپنے ایک عہدے دار کو مقرر کر دیا جو زیادہ تر ترک ہوتے تھے۔ ان کو امیر صدہ سے موسوم کیا گیا۔ یہ عہدے دار صرف انتظامی امور کے ذمے دار تھے۔ مال گزاری وصول کرنا، علاقے میں امن قائم رکھنا اور دہلی کی حکومت کی فوجی اور مالی ضروریات کی تکمیل کرنا۔ ان عہدے داروں کی تعیناتی کی وجہ سے ہوا یہ کہ کئی ترک عہدے داروں نے اپنے متعلقین کے ساتھ دکن، مالوہ اور گجرات میں سکونت اختیار کر لی۔ شروع شروع میں ممکن ہے ان عہدے داروں اور ان کے اہلِ خاندان کو اجنبیت کا احساس رہا ہو، لسانی اور تہذیبی طور پر انہوں نے یہاں ہم آہنگی محسوس نہ کی ہو لیکن جب یہاں رہنا ہی پڑا تو ظاہر ہے انہوں نے خواہی نخواہی خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیا ہوگا۔ کچھ خود بھی بدلے ہوں گے اور کچھ حالات کو بھی بدلا ہوگا اور رفتہ رفتہ ان کا اصل وطن ان کی یادوں کا حصہ رہ گیا ہوگا اور وہ بتدریج ان علاقوں میں رہ بس گئے ہوں گے اور انہیں کو اپنا وطن قرار دے لیا ہوگا۔ خاص طور پر ان کی آنے والی نسلوں کے لیے یہاں نہ کوئی اجنبیت رہی اور نہ کوئی غیریت۔ وہ گجراتی اور دکنی ہو گئے۔ زبان، معاشرت، رہن سہن، طور طریقوں اور عادات و اطوار سب زاویوں سے بدل

گئے یہ سلسلہ اور چلتا ہے جب 1322ء میں علاء الدین خلجی کے جنرل ملک کافور نے ورنگل پر بھی اپنا تسلّط جما لیا' جو تلگو علاقے میں واقع ہے اور بڑھتے بڑھتے اس کی افواج نے مدورائی' تنجور اور جنوبی ہند کے سواحل تک رسائی حاصل کر لی جو تمل علاقے میں ہیں۔ انتظام سلطنت اگرچہ اتنا مضبوط اور قوی نہ رہا ہو لیکن تہذیبی اور لسانی اثرات ایک دوسرے پر پڑتے رہے۔ آج بھی آندھرا پردیش' کرناٹک اور تمل ناڈو کے کئی خاندان ایسے ہیں جو ہر چند کہ تہذیبی اور لسانی طور پر قطعی دکنی اور دراوڑی ہیں لیکن خود کو شمالی ہند سے وابستہ کرتے ہوئے اپنا تشخص چاہتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر دکنی بولتے اور کئی دکنی ہی نہیں کنڑی اور تمل بولتے ہیں لیکن ان کی زبان پر شمالی ہند کی زبانوں پنجابی' ہریانی' اودھی اور برج بلکہ عربی اور اس سے زیادہ فارسی کے اثرات آسانی سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس دور میں علاء الدین خلجی اور ملک کافور کے ساتھ آئی ہوئی افواج دہلی سے دکن تک متعینہ امیرانِ صد اور ان کے سیکڑوں کارندے یہیں کے ہو کر رہ گئے بلکہ ان پر دو' تین صدیاں گزر گئیں اور ان کی نسلیں یہاں زندگی بسر کرتے ہوئے یہیں کی مٹی کا پیوند بھی ہو گئیں۔

3.2.4 معاشرتی میل جول

ظاہر ہے ان فوجیوں اور انتظامی امور کے سربراہوں اور کارندوں میں سب ایسے نہیں ہوں گے جنہیں عربی فارسی کا عالم و فاضل قرار دیا جائے جو شستہ و شائستہ زبان بولتے ہوں۔ ان میں سے کئی تو عام سطح کے اور عام محفلوں اور بازار کی زبان بولنے والے رہے ہوں گے۔ انہیں اپنی زبان پر قدرت حاصل رہی ہوگی۔ لیکن انہیں یہاں کے لوگوں سے بازاروں میں اور عام محفلوں وغیرہ میں ملنا ہوتا ہوگا' ان میں سے کئی یہاں کی خاک کا پیوند بھی ہو گئے ہوں گے اور کئی نے یہاں شادی بیاہ کے ذریعے تعلقات اور رشتہ داریاں بھی قائم کی ہوں گی اور یہاں کی سماجی زندگی سے بھی ان کا گہرا اور مضبوط ربط ہو گیا ہوگا بلکہ دکن ہی ان کا وطن بن گیا ہوگا۔ مافی الضمیر کے اظہار کے لیے ان کی زبان خواہ تُرکی ہو یا فارسی کیا کام آتی اور یہاں کی زبان وہ کیسے بول پاتے چنانچہ دھیرے دھیرے اور محدود پیمانے پر سہی الفاظ کا لین دین ہونا لازمی ہے۔ کئی اصوات ایسی ہوں گی جو ادا نہیں کر پاتے رہے ہوں گے اس لیے کئی الفاظ کا تلفظ بدلتا گیا ہوگا اور بدلے بلکہ بگڑے ہوئے تلفظ کے بارے میں آج ہم جو منفی رائے رکھتے ہیں اس دور کے پس منظر میں جائزہ لیں تو یہ قدرے غنیمت ہے۔ یہ بدلا ہوا تلفظ دراصل لسانی سمجھوتہ تھا جو ناگزیر تھا اس لیے شمالی ہند سے آئے عام افراد اور سپاہیوں نے یہاں کی مقامی زبانوں کے کئی الفاظ اپنا لیے ہوں گے اور کئی الفاظ انہوں نے یہاں کی زبانوں کو دیئے بھی ہوں گے۔ آج بھی ہم سب واقف ہیں کہ تلگو اور کنڑی میں خاص طور پر اور تمل اور ملیالم میں نسبتاً کم ترکی اور فارسی کے الفاظ ملتے ہیں جن کا تلفظ اور ادائیگی بدل چکی ہو یہ اور بات ہے۔ اسی طرح پر دونوں زبانوں کی قواعد پر بھی اثر پڑا۔ قواعد ایسی چیز نہیں جو آسانی سے متاثر ہو۔ جب دو زبانوں میں میل جول ہوتا ہے اور ہم دوسری زبان میں اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں تو قواعد پر بہت کچھ بیت جاتی ہے۔ علاء الدین خلجی کے حملوں اور اس کے اپنے ڈھنگ کے انتظام سلطنت سے اور جو بھی ہوا ہو لیکن ایک چیز واضح ہے وہ یہ کہ جنوبی ہند کی زبانوں سے ترکی اور فارسی کا لین دین بڑھ گیا اور دکنی کے لیے فضائیں سازگار اور راہیں استوار ہوئیں۔

3.2.5 پایۂ تخت کی تبدیلی

محمد تغلق نے جب سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی تو اس نے انتظامی امور کو بڑی حد تک حسبِ سابق رکھا۔ زبانوں کے مابین لین دین بھی جاری رہا لیکن جو غیر معمولی واقعہ پیش آیا وہ پایۂ تخت کی تبدیلی ہے۔ محمد تغلق کے بارے میں کہنے والے بہت کچھ کہتے ہیں۔ منفی بھی مثبت بھی' اچھا بھی' برا بھی' لیکن مورخین اس کی فہم و فراست' دانائی و دانش مندی' دور اندیشی اور احتیاط پسندی کے لیے بھی رطب اللساں ہیں۔ اس نے بلاشبہہ کئی پہلوؤں پر غور کیا ہوگا۔ سلطنت دہلی کے بڑھتے ہوئے حدود کے باعث' چوں کہ دہلی اب ملک کے وسط میں نہیں رہی تھی اس لیے رسد و رسائل اور پیغام رسانی کی موجودہ سہولتیں ہوتیں تو اور بات تھی لیکن ان دنوں دہلی سے دکن کے علاقوں کو سپاہ اور رسد کی روانگی اور پیغامات اور احکامات کی ترسیل کارے دارد تھی۔ چنانچہ ان زاویوں ہی سے غور کر کے محمد تغلق نے غالباً دکن' مالوہ بلکہ گجرات پر بھی بہتر طریقے پر

کنٹرول کرنے کے لئے پایۂ تخت کی تبدیلی کا حکم دیا ہوگا۔ یہ 1327ء کی بات ہے ۔محمد تغلق نے فرمان جاری کیا کہ شہر دہلی کی کُل آبادی دولت آباد ہجرت کرے۔ مورخین ہجرت کے سلسلے میں اس کو تاریخ کا سب سے بڑا اور حیرت انگیز واقعہ قرار دیتے ہیں ۔کہا جاتا ہے' لگتا تھا کہ دہلی ویران ہوگئی۔صرف افواج' حکومت اور محکموں میں کام کرنے والے ہی نہیں' تاجر پیشہ' ہنرمند' پیشہ ور' فنکار' کاری گر' علما' ادبا اور شعرا سب کے لیے یہ حکم تھا اور پوری سختی کے ساتھ ۔اور وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کرنی نہیں چاہی انہیں ہجرت کے لیے مجبور کیا گیا۔ غرض کہ دہلی خالی ہوگئی ۔ دولت آباد میں ہر طرح' ہر مزاج اور ہر مذاق کے لوگ آئے' بسے اور یہاں ایک نئی دہلی آباد ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ ہر روز بے اندازہ پالکیوں میں لوگ دولت آباد آیا کرتے تھے ۔علاء الدین خلجی کے حملوں کے وقت ہی سے دکنی کی ترویج و ارتقا کے لیے ماحول تیار تھا۔ حالات بہتر تھے ۔محمد تغلق کے پایۂ تخت کی تبدیلی کی وجہ سے یہ پیش رفت بہت تیز ہوئی۔ بقول پروفیسر مسعود حسین خاں :

> ''ہر چند سیاسی سطح پر یہ تجربہ دیوانگی کے مترادف رہا لیکن اس کے ادبی و لسانی نتائج بہت دور رس ثابت ہوئے اور خسرو کی ''زبانِ دہلی'' دکن کے دور دراز علاقوں میں فاتحین اور رابطے کی زبان کی حیثیت سے پھیل گئی ۔''

قبل ازیں آئے ہوئے لوگ دکنی سے واقف ہو چکے تھے اور نئے دیس میں دکنی ہی ان کے اظہار خیال کا ذریعہ تھی۔ تاریخ کا یہ اصول ہے کہ فاتح اقوام ممالک اور علاقے فتح ضرور کر لیتی ہیں لیکن مفتوح ممالک تہذیبی' تمدنی اور ثقافتی طور پر غالب رہتے ہیں۔عربوں نے ایران کو فتح کیا' ایرانی تہذیب کو فتح نہیں کر سکے ۔ جب کہ ایرانی 'تہذیب عرب تہذیب پر غالب آ گئی ۔تہذیبی یلغار کو زیادہ مدت تک روکا نہیں جاسکتا۔ یہاں بھی یہی ہوا' شمالی ہند سے آنے والوں نے دکن پر سیاسی اور انتظامی فتح تو پالی لیکن لسانی اور تہذیبی سطح پر انہیں دکن کا باج گزار رہنا پڑا۔ یہاں کی زبان سیکھنی اور یہاں کے لباس اور غذاؤں کو استعمال کرنا پڑا۔ اور بتدریج وہ ان کے عادی ہوگئے ۔ یوں بھی لباس اور غذاؤں کا انحصار موسموں اور آب و ہوا پر ہوتا ہے اور زبان کے معاملہ میں تو بڑے گروہ کی زبان کو اختیار کیے بغیر کوئی صورت نہیں ہوتی۔ آگے چل کر تو اور محرکات بھی کام کرتے ہیں ۔جب دکن میں خودمختار سلطنتیں' بہمنی سلطنت اور بعد ازاں قطب شاہی' عادل شاہی' احمد شاہی' برید شاہی اور نظام شاہی سلطنتیں قائم ہوئیں تو انہوں نے شمال کے خلاف اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے شمالی ہند کی زبانوں سے رشتہ توڑ کر جنوبی ہند کی زبانوں خاص کر دکنی کو اپنایا۔ اسی میں اظہارِ خیال کیا ۔اسی کو دربار میں جگہ دی۔ دکنی شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کی کہ اس کو سرکاری حیثیت حاصل ہوگئی ۔ دوسرے یہ کہ یہاں عوام سے تعلقات رکھنے اور انتظامِ سلطنت کو چلانے کے لیے بھی انہیں دکنی کی ضرورت تھی ۔ لہٰذا دکنی کے پھلنے پھولنے کے مواقع اور روشن ہوگئے ۔

3.2.6 پایۂ تخت کی پھر تبدیلی

محمد تغلق کے پایۂ تخت نے دکن کی فضاؤں میں نئی لہریں دوڑا دیں لیکن محمد تغلق کے جی میں پھر نہ جانے کیا آیا کہ اس نے' دو سال بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ 1329 میں دہلی کو دوبارہ پایۂ تخت بنانے کا حکم دیا اور ایک مرتبہ پھر آبادی نے اپنے متعلقین اور مال و متاع کے ساتھ دہلی کو نقلِ مقام کیا۔

لیکن یہ ناممکن تھا کہ پوری آبادی اس حکم کی تعمیل میں نقل مقام کرتی ۔کئی لوگوں نے بیزاری کے سبب بھی یہاں رہ جانا گوارا کیا ہوگا۔ کئی لوگ بیمار رہے ہوں گے جن کے لیے واپس ہونا ناممکن ہوا ہوگا۔ جن لوگوں نے اپنے کاروبار قائم کیے ہوں گے ان کے لیے بھی واپسی مشکل ہوئی ہوگی۔ شادی بیاہ کے باعث بھی کئی خاندانوں کو یہاں رہنے پر مجبور ہونا پڑا ہوگا۔ اور کئی ایک جو مقامی نظم ونسق سے وابستہ تھے ان کے لیے رہنے کی مجبوری تھی ہی۔ یہ ساری پیش رفت عوام کے لیے پریشان کن رہی ہو لیکن دکنی کے حق میں اس کے اچھے نتائج نکلے۔ یہاں فارسی وغیرہ کا چلن بھی ہوا ہوگا لیکن دکنی کو نظم ونسق اور شعر و ادب میں نکھرنے سنورنے کے مواقع ملے۔عربی' فارسی اور ترکی بولنے والوں کو یہاں دولت آباد اور اس کے نواح میں مرہٹی سے جو ہند۔آریائی خاندان کی زبان ہے سامنا ہوا۔ اس کے اثرات تو کچھ زیادہ ہی مرتب ہوئے

اور پھر جنوب کی زبانوں تلگو، کنڑ اور تمل کے تھوڑے بہت اثرات قبول کرنے پڑے ہوں گے جو دراوڑی خاندان کی زبانیں ہیں۔ اس طرح دو مختلف الخاندان زبانوں کے میل ملاپ اور ان کے لین دین سے ایک نیا لسانی منظر نامہ سامنے آیا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. فتح گجرات کے بارے میں لکھیے۔
2. امیرانِ صدہ سے کیا مراد ہے؟
3. دہلی سے دولت آباد کو پایۂ تخت کی تبدیلی کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟

3.3 پایۂ تخت کی تبدیلی کے اثرات

یہ لسانی منظر نامہ ارادتاً یا کسی تحریک یا کوشش کے باعث ترتیب نہیں پایا تھا بلکہ لسانیات کا اصول ہے کہ جب دو زبانیں آپس میں ملتی ہیں تو الفاظ کا لین دین، تلفظ اور اصوات میں تبدیلی ناگزیر ہے بلکہ کہیں کہیں تو املا میں بھی فرق آجاتا ہے۔ علاء الدین خلجی کے حملوں اور محمد تغلق کے پایۂ تخت کی تبدیلی سے جو صورت حال بدلی اور اس کے لسانی اثرات جو یہاں پر مرتب ہوئے اور الفاظ وغیرہ کی جو صورتیں ہمارے سامنے آئیں وہی ہماری دلچسپی کا باعث ہیں۔ زبان کا ارتقا ہوتو رہا تھا لیکن کچھ اور نہج پر۔ یہ نہج کسی حد تک شمالی ہند کی زبانوں پنجابی، ہریانی اور برج کی طرح بھی ہے اور کسی حد تک ان سے مختلف بھی لیکن ان سے بہر کیف معاشرتی اور لسانی تبدیلیاں اور تغیرات ضرور رونما ہوئے جن کی اپنی اہمیت ہے۔ خاص طور پر پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی گراں قدر کتاب ''مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو'' میں ان سے گہرائی کے ساتھ اور تفصیلی بحث کی ہے جس سے یہاں اس اکائی میں بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

3.3.1 لسانی تبدیلیاں

دکن میں لسانی تبدیلیوں کے نتیجے میں جو چند باتیں نمایاں ہیں ان میں جمع بنانے کا قاعدہ ہے۔ ہر چند کہ فارسی اور پنجابی میں بھی ''اں'' کے اضافے سے جمع بنانے کا قاعدہ ہے لیکن دکنی میں یہ قاعدہ ہریانی کے اثر سے آیا ہے جیسے ہاتھ سے ہاتھاں، آم سے آماں، باغ سے باغاں، عورت سے عورتاں، مرد سے مرداں اور بات سے باتاں وغیرہ۔

اس طرح علامتِ فاعل ''نے'' کا عدم استعمال ہے۔ ''نے'' کا استعمال قدیم دکنی میں کہیں نہیں ملتا۔ اسی طرح یہ بات بھی صحیح ہے کہ اپ بھرنش میں اور اس کے بعد ہریانی، پنجابی اور بھوج پوری وغیرہ میں بھی ''نے'' کا عدم استعمال عام ہے۔ مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' میں بھی ''نے'' کا استعمال قطعی نہیں۔ شمالی ہند کے اور علاقوں اور وہاں کی اور زبانوں میں بھی ''نے'' کا عدم استعمال عام ہے۔ اس سلسلے میں میر کے اس شعر کا حوالہ عام طور پر دیا جاتا ہے :

گُل کو محبوب میں قیاس کیا　　فرق نکلا بہت جو باس کیا

میر کے یہاں ایسے اور اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ شمالی ہند میں بعد ازاں ''نے'' کے استعمال پر توجہ دی گئی لیکن دکنی میں آج بھی ''بچہ لڈو کھایا'، میں روٹی پکایا' اور 'میں سنا' جیسے فقرے عام ہیں۔ اردو میں ''نے'' کے استعمال کے چند قاعدے ہیں لیکن دکنی میں ایسی کوئی تخصیص نہیں۔

دکنی کا ایک اور امتیاز حرفِ قید، حرفِ تاکید یا حرفِ تاکیدی ''نچ'' کا استعمال ہے۔ یہ معیاری اردو کے ''ہی'' کی متبادل صورت ہے جس کا استعمال فعل، اسم، ضمیر اور صفت کے ساتھ لگا کر ''ہی'' کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے جیسے ''موہن انچ بولا'' ''آپچ آؤ'' مدراسچ جاؤں گا'' وغیرہ۔ یہاں بھی دیکھا جائے تو حرفِ تاکیدی ''نچ'' کا استعمال دکنی میں ایک ہند۔آریائی زبان مرہٹی کا مرہونِ منت ہے۔ یہی حال لفظ ''نکو''

(نہیں کے معنی میں) کا بھی ہے جو دکنی پر مرہٹی کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

مرہٹی کے دکنی اور اردو پر اثرات لازمی تھے کہ تبدیل شدہ پایۂ تخت دولت آباد خالص مرہٹی کے علاقے میں واقع ہے۔

دکنی میں تخفیفِ مصوتہ یعنی بڑے مصوتوں کی چھوٹے مصوتوں میں تبدیلی کا رجحان عام ہے جیسے ''آ'' کو ''اَ'' میں اور ''اُو'' کو 'او' میں بدل دیا جاتا ہے۔ آسمان کو اسمان' ہاتھی کو ہتھی' پھول کو پھُل اور سورج کو سُرج کہنے کا رواج عام ہے۔ اس کی ایک الٹی صورت بھی ہے یعنی چھوٹے مصوتوں کو طویل مصوتوں میں تبدیل کر دینا جیسے اَ' آ میں اور ''اُو'' او میں وغیرہ مثلاً اپنا' 'آپنا' ہوگیا۔ بندر' باندر ہوگیا' لہو' لوہو ہوگیا وغیرہ۔

نونِ غنہ (ں) کا زائد استعمال بھی دکنی میں عام ہے۔ یہ بھی برج بھاشا' بندیلی اور ہریانی کا اثر ہے جو دکنی میں عام ہے۔ عیسوی خاں کے ''قصۂ مہر افروز و دلبر'' میں نونِ غنہ کی بعض صورتیں کئی جگہوں پر استعمال کی گئی ہیں جیسے 'صبح' کو صبوں' باسٹھ کو بانسٹھ' دہی کو دہیں' وغیرہ نونِ غنہ کے استعمال کی اچھی مثالیں ہیں۔ اس خصوص میں سوچ کو سونچ اور 'کوچہ' کو 'کونچہ' آج بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

اسی طرح دو کوزی آوازیں (ٹ' ڈ وغیرہ) جب قریب قریب استعمال ہوتی ہیں تو عموماً پہلی آواز دندانی بن جاتی ہے جیسے ٹوٹنا' تو ٹنا میں تبدیل ہوجاتا ہے اور ڈھونڈنا کی دھونڈنا میں تبدیلی عمل میں آتی ہے۔ یہ تبدیلی شمالی ہند کی زبانوں کے مقابلے میں دراوڑی زبانوں میں کنڑی کا اثر بتائی جاتی ہے جس کو دکنی نے بھی قبول کیا۔

سیاسی تبدیلیوں اور نظم ونسق میں اونچ نیچ کے باوجود اردو کا ارتقا ہوتا رہا اور خواہی نخواہی بہت سی چیزوں کو قبول کرنا پڑا۔ اردو کی ترقی کی رفتار تیز یا سست رہی ہو لیکن رکی نہیں اور کبھی جمود کا شکار نہیں ہوئی۔ مذکورہ بالا اثرات کے علاوہ اور بھی کئی عناصر موثر ثابت ہوئے۔ دکنی اردو پر ایک اور اثر یہ ہوا کہ بعض الفاظ میں دو حرفوں کو پیچھے اور پچھلے حرفوں کو آگے کر دیا گیا۔ گویا لفظ میں حروف تو وہی رہے لیکن ان کی ترتیب بدل گئی جیسے کیچڑ کو' چیکڑ اور پتھر کو پھتر بنادیا گیا۔ تلفظ کی یہ تبدیلی بھی لائقِ توجہ ہے۔ بلا شبہ یہ بھی شمالی ہند سے آئی زبانوں کے اثرات ہیں۔ میواتی' بھوجپوری اور گجری میں لفظ کو رواں بنانے کے لیے یہ تبدیلی ایک عام رجحان ہے۔ اسی طرح ق اور خ کی تقلیبِ صوت کا معاملہ بھی ہے۔ دکنی میں عام طور پر ق کا تلفظ خ کی طرح ادا کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ اس کو ترشی (املی وغیرہ) کے استعمال کا اثر بتاتے ہیں۔ ممکن ہے یہ عنصر بھی کارفرما ہو۔ پھر بھی بات یہ ہے کہ ق عربی حرف ہے۔ اس کی ادائیگی ہند۔آریائی زبان والوں کے لیے ہمیشہ دشوار رہی ہے۔ اہلِ پنجاب بھی ''ق'' کی جگہ ''ک'' کی صوت ادا کرتے ہیں۔ ''ق'' کو ''ک'' کی بجائے ''ق'' کی طرح ادا کرنے کے لیے خاصی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب اس طرف توجہ دی جارہی ہے۔

دکنی اردو میں علامتِ مستقبل گا' گی' گے کے ساتھ 'سی' بھی ہے اور جمع کی صورت میں گیاں بھی۔ یہ بھی شمالی ہند کی زبانوں کا اثر ہے جیسے راجستھانی کی بعض بولیوں میں 'سی' کا استعمال علامتِ مستقبل کے طور پر کیا جاتا ہے۔

آخر میں مرکب الفاظ بنانے کے سلسلے میں دکنی میں ''ہار'' کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ جیسے پھول بیچنے والے کے لیے پھلہار اور پانی بھرنے والے کے لئے پنہار وغیرہ یہ تو چند ایک مثالیں تھیں۔ اگر اردو کے ارتقا کے سلسلے میں دکنی میں اردو کی صورتِ حال پر نظر رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسے کئی الفاظ' ان کا املا' ان کا تلفظ' تراکیب مرکبات اور قواعد کے طور طریقے ہیں جو پایۂ تخت کی تبدیلی اور اس کے بعد دکنی اور اردو پر اثر انداز ہوئے۔ اردو کے ماہرین لسانیات اور ہماری زبان کے محققین کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا۔ پروفیسر سید محی الدین قادری زور' پروفیسر عبدالقادر سروری' پروفیسر مسعود حسین خاں' ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی' ڈاکٹر سدیشور دیال ورما اور بعض ماہرین لسانیات نے اس سمت توجہ دیتے ہوئے دکنی پر اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ ایک نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ یہ اثرات محمد بن تغلق کے پایۂ تخت کی تبدیلی کے باعث اردو کے ارتقا پر مرتب پائے' لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئیے کہ اگر محمد تغلق حکمرانِ دہلی نہ ہوتا یا وہ حکمرانِ دہلی تو ہوتا لیکن پایۂ تخت دہلی سے دولت آباد تبدیل نہ کرتا یا اگر پایۂ تخت تبدیل بھی کرتا تو کسی اور مقام پر ۔۔۔۔ تو یہ تبدیلیاں وقوع پذیر نہ ہوتیں۔ ایسا نہیں' قطعی ایسا نہیں ہے۔ اگر یہ سب کچھ نہیں ہوتا اور ان کی بجائے کچھ اور بھی ہوتا تو لسانی تبدیلیوں کا عمل برابر جاری رہتا۔ یہ تبدیلیاں اس نوعیت اور اس طرح

کی نہیں ہوتیں لیکن تبدیلیاں ضرور ہوتیں کہ زبانیں زندہ اکائیاں ہوتی ہیں ۔ زمانے کے سرد و گرم، خوب و خراب، نشیب و فراز اور دیگر عوامل اور محرکات سے متاثر ہوتی ہیں ۔ دیگر زبانوں کے عمل اور ردِ عمل سے وہ متاثر ہوتی ہیں اور اپنے ڈھانچے میں تبدیلی اور تغیر لاتی رہتی ہیں۔ اردو کے ارتقا میں جو بھی عوامل رہے ہوں، اردو ان سے متاثر ہوتی رہی اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. دکنی میں جمع بنانے کا طریقہ لکھیے ۔
2. علامتِ فاعل کا دکنی میں استعمال کیسے ہوتا ہے؟
3. دکنی میں بڑے مصوتے چھوٹے مصوتوں کی شکل کب اختیار کرتے ہیں؟

3.4 خلاصہ

پایۂ تخت کی تبدیلی تو 1327ء میں عمل میں آئی لیکن اس سے بہت پہلے ہی شمالی ہند اور جنوبی ہند کے مابین معاشرتی، تہذیبی اور لسانی روابط کا آغاز ہو چکا تھا ۔ محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ اور اس کے بعد محمود غزنوی کے حملوں سے لسانی طور پر ملا جلا ہیولیٰ تیار ہونے لگا تھا ۔ غزنویوں کے بعد علاء الدین خلجی نے گجرات و دکن کا رخ کیا ۔ دکن اور نواح دکن پر انتظامی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے گجرات کی فتح ضروری تھی چنانچہ 1297ء میں گجرات کی فتح عمل میں آتی ہے اور پھر لگ بھگ دس بارہ سال کے بعد علاء الدین خلجی اپنے جنرلوں کو تسخیر دکن کے لیے روانہ کرتا ہے۔ خلجی افواج نے 1310ء میں دکن اور مالوے پر کامیاب فوج کشی کی۔ یہ دکن پر دہلی کی بڑی فتح تھی جس کے سیاسی ہی نہیں لسانی اثرات بھی دور رس رہے۔ مفتوحہ علاقوں پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے علاء الدین خلجی نے انتظام سلطنت میں کافی تبدیلیاں لائیں۔ امیرانِ صدہ کو مامور کیا جو زیادہ تر ترک تھے ۔ ان عہدے داروں کی تعیناتی کی وجہ سے ہوا یہ کہ کئی ترک عہدے دار اپنے متعلقین کے ساتھ دکن ، مالوہ اور گجرات میں سکونت پذیر ہو گئے ۔ ابتدا میں ان عہدے داروں نے اجنبیت محسوس کی ہو لیکن جلد ہی انہوں نے یہاں کے حالات سے مطابقت پیدا کر لی۔ گویا انہیں علاقوں کو اپنا وطن قرار دے لیا اور اپنے اصل علاقے کو فراموش کر کے گجراتی اور دکنی بن گئے ۔

1322ء میں علاء الدین خلجی کے جنرل ملک کافور نے نہ صرف ورنگل پر فتح حاصل کر لی بلکہ اس کی افواج نے مدورائی، تنجور اور جنوبی ہند کے سواحل تک رسائی حاصل کر لی ۔ اس طرح لسانی اور تہذیبی اثرات مزید افزوں ہونے لگے چنانچہ یہاں کی زبانوں پر شمالی ہند کی زبانوں پنجابی، ہریانی، اودھی، برج بلکہ عربی اور اس سے زیادہ فارسی کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ شمالی ہند والوں نے دکن کو اپنا وطن تو بنا لیا لیکن ان کی زبان خواہ ترکی ہو کہ فارسی یہاں کیا کام آتی چنانچہ دھیرے دھیرے اور محدود پیمانے پر سہی الفاظ کا لین دین لازمی تھا کئی اصوات ایسی ہوں گی جن کو وہ ادا نہیں کر پاتے رہے ہوں گے اس لیے ان کا تلفظ بدل گیا ہوگا۔ یہ بدلا ہوا تلفظ دراصل لسانی سمجھوتہ تھا جو ناگزیر تھا۔ اسی طرح شمالی ہند سے آئے افراد اور سپاہیوں نے یہاں کی مقامی زبانوں کے کئی الفاظ اپنا لیے ہوں گے اور کئی الفاظ انہوں نے یہاں کی زبانوں کو دیے بھی ہوں گے۔ چنانچہ جنوبی ہند کی زبانوں سے فارسی اور ترکی کا لین دین بڑھ گیا اور دکنی کے لیے فضائیں سازگار اور راہیں استوار ہوئیں ۔

محمد تغلق نے جب دہلی کا تخت سنبھالا تو اس نے انتظامی امور میں اور جو بھی کیا ہو، دہلی کی بجائے دولت آباد کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا اور سختی کے ساتھ ہر کس و ناکس کو مجبور کیا کہ وہ دولت آباد کا رخ کرے ۔ وسطی ہند میں ہونے کی وجہ سے محمد تغلق کے نزدیک دولت آباد بہتر مقام تھا جہاں سے ملک کے ہر حصے پر نظر رکھی جا سکتی تھی ۔ دور دراز کے علاقوں کو سپاہ اور رسد کی فراہمی، پیغامات اور احکامات کی ترسیل وغیرہ کے لیے دولت آباد بہتر تھا ۔ محمد تغلق نے ہر چند کہ دو سال بعد ہی 1329ء میں پایۂ تخت کو دوبارہ دہلی منتقل کر دیا لیکن اسی دوران یہاں شمالی ہند سے جو لوگ آئے ہوئے تھے، ناممکن تھا کہ وہ سب دوبارہ دہلی کا رخ کرتے ۔ شمالی ہند کے لوگ ممکن ہے اپنے گھروں میں اپنی زبان بولتے

رہے ہوں لیکن بازاروں اور محفلوں میں انہیں جنوبی ہند کی زبانوں سے ممکنہ حد تک کام لینا پڑا۔ کئی خاندانوں اور افراد نے دہلی کو پھر نقل مقام کیا ہوگا اور وہ جو کئی یہاں رہ گئے وہ یہاں کی زبانوں کو اپنانے پر مجبور ہوئے اور دکنی کے حق میں کہا جاسکتا ہے کہ اس کے نتائج اچھے نکلے۔ آگے چل کر بہمنی سلطنت اور پھر اس کے بعد قطب شاہی' عادل شاہی' احمد شاہی' نظام شاہی اور برید شاہی سلطنتوں میں دکنی کو اور کھلی فضا ملی کہ ان سلاطین نے شمالی ہند کے خلاف اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے دکنی زبان اور تہذیب کی سرپرستی کی۔ دکنی شاعروں اور ادیبوں کی ہمت افزائی کی گئی اور یہاں تک کہ دکنی کو دربار میں بھی جگہ مل گئی۔ اس باعث بھی اور عوامی سطح پر بھی جو لسانی منظر نامہ سامنے آتا ہے وہ شمالی ہند کی زبانوں اور جنوبی ہند کی زبانوں کے اختلاط کا نتیجہ تھا جس کے نقوش بتدریج گہرے ہوتے جاتے ہیں۔

جب دو زبانیں آپس میں ملتی ہیں تو الفاظ کا لین دین' تلفظ اور اصوات میں تبدیلی ناگزیر ہے بلکہ کبھی کبھی تو املا میں بھی فرق آجاتا ہے۔ اس خصوص میں ہمارے کئی ماہرین لسانیات اور محققین نے تلاش و تحقیق سے کام لیا ہے۔ خاص طور پر پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی گراں قدر کتاب ''مقدمۂ تاریخ زبان اردو'' میں اس بارے میں سیر حاصل انداز میں قلم اٹھایا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس لسانی لین دین کے باعث جو باتیں نمایاں ہوئیں ان میں ''اں'' سے جمع بنانے کا طریقہ ہے جیسے بات سے باتاں' ہاتھ سے ہاتھاں وغیرہ۔ یہ طریقہ پنجابی میں بھی ہے۔ دکنی میں علامتِ فاعل ''نے'' کا عدم استعمال عام ہے اور یہ بھی اپ بھرنش اور اس کے بعد ہریانی' پنجابی اور بھوج پوری کا اثر ہے اور زبانوں میں بھی یہ سلسلہ ملتا ہے۔ حتیٰ کہ میر جیسا شاعر بھی ''نے'' کا عدم استعمال کرتے ہوئے ''گُل کو محبوب میں قیاس کیا'' جیسے مصرعے کہتا ہے۔ حرف تاکیدی ''ہی'' کی بجائے ''نچ'' کا استعمال دکنی میں عام ہے جو مرہٹی کا اثر ہے۔ مرہٹی سے دکنی نے لفظ ''نکو'' بھی لیا ہے جو ''نہیں'' کے معنی رکھتا ہے۔ طویل مصوتوں کی چھوٹے مصوتوں میں تبدیلی جیسے آسماں کو اسمان اور چھوٹے مصوتوں کی طویل مصوتوں میں تبدیلی جیسے ''بندر کو باندر'' کہنے کا رواج دکنی میں عام ہے۔ نونِ غنہ کا زاید استعمال بھی دکنی میں ہے جو برج بھاشا' بندیلی اور ہریانی وغیرہ کا اثر ہے۔ آج بھی لوگ 'کوچہ' کو 'کونچہ' اور 'سوچ' کو 'سونچ' کہتے ہیں۔ اس طرح دو کوزی آوازیں (ٹ' ڈ وغیرہ) قریب قریب استعمال ہوں تو عموماً پہلی آواز دندانی بن جاتی ہے جیسے ٹوٹنا' توٹنا ہوجاتا ہے۔ یہ کنڑی کا اثر بتایا جاتا ہے جس کو دکنی نے اپنالیا ہے۔

اور کئی باتوں کے علاوہ ''ق'' اور ''خ'' کی تقلیبِ صوت کا معاملہ بھی ہے۔ دکنی میں ''ق'' کا تلفظ ''خ'' کی طرح ادا کیا جاتا ہے۔ اہل پنجاب بھی ''ق'' کی جگہ ''ک'' کی صوت ادا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ اور کچھ نہیں سوائے اس کے کہ ق عربی صوت ہے جس کی ادائیگی ہند۔آریائی زبان والوں کے لیے بھی دشوار ہے۔ دکنی اردو میں علامتِ مستقبل گا' گی' گے کے علاوہ 'سی' بھی ہے۔ یہ شمالی ہند کی زبانوں کا اثر ہے جیسے راجستھانی کی بعض بولیوں میں 'سی' کا استعمال علامتِ مستقبل کے لیے کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مرکب الفاظ بنانے میں ''ہار'' کا لاحقہ دکنی میں استعمال کیا جاتا ہے جیسے لکڑیاں کاٹنے والے کو 'لکڑہار' وغیرہ ------ یہ تو چند مثالیں تھیں۔ دکنی کے سارے لسانی سرمایے پر نظر رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسے کئی الفاظ اُن کا املا' ان کا تلفظ' تراکیب' مرکبات اور قواعد کے طور طریقے ہیں جو پایۂ تخت کی تبدیلی اور اس کے بعد دکنی پر اثر انداز ہوئے۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ زبان کے ارتقا میں یہ ایک فطری عمل تھا۔ اگر محمد تغلق نے پایۂ تخت تبدیل نہ کیا ہوتا یا اور کوئی صورتِ حال ہوتی تب بھی زبان کا ارتقا ہوتا۔ دکنی دیگر زبانوں سے متاثر ہوتی' اردو کے رنگ روپ بدلتے اور ارتقائی مراحل طے ہوتے۔ زبانیں زندہ اکائیاں ہوتی ہیں زمانے کی گردش سے متاثر ہوتی ہیں اپنے ڈھانچے میں تغیر اور تبدّل لاتی رہتی ہیں۔ اُردو کے ارتقا میں جو بھی عوامل رہے ہوں' رہے' اردو ان سے متاثر ہوتی رہی اور آئندہ بھی متاثر ہوتی رہے گی۔

3.5 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. دکنی پر پایۂ تخت کی تبدیلی کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟
2. اس اکائی کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. محمد تغلق کے پایۂ تخت کی تبدیلی تک شمالی اور جنوبی ہند کے لسانی منظر نامے پر روشنی ڈالیے۔
2. دکنی پر شمالی ہند کی زبانوں کے جو اثرات مرتب ہوئے اُن میں سے صرف تین کا ذکر کیجیے۔

3.6 فرہنگ

رطب اللساں = مداح، بہت تعریف کرنے والے

میل جول = رسم و راہ

کارندے = کام کرنے والے

دیرپا = پائدار، مضبوط

تسخیر = قابو میں لانا

تعیناتی = تقرری

سریر = تخت شاہی

تشخیص = امتیاز

تخصیص = خصوصیت

ہیولیٰ = خاکہ

رسد = ذخیرہ جو لشکر کے ہمراہ ہو

باج گزار = محصول دینے والا

مابین = درمیان

زیرِ نگیں = ماتحت

قلمرو = سلطنت، ریاست

تسلط = حکومت، قبضہ

یلغار = دھاوا

نہج = طور طریقہ

اختلاط = میل جول

افزوں = زیادہ

3.7 سفارش کردہ کتابیں

1. مسعود حسین خاں : مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو
2. جمیل جالبی : تاریخِ ادب اردو (جلد اول)
3. محمود شیرانی : پنجاب میں اردو

.....

اکائی: 4 دکنی اُردو کی لسانی خصوصیات

ساخت

4.1 تمہید

4.2 دکنی اردو کی لسانی خصوصیات

4.3 دکنی اور شمالی ہند کی اردو کے مشترک الفاظ

4.4 دکنی میں سنسکرت کے الفاظ

4.5 دکنی میں جمع بنانے کا قاعدہ اور علامت مستقبل کا استعمال

4.6 دکنی کے مخصوص الفاظ اور ضمائر

4.7 دکنی میں الفاظ کی تکرار، حروفِ استدراک اور حروفِ تشبیہ

4.8 خلاصہ

4.9 نمونۂ امتحانی سوالات

4.10 فرہنگ

4.11 سفارش کردہ کتابیں

4.1 تمہید

دکنی زبان کی خصوصیات موجودہ اردو سے بہت الگ اور مختلف ہیں۔ اصل میں یہ خصوصیات قدیم اردو کی خصوصیات ہیں۔ اسی وجہ سے بعض علما نے دکنی کو ''اردوئے قدیم'' بھی کہا ہے۔ جیسے شمس اللہ قادری نے دکنی شعرا کے بارے میں جو اپنی کتاب لکھی ہے اس کا عنوان ہی ''اردوئے قدیم'' ہے۔ یہ بات تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ اردو شمالی ہند میں پیدا ہوئی اور پھر بعض تاریخی حالات و واقعات کی وجہ سے دکن پہنچی۔ یہ زبان شمالی ہند میں تیزی سے بدلنے لگی لیکن دکن میں اپنی قدیم شکل میں باقی رہی۔ اسی وجہ سے وہ موجودہ اردو سے اتنی اور ایسی مختلف ہو گئی کہ اب اسے دکنی اردو کہا جاتا ہے اور وہ صرف اسی کی خصوصیات بن گئی ہیں۔ اس لیے کہ قدیم اردو، شمال میں صرف بول چال کے لیے استعمال ہوئی اور وہ چونکہ ادبی اغراض کے لیے استعمال نہیں ہوئی اس لیے اس کے نمونے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جتنے کچھ نمونے تحقیق کے بعد جمع ہوئے ہیں اور ملے ہیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دکنی زبان کی لسانی خصوصیات اصل میں قدیم اردو زبان ہی کی خصوصیات ہیں۔ لیکن موجودہ طور پر چوں کہ قدیم اردو کی یہ خصوصیات جدید اردو سے غائب ہو چکی ہیں اس لیے یہ خصوصیات اب دکنی اردو کی خصوصیات بن گئی ہیں۔

4.2 دکنی اردو کی لسانی خصوصیات

دکنی اردو یا اردوئے قدیم کی سب سے بڑی اور اہم خاصیت یہ تھی کہ یہ زبان دوسری ہندوستانی زبانوں سے زیادہ قریب تھی۔ صرفی اور نحوی لحاظ سے دوسری ہندوستانی زبانوں کی بہت سی خصوصیات اس میں ملتی ہیں۔ دکنی میں ہندوستانی زبانوں کے جو الفاظ ملتے ہیں، اس کے تعلق سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''اس دور کی زبان میں ہمیں مختلف زبانوں کی ایک کھچڑی سی پکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جس میں مقامی زبانوں کے علاوہ کھڑی بولی، برج بھاشا، اودھی، سرائیکی، پنجابی، راجستھانی، سنسکرت اور گجری وغیرہ کے اثرات ایک ساتھ پک رہے ہیں۔ عربی، فارسی، ترکی الفاظ اس کھچڑی زبان میں ایک حلاوت پیدا کر کے اسے ایک نیا رنگ دے

رہے ہیں۔عربی فارسی کے لسانی اور تہذیبی اثرات نے زبان کا خمیر اٹھنے اور جلد پک کر تیار ہو جانے کے عمل میں مدد دی'' (تاریخ اردو ادب۔جلد اول صفحہ 197)

قدیم اردو اور دکنی میں حقیقت میں کوئی فرق نہیں تھا۔قدیم اردو جب دکن پہنچی تو دکنی کہلائی۔ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اردو زبان کی تاریخ پر جو کام کیا ہے اس میں انہوں نے ہر جگہ اس بات کا ذکر کیا ہے کہ قدیم اردو اور دکنی ایک ہی زبان ہے۔وہ ''معراج العاشقین'' کی زبان کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''وہ چودھویں صدی عیسوی کی ''زبان دہلوی'' کی نشان دہی کرتی ہے'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ 149)

انہوں نے ''معراج العاشقین'' میں استعمال ہونے والے الفاظ کی فہرست یوں دی ہے: کاڑا (جوشاندہ)' ہور (''اور'' یہ پنجابی اور کھڑی میں ملتا ہے) نک (ناک)' بارا (ہوا)' پیلانا (پلانا)' لگ (تک)' بوی (بو)' سوں (سے)' تے (سے)' اُپس کو (اپنے کو)' اپے (خود)' کیاں (کی' کی جمع)' انگے (آگے)' دسرا (دوسرا)' تسرا (تیسرا)' اندھارا (اندھیرا)' اجیالا (اجالا)' **نئیں** (نہیں)' لک (لاکھ)' میریاں (میری کی جمع)' دک (دکھ)' اے (یہ)' پینے (پہنے) باج (بغیر)' دسنا (دکھائی دینا)' پیٹ (پیٹھ) سی (سے)' منا (منع)۔

''معراج العاشقین'' کا مقابلہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے مطابق اگر دکنی شاعر نظامی کی زبان سے کیا جائے تو ''نظامی کی زبان کی قدامت مسلم ہو جاتی ہے۔'' دکنی زبان پر شمالی ہند کی زبانوں کے اثرات کے تعلق سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''نظامی کی زبان میں نہ صرف راجستھانی اور پنجابی کی اکثر شکلیں پائی جاتی ہیں بلکہ اس پر اَپ بھرنشی روایات کا ٹھپہ بھی صاف طور پر نظر آتا ہے۔اس بنا پر بھی قیاس کرنا پڑتا ہے کہ دکن میں نواح دہلی کی ایک سے زیادہ زبانوں کے اثرات پہنچے ہیں'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ 15)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب ''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' کے پانچویں اور آخری باب میں مختلف دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ دکنی زبان کی خصوصیات اصل میں قدیم اردو ہی کی خصوصیات ہیں۔اسی وجہ سے دکنی' شمالی ہند کی مختلف بولیوں سے متاثر ہے۔دکنی کی اور شمالی ہند کی مختلف بولیوں میں لسانی خصوصیات یکساں ہیں۔اسی بنا پر انہوں نے اپنے آخری باب کا عنوان حسب ذیل رکھا ہے:

''پانچواں باب

تشکیل (ایک نئے لسانی نظریے کی)

دکنی کی لسانی خصوصیات کا تقابل نواح دہلی کی بولیوں سے''

اس باب میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے جگہ جگہ دکنی' ہریانی' کھڑی بولی اور میواتی سے اردو کا تقابل کر کے یہ بتایا ہے کہ:

''دکنی زبان کے تقریباً تمام حروف نواح دہلی کی بولیوں میں رائج ہیں'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ 286)

دکنی میں ''اں'' لگا کر جمع بنانے کا طریقہ ملتا ہے۔ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے مطابق میرٹھ' مظفر نگر اور سہارنپور میں جمع بنانے کا یہ طریقہ آج بھی رائج ہے۔ادبی سطح پر بھی یہ طریقہ استعمال ہوتا تھا۔شمالی ہند کے قدیم شعرا فائزؔ اور حاتمؔ کے اشعار سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنے دعوے کو مدلل بنا دیا ہے

ع ود **بھواں** تیغ جنوبی سی دراز (فائز)

ع لب پر گلوں کے مہر کرے ان **لباں** کا رنگ (حاتم)

دکنی میں ''میرا'' کی بجائے ''مج'' یا ''منج'' اور ''تیرا'' کی بجائے ''تج'' استعمال ہوتا ہے۔ڈاکٹر مسعود حسین اس کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''قدما کے یہاں اس کی کثرت سے مثالیں مل جاتی ہیں جس سے ثابت ہے کہ یہ دکنی سے مخصوص نہیں مثلاً حاتمؔ کے یہاں تم ساتھ' تجھ گل بدن کی بو' تج عشق' تجھ پاس' ہمن پاس۔(فائزؔ)۔(مقدمہ تاریخ زبان اردو۔صفحہ 284)

اپنی معلومات کی جانچ :

1. دکنی اردو کی سب سے اہم خاصیت کیا ہے؟
2. دکنی اردو، شمالی ہند کی کن بولیوں سے زیادہ متاثر ہے؟

4.3 دکنی اور شمالی ہند کی اردو کے مشترک الفاظ

اسی طرح 'ہمنا' ,'ہمن کو 'تمنا', تمن کو' بھی صرف دکنی کی خصوصیات نہیں ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کہتے ہیں کہ حاتم کے کلام میں اس کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ وہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں حضرت کمال الدین مخدوم شیخ سعدی کا کوروی کا حسب ذیل شعر پیش کرتے ہیں، جس میں ضمائر کی یہ شکلیں مل جاتی ہیں۔

ہمنا تمن کو دل دیا ' تم دل لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا ' تم وہ کیا ' ایسی بھلی یہ پیت ہے

(مقدمۂ تاریخ زبان اردو صفحہ 285)

'ہمن'۔'ہمیں' اور 'ہمیں کو' کی دکنی شکلیں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی تحقیق کے مطابق قدیم اردو میں رائج تھیں۔ جیسے چندر بھان برہمن کے اس مصرعے میں:

ع خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لا کے ڈالا ہے

دکنی کا ''سوں' افضل جھنجھانوی نے استعمال کیا ہے:

ع سنی دل سوں، کبھی دیکھی ہمن کوں

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کہتے ہیں کہ دکنی ضمائر میں قابل ذکر ''اپس'' ہے جو محمد قلی سے لے کر ولی تک ہر ایک کے کلام میں مل جاتی ہے۔ یہ بھی افضل کے ''بارہ ماسہ'' میں مل جاتی ہے۔

اری سبزک پیا کے باغ جا کر
اپس کوں بے وفا سیتی لوکا کر

(مقدمۂ تاریخ زبان اردو صفحہ 287)

اسی طرح دکنی کے تقریباً تمام الفاظ نواح دہلی کی بولیوں میں قدیم زمانے سے رائج ہیں جیسے 'سیتی'۔'سیتے' تھے' سوں' ستیں' لگوں' لگ' لگن' پہ' پو' یہ تمام حروف قدیم شعرا یعنی فائز' آبرو' حاتم اور دیگر متقدمین کے کلام میں بار بار آتے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں مثال کے طور پر یہ درج ذیل اشعار پیش کرتے ہیں:

اَدھر اس کے یاقوت سیتی ہیں بیش
عقیقِ یمن لب ستی منفعل

فائز

شعر کو مضموں ستے جو قدر ہی، ہے آبرو
قافیہ سیتے ملایا قافیا تو کیا ہوا

آبرو

دل میں طمع نہیں مجھے شاہ و گدا ستے
میں سب کوں چھوڑ ساز کیا ہوں خدا ستے

حاتم

اس کے علاوہ دوسرے الفاظ جو دکنی میں رائج ہیں شمالی ہند کی قدیم اردو اور وہاں کی بولیوں میں مل جاتے ہیں۔ یہاں ان الفاظ کی فہرست دی جارہی ہے جو اب دکنی کی خاصیت بن گئے ہیں لیکن قدیم اردو میں یہ رائج تھے۔

ہور (اور)، دھر یا دھیر (سمت)، کدھیں (کبھی)، اتاول (جلد)، اتا، جتا (اتنا اور جتنا)، وستاد (استاد)، اچھنا (ہونا)، دسنا یا دیسنا (دکھائی دینا)، پتیانا (یقین کرنا)، اپجنا (اگنا)، ناؤں، ٹھاؤں (نام، جگہ)

مذکورہ بالا الفاظ کی فہرست ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی کتاب میں دے کر یہ کہا ہے کہ دکنی زبان کے یہ تمام الفاظ شمالی ہند کی بولیوں اور زبانوں میں ملتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہمارے خیال میں مرہٹی اور گجراتی زبان کے بعض لسانی اثرات کو چھوڑ کر دکنی کے تمام غریب الفاظ کی توجیہہ نواح دہلی کی چار بولیوں ہریانی، کھڑی، میواتی اور برج سے کی جاسکتی ہے۔ اس کے برخلاف دکن میں اجنبی بولیوں کے ماحول میں یہ لسانی ارتقا بالکل رک جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی زبان میں الفاظ کی وہی شکلیں ملتی ہیں جو شمالی ہند میں آج سے نوسو برس پہلے رائج تھیں یا جو اب صرف گھریلو اور دیہاتی زبان میں پائی جاتی ہیں۔''
>
> (مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ 291-290)

اس ساری بحث سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اردوئے قدیم اور دکنی ایک ہی زبان ہے۔ بعض حضرات کے ذہن میں یہ تصور ہے کہ دکنی اور موجودہ اردو دو الگ زبانیں ہیں قطعی طور پر صحیح نہیں ہے۔ اب چونکہ موجودہ اردو میں دکنی کے وہ الفاظ نہیں ملتے جو قدیم اردو میں استعمال ہوا کرتے تھے اس لیے دکنی میں پائے جانے والے یہ الفاظ دکنی اردو کی لسانی خصوصیات بن گئے ہیں۔

جس زمانے میں قدیم اردو دکن پہنچی وہ ایسا زمانہ تھا جب اردو سارے ہندوستان میں پھیل رہی تھی اور وہ ہندوستان گیر صورت اختیار کررہی تھی یہی وجہ ہے کہ اس زمانے کے صوفیا اور مذہبی پیشوا اسی زبان میں اپنی تعلیمات پھیلا رہے تھے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

> ''اس عہد کے مذہبی پیشواؤں کو شعوری اور غیر شعوری طور پر یہ احساس ہوگیا تھا کہ ان کا عالم گیر پیغام ایک عالم گیر زبان میں ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ نام دیو نے مرہٹواڑی میں کبیر داس نے پورب اور گرونانک نے پنجاب میں بیٹھ کر لشکریوں اور بیوپاریوں کے ذریعے پھیلی ہوئی اس زبان کو اپنایا جسے خسرو نے ''زبان دہلوی'' کے نام سے یاد کیا ہے۔'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ 152)

قدیم اردو ہندستان کے دور دراز علاقوں تک جس طرح پہنچ رہی تھی اس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

> ''دہلی کے مرکز سے جو نئی لسانی لہریں تمام ہندوستان میں پھیل رہی تھیں ان کا عکس ہمیں دکن کے دور دراز گوشوں سے نام دیو کے کلام تک مل جاتا ہے۔'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ 152)

اپنی معلومات کی جانچ:

1. دکنی اردو کے کون سے الفاظ شمالی ہند کی بولیوں میں ملتے ہیں؟
2. اولیاء اللہ اور مذہبی پیشواؤں نے دکنی یا قدیم اردو میں اپنی تعلیمات کیوں پیش کیں؟

4.4 دکنی میں سنسکرت کے الفاظ

جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا ہے کہ دکنی کی سب سے بڑی اور اہم خاصیت یہ تھی کہ وہ ہندوستان کی دوسری زبانوں سے بہت قریب تھی۔ جیسے ''والا'' کے لیے ''ہارا'' کا لفظ دکنی میں آتا ہے۔ لیکن یہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

لفظ ''والا'' مابعد کا ارتقا ہے۔ قدیم دکنی، ہریانی، پنجابی اور برج میں ہمیشہ ''ہارا'' آیا ہے جیسے ''جانہارا''۔ ''پانہارا'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو صفحہ 163)

دکنی کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس میں سنسکرت کے بہت سے الفاظ ملتے ہیں بعض جگہ تو یہ اپنی خالص شکل میں ہیں اور بعض جگہ اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق انہیں بدل دیا گیا ہے۔ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''جدید آریائی زبانیں جب ادبی شکل اختیار کرتی ہیں تو انہیں خواہ مخواہ سنسکرت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے ''سنکرتیت' کے اس رجحان کو زبردست صدمہ پہنچا۔انہوں نے اپنا خزانہ الفاظ بیشتر فارسی اور عربی سے لیا۔اور ہندوستانی الفاظ کی صحت کی مطلق پرواہ نہ کی چنانچہ دکنی ادبیات میں سنسکرت کے اکثر الفاظ توڑ مروڑ کر ذیل کی شکل میں ملتے ہیں:

پرم' پیم (پریم)' دشٹی (درشٹی =نظر)' چمن (چمبن = چومنا)' انجھو (اشرو = آنسو)' سیتل (شیتل = ٹھنڈا)' بست (وستو = چیز)' کیس (کیش = بال) وغیرہ۔

سنسکرتیت کے اس رجحان کی وجہ سے بہت سے الفاظ دکنی میں استعمال ہوتے ہیں جو خالص شکل میں ہیں۔دکنی زبان وادب کی یہ بھی ایک اہم خاصیت ہے کہ اس میں سنسکرت کے خالص الفاظ بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''سنسکرتیت کے ہی بڑھتے ہوئے عام رجحان سے مسلمانوں کو بھی مفر نہ تھا۔اس کی شہادت' ہمیں قدیم دکنی ادب سے ملتی ہے۔جہاں خالص سنسکرت کے بے شمار الفاظ بلا تکلف نظم ونثر میں استعمال کیے گئے ہیں۔

میگھ (بادل)' دوت (پیامبر)' ترلوک (تینوں عالم)' چتر (ہوشیار)' جیو (جی)' چرن (قدم)' چنتا (فکر)' دنکر (دن کرنے والا یعنی سورج)' درپن (آئینہ).....سور (سورج)' روی (سورج)' رکت (خون)' شبد (لفظ)' سنگرام (لڑائی)' سیس (سر)' ہردے (دل)' ادھک (زیادہ)' بہو (بہت)' وانر (بندر) الک (زلف) پرکٹ (ظاہر)' وینا (بین)' انتر (راز)' بھان (سورج)' پستک (کتاب) وغیرہ۔

قدیم دکنی' قدیم اردو ہی تھی۔افضل کی مشہور ''بارہ ماسہ'' یا بکٹ کہانی' شمالی ہند کی قدیم زبان کا نمونہ ہے۔وہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ قدیم اردو جب دکن آئی تو وہ دکنی کہلائی۔ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''افضل کی زبان کا لسانی تجزیہ کیا جائے تو قدیم دکنی کی ابتدا پر بھی روشنی پرتی ہے اور یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ دکنی زبان کا جواز ہریانی اور ہندوستانی (کھڑی یا زبان دہلوی) سے پیش کیا جا سکتا ہے۔گو کئی لحاظ سے افضل کی اردو' دکنی کے مقابلے میں ارتقا یافتہ ہے۔''

اس کے بعد انہوں نے اسما' ضمائر' حروف اور افعال' افضل نے جو استعمال کیے ہیں وہی دکنی کی کتابوں میں جس طرح ملتے ہیں ان کو پیش کیا ہے۔

''ہم کوں۔اپس کوں (دکنی میں بھی ملتا ہے) ہمن سے (ہم سے دکنی میں بھی ملتا ہے)

حروف: کن' کوں (دکنی کے مطابق' باجھ (بغیر۔پیا باج پیالہ پیا جائے نا) سوں۔سیں (دکنی کے مطابق)

اس سلسلے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے شاہ سید برکت اللہ مارہروی کا کلام پیش کیا ہے۔شاہ برکت اللہ کے کلام میں بہت سے الفاظ اسی طرح ملتے ہیں جو دکنی میں ہیں۔ذیل میں ان الفاظ کی نشاندہی کی گئی ہے:

گھر تج کے جا جنگل میں پرتب سمجھ پری
تن من میں **پیم** کی اگ پری تب سمجھ پڑی
تکیہ جو مخملی و دگر سیج چھوڑ کے
جب اینٹ زیر **سیس** دھری تب سمجھ پری

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے لکھا ہے:

''قدیم اردو میں بیشتر (ڈ) کی آواز ملتی ہے (ڑ) کی آواز اٹھارہویں صدی کی ابتدا کا ارتقا ہے۔ (ڈ) کی آواز آج بھی پنجابی، راجستھانی، ہریانی اور کھڑی بولی کے بعض اضلاع (میرٹھ، مظفرنگر، سہارنپور) میں عام مستعمل ہے:

بڈا	بجائے	بڑا
تھڈی	بجائے	ٹھوڑی
گڈھا	بجائے	گڑھا
علی گڈھ	بجائے	علی گڑھ

دکنی میں بھی قدیم اردو کی طرح (ڈ) کی آواز ہی ملتی ہے۔ جس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دکنی قدیم اردو دوسری ہندوستانی زبانوں سے زیادہ قریب تھی۔ دکنی کے ایسے الفاظ جو اب اس کی خاصیت سمجھے جاتے ہیں وہ شمالی ہند کی قدیم اردو میں بھی استعمال ہوتے تھے۔ لیکن مظہر جان جاناں، حاتم اور پھر ناسخ نے جو اصلاح زبان کی تحریکیں چلائیں ان کی وجہ سے ٹھیٹ ہندوستانی الفاظ کی جگہ بعض عربی فارسی کے الفاظ استعمال ہونے لگے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے متروک الفاظ کی لمبی فہرست دی ہے۔ جو حسب ذیل ہیں:

نین (چشم)، ساجن (معشوق)، جگ (دنیا)، درشن (زیارت)، ماس (گوشت)، منسا (تجویز)، موہن (معشوق)، پیو (دوست)، پیا (معشوق)، برہا (فراق)، من (دل)، سنسار (دنیا)، باٹ (راستہ)، درشن (دیدار)، دارو (دوا)، پیتم (معشوق)، سریجن (معشوق)، سرج (سورج)، جیو (جی)، بیجلی (بجلی)، جھٹا (جھوٹا)، چند (چاند)، نمن (طرح)، بھیتر (اندر)، سیں، سوں سیتی (سے)، انگے (آگے)، بنا (بن)، باج (بغیر)، منیں منے (میں)، دوجا، دوج (دوسرا)، لگ (تک)، کن (پاس)، کوں (کو)، نزیک، نزک (نزدیک)، کدھی، کدھیں (کبھی)، اتا (اتنا)، **نئیں** (نہیں)، تجنا (چھوڑنا)، اتھا (تھا) اہے (ہے)، کیتا (کیا)، جاے (جلائے)۔ بوجھنا (سمجھنا)، گلنا (پگھلنا)، کئی (کوئی)، اپس (اپنے)، تمنا (تمہارے)۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. دکنی میں سنسکرت کے کون کون سے الفاظ ملتے ہیں؟
1. اردو کے کن شعرا نے اصلاح زبان کی تحریکیں چلائیں؟
2. چار پانچ ایسے الفاظ بتایئے جو بعد میں متروک قرار دیئے گئے؟

4.5 دکنی میں جمع بنانے کا قاعدہ اور علامتِ مستقبل کا استعمال

''اں'' لگا کر جمع بنانے کا قاعدہ گو فارسی کا ہے اور شاید فارسی ہی کے اثر سے پنجابی میں بھی یہی قاعدہ ملتا ہے۔ مثال کے طور پر یار سے یاراں، ہم نفس سے ہم نفساں وغیرہ۔ دکنی میں بھی 'اں' لگا کر جمع بنائی جاتی ہے۔ لیکن یہ قاعدہ پنجابی کے علاوہ ہریانی اور راجستھانی میں بھی ملتا ہے۔ مسعود حسین خاں لکھتے ہیں

''جمع میں حالت مفعولی کا اختتام اردو کے برخلاف اکثر ''اں'' پر ہوتا ہے جیسے وناں، عورتاں وغیرہ یہ شکل ہریانی، راجستھانی اور پنجابی میں عام ہے۔ دکنی کی بھی یہی خصوصیت ہے'' (مقدمۂ تاریخ زبان اردو۔ صفحہ 91)

صیغۂ ماضی میں (یا) لگانا دکنی میں عام ہے جیسے ''پوچھا'' کی جگہ ''پوچھیا''۔ لیکن یہ صرف دکنی ہی میں نہیں قدیم اردو اور ہریانی میں بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''پوچھیا کی ترکیبیں، ہریانی اور قدیم اردو ' دکنی دونوں میں پائی جاتی ہیں (مقدمۂ تاریخ زبان اردو صفحہ 101)

''سی'' علامت مستقبل کے طور پر شمالی ہند کی قدیم اردو میں رائج تھی۔ اور دکن میں بھی رائج تھی۔ مسعود حسین خاں نے امیر خسرو کے پیر بھائی

حضرت روشن چراغ دہلوی کی تصنیف ''خیر المجالس'' سے یہ فقرہ نقل کیا ہے:

''ارے مولانا یہ بداہوسی'' یعنی ارے مولانا ایں مرد بزرگ خواہد شد''

پھر وہ بتاتے ہیں کہ دکنی میں بھی ''سی'' علامت مستقبل کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اور وہ ''سب رس'' کا یہ جملہ نقل کرتے ہیں:

''جس عشق کا کچھ درد اس کتاب کو سینے پر تے ہلاسی نا۔ اس کتاب بغیر اپنا وقت بھلاسی نا''

اس کے بعد وہ احمد اور ولی کے اشعار پیش کرتے ہیں جن میں 'سی' علامت مستقبل کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔

کدھیں ہیج سک سنگ ملسی نہ منجہ
کدھیں من کمل پھول کھل سی نہ منجہ

.....

کیا ہے زہر کا تاثیر اس میں
نہ چل سی کچھ مری تدبیر اس میں

پھر وہ لکھتے ہیں کہ یہ صرف دکنی یا قدیم اردو کی خاصیت نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی کئی زبانوں میں یہ صورت ملتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''پروفیسر شیرانی نے اس (سی) کا تعلق ملتانی سے بتایا ہے۔ حالانکہ مغربی ہندوستان کی اکثر زبانوں (مثلاً) گجراتی، مارواڑی اور جے پوری میں یہ آج تک بعینہ استعمال ہوتی ہے۔ دہلی کے مضافات بالخصوص ضلع گوڑ گاؤں کی بولیوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہاں سے یہ قدیم دہلی کے بازاروں میں عام طور سے رائج ہوگئی ہوگی۔''
(مقدمۂ تاریخ زبان اردو صفحہ 145)

اردو کے لیے ''ہندوستانی'' کا لفظ انگریزوں سے بہت پہلے رائج ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''شاہ جہاں کی فارسی تصنیفات میں ہندی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کا لفظ بھی زبان کے لیے عام طور پر ملتا ہے۔ عبدالحمید لاہوری نے اس لفظ کو بار ہا استعمال کیا ہے..... جو ڈاکٹر سلیمان ندوی اور پروفیسر شیرانی دونوں کا خیال ہے کہ لفظ ''ہندوستانی'' زبان کے سلسلے میں اس عہد سے قدیم ہے۔''

سید سلیمان ندوی اور پروفیسر شیرانی نے لکھا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ (988 تا 1037ء) کی فارسی دانی کے سلسلے میں مشہور مورخ فرشتہ نے ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ بعد میں ملا وجہی نے بھی ''سب رس'' (1635ء) میں ''زبان ہندوستان'' کی ترکیب استعمال کی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ''اں'' لگا کر جمع بنانے اور علامت مستقبل ''سی'' کا استعمال دکنی کے علاوہ کون سی ہندوستانی زبانوں میں ملتا ہے ؟
2. اردو کے لیے ہندوستانی کا لفظ انگریزوں سے پہلے کن بادشاہوں کے زمانے میں ملتا ہے؟

4.6 دکنی کے مخصوص الفاظ اور ضمائر

بہت سے لفظ جو ''دکنی'' کی خاصیت ہیں اردوئے قدیم اور شمالی ہند کی مختلف زبانوں اور بولیوں میں بھی مل جاتے ہیں جیسے ''دہی'' کے لیے ''دہیں'' کا لفظ ''خالق باری'' میں بھی ملتا ہے اور ''سب رس'' میں بھی۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''ان کے علاوہ کوں 'توں وغیرہ تو ہر صفحہ پر مل جائیں گے۔ غنہ کی آواز کی پیدائش جدید آریائی زبانوں کی مشترک عالم گیر خصوصیت ہے۔ توں (تو) پنجابی سے لے کر دکنی، ہریانی، کھڑی بولی، راجستھانی اور برج بھاشا تک میں یکساں طور پر قدیم زمانے سے مستعمل ہے''۔ (مقدمۂ تاریخ زبان اردو صفحہ 237)

فعل میں جمع کا صیغہ صرف دکنی کی خصوصیت نہیں ہے۔ جیسے عورتاں آئیاں یہ قدیم اردو میں بھی کثرت سے استعمال ہوتا تھا۔ جیسے سوداؔ نے لکھا ہے

یہ انکھیاں کیوں مرے جی کے گلے کا ہار ہو پڑیاں

اور حاتمؔ کہتے ہیں:

جب سے تری ادائیں عالم کو بھائیاں ہیں
تب سے جہاں میں تو نے دھومیں مچائیاں ہیں

اس تعلق سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''مذکورہ بالا لسانی خصوصیات کے متعلق یہ کہنا کہ اردوئے قدیم یا دکنی نے پنجابی سے لی ہوں گی، محض بے بنیاد قیاس آرائی ہوگی۔ یہی صرفی خصوصیات دہلی کے قرب وجوار کی بولیوں میں آج بھی پائی جاتی ہیں۔''

(مقدمۂ تاریخ زبان اردو 231)

پھر وہ بتاتے ہیں کہ شمالی ہند کے مختلف ادیبوں اور شاعروں نے جمع بنانے کے لیے ''اں'' کا استعمال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''قدیم ترین مصنفوں محمد افضل اور عبدیؔ اور شیخ محبوب عالمؔ ساکن جھجر وغیرہ کے یہاں ''اں'' ملتا ہے۔ مثلاً دن کی جمع وناں، کھیت کی جمع کھیتاں، گھر کی جمع گھراں وغیرہ آج بھی ہریانہ کے علاقے میں بولا جاتا ہے۔ شیخ محبوب عالم کے ''محشر نامہ'' میں اسی نہج پر نگراں، غریباں، جھوٹاں، اونٹاں وغیرہ ملتے ہیں۔''

لب پر کلی کی مہر کرے اس لباں کا رنگ (حاتم)

آتیاں، جاتیاں کے تعلق سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے لکھا ہے:

''اسی طرح سے آتیاں، جاتیاں وغیرہ حاتمؔ، میرؔ اور سوداؔ سے لے کر لکھنو میں میر انیسؔ اور دہلی میں داغؔ تک نے باندھا ہے۔ راقم السطور نے خود دہلی کی سیڑھیوں کی زبان سے اس قسم کے صیغے سنے ہیں'' (مقدمۂ تاریخ زبان اردو صفحہ 232)

البتہ صفت کی بھی جمع بنانے کا طریقہ خاص دکنی کی خاصیت ہے جیسے

کالیاں، گوریاں، سکیاں، کوں جگ میں جوتھیاں سو بسریا
کونلی سکی کوں دیکھت میں سد بھولیا دکن میں

(محمد قلی قطب شاہ)

کچیاں، کونلیاں، کنواریاں، ناریاں، کلیاں کوں نوروز آیا
محمد صدقے قطبا کوں انداں سوں ملایا ہے

(محمد قلی قطب شاہ)

وجہی ''سب رس'' میں لکھتے ہیں:

''عورتاں بچاریاں بہت بھلیاں ہیں'' (سب رس)

رو رو کے نیل پڑے ہیں نیلیاں انکھیاں ہویاں بھی
تو دل میں دوی صورت ہے جو جھڑک گئے نیلے پر

(ہاشمی)

ضمائر کے لیے دکن میں جتنے الفاظ ملتے ہیں وہ شاید ہندوستان کی کسی بھی زبان میں نہیں ملتے۔ ڈاکٹر حبیب ضیا نے دکنی ضمائر کی پوری تفصیل دی ہے

ضمیر متکلم : حالتِ فاعلی۔ میں' اپے' ہم' ہمن' ہمنا' ہمے' ہمیں

حالت مفعولی مجے' منجے' مجہ' منج' منج کوں' ہمنا' ہمنا کوں

حالت اضافی موَ' مج' منج ہمن' ہمارا

ضمیر مخاطب : حالت فاعلی توں' تو تم' تمن' تمنا' تمیں' تمہیں

حالت مفعولی تج' تجھ' تجے' تج کوں تمن' تمنا' کوں

ضمیر غائب : حالت فاعلی وہ' وؤ' اوَ' وے' انے ان' اونو' وے

حالت مفعولی اس' اس کوں' اسے انوں کوں' انہوں کو' ان کوں

حالت اضافی دن کا' اتن' انو کا' اینو کا

(دکنی زبان کی قواعد صفحہ 86)

ضمیر موصول : حالت فاعلی جو' جیو' جے' جن' جن نے' جنے جن' جنو' جنہوں

حالت مفعولی جسے' جس کوں جنہوں کو

حالت اضافی جس کا جنہوں کا

ضمیر استفہام حالت فاعلی کوں' کن' کنے' کو کن

حالت مفعولی کسے' کس' کس کوں کنے کوں

حالت اضافی کس کن کا

ضمیر اشارہ قریب : یوں' اے' یے

ضمیر اشارہ بعید : وہ' وو

ضمیر تنکیر : کچھ' کچ' کوچ

وہ افعال جو متعلق فعل زماں کہلاتے ہیں۔ دکنی میں ملتے ہیں ان افعال سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فعل کس زمانے میں واقع ہوا۔

1. اب کے لیے اِتا' اِتال' ایتال
2. جب کے لیے جداں' جدھاں' جَو
3. تب کے لیے تدھاں' تو
4. اول کے لیے پچھے' پچھیں' پچھیں
5. جلدی کے لیے تُرت' بیگی' بیگ
6. ہمیشہ کے لیے جم' سدا

متعلق فعل استفہام' جس میں فعل کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔ دکنی میں ذیل کے الفاظ ملتے ہیں:

کیوں کے لیے کی' کے' کاہے' کاہے کوں' کائیکوں' کس دھات

ڈاکٹر حبیب ضیا نے لکھا ہے:

''کیوں'' کے لیے ''کے'' کا استعمال دکنی کے لیے خاص ہے۔ اردو میں یہ لفظ ان معنوں میں کبھی استعمال نہیں ہوا۔''

مثال کے طور پر انہوں نے یہ شعر پیش کیا ہے:

مو نین میانے بیس کے بھی کے نہ آوتے
مجلس ہماری کوں نہیں درباں کا احتیاج

(دکنی زبان کی قواعد صفحہ 191)

متعلق فعل عدد میں یک بار کے علاوہ دو بار کے لیے ''دو جی بار'' سو بار کے لیے ''صد بار''، متعلق فعل مقدار میں اتنا کے لیے ''یتا'' جتنے کے لیے ''جتا'' مرکب متعلق فعل سے کسی فعل کی وضاحت ہوتی ہے۔ دکنی میں اس کی بھی کئی صورتیں ملتی ہیں:

1. کئیں کا کئیں 'آ سے پا سے
2. جاں تلک' وہاں تلک' جو لگ' اب لگ' جدھاں لگ' جاں لگوں
3. جلگ' تلگ' جو' نگن' گو تلک

علامتِ اضافت: اردو میں علامت کا' کے' کی ہے۔ لیکن دکنی میں ان کے ساتھ علامتِ اضافت کی قدیم شکلیں بھی بہت استعمال ہوتی ہیں: کا' کے' کرا اور کیرا' کے کے لیے ''کیرے'' کی کے لیے ''کری'' اور ''کیری''

حرفِ جار: اسم یا ضمیر کا تعلق فعل یا صفت کے ساتھ ظاہر کرنے والے حروف حرفِ جار کہلاتے ہیں۔ اردو میں ''سے''، ''ئیں''، ''تک' اور پر استعمال ہوتے ہیں۔ دکنی میں ان کے علاوہ حرفِ جار کی کئی صورتیں ملتی ہیں:

''سے'' کے لیے ''سوں''۔ ''ستی''۔ ''سیتی''۔ سیتیں''۔ سیتھیں''۔ ''سیں''۔ ''سے''۔ ''ستھے''۔ ''تھے''۔

''تے''۔ ''تک'' کے لیے ''تلگ''۔ ''لگ''۔ ''لگوں''۔ ''لگن''۔ ''پر'' کے لیے ''اپر' اپرال' پوپہ

الفاظ کی تکرار سے بعض وقت تاکید' بعض جگہ مبالغہ تو کبھی تعمیم اور کبھی کثرت کا مفہوم پیدا کیا جاتا ہے۔ دکنی کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں صرف لفظ کی تکرار نہیں ہوتی بلکہ ''ے'' کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جیسے 'بال بال' کی جگہ 'بالے بال'۔ 'رگ رگ کی جگہ 'رگے رگ'۔ 'جنگل جنگل' کی جگہ 'جنگلے جنگل' بن بن کی جگہ 'بنے بن' وغیرہ۔ ڈاکٹر حبیب ضیا نے اس سلسلے میں درج ذیل اشعار پیش کیے ہیں۔ جن میں مذکورہ بالا الفاظ کی تکرار دکنی زبان کی اس خاصیت پر روشنی ڈالتی ہے۔

رگے رگ بالے بال تے وچہ نام
دھڑکتا نکلتا اچھے جم مدام

.....

کرم کے بھار **نئیں** نکلے نہیں تو
گھرے گھر غلغلا در زور ہوتا

.....

دنڈلا کے دندے اے چھوڑ گھروا
ہو جنگلے جنگل فرار پکڑے

اگر تج سا سرد **کئیں** ھور ہوتا
بنے بن بلبلاں کا شعور ہوتا

اپنی معلومات کی جانچ :

1. دکنی کے کون سے مخصوص الفاظ شمالی ہند کی زبانوں اور بولیوں میں بھی پائے جاتے ہیں؟
2. الفاظ کی تکرار کے ذریعے کثرت کا مفہوم دکنی اردو میں کس طرح پیدا کیا جاتا ہے؟

4.7 دکنی میں الفاظ کی تکرار، حروفِ استدراک اور حروفِ تشبیہہ

الفاظ کی تکرار کے سلسلے میں دکنی میں ''ے'' کے علاوہ ''ی''، ''ن'' کا بھی استعمال ہوتا ہے جیسے :

عشق نے کھیل کھیلیا ٹھارین ٹھار (ماخوذ دکنی زبان کی قواعد)

حروف عطف دو جملوں یا کلموں کو ملاتے ہیں۔ اردو میں ''اور'' ''و'' اور ''یا'' حروف عطف ہیں۔ اردو کے عام قاعدے کے مطابق ایک ساتھ دو حروف عطف نہیں آتے لیکن دکنی زبان کی یہ خاصیت ہے کہ اس میں بعض وقت دو حروف عطف آتے ہیں: جیسے

قدر عنا و ہور لٹکتا چال (محمد قلی)

اسی طرح ''د'' اور ''یا'' ایک ساتھ

ہمیں کیا جو ہمناتے کچ خیر ہو
اپس نفس پر حب و یا بیر ہو (نصرتی) (دکنی زبان کی قواعد صفحہ 227-226)

حروف استدراک : دو جملوں کے درمیان حروف استدراک آتے ہیں۔ پہلے جملے میں جو شبہ ہوتا ہے، اسے یہ حروف دوسرے جملے میں رفع کر دیتے ہیں۔ اردو میں 'لیکن'، 'مگر' گر چہ' اور 'بلکہ' حروفِ استدراک ہیں۔ دکنی میں گو مذکورہ بالا حروفِ استدراک استعمال ہوتے ہیں لیکن خاص دکنی کے حروف استدراک ''ولے''۔ ''پن''۔ اور ''اما''

1. ''بعض کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ کوں قیامت میں دیکھیں گے
ولے حیراں ہوئیں گے کہہ ناسکیں گے'' (وجہی)
2. ع ''بات جدا پن بھید و ہیچ (وجہی)
3. ع بتی ساری تھی اما تیل نئیں تھا (ابن نشاطی)

حروف استثنا : یہ حروف ایک چیز یا شخص کو دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔ اردو میں ''بغیر'' اور ''بجز'' ملتے ہیں۔ دکنی میں ان کے لیے 'بن'، 'بنا' اور 'باج' بھی ملتے ہیں جیسے:

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج یک تل جیا جائے نا
(محمد قلی قطب شاہ)

یا

وہاں دوسرا نہ تھا کوئی علی باج (وجہی)
تجھ بن اور نکوے ناخالق دو جا ہوئے

حروف تخصیص اردو میں کئی ہیں' ہر' بھی' تو' ہی' لیکن جو دکنی کے لیے مخصوص ہیں وہ ''بھی'' جگہ ''بی'' جیسے

انو بی یو مخفی اسراریوں کتے ہیں اظہار

اردو اور دکنی دونوں میں ''ہی'' یہی' وہی استعمال ہوتے ہیں لیکن دکنی کا مخصوص حروفِ تخصیص ''چ'' ہے۔ یہ مرہٹی زبان کے اثر سے آیا ہے جیسے وے حیران ہوئیں گے کہہ نا سکیں گے کہ یونچہ ہے یا ایسا چ ہے (وجہی) اسی طرح اتنا ہی کے لیے ''انتاج'' ویسا ہی کے لیے ''ویساچ'' اپنا ہی کے لیے ''اپناچ'' تیرا ہی کے لیے ''تیراچ'' دکنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

حروف تشبیہ :ایک دوسرے کے مانند قرار دینے کے لیے آتے ہیں۔ اردو اور دکنی میں' مانند' 'سی' 'سا' کے حروف آتے ہیں لیکن مخصوص دکنی کے حروفِ تشبیہ حسب ذیل ہیں:

''ناد''۔ ''نمن''۔ ''سار''

چلی پانی پہ کشتی باد کے سار
فلک کے ناد کس جاگے پہ ناٹھار

(ابن نشاطی)

.....

کیا سُکھ وطن واں عزیزاں کی سار
گیا دُکھ سو دندیاں نمن جگ تے بھار

(نصرتی)

.....

رگ رگ وہ خوش روح نمنے سرس
جلگ دینے ہارا اتھا رنگ رس

(نصرتی)

اردو میں پریشانی' حیرانی اور سرگردانی استعمال ہوتے ہیں لیکن دکنی میں پریشانی کی جگہ ''پریشانگی'' حیرانی کے لیے ''حیرانگی'' اور سرگردانی کے لیے ''سرگردانگی'' استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے

''لٹ کو اس کی پریشانگی پر' اس کی حیرانگی پر' اس کی سرگردانگی' پر مہر آئی'' (وجہی)

دکنی اردو اور اردوئے قدیم دونوں کی لسانی خصوصیات ایک ہی تھیں۔ لیکن موجودہ زمانے میں چونکہ قدیم اردو تحریری شکل میں محفوظ نہیں رہ سکی اس وجہ سے جدید اردو' قدیم اردو سے بالکل الگ اور مختلف ہوگئی۔ اور آج دکنی اردو کی لسانی خصوصیات ہی ہماری دسترس میں ہیں۔ لیکن اردو زبان کے ارتقا کے تسلسل کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے قدیم اردو کی لسانی خصوصیات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے یہاں دکنی اردو کے ساتھ ساتھ قدیم اردو کی لسانی خصوصیات کو بھی واضح کر دیا گیا ہے تا کہ ان حضرات کے سامنے جو دکنی اور جدید اردو کو الگ سمجھتے ہیں اردو زبان کے ارتقا کا نقشہ بھی آ جائے۔ اور دکنی اردو کی لسانی خصوصیات بھی واضح ہو جائیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. دکنی اردو کے خاص حروفِ تخصیص اور حروف تشبیہ کیا ہیں؟
2. جدید اردو' قدیم اردو سے بالکل مختلف کیوں ہوگئی؟

4.8 خلاصہ

اردو کی پیدائش شمالی ہند میں ہوئی' یہ بات مسلمہ ہے۔ وہی اردو بولنے والے دکن میں جب آباد ہوئے تو اس زبان کا فروغ دکن میں ہوا۔ اردو کے نام' مقام کی مناسبت سے بدلتے گئے۔ چونکہ اردو ہند میں پیدا ہوئی اس وجہ سے اسے ''ہندی'' بھی کہا گیا اور ہندوستان کی مناسبت سے ''ہندوی'' بھی کہلائی۔ ابتدا میں اردو کو ''ہندی'' اور ''ہندوی'' بھی کہا گیا۔ دہلی میں چونکہ اس کو فروغ حاصل ہوا اس وجہ سے وہ ''زبان دہلوی'' بھی کہلاتی اور جب وہ گجرات پہنچی تو ''گجری'' کے نام سے بھی وہ پکاری گئی۔ دکن جب وہ آئی تو ''دکنی'' کہلائی۔ دکن کے بعد جب پھر وہ ادبی روپ اختیار کر کے شمالی ہند پہنچتی ہے تو ''ریختہ'' کہلاتی ہے۔ شاہی دربار میں پہنچی تو ''اردوئے معلیٰ'' کہلائی۔ ''اردو'' اس کا نام بہت بعد میں پڑا۔

قدیم اردو اور دکنی ایک ہی زبان تھی۔ اسی وجہ سے شمس اللہ قادری نے دکنی شعرا کا جب تذکرہ لکھا تو اسے ''اردوئے قدیم'' کا نام دیا۔ دکنی اور قدیم اردو کی لسانی خصوصیات ایک ہی ہیں۔ اس وجہ سے ہم دکنی کو قدیم اردو اور قدیم اردو کو دکنی کہیں تو ایک ہی بات ہوگی۔ دکنی کی سب سے بڑی اور اہم خاصیت یہ تھی کہ وہ ہندوستان کی دوسری زبانوں سے بہت قریب تھی۔ جیسا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں دکنی اردو پر کھڑی بولی' برج بھاشا' اودھی' پنجابی' سرائیکی' راجستھانی' سنسکرت کے اثرات پڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے فخر الدین نظامی کی زبان کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس پر راجستھانی اور پنجابی کے علاوہ اَپ بھرنشی روایات کا اثر بھی صاف طور پر نظر آتا ہے۔ اور یوں دکنی زبان پر نواح دہلی کی کئی زبانوں کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اردو سارے ہندوستان میں پھیل رہی تھی اسی وجہ سے صوفیا اور مذہبی پیشواؤں نے بھی اپنی تعلیمات اور تلقین کے لیے اسی زبان کو اپنایا۔ دکنی کی دوسری خاصیت یہ ہے کہ اس میں سنسکرت کے بھی بہت سے الفاظ خالص شکل میں اور بدلی ہوئی شکل میں ملتے ہیں۔ دکنی کے اسما' ضمائر' افعال اور حروف اپنی خاصیت رکھتے ہیں۔ گو یہ قدیم اردو میں پائے جاتے ہیں لیکن جدید اردو میں چوں کہ یہ بالکل نہیں ملتے اس لیے یہ دکنی اردو کی لسانی خاصیت بن گئے ہیں۔

شمالی ہند میں اصلاح زبان کی تحریکوں کی وجہ سے بھی دکنی اور جدید اردو میں دوری پیدا ہوگئی سب سے پہلے مظہر جان جاناں نے یہ تحریک شروع کی' بعد میں حاتم اور پھر ناسخ نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کی وجہ سے وہ ہندوستانی الفاظ جو اردو ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی استعمال ہوتے تھے وہ متروک قرار دیئے گئے۔ جو الفاظ ان کی تحریکوں کی وجہ سے متروک ہوئے وہ سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ یہاں ان میں سے چند دیے جا رہے ہیں:

نین (چشم)' ساجن (معشوق)' جگ (دنیا)' پیا (معشوق)' من (دل)' سنسار (دنیا)' دارو (دوا)' بنا (بن)' **نئیں** (نہیں)' تجنا اور (چھوڑنا) یہ تمام الفاظ دکنی میں استعمال ہوتے آئے تھے۔ ان کو ترک کرنے سے بھی دکنی یا قدیم اردو اور جدید اردو میں دوری پیدا ہوگئی۔ شمالی ہند کے قدیم شاعروں کے پاس دکنی کی بہت سی لسانی خصوصیات ملتی ہیں۔ جیسے ''اں'' سے جمع بنانے کا قاعدہ' افضل' اور شیخ محبوب عالم کے یہاں بھی ملتا ہے۔ اسی طرح اسما میں جمع کا صیغہ استعمال ہو تو افعال میں بھی جمع کا صیغہ استعمال کرنے کا قاعدہ میر اور سودا کے ہاں بھی ملتا ہے۔ اس کے تعلق سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے لکھا ہے کہ یہ صرف میر و سودا ہی نہیں بلکہ داغ نے بھی استعمال کیا ہے:

اسی طرح سے آئیاں' جائیاں وغیرہ حاتم' میر اور سودا سے لے کر لکھنو میں میر انیس اور دہلی میں داغ تک نے باندھا ہے' البتہ صفت کی جمع دکنی اردو کی لسانی خاصیت ہے۔ جیسے محمد قلی نے کہا ہے۔

کالیاں گوریاں سکیاں کوں جگ میں جوتھیاں سو بسریا
کونلی سکی کوں دیکھت ' میں سد بھولیا دکن میں

دکنی کی ایک اور لسانی خصوصیت یہ رہی ہے کہ ضمائر کے لیے اس میں جتنے الفاظ ملتے ہیں وہ شاید ہی کسی اور ہندوستانی زبان میں ملیں۔ ویسے اپے' ہمنا' ہمیں' تمنا' تمیں' یو' اے' یے' وو اس طرح بیسیوں الفاظ ملتے ہیں۔

الفاظ کی تکرار سے بعض وقت تاکید' بعض جگہ مبالغہ کبھی تعمیم اور کبھی کثرت کا مفہوم پیدا کیا جاتا ہے۔ دکنی کی خاصیت یہ ہے کہ ''ے'' لگا کر الفاظ کی تکرار کی جاتی ہے جیسے جنگل جنگل کی جگہ جنگلے جنگل' بال بال کی جگہ بالے بال' گھرے گھر' رگے رگ وغیرہ۔ اسی طرح بعض حروف تشبیہ بھی

خاص دکنی کے ہیں۔ مانند یا طرح کی جگہ ''ناد''، تمنے، نمن اور سار، بعض حروفِ استدراک خاص دکنی کے ہیں۔ یہ حروف دو جملوں کے درمیان آتے ہیں پہلے جملے میں جو شبہ ہوتا ہے وہ دوسرے جملے سے رفع ہو جاتا ہے۔ اردو میں لیکن، مگر، گرچہ، بلکہ حروفِ استدراک ہیں۔ دکنی میں ان کے علاوہ، ولے، پن، اما ملتے ہیں اور یہ دکنی کے لیے مخصوص ہیں:

ولے حیراں ہوئیں گے کہہ نا سکیں گے (وجہی)

بات جدا پن بھید و ہیچ (وجہی)

بتی ساری تھی اما تیل **نئیں** تھا (ابن نشاطی)

یہی دکنی اردو کی لسانی خصوصیات ہیں جو اسے جدید اردو سے الگ کرتی ہیں۔

4.9 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے۔

1. دکنی اور قدیم اردو کی جو مشترک لسانی خصوصیات ملتی ہیں۔ ان پر روشنی ڈالیے۔
2. ضمائر، افعال، حروفِ تخصیص، حروفِ استدراک اور حروفِ تشبیہ جو خاص دکنی زبان کے ہیں، ان کی تفصیل بیان کیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. دکنی اردو کی سب سے بڑی اور اہم لسانی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔
2. دکنی میں جو سنسکرت الفاظ ہیں ان کی نوعیت کیا ہے؟
3. دکنی کے تعلق سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کون سا لسانی نظریہ پیش کیا ہے؟

4.10 فرہنگ

الفاظ = معنی الفاظ = معنی الفاظ = معنی

لسان = زبان، بولی صرف = وہ علم جس سے کلموں کی شناخت اور ادل بدل معلوم ہو

نحویہ = وہ علم جس سے کلمات کا جوڑنا، توڑنا اور ان کا باہمی تعلق معلوم ہو مونین = میری آنکھیں

میانے = میں بھار = باہر، بوجھ دندے = دشمن

جاگہ = جگہ ٹھارنا = ٹھہرنا دینے ہارا = دینے والا

غریب الفاظ = ناموس الفاظ

4.11 سفارش کردہ کتابیں

1. پروفیسر مسعود حسین خاں — مقدمۂ تاریخ زبان اردو
2. ڈاکٹر جمیل جالبی — تاریخ ادب اردو (جلد اول)
3. ڈاکٹر حبیب ضیا — دکنی زبان کی قواعد

اکائی : 5 لسانیات کا مفہوم ۔ مصّوتے و مصمّتے

ساخت

5.1 تمہید

5.2 لسانیات کیا ہے؟

5.2.1 لسانیات کی تاریخ

5.3 لسانیات کی شاخیں

5.3.1 توضیحی لسانیات

5.3.2 بولیاں

5.3.3 سماجی لسانیات

5.3.4 ذولسانیات

5.3.5 نفسیاتی لسانیات

5.3.6 تاریخی لسانیات

5.3.7 اسلوبیات

5.4 صوتیات

5.5 مصّوتے

5.5.1 اردو مصّوتے

5.6 مصمّتے

5.6.1 اردو مصمّتے

5.6.2 خالص ہندی آوازیں

5.6.3 خالص فارسی آواز

5.6.4 خالص عربی آواز

5.6.5 ہندی فارسی مشترک آوازیں

5.6.6 ہندی عربی مشترک آوازیں

5.6.7 فارسی عربی مشترک آوازیں

5.6.8 ہندی فارسی عربی مشترک آوازیں

5.6.9 اردو کے مصمّتے ۔ جدول

5.7 خلاصہ

5.8 نمونۂ امتحانی سوالات

5.9 فرہنگ

5.10 سفارش کردہ کتابیں

5.1 تمہید

انسانی زندگی میں زبان کی بڑی اہمیت ہے۔قوتِ گویائی ہی انسان اور حیوان میں فرق قائم کرتی ہے ۔ ۔ زبان کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود انسانی زندگی کی تاریخ قدیم ہے۔ زبان ہمارے احساسات' جذبات و خیالات کو ادا کرنے کا ایک اہم وسیلہ ہے ۔ زبانیں جتنی طاقتور ہوں گی اتنی ہی ان میں تبدیلیاں رونما ہوں گی ۔ زبان آواز اور الفاظ کا مجموعہ ہے جس میں معنی کا ہونا ضروری ہے ۔ الفاظ اور معنی میں ربط و تعلق ہی سے ترسیل و ابلاغ میں سہولت ہوتی ہے۔ زبانوں کے سائنسی مطالعے اور تجزیے کا نام لسانیات ہے جس کی مختلف شاخیں ہیں۔

5.2 لسانیات کیا ہے؟

انسانی سماج میں زبان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔ زبان' ابلاغ و ترسیل کا بنیادی وسیلہ ہے۔ زبان کا تصور اعضائے نُطق سے ادا کی جانے والی آوازوں سے ہے۔ اعضائے نطق سے ادا کی جانے والی آوازیں بے معنی بھی ہوسکتی ہیں اور ہوتی ہیں ۔لیکن جب یہی آوازیں ایک ترتیب کے ساتھ ادا ہوکر بامعنی لفظ بن جاتی ہیں تو یہ خیالات اور احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہیں۔ زبان کے سائنسی مطالعے اور تجزیے کا نام لسانیات (Linguistics) ہے۔

لسانیات یا علم زبان کو بالعموم لسانی علوم (Linguistic Sciences) کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لسانیات دو علوم کا مجموعہ ہے جو مندرجہ ذیل ہیں :

1. لسانیات
2. صوتیات

صوتیات لسانیات کے مطالعے میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اور لسانیات یا زبان کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے ''بنیاد کا پتھر'' ثابت ہوتی ہے۔صوتیات پر تفصیلی گفتگو آگے آئے گی ۔

5.2.1 لسانیات کی تاریخ

زبان کے مطالعے کو علمی انداز سے سمجھنے اور پرکھنے کی ابتدا' دیگر بہت سے علوم کی طرح 'ہندوستان ہی میں ہوئی ۔ یہ ایک قدیم علم ہے۔ اس کا سہرا سنسکرت کے مشہور عالم پانینی (Panini) کے سر جاتا ہے' جنھوں نے آج سے اندازاً ڈھائی ہزار قبل سنسکرت کا سائنسی مطالعہ کرکے اس کی قواعد لکھی اور اس کی آوازوں کے ساتھ سنسکرت زبان کے قواعد وضوابط تحریر کیے۔ پانینی (Panini) کی اس قواعد کی کئی ہزار صفحوں میں تشریحیں اور توضیحیں پیش کی گئیں ۔صوتیات کے اصول بھی پہلے پہل یہیں تیار کیے گئے ۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں ڈبلیو ۔ ڈی ۔ وھٹنے (W.D. Whitney) نے زبان اور علم زبان پر ایک یادگار تصنیف چھوڑی ہے لیکن اس علم کا باقاعدہ ارتقا 1914 ء کی پہلی جنگ عظیم کے بعد شروع ہوا۔ اس کی ضرورت یوں پیش آئی کہ جنگ عظیم کے زمانے میں فوجیوں کو کم سے کم وقت میں مختلف علوم کی زبانیں سیکھنی تھیں ۔ زبانوں کو کم وقت میں سیکھنے کی اس ضرورت نے جدید لسانیات (Modern Linguistics) کو فروغ دیا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. لسانیات سے کیا مراد ہے؟
2. زبان کے مطالعے میں پانینی کی کیا اہمیت ہے؟
3. علم زبان کا باقاعدہ آغاز کب ہوا؟

5.3 لسانیات کی شاخیں

لسانیات میں زبانوں کا مطالعہ سائنسی بنیادوں پر کرنا پڑتا ہے جس کی کئی ذیلی شاخیں ہیں جن میں سے چند اہم شاخیں یہ ہیں :

.1	صوتیات	Phonetics
.2	توضیحی لسانیات	Descriptive Linguistics
.3	بولیاں	Dialectology
.4	سماجی لسانیات	Socio-Linguistics
.5	ذولسانیات	Bilingualism
.6	نفسیاتی لسانیات	Psycholinguistics
.7	تاریخی لسانیات	Historical Linguistics
.8	اسلوبیات	Stylistics

صوتیات انسانی اعضائے نُطق سے ادا ہونے والی آوازوں کا علم ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی ۔

5.3.1 توضیحی لسانیات

توضیحی لسانیات زبان کے ڈھانچے سے بحث کرتی ہے ۔دنیا بھر کے ماہرین لسانیات کو زیادہ تر توضیحی لسانیات ہی سے سابقہ پڑتا ہے جسے تجزیاتی لسانیات بھی کہا جاتا ہے۔ توضیحی یا تجزیاتی لسانیات میں صرف ونحو کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔لفظوں کے مطالعے یعنی صَرف کو Marphology کہا جاتا ہے۔ Marphology میں لفظ کی ساخت کا مطالعہ کیا جاتا ہے مثلاً ایک مادّے میں سابقے اور لاحقے لگا کر نئے الفاظ کیسے بنائے جاسکتے ہیں۔جملوں کے مطالعے یعنی نحو کو Syntax کہتے ہیں ۔اس کا موضوع جملہ یا فقرہ ہے ۔زبان کی قواعد میں صرف و نحو کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

5.3.2 بولیاں

لسانیات میں ''زبان'' اور ''بولی'' دو تصورات ہیں۔ جب بول چال کی زبان ضبط تحریر میں آتی ہے اور اس میں شعر و ادب لکھا جانے لگتا ہے تو اس کا ایک معیار متعین ہوتا ہے ۔ یہ معیار قطعی اور آخری نہیں ہوتا اس میں بھی وقت اور مقام یعنی زماں و مکاں کے ساتھ تبدیلیاں آتی ہی رہتی ہیں۔ اگر یہ تبدیلیاں اور تغیرات ختم ہوجائیں تو سمجھیے کہ اس زبان کا خاتمہ ہونے والا ہے۔عوام زبان بولتے ہیں عالم اور ادیب اسے ضبط تحریر میں لاکر شعر و ادب کی تخلیق کرتے ہیں۔ اصول وضوابط ایک زبان کو معیار عطا کرتے ہیں۔ معیاری زبان کو ادیبوں' شاعروں اور اساتذہ کی قبولیت حاصل ہوتی ہے۔

بولی میں اصول وضوابط کی پابندیوں پر کوئی گرفت نہیں ہوتی۔ اگرچہ معیاری زبان اور بولی کا بنیادی لسانی ڈھانچہ ایک ہی ہوتا ہے۔ صرف لفظیات' تلفظ' محاورے اور لب و لہجے میں کبھی ہلکا اور کبھی گہرا فرق ہوتا ہے۔ انگلستان میں معیاری انگریزی کی بھی چند بولیاں ہیں۔ بولی اور زبان میں یہ فرق کیفیت اور کمیت کا ہوتا ہے۔

اردو ایک کل ہند رابطے کی زبان ہونے کی وجہ سے مقامی زبانوں اور بولیوں کے زیر اثر اس کی متعدد علاقائی بولیاں ہوگئی ہیں۔ روزمرہ بولی جانے والی زبان علاقائی بولی ہے۔ ان کی زبان پر علاقائی زبانوں کے اثرات ہیں۔ مہاراشٹرا کی عام بول چال کی اردو پر مراٹھی کے اثرات ہیں۔ گجرات میں گجراتی کے' اندھرا پردیش میں تلگو' کرناٹک میں کنڑ' بنگال میں بنگالی اور پنجاب میں پنجابی کے اثرات کی وجہ سے بول چال کی اردو ان علاقوں کی علاقائی بولی بن گئی ہے۔ اردو زبان میں بولیوں کا یہ تنوع دنیا کی کسی دوسری زبان میں کم ہی دکھائی دے گا۔

بڑے بڑے شہروں میں جہاں مختلف علاقوں سے آ کر لوگ بس گئے ہیں' ایک الگ محاورہ بن گیا ہے۔ یہ ان بڑے شہروں میں اردو کی بولیاں ہیں ۔اس کی سب سے اچھی مثال حیدرآباد دکن اور ممبئی کی اردو ہے جس میں شمال وجنوب اور مشرق ومغرب اور اطراف و جوانب کی زبانوں کا عمل دخل صاف نظر آتا ہے۔

5.3.3 سماجی لسانیات

زبان سماجی سطحوں پر بدلتی رہتی ہے ۔کسی بھی زبان کا سماجی سطحوں پر مطالعہ سماجی لسانیات کا موضوع ہے جیسے اردو میں احترام اور تعظیم کے اظہار یعنی آدابِ گفتگو میں سماجی مرتبے و مقام کی بنیادوں پر تبدیلیاں آتی رہتی ہیں جیسے تو ' تم اور آپ' آ ' آو' آیئے' تشریف لایئے ۔ بیٹھ' بیٹھو' بیٹھئے اور تشریف رکھیئے ۔ سماجی لسانیات میں مخاطب کے سماجی درجے' پیشے اور مرتبے کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ کرخنداری اردو اور بیگماتی اردو بھی سماجی لسانیات کے ذیل میں آتے ہیں ۔

5.3.4 ذولسانیات

سماجی لسانیات کا ایک پہلو ذولسانیات ہے۔ جب ایک شخص ایک سے زیادہ یعنی دو زبانیں بھی جانتا ہوتو اسے ہم ذولسانی کہتے ہیں۔ اگر کوئی دو سے زیادہ زبانیں جانتا ہوتو اسے کثیر لسانی اور ذولسانی دونوں کہا جاسکتا ہے یعنی کثیر لسانیت ذولسانیت ہی کے زمرے میں آتی ہے ۔ ہندوستان ایک کثیر لسانی ملک ہے۔ اس میں بسنے والے افراد اپنی مادری زبان کے ساتھ علاقائی یا قومی زبان سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ اردو بولنے والے افراد اپنی علاقائی زبانیں بھی جانتے ہیں۔ آج کل انگریزی دنیا کی سب سے طاقتور علمی زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم اور انتظامیہ و رابطہء عامہ میں اس کا استعمال ضروری سا ہوگیا ہے۔ لہٰذا لوگ ضروری حد تک اس کا استعمال کرنا جانتے ہیں۔ ایسے لوگ' ذولسانی یا کثیر لسانی کہلائیں گے۔ ذولسانیت بھی اردو کو متاثر کرتی ہے چنانچہ ہماری زبان میں مقامی اور انگریزی زبان کے الفاظ غیر محسوس طور پر درآئے ہیں اور غیر شعوری طور پر ہم انہیں اپنی روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں ۔

5.3.5 نفسیاتی لسانیات

زبان ایک نفسیاتی عمل بھی ہے ۔ یہ خیال کو ظاہر کرتی ہے ۔ اس لیے زبانوں کا نفسیاتی مطالعہ بھی کیا جاتا ہے ۔ زبان کی ابتدا کی کھوج اور معنیات میں خاص طور سے نفسیاتی لسانیات سے مدد لی جاتی ہے۔

5.3.6 تاریخی لسانیات

کسی بھی زبان کا مطالعہ تاریخی پس منظر میں کیا جائے' عہد بہ عہد تبدیلیوں کا بیان کیا جائے تو اسے تاریخی لسانیات کہتے ہیں ۔ ایک خاندان کی کئی زبانوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو یہ تقابلی لسانیات کہلاتی ہے ۔ تقابلی لسانیات میں رشتے' شجرے اور نسل کا تعین کرنا ہوتا ہے ۔ اس طرح تقابلی اور تاریخی لسانیات عملاً ایک ہی کام انجام دیتی ہیں۔ جدید تاریخی و تقابلی لسانیات کی بنیاد سر ولیم جونز نے ڈالی ہے ۔ انہوں نے سنسکرت' یونانی اور لاطینی زبانوں کا مطالعہ کرکے ثابت کیا ہے کہ یہ زبانیں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں ۔

5.3.7 اسلوبیات

اس میں دیکھا جاتا ہے کہ عبارت کو جذباتی ' تاثراتی ' تخیلاتی اور شاعرانہ انداز میں پیش کرنے کے لیے کیا کیا طریقے اپنائے گئے ہیں۔ اسلوبیات میں کسی بھی فن پارے کا صوتیاتی ' لفظیاتی ' صرفی ونحوی تجزیہ کرکے فن پارے میں برتی گئی تکنیک اور صاحب قلم کی نفسیاتی کیفیات کا جائزہ لیا جاتا ہے ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. لسانیات کی تین اہم شاخوں کے نام بتایئے۔
2. زبان اور بولی میں کیا فرق ہے؟
3. ذولسانیات سے کیا مراد ہے؟
4. تاریخی یا تقابلی لسانیات کی بنیاد کس نے ڈالی؟

5.4 صوتیات

صوتیات انسانی اعضائے نطق سے پیدا ہونے والی آوازوں کا علم ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔ لسانیات میں اس کی اپنی آزادانہ حیثیت ہے۔ آوازوں کی مختلف اقسام ہیں' علم الاصوات انہیں اقسام کے مطالعے کا نام ہے۔ اس میں آوازوں کے مخارج وغیرہ سے بحث ہوتی ہے۔ صوتیات ان ساری آوازوں کے مطالعے کا نام ہے جو دنیا کی کسی بھی زبان میں استعمال ہوتی ہیں۔ ان کی کثیر تعداد ہوتی ہے۔ ان ساری آوازوں کا مطالعہ ''عام صوتیات'' یا General Phonetics کہلاتا ہے۔ یہ ساری آوازیں سبھی زبانوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً انگریزی' فرانسیسی' جرمن' روسی' عربی اور فارسی کی آوازیں' عمومی صوتیات میں سے چند آوازیں ہی ہوتی ہیں' مشترکہ آوازیں چند ہوتی ہیں اور چند آوازیں مختلف ہوتی ہیں اور وہ چند مختلف آوازیں جرمن' فرانسیسی یا عربی کو صوتی اعتبار سے ایک دوسرے سے ممیّز کرتی ہیں۔ لہٰذا ہر زبان کی صوتیات (Phonetics) الگ الگ ہوتی ہے' اگرچہ ان میں چند مشترک آوازیں بھی ہوتی ہیں۔

ہندوستان ایک وسیع وعریض ملک ہے۔ اس میں بولی جانے والی زبانیں مختلف خاندانی السنہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ جن میں دو خاندان ہند آریائی اور دراوڑی مشہور ہیں۔ ہند آریائی خاندان میں اردو' ہندی' مراٹھی' گجراتی' پنجابی' بنگالی اور سندھی وغیرہ شامل ہیں۔ اور دراوڑی خاندان میں تلگو' کنڑ اور تامل شامل ہیں' ان سبھی زبانوں میں صوتی مماثلتوں کے باوجود اختلافات بھی ہیں اور یہ اختلافات ہی ان زبانوں کو ایک دوسرے سے ممیّز کرتے ہیں۔ چند عمومی اصوات مراٹھی میں ہیں تو اردو یا ہندی میں نہیں ہیں' چند آوازیں صرف سندھی کی خصوصیت ہیں' دیگر ہند آریائی زبانوں میں وہ استعمال نہیں ہوتیں۔ زبانوں سے تھوڑی بہت دلچسپی کی بنا پر' مشاہدے اور آوازوں کے تئیں ہلکی سی فہم وتربیت سے یہ صوتی فرق معلوم ہوسکتا ہے۔

علم الاصوات (Phonetics) میں آوازوں کی یوں تو کئی اقسام ہیں لیکن دو بڑی اقسام درج ذیل ہیں :

1. مصوتے Vowels
2. مصمتے Consonants

اپنی معلومات کی جانچ:

1. عام صوتیات سے کیا مراد ہے؟
2. اردو کا تعلق کس خاندان السنہ سے ہے؟
3. دراوڑی خاندان سے تعلق رکھنے والی دو زبانوں کے نام بتایئے۔
4. علم الاصوات کی دو بڑی قسموں کے نام لکھیے۔

5.5 مصوتے

مصوتے' اعضائے نطق سے پیدا ہونے والی وہ آوازیں ہیں جن میں پھیپھڑوں سے نکلنے والی سانس (Air Stream) منہ میں کہیں بھی

رکاوٹ کے بغیر خارج ہوتی ہے ۔صرف زبان اوپر' نیچے یا درمیانی حالت میں ہوتی ہے (بغیر رکاوٹ کے) یا ہونٹ مدور (Rounded) یا غیر مدور (Unrounded) ہوتے ہیں ۔مصوتوں کی ادائیگی میں منہ کم یا زیادہ کھلا ہوتا ہے' لیکن کہیں رکاوٹ نہیں ہوتی ۔

آ '	آ '	اِ '	اِی '	اُ '	اُو	اردو میں اور
a	a:	i:	i:	o	u	انگریزی میں
ऊ	उ	ई	इ	आ	अ	ہندی/مراٹھی میں
او	او	ای	ا	آ	ا	

مصوتوں کی مثالیں ہیں ۔مصوتہ اصطلاحی لفظ ہے ۔ ہماری عام اردو قواعد میں اسے ''حرفِ علت'' کہا جاتا ہے ۔

5.5.1 اردو مصّوتے

اردو کے مصوتے ہند آریائی اصل سے تعلق رکھتے ہیں جو دیوناگری رسم الخط میں حسب ذیل ہیں :

ओ	ए	ऊ	उ	ई	इ	आ	अ
او	اے	اُو	اُ	ای	اِ	آ	اَ

اردو میں دوہرے مصّوتے (Dipthongs) دو ہیں جو حسب ذیل ہیں

ऐ	ऐ
اے	اَوْ

اوپر اقلی جوڑوں کا ذکر ہوا ہے ۔ یہ بات اردو مصّوتوں کے تعلق سے بھی صحیح ہے مثلاً

məl (ـَ) زبر

m a l (ـّ) مد

m i l (ـِ) زیر

m i:l (ـٰ) کھڑا زیر

m u l (ـُ) پیش

m u: l (ـُ) اُو

m e l (اے)

m o l (او)

اردو کے یہ مصّوتے انسانی منہ کی شکل کے ذریعے درج ذیل خاکے میں پیش کیے گئے ہیں ۔

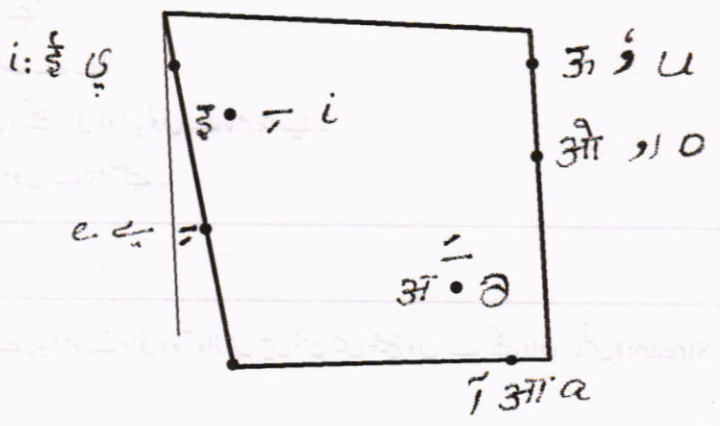

اپنی معلومات کی جانچ :

1. مصوّتے کی تعریف کیجیے۔
2. اردو مصوّتے کون سے ہیں؟

5.6 مُصمّتے

مصمتے' صوتیات (Phonetics) میں ان آوازوں کو کہتے ہیں جن کی ادائیگی میں پھیپھڑوں سے نکلی ہوئی سانس (Air stream) منہ میں حلق سے لے کر دانتوں یا ہونٹوں تک کہیں نہ کہیں رک جاتی ہے اور یہ رکاوٹ دور ہونے کے بعد ہی وہ آواز پیدا ہوتی ہے مثلاً جب سانس ہونٹوں کے پاس آ کر روک دی جاتی ہے اور ہونٹ کھلنے کے بعد پیدا ہوتی ہے اسے دولبی یعنی دو ہونٹوں والی آوازیں کہا جاتا ہے جیسے ب(b) اور پ (P) کی آوازیں۔ ان دونوں آوازوں کی ادائیگی کے وقت سانس ہونٹوں کے پاس آ کر رک جاتا ہے اور جب رکاوٹ دور کی جاتی ہے تو ب (b) یا پ (p) کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ بَ اور پَ کی آوازوں میں البتہ جو فرق ہے وہ حلقی لبوں میں اہتزاز (Vibration) یا غیر اہتزاز (Non-vibration) کا فرق ہے۔ بَ کی ادائیگی میں حلقی لبوں (Vocal cords) میں اہتزاز پیدا ہوتا ہے اور پَ کی ادائیگی میں حلقی لبوں میں جنبش پیدا نہیں ہوتی۔ اردو میں انہیں مسموع (Voiced) اور غیر مسموع (Un-voiced) کہتے ہیں۔

بَ اور پَ کے ساتھ اگر ہکاریت (ھ) کی آواز ملی ہوئی ہو تو یہ بھی دو لبی آوازیں کہلائیں گی' مگر ہکاریت (ھ) کے ساتھ انہیں ہکاری (Aspirated) آوازیں کہتے ہیں۔ چوں کہ دونوں ہونٹ بند ہوتے ہیں اس لیے انہیں دولبی بندشیہ یا دولبی ہکاری بندشیہ کہتے ہیں۔ مصمتوں کی ادائیگی میں زبان' تالو اور ہونٹ اہم رول ادا کرتے ہیں۔ زبان کا اس میں کلیدی کردار ہے۔

تَ اور دَ کی آوازوں کی ادائیگی میں نوکِ زبان اوپری دانتوں کے پاس سانس کو روک دیتی ہے۔ تَ اور دَ کی آوازیں اسی لحاظ سے دندانی آوازیں کہلاتی ہیں جن میں اول الذکر مسموع کہلاتی ہے۔ صوتیات میں مصوتے اور مصمتے کے فرق کو سمجھنے کے لیے یہ صرف چند اشارے تھے۔ اس سلسلے کی تفصیلات گوشواروں کے ذریعے' ذیل میں پھر بیان کی جائیں گی۔ دولبی بندشیہ کا ذکر ہو چکا ہے۔ اسی طرح دندانی' معکوسی' حنکی اور لہانی آوازیں بھی ہوتی ہیں جن کی ادائیگی میں اعضائے نطق کے مختلف حصے اپنا رول ادا کرتے ہیں۔

کسی بھی زبان میں آوازوں کی مختلف اقسام ہوتی ہیں' لیکن ان آوازوں کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ آوازیں محض آوازیں ہوتی ہیں۔ جب ان آوازوں کا مخصوص زبان کے سیاق میں مطالعہ کیا جاتا ہے اور جب وہ آوازیں دیگر آوازوں کے تقابل سے ممیّز اور بامعنی بن جاتی ہیں تو یہ عملی صوتیات (Phonemics) کہلاتی ہیں۔ ایسی بامعنی (Meaningful) آوازوں کو تھوتیہ (Phoneme) کہتے ہیں اور مخصوص زبانوں میں عملی نقطۂ نظر سے آوازوں کے مطالعے کو تجزیاتی صوتیات یا توضیحی صوتیات یعنی Phonemies یا Phonology کہا جاتا ہے۔ مختلف زبانوں میں کم سے کم بامعنی آواز پہچاننے کے مختلف طریقے ہیں لیکن ہماری زبان اردو یا ہندی کے حوالے سے چند الفاظ کے تقابل میں جب آواز (صوتیہ Phoneme) دوسری آواز یعنی صوتیہ سے ممیّز ہوتی ہے تو اس کو بامعنی صوتیہ آواز کہتے ہیں۔ اردو/ ہندی میں آسان طریقہ اقلی جوڑے ہیں' یعنی ایسے چھوٹے چھوٹے الفاظ جن میں دو آوازیں مماثل ہوتی ہیں اور ایک ہی آواز کی تبدیلی سے معنی میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ اقلی جوڑوں کا یہ تصور اردو کے حوالے سے مندرجہ ذیل مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔ (الفاظ لکھنے کے لیے صوتی رسم الخط استعمال کیا جاتا ہے جو صوتی مطالعے کے لیے لازمی ہے)۔

پَل pal

بَل bal

tal تَل

dal دَل

kal کَل

gal گَل

c̆al چَل

chal چھَل

nal نَل

mal مَل

jal جَل

c

اردو میں اقلی جوڑوں کے اس تقابلی اور مطالعے سے اردو کا صوتی تجزیہ کیا گیا اس سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا اس کی بنیاد پر اردو میں مصوتوں کی تعداد متعین کی گئی ۔ یہاں البتہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اردو ہند آریائی زبان ہونے کے باوجود یہ ایک مخلوط یا ملواں زبان بھی ہے جس پر عربی اور فارسی کے بھی بہت سے اثرات ہیں۔ یہ اثرات لفظی سطح پر بھی ہیں اور صوتی سطح پر بھی چوں کہ اردو نے تحریر کے لیے فارسی ۔عربی رسم خط اپنایا۔ جس سے رسمِ خط کی وجہ سے عربی فارسی کی چند خصوصیات اردو میں راہ نہ پا سکیں۔

5.6.1 اردو مصمتے

جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا جاچکا ہے' اردو ایک ہند آریائی زبان ہوتے ہوئے' ایک مخلوط زبان ہے ۔ اس پر سنسکرت کی راہ دراوڑی صوتیات کا اثر ہے تو دوسری طرف اس پر عربی اور فارسی کے بھی گہرے اثرات ہیں۔ اِدھر انگریزی زبان نے بھی اسے بہت متاثر کیا ہے۔ ان سارے اثرات کی وجہ سے اردو کا صوتی نظام (Phonetic System) ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں بہت وسیع ہوگیا ہے۔ اردو کے مصمتوں (Phonemes) میں خالص آریائی مصمتوں کے ساتھ دراوڑی' عربی اور فارسی کی آوازیں اردو صوتی نظام کا حصہ ہیں۔ مشہور ماہر لسانیات اور محقق پروفیسر مسعود حسین خاں نے ان آوازوں کو ذیل کی ترتیب سے پیش کیا ہے۔

5.6.2 1. خالص ہندی آوازیں

بھ' پھ' تھ' ٹھ' دھ' ڈھ' جھ' چھ' کھ' گھ

ٹ' ڈ' ڑ' ڑھ (یہ آخری چار آوازیں دراوڑی آوازیں ہیں جو سنسکرت کے ذریعے اردو صوتیات کا حصہ بنیں ۔

5.6.3 2. خالص فارسی آواز

ژ

5.6.4 3. خالص عربی آواز

ق

5.6.5 4. ہندی فارسی مشترک آوازیں

ب' پ' ت' ج' چ' د' ر' س' ش' ک' گ' ل' م' ن' و' ہ' ی

5.6.6 5. ہندی عربی مشترک آوازیں

ب، ت، ج، د، ر، س، ش، ک، ل، م، ن، و، ہ، ی

5.6.7 6. فارسی عربی مشترک آوازیں

ب، ت، ج، ح، خ، د، ر، ز، س، ش، ع، غ، ف، ق، ک، ل، م، ن، و، ہ، ی

5.6.8 ہندی فارسی عربی مشترک آوازیں

یہاں پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ عربی فارسی کی اصوات ذ، ص، ض، ط، ظ ت ث بھی اردو میں مستعمل ہیں، لیکن ان کی صرف تحریری حیثیت ہے اور بہت بامعنی حیثیت ہے، لیکن ان کی صوتی اہمیت قریب المخرج آوازوں میں دب گئی ہے، لہٰذا یہ اب اردو تحریر کا تو حصہ ہیں لیکن اردو صوتی نظام کا نہیں۔

اردو کی ان اصوات کو مخرج اور دیگر صوتی خصوصیات کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے۔ اردو مصمتوں (Phonemes) کی یہ ترتیب اس طرح ہے:

5.6.9 اردو کے مصمتے۔ جدول

		دولبی	دندانی	معکوسی	حنکی	غشائی	لہاتی (کوے ی)
	غیر مسموع	پ	ت	ٹ	چ	ک	ق
	نفسی / ہکاری	پھ	تھ	ٹھ	چھ	کھ	
	مسموع	ب	د	ڈ	ج	گ	
	نفسی	بھ	دھ	ڈھ	جھ	گھ	
انفی (ناک کی)	مسموع	م	ن				
	غیر مسموع	ف	س		ش	خ	
	مسموع	و	ز		(ژ)	غ	
لرزشی	مسموع		ر				
پہلوئی	مسموع		ل				
	مسموع			ڑ			
	مسموع (نفسی/ہکاری)			ڑھ			
نیم مصوّتہ					ی		

مصمتوں کے علاوہ بھی چند ایسی خصوصیات ہیں جو بامعنی ہیں مثلاً مصوتوں کو انفیانہ یعنی نونِ غنہ۔ نونِ غنہ مصوتوں کے انفیانے کا انداز ہے۔ اسے درج ذیل مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اردو میں مد (~) کی علامت، صوتی رسم الخط میں مصوتے کے انفیانے کی علامت ہے۔

جیسے sas (ساس) ۔ اور sas (سانس) ۔ مصوتہ کو انفیانے سے معنی میں فرق پیدا ہوا۔ ساس اور سانس میں جو معنی کا فرق ہے' وہ واضح ہے ۔ اسی طرح وقفہ یا Juncture بھی اردو میں بامعنی ہے جیسے :

جالے' بغیر وقفہ (Juncture) کے معنی ہوں گے جالا' یعنی مکڑی کے جالے (صیغہ جمع اور یہی لفظ جا ۔ لے ۔ وقفہ (Juncture) کے ساتھ اس کے معنی ہوں گے جا اور لے۔ اسی طرح تشدید (آواز کو دہرانا) بھی بامعنی ہوجاتا ہے' مثلاً :

پتا (pata) ۔ اور پتّا (پتہ) patta ۔ دونوں میں معنی کے فرق کی وضاحت ضروری نہیں ۔

صوتیات جو ایک آزاد علم ہے اور مطالعۂ زبان میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے' اس کا نسبتاً تفصیلی بیان کیا گیا ہے ۔ کسی بھی زبان کے مطالعے میں صوتیاتی مطالعہ ریڑھ کی ہڈّی کی طرح ہے ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. مصمتے کی شناخت کیا ہے؟
2. Phonology کو اردو میں کیا کہتے ہیں؟
3. اردو میں خالص ہندی آوازیں کون سی ہیں؟
4. ہندی' فارسی' عربی مشترک آوازیں کون سی ہیں؟
5. اردو میں خالص فارسی اور عربی آوازوں کے نام بتایئے ۔

5.7 خلاصہ

زبان ابلاغ و ترسیل کا بنیادی ذریعہ ہے۔ زبان کا تصور اعضائے نطق سے ادا ہونے والی آوازوں سے ہے۔ انسانی اعضائے نطق سے پیدا ہونے والی آوازیں بے معنی ہوسکتی ہیں اور ہوتی ہیں لیکن جب یہ آوازیں ایک ترتیب کے ساتھ ادا ہوکر بامعنی ہوجاتی ہیں' مافی الضمیر کو ادا کرتی ہیں ۔ خیالات اور احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں ۔ زبان کے سائنسی مطالعے اور تجزیے کا نام لسانیات کہلاتا ہے یعنی وہ علم جس میں زبانوں کی پیدائش کا مطالعہ' سماجی' نفسیاتی ' تاریخی' اسلوبیاتی ' ذولسانی اور بولیوں کا سائنٹفک مطالعہ علم زبان یا لسانیات کہلاتا ہے۔ لسانیات دو علوم یعنی لسانیات اور صوتیات کا مجموعہ ہے۔ لسانیات کی چند اہم قسمیں ہیں جیسے توضیحی لسانیات' نفسیاتی لسانیات' تاریخی لسانیات اور سماجی لسانیات۔ زبان اور بولی کا فرق ذولسانیات کا یہاں تعارف کرایا گیا ہے۔ ان بنیادی باتوں کے جاننے کے بعد طالب علم کو لسانیات کے مطالعے سے دلچسپی پیدا ہوسکتی ہے ۔ آج کے سائنٹفک دور میں زبانوں کا سائنٹفک مطالعہ ایک اہم ضرورت ہوگیا ہے جس کی طرف اردو کے طالب علم کو توجہ دینے کی ضرورت ہے ۔

5.8 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے :

1. لسانیات کی تعریف کرتے ہوئے اس کی مختصر تاریخ بیان کیجیے ۔
2. لسانیات کی اہم شاخیں کون کون سی ہیں ؟۔ ان کی تفصیل لکھیے ۔
3. علم الاصوات کی دو بڑی قسموں کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے ۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. ذولسانیات سے کیا مراد ہے؟
2. مصوّتے کی تعریف کیجیے۔
3. سماجی لسانیات میں زبان کا مطالعہ کس طرح کیا جاتا ہے؟
4. ہندی، فارسی، عربی مشترک آوازیں کون سی ہیں؟ لکھیے۔

5.9 فرہنگ

پانینی = دنیا کا پہلا عظیم ماہر صوتیات وقواعد داں تھا۔ اندازاً اس کا زمانہ 70 ق۔م سے 350 قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی منظوم قواعد کا نام اشٹادھیائے ہے، جس میں آٹھ ابواب اور چار ہزار سوتر (شعری سطور) ہیں۔

سر ولیم جونز = (1746 تا 1794ء) یہ کلکتہ ہائی کورٹ میں چیف جسٹس تھے۔ انہوں نے کالی داس کے ناٹک ''شکنتلا'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ اس وقت انہیں سنسکرت اور بعض یورپی زبانوں کے ہم خاندان ہونے کا اندازہ ہوا۔ انہوں نے کلکتہ میں رائل اشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔

ولیم۔ڈی وھٹنے = W.D. whitney (1827 تا 1894ء) پہلے امریکی ماہر لسانیات ہیں جنہوں نے اتھروید کو مرتب کیا اور 1879ء میں سنسکرت اور ویدک زبانوں کی قواعد شائع کی۔ لسانیات میں ان کی دو کتابیں ہیں۔ زبان اور زبان کا مطالعہ (1867ء) زبان کی زندگی اور نشوونما (1874ء)۔

Vowels	=	مصوّتے	Consonants	=	مصمّتے
Morphology	=	مارفیمیات یا صَرف	Syntax	=	نحو
Stylistics	=	اسلوبیات	Phonetics	=	صوتیات
Phoneme	=	صوتیہ	General Phonetics	=	عام صوتیات

5.10 سفارش کردہ کتابیں

1. اردو میں لسانیاتی تحقیق — پروفیسر عبدالستار دلوی
2. اردو زبان اور سماجی سیاق — پروفیسر عبدالستار دلوی
3. مقالاتِ مسعود — پروفیسر مسعود حسین خاں
4. ہندوستانی لسانیات — ڈاکٹر محی الدین قادری زور
5. زبان اور علم زبان — پروفیسر عبدالقادر سروری
6. اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو — پروفیسر گوپی چند نارنگ

.....

اکائی : 6 اردو املا کے مسائل اور صحتِ املا کی جدید سفارشیں

ساخت

6.1 تمہید

6.2 الف

6.2.1 عربی لفظ اور الف مقصورہ

6.2.2 الف اور ہائے مختفی

6.2.3 ال

6.3 تنوین

6.4 ت ۔ ط

6.5 ذ۔ز۔ژ

6.6 س۔ص۔ض

6.7 ن اور نونِ غنہ

6.8 واؤ

6.9 ہائے ملفوظ

6.9.1 ہائے مخلوط

6.10 ہمزہ (ء)

6.10.1 ہمزہ اور اضافت

6.11 لفظوں کو ملا کر نہ لکھیں

6.12 اعداد

6.13 خلاصہ

6.14 نمونۂ امتحانی سوالات

6.15 فرہنگ

6.16 سفارش کردہ کتابیں

6.1 تمہید

اِملا کا تعلق زبان کے رسمِ خط سے ہوتا ہے۔ جو لفظ بولا جائے اس کو اس طرح لکھا جائے کہ پڑھنے والا صحیح تلفظ کرے۔ اردو میں زبان کی ماہیت اور رسمِ خط سے املا کے مسائل نہایت پے چیدہ ہیں۔ اردو ہند آریائی زبان ہے۔ کھڑی بولی اس کی ماں ہے۔ اس پر ہریانوی، مشرقی پنجابی اور برج بھاشا کے اثرات ہیں۔ اس زبان کو ان لوگوں نے اپنایا اور ترقی دی جو فارسی بولتے تھے جس پر عربی زبان کا اثر تھا۔ وہ لوگ برہمی یا دیوناگری رسم خط سے واقف نہیں تھے۔ وہ اس زبان کو فارسی رسمِ خط میں لکھنے لگے۔ اردو کا ابتدائی نام ہندوی تھا۔ آگے چل کر اس کو مختلف نام دیے گئے جیسے ہندوی، گجری، دکنی اور ریختہ وغیرہ۔ آخر میں اس زبان کے لیے اردو کا نام مروّج ہوا۔ اس زبان میں بہت سی آوازیں ایسی تھیں جن کے اظہار کے لیے فارسی میں حروف موجود نہ تھے۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ فارسی حروف ہی میں ردّوبدل کر کے ان آوازوں کے اظہار کی صورت نکالی جائے۔ فارسی میں اردو کی کوز آوازوں کو پیش کرنے کے لیے حروف موجود نہیں تھے۔ اس کے لیے قدیم

حروف میں ترمیم کرکے نئے حروف بنائے گئے جیسے /ٹ/ کے لیے حرف /ت/ کی شکل میں تبدیلی کی گئی اور دونقطوں کی جگہ چار نقطے :: لگائے گئے پھر چار نقطوں کے بجائے دونقطوں کے اوپر ایک لکیر کھینچی گئی ـــ آگے چل کر دونقطوں اور ایک لکیر کو ہٹا کر/ ط/ کی شکل کام میں لائی گئی ۔اس طرح ہمارے رسمِ خط میں حروف/ ٹ/ ڈ/ ڑ/ کا اضافہ ہوا۔ اردو میں بہت سی ہکار آوازیں (Aspirated Sounds) ہیں جن کے لیے فارسی رسمِ خط میں حروف موجود نہیں ہیں ۔ اردو میں ان آوازوں کو پیش کرنے کے لیے دوچشمی /ھ/ سے مدد لی گئی ۔کسی حرف کے آگے دوچشمی /ھ/ لگا کر ہکار مصمتوں کو پیش کرنا ممکن ہوگیا جیسے : بھ ۔ پھ ۔تھ ۔ٹھ ۔جھ ۔ چھ ۔دھ ۔ڈھ ۔ڑھ ۔کھ ۔گھ ۔لھ ۔مھ ۔نھ ۔

اردو میں کھڑی بولی، مشرقی پنجابی، ہریانی اور برج کے الفاظ کے علاوہ فارسی کے توسط سے بہت سے عربی الفاظ داخل ہوگئے تھے جن کی آوازیں اردو میں موجود نہیں تھیں جیسے : ث، ص، ز، ذ، ض، ظ اور ع وغیرہ ۔جن لفظوں میں یہ حروف شامل تھے انھیں صرف تحریر کی حد تک جوں کا توں اردو میں لیا گیا لیکن قرأت میں ان کے مخارج کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ۔ اردو میں /ث/ اور/ص/ کو /س/ کے مخرج سے ادا کیا جاتا ہے۔ اسی طرح /ذ/ض/ اور/ظ/ تحریر میں تو آتے ہیں لیکن انھیں /ز/ کے مخرج سے ادا کیا جاتا ہے ۔ جب یہ دیکھا گیا کہ اردو میں بعض حروف لکھے تو جاتے ہیں لیکن ان کو اصل مخرج سے ادا نہیں کیا جاتا تو اردو املا کی اصلاح کی تجاویز پیش کی جانے لگیں ۔بعض انتہاپسند اصحاب کا یہ خیال تھا کہ جن حروف کو ہم ان کے اصل مخارج سے ادا نہیں کرتے انھیں حروفِ تہجی سے خارج کردیا جائے ۔/ث/ اور/ص/ کو/س/ سے بدلا جائے/ ذ/ /ض/ اور/ظ/ کو/ز/ میں تبدیل کردیا جائے ۔/ع/ کو/ا/ سے ظاہر کیا جائے ۔صبر کو سبر، طلب کو تلب، عدل کو ادل لکھا جائے ۔ یہ تجویز انقلابی نوعیت کی تھی اس لیے اسے قبول نہیں کیا گیا ۔

اردو املا پر ہندوستان اور پاکستان کے کئی علما نے اظہارِ خیال کیا ہے ۔ املا کے مسائل پر مباحث ہوئے ہیں، کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ املا کے مسائل پر جن علما نے روشنی ڈالی ہے ان میں قابلِ ذکر غلام مصطفیٰ خاں، عبدالستار صدیقی، غلام رسول، رشید حسن خاں، ابومحمد سحر اور گوپی چند نارنگ ہیں۔ ترقی اردو بیورو (ہندوستان) اور مقتدرہ قومی زبان (پاکستان) نے املا کے مسائل پر کتابیں شائع کیں ۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ تمام علما کے خیالات اور سارے مباحث کا جائزہ لیا جائے ۔طلبا کے استفادے کے لیے ہم گوپی چند نارنگ کی ''کتاب املا نامہ'' اور بعض دوسرے علما کی تجاویز کو چند ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ پیش کریں گے ۔

6.2 الف

الف دراصل مصوتہ ہے ۔الف کی دو قسمیں ہیں :

(1) الفِ ممدودہ

(2) الفِ مقصورہ

الفِ ممدودہ : یہ لمبا مصوتہ ہے۔ اسے کھینچ کر پڑھا جاتا ہے۔ جب یہ مرکب لفظوں میں آتا ہے تو اس پر مد نہیں لکھا جاتا جیسے : تیزاب، سیلاب، دستاویز، مرغابی ۔

لیکن مرکب لفظ کے دو اجزا کا علاحدہ علاحدہ تلفظ کیا جائے تو الف پر مد لکھا جاتا ہے۔ جیسے گرد آلود، عالم آرا، ابر آلود، رنگ آمیز ۔ ان لفظوں میں مد اس بات کی علامت ہے کہ الف لمبا مصوتہ ہے ۔

الفِ مقصورہ : چھوٹا مصوتہ ہے۔ لفظ کے شروع میں الف آئے تو اس کا تلفظ زبر کا ہوگا۔ اس پر زبر کے اضافے کی ضرورت نہیں ہے۔/ i / کے لیے الف کے نیچے زیر اور / u / کے لیے الف پر پیش لگایا جائے گا۔

6.2.1 عربی لفظ اور الفِ مقصورہ

(1) عربی میں بعض الفاظ جن کے آخر میں الف کی آواز آتی ہے انھیں /ی/ سے لکھتے ہیں اور/ی/ پر الفِ مقصورہ (چھوٹا الف) لکھا جاتا ہے جیسے :مدعیٰ ۔معزیٰ، ماویٰ ۔مصلّیٰ ۔اعلیٰ اور بعض اسمائے خاص بھی اسی طرح لکھے جاتے ہیں جیسے :عیسیٰ ۔موسیٰ ۔لیلیٰ ۔مصطفیٰ ۔

یحییٰ ۔ ایک تجویز یہ ہے کہ ان تمام لفظوں کو/ی/ کے بغیر الف سے لکھا جائے ۔ جیسے مدعا' معرّا' ماوا' مصلا' اعلا ۔ لیکن وہ اسمائے خاص اور وہ الفاظ جو قرآن میں آئے ہیں انھیں ویسے ہی لکھا جائے ۔ بعض علما نے رائے دی ہے کہ ایسے الفاظ بھی جو رواج میں جڑ پکڑ چکے ہیں اور اردو والے ان کے عادی ہو چکے ہیں انھیں فی الحال تبدیل نہ کیا جائے جیسے : عقبیٰ ۔ تقویٰ ۔ متبنیٰ ۔ مستثنیٰ ۔ عہدِ وسطیٰ ۔ اردوے معلیٰ ۔ عیدالضحیٰ وغیرہ۔

(2) بعض عربی لفظوں کے درمیان کسی حرف پر الفِ مقصورہ لکھا جاتا ہے اور اس حرف کو الف سے پڑھا جاتا ہے جیسے رحمٰن' سلیمٰن ' اسحٰق ۔ اسمٰعیل ۔ اس بارے میں تجویز یہ ہے کہ انھیں پورے الف سے لکھا جائے : رحمان ۔ سلیمان ۔ اسحاق' اسماعیل ۔ یہ املا اردو میں رائج ہو چکا ہے۔ اس لیے اسے برقرار رکھا جائے ۔

(3) علٰحدہ کو علاحدہ لکھنا چاہیے ۔ لہٰذا کو رائج طریقے سے لکھا جائے ۔

(4) عربی اور ترکی کے بعض الفاظ جن کے آخر میں الف ہے/ہ/ سے لکھے جاتے ہیں ۔ جو/ہ/ سے رائج ہو چکے ہیں انھیں اسی طرح لکھیں جیسے :شوربہ ۔ سقہ ۔ ناشتہ ۔ ملغوبہ ۔ ذیل کے لفظ الف سے لکھے جائیں :

معما ۔ تماشا ۔ حلوا ۔ مچلکا ۔ بقایا ۔ تمغا ۔ تقاضا

(5) ذیل کے الفاظ رائج املا کے ساتھ لکھے جائیں :

اللہ ۔ الٰہ ۔ الٰہی ۔ الٰہ آباد ۔ الٰہیات

(6) اضافت کی صورت میں ایسے الفاظ الف سے لکھے جائیں گے :

لیلائے شب ۔ دعوائے پارسائی ۔

(7) عربی مرکبات' جملوں اور عبارتوں کو عربی طریقے سے لکھا جائے ۔

علی الصّباح ۔ علی الحساب ۔ حتی الامکان ۔ علیٰ ہٰذا القیاس ۔

6.2.2 الف اور ہائے مختفی

(1) اردو میں ہائے مختفی کا وجود نہیں لیکن یہ غلط رواج پڑ گیا ہے کہ بہت سے ہندی لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی لاتے ہیں جیسے :بھروسہ' سندیسہ' ڈبیہ وغیرہ ۔ ایسے تمام لفظوں کو الف سے لکھنا چاہیے ۔ چند الفاظ مثال کے طور پر پیش ہیں :

آرا ۔ اڈا ۔ انگارا ۔ باجا ۔ بٹوا ۔ بیڑا ۔ پارا ۔ پٹا ۔ پہاڑا ۔ تانگا ۔ تکیا ۔ تھالا ۔ ٹکیا ۔ ٹھکانا ۔ ٹھیلا ۔ جلاہا ۔ جنگلا ۔ جھمیلا ۔ چارا ۔ چٹخارا ۔ چھلاوا ۔ دسہرا ۔ دھاگا ۔ دھوکا ۔ ڈاکا ۔ ڈربا ۔ ڈھکوسلا ۔ راجا ۔ رکشا ۔ سایا ۔ سروتا ۔ سمجھوتا ۔ شوالا ۔ غبارا ۔ کٹورا ۔ کلھیا ۔ گملا ۔ گھروندا ۔ گولا ۔ لالا ۔ لمبوترا ۔ مارکا ۔ مائیکا ۔ مورچا ۔ مہینا ۔ ناتا ۔ نالا ۔ ہریالا ۔ ہمالا ۔

(2) فارسی اور عربی کے الفاظ جنھیں اردو والیا گیا ہے انھیں بھی الف سے لکھا جائے گا جیسے : نقشا ۔ پرسا ۔

چند الفاظ اس اصول سے مستثنیٰ ہیں انھیں/ہ/ سے لکھنا مناسب ہے جیسے : خاکہ ۔ بدلہ ۔ غنڈہ ۔ تولہ ۔ ماشہ ۔ سموسہ ۔

(3) اسی طرح ایسے مرکب الفاظ جن کا ایک جز فارسی یا عربی ہے اور جو اردو کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں انھیں الف سے لکھا جانا چاہیے جیسے : آب خورا ۔ بھڑکیلا ۔ بے صبرا ۔ پاٹھ شالا ۔ پن سیرا ۔ تکونا ۔ تھکاماندا ۔ جوشیلا ۔ چوراہا ۔ دوپٹا ۔ ست رنگا ۔ شکر پارا ۔ غل غپاڑا ۔ لمبوترا ۔ نوسکھیا ۔ وارانیارا ۔ ہرجا خرچا ۔

(4) بعض شہروں کے نام/ہ/ سے لکھے جاتے ہیں انھیں اسی طرح لکھنا چاہیے : پٹنہ ۔ آگرہ ۔ کلکتہ ۔ امریکہ ۔

(5) ایسے الفاظ جو ہندی سے آئے ہیں اور جن کے آخر میں/ی/ کے بعد ہائے مختفی آتی ہے جس کا تلفظ زبر یا فتحہ کا ہوتا ہے انھیں ہائے مختفی سے ہی لکھنا چاہیے جیسے : ستیہ جیت رے ۔ راجیہ سبھا ۔ ساہتیہ پریشد وغیرہ ۔

(6) یورپی زبانوں کے دخیل الفاظ کو رائج املا کے ساتھ لکھنا مناسب ہے جیسے : کمرہ ۔ دیگر الفاظ کو الف سے لکھا جائے جیسے :ڈراما ۔سوڈا ۔ فرما وغیرہ ۔

(7) الف اور ہائے مختفی پر ختم ہونے والے بعض الفاظ کا تلفظ یکساں ہوتا ہے لیکن معنی میں اختلاف ہوتا ہے ۔معنی کے اعتبار سے ان کے املا کا تعین ہوگا جیسے :

چارہ (علاج ۔ مدد)	چارا	(مویشیوں کی خوراک)
پارہ (ٹکڑا ۔حصہ)	پارا	(سیماب)
نالہ (فریاد)	نالا	(بڑی نالی)
پتہ (نشان ۔ مقام)	پتّا	(درخت کا پتّا)

(8) بعض لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی لگایا جاتا ہے جو درست نہیں ہے جیسے : موقعہ ۔ معہ ۔ انھیں موقع اور مع لکھنا چاہیے ۔ اسی طرح بابت اور آیت کے آخر میں/ہ/ لگانا مناسب نہیں ہے ۔

(9) سنہ کو سن نہیں لکھنا چاہیئے ۔

(10) جگہ اور توجہ کی/ہ/ پر شوشہ نہیں لگانا چاہیے ۔

(11) سہہ ۔ کہہ ۔ بہہ ۔شوشے کے ساتھ لکھے جائیں ۔

(12) ضمیرِ اشارہ 'یہ' اور کافِ بیانیہ 'کہ' کو /ہ/ کی لٹکن کے بغیر لکھا جائے ۔

(13) الف اور/ہ/ پر ختم ہونے والے لفظوں کے بعد حروفِ عطف آئیں تو انھیں یائے مجہول سے بدلنا چاہیے جیسے کلکتہ = کلکتے سے ۔ مئے خانہ = مئے خانے تک ۔ افسانہ = افسانے میں ۔ پردہ = پردے پر

6.2.3 ال

اردو میں عربی کے بہت سے الفاظ شامل ہیں جن کے شروع میں 'ال' آتا ہے لیکن پڑھا نہیں جاتا ایک تجویز یہ تھی کہ ایسے لفظوں کو /الف/ کے بغیر لکھا جائے جیسے بالکل کے بجائے بلکل ۔لیکن اس پر عمل نہ ہوسکا وہ حروف جن کے آغاز میں الف ادا نہیں ہوتا لیکن/ل/ پڑھا جاتا ہے' قمری حروف کہلاتے ہیں جیسے : انا الحق ۔ بالفعل ۔ ملک الموت ۔ وہ حروف جن کے آغاز میں/الف/ اور/ل/ دونوں ادا نہیں ہوتے شمسی حروف کہلاتے ہیں ان میں/ا/ اور/ل/ کے بعد کے حرف کو تشدید کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے جیسے :

عبدالشکور ۔ بالترتیب ۔ احمد الدین وغیرہ ۔ ایسے تمام الفاظ کا قدیم املا برقرار رکھنے کی سفارش کی گئی ہے ۔

6.3 تنوین

اردو میں عربی کے کئی الفاظ شامل ہیں جن کے آخر میں الف بڑھا کر الف پر دو زبر لگائے جاتے ہیں جسے تنوین کہا جاتا ہے اور اس کا مفہوم ہوتا ہے ''سے'' یا ''کے ساتھ'' جیسے شرارتاً = شرارت سے' مصلحتاً = مصلحت سے' وضاحتاً = وضاحت کے ساتھ ۔عربی قاعدہ یہ ہے کہ جو لفظ/ت/ پر ختم ہوتا ہے اس کے آگے/الف/ بڑھا کر تنوین لگائی جائے جیسے : مروتاً ۔حقیقتاً ۔ وقتاً فوقتاً ۔ مصلحتاً ۔

عربی کے جو لفظ مدورت' = /ۃ/ پر ختم ہوتے ہیں' تنوین مدور/ۃ/ پر لگائی جائے اردو میں یہ اصول بنایا گیا ہے کہ لفظ کے آخر میں مدور /ۃ/بھی آئے تو اس کو/ت/سمجھا جائے اور/ت/ کے بعد/الف/ بڑھا کر تنوین لگائی جائے جیسے :عادۃ = عادتاً ۔نسبۃ =نسبتاً ۔حکمۃ =حکمتاً ۔کلیۃ =کلیتاً

بعض علما کی تجویز ہے کہ تنوین (دو زبر) کو/ن/ سے بدل دیں جیسے فوراً کو فورن لکھیں لیکن اس تجویز کو عام طور پر قبول نہیں کیا گیا ۔

تنوین کے سلسلے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اردو میں عربی کے تائے مدور کو/ت/ سے بدل دیا جاتا ہے جیسے حیاۃ = حیات' بابۃ = بابت'

مسماۃ = مسمات لیکن چند الفاظ اب بھی تائے مدور سے رائج ہیں ۔انھیں اسی طرح لکھنا مناسب ہے جیسے صلٰوۃ ' زکٰوۃ ۔

اردو میں عربی کے بعض لفظ مروج ہیں جو الف پر ختم ہوتے ہیں اوراصلاً ان کے بعد ہمزہ تھا جسے حذف کردیا گیا ہے۔ ان لفظوں کے بعد تنوین آئے تو ہمزہ بڑھانی چاہیے اور ہمزہ پر تنوین لگائی جائے جیسے : ابتدا = ابتداءً ۔انتہا = انتہاءً ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. فارسی رسمِ خط میں ہندی کی کن آوازوں کے اظہار کے لیے حروف نہیں ہیں؟
2. اردو میں شامل عربی لفظوں کی ابتدا میں 'ال' آئے تو ان کے بارے میں کیا تجاویز ہیں؟
3. تنوین کا اصول کیا ہے؟

6.4 ت ۔ ط

اردو میں بعض الفاظ جنھیں /ت/ سے لکھنا چاہیے /ط/ سے لکھ دیے جاتے ہیں جو درست نہیں ہے ۔انھیں /ت/ سے ہی لکھا جائے جیسے: طشت' طشتری' طمانچہ' طوطا ' ناطہ وغیرہ ان لفظوں کو اس طرح لکھنا چاہیے : تشت' تشتری' تمانچہ' توتا ' ناتا ۔ ذیل کے لفظوں کو /ط/ سے لکھنا درست ہے :

غلطاں ۔طوطی ۔

6.5 ذ ۔ز ۔ژ

(1) فارسی مصادر گذشتن' گذاشتن اور پذیرفتن کے مشتقات کو/ذ/ سے لکھنا چاہیے۔ جیسے : گذشتہ' گذرگاہ' رہ گذر' سرگذشت' پذیرائی' دل پذیر۔

(2) فارسی مصدر گزاردن کے مشتقات /ز/ سے لکھے جائیں گے ۔ گزارش' خدمت گزار' مال گزاری ۔

(3) گزار اور گزرانا بھی /ز/ سے لکھنا مناسب ہے۔

(4) حضرت ابراہیم کے والد یا چچا کا نام آزر/ز/ سے لکھا جائے۔لفظ آذر آگ کے معنوں میں /ذ/ سے لکھنا چاہیے جیسے : آذر کدہ ۔

(5) ذرّہ' ذرا اور ذات /ذ/ سے لکھے جائیں ۔

(6) زخار' آزوقہ' ازدحام میں حرف /ز/ لایا جائے گا ۔

(7) مدوجزر میں /ز/ آئے گا اور حساب کی اصطلاح جذر/ذ/ سے لکھی جائے گی ۔

(8) فارسی کے دخیل الفاظ اور جن لفظوں میں /ژ/ کا تلفظ ہوتا ہے ان میں حرف /ژ/ استعمال کیا جائے جیسے :مژدہ ۔ارژنگ ۔اژدر ۔اژدہا' نژاد ۔ٹیلی ویژن وغیرہ ۔

6.6 س ۔ص ۔ض

(1) لفظ قصائی /ص/ سے لکھا جائے ۔

(2) مسالا اور مسل (رودادِ مقدمہ) اور سمن میں /س/ مندرج ہوگا ۔

6.7 ن اور نونِ غنّہ

(1) کسی لفظ میں /ن/ کے بعد /ب/ آئے تو /ن/ کی آواز /م/ سے بدل جاتی ہے جیسے گنبد ۔انبار ۔بعض لفظ 'ن' سے اور 'م' سے بھی لکھے

جاتے ہیں جیسے : انبر' امبر ۔تنبا کو' تمبا کو ۔

(2) اردو کے جن مصدروں میں دو/ن/ آتے ہیں ایک/ن/ مادۂ فعل کا اور ایک/ن/ علامتِ مصدر کا ۔ان مصدروں کو دو/ن/ کے ساتھ لکھنا چاہیے جیسے سننا ۔ گننا ۔ بننا ۔ انھیں تشدید کے ساتھ سنّا ۔ بنّا لکھنا درست نہیں ہے ۔

(3) نونِ غنہ لفظ کے آخر میں آئے تو نون کا نقطہ نہ لگایا جائے جیسے : جہاں ۔ زباں ۔ فغاں لفظ کے درمیان نونِ غنہ آئے تو اس پر الٹی قوس لگائی جائے ۔ اینٹ ۔ چاند ۔

(4) بعض مصادر میں نونِ غنہ ہوتا ہے لیکن ان سے ماخوذ لفظوں میں نونِ غنہ نہیں دیا جاتا ۔ بانٹنا = بٹوارا ۔ چھانٹنا = چھٹنا ۔

(5) گاؤں ۔ پاؤں ۔ چھاؤں یہ الفاظ پہلے درمیانی نونِ غنہ سے لکھے جاتے تھے : گانْو ۔ پانْو ۔ چھانْو لیکن اب یہ املا متروک ہو چکا ہے ۔

(6) چند الفاظ نونِ غنہ کے ساتھ لکھے جاتے تھے : گھانْس ۔ سونْچنا ۔ چانْول ۔ کونْچہ ۔ پھونْس ۔ ان لفظوں کو نونِ غنہ کے بغیر لکھا جائے : گھاس ۔ سوچنا ۔ چاول ۔ کوچہ ۔ پھوس ۔

(7) ذیل کے الفاظ کے درمیان نونِ غنہ لایا جائے : جھونپڑا ۔ کنواں ۔ کینچلی ۔

(8) یہ لفظ مروج املا کے ساتھ لکھے جائیں گے : مہنْدی ۔ مہنْگی ۔ لہنْگا ۔

6.8 واؤ

(1) قدیم اردو میں پیش کو/و/ سے لکھا جاتا تھا : اوس ۔ اودھر ۔ پہونچنا اب ان لفظوں کو/و/ کے بغیر لکھتے ہیں : اُس ۔ اُدھر ۔ پہنچنا ۔

(2) دوہائی ۔ دوہرا ۔ کو واو کے بغیر لکھنا چاہئیے ۔ دہائی ۔ دہرا ۔

(3) چند لفظوں کی اصل میں/و/ رہتا ہے لیکن ان سے بننے والے لفظوں میں/و/ کی جگہ پیش (ُ) لاتے ہیں ان لفظوں کو/و/ کے بغیر لکھنا چاہیے جیسے : لوہا سے لہار' سونا سے سنار ۔

(4) بعض لفظ/و/ کے ساتھ اور/و/ کے بغیر دونوں طرح لکھے جاسکتے ہیں : دلہن' دولہن' موٹاپا' مٹاپا' نوکیلا' نکیلا' ہندوستان' ہندستان ۔

(5) جز اور جزو حصے یا ٹکڑے کے معنوں میں دونوں طرح لکھے جاسکتے ہیں ۔

(6) واوِ معدولہ کے بعد الف ہو تو ان دونوں حروف کو ملا کر بولتے ہیں جیسے : خواب ۔ خواہش ۔ خواجہ ۔ واو کے بعد الف نہ ہو تو تلفظ میں/و/ کو پیش سے بدل دیتے ہیں جیسے : خود ۔ خوش ۔

6.9 ہائے ملفوظ

(1) لفظ کے آخر میں ہائے ملفوظ ہائے مختفی کی طرح لکھی جاتی ہے ۔ اس میں/ہ/ کی آواز سنائی دے تو اس کے نیچے شوشا لگانا چاہیے : مہ ۔ کہ ۔ نہ/ہ/ کی آواز ادا نہ ہو یا خفیف ہو تو شوشا لگانے کی ضرورت نہیں جیسے یہ ۔ کہ ۔

(2) آخر میں آنے والی ہائے ملفوظ سے پہلے/ی/ ہو تو کہنی دار/ہ/ لکھنا درست نہیں جیسے تشبیہہ ۔ تنبیہہ ۔ ان لفظوں کو اس طرح لکھنا چاہیے : تشبیہ ۔ تنبیہ ۔

6.9.1 ہائے مخلوط

قدیم املا میں/ہ/ اور ہائے مخلوط (ھ) میں فرق نہیں کیا جاتا تھا ۔ ہے کو ھے ۔ گھر کو گہر لکھ دیا جاتا تھا ۔ لیکن اب ہائے مخلوط کو ہکار آوازوں سے مخصوص کر دیا گیا ہے ۔

(1) اردو کی تمام ہکار آوازوں کو ہائے مخلوط (ھ) سے لکھنا چاہیے جیسے : بھائی ۔ پھر ۔ پتھر ۔ اٹھنا ۔ بجھنا ۔ اچھا ۔ بدھ ۔ بڑھا ۔ بڑھائی ۔ لاکھ ۔ گھوڑا ۔ وغیرہ ۔

(2) اردو میں رھ ' لھ ' مھ ' نھ ' وھ ' یھ بھی ہکار آوازیں ہیں اس لیے ذیل کے لفظوں کو ہائے مخلوط سے لکھا جائے : گیارھواں ۔ کولھو ۔ تمھارا ۔ ننھا ۔ ابھی ۔ تمھیں ۔

(3) بعض لفظوں میں ہائے مخلوط دوبار آتا ہے ۔ دوسرے ہائے مخلوط کی /ھ/ کو حذف کیا جاسکتا ہے : بھابھی = بھابی ' پھوپھی = پھوپی ' اسی طرح : ڈھیٹ ' گھونگا ' گھنگرو وغیرہ ۔

(4) لفظ کے آغاز میں دوچشمی ھ لکھنا غلط ہے ' لٹکن والی ہ لکھنا چاہیے ۔ دوچشمی ھ کا استعمال صرف ہکار حروف میں ہی ہوگا ۔ ھے ۔ ھندوستان ۔ ھمیشہ ۔ لکھنا غلط ہے ۔ ہندوستان اور ہمیشہ لکھنا درست ہے ۔ علاوہ ازیں لفظ کے درمیان میں ہکار حرف نہ ہو تو اسے بھی لٹکن والی /ہ/ سے لکھیں گے جیسے پہلا ۔ دہلی ۔ دہن ۔ ان لفظوں کو پھلا ۔ دھلی ۔ دھن لکھنا درست نہیں ہے ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

(1) جن مصدروں میں دو/ن/ مسلسل آئیں انھیں کس طرح لکھنا چاہیے ؟

(2) ہائے مخلوط کا استعمال کن حروف میں ہوتا ہے ؟

(3) گذشتن اور گزاردن کے مشتقات کس طرح لکھے جائیں ؟

6.10 ہمزہ (ء)

اردو میں ہمزہ (ء) کے استعمال کے اصول حسبِ ذیل ہیں :

(1) کسی لفظ میں دو مصوتے ساتھ آئیں تو پہلے مصوتے کے بعد /ء/ لکھا جائے جیسے : کو+ای=کوئی ' کھا+او = کھاؤ ' جا+اے = جائے ۔

(2) عربی کے بہت سے الفاظ /ا/ پر ختم ہوتے ہیں اور /ا/ کے بعد ہمزہ آتا ہے ۔ یہ لفظ اردو میں /ء/ کے بغیر لکھے جائیں گے : ابتداء ' شعراء ' علماء ۔ کو ہمزہ کے بغیر اس طرح لکھا جائے گا ۔ ابتدا ۔ شعرا ۔ علما ۔

(3) اگر یہ الفاظ کسی ترکیب کا جز ہوں تو /ء/ لکھنا ہوگا جیسے : انشاء اللہ ۔ شعراءِ کرام ۔ صوفیاءِ ہند ۔

(4) بعض عربی لفظوں میں /ا/ اور /و/ کے بعد ہمزہ لکھا جاتا ہے جیسے : جرأت ۔ تأثر ۔ مؤثر ۔ مؤدب ۔ اردو میں ان لفظوں کو ہمزہ کے بغیر لکھنے کا مشورہ دیا گیا ہے جیسے جرات ۔ تاثر ۔ موثر ۔ مودّب ۔

(5) اردو اسم ' حاصلِ مصدر اور امر جن میں الف کے بعد /و/ آتا ہے انھیں /ء/ کے ساتھ لکھنا چاہیے جیسے الاؤ ۔ پلاؤ ۔ گاؤ ۔ بچاؤ ۔ بہاؤ ۔ جھکاؤ ۔ آؤ ۔ جاؤ ۔ کھاؤ ۔

(6) کسی لفظ کے آخر میں یائے مجہول /ے/ ہو اور اس کے قبل زبر (فتحہ) ہو تو ہمزہ لکھنا چاہیے : گئے ۔ نئے ۔

(7) اگر یائے مجہول کے قبل کسرہ (زیر) ہو تو ہمزہ کے بجائے /ی/ لکھی جائے گی ۔ جیسے : لیے ۔ کیے ۔ بیٹھیے ۔

(8) فعلِ امر تعظیمی کے آخر میں اِ + یے آتا ہے ۔ ان میں الف کو ہمزہ سے لکھنا چاہیے جیسے آ +ایے=آیئے ۔ لا+ایے = لایئے ۔ کھو+اِیے =کھویئے ۔

(9) کسی لفظ میں الف کے بعد الف اور یائے مجہول آئے تو دوسرے الف کو ہمزہ سے بدلنا چاہیے جیسے : گا+اے = گائے ۔ لا+ے=لائے ۔ را+اے = رائے ۔ چا+اے = چائے ۔

(10) اسی طرح حرف /و/ کے بعد الف اور یائے مجہول آئے تو الف کو ہمزہ سے بدلنا چاہیے جیسے : بو+اے = بوئے ۔ کھو+اے = کھوئے ۔ رو+اے = روئے ۔

(11) لفظ کے آخر میں /و/ ہو اور اس کے قبل ساکن مصوتہ ہو تو واؤ پر ہمزہ نہیں لگایا جائے گا: جیسے بھاو ۔ الاو ۔ گھاو ۔ پڑاو ۔ لگاو ۔ پاو ۔ دیو ۔ بیوپار ۔ نیوتا ۔

(12) جن لفظوں میں دوہرے مصوتے کی آواز آتی ہے انھیں ہمزہ کے ساتھ لکھنا چاہیے جیسے : بچاؤ ۔ گھماؤ ۔ آؤ ۔ جاؤ ۔ ہوئے ۔ ہوئی ۔ ہندوؤں ۔ بازوؤں ۔

(13) جہاں دو مصوتے ساتھ آئیں ہمزہ لکھا جائے جیسے کئی ۔ گئے ۔ گئی ۔

(14) افعال کے آخر میں دو /ی/ آئیں تو ہمزہ لکھا جائے گا ۔ جیسے : آیئے ۔ کھایئے ۔ کھویئے ۔

(15) /ے/ سے پہلے حرف مفتوح ہو تو ہمزہ نہیں لگایا جائے بلکہ فتح کی علامت دی جائے گی ۔ جیسے : مئے ۔ شئے ۔ طئے ۔

(16) جن لفظوں کے آخر میں یائے مجہول /ے/ جزِ لفظ ہو انھیں ہمزہ کے بغیر لکھا جائے ۔ جیسے : رائے ۔ چائے ۔ بجائے ۔

(17) جو الفاظ دوہرے مصوتے سے بولے جاتے ہیں ان کو ہمزہ سے لکھنا چاہیے : گائے (مضاع) جائے (مضارع) سرائے ۔

(18) فارسی میں چند الفاظ /ی/ سے لکھے جاتے ہیں لیکن اردو میں ان کا تلفظ /ی/ سے نہیں ہوتا ۔ ان لفظوں کو ہمزہ سے لکھنا چاہیے : آزمائش ۔ ستائش ۔ آئندہ ۔ نمائندہ ۔ شائع ۔ قائم ۔ مائل وغیرہ ۔

6.10.1 ہمزہ اور اضافت

(1) مرکب لفظ میں مضاف کے آخر میں ہائے مختفی ہو تو اضافت کے لیے ہمزہ لگائیں : نامۂ عشق ۔ خانۂ خدا ۔ جلوۂ طور ۔ نذرانۂ خلوص ۔ نالۂ دل ۔

(2) مضاف کے آخر میں مصوتے /ا/ یا /و/ آئے تو ان کے آگے یائے مجہول /ے/ بڑھا کر ہمزہ لگائیں : نوائے سروش ۔ بوئے گل ۔

(3) یائے مجہول /ے/ پر ختم ہونے والے الفاظ میں بھی جو دوہرے مصوتے سے بولے جاتے ہیں اضافت کے لیے ہمزہ لگائیں : مئے رنگیں ۔ تنگ نائے غزل ۔

(4) جن لفظوں کے آخر میں ہمزہ آتا ہے اضافت کے لیے ہمزہ کے بعد کسرہ لگائیں : سوءِ ظن ۔ مبدءِ اول ۔ مبدءِ فیض ۔

(5) واوِ عطف پر ہمزہ نہ لکھیں ۔ زندگی و موت ۔ شمع و پروانہ ۔

6.11 لفظوں کو ملا کر نہ لکھیں

(1) اردو میں زمانۂ قدیم سے یہ رواج رہا ہے کہ دو اور کبھی دو سے زیادہ لفظوں کو ملا کر لکھا جاتا ہے جیسے : اسلیے ۔ ہمنے ۔ اسواسطیکہ ۔ یہ طریقہ نامناسب ہے ۔ ہر لفظ کو الگ الگ لکھنا چاہیے جیسے : آئے گا ۔ جائیں گے ۔ آپس میں ۔ دل میں ۔ کیوں کہ ۔ حالاں کہ ۔ کس کا ۔ اس کی ۔ ہم کلام ۔ ہم عصر ۔ دل کش ۔ دل چسپ ۔ رحم دل ۔ خوب صورت ۔ بہ خوبی ۔ بہ ہر حال ۔ بے شک ۔ بے خبر ۔ آج کل ۔ کل جگ ۔ در بہ در ۔ نو بہ نو ۔ ان پڑھ ۔ ان جانا ۔ شاہ زادہ ۔ طالبِ علم ۔ شاہ رخ ۔ بیش تر ۔ خوب تر ۔ فن کار ۔ کاشت کار ۔ غارت گر ۔ کاری گر ۔ نیل گوں ۔ مئے گوں ۔ کشتی بان ۔ گاڑی بان ۔ نام ور ۔ سخن ور ۔ خواب گاہ ۔ آرام گاہ ۔ غم کدہ ۔ بت کدہ ۔ صنم خانہ ۔ کتب خانہ ۔ عقل مند ۔ ضرورت مند ۔ یک جا ۔ نرخ نامہ ۔ دین دار ۔ راہ بر ۔ لب ریز ۔ مئے گسار ۔ کوہ کن ۔ کام یاب ۔ ماہ تاب ۔

(2) بعض مرکبات کو مستثنیٰ رکھنے کی سفارش کی گئی ہے جیسے : پاسبان ۔ باغیچہ ۔ بچپن ۔ غمگیں ۔ سوگوار ۔ تمتمانا ۔ زمیندار ۔

(3) انگریزی اور یورپی زبان کے الفاظ اور اصطلاحوں کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے لکھا جائے تو ان کی ادائیگی میں سہولت ہوگی ۔ جیسے : گلِ کرسٹ ۔ پارلی منٹ ۔ ٹیلی ویژن ۔ ورک شاپ ۔ کان فرنس ۔ انسٹی ٹیوٹ وغیرہ ۔

6.12 اعداد

(1) دونوں کو 'دونو' بھی لکھا جاتا ہے۔ صحیح املا 'دونوں' ہے۔ اسی طرح تینوں۔ چاروں۔ پانچوں لکھنا چاہیے۔

(2) ہندسہ : 6 کو چھے لکھنا چاہیے۔

(3) گیارہ سے اٹھارہ تک ہندسوں کے آخر میں ہائے مختفی لکھنا چاہیے: بارہ۔ تیرہ۔ چودہ۔ وغیرہ۔

(4) تاکیدی اعداد کو ہائے مخلوط سے لکھیں۔ گیارھواں۔ بارھواں۔ تیرھواں وغیرہ۔

(5) انّیس سے اکتالیس تک کے اعداد میں /س/ سے پہلے /ی/ لکھی جائے۔ انّیس۔ بیس۔ اکّیس۔ بائیس وغیرہ۔

(6) ذیل کے اعداد کو نونِ غنہ کے ساتھ لکھا جائے۔ تینْتیس۔ چونْتیس۔ پینْتیس۔ سینْتیس۔ پینْتالیس۔ سینْتالیس۔ پینْسٹھ

(7) اعداد 51 - 81 اور 91 کو /ی/ کے ساتھ لکھنا چاہیے: اکیاون۔ اکیاسی۔ اکیانوے۔

(8) سیکڑا نونِ غنہ کے بغیر لکھیں۔

(9) 85-95-99 کا صحیح املا پچاسی۔ پچانوے اور ننانوے ہے۔

(10) 69 سے 78 تک کے ہندسوں کو لکھنے کی صحیح صورت یہ ہے: اٹھتر۔ ستر۔ اکھتر۔ بہتر۔ تہتر۔ چوہتر۔ پچھتر۔ چھیتر۔ ستھتر۔ اٹھتر۔

(11) جو عدد مصمتے پر ختم ہوتے ہیں انھیں وصفی عدد بنانے کے لیے عدد کے بعد واں کا اضافہ کیا جائے: چوبیسواں۔ اڑتیسواں۔ باسٹھواں۔ اٹھتر واں۔ لیکن عدد اگر مصوتے پر ختم ہو تو مناسب یہ ہے کہ ہندسہ لکھ کر 'واں' یا 'ویں' بڑھادیں جیسے: 79 واں' 79 ویں' 98 واں۔ 98 ویں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. لفظ کے آخر میں یائے مجہول سے پہلے کسرہ ہو تو اسے کس طرح لکھیں گے؟
2. مرکب لفظ میں اضافت کے لیے ہمزہ لانے کی مثالیں دیجیے؟
3. انگریزی اور یورپی زبانوں کے الفاظ کس طرح لکھے جائیں؟
4. گیارہ سے اٹھارہ تک کے ہندسوں کو کیسے لکھا جائے گا؟

6.13 خلاصہ

اس اکائی میں پہلے بتایا گیا ہے کہ اردو رسمِ خط کس طرح تشکیل پایا۔ رسمِ خط کی وجہ سے املا کے کیا مسائل پیدا ہوئے اور انھیں کس طرح حل کیا گیا۔ مثلاً اردو کے فارسی سے ماخوذ رسمِ خط میں ہندی کی کوز آوازوں کے لیے /ت/ ،/ اور /ر/ پر 'ط' لگا کر حروف /ٹ/ ڈ/ڑ/ کا اضافہ کیا گیا۔ عربی لفظوں میں /ی/ پر الف مقصورہ لکھنے کے بجائے پورے الف سے لکھنے کی تجاویز پر غور کیا گیا۔ تنوین کے قاعدے بتائے گئے۔ مختلف حروف ت' ط' ذ' ز' ژ' س' ص' ض کے استعمال کی غلطیوں کی وضاحت کی گئی۔ /ن/' نون غنہ اور /و/ کے اندراج کے صحیح طریقے بتائے گئے۔ خالص اردو لفظوں کے آگے ہائے مختفی نہ لگانے کی ہدایت دی گئی۔ ہائے مخلوط صرف ہکار حروف کے لیے استعمال ہوگا۔ ہمزہ کے استعمال میں جو بے راہ روی ملتی ہے اس کو دور کیا گیا۔ یہ تاکید کی گئی کہ دو لفظوں کو بہ استثنائے چند ملا کر نہ لکھا جائے۔ آخر میں ہندسوں کے لکھنے کے صحیح طریقے بتائے گئے۔

6.14 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. کن الفاظ کے بعد ہائے مختفی کے بجائے الف لکھنا چاہیے؟ مثالوں سے واضح کیجیے۔

2. ہمزہ (ء) کے استعمال کے قاعدے تفصیل سے مثالوں کے ساتھ لکھیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. کن لفظوں کو ملا کر نہیں لکھنا چاہیے اور کن لفظوں کو ملا کر لکھا جاسکتا ہے؟
2. اعداد لکھنے کے چند طریقوں کی وضاحت کیجئے؟

6.15 فرہنگ

ماہیت = حقیقت

کوزآوازیں = /ٹ/ڈ/ڑ/ جن کی ادائیگی میں زبان کی نوک تالو کی طرف مڑتی ہے۔

ہکارآوازیں = /بھ/ پھ/تھ/ وغیرہ کی جن کی ادائیگی میں/ہ/ کی آواز شامل رہتی ہے۔

مخرج = منھ میں کسی حرف کی آواز نکلنے کا مقام۔

مصوّتہ = حروف علت اور حرکات: ا۔و۔ی۔زبر۔زیر۔پیش وغیرہ (Vowels)

مصمّتہ = حروف صحیح Consonants۔ب۔پ۔ت۔ٹ وغیرہ۔

الفِ ممدودہ = الف جسے کھینچ کر پڑھا جائے۔اس الف پر مد بھی لاتے ہیں۔

ہائے مختفی = وہ ہا/ہ/ جو کھل کر نہ پڑھی جائے اور حرفِ ماقبل کی حرکت کو ظاہر کرے۔

ہائے ملفوظی = وہ ہا/ہ/ جو خوب کھل کر پڑھی جائے جیسے گاہ۔ماہ۔

پذیرفتن = ادا کرنا۔رہا کرنا۔چھوڑنا

دخیل = وہ الفاظ جو دوسری زبانوں سے داخل کیے گئے۔

ماخوذ = اخذ کیا ہوا' نکالا ہوا۔

ہائے ملفوظ = وہ/ہ/ جو پڑھنے میں آئے: ہم۔ماہ

ہائے مخلوط = وہ/ہ/ جو ہکار حروف میں آئے۔اس کے لیے دوچشمی/ھ/ استعمال کی جاتی ہے جیسے بھائی۔تھوڑا۔

حاصلِ مصدر = وہ لفظ جو مصدر سے حاصل کیے جائیں جیسے آزمانا سے آزمائش

مضاف اور مضاف الیہ= حروف اضافت سے بننے والے مرکب کے اجزا جیسے ''احمد کی کتاب''میں کتاب مضاف اور احمد مضاف الیہ ہے۔

واوِعطف = وہ/و/ جو ''اور'' کے معنی دیتی ہے۔

گذشتن = گذرنا گزاردن = چھوڑ دینا

6.16 سفارش کردہ کتابیں

گوپی چند نارنگ ''املا نامہ''

رشید حسن خاں ''اردو املا''

انجمن ترقی اردو ''تجاویز اصلاحِ املا''مطبوعہ رسالہ اردو ۱۹۹۴ء

گوہر نوشاہی منتخب مقالات اردو املا و رموزِ اوقاف

اکائی : 7 اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاءِ کرام کی خدمات

ساخت

7.1 تمہید

7.2 تیرھویں صدی عیسوی کا مذہبی سرمایہ

7.2.1 خواجہ معین الدین چشتیؒ

7.2.2 بابا فریدالدین گنج شکرؒ

7.2.3 قاضی حمید الدین ناگوری

7.3 چودھویں صدی عیسوی کا مذہبی سرمایہ

7.3.1 امیر خسرو

7.3.2 شیخ عین الدین گنج العلم

7.3.3 شیخ شرف الدین یحییٰ منیری

7.4 پندرھویں صدی عیسوی کا مذہبی سرمایہ

7.4.1 حضرت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ

7.4.2 شاہ میراں جی شمس العشاق

7.5 سولھویں صدی عیسوی کا مذہبی سرمایہ

7.5.1 شیخ بہاء الدین باجن

7.5.2 شیخ عبدالقدوس گنگوہی

7.5.3 شاہ محمد غوث گوالیاری

7.5.4 شاہ علی محمد جیو گام دھنی

7.5.5 شیخ وجیہ الدین علوی

7.5.6 شاہ برہان الدین جانم

7.6 سترھویں صدی عیسوی کا مذہبی سرمایہ

7.6.1 شیخ محمد خوب چشتی

7.6.2 سید میراں جی خدانما

7.6.3 شاہ امین الدین علی اعلیٰ

7.7 خلاصہ

7.8 نمونہ امتحانی سوالات

7.9 فرہنگ

7.10 سفارش کردہ کتابیں

7.1 تمہید

اردو کی ابتدائی نشونما میں صوفیاءِ کرام کا بڑا حصہ ہے ۔ صوفیاءِ کرام کو نہ اردو زبان سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ اس زبان کی ترقی ان کے

پیش نظر تھی ۔ انھوں نے اردو زبان کو اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اس لیے منتخب کیا کہ یہ زبان سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔صوفیا کا عوام سے براہ راست تعلق تھا اس لیے وہ اسی زبان کو ذریعۂ ابلاغ بنانا چاہتے تھے جو اس وقت عوام میں رائج تھی ۔ یہ قدیم اردو عوام میں رائج ضرور تھی لیکن فارسی کے مرتبے تک نہیں پہنچ سکی تھی تصنیف 'تالیف میں فارسی ہی کا استعمال تھا۔ یہ صوفیا ہی تھے جن کی بدولت قدیم اردو رشد'ہدایت' پند و موعظمت کا موثر ذریعہ بن گئی جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس زبان میں فکر وفن کے اظہار کی اچھی صلاحیت پیدا ہوتی گئی ۔ اردو نے اب تک اپنی زندگی کی آٹھ صدیاں گزاری ہیں۔ ابتدائی پانچ صدیاں یعنی 1300ء تا 1700 ء اس کی زندگی کے قدیم دور کی آئینہ دار ہیں۔ ہر زبان کے ادب میں نظم پہلے آتی ہے' نثر بعد میں ۔اردو ادب کی ابتدائی صدیوں میں نظم کے مقابلے میں نثر بہت کم ملتی ہے۔اردو نثر کے فقرے اور جملے باقاعدہ نثری کتابوں سے پہلے صوفیا کے ملفوظات میں ملتے ہیں۔ یہ فقرے اور جملے اردو کے قدیم نثری مکالموں کے باقیات الصالحات ہیں۔ اس لیے اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاء کی خدمات نظر انداز نہیں کی جاسکتیں ۔ اس اکائی میں اردو کی ابتدائی پانچ صدیوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور صوفیاءِ کرام نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے ۔

7.2 تیرھویں صدی عیسوی کا مذہبی سرمایہ

اسلام کی نشر و اشاعت اور تبلیغ میں تیرھویں صدی عیسوی کے بلند پایہ صوفی حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور آپ کے خلفا کا بڑا حصہ ہے ۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کو پھیلانے کے لیے کسی ملک اور کسی قوم کے خلاف تلوار استعمال نہیں کی۔ بلکہ دنیا اسلام کے سچے نام لیواؤں کے اخلاق و رکردار سے متاثر ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہوئی ۔ اس برصغیر میں بے شمار صوفیاءِ کرام نے اسلام کی روشنی پھیلائی اور ایک ایک بزرگ کے ہاتھوں پر سینکڑوں' ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں بندگان خدا نے اسلام قبول کیا۔ انھیں عظیم المرتبت ہستیوں میں ایک برگزیدہ ہستی حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی ہے ۔

7.2.1 حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (وفات 1235ء)

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ برصغیر کے اکابر صوفیا میں نہایت بلند مرتبے کے مالک ہیں۔ خواجہ گان چشت میں آپ کا رتبہ بہت بلند ہے ۔ آج برصغیر میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے جو اُجلے نقوش نظر آتے ہیں ان میں بڑا حصہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی کوششوں کا ہے ۔ آپ نے اجمیر میں تبلیغِ اسلام کا ایک مستقل نظام قائم کیا۔ اس نظام میں مرکزی حیثیت اجمیر کو حاصل تھی اس کے تحت دوسرے مراکز تھے ۔ دہلی میں آپ کے خلیفہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی رشد و ہدایت میں مصروف تھے ۔ وسطی ہند میں ناگور اہم مرکز تھا جہاں آپ کے مشہور خلیفہ حضرت خواجہ حمید الدین ناگوری منصب رشد و ہدایت پر فائز تھے ۔ لاہور میں حضرت فریدالدین گنج شکر مخلوقِ خدا کی ہدایت کے منصب پر فائز تھے ۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ مخلوق خدا کو جو سبق دیتے تھے کتاب کے بجائے اپنے عمل سے دیتے تھے ۔ مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ ''باوجود تلاش کے ہمیں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ قدس سرہ العزیز کا کوئی معتبر قول ہندی زبان میں نہیں ملا۔ لیکن ان کی عالمگیر مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یقینی امر ہے کہ وہ ہندی زبان سے ضرور واقف تھے کیوں کہ ہندو بھی مسلمانوں سے کم ان کے معتقد نہیں ۔ ''ہندالولی'' کی ترکیب اور ''غریب نواز'' کا لقب خود ان کی عام مقبولیت کی صاف شہادت دے رہے ہیں'' ۔

7.2.2 بابا فریدالدین گنج شکرؒ (وفات 1265ء)

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے جانشین' خلیفۂ اکبر اور سجادہ نشین حضرت قطب الدین بختیار کاکی تھے ۔ حضرت بختیار کاکی کے بائیس خلیفہ تھے جو سب ہی اولیا اللہ گزرے ہیں۔ ان میں بابا فریدالدین گنج شکرؒ کا نام سرفہرست ہے۔ بابا فریدالدین گنج شکرؒ ایک بلند پایہ صوفی اور شاعر ہونے کے علاوہ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے ۔ ان کا کلام سکھوں کی مقدس کتاب ''گرو گرنتھ صاحب'' میں درج ہے ۔ حضرت کا کلام پرانی بیاضوں میں بھی ملتا ہے ۔ مولوی عبدالحق کو ایک پرانی بیاض میں یہ نظم ملی ۔

تن دھونے سے دل جو ہوتا پوک　　پیش رو اصفیا کے ہوتے غوک
ریش سبلت سے گر بڑے ہوتے　　بوکڑواں سے نہ کوئی بڑے ہوتے
خاک لانے سے گر خدا پائیں　　گاے بیلاں بھی و اصلاں ہوجائیں

بابا فرید الدین کی غزل کے یہ شعر ملاحظہ ہوں

وقتِ سحر وقت مناجات ہے　　خیز در ان وقت کد برکات ہے
نفس مبادا بگوید ترا　　خسپ چہ خیزی کدا بھی رات ہے
پند شکر گنج کد بدل جان شنو　　ضائع مکن عمر کی ہیہات ہے

7.2.3 قاضی حمید الدین ناگوریؒ (وفات 1274ء)

قاضی حمید الدین ناگوریؒ بخارا کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے استاد ہیں۔ آپ ایک بہت بڑے عالم تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ہمراہ ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ناگور میں سکونت اختیار کی اور رشد و ہدایت میں مصروف رہے۔ لوگوں نے آپ کا پیغام حق قبول کیا۔ آپ نے بہت سے رسالے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں ''سرور الصدور'' میں لکھا ہے کہ اس زمانے ہیں ان بزرگوں کے گھروں میں بھی ہندی بول چال کا رواج تھا اور چوں کہ یہ ان کے مفید مطلب تھا اس لیے وہ اپنی تعلیم و تلقین میں بھی اسی سے کام لیتے تھے''۔ اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ زبان جسے ہندی کہتے تھے باوجود تغیر و تبدل کے کچھ مدت قبل تک ہندی کہلاتی رہی ہے اور اب اردو کے نام سے موسوم ہے۔ کس طرح ہمارے ملک میں اندر باہر چھائی ہوئی تھی۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ہر زبان کے ادب میں کون سی صنف پہلے منظر عام پر آئی؟
2. اردو نثر کے باقدہ فقرے اور جملے با قاعدہ نثری کتابوں سے پہلے کہاں ملتے ہیں؟
3. حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ان کے خلفا کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ مختصراً لکھیے۔
4. کس کا کلام سکھوں کی مقدس کتاب ''گروگرنتھ صاحب'' میں درج ہے۔ ان بزرگ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ مختصراً لکھیے۔

7.3 چودھویں صدی عیسوی کا مذہبی سرمایہ

چودھویں صدی عیسوی کے صوفیا میں حضرت امیر خسرو اور شیخ عین الدین گنج العلم قابل ذکر ہیں جنھوں نے قابل قدر مذہبی تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بھی اس عہد کے قابل ذکر بزرگ گزرے ہیں۔

7.3.1 امیر خسرو (وفات 1324ء)

چودھویں صدی عیسوی کے صوفیا میں امیر خسرو کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ترکی النسل تھے ان کے والد امیر سیف الدین محمود ہزارہ و بلخ کے امرا میں شمار ہوتے تھے۔ چنگیز خان کے حملوں سے تنگ آ کر ہندوستان آئے اور دہلی کے ایک مشہور امیر عماد الملک کی بیٹی سے شادی کی جن سے تین لڑکے ہوئے جن میں سب سے چھوٹے امیر خسرو تھے۔ امیر خسرو، خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ شاعری کا شوق

پیدائشی تھا۔ کم عمری میں تمام مروجہ علوم میں کمال حاصل کرلیا۔ فارسی ان کے اجداد کی زبان تھی تو ہندی (اردو) ننھیال کی بولی تھی۔ ان دونوں زبانوں میں مہارت حاصل کی۔ اس کے علاوہ ان کو ترکی' عربی اور سنسکرت پر بھی عبور تھا۔ ان دنوں شمالی ہند میں جو زبانیں اور بولیاں رائج تھیں ان سے بھی واقف تھے۔ ہندوستانی اور ایرانی موسیقی میں ان کی مہارت خداداد تھی۔ ہندی اور ایرانی راگوں کے میل سے کئی راگ راگنیاں ایجاد کی تھیں۔ ستار ان کی ایجاد ہے۔ قوالی بھی ان کی دین ہے۔

امیر خسرو' حضرت نظام الدین اولیا کے محبوب ترین مرید تھے انھوں نے گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور سات بادشاہوں کی ملازمت میں رہے۔ امیر خسرو فارسی کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اہل ایران بھی ان کا لوہا مانتے ہیں۔ دہلی کے بازاروں میں بولی جانے والی ریختہ زبان کو امیر خسرو ''ہندوی'' اور ''زبان دہلوی'' کہتے تھے۔ وہ اس زبان کے پہلے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ امیر خسرو نے بہت سی پہیلیاں اور معمے بھی کہے ہیں جو بڑے مقبول ہیں۔ گیتوں' لوریوں اور پہیلیوں وغیرہ کے علاوہ انھوں نے ایسے شعر بھی کہے ہیں جو اردو بھی سمجھے جاسکتے ہیں اور فارسی بھی اور ایسے بھی شعر کہے ہیں جن کا ایک ٹکڑا یا مصرع فارسی ہے اور دوسرا اُردو۔ اس کو ریختہ کہتے ہیں۔ امیر خسرو کی ایک غزل جو ریختہ میں ہے اکثر تذکروں میں درج ہے' بڑی مشہور ہے :

زِحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

غرض امیر خسرو نے فاسی اور ہندی کو ملایا اور ہندی میں بکثرت نظمیں اور دوہے لکھے۔ افسوس ان کا مکمل ہندی کلام اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ تذکروں میں کہیں کہیں بعض چیزیں مل جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بیسیوں پہیلیاں' انملیاں اور کہہ مکرنیاں وغیرہ ان کے نام سے مشہور ہیں۔ چودھویں صدی عیسوی کی اُردو کا بہترین نمونہ امیر خسرو کا کلام ہے۔

''خالق باری'' امیر خسرو کی مشہور تصنیف ہے۔ یہ کتاب بچوں کے ادب کی پہلی تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ اسی سے اردو میں ''ادب اطفال'' کا آغاز ہوا۔ اس کتاب میں روزمرہ استعمال میں آنے والے فارسی الفاظ کے معنی واضح کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب عرصے تک بچوں کے درس و تدریس میں استعمال ہوتی رہی۔ اسی کی تقلید میں اور اسی اسلوب اور پیرائے میں بچوں کے لیے مزید کتابیں بھی لکھی جاتی رہی ہیں جیسے اشرف بیابانی نے ''واحد باری'' اور سید محمد دالہؔ نے ''رازق باری'' اسی طرز پر لکھی۔

مختصر یہ کہ امیر خسرو نے زبان' شاعری اور موسیقی ہی نہیں عام تہذیبی زندگی کو بھی بہت متاثر کیا۔ سماجی زندگی میں مشترکہ روایات اور جذباتی ہم آہنگی کی بنیاد ڈالی۔

7.3.2 شیخ عین الدین گنج العلم (وفات 1392ء)

شیخ عین الدین گنج العلم چودھویں صدی کے ایک مشہور بزرگ تھے۔ آپ دہلی میں پیدا ہوئے۔ گجرات میں تعلیم پائی پھر بیجاپور منتقل ہوئے۔ آپ نے دکنی زبان میں چھوٹے چھوٹے کئی مذہبی رسالے لکھے جو تلف ہوگئے۔ حکیم شمس اللہ قادری نے ''اردوئے قدیم'' میں لکھا ہے کہ شیخ عین الدین گنج العلم کے رسائل نیز شمس العشاق اور شاہ میراں جی کی دکنی تصانیف ''گل باس'' و ''جل ترنگ'' فورٹ سینٹ جارج کالج کے کتب خانے میں موجود تھیں۔

7.3.3 شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (وفات 1370ء)

چودھویں صدی کے ایک اور بزرگ وصوفی کامل شیخ شرف الدین یحییٰ منیری جو بہار کے قصبے منیر کے رہنے والے تھے ان اولیاء اللہ میں ہیں جن کا فیض آج بھی جاری اور مخلوق خدا کی ہدایت کا باعث ہے۔ آپ کے بتائے ہوئے منتر اور وظائف سانپ' بچھو اور سایہ کے اتارنے' دفع امراض کے لیے پڑھے جاتے ہیں۔ جن کے آخر میں ان کی دُہائی ہوتی ہے۔ مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری پوربی اور ہندی بھاشا کے شاعر بھی تھے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. امیر خسرو کو کتنی زبانوں پر عبور حاصل تھا؟
2. ''خالق باری'' کی طرز پر کون سی کتابیں لکھی گئیں؟
3. امیر خسرو کے علاوہ چودھویں صدی عیسوی کے کن صوفیا نے شہرت حاصل کی؟

7.4 پندرھویں صدی عیسوی کا مذہبی سرمایہ

پندرھویں صدی عیسوی کے صوفیاء کرام میں حضرت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور شاہ میراں جی شمس العشاق قابل ذکر ہیں۔

7.4.1 حضرت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ (وفات 1422ء)

سلطان محمد تغلق نے 1327ء میں دولت آباد کو ہندوستان کا دارالسلطنت بنایا اور ساری دہلی کو اُجاڑ کر یہاں لایا تو اس وقت حضرت نظام الدین اولیاء کے بہت سے خلفا اور مرید دولت آباد آئے۔ دکن کی خلافت شیخ برہان الدین غریب (وفات 1337ء) اور ان کے بڑے بھائی شیخ منتجب الدین زر زری بخش (وفات 1309ء) کو عطا ہوئی یہ لوگ یہیں رہ گئے اور یہاں انھوں نے مخلوق خدا کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔

شیخ برہان الدین غریب اپنے چالیس ہمراہیوں کے ساتھ دولت آباد آئے تھے ان میں سید محمد یوسف الحسینی الدہلوی عرف شاہ راجو (خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے والد) بھی تھے۔ سید محمد یوسف الحسینی سید راجا اور راجو قتال کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ آپ نے 5 شوال 731ھ/ 1330ء کو دولت آباد میں انتقال فرمایا۔ آپ کے فرزند سید محمد حسینی جو عام طور پر خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے نام سے مشہور ہیں 815ھ / 1412ء میں سلطان فیروز شاہ بہمنی کے دور میں گلبرگہ تشریف لائے اور 825 ھ / 1422ء میں یہیں انتقال فرمایا۔

خواجہ بندہ نواز گیسودراز نے جنوبی ہند میں اشاعت اسلام کی زبردست خدمت انجام دی۔ آپ اپنے وقت کے ایک جلیل القدر مفسر' محدث' فقیہہ' صوفی' بلند پایہ عالم اور عارف کامل تھے۔ آپ دولت آباد میں پیدا ہوئے اور اپنے والد سید محمد یوسف حسینی المعروف بہ شاہ راجو قتال کی وفات کے بعد دہلی چلے گئے اور سلطان فیروز شاہ بہمنی کے دور میں گلبرگہ تشریف لائے اور یہاں انتقال فرمایا۔

خواجہ بندہ نواز حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ علم تصوف میں آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔ آپ کے مریدوں اور معتقدین کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ آپ اپنے مریدوں کو علم تصوف' حدیث' فقہ اور سلوک کا درس دیا کرتے تھے جو لوگ عربی و فارسی سے ناواقف تھے ان کے لیے دکنی میں تقریر کرتے۔ بہت سے اردو رسالے آپ سے منسوب ہیں۔ ان میں معراج العاشقین' ہدایت نامہ' شکارنامہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مولوی عبدالحق ''معراج العاشقین'' کو مرتب کر کے شائع کر چکے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں اس رسالے کے علاوہ میرے پاس آپ کے متعدد

اور رسالے اس زبان (دکنی) میں ہیں مثلاً تلاوت الوجود' دارالاسرار' شکار نامہ' تمثیل نامہ' ہشت مسائل وغیرہ ۔اگر چہ زبان ان کی قدیم ہے لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انھیں کی تصنیف ہیں یا ان سے منسوب ہیں''۔ مندرجہ بالا کتابوں کا موضوع تصوف اور سلوک ہے ۔ ڈاکٹر گیان چند کی تحقیق ہے کہ خواجہ بندہ نواز نے اردو نثر میں کوئی رسالہ نہیں لکھا۔

حضرت خواجہ بندہ نواز شاعر بھی تھے شہباز' محمد اور بندہ تخلص فرماتے تھے ۔ آپ کی نظم کے مختلف نمونے اور چکی نامے دستیاب ہوئے ہیں۔مختلف بیاضوں میں بعض بیماریوں کے نسخے اور بعض شعر آپ کے نام سے موسوم کیے گئے ہیں ۔

خواجہ بندہ نواز نے اپنی زندگی کے آخری دس سال گلبرگہ میں بسر کیے اور سرزمین دکن کو اپنی تعلیم وتلقین سے فیض پہنچاتے رہے۔مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ آپ کا معمول تھا کہ نماز ظہر کے بعد طلبہ اور مریدوں کو حدیث وتصوف اور سلوک کا درس دیا کرتے تھے اور گاہے گاہے کلام فقہ کی تعلیم بھی دیتے تھے ۔جو لوگ عربی وفارسی سے واقف نہ تھے ان کے سمجھانے کے لیے ہندی زبان میں تقریر فرماتے تھے ۔

7.4.2 شاہ میراں جی شمس العشاق (وفات 1496ء)

شاہ میراں جی شمس العشاق ان اولیاء اللہ میں سے ہیں جن کا فیض صدہا مخلوق خدا کی ہدایت کا باعث ہوا۔ آپ نے بیجاپور میں ایک ایسے خاندان کی بنیاد ڈالی جس میں ان کے جانشین یکے بعد دیگرے کئی پشت تک بڑے صاحب علم اور صاحب ذوق ہوئے ۔ انھوں نے اردو کو اپنی زبان سمجھا اور اس زبان میں سلوک ومعرفت پر متعدد رسالے اور مثنویاں لکھیں ۔

میراں جی شمس العشاق' حاجی دوام الدین کے صاحب زادے تھے ۔ مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے ایک عرصے تک وہیں قیام کیا۔ بارہ سال روضۂ مبارک کے قریب رہے ایک روز شب جمعہ کو حالتِ خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ہندوستان جانے کے لیے ارشاد فرمایا۔ آپ ہندوستان آئے اور حضرت شاہ کمال الدین مجرد بیابانی کے مرید ہوئے ۔ شاہ کمال الدین' شاہ جمال الدین مغربی کے مرید تھے اور وہ حضرت سید محمد حسینی گیسودراز کے مرید تھے ۔حضرت گیسودراز کا فیض دکن میں بہت عام ہے ۔ شاہ میراں جی اور ان کے خانوادے نے اردو زبان میں تصنیف وتالیف کا کام انجام دیا ۔ ان کی بدولت بیجاپور میں اس زبان کو اس قدر فروغ ہوا کہ یہاں ایسے خوش بیاں اور بلند خیال شاعر پیدا ہوئے جن کی نظیر اردو کے شاعروں میں بہت کم ملتی ہے ۔

عادل شاہی سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ میراں جی شمس العشاق کا بڑا ادب کرتا تھا ۔ اسی کے زمانے میں آپ کا انتقال ہوا۔ میراں جی کے مریدوں کا حلقہ نہایت وسیع تھا ۔ آپ نے اردو میں درس وتدریس' تعلیم وتلقین کے علاوہ تصنیف وتالیف کا بھی کام کیا۔ آپ کی کئی تصانیف کا پتا چلا ہے جن میں 'خوش نامہ''۔'' خوش نغز''۔''شہادت التحقیق''/''شہادت الحقیقت''۔''مغز مرغوب''/'' شرح مرغوب القلوب'' مشہور اور اہم ہیں ۔ ان میں تصوف ومعرفت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. چودھویں صدی کے وہ کون سے صوفی تھے جو کئی زبانوں سے واقف تھے اور انھوں نے کئی راگ راگنیاں ایجاد کیں؟
2. دہلی کے بازاروں میں بولی جانے والی ریختہ زبان کو امیر خسرو نے کیا نام دیا ہے؟
3. امیر خسرو یا شیخ عین الدین گنج العلم کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں ؟مختصراً لکھیے ۔
4. خواجہ بندہ نواز گیسودراز یا میراں جی شمس العشاق کی خدمات پر مختصر نوٹ لکھیے ۔

7.5 سولھویں صدی عیسوی کا مذہبی سرمایہ

سولھویں صدی عیسوی کے صوفیا میں حضرت غوث گولیاری' شاہ علی محمد جیوگام دھنی' برہان الدین جانم اور شاہ وجیہہ الدین علوی بہت مشہور ہیں۔ شیخ بہاء الدین باجن اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا بھی تعلق اسی عہد سے تھا۔

7.5.1 شیخ بہاء الدین باجنؔ (وفات 1506ء)

شیخ بہاء الدین باجن برہان پور کے اولیاء اللہ میں سے ہیں ان کے فیض سے صدہا مخلوقِ خدا نے ہدایت پائی ۔ آپ حضرت شیخ عزیز اللہ المتوکل علی اللہ کے مرید تھے ۔ آپ کی ایک کتاب ''خزانۂ رحمت'' مشہور ہے جس میں انھوں نے اپنے پیرومرشد کے ملفوظات اور ارشادات جمع کیے ہیں۔ باجن شاعر بھی تھے آپ کا کلام تصوف کے مضامین سے لب ریز ہے ۔

7.5.2 شیخ عبدالقدوس گنگوہی (وفات 1538ء)

شیخ عبدالقدوس گنگوہی صاحب علم وعمل اور بڑے عالم وصوفی تھے ۔ مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ آپ شیخ محمد بن شیخ احمد عبدالحق چشتی صابری کے مرید اور صاحبِ تصانیفِ کثیرہ ہیں۔ آپ ہندی میں شاعری بھی کرتے تھے ۔ آپ کی کتابوں میں ''رشد نامہ'' بڑی مقبول ہوئی۔ اس میں تصوف اور وحدت الوجود کے نکات بیان کیے گئے ہیں۔

7.5.3 حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری (وفات 1563ء)

حضرت محمد غوث گوالیاری سولھویں صدی عیسوی کے بہت بڑے بزرگ اور صوفی تھے۔ بارہ سال تک کوہ چنار کے دامن میں سخت ریاضت کی تھی۔ مغل حکمران ہمایوں آپ کا بڑا معتقد تھا۔ اکبر اعظم آپ کا مرید تھا مگر بعد میں منحرف ہوگیا۔ حضرت غوث گوالیاری کے ہندی قول اور ہندی اشعار قدیم بیاضوں میں ملتے ہیں۔ ''جواہر خمسہ'' آپ کی مشہور کتاب ہے ۔ گجرات کے مشہور عالم وصوفی شیخ وجیہہ الدین علوی نے حضرت غوث گوالیاری ہی سے روحانی فیض حاصل کیا تھا ۔

7.5.4 شاہ علی محمد جیوگام دھنی (وفات 1565ء)

شاہ علی محمد جیوگام دھنی گجرات کے بلند پایہ عارف اور صوفی تھے ۔ آپ کا تعلق گجرات کے سادات رفاعیہ سے تھا۔ اہل گجرات پر آپ کی تعلیم اور ہدایت کا بڑا اثر ہوا۔ آپ کا مجموعہ کلام ''جواہر اسرار اللہ'' توحید اور وحدت الوجود سے بھرا پڑا ہے ۔ تمام موجودات کو خدائے تعالیٰ ہی کا ایک وجود ماننا وحدت الوجود کہلاتا ہے۔ شاہ علی محمد کا کلام خدائے تعالیٰ کی محبت سے لبریز ہے وہ عاشق ہیں اور خدا معشوق' اپنی محبت کو وہ طرح طرح سے جتاتے ہیں۔ طرز کلام ہندی شعرا کا سا ہے اور عورت کی طرف سے خطاب ہے۔ زبان سادہ ہے لیکن پرانی ہے اور غیر مانوس الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اس لیے سمجھنا مشکل ہے ۔

7.5.5 شیخ وجیہ الدین احمد علوی (وفات 1589ء)

شیخ وجیہ الدین علوی اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور صاحب باطن بزرگ تھے ۔ 1589ء میں احمد آباد میں انتقال کیا ۔ آخری عمر احمد آباد میں درس و تدریس اور تعلیم وتلقین میں گذاری ۔ آپ نے حضرت غوث گولیاری سے فیضِ روحانی حاصل کیا۔ آپ کے مریدوں نے آپ کی کہی ہوئی باتوں یعنی ملفوظات کو کتاب کی صورت میں جمع کیا ہے جس کا نام ''بحر الحقائق'' ہے ۔ اس میں جگہ جگہ ہندی اقوال درج ہیں۔ اس طرح شیخ وجیہ الدین علوی نے ملفوظات کے علاوہ اردو میں کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی ۔

7.5.6 شاہ برہان الدین جانم (وفات 1598ء)

برہان الدین جانؔم' شاہ میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے ۔ حضرت جانؔم اپنے عہد کے بڑے عالم' عارف اور صوفی تھے ۔ پندرہ برس کی عمر تک تحصیلِ علم میں مصروف رہے اور علم ظاہری میں کمال حاصل کیا ۔ اس کے بعد علم باطنی کے کسب کا اشتیاق پیدا ہوا اور اپنے والد میراں جی شمس العشاق کے ہاتھ پر بیت کی اور والد کی تعلیم و تربیت سے جانم بہت جلد ایک جید عالم اور صوفی بن گئے ۔ جانم اپنے والد کی

طرح رشد و ہدایت اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے ۔ انھوں نے اپنے والد کی روایت کو نباہا اور جنوبی ہند میں رشد و ہدایت کے فیض کو اپنی تصانیف کے ذریعے سے جاری رکھا۔ ''تاریخ ادب اردو'' میں ڈاکٹر جمیل جالبی رقمطراز ہیں کہ ''جانم کی دو خدمات قابل ذکر ہیں ایک تو یہ ہے کہ انھوں نے تصوف کے فلسفۂ وجود کو مرتب کر کے اسے ایک باقاعدہ شکل دی اور آب و آتش' خاک و باد کے تعلق سے وجود کا مطالعہ کر کے اُس کے چار مدارج 'واجب الوجود' ۔'ممکن الوجود' ۔'ممتنع الوجود' اور 'عارف الوجود' مقرر کیے ۔ دوسری یہ کہ تصوف و اخلاق اور شریعت و طریقت کو اپنی نظم و نثر کے ذریعے پیش کیا ۔''

جانؔم کے پیش نظر رشد و ہدایت اور پند و نصیحت تھا اس کی جھلک ان کی نظم و نثر کی تمام تصانیف میں موجود ہے وہ معرفت و سلوک کی تعلیمات سادہ اور سلیس زبان میں اپنے مریدوں اور معتقدین کو دینا چاہتے تھے ۔ جانؔم چشتیہ سلسلے کے ان بزرگوں میں سے ہیں جن کی تصانیف نے عوام و خواص میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی تھی ۔ جانؔم نے نظم و نثر کی کئی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کا موضوع تصوف اور سلوک ہے ۔''ارشاد نامہ'' ۔''وصیت الہادی'' ۔''سکھ سُہیلا'' ۔''منفعت الایمان'' ۔''حجت البقاء'' ۔''بشارت الذکر'' اور عبرتِ آدم وغیرہ شعری تصانیف ہیں۔ ان میں اخلاق و حکمت اور پند و موعظمت کی مفید باتیں بیان کی گئی ہیں۔ نثر میں بھی برہان الدین جانم سے بہت سے رسالے منسوب ہیں۔ ان میں ''معرفت القلوب'' ہشت مسائل اور ''کلمتہ الحقائق'' قابل ذکر ہیں ۔

جانؔم کی نثری تصانیف میں ''کلمتہ الحقائق'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ یہ قدیم اردو کا اولین نثری کارنامہ ہے جو مکمل حالت میں دستیاب ہوا ہے اور اس کے مصنف کے بارے میں شک و شبہ نہیں ہے ۔

جانؔم کی نثری تصانیف کا موضوع بھی مذہبی ہے ۔''کلمتہ الحقائق'' میں ذات و صفات' فنا و بقا' نور کی تخلیق' وجود اور عناصر اربعہ جیسے موضوعات پر سوال و جواب کے پیرائے میں روشنی ڈالی گئی ہے ۔ قرآن و حدیث کے جابجا حوالے دیے گئے ہیں ۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اور اکبر الدین صدیقی نے کلمتہ الحقائق کو مرتب کر کے شائع کر دیا ہے ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ''خزانۂ رحمت'' کس کی کتاب ہے' اس میں کس کے ملفوظات ہیں؟
2. ''رشد نامہ'' میں کیا بیان ہوا ہے اسے کس نے لکھا ؟
3. ''جواہر اسرار اللہ'' میں کیا بیان کیا گیا ہے ؟
4. ''بحر الحقائق'' میں کس کے ملفوظات جمع کیے گئے ہیں ؟
5. شاہ برہان الدین جانؔم کی خدمات پر ایک مختصر نوٹ لکھیے ۔

7.6 سترھویں صدی عیسوی کا مذہبی سرمایہ

سترھویں صدی عیسوی کے صوفیا میں شاہ امین الدین علی اعلیٰ و شیخ خوب محمد چشتی قابل ذکر ہیں ۔ اردو کے فروغ میں ان بزرگوں کا بھی بڑا حصہ ہے ۔

7.6.1 شیخ خوب محمد چشتی (وفات 1622ء)

شیخ خوب محمد چشتی احمد آباد گجرات کے مشہور بزرگ ہیں ۔ ان کا شمار وہاں کے بڑے درویشوں اور اہل عرفان میں ہوتا ہے ۔ صاحب تصانیف ہی نہیں صاحب سخن بھی تھے ۔ مولوی عبدالحق کا بیان ہے ''خموش'' سے تاریخ ولادت 936ھ / 1539ء اور ''خوب تھے'' سے تاریخ وصال 1023ھ / 1614ء نکلتی ہے ۔ انھوں نے تصوف میں کئی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں ۔ ایک رسالہ ''بھاؤ بھید'' ۔ صنائع بدائع کلام میں

ہے ۔ دوسری مشہور کتاب ''خوب ترنگ'' ہے جو خالص تصوف کی کتاب ہے ۔ یہ دراصل ایک صوفیانہ مثنوی ہے جو ایک زمانے تک بڑی مقبول رہی ۔ برسوں بعد حضرت مخدوم عبدالحق ساوی (وفات 1742ء) نے اس کی شرح ''مفتاح التوحید'' کے نام سے لکھی ۔ ''خوب ترنگ'' میں شیخ خوب محمد چشتی نے اپنے پیرومرشد شیخ کمال الدین محمد سیستانی کے ارشادات منظوم کیے ہیں ۔

7.6.2 میراں جی خدانما (وفات 1663ء)

سید میراں جی خدانما' خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے سلسلے کے ایک مشہور شاعر و ادیب گذرے ہیں ۔وہ 1004ھ / 1596ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے ۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے ملازم تھے ۔ بادشاہ نے بعض امور مملکت کے سلسلے میں انھیں بیجاپور بھیجا تھا ۔ یہاں آکر انھوں نے حضرت امین الدین علی اعلیٰ سے بیعت کی اور خرقۂ خلافت سے سرفراز کیے گئے ۔ میراں جی نے حیدرآباد واپس آکر ملازمت ترک کردی اور درس و تدریس اور رشد و ہدایت میں مصروف ہوگئے ۔

میراں جی خدانما کا شمار اردو کے ان قدیم نثر نگاروں میں ہوتا ہے جن کی تصانیف نے اردو نثر کی راہ متعین کی اور اس کا معیار قائم کیا۔ میراں جی کی نثری کتابوں میں ''شرح شرحِ تمہیدات عین القضات'' ۔''رسالہ وجودیہ'' اور'' رسالہ مرغوب القلوب'' قابل ذکر ہیں ۔ ان رسائل میں مسائل تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

''شرح شرح تمہیدات عین القضات'' عبداللہ بن محمد عین القضات ہمدانی کی عربی تصنیف ''تمہیدات ہمدانی'' کا آزاد ترجمہ ہے ۔ ترجمہ عام فہم اور سلیس ہے ۔ گنجلک اور پیچیدہ عبارتیں کہیں نظر نہیں آتیں ۔ پروفیسر سیدہ جعفر کا بیان ہے کہ خدانما کی نثر کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ وہ مثالوں کے ذریعے سے اپنے مافی الضمیر کی وضاحت کرتے ہیں اور یہ مثالیں انھوں نے روزمرہ کی زندگی سے اخذ کی ہیں کیوں کہ ان کے مخاطب ایسے عوام تھے جن کے لیے تصوف کے اسرار و رموز کی تفہیم آسان نہیں تھی ۔ خدانما نے ان کی عملی اور ذہنی استعداد کو پیش نظر رکھتے ہوئے مطالب کی سادہ زبان میں مثالوں کی مدد سے اچھی صراحت کی ہے''۔

7.6.3 شاہ امین الدین علی اعلیٰ (وفات 1675ء)

امین الدین علی اعلیٰ' شاہ میراں جی شمس العشاق کے پوتے اور برہان الدین جانؔم کے فرزند تھے ۔ امین الدین اعلیٰ کی ولادت سے پہلے ہی جانؔم کا انتقال ہوگیا۔ جانؔم کے خلیفہ محمود خوش دہاں نے امین الدین اعلیٰ کو علوم ظاہری و باطنی سے مستفید کیا ۔

شاہ امین الدین بھی اپنے باپ دادا کی طرح صاحب ارشاد و ہدایت تھے ۔ آپ کے سینکڑوں مرید تھے ۔ جن میں میراں جی خدانما اور سید ہاشم خداوند ہادی بہت مشہور ہیں ۔ شاہ امین الدین اور ان کے مریدوں نے نظم و نثر کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے ۔ بقول پروفیسر سیدہ جعفر ''ایک ایسی زبان جو' گھر بھا کا'' کہلاتی تھی رشد و ہدایت کا موثر ذریعہ بن گئی جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس زبان میں فکر و فن کے اظہار کی اچھی صلاحیت پیدا ہوتی گئی ۔ امین الدین اعلیٰ نے نظم و نثر میں بہت سے رسالے سپرد قلم کیے ہیں ۔ ''گنج مخفی'' ۔ ''رسالہ وجودیہ'' گفتار امین الدین ''ظاہر و باطن'' ۔ ''عشق نامہ'' ۔ ''شرح کلمہ طیب اور کلمۃ الاسرار'' وغیرہ میں انھوں نے اپنی تعلیمات کا نچوڑ پیش کردیا ہے ۔

> ''امین الدین علی اعلیٰ کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے والد کی قائم کی ہوئی روایات کو آگے بڑھایا اور اردو نثر کو اس منزل تک پہنچانے میں مدد دی جہاں اس کے منفرد خدوخال ابھر سکے اور اس کا مخصوص مزاج اور انفرادی آہنگ اور لب و لہجہ متعین ہوسکا ۔''

غرض اس صدی وار تجزیے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ترین اردو ادب پر مذہب کا غلبہ تھا ۔ خواجگان چشت اور دوسرے صوفیا نے ہندوستان میں اپنی گفتار اور کردار سے ایک ایسا انقلاب پیدا کیا کہ جس کا اثر ہندوستانی تہذیب و تمدن' افکار و خیالات' علم و ادب' شعر و شاعری غرض زندگی کے ہر شعبے پر ایسا پڑا کہ اس کے آثار اور خدوخال آج بھی نمایاں ہیں ۔ یہ تمام صوفیا کرام اردو کے محسن ہیں ۔ یہ تمام بزرگ اس

زبان کے بڑے ادیب اور شاعر نہ تھے اور نہ ان کا مقصد اس زبان کی ترقی تھا۔ ان کی غرض و غایت صرف ہدایت، تبلیغ و اشاعت اسلام تھی لیکن اس طرح خود بخود اردو زبان کو فروغ ہوتا گیا اور عہد بہ عہد نئے نئے اضافے اور اصلاحیں ہوتی گئیں ان کی مثال نے دوسروں کی ہمت بڑھائی جس سے اس کے ادب میں نئی شان پیدا ہوگئی۔ اس طرح اردو زبان کا مورخ صوفیا کرام کے احسانوں کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ''خوب ترنگ'' کس کی تصنیف ہے اس میں کیا ہے؟
2. سید میراں جی خدا نما کی نثری تصانیف کے نام لکھیے۔
3. ''کلمۃ الاسرار'' کس کی کتاب ہے؟
4. امین الدین علی اعلیٰ کی خدمات پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

7.7 خلاصہ

اردو ادب کا ابتدائی دور زیادہ تر مذہبی ادب کا دور رہا ہے شاید ہی دنیا کا کوئی ادب ایسا ہو جس پر مذہب کے اثرات نہ پڑے ہوں۔ ابتدائی دور میں مذہب کا رنگ گہرا ہوتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے۔ صوفیا کرام کو نہ اردو سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ اس زبان کی خدمت ان کے پیش نظر تھی۔ صوفیا کا عوام سے براہ راست تعلق تھا۔ اس لیے وہ اسی زبان کو ذریعۂ ابلاغ بنانا چاہتے تھے جو اس وقت عوام میں رائج تھی۔ اردو زبان عوام میں رائج ضرور تھی لیکن فارسی کی قدر و منزلت اور مرتبے تک نہیں پہنچ سکی تھی اور تصنیف و تالیف میں فارسی ہی مروج تھی اس لیے دکن کے صوفیا نے بار بار یہ احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ اردو زبان میں کوئی عیب نہیں اور اسے بھی وسیلۂ اظہار بنایا جاسکتا ہے۔

اردو زبان جو ''گھر بھاکا'' کہلاتی تھی رشد و ہدایت، پند و موعظمت کا موثر ذریعہ بن گئی جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس زبان میں فکر و فن کے اظہار کی اچھی صلاحیت پیدا ہوتی گئی۔

اردو زبان مختلف فرقوں کے صدیوں کے میل جول کا نتیجہ ہے اردو نے اب تک اپنی زندگی کی آٹھ صدیاں گزاری ہیں۔ ابتدائی پانچ صدیاں یعنی 1300ء تا 1700ء اس کی زندگی کے قدیم دور کی آئینہ دار ہیں۔

اسلام کی اشاعت میں تیرھویں صدی کے بلند پایہ صوفی حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور آپ کے خلفا کا بڑا حصہ ہے۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ مسلمانوں نے اسلام پھیلانے کے لیے کسی ملک میں اور کسی قوم کے خلاف تلوار استعمال نہیں کی بلکہ دنیا اسلام کے سچے نام لیواؤں کے اخلاق، کردار اور ان کے ارشادات و ملفوظات سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوئی۔ اس برصغیر میں بے شمار صوفیاءِ کرام نے اسلام کی روشنی پھیلائی اور ایک ایک بزرگ کے ہاتھوں پر سینکڑوں ہزاروں نہیں لاکھوں بندگان خدا نے اسلام قبول کیا۔

برصغیر کے اکابر صوفیا میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی نہایت بلند مرتبہ کے مالک ہیں۔ آج برصغیر میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے جو اُجلے نقوش نظر آتے ہیں ان میں بڑا حصہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی کوششوں کا ہے۔ آپ نے اجمیر میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت ایک مستقل نظام قائم کیا اس نظام میں مرکزی حیثیت اجمیر کو حاصل تھی۔ اس کے تحت دوسرے مراکز تھے۔ دہلی میں آپ کے خلیفہ قطب الدین بختیار کاکی رشد و ہدایت میں مصروف تھے۔ وسطی ہند میں ناگور اہم مرکز تھا۔ جہاں آپ کے مشہور خلیفہ حضرت خواجہ حمیدالدین ناگوری منصب رشد و ہدایت پر فائز تھے۔ لاہور میں بابا فرید الدین گنج شکر مخلوق خدا کی ہدایت کے منصب پر فائز تھے۔

ہر زبان کے ادب میں نظم پہلے آتی ہے اور نثر بعد میں۔ اردو ادب کی ابتدائی صدیوں میں نظم کے مقابلے میں نثر بہت کم ملتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زبان کے استعمال میں نثر کی مقدار نظم سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اور یہ بات چیت کی حد تک ہی نہیں بلکہ تحریر

تک کے معاملے میں درست ہے ۔ اردو نثر کے فقرے اور جملے باقاعدہ نثری کتابوں سے پہلے تقریباً تمام صوفیا کے ملفوظات میں ملتے ہیں ۔ انھیں مولوی عبدالحق نے اپنے رسالے ''اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام'' میں اور ڈاکٹر گیان چند جین نے ''تاریخ ادب اردو 1700ء تک'' (جلد دوم) میں پیش کیا ہے ۔ یہ فقرے اور جملے اردو کے قدیم نثری مکالموں کے باقیات الصالحات ہیں۔ ان میں حضرت قطب الدین بختیار کاکی' حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر' شیخ حمید الدین ناگوری' شیخ شرف الدین بوعلی قلندر' شاہ راجو قتال' شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی' شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری' شاہ محمد غوث گوالیاری اور شیخ وجیہ الدین علوی وغیرہ کے نثری مکالمے بڑی اہمیت کے حامل ہیں ۔ ڈاکٹر گیان چند جین کا بیان ہے کہ ''خواجہ بندہ نواز نے اردو نثر میں کوئی رسالہ نہیں لکھا۔ ان کے قریب العصر کسی مصنف نے ان سے کسی اردو کتاب کا انتساب نہیں کیا۔ صرف بیسویں صدی کے اردو محققین یا تذاکراتِ صوفیا میں ان سے اردو کتابیں منسوب کی گئیں ہیں اس سے پیشتر نہیں ۔''

برہان الدین جانم کی تصنیف ''کلمۃ الحقائق'' دبستان بیجاپور کی ایک ایسی تصنیف ہے جس کے مصنف کے بارے میں شک و شبے کی گنجائش نہیں ۔ یہ ہماری قدیم ترین نثر کا ایک مستند نمونہ ہے ۔ عام طور پر مرید' خدا' وجود انسانی' ذات و صفات اور دوسرے مختلف متصوفانہ مسائل سے متعلق جن سوالوں کے جوابات جاننا چاہتے ہیں انھیں جانم نے ''کلمۃ الحقائق'' میں سادہ اور عام فہم انداز میں پیش کیا ہے ۔ ڈاکٹر گیان چند جین کا بیان ہے کلمۃ الحقائق کی زبان پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصنف کے سامنے اردو نثر کا کوئی نمونہ نہیں ۔ اس لیے وہ لڑکھڑا کر لڑکھڑا ' اکھڑی اکھڑی زبان لکھتا ہے ۔''

صوفیاءِ دکن میں امین الدین اعلیٰ کی شخصیت ایک امتیازی شان کی حامل نظر آتی ہے ۔ شاہ امین اور ان کے مریدوں نے اردو نظم و نثر کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے ۔ ایک ایسی زبان جو ''گھر بھا کا'' کہلاتی تھی رشد و ہدایت کا موثر ذریعہ بن گئی جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس زبان میں فکر و فن کے اظہار کی اچھی خاصیت پیدا ہوتی گئی ۔ امین الدین اعلیٰ نے نثر میں بہت سے رسالے سپرد قلم کیے ۔ برہان الدین جانم کی زبان پر ''دیسی الفاظ'' کا غلبہ تھا لیکن امین الدین اعلیٰ کی تحریر پر عربی و فارسی کے اثرات نمایاں ہیں ۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے والد کی قائم کی ہوئی روایات کو آگے بڑھایا اور اردو نثر کو اس منزل تک پہنچانے میں مدد دی جہاں اس کے منفرد خدوخال ابھر سکے اور اس کا مخصوص مزاج اور انفرادی آہنگ اور لب ولہجہ متعین ہوسکا۔

7.8 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے :

1. اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیا کی خدمات پر ایک نوٹ لکھیے ۔
2. سولھویں صدی عیسوی کے صوفیا کی خدمات پر روشنی ڈالیے ۔
3. سترھویں صدی عیسوی کے صوفیاءِ کرام کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے ۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے :

1. امیر خسرو کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے ۔
2. شاہ امین الدین اعلیٰ کا تعارف کرائیے ۔
3. خواجہ بندہ نوازؒ یا میراں جی شمس العشاق پر ایک نوٹ لکھیے ۔

7.9 فرہنگ

قُدس سرّہ یا قدس اللہ سرّہ = اللہ اس کے راز (قبر) کو پاک کرے ۔مرحوم بزرگوں کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ کی جگہ مستعمل ہے

بتیاں = بتی کی جمع ' سوت کی ڈوری جو چراغ میں جلائی جاتی ہے اور زخم پر بھی رکھی جاتی ہے' موم یا چربی کی شمع ' دیا

تصوف = علم معرفت' دل سے خواہشوں کو دور کر کے خدا کی طرف دھیان لگانا' تزکیہ نفس کا طریقہ

وحدت الوجود = تمام موجودات کو خدائے تعالیٰ ہی کا ایک وجود ماننا اور ماسوا کے وجود کو محض اعتباری سمجھنا

چشتی = صوفیا کا ایک مشہور سلسلہ جو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے چلتا ہے

خواجگان = خواجہ کی جمع ' تو ران میں سادات کا لقب' خداوند' آقا

دوہائی (دُہائی) = کسی کو پکار کر مدد کے لیے بلانا ۔ دادخواہی

ملفوظات = ملفوظ کی جمع ۔منہ سے بولی ہوئی بات

فقہ = احکام شریعت کی معلومات' علم دین

واصلاں = واصِل کی جمع ' ملنے والا' ملا ہوا

ہجراں = ہجر کی جمع ۔ جدائی' مفارقت

بوکڑواں = بوکڑوں کی جمع ' بکرے

وصلش = ملاقات' ہجر کی ضد

ہیہات = افسوس' ہائے ہائے

پوک = پاک

بیلاں = بیل کی جمع

خیز = اٹھو

گنج العلم = علم کا خزانہ

سکھی = سہیلی

منتر = جادو' ٹونا

سُلوک = تلاش حق (اصطلاح تصوف)

رتیاں = رات کی جمع

دوہا = دومصرعوں کا ہندی شعر

نیناں = نین کی جمع ' آنکھیں

کوتاہ = چھوٹا' تھوڑا' مختصر

خاک لانے = خاک لگانے

غوک = مینڈک

دراں = اس وقت

چوں = جیسے

پیا = محبوب' شوہر

چشت = مقام کا نام

7.10 سفارش کردہ کتابیں

1. افضل الدین اقبال : مدراس میں اردو ادب کی نشوونما
2. سیدہ جعفر و گیان چند : تاریخ ادب اردو 1700ء تک (جلد دوم)
3. جمیل جالبی : تاریخ ادب اردو (جلد اول)
4. ظہور الحسن شارب : دلّی کے بائیس خواجہ
5. عبدالحق : اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام
6. وحیدہ نسیم : شاہانِ بے تاج

اکائی : 8 بہمنی دور میں اُردو ادب

ساخت

8.1 تمہید

8.2 بہمنی دور کا سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر

8.3 بہمنی دور میں اردو کے فروغ کے اسباب

8.4 ابتدائی زمانہ

8.5 بہمنی دور کے علمی اور ادبی کارنامے

8.6 میراں جی شمس العشاق

8.7 سید اشرف شاہ بیابانی

8.8 دیگر شعرا

8.9 خلاصہ

8.10 نمونۂ امتحانی سوالات

8.11 فرہنگ

8.12 سفارش کردہ کتابیں

8.1 تمہید

اردو شمالی ہند میں پیدا ہوئی۔ محمود غزنوی اور محمد غوری نے پنجاب میں اپنی حکومتیں قائم کیں تو اردو کی ابتدا کی صورت پیدا ہوئی۔ محمد غوری نے دہلی پر قبضہ کر کے جب قطب الدین ایبک کو وہاں کا حاکم بنادیا تو مستقل طور پر فارسی اور ترکی بولنے والے آباد ہوگئے۔ مقامی زبانیں الگ تھیں۔ مقامی زبانوں میں جب دوسری زبانوں یعنی فارسی اور کچھ عربی اور ترکی کے بعض الفاظ شامل ہونے لگے اور ایک نئی زبان کی صورت پیدا ہوئی۔ اس کو ہندی یا ہندوی کہا گیا۔ جس طرح حیدرآباد کی ہر چیز کو حیدرآبادی کہا جاتا ہے اور عرب کی ہر چیز کو عربی کہا جاتا ہے۔ ہند کی مناسبت سے ہند یا یعنی ہندوستان کی ہر چیز کو ہندی کہا جاتا تھا اور اب بھی کہا جاتا ہے جیسے عرب میں ہندوستانیوں کو ''الہندی'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اردو بھی مدتوں تک ہندی یا ہندوی کہلائی۔ دہلی میں جب یہ پھلنے پھولنے لگی تو ''زبان دہلوی'' کے نام سے یاد کی گئی۔ علاء الدین خلجی کی فوجوں کے ساتھ جب گجرات پہنچی تو گجری کہلائی۔ خلجی اور تغلق فوجیوں کی زبان پر چڑھ کر جب دکن پہنچی تو دکنی کہلائی۔ ولی کی سخن وری کی داد دیتی ہوئی اس کے ساتھ جب دوبارہ دلی پہنچتی ہے تو ''ریختہ'' کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ شاہی لشکر میں جب وہ رہنے لگی تو ''اردوئے معلیٰ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

بہمنی دور میں وہ صرف بول چال کی زبان نہیں رہی بلکہ ادب کے اونچے درجے پر فائز ہوئی۔

8.2 بہمنی دور کا سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر

اردو زبان کا آغاز شمالی ہند میں ہوا۔ وہاں دو تین سو سال تک نشوونما پانے کے بعد اس نے دکن کا رخ کیا۔ سیاسی حالات و واقعات کی

وجہ سے وہ دکن پہنچی ۔ علاء الدین خلجی کی سیاسی حکمت عملی کی وجہ سے اردو زبان کو دکن میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا ۔ علاء الدین 1297ء میں گجرات کو فتح کر کے اپنی سلطنت کا حصہ بنالیا۔ گجرات کوئی سو سال تک سلطنت دہلی کا حصہ بنا رہا۔ گجرات فتح کرنے کے بعد 1310ء میں علاء الدین نے دکن اور مالوہ پر حملہ کر کے انھیں بھی فتح کرلیا۔ چونکہ یہ علاقے دہلی سے کافی دور تھے اس لیے یہاں موثر طور پر حکمرانی کرنے کے لیے گجرات، دکن اور مالوہ کے علاقوں کو علاء الدین نے سو سو مواضعات میں تقسیم کردیا اور ہر موضع پر ایک ایک افسر مقرر کردیا جو ''امیر صدہ'' کہلاتا تھا۔ امیرانِ صدہ یہاں کے بے تاج بادشاہ ہوا کرتے تھے ۔ مال گزاری وصول کرنے سے لے کر یہاں کا ہر چھوٹا بڑا انتظام ان ہی کے سپرد ہوتا تھا۔ چونکہ انتظامی امور کی انجام دہی کے لیے انھیں مستقل طور پر یہیں رہنا ہوتا تھا اس لیے وہ اپنے اہل وعیال اور متعلقین کو بھی ساتھ لے آئے تھے ۔ دکن اور گجرات ہی کو انھوں نے اپنا وطن بنالیا تھا۔

امیران صدّہ دکن آنے سے پہلے شمالی ہند میں آباد تھے اور وہاں ان کے آباواجداد صدیوں سے بسے ہوئے تھے اور اس لیے دربار اور سرکار سے ہٹ کر اردو یا ہندوی ہی سے اپنا کام نکالتے تھے ۔ جب گجرات اور دکن میں انھوں نے سکونت اختیار کرلی تو اسی زبان سے اپنا روزمرہ کا کام نکالنے لگے ۔ یہی زبان رابطے کی زبان بن گئی تھی ۔ بعد کے حالات نے اس صورتِ حال کو اور زیادہ مستحکم کردیا۔ خلجی کے بعد محمد تغلق نے امیرانِ صدّہ کے اس نظام کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ اس کو اور مضبوط بنانے کے لیے احکام صادر کیے ۔ اس نظام کی وجہ سے اردو زبان کو جو فائدہ حاصل ہوا اس کے بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں :

> ''اس نظام کی وجہ سے شمال کے لیے دکن اور گجرات کے راستے کھلے رہے ۔ تجارت، لین دین اور دوسرے معاشرتی امور مضبوط تر ہوتے رہے اور ساتھ ساتھ اردو زبان کا حلقہ اثر بھی بڑھتا اور پھیلتا رہا اور ان علاقوں میں یہ زبان بین الاقوامی زبان کی حیثیت میں پھلتی پھولتی رہی ۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب بول چال کی زبان سے گزر کر ادبی سطح پر استعمال میں آئی اور صوفیوں، شاعروں نے اسے اپنے اظہار مقصد کا ذریعہ بنایا تو گجرات میں اس کے ادبی روپ کو ''گجری'' نام دیا گیا اور دکن میں یہ دکنی کہلائی''
> (تاریخِ ادب اردو ۔ صفحہ ۱۳)

محمد تغلق کے ایک اور تاریخی اقدام نے اردو کو دکن میں مستحکم کرنے میں بڑا اہم حصہ ادا کیا۔ دہلی سے دکن کی دوری کا اندازہ خلجی کو بھی تھا، اسی وجہ سے اس نے امیران صدہ کو مقرر کیا تھا ۔ محمد تغلق انتہا پسند بادشاہ تھا۔ اس نے یہ اندازہ کرلیا تھا کہ خود امیرانِ صدہ بھی اس کے قابو سے نکل سکتے ہیں ۔ دکن پر اپنی گرفت کو مضبوط ترین بنانے کے لیے اس نے خود پائے تخت کو دہلی سے دولت آباد منتقل کردیا اور اس انتقال مکانی پر اس انتہا پسندی سے کام لیا کہ دہلی میں ایک متنفس بھی نہیں رہا۔ اس طرح 1327ء میں دہلی کی ساری آبادی دولت آباد منتقل ہوگئی ۔ اس سارے عمل سے دکنی زبان کو اور قوت سے ساتھ پھلنے پھولنے اور فروغ پانے کا موقع مل گیا۔ بعد میں تغلق نے دکن سے پھر دہلی کو پائے تخت بنایا تو بے شمار لوگ دکن ہی میں رہ گئے ۔ اور امیرانِ صدہ کے زیر سایہ آ گئے ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیران صدہ زیادہ طاقتور ہوگئے ۔ اسی لیے محمد تغلق کے آخری زمانے میں تمام امیران صدہ نے متحد ہو کر بغاوت کردی اور خود مختاری کا اعلان کردیا۔ اور اپنے میں سے ایک کو بادشاہ بنادیا۔ 1347ء میں یوں عظیم الشان بہمنی سلطنت کی بنیاد پڑی ۔ بہمنی حکومت میں دکنی زبان کے فروغ اور دکنی کلچر کی ابتدا کے بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں :

> ''اب دکن کی سلطنت شمال سے آئے ہوئے ان ترک خاندانوں کے ہاتھ میں آ گئی تھی جو خود کو دکنی کہنے پر فخر محسوس کرتے تھے ۔ دکنی ان کی زبان تھی جس پر انھوں نے دکنی قومیت اور کلچر کی بنیاد رکھی تھی ۔ بہمنی سلطنت کی زبان خافی خان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، ہندوی تھی'' (تاریخ ادب اردو، صفحہ 14)

بہمنی خاندان کا پہلا بادشاہ علاء الدین حسن شاہ بہمنی تھا ۔ بہمنی عہدِ حکومت 1350ء سے شروع ہو کر 1525ء کو ختم ہوتا ہے ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. اردو دکن میں کس طرح پہنچی ؟
2. امیران صدہ اور محمد تغلق کی وجہ سے اردو زبان کو دکن پر کس طرح فروغ حاصل ہوا ؟

8.3 بہمنی دور میں اردو کے فروغ کے اسباب

بہمنی عہد میں اردو زبان اور ادب کو جو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ اس کے کئی اسباب تھے ۔قدیم اردو یا دکنی جو رابطے کی زبان بنی اس کی سب سے اہم اور بڑی وجہ یہ تھی کہ دکن میں دراوڑی خاندان کی زبانیں کئی تھیں جیسے تلگو' کنڑی' ملیالم اور تامل ۔ یہ زبانیں ہند آریائی زبانوں سے اتنی الگ اور مختلف تھیں کہ ان میں سے کوئی بھی زبان بنیادی زبان نہیں بن سکتی تھی ۔ اسی وجہ سے قدیم اردو جس کو بولتے ہوئے خلجی اور تغلق کے زمانے میں دکن کے حاکم مقرر ہوئے انھوں نے اسی کو رابطے کی زبان بنایا۔ اس کے علاوہ قدیم اردو یعنی دکنی کو جو سرکاری اور درباری سرپرستی حاصل ہوئی اس کا اہم سبب سیاسی تھا۔ جب کبھی کوئی ملک اور قوم آزادی حاصل کرتی ہے اور خودمختار ہوتی ہے ۔ اس کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے حاکم ملک اور قوم سے ہر لحاظ سے خودمختار ہو اور الگ ہو۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اپنی الگ پہچان اور شناخت بنانے کی کوشش کرتی ہے ۔ اس بات کی سب سے بڑی اور روشن مثال امریکا ہے۔ امریکا پر برطانیہ اس طرح قابض تھا جس طرح ہندوستان پر تھا۔ امریکا جب برطانیہ کے تسلط سے آزاد ہوا تو اس نے جہاں اپنا جھنڈا اور سکہ علحدہ کیا وہیں انگریزی کو قائم رکھتے ہوئے اس کا لہجہ الگ اور مختلف کرلیا اسی طرح املا میں بھی کئی تبدیلیاں کیں اور برطانوی انگریزی سے اسے ممتاز اور الگ کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح سے آمدورفت کے برطانیہ سے بالکل برعکس اصول اور ضابطے اختیار کیے۔ برطانیہ میں اور دوسرے بہت سے ممالک میں بائیں طرف سے چلنا ضروری ہوتا ہے ۔ لیکن امریکا میں دائیں جانب سے چلنے کا اصول اختیار کیا گیا۔ بجلی کے کھٹکے برطانیہ میں جب نیچے کی طرف کیے جاتے ہیں تو بجلی چالو ہوتی ہے۔ لیکن امریکہ میں جب کھٹکے اوپر کی جانب کیے جاتے ہیں تو بجلی چالو ہوتی ہے ۔اس طرح آزاد ملک اپنی پہچان اور شناخت بناتے ہیں بالکل اسی طرح بہمنی سلطنت نے بھی اپنی شناخت بنانے کے لیے مغلیہ سلطنت سے اختلاف کیا۔ جہاں جھنڈا اور سکہ لازمی طور پر الگ ہوئے اور دوسری بہت سی چیزوں میں اختلاف ہوا وہیں زبان کے سلسلے میں بھی مغلیہ سلطنت سے بہمنی سلطنت نے اپنے آپ کو الگ کیا۔ مغلیہ سلطنت میں فارسی نہ صرف سرکاری اور درباری زبان تھی بلکہ علمی اور ادبی اغراض کے لیے بھی صرف فارسی ہی استعمال ہوتی تھی ۔ حد یہ کہ اردو کے بڑے سے بڑا شاعر بھی شاعری کے سوا جب کوئی علمی اور ادبی کام انجام دیتا تھا تو وہ فارسی ہی استعمال کرتا تھا۔ میر' مصحفی' میر حسن قائم چاند پوری اور اس زمانے کے تمام دوسرے شاعر جب اردو شاعروں کا تذکرہ لکھتے تھے تو فارسی ہی میں لکھتے تھے ۔بہمنی عہد میں قدیم اردو یا دکنی پر زیادہ توجہ دی گئی اور کئی اہم دکنی شاعر اس دور میں ملتے ہیں ۔

بہمنی دور میں جو ''نئی تہذیب اور نئی لسانی روایات'' قائم ہوئیں اس کے تعلق سے پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں :

> 1347ء میں علاء الدین حسن بہمن شاہ نے خودمختار حکومت قائم کرلی ۔ پہلے پہل اس کا پایہ تخت دولت آباد تھا لیکن جلد ہی اس نے گلبرگہ پائے تخت بنایا اور اس کا نام حسن آباد رکھا۔ بہمنی خاندان کے کل اٹھارہ حکمران ہوئے ۔ ان میں بڑے قابل اور علم دوست بادشاہ گزرے ہیں جنھوں نے دکن میں نئی تہذیبی روایات کو ترقی دی اور نئی ادبی اور لسانی روایات کی بنیاد رکھی'' (اردو کی ادبی تاریخ صفحہ' 68)

علاء الدین خلجی کے دکن فتح کرنے سے پہلے بھی کئی بزرگ دکن آئے تھے جنھوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ ''نئی تہذیب اور نئی لسانی روایات'' کو فروغ دینے میں بڑا حصہ ادا کیا۔ دکن میں خلجی کے آنے سے پہلے جن بزرگوں کے نام ملتے ہیں ان میں حاجی رومی' سید شاہ مومن' بابا سید مظہر عالم' شاہ جلال الدین گنج رواں' سید احمد کبیر حیات قلندر' بابا شرف الدین' بابا اور شہاب الدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علاء

الدین خلجی کی فتح دکن کے بعد جو بزرگ دکن آئے اور جنھوں نے ایک نئی زبان کو یہاں ترویج دینے میں اہم کام انجام دیا ان کے تعلق سے جمیل جالبی لکھتے ہیں :

''علاء الدین کی فتح دکن کے بعد روحانی پیشوائی کے اس سلسلے کو اور فروغ حاصل ہوا اور یہاں بھی پیر مقصود' پیر جمنا' شاہ منتخب الدین زرزری بخش میر مٹھے حضرت گیسو دراز کے والد سید یوسف شاہ راجو قتال شاہ برہان الدین غریب' شیخ ضیاء الدین اور بہت سے دوسرے صوفیائے کرام دکن کے مختلف علاقوں میں سجادے بچھاے ۔ درستیٔ اخلاق و تبلیغ دین میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان بزرگوں نے یہاں کی مقامی زبانوں کے الفاظ شمال کی زبان میں ملا کر ایک ایسا ہیولا تیار کیا جس سے اظہار کی مشکل حل ہوگئی ۔ اردو زبان کی ابتدائی ترقی میں ان لوگوں کی نامعلوم کوششیں نا قابل فراموش ہیں'' (تاریخ ادب اردو 'صفحہ 151)

بزرگانِ دین کے ملفوظات جو ہم تک پہنچے ہیں ۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان پر ہندوستانی زبانوں کے مختلف اثرات پڑ رہے تھے۔ ان کی زبان کو کسی ایک زبان تک محدود نہیں کیا جاسکتا ۔ جمیل جالبی نے شاہ برہان الدین غریب' زین الدین خلد آبادی' شاہ کو چک ولی کے ملفوظات کے بارے میں کہا ہے :

''یہ جملے نہ خالص پنجابی ہیں اور نہ خالص سندھی' سرائیکی یا اردو میں' مختلف زبانوں کے اثرات ان میں ملے جلے نظر آرہے ہیں''۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. بہمنی حکومت کے قیام سے اردو کو کیا فائدہ پہنچا؟
2. بزرگان دین اور صوفیائے کرام کی دکن میں آمد سے اردو کو کیا فائدہ پہنچا ؟

8.4 ابتدائی زمانہ

بہمنی عہد کا ابتدائی زمانہ یعنی علاء الدین حسن بہمن شاہ کا زمانہ زیادہ تر اپنی حکومت کو مستحکم بنانے میں گزرا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے زمانے میں کئی علما و فضلا کو پایۂ تخت میں مدعو کیا گیا ۔ علاء الدین کے بعد اس کا بیٹا محمد شاہ اول تخت نشین ہوا ۔ اس نے بہمنی سلطنت کو پُرشکوہ بنانے میں بڑا کام کیا۔ بہمنی دربار کی شان و شوکت اسی کے زمانے میں قائم ہوئی ۔ محمد شاہ کے زمانے میں کئی روحانی پیشوا' صوفیا اور بزرگ گلبرگہ میں تھے۔ وہ جس طرح عوام کی اصلاح کرتے تھے اور بادشاہ کو بھی راہ راست دکھاتے تھے اور اردو زبان کی ترویج و اشاعت کرتے تھے۔ اس کے بارے میں پروفیسر عبدالقادر سہروردی لکھتے ہیں :

''عوام حتیٰ کہ بادشاہوں کے اخلاق و عادات پر نظر رکھتے اور جب ضرورت پڑتی اس کی اصلاح کی کوشش کرے ۔ حضرت زین الدین کے کہنے سے محمد شاہ نے شراب پینا چھوڑ دیا تھا اور حدود سلطنت میں شراب کی دکانیں بند کرادی تھیں ۔ حضرت زین الدین کا کام بھی عوام کو ارشاد و ہدایت کرنا تھا اور وہ دکن کے لوگوں کو پرانی اردو ہی میں احکام دین سمجھاتے تھے ۔ (اردو کی ادبی تاریخ صفحہ 70)

محمد شاہ کے زمانے میں حضرت عین الدین گنج العلم کا انتقال ہوا۔ وہ بیجاپور چلے گئے تھے انھوں نے دکنی عوام کی ہدایت اور اصلاح کے لیے کچھ رسالے دکنی میں لکھے تھے ۔

محمد شاہ کے بعد اس کا بڑا بیٹا مجاہد شاہ اور اس کے بعد علاء الدین کا دوسرا بیٹا داؤد شاہ تخت نشین ہوئے ۔ اس زمانے میں امراء کی کشمکش

کی وجہ سے سلطنت کا سکون متاثر ہوگیا تھا۔ بعد میں محمد شاہ ثانی جب تخت نشین ہوا تو شورشیں کم ہوگئیں اور سکون بحال ہوا۔ محمد شاہ ثانی نے بھی علما اور شعرا کو اپنے دربار میں مدعو کیا۔ فارسی کے شہرہ آفاق شاعر حافظ کو بھی محمد شاہ نے مدعو کیا تھا۔ لیکن وہ نہیں آئے۔ محمد شاہ خود بھی فارسی کا شاعر تھا۔ محمد شاہ کے انتقال کے بعد پھر سلطنت میں بے چینی پیدا ہوگئی اور اقتدار کے لیے رسا کشی شروع ہوگئی۔ جس کی وجہ سے ایک سال کے اندر دو بادشاہ غیاث الدین اور شمس الدین تخت پر بیٹھائے بھی گئے اور اتارے بھی گئے۔ البتہ فیروز شاہ کی تخت نشینی کے بعد یہ ہنگامے ختم ہوگئے۔ فیروز شاہ بہمنی خاندان کا آٹھواں بادشاہ تھا اس کے عہد میں سلطنت اپنی تہذیب' علم وفن اور شان وشوکت کے اعتبار سے عروج پر پہنچ گئی۔ فیروز شاہ علم و ادب کی دل سے قدر کرتا تھا اس لیے اس کے دربار میں علما وصوفیا جمع تھے۔ فیروز شاہ کے عہد کی ایک خصوصیت یہ رہی کہ حضرت محمد حسینی گیسودراز گلبرگہ میں رونق افروز ہوئے۔ آپ نے یہاں بھی رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ فارسی کے ساتھ کبھی کبھی اردو میں بھی درس دیا کرتے تھے۔ آپ سے کئی تصانیف اردو کی منسوب کی جاتی ہیں۔ ''معراج العاشقین'' بھی آپ سے منسوب کی جاتی تھی لیکن بعد کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ یہ آپ کی تصنیف نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ''شکار نامہ''۔ ''تمثیل نامہ''۔ ''خلاصہ توحید'' اور ''تلاوت الوجود'' آپ کے نام سے منسوب ہیں۔ آپ نے عورتوں کے لیے بھی ایک چھوٹی سی نظم ''چکی نامہ'' لکھی تھی۔ آپ کے بڑے فرزند جن کا انتقال آپ کی زندگی میں ہوگیا تھا' دکنی کے شاعر تھے۔ آپ کا نام محمد اکبر حسینی تھا۔

آپ نے ایک مختصر سا رسالہ دکنی میں لکھا تھا۔ اس میں بھی وعظ اور نصیحت ملتی ہے۔

فیروز شاہ کے بعد احمد شاہ تخت نشیں ہوا۔ اس کو بھی بزرگان دین پر اعتقاد تھا اور ان کے ساتھ بے حد عزت اور احترام سے پیش آتا تھا۔ فیروز شاہ کے بعد احمد خاں بہمنی سلطنت کے تاج وتخت کا وارث بنا۔ اس نے اپنا پایہ تخت گلبرگہ سے بیدر منتقل کیا۔ بیدر میں جو اس نے عالی شان محل اور عمارتیں بنائی تھیں وہ فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ اس کے زمانے میں کئی ایرانی شاعر بیدر کے دربار میں آئے۔ فارسی کے شاعر آذری کو احمد شاہ نے ملک الشعرا بنایا تھا۔ آذری دکنی میں بھی شاعری کرتا تھا اور اس نے ''بہمن نامہ'' کے نام سے بہمنی سلاطین کی منظوم تاریخ لکھی تھی۔

احمد شاہ کا جانشین علاء الدین ثانی تھا۔ اس کے عہد میں کئی علما اور فضلا موجود تھے۔ حضرت گیسودراز کا اسی کے عہد میں انتقال ہوا۔ اس کے دور میں علمی اور فنی ترقی جاری رہی۔ اس نے قمار بازی اور مئے نوشی کو ممنوع قرار دیا تھا۔ علاء الدین ثانی کے بعد ہمایوں شاہ' جسے ظالم کا لقب ملا تھا تخت نشیں ہوا۔ جو علما ہمایوں کے تخت نشیں ہونے کے مخالف تھے' جب ہمایوں تخت وتاج حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو ان کو چن چن کر قتل کرنے لگا۔ اس کے باوجود اس کے عہد میں کئی عالم اور شاعر رہے ہیں۔ شاہ طاہر استرآبادی اور ملا محمد تقی نظیری اس کے زمانے کے فارسی کے مشہور شاعر گزرے۔ نظیری دکنی بھی شعر کہتا تھا۔ محمود گاواں تجارت کی غرض سے بیدر آئے۔ ہمایوں اس کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اسے اپنے لشکر کا سالار بنادیا۔ ہمایوں کے بعد اس کا آٹھ سالہ بیٹا احمد شاہ ثالث تخت نشین ہوا۔ لیکن سلطنت کا کاروبار اس کی والدہ ماجدہ نے سنبھال لیا۔ اس خاتون نے بڑی قابلیت کے ساتھ سلطنت پر حکمرانی کی۔ احمد شاہ کے بعد محمد شاہ لشکری نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس کے عہد حکومت میں محمود گاواں نے بہت عروج حاصل کیا۔ اس نے علما وفضلا کی سرپرستی کی۔ ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا جو آج بھی بیدر میں موجود ہے۔ اس مدرسہ کا ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی تھا۔ محمد شاہ نے یوسف عادل خاں کو سپہ سالار بنادیا تھا۔ جس نے بعد میں عادل شاہی حکومت قائم کی۔ بعد میں باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو آفاقی کہا جانے لگا۔ جب آفاقیوں اور دکنیوں میں پُرتشدد جھگڑے شروع ہوئے تو ان جھگڑوں میں محمود گاواں کو قتل کردیا گیا۔ اس کے بعد محمد شاہ لشکری کا انتقال ہوا۔ محمد شاہ بہمنی سلطنت کا آخری عظیم الشان بادشاہ تھا۔ محمد شاہ کے عہد حکومت میں اردو کی قدیم ترین مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' لکھی گئی۔ محمد شاہ کے جانشینوں میں محمود شاہ' احمد شاہ رابع' علاء الدین' ولی اللہ اور کلیم اللہ کا زمانہ بڑا ہی پُرآشوب رہا ہے۔ محمود شاہ نے گو چھبیس سال تک حکومت کی لیکن آپسی ناچاقی اور دکنیوں اور آفاقیوں کے جھگڑوں نے سلطنت کی چول چول ڈھیلی کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہمنی دور کے صوبے داروں نے ایک کے بعد ایک خود مختاری کا اعلان کردیا اور بہمنی سلطنت پانچ سلطنتوں میں بٹ گئی۔ اور یہ عظیم سلطنت 1350ء میں قائم ہوئی تھی۔ 1525ء میں ختم ہوگئی۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. فیروز شاہ بہمنی کے دور میں اردو زبان و ادب میں جو کام ہوا اس پر روشنی ڈالیے۔
2. احمد شاہ بہمنی کے دور سے بہمنی سلطنت کے ختم ہونے تک کے واقعات و حالات بیان کیجیے۔

8.5 بہمنی دور کے علمی اور ادبی کارنامے

اب تک کی تحقیق کے مطابق دکنی اردو کی قدیم ترین مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' ہے۔ ایک زمانے تک ''معراج العاشقین'' کو اردو کی پہلی تصنیف سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ خواجہ بندہ نواز گیسودراز سے منسوب کی جاتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر حفیظ قتیل نے ''معراج العاشقین کا مصنف'' کے عنوان سے جو کتاب لکھی ہے اس میں مدلل انداز میں انھوں نے ثابت کردیا ہے کہ ''معراج العاشقین'' نہ تو حضرت گیسودراز کی تصنیف ہے نہ ان کے زمانے میں لکھی گئی ہے۔ بلکہ ان کے زمانے کے تقریباً دوسو سال کے بعد مخدوم شاہ حسینی نے اس کو لکھا ہے۔ اور اس طرح ''معراج العاشقین'' کو اردوئے قدیم یا دکنی کی پہلی تصنیف نہیں کہا جاسکتا۔

مذکورہ تحقیق کے بعد فخر دین نظامی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' اردو کی قدیم ترین تصنیف قرار پاتی ہے۔ یہ مثنوی احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں لکھی گئی ہے۔

احمد شاہ کا زمانہ 825 - 838 ھ م 1421 - 1434 ء رہا ہے۔ احمد شاہ کے دور کی تصنیف ہونے کی داخلی شہادت خود مثنوی میں موجود ہے۔ نظامی نے لکھا ہے :

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنوار — پرت پال سینسار، کردار ادھار
دھنیں تاج کا کون راجا ابھنگ — کنور شاہ کا شاہ احمد بھجنگ

مثنوی میں بار بار مصنف نے اپنا نام ''فخر دین نظامی'' لکھا ہے۔ مثنوی کا نام کیا تھا اس کا پتا نہیں چلتا کیوں کہ ابتدائی ورق اور بیچ کے کئی اوراق کے علاوہ آخر کے حصے میں اس مثنوی کا نام نہیں ملتا۔ چونکہ مثنوی کی کہانی کدم راؤ اور پدم راؤ کے کرداروں پر استوار ہوئی ہے۔ اس لیے مولوی نصیر الدین ہاشمی نے اس مثنوی کا نام کدم راؤ پدم راؤ رکھ دیا ہے۔ بعد میں جمیل جالبی نے اسے مرتب کیا اور اسی نام سے شائع بھی کردیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا قصہ کسی مشہور ہندوستانی کہانی سے ماخوذ ہے۔ اس مثنوی کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ کدم راؤ راجہ ہے اور اس کا وزیر پدم راؤ ہے۔ کدم راؤ ایک دن اعلیٰ ذات کی ناگنی کو ایک کم ذات کے سانپ کے ساتھ میل کھاتا دیکھ لیتا ہے۔ وہ کم ذات کے سانپ کو فوراً ہی تہہ تیغ کردیتا ہے اور ناگنی کو بھی مارتا ہے لیکن اس کی دم کٹ جاتی ہے اور وہ جھاڑیوں میں چھپ جاتی ہے۔ راجہ کدم راؤ کو عورت کی بے وفائی کا یقین ہوجاتا ہے اور وہ اداس رہنے لگتا ہے۔ رانی سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں۔ پدم راؤ وزیر بھی سمجھاتا ہے لیکن کدم راؤ دنیا سے بیزار ہوکر جوگیوں اور سنیاسیوں کی صحبت میں رہنے لگتا ہے۔ وہ اکھرناتھ نامی جوگی سے بے حد متاثر ہوتا ہے، کیونکہ وہ کسی بھی چیز کو کسی بھی دوسری چیز میں تبدیل کرنے کا گُر جانتا تھا۔ وہ اپنے اس کمال سے راجہ کو چڑیا بنادیتا ہے اور خود راجہ بن بیٹھتا ہے۔ ایک دن وہ پدم راؤ سے ایک ''فرمائش نامعقول'' کرتا ہے۔ جب پدم راؤ اسے پورا کرنے سے انکار کردیتا ہے تو اس پر بہت برہم ہوتا ہے تو ادھر کدم راؤ چڑیا کے روپ میں اڑتے اڑتے اپنے محل پہنچتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ اصل وہی کدم راؤ ہے۔ پچھلی باتیں جب وہ سناتا ہے تو پدم راؤ کو یقین ہوجاتا ہے کہ وہی کدم راؤ راجہ ہے۔ پدم راؤ موقع پاکر جب اکھرناتھ گہری نیند میں رہتا ہے اسے ختم کردیتا ہے۔ کدم راؤ منتر کے زور سے پھر اپنی اصلی حالت میں آجاتا ہے اور محل میں واپس آکر ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے ہیں۔

مثنوی ''کدم راؤ اور پدم راؤ'' کی زبان بے حد مشکل ہے اور اس کو سمجھنا بھی بہت مشکل ہے ۔ اس مثنوی کی قدامت کے باوجود اس میں جو خوبیاں ملتی ہیں اس کے تعلق سے جمیل جالبی لکھتے ہیں :

> ''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'' ساڑھے پانچ سو سال سے زیادہ پرانی مثنوی ہے اور اردو ادب کے اولین روایت کی نمائندہ ہے۔ جس کثرت سے اس میں ضرب الامثال اور محاورے استعمال ہوئے ہیں۔ وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ زبان صدیوں پرانی ہے جو سینکڑوں سال کی مسافت طے کر کے' اپنے ارتقا کی مختلف منزلوں سے گزر کر ادبی سطح پر استعمال میں آنے کے لائق بنی ہے ۔ سنسکرتی الفاظ کے استعمال کے علاوہ جہاں تک بیان کی چستی اور رچاوٹ کا تعلق ہے وہ ''کدم راؤ پدم راؤ'' میں موجود ہے۔ یہاں بیان میں بے جا پھیلاؤ کا بھی احساس نہیں ہوتا بلکہ بات کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کا عمل ملتا ہے ۔ مثنوی میں استعمال ہونے والی ضرب الامثال میں سے شاید ہی کوئی ایسی ہو جو آج بھی اردو زبان کے سرمائے میں شامل نہ ہو''۔
> (تاریخ ادب اردو صفحہ 166)

8.6 میراں جی شمس العشاق

میراں جی عین جوانی میں دنیوی تعلقات ترک کر کے راہ خدا میں نکل گئے تھے ۔ وہ بیت اللہ میں قیام کے بعد مدینہ منورہ میں کوئی بارہ سال رہے ۔ وہ ایسے خاندان کے بانی تھے جس نے صدیوں تک ارض دکن میں رشد و ہدایت کا کام انجام دیا۔ میراں جی کا زمانہ 1496ء کا ہے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بہمنی سلطنت طوائف الملکی کی شکار ہو چکی تھی ۔ وہ روبہ زوال تھی ۔ 1490ء میں عادل شاہی حکومت اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر چکی تھی۔ بیدر کی برید شاہی 1487ء سلطنت بھی آزادی کا اعلان کر چکی تھی ۔ برار میں عماد شاہی (1487ء) حکومت بھی قائم ہو چکی تھی ۔ احمد نگر کی نظام شاہی (1490ء) سلطنت بھی الگ ہو گئی تھی ۔ قطب شاہی سلطنت نے البتہ (1512ء) میں خود مختاری کا اعلان یا ۔ ان حالت میں ہر طرف بے اطمینانی تھی ۔ میراں جی کی تصانیف اسی زمانے میں سامنے آئیں اور اللہ کی طرف رجوع ہو کر سکون پانے کا طریقہ بتاتی رہیں ۔ اسی وجہ سے ان کی تمام تصانیف کا موضوع تصوف اور اخلاقی تعلیم ہے ۔ ان کی چار کتابیں ملتی ہیں (1) خوش نامہ (2) خوش نغز (3) شہادت التحقیق (4) مغز مرغوب ۔

''خوش نامہ'' ایک سو ستر اشعار پر مشتمل نظم ہے ۔ اس میں ایک نیک سیرت لڑکی ''خوش'' کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کی بہترین صفات کی وجہ سے سب ہی اس سے محبت کرتے تھے اور عزت بھی کرتے تھے ۔ لیکن وہ صرف سترہ سال کی ہوئی تھی کہ اللہ نے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔ اتنی کم عمری میں خوش کا مر جانا افسوس کی بات ہے لیکن اللہ کی مرضی یہی تھی ۔ اس کی موت سے میراں جی اخلاقی نتائج اخذ کر کے روحانی مسائل کی تشریح کرتے ہیں ۔

دوسری نظم ''خوش نغز'' ہے ۔ یہ صرف بہتر (72) اشعار پر مشتمل ہے ۔ اس میں سوال اور جواب کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے ۔ خوش' مختلف روحانی اور مذہبی مسائل پر سوالات کرتی ہے اور میراں جی اس کا جواب دیتے ہیں جیسے عقل اور عشق' کرامات' مراقبہ' عرفان روح وغیرہ۔ میراں جی کی نظموں میں مختلف بولیوں جیسے برج بھاشا' پنجابی اور مراٹھی کے اثرات ملتے ہیں ۔

''شہادت التحقیق'' میراں جی کی ایک طویل نظم ہے جو پانچ سو ترسٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں شریعت اور طریقت کے مسائل قرآن اور حدیث کے ذریعے سمجھائے گئے ہیں ۔ اس میں بھی سوال اور جواب کا طریقہ اپنایا گیا ہے ۔ ''طالب'' سوال کرتا ہے ''مرشد'' جواب دیتے ہیں ۔ اس میں بھی شریعت اور طریقت کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اس میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ سوچ سمجھ کر شریعت اور طریقت پر چلنا چاہیے جو ایسا نہیں کرتے وہ اپنی عمر ضائع کرتے ہیں ۔

''ہور پھوکٹ عمر کھووے''

مغز مرغوب شمس العشاق کی چوتھی اور آخری نظم ہے ۔ اس میں بھی فلسفیانہ اور صوفیانہ مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

میراں جی کی زبان مشکل ہے اور اس کو سمجھنے میں وقت پیش آتی ہے ۔ اردو زبان کی خدمت میراں جی اور ان سے پہلے اور بعد کے ادیبوں نے جس طرح کی ہے ۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے جمیل جالبی لکھتے ہیں :

''یوں معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کھودا جارہا ہے اور ہزار دشواریوں سے راستہ بنایا جارہا ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی محنت اور صلاحیت سے زبان کے دریا کو بیان کے راستے پر ڈالا ۔ آج وہ ہمیں مشکل' ناموس اور بے معنی نظر آتے ہیں ۔۔۔۔ اگر یہ لوگ اس دور میں زبان و بیان کے نئے نئے تجربے (اور یہ سب حقیقت میں تجربے ہیں) نہ کرتے تو سرسوتی کی طرح اس زبان کا دریا بھی راستے ہی میں خشک ہوجاتا ۔۔ یہ اردو زبان کے وہ نمونے ہیں جو نویں صدی ہجری کی زبان پر نہ صرف روشنی ڈالتے ہیں بلکہ نقوشِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ہم اس سرمائے سے مختلف تہذیبی دھاروں اور اثرات کا مطالعہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کس کس اثر نے ہماری فکر' ہمارے اظہار کو متاثر کیا ہے اور وہ کون سے اثرات تھے جو اٹھے' بڑھے اور غالب ہوگئے ۔ جس طرح کسی جہاز کی پرواز کو بہت دور تک دیکھنے کے لیے اسے مسلسل ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا پڑتا ہے' اسی طرح اردو کی روایت کو دور تک دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ان لوگوں کی زبان و بیان کی پرواز کو بھی مسلسل دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے'' ۔ (تاریخ ادب اردو ' صفحہ 174)

اپنی معلومات کی جانچ :

1. میراں جی شمس العشاق کی تصانیف کا موضوع کیا ہے ؟
2. میراں جی شمس العشاق نے کتنی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں ؟

8.7 سید اشرف شاہ بیابانی

سید شاہ اشرف بیابانی (1459ء تا 1528ء) رفاعی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ انھوں نے ''نوسر ہار'' کے نام سے 1503ء میں ایک مثنوی لکھی ۔ اس مثنوی کا نام ''نوسر ہار'' اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں نو باب ہیں اور جو ہار کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ہر ہار گویا ہیروں کا ہے ۔ ادبی لحاظ سے بھی یہ مثنوی بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ اشرف نے فخریہ طور پر کہا ہے کہ اس مثنوی میں اس نے ہیرے موتی جڑے ہیں ۔ ان کو سونے کے تار میں پرویا ہے ۔ ہر ہر مصرعے میں نگینے جڑے ہوئے ہیں ۔ اس مثنوی کے نو باب نہیں ہیں بلکہ ''نوسر ہار'' ہیں جن کی قیمت ہزاروں اور لاکھوں ہے :

سونے کی جیو کھونٹی گھڑ — ہیرے مانک موتی جڑ
ایک ایک بول مانک مول — سیم ترازو سیں تھیں تول
بند پرائی سونے تار — سچیں ہوا او ''نوسرہار''
ہر ہر مصرعے باندے لڑ — رتن پدارت مانک جڑ
اے نوبا باں نو سرہار — قیمت اس کی لاکھ ہزار

مثنوی کا موضوع واقعہ کربلا یعنی شہادت حسین ہے جس کو ہندوی زبان میں لکھا گیا ہے ۔

بازاں کیتا ہندوی میں قصۂ مقتل شاہ حسین

ہر باب کا عنوان فارسی میں ہے۔ یہ مثنوی شاید مجلسوں میں سنانے کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کی زبان بہت بامحاورہ ہے۔ جو محاورے اس مثنوی میں ملتے ہیں وہ آج بھی ہماری زبان کا جزو ہیں جیسے وقت آنا (موت آنا)' اٹھ جانا (مرجانا)' غم کھانا (فکروتردود میں مبتلا رہا) ہات آنا (حاصل ہونا) ہات ملنا (افسوس کرنا) پھل پانا (اچھا نتیجہ حاصل ہونا) آساں ٹوٹ پڑنا (سخت مصیبت پڑنا) قول کرنا (وعدہ کرنا) وغیرہ۔ اشرف کی اس مثنوی میں رزمیہ انداز بھی ملتا ہے۔ میدان جنگ کا نقشہ بھی اس نے اچھی طرح کھینچا ہے۔ اسی طرح جذبات اور احساس کی پیش کشی بھی بہت اچھی ہے۔ یہ مثنوی اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے جب اردو زبان ابتدائی شکل میں تھی۔ اس زبان کو اردو ہی نہیں بلکہ دکھنی کے نام سے بھی ابھی پکارا نہیں گیا تھا۔ جمیل جالبی کے کہنے کے مطابق :

''میراں جی کی طرح اشرفؔ بھی اپنی زبان کو ہندوی کہتا ہے۔ شاہ باجن بھی اپنی زبان کو ہندی یا دہلوی کہتے ہیں۔ ابھی اس کے لیے ''گجری'' یا ''دکنی'' کا لفظ استعمال نہیں ہوا''۔ (تاریخ ادب اردو' صفحہ 178)

بہمنی دور نے اردو کی سب سے بڑی خدمت یہ کی کہ اس زبان کو دکن کے چپے چپے تک پہنچادیا۔ بہمنی سلطنت ایک عظیم سلطنت تھی جب یہ ٹوٹی تو پانچ بڑی بڑی سلطنتیں وجود میں آئیں۔ بہمنیوں نے ایک مشترکہ زبان اور ایک مشترکہ تہذیب آنے والوں کو دی۔ جس سے وہ اپنی الگ شناخت اور پہچان بنا سکے۔ بہمنی دور ہی میں زبان و بیان کو اتنا نکھار اور سنوار دیا گیا تھا کہ وہ ادبی اغراض کیلئے استعمال ہوسکے اور اس میں ہر قسم کے موضوعات بیان ہوسکیں۔ بہمنی دور کے مصنفین نے اردو زبان کی خدمت جس طرح کی ہے اس پر جمیل جالبی یوں روشنی ڈالتے ہیں :

''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کو اردو زبان کے مزاج و خون میں شامل کرکے اسے آگے بڑھایا ہے۔ اگر یہ لوگ ایسا نہ کرتے اور اس زبان کو اپنے اپنے انداز میں' اپنی اپنی ضرورت کے مطابق' استعمال نہ کرتے تو یہ زبان وقت کی قبر میں کبھی کی دفن ہوچکی ہوتی۔ طویل نظم لکھنا' اور وہ بھی ایسے دور میں جب خود زبان و بیان ہر سطح پر گھٹنوں پر چل رہی تھی۔ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ان لوگوں نے زبان کو مختلف موضوعات سے آشنا کرکے اسے جلد ہی کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ قدیم اردو مصنفین کا ہم پر یہی احسان ہے۔'' (تاریخ ادب اردو ' جلد 5 ' 179)

بہمنی عہد جب ختم ہوا تو پانچ سلطنتوں میں بٹ گیا لیکن بہمنی دور نے ایسی مضبوط لسانی اور تہذیبی روایت قائم کی تھی جس پر یہ تمام ریاستیں تادم آخر چلتی رہیں۔ ان میں سے عادل شاہی اور قطب شاہی دور ادبی لحاظ سے بھی پرشکوہ اور شاندار رہا ہے جس پر اردو زبان ادب جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ یہ اردو ادب و تہذیب کا بھی سنہری دور ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. نوسرہار پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. بہمنی دور نے اردو کی سب سے بڑی کیا خدمت انجام دی؟ بیان کیجیے۔

8.8 دیگر شعرا

بہمنی دور کے دیگر شعرا میں فیروزؔ، لطفیؔ اور مشتاقؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔

فیروز بیدریؔ

فیروز کا پورا نام قطب دین قادری اور تخلص فیروز ہے۔ وہ بیدر کا متوطن تھا جیسا کہ اس نے درج ذیل شعر میں اپنے نام تخلص اور وطن

کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مجھے ناؤں ہے قطب دیں قادری
تخلص سو فیروز ہے بیدری

فیروز نے ایک مثنوی ''پرت نامہ'' جس کا دوسرا نام ''توصیف نامہ میراں محی الدین'' بھی ہے کے علاوہ چند غزلیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ''پرت نامہ'' کو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مرتب کر کے شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کے مجلّہ ''قدیم اردو'' (جلد اول) 1965ء میں شائع کر دیا ہے۔

''پرت نامہ'' فیروز نے اپنے پیر و مرشد اور مذہبی رہنما حضرت مخدوم جی شیخ محمد ابراہیم (متوفی 1564ء) کی مدح میں لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے میں نے خواب میں حضرت غوث اعظم دستگیر کو دیکھا اور جب نیند سے بیدار ہوا تو میرے سامنے حضرت مخدوم جی انھیں کے ہم شکل دکھائی دیے۔ اسی لیے وہ اپنے مرشد کو محی الدین ثانی بھی کہتا ہے۔ ''پرت نامہ'' از اول تا آخر حضرت غوث اعظم اور فیروز کے مرشد حضرت مخدوم جی شیخ محمد ابراہیم کی مدح و توصیف میں ہے۔

مخدوم جی اپنے دور کے ایک مشہور عالم تھے۔ ان کی شہرت دکن کے علاقے میں بہت جلد پھیل گئی۔ یہی وجہ ہے کہ گولکنڈے کے تیسرے حکمران ابراہیم قطب شاہ نے انھیں گولکنڈہ آنے کی دعوت دی تھی۔ مخدوم جی خود تو گولکنڈہ نہیں آئے لیکن اپنے مرید فیروز کو اپنی بجائے گولکنڈہ روانہ کیا۔ جہاں فیروز کو بحیثیت شاعر غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ گولکنڈے کے شعرا وجہی، محمد قلی اور ابن نشاطی نے اپنے کلام میں فیروز کا ذکر عزت و احترام سے کیا ہے۔ فیروز کی گولکنڈہ میں آمد وہی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ ولی کا سفر دہلی۔ ڈاکٹر محمد علی اثر لکھتے ہیں :

> ''گولکنڈہ میں فیروز کو ایک باکمال شاعر اور استادِ سخن کی حیثیت سے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ گولکنڈہ کے نوعمر شاعروں نے فیروز کے آگے زانوے ادب تہہ کیا۔ گولکنڈہ میں اردو شاعری کی شمع روشن کرنے کا سہرا فیروز ہی کے سر ہے۔ (دکنی غزل کی نشوونما ص 54)

ڈاکٹر محمد علی اثر نے اپنی کتاب ''دکنی غزل کی نشوونما'' میں فیروز کی 5 نو دریافت غزلیں یکجا کی ہیں۔ اس کی غزل گوئی کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے :

> ''فیروز کی غزل کی سب سے نمایاں خصوصیت اظہار بیان کی سادگی اور روانی ہے۔ اس کا تصور محبوب مادی اور مجازی ہے اور وہ غزل کو عورتوں سے باتیں کرنے اور عورتوں کی باتیں کرنے کا ذریعہ اظہار سمجھتا ہے۔ اس کے ہاں محبوب کی جنس واضح ہے۔ وہ اپنے محبوب کو نار، سودھن، استری، شہپری، سانولی، سکھی کے نام سے یاد کرتا ہے۔'' (دکنی غزل کی نشوونما۔ص 60)

نمونہ کلام:

سنگار بن کا سرو ہے سو قد ترا اسے شہ پری
مکھ پھول تے نازک دسے توں پھول ہے یا استری
سودھن کہے فیروز یا ایسے دیوانہ کی کیا
جب سانولی سکھی سوں مائل ہوا دکھن میں
اول کس چھند سوں آ کر نہ تھا سونیہہ منج لاکر
برہ کے بس منے بھاکر تو بیزاری نہ کرتا تھا

مشتاق بیدری

مشتاق کا پورا نام اور اس کے واقعاتِ حیات پردہ' گمنامی میں ہیں۔ اس کی چند غزلوں اور ایک قصیدے کا پتہ چلتا ہے ۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

''مشتاق سلطان محمد شاہ لشکری بہمنی (متوفی 1482ء) کے آخری زمانہ کا ایک شاعر تھا جس نے غالباً سلطان محمود شاہ بہمنی (متوفی 1518ء) کے دور میں شہرت حاصل کی اس نے سید برہان الدین شاہ خلیل اللہ بت شکن کی مدح میں جو قصیدہ لکھا تھا وہ اب تک محفوظ ہے۔'' (دکنی ادب کی تاریخ ص 15)

ڈاکٹر زور نے ''دکنی ادب کی تاریخ'' میں مشتاق کی دو غزلوں کے چند اشعار نمونتاً پیش کیے ہیں مولوی نصیر الدین ہاشمی نے بھی ''دکن میں اردو'' میں مشتاق کی غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار درج کیے ہیں۔ ان کے علاوہ مولوی سخاوت مرزا نے اپنے ایک تحقیقی مضمون ''قدیم اردو کی ایک نایاب بیاض'' مشمولہ رسالہ اردو کراچی (اکتوبر 1950ء) میں مشتاق کا ایک قصیدہ اور غزلیں شائع کی ہیں ۔ جن کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ مشتاق ایک باکمال غزل گو اور بے مثال قصیدہ گو بھی تھا۔

نمونہ کلام:

او کسوت کیسری کر تن چمن میانے چلی ہے آ
رہے کھلنے کوں تیوں دستی او چنپے کی کلی ہے آ

صفا اس گال کوں دیکھت نظر سوجا گاگر پڑتی
مکھی کے پر میں کاں طاقت جو سورج لگ جا گزر آوے

لطفی

مشتاق کی طرح لطفی کا پورا نام اور اس کے حالات زندگی نامعلوم ہیں ۔

''لطفی بھی اسی (بہمنی) دور کا شاعر تھا اور مشتاق کا ہم عصر ۔ اس نے بھی مشتاق کی طرح شاہ محمد کی مدح کی ہے جو خلیل اللہ بت شکن کی اولاد میں تھے ۔'' (دکنی ادب کی تاریخ ص 16)

لطفی کی اب تک صرف ایک ہی غزل کے چند اشعار دستیاب ہوئے ہیں جنہیں ڈاکٹر زور نے ''دکنی ادب کی تاریخ'' میں نصیر الدین ہاشمی نے ''دکن میں اردو'' میں درج کیا ہیں ۔ یہ غزل دراصل ریختی ہے جس میں لطفی نے خود کو عورت تصور کر کے عورتوں کے جذبات کی ترجمانی انھیں کی زبان میں کی ہے ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

خلوت منے سجن کے میں موم کی بتی ہوں
یک پاؤں پر کھڑی ہوں جلنے پرت تپی ہوں

شبہہ کے ملن کی ماتی ہر نس جلن کوں آتی
سب قد کھرا جلاتی پن آہ **نئیں** کتی ہوں

رسیا چتر رسیلے بھوگی سو شاہ محمد
مندر منے سجن کے نس جاگتی رہتی ہوں

مشتاق اور لطفی کی غزل گوئی کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد علی اثر لکھتے ہیں :

''مشتاق اور لطفی کے کلام کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ وہ اپنے زمانے کے اساتذہ سخن رہے ہوں گے ۔۔۔۔ یہ قدیم اردو غزل کے اولین نمونے نہیں ہوسکتے بلکہ ان کے پیش رو شعرا نے بھی صنف غزل پر طبع آزمائی کی ہوگی ورنہ غزل کے ان اولین نقوش میں اس درجہ پختگی اور روانی پیدا نہیں ہوسکتی تھی ۔'' (دکنی غزل کی نشوونما ص 51)

اپنی معلومات کی جانچ :

1. فیروز نے کن اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ؟
2. فیروز کی مثنوی کا نام بتایئے ۔
3. مشتاق نے غزل کے علاوہ کس صنف میں طبع آزمائی کی ؟
4. لطفی کی کتنی غزلیں دریافت ہوئی ہیں ؟

8.9 خلاصہ

اردو شمالی ہند میں پیدا ہوئی ۔لیکن دکن میں وہ نہ صرف پلی بڑھی بلکہ ادبی اغراض کے لیے استعمال ہونے لگی ۔ شمال سے دکن وہ سیاسی وجوہات کی بنا پر پہنچی ۔ امیر خسرو نے اسے ہندی یا ہندوی کہا۔ دہلی میں وہ ''زبان دہلوی'' کہلائی ۔ علاء الدین خلجی نے دکن کا پورا علاقہ فتح کرلیا۔ جس میں گجرات اور مالوہ بھی شامل تھے ۔ اس پورے علاقے کو اس نے ایک سو علاقوں میں تقسیم کردیا۔ اور ہر حصہ پر اپنا ایک امیر یا حاکم مقرر کیا جس کو وہ ''امیر صدّہ'' کہتے تھے ۔ امیرانِ صدّہ نے دکن ہی کو اپنا وطن بنا لیا تھا ۔ وہ اپنے تمام متعلقین کے ساتھ دکن آئے ۔ امیران صدّہ کے نظام کو بعد میں تغلق نے بھی قائم رکھا۔ تغلق نے جب پائے تخت دہلی کی بجائے دولت آباد منتقل کیا تو دہلی کی ساری آبادی دکن منتقل ہوگئی۔ لیکن جب دوبارہ دہلی کو پائے تخت بنایا گیا تو بے شمار لوگ دکن ہی میں رہ گئے ۔ اردو پہلے گجرات پہنچی اور گجری کہلائی ' بعد میں دکن پہنچی تو دکنی کہلائی ۔ مذکورہ بالا سیاسی حالات کی وجہ سے اردو کو دکن میں پھلنے پھولنے کا زبردست موقع مل گیا۔ بعد میں جب تغلق کی حکومت کمزور پڑ گئی تو امیرانِ صدّہ نے متحدہ طور پر بغاوت کردی۔ اور اپنی آزادی کا اعلان کردیا۔ اس نئی سلطنت کا بانی علاء الدین شاہ بہمن تھا ۔ اسی مناسبت سے 1347ء میں عظیم الشان بہمنی سلطنت قائم ہوئی ۔ چونکہ ہر سلطنت جب آزاد ہوتی ہے تو ہر بات میں اپنی شناخت بناتی ہے اسی طرح بہمنی سلطنت نے بھی ہر بات میں شمالی ہند سے الگ طور پر اپنی شناخت قائم کی ۔ لسانی طور پر بھی چونکہ شمالی ہند میں فارسی کا بول بالا تھا اس لیے اور پھر اس وجہ سے بھی کہ ان کے رابطے کی زبان شروع ہی سے اردو تھی انھوں نے اردو ہی کو اپنایا' اور ہر ممکن طرح سے اردو کی سرپرستی کی ۔ بڑی مدت تک اردو کو اردو نہیں کہا گیا۔ وہ ہندی اور ہندوی کہلاتی تھی ۔ بعد میں وہ ''دکنی'' کہلائی ۔

اردو کی ترویج و اشاعت میں صوفیائے کرام کا بھی بڑا حصہ رہا ہے ۔ دکن میں بھی کئی صوفیا آئے جنھوں نے یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی انھوں نے فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی رشد و ہدایت کے لیے استعمال کیا۔ بہمنی سلاطین بھی ان صوفیا کا بڑا احترام کرتے تھے ۔ یہ بزرگان دین عوام ہی کی رہنمائی نہیں کرے تھے بلکہ خود بادشاہوں کو بھی راہ راست پر لاتے تھے۔ پروفیسر عبدالقادر سہروردی نے لکھا ہے کہ حضرت زین الدین نے محمد شاہ بہمنی کو تلقین کی کہ وہ مئے نوشی ترک کردے تو اس نے نہ صرف خود شراب پینا چھوڑ دیا بلکہ حدود سلطنت میں مئے نوشی ممنوع قرار دے دی ۔ فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو بھی دکن تشریف لائے ۔ ان بزرگان دیں کی وجہ سے بھی دکنی اردو کی ترویج ہوئی ۔ وہ فارسی کے ساتھ اردو میں بھی رشد و ہدایت کا کام انجام دیا کرتے تھے ۔ اس کے ساتھ دکنی میں ہی تصنیف و تالیف بھی کیا کرتے تھے ۔ بہمنی عہد کوئی دو سال سال تک چلتا رہا۔ اس پورے دور میں دکنی اردو ہی رابطے کی زبان تھی ۔ اور علمی ادبی اور مذہبی

اغراض کے لیے دکنی ہی استعمال کی جاتی تھی۔ اس کے برخلاف شمالی ہند میں ہر سطح پر فارسی ہی کا بول بالا رہا۔ حد یہ کہ اردو کے شاعر جب اردو ہی کے شاعروں کا ''تذکرہ'' لکھتے ہیں تو فارسی میں لکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے لیے اردو صرف بول چال کی زبان تھی وہ اردو کی اس سطح کو بلند نہیں کر پارہے تھے لیکن دکنی ادیبوں اور شاعروں نے ہر قسم کے علمی اور ادبی کاموں کے لیے اردو کو استعمال کیا۔ اور یہ کام سب سے پہلے بہمنی دور میں ہوا۔ بہمنی دور نے دکنی اردو کو ایسی مضبوط بنیادیں فراہم کردیں تھیں جس پر بعد کی ریاستیں خاص طور پر عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتیں دکنی ادب کی عالی شان اور پائیدار عمارتیں بنا سکے۔ 1525ء میں جب عظیم الشان بہمنی سلطنت ختم ہوئی اور پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں تو ان سب میں دکنی کو پھلنے پھولنے اور ممکنہ ترقی پانے کا موقع ملا۔

بہمنی سلطنت میں دکنی زبان کو علمی اور ادبی اغراض کے لیے جس کمال کے ساتھ استعمال کیا وہ بہمنی ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں پوری شان اور آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہے۔ دکنی کا موجودہ تحقیق کی بنا پر قدیم ترین شاعر فخر دین نظامی ہے۔ اس کی مثنوی کا صرف ایک ہی نسخہ ساری دنیا میں ملتا ہے۔ یہ نسخہ بھی بہت ہی خستہ حالت میں ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ بھی چونکہ تلف ہوگیا ہے اس لیے مثنوی کا نام کیا تھا یہ معلوم نہیں ہوتا۔ مثنوی کے دو اہم کردار کدم راؤ اور پدم راؤ ہیں۔ اسی وجہ سے مثنوی کے مرتب ڈاکٹر جمیل جالبی نے اسے مثنوی ''کدم راؤ' پدم راؤ'' کا نام دیا ہے۔ اس مثنوی کی زبان کو سمجھنا بے حد مشکل ہے۔ اس مثنوی میں کسی مشہور اور مقبول ہندوستانی قصے کو پیش کیا گیا ہے۔ اس زمانے میں جب کہ زبان ابتدائی حالت میں تھی اتنی طویل مثنوی لکھنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ادبی اغراض کے لیے بھی یہ زبان کافی مدت سے استعمال ہورہی تھی۔ دوسری بات یہ کہ اس مثنوی کا لکھنے والا قادر الکلام شاعر تھا۔ اس نے جو محاورے استعمال کیے ہیں ان سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔ بہرحال یہ مثنوی دکنی ادب کا قدیم ترین اور قابل قدر نمونہ ہے۔

میراں جی شمس العشاق بہمنی عہد کے ایک اہم شاعر اور بزرگ ہیں۔ ان کی چار کتابیں ملتی ہیں: (1) خوش نامہ (2) خوش نغز (3) شہادت التحقیق (4) مغز مرغوب

''خوش نامہ'' میں ایک 17 سالہ لڑکی جو حد درجہ نیک اور پاکیزہ صفات رکھتی تھی' وہ نوعمری میں اللہ کو پیاری ہوجاتی ہے۔ اس کی موت سے میراں جی نے اصلاحی نتائج اخذ کیے ہیں اور روحانی مسائل کی تشریح کی ہے۔

دوسری نظم ''خوش نغز'' ہے۔ یہ 72 اشعار والی مختصر نظم سوال اور جواب کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم کا مرکزی کردار ''خوش'' ہے۔ وہ میراں جی سے روحانی مسائل کے بارے میں سوالات کرتی ہے اور میراں جی اس کا جواب دیتے ہیں۔ تیسری نظم ''شہادت التحقیق'' ہے یہ ایک طویل نظم ہے جو پانچ سو ترسٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں شریعت اور طریقت کے مسائل' قرآن شریف اور احادیث کی روشنی میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس میں بھی سوال و جواب کا طریقہ اپنایا گیا ہے۔ طالب سوال کرتا ہے اور مرشد جواب دیتے ہیں۔ سوال بھی تفصیلی ہیں اور جواب بھی۔ میراں جی کی ایک اور مختصر نظم ''مغز مرغوب'' ہے۔ اس میں صوفیانہ اور فلسفیانہ مسائل کی تشریح کی گئی ہے۔ میراں جی کی زبان قدیم ہونے کی وجہ سے بہت مشکل معلوم ہوتی ہے۔

سید شاہ اشرف بیابانی' میراں جی شمس العشاق کے کم عمر ہم عصر ہیں۔ جنہوں نے ''نوسرہار'' کے نام سے ایک مثنوی یادگار چھوڑی ہے۔ ''نوسرہار' میں ''واقعہ کربلا'' یعنی شہادت حضرت امام حسینؓ کو پیش کیا گیا ہے چونکہ مثنوی کے نو باب ہیں اس لیے اسے ''نوسرہار'' کہا گیا ہے۔ اس کی زبان بامحاورہ ہے۔ اس میں لازم کی کیفیت کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ جذبات و احساسات کی عکاسی بھی اچھی کی گئی ہے۔ ان تمام خوبیوں کی وجہ سے ادبی لحاظ سے بھی یہ مثنوی اچھی ہے۔

اس دور کے دیگر شعرا میں فیروز بیدردی' لطفی اور مشتاق کے نام قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر نے ایک مثنوی ''پرت نامہ'' کے علاوہ چند غزلیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں اور آخر الذکر شاعروں کے چند غزلیں اور قصائد ملتے ہیں۔

بہمنی دور' اردو ادب کی تاریخ میں اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ اسی عہد میں دکنی زبان و ادب کو ایسی مستحکم بنیادیں فراہم ہوگئی تھیں جس کی وجہ سے بعد میں بھی ان بنیادوں پر اردو شعر و ادب کی شاندار عمارتیں کھڑی کی گئیں۔

8.10 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے تیس تیس سطروں میں جواب لکھیے ۔

1. وہ کون سے سیاسی اور تاریخی حالات ہیں جن کی وجہ سے اردو شمال سے دکن آئی ؟
2. بہمنی دور کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالیے ۔

درج ذیل سوالوں کے پندرہ پندرہ سطروں میں جواب لکھیے ۔

1. نظامی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں ۔ بیان کیجیے ۔
2. میراں جی شمس العشاق کی تصانیف کا جائزہ لیجیے۔
3. ''نوسرہار'' کا تنقیدی جائزہ لیجیے ۔
4. ''اردو'' کے علاوہ اردو زبان کے اور کون سے نام ملتے ہیں ۔
5. بہمنی بادشاہوں کے عہد میں علم و ادب کی جو سرپرستی ہوئی اس پر روشنی ڈالیے ۔

8.11 فرہنگ

ریختہ = ریختن کے معنی ٹپکانا' ملنا' اردو کو ریختہ اس لیے کہا گیا کہ دوسری زبانوں کے الفاظ اس میں ملے ہوتے ہیں۔

رزم = جنگ و جدل رزمیہ' ایسی شاعری جس میں جنگ و جدل کے حالات و واقعات ہوں

طریقت = باطنی طور پر نیکی کے اصولوں کو اپنانا۔ بے ریائی کے ساتھ نیک عمل اور اصولوں پر کاربند رہنا۔

مبتدی = شروع کرنے والا' ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والا

ملفوظات = کہے ہوئے الفاظ' بولی ہوئی بات' ارشادات

اردوئے مصفیٰ = شاہی لشکر' اعلیٰ اردو زباں

رشد = راہ راستی کی تعلیم' ہدایت

شریعت = اسلامی اصول وقوانین

اردو = لشکر' چھاؤنی' بازار

قماربازی = جوا کھیلنا

پلیتی = گندگی

8.12 سفارش کردہ کتابیں

1. اردو کی ادبی تاریخ — پروفیسر عبدالقادر سہروردی — 1958ء حیدرآباد
2. داستانِ ادبِ اردو — ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور — 1982ء حیدرآباد
3. مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو — ڈاکٹر مسعود احسن خاں — 1978ء حیدرآباد
4. تاریخِ ادب اردو (جلد اول) — ڈاکٹر جمیل جالبی — 1993ء دہلی
5. دکنی غزل کی نشوونما — ڈاکٹر محمد علی اثر — 1986ء حیدرآباد

اکائی: 9 قطب شاہی دور میں اُردو ادب

ساخت

9.1 تمہید

9.2 سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر

9.3 قطب شاہی دور کے اولین شعرا

9.4 محمد قلی قطب شاہ

9.5 اسد اللہ وجہی

9.6 ملک الشعرا غواصی

9.7 ابن نشاطی

9.8 قطب شاہی دور کے دیگر شعرا اور نثر نگار

9.9 خلاصہ

9.10 نمونۂ امتحانی سوالات

9.11 فرہنگ

9.12 سفارش کردہ کتابیں

9.1 تمہید

اس اکائی میں گولکنڈے کے قطب شاہی سلاطین کے عہدِ حکومت میں نشو ونما پانے والے اردو ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چناں چہ اس سلسلے میں پہلے قطب شاہی دور کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور پھر بعد میں اس دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کا تعارف کراتے ہوئے ان کی ادبی خدمات کا مفصّل جائزہ لیا گیا ہے۔

تاریخِ ادبِ اردو میں قطب شاہی دور کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس سلطنت کے تمام حکمران علم دوست، شعر و ادب کے دل دادہ اور شاعروں اور فن کاروں کے قدر دان تھے۔ اور بیش تر سلاطین جیسے جمشید قلی، محمد قلی، محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ خود بھی شعر کہتے تھے۔

قطب شاہی دور کے اولین شاعروں میں فیروز، سید محمود اور ملا خیالی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ تینوں شعرا گولکنڈے کے چوتھے حکمران ابراہیم قطب شاہ کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کا دور حکومت دکنی اردو ادب کے عہد زرّین کی حیثیت رکھتا ہے۔ خود بادشاہ وقت ایک پر گو اور قادر الکلام شاعر تھا اس کا ضخیم کلیات پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس دور کے دوسرے اہم شعرا میں ملک الشعرا وجہی احمد گجراتی اور غواصی کے نام قابل ذکر ہیں:

محمد قلی قطب شاہ کے بعد عہد محمد قطب شاہ، عبداللہ شاہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ میں بھی متعدد با کمال شعرا اور نثر نگار پیدا ہوئے جن میں ابن نشاطی، جنیدی، طبعی، فائز، میراں جی خدانما، میراں یعقوب، عابد شاہ وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

9.2 سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر

قطب شاہی حکمرانوں کے عہد میں گولکنڈے میں جس ثقافت اور تمدن کو فروغ ہوا وہ حقیقتاً صرف ایک تسلسل تھا ان سماجی اقدار اور ثقافتی روایات کا جن کی آب یاری سرزمین دکن میں پہلی بار بہمنی حکمرانوں نے کی تھی۔ سیاسی سطح پر بہمنی سلاطین کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے دکن کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو

جو ہر وقت برسر پیکار رہتی تھیں' ایک انتظامی وحدت میں منسلک کیا۔ جس کی وجہ سے جنوبی ہند میں امن وامان اور خوش حالی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

گولکنڈے کے پہلے فرماں روا سلطان قلی قطب الملک کا عہد (1518ء۔1543ء) اس نوعمر سلطنت کے استحکام کا زمانہ ہے۔ سلطان قلی اس علاقے کے لیے کوئی نیا حکمران نہیں تھا۔ گولکنڈے کی آزادی سے قبل اس نے تلنگانہ کے علاقے میں 24 سال تک گورنر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ بہمنی دربار میں اس کا شمار ایسے سپہ سالاروں میں ہوتا تھا جو بیک وقت صاحبِ علم وفضل بھی تھے اور میدان کارزار کے سورما بھی یہی سبب تھا کہ محمود شاہ بہمنی نے اسے صاحبِ سیف وقلم کے خطاب سے نوازا تھا۔

سلطان قلی کے بعد اس کا تیسرا فرزند جمشید قلی (1543ء۔1550ء) گولکنڈے کے تخت پر متمکن ہوا۔ جمشید نے سیاسی اعتبار سے مملکت کو مستحکم بنانے میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ تاہم اپنے سات سالہ عہد حکومت میں وہ گولکنڈے کے عوام میں کبھی مقبولیت حاصل نہ کرسکا۔ کیوں کہ عام روایات کے مطابق اپنے بوڑھے باپ کو قتل کروانے میں جمشید کا ہاتھ تھا۔ لیکن شعروادب سے جمشید کی دل چسپی ثابت ہے۔ وہ فارسی میں فی البدیہہ شعر بھی کہتا تھا۔

جمشید کے انتقال کے بعد اس کے چھوٹے بیٹے سبحان قلی کو سات سال کی عمر میں تخت نشین کیا گیا۔ سبحان قلی کی کم سنی کی وجہ سے ارباب سیاست کا ایک گروہ اس حکومت کے خلاف ہوگیا اور سلطان قلی کے سب سے چھوٹے بیٹے ابراہیم قلی نے 1550ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ ابراہیم قلی کی تخت نشینی کے بعد گولکنڈے کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس ثقافت اور تمدن کو مورخین آج قطب شاہی تہذیب وثقافت سے موسوم کرتے ہیں وہ اپنے نمایاں خدوخال میں ابراہیم قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ ابراہیم قطب شاہ نے ایک طرف تو سیاسی اعتبار سے اپنی سلطنت کے استحکام اور توسیع کے لیے کامیاب جدوجہد کی تو دوسری طرف اپنی مملکت میں بسنے والے مختلف طبقات کے مابین اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے کی ارادی کوشش کا آغاز کیا۔ وہ علم وادب کا اس قدر دل دادہ تھا کہ سفر وحضر میں علما وفضلا کے علاوہ کتابوں سے بھرے ہوئے صندوق بھی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ابراہیم قطب شاہ تلگو زبان کا سب سے پہلا سرپرست اور قدردان تھا۔ اس زمانے کے متعدد تلگو شاعروں نے اپنے کلام میں ابراہیم کی سرپرستی کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ دکنی اردو کے اولین شعرا' فیروز' محمود اور خیالی' ابراہیم قطب شاہ کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے بعد اس کا چوتھا فرزند محمد قلی قطب شاہ (1580ء 1611ء) گولکنڈے کا پانچواں حکمران بنا۔ محمد قلی کو خوش قسمتی سے ایک مستحکم اور طاقتور حکومت اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔ اس کا دور حکومت بڑی حد تک امن وامان میں گزرا۔ اردو شعروادب کا فروغ اور شہر حیدرآباد کا قیام محمد قلی کے عہد کے اہم کارنامے ہیں۔ وہ نہ صرف علوم وفنون کا قدردان اور سرپرست تھا بلکہ خود بھی شعر گوئی میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ اسے اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ سماجی اور تمدنی نقطہ نظر سے محمد قلی کا عہد حکومت دکن کی تاریخ میں ایک یادگار دور سمجھا جاتا ہے۔ محمد قلی نے اس بات کی خاص طور پر کوشش کی کہ اس مملکت میں بسنے والے مختلف طبقوں کے درمیان یگانگت' میل جول اور بھائی چارگی کے جذبات نشوونما پائیں۔ اس نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ مملکت میں بسنے والے سارے طبقات کو مذہبی آزادی حاصل رہے۔

محمد قلی کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد قطب شاہ 1611ء میں گولکنڈے کے تخت پر متمکن ہوا۔ سلطان محمد بھی اپنے آباءواجداد کی طرح ایک علم دوست بادشاہ تھا۔ وہ اپنی علم دوستی پاکیزہ اخلاق' اعلا کردار اور مذہب پرستی کی بدولت کافی شہرت رکھتا تھا۔ اسے کتابیں جمع کرنے اور ان پر اپنی رائے تحریر کرنے یا دستخط ثبت کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے اپنے چچا محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کو مرتب کرکے اس پر ایک منظوم مقدمہ بھی تحریر کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد کو اردو سے زیادہ فارسی اور عربی زبان سے دلچسپی تھی۔ شاید اسی لیے اس دور میں عربی وفارسی کے متعدد علما وفضلا کی سرپرستی کی گئی۔ اس کے برعکس دکنی اردو کے نامور شعرا وجہی اور غواصی گم نامی کی زندگی بسر کررہے تھے۔

سلطان محمد قطب شاہ کے انتقال کے بعد اس کا فرزند عبداللہ قطب شاہ 1626ء میں حکمران ہوا۔ اس بادشاہ کا عہد حکومت (1626ء۔1672ء) سب سے طویل تھا۔ اس نے 48 سال تک حکومت کی۔ سلطان عبداللہ اپنے نانا محمد قلی کی طرح علم دوست' عیش پسند اور رقص وموسیقی کا رسیا تھا۔ وہ خود بھی صاحب دیوان شاعر تھا اور اس کے دور میں وجہی' غواصی ابن نشاطی جیسے بلند پایہ شعرا موجود تھے۔ اسی دور میں غواصی کو ملک الشعرا کے مرتبے تک پہنچنے کا موقع ملا۔

سلطان عبداللہ کے انتقال کے بعد 1672ء میں مملکت گولکنڈہ کا آخری حکمران ابوالحسن تانا شاہ تخت نشین ہوا' وہ عبداللہ قطب شاہ کا داماد تھا۔ اس کے عہد حکومت میں مرہٹوں اور مغلوں کی یورش کی وجہ سے گولکنڈے میں بے اطمینانی اور انتشار پیدا ہوگیا تھا۔ دکن کی سیاسی تاریخ کے ایسے نازک ترین دور

میں شاہ ابوالحسن نے اپنی حکمتِ عملی اور تدبّر کی وجہ سے ملک کے داخلی اور خارجی حالات پر قابو پانے میں کامیابی حاصل کی۔ دیگر قطب شاہی سلاطین کی طرح سلطان ابوالحسن بھی ایک اچھا شاعر اور علم دوست بادشاہ تھا۔ اس کا دیوان تو ابھی تک دریافت نہیں ہوا لیکن تذکروں میں اس کی دو ایک غزلوں کا پتہ چلتا ہے اس دور کے اہم شاعروں میں فائزؔ اور طبعیؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. قطب شاہی سلطنت کا بانی کون تھا؟
2. گولکنڈے پر کتنے بادشاہوں نے حکومت کی؟
3. مملکتِ گولکنڈہ کے تاریخی پس منظر پر ایک نوٹ لکھیے۔

9.3 قطب شاہی دور کے اولین شعرا

قطب شاہی دور کے اولین شاعروں میں فیروزؔ، سید محمودؔ اور ملا خیالیؔ کے نام ملتے ہیں۔ یہ تینوں شاعر چوتھے قطب شاہی حکمران ابراہیم قطب شاہ کے دور (1550ء 1580ء) سے تعلق رکھتے ہیں۔

فیروزؔ: فیروز کا نام قطب الدین قادری تھا۔ وہ دراصل بیدر کا باشندہ تھا جو ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں گولکنڈہ چلا آیا۔ اس کی تصانیف میں ایک مختصر مثنوی ''پرت نامہ'' کے علاوہ چند غزلوں کا پتہ چلتا ہے۔ یہ مثنوی فیروزؔ نے اپنے پیر و مرشد شیخ محمد ابراہیم مخدوم جی (متوفی 1173ھ/1565ء) کی مدح میں لکھی ہے۔ گولکنڈہ پہنچنے کے بعد فیروز کو استادِ سخن کی حیثیت سے غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ گولکنڈے کے بلند پایہ شعرا محمد قلی، وجہیؔ اور ابن نشاطیؔ نے اپنے کلام میں جس انداز سے فیروز کا تذکرہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان شاعروں نے فیروز کے آگے زانوے ادب تہہ کیا تھا۔ فیروز کی گولکنڈے میں آمد وہی حیثیت رکھتی ہے جیسے کہ بعد کے زمانے میں ولیؔ کا سفر دہلی۔

سید محمودؔ: فیروز کی طرح سید محمود بھی قطب شاہی دور کے اولین شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ زمانۂ مابعد کے بلند پایہ شاعروں میں وجہیؔ، محمد قلی اور ابن نشاطیؔ نے محمود کو قطب شاہی دور کے ایک عظیم المرتبت شاعر کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔ محمودؔ کے کلام کا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک پرگو اور قادر الکلام شاعر تھا۔ اس نے دکنی اردو کے علاوہ پنجابی اور افغانی میں بھی شعر موزوں کیے ہیں۔ لیکن صرف اردو شاعری کی وجہ سے اسے مقبولیت حاصل ہوئی۔ محمودؔ بنیادی طور پر ایک غزل گو شاعر ہے۔ سادگی، روانی، برجستگی اور نغمگی و موسیقیت اس کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''تاریخ ادب اردو'' (جلد اول) میں محمود کی چند غزلیں اور بعض غزلوں کے منتخب اشعار شائع کیے ہیں:

ملا خیالیؔ: خیالیؔ ابراہیم قطب شاہ کے عہد کا ایک ممتاز شاعر ہے۔ غالباً اس کا تعلق دربار شاہی سے تھا اسی لیے اس نے 1665ء میں اپنے نام سے ایک دو منزلہ مسجد تعمیر کروائی تھی۔ قلعہ گولکنڈہ کے شمال مشرق کی جانب فصیل سے متصل نئے قلعہ میں ہتھیان کے درخت کے قریب ملا خیالی کی یہ خوبصورت مسجد اور اس کا کتبہ آج تک موجود ہے۔ ابن نشاطیؔ اور سید اعظمؔ نے اپنے کلام میں جس انداز سے خیالیؔ کا تذکرہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ اور پرگو شاعر تھا لیکن افسوس کہ ملا خیالی کی صرف ایک ہی غزل دستیاب ہوئی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. فیروزؔ، بیدر سے گولکنڈہ کس بادشاہ کے دور میں آیا؟
2. محمودؔ نے کن کن اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی؟
3. ملاّ خیالیؔ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

9.4 محمد قلی قطب شاہ

(ولادت 973ھ تخت نشینی 988ھ وفات 1020ھ)۔محمد قلی قطب شاہ، مملکتِ گولکنڈہ کا پانچواں فرماں روا اور دکنی اردو کا ایک قادرالکلام شاعر تھا۔محمد قلی سے قبل اگرچہ فیروز۔سید محمود اور ملا خیالی جیسے اساتذہ سخن گزرے ہیں لیکن کسی کا بھی کلام مرتبہ دیوان کی شکل میں دستیاب نہ ہوسکا۔موجودہ معلومات کی روشنی میں محمد قلی ہی اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔جس کا دیوان عہدِ قدیم ہی میں مرتب و مدون ہو چکا تھا۔محمد قلی کے کلیات کو اس کے بھتیجے اور داماد سلطان محمد قطب شاہ نے مرتب کر کے اس پر ایک منظوم مقدمہ بھی تحریر کیا تھا۔سلطان محمد کی اطلاع کے مطابق محمد قلی کا ضخیم کلیات پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔جس میں غزلیں، قصیدے، مثنویاں، مرثیے، نظمیں، رباعیاں سبھی اصناف سخن موجود ہیں۔لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کا شاعر ہے۔یہاں تک کہ اس کی وہ تخلیقات بھی جنھیں تسلسل بیان کی وجہ سے عنوانات قائم کر کے نظم قرار دیا گیا ہے دراصل محمد قلی کی غزلیں ہی ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کو خوش قسمتی سے ایک مستحکم اور طاقتور حکومت اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی اور اس کا دور حکومت مجموعی طور پر امن و امان میں گزرا۔اس کے دور میں ایران کے مشہور عالم اور مدبر میر مومن حیدرآباد ہوئے تھے جنھیں بادشاہ نے اپنا مشیر مقرر کیا تھا۔سلطنت کے بیش تر کاروبار کی نگرانی میر مومن ہی کے سپرد تھی۔یہی وجہ ہے محمد قلی کو سیاسی اور انتظامی الجھنوں سے آزاد رہ کر بڑی حد تک عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کا موقع مل گیا۔

شہر حیدرآباد کا قیام اور اس شہر میں بسنے والے مختلف طبقوں کے مابین خلوص اور بھائی چارگی کے جذبات کی ترویج، محمد قلی کے دور کے یادگار کارنامے ہیں۔محمد قلی کی تعلیم و تربیت اس کے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں ادھوری اور ناقص ہوئی تھی لیکن فن شاعری میں وہ مہارت تامہ رکھتا تھا۔فارسی کے بلند پایہ شاعروں خصوصاً حافظ شیرازی، خاقانی، ظہیر فاریابی اور انوری کا اس نے بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا۔حافظ شیرازی کی متعدد غزلوں کا اس نے دکنی اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔

محمد قلی کی قادرالکلامی کا یہ حال تھا کہ وہ روز آنہ اسی طرح شعر کہنے پر قادر تھا جس طرح روز دریا میں موجیں اٹھتی ہیں لیکن اس کی روانی میں کوئی فرق نہیں آتا۔محمد قلی کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت انداز بیان کی سادگی ہے۔وہ اپنے مشاہدات زندگی اور جذبات و محسوسات کو سیدھے سادے اسلوب اور عام فہم زبان میں پیش کرنے کا عادی ہے۔محمد قلی ایک کثیر المحبوب شاعر بھی ہے اور اس کے کلام میں موضوعات اور مضامین کا تنوع بھی۔اس نے اپنی متعدد محبوباؤں جیسے گوری، سانولی، چھبیلی، نٹھنی، پیاری وغیرہ کے حسن و جمال کی تعریف بھی کی ہے اور مختلف النوع موضوعات جیسے حمد و مناجات، نعت و منقبت، عید و تہوار، بسنت، نوروز سالگرہ (برس گانٹھ) برسات (مرگ) تھنڈ کالا، خداداد محل، باغ محمد شاہی، شاہی ہاتھی، چوگان، پھوکڑی پھو، کھمڈی وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔محمد قلی نے ایک ایسے دور میں صنف غزل پر باقاعدہ اور خصوصی طور پر توجہ کی جب کہ دبستان دکن میں مثنوی کا سکہ چل رہا تھا۔

محمد قلی کی شاعری میں اپنے عہد اور ماحول کی بھرپور ترجمانی ملتی ہیں۔اس کے کلام کے مطالعے سے اس دور کی سماجی زندگی کے بارے میں بہت کچھ مواد حاصل کیا جاسکتا ہے۔شادی بیاہ کے رسوم، رہن سہن کے طور طریقے، مختلف موسموں، عیدوں، تہواروں، کھیلوں وغیرہ کی تفصیلات کے دلچسپ مرقعے اس کی شاعری میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔محمد قلی کی شاعری نہ صرف اس کی منظوم سوانح حیات ہے بلکہ اپنے دور کی ایک مستند تاریخ بھی ہے۔جس میں چار سو سال پہلے کی زندگی کی تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔

محمد قلی نے اپنے کلام میں عشقیہ موضوعات کے ساتھ ساتھ مذہبی رنگ کو بھی اپنایا ہے۔جس میں اس نے اپنے اعتقادات سے والہانہ وابستگی اور جوش عقیدت کا مظاہرہ کیا ہے۔اس میں شک نہیں کہ محمد قلی مذہب پر بھرپور عقیدہ رکھتا ہے اور مذہبی رسوم پر بھی چلتا ہے۔لیکن مذہب کی حقیقی روح سے اس کی شخصیت اور شاعری دونوں عاری ہیں۔اس کو مذہب کے صرف تہذیبی پہلوؤں سے دلچسپی ہے۔ستم ظریفی ہے کہ وہ اپنی عیش کوشی کو بھی ''نبی کا صدقہ'' اور ''بارہ اماموں کا کرم'' قرار دیتا ہے۔

نبی صدقے بارہ اماماں کرم تھے　　کرو عیش جم بارہ پیاریاں سوں پیارے

بعض نقادوں نے محمد قلی کی شاعری کو الہامی قرار دیا ہے لیکن محمد قلی کے ہاں نہ تو مضامین غیب سے آتے ہیں اور نہ وہ عرش سے ادھر کی باتیں کرتا ہے۔وہ تو اسی عالم رنگ و بو کا پرستار ہے۔ایک وسیع و عریض اور عظیم الشان مملکت کے ایک مطلق العنان، بادشاہ ہونے کے ناتے اس نے کبھی کسی محبوبہ کا

انتظار نہیں کیا بلکہ متعدد محبوبائیں ہمیشہ اس کے درشن کی منتظر رہتی تھیں۔ اپنی پیاریوں کے جھرمٹ میں رہ کر اس نے انھیں کے عشوہ و جمال، خدوخال اور رفتار و گفتار کی داد دی ہے۔ وہ ایک خوش گو اور اردو کا اولین صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ اردو زبان کی تاریخ میں یہی واقعہ اس کے نام اور کلام کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر کیوں کہتے ہیں؟
2. محمد قلی کے کلام کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟
3. محمد قلی کے واقعاتِ حیات پر ایک نوٹ لکھیے۔

9.5 اسد اللہ وجہی

ملک الشعرا اسد اللہ وجہی، قطب شاہی دور کا ایک عظیم المرتبت شاعر اور باکمال نثر نگار ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کا ایک بلند پایہ عالم، فلسفی اور حکیم بھی تھا۔ دکنی اردو کے دوسرے شعرا کی طرح وجہی کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا پتہ نہیں چلتا۔ غالباً وہ گولکنڈے کے چوتھے حکمراں ابراہیم قطب شاہ کے عہد (1550ء۔1580ء) میں پیدا ہوا اور پھر اس نے مزید تین قطب شاہی سلاطین محمد قلی قطب شاہ (1580ء۔1611ء) محمد قطب شاہ (1611ء۔1626) اور عبداللہ قطب شاہ (1626ء۔1674ء) کا زمانہ بھی دیکھا۔

وجہی اپنے دور کا ایک بلند پایہ شاعر و ادیب تھا۔ اس لیے فطری طور پر اس کے ہم عصر اور زمانۂ مابعد کے شاعروں نے اس کے کمال فن کا اعتراف کیا ہے۔ طبعی اپنی مثنوی ''بہرام و گل اندام'' کی تصنیف کے دوران وجہی کو بالکل اسی طرح خواب میں دیکھتا ہے جس طرح خود وجہی نے فیروز کو خواب میں دیکھا تھا اور اس سے اپنی مثنوی کی تعریف سنی تھی۔ طبعی کے اشعار ہیں:

لگیا میں جو یو مثنوی بولنے — یو موتیاں نچھل ڈھال تیوں رولنے
یو وجہی مرے خواب میں آے کر — مکھ اپنا سورج ناد دکھلائے کر
سراسر سُنیا جو مری مثنوی — کہیا بات طبعی ہے تیری نوی

شاہ افضل قادری (مصنف محی الدین نامہ) نے اپنے ایک قصیدے میں عبداللہ قطب شاہ کی مدح کے دوران وجہی کی فن کارانہ صلاحیتوں کی داد دی ہے اور اس کو ''گیانی'' (عالم) ''گن بھر'' (صاحب اوصاف) ''عاقل'' اور ''کامل'' جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

تجھ ایسے شاہ کوں ہونا سو وجہی سار کا شاعر — نپٹ عاقل نپٹ کامل، نپٹ گیانی، نپٹ گن بھر

وجہی کے ہم عصر اور زمانۂ مابعد کے شعرا کے کلام کے حوالوں سے اس کے سنہ وفات کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ابن نشاطی نے اپنی مثنوی ''پھول بن'' (1066ھ) میں اس دور کے مرحوم شعرا کو یاد کیا ہے۔ جن میں وجہی کا نام شامل نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ 1066ھ تک وجہی بقید حیات تھا۔ البتہ طبعی اپنی مثنوی ''بہرام و گل اندام'' (سنہ تصنیف 1088ھ) میں وجہی کو مرحوم شاعر کی حیثیت سے خواب میں دیکھتا ہے۔ ان شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ وجہی نے 1066ھ/1655 اور 1088ھ / 1677ء کے درمیانی زمانے میں وفات پائی۔ ''سب رس'' کے ایک قلمی نسخے کے ترقیمے سے پتہ چلتا ہے کہ وجہی سلسلۂ چشتیہ کے ایک صوفی بزرگ حضرت شاہ علی متقی کا مرید تھا۔ وجہی نے مثنوی ''قطب مشتری''، ''تاج الحقائق''، ''سب رس'' اور فارسی دیوان کے علاوہ چند دکنی غزلیں اور مرثیے بھی اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ وجہی کی دکنی غزلوں اور فارسی کلام کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان محمد قطب شاہ کے عہد (1611۔1626ء) میں کسی وقت اس پر شاہی عتاب نازل ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کو تنگ دستی، مفلسی اور فاقہ کشی کے دن بھی دیکھنے پڑے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے وجہی کو اپنے دربار کا ملک الشعرا مقرر کیا تھا۔ اس دور میں وجہی کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ بادشاہ وقت کا

دست راست بن گیا تھا۔اسی دور میں اس نے اپنی شاہ کار مثنوی ''قطب مشتری'' لکھی۔یہ وجہی کی طبع زاد مثنوی ہے۔جو 1018ھ میں صرف 12 دن کے عرصے میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔اس دور کی دیگر مثنویوں کی طرح اس مثنوی کا آغاز بھی حمد و مناجات اور نعت و منقبت سے ہوتا ہے۔اس کے بعد مدح بادشاہ ہے اور پھر وجہی نے ''درشرح شعر خود گوید'' کی سرخی کے تحت شاعری سے متعلق اپنے نظریات اختصار کے ساتھ پیش کیے ہیں۔

قطب مشتری ایک معرکتہ آلا را مثنوی ہے جس میں وجہی نے بادشاہ وقت سلطان محمد قلی قطب شاہ کو قصے کے ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔یہ قصہ گویا محمد قلی کی شہزادگی کے زمانے سے متعلق ہے۔نوجوانی کے زمانے میں شہزادہ ''قطب'' کو بنگالہ کی شہزادی ''مشتری'' سے عشق ہو جاتا ہے جس کی شکل اس نے خواب میں دیکھی تھی۔پھر وہ شہزادی کے تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے اور عہد متوسط کے دوسرے قصے کہانیوں کی طرح مختلف خطرناک مہمات سر کر کے بالآخر بنگالہ پہنچتا ہے اور شہزادی سے بیاہ کر کے گولکنڈہ واپس آتا ہے۔یہ صرف ایک فرضی داستان ہے جس میں قدیم زمانے کے قصوں کی طرح دیوؤں اور پریوں کا ذکر اور محیر العقول واقعات بھی ملتے ہیں۔تاہم اس مثنوی کے مطالعے سے محمد قلی کے مزاج و کردار پر روشنی ضرور پڑتی ہے۔اور اس کے عالم شباب کی مصروفیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اس مثنوی کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کے کم و بیش تمام کرداروں کے نام محمد قلی قطب شاہ کے خاندانی نام ''قطب'' کی مناسبت سے ستاروں کے نام پر رکھے گئے ہیں جیسے مشتری، عطارد، زمرہ، مہتاب، مریخ وغیرہ۔وجہی کو زبان و بیان پر غیر معمولی مہارت حاصل ہے۔اس مثنوی میں اس نے انسانی جذبات کی تصویر کشی، کردار نگاری اور منظر نگاری کے بڑے دلکش مرقع پیش کیے ہیں۔

وجہی اپنے دور کا ایک باکمال شاعر ہی نہیں بلکہ بلند پایہ نثر نگار بھی تھا اس نے ''تاج الحقائق'' اور ''سب رس'' جیسی اہم نثری تصانیف بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔''تاج الحقائق'' تصوف کے موضوع پر ایک نثری سالہ ہے جس کا تذکرہ سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے ''سب رس'' کے مقدمے میں کیا تھا۔اس کتاب میں سلوک اور معرفت کے مسائل کو عام فہم لیکن دل نشین اور موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ڈاکٹر جاوید وشسٹ ''تاج الحقائق'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''تصوف کا یہ نثری رسالہ وجہی کا نقش اول ہے اور سب رس نقش ثانی۔سب رس کے نقطہ عروج تک پہنچنے کے لیے وجہی کو تاج الحقائق کی منزل سے گزرنا لازمی تھا۔''

وجہی کی دوسری نثری تصنیف ''سب رس'' ہے اس کتاب کو وجہی نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر 1045ھ مطابق 1635ء میں لکھا تھا۔''سب رس'' کا قصہ محمد یحیٰ ابن سبک فتاحی نیشاپوری کی فارسی نثری تصنیف ''قصہ حسن و دل'' سے ماخوذ ہے۔تاہم وجہی نے اپنی بے پناہ علمی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروے کار لاتے ہوئے اس کتاب کو ایک تخلیقی تصنیف کا درجہ دے دیا ہے۔وجہی نے پیچیدہ اور خشک فلسفیانہ مسائل کو ادبی حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔''سب رس'' کا شمار اردو نثر کی دو یا تین منتخب کتابوں میں شمار ہوتا ہے۔اس کا اسلوب مقفیٰ ہوتے ہوئے بھی سادہ و پرکار ہے۔بعض مقامات پر وجہی نے حقائق حیات کے متعلق فلسفیانہ اور حکیمانہ نکات پیش کیے ہیں۔جس کی وجہ سے یہ کتاب اردو نثر کے لازوال نمونوں میں شمار ہوتی ہے۔

سب رس قدیم طرز کا ایک ناول ہے۔جس میں انسانی جذبات و احساسات اور انسانی صلاحیتوں اور قوتوں جیسے عشق، عقل، حسن، غمزہ، عشوہ، ناز، ناموس، ہمت، دل، نظر، خیال، وہم، صبر، طمع، وفا وغیرہ کو کرداروں کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔سب رس کا قصہ ایک تمثیلی داستان کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے سارے کردار تمثیلی ہیں۔اس کا قصہ دو سطحوں پر آگے بڑھتا ہے۔ایک سطح ظاہری کہانی کا انداز لیے ہوئے ہے اور دوسری سطح علم باطنی سے متعلق ہے۔گویا سب رس کے قصے میں عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں کا بیان ایک ساتھ پہلو بہ پہلو ہوا ہے۔

''سب رس'' میں ایک طرف عربی آیات و احادیث، فارسی اشعار اور مقولے ملتے ہیں تو دوسری طرف روزمرہ، محاورے اور ضرب الامثال بھی کثرت سے ملتے ہیں۔''سب رس'' کی زبان مقفیٰ ہے۔یعنی چھوٹے چھوٹے جملوں میں قوافی کا اہتمام کیا گیا ہے۔تاہم ان قافیوں کو وجہی نے اس قدر مہارت اور ہنرمندی کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ کہیں تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔وجہی نے نظم اور نثر کے امتزاج سے ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی ہے۔چنانچہ وہ کہتا ہے:

> ''آج لگن اس جہان میں ہندوستان میں، ہندی زبان سوں، اس لطافت، اس چھنداں سوں، نظم ہور نثر ملا کر، گلا کرنیں بولیا۔اس بات کوں اس نبات کوں یوں کوئی آب حیات میں **نئیں** گھولیا۔یوں غیب کا علم **نئیں** بولیا۔''

اپنی معلومات کی جانچ:

1. وجہی نے کون کون سے بادشاہوں کا زمانہ دیکھا؟
2. ''قطب مشتری'' پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
3. ''سب رس'' کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

9.6 ملک الشعرّا غواصی

غواصی، قطب شاہی دور کا ایک عظیم المرتبت اور بلند قامت شاعر ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش، تعلیم و تربیت، سنہ وفات اور خاص طور پر آخری زمانے کے حالات پردۂ تاریکی میں ہیں۔ اس کے کلام کی داخلی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ابراہیم قطب شاہ کے دور میں پیدا ہوا۔ محمد قلی قطب شاہ کے دور میں اس نے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ اور پھر اس نے محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ بھی دیکھا۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کا دور حکومت غواصی کی شاعری کا عہد زرین ہے۔ اس بادشاہ نے نہ صرف غواصی کی سرپرستی کی اور اس کو اپنے دربار کا ملک الشعرا بنایا بلکہ قطب شاہی سفیر کی حیثیت سے اس کو بیجاپور روانہ کیا اور ''فصاحت آثار'' کے خطاب سے بھی نوازا۔ غواصی میراں سید شاہ حیدر ولی اللہ (متوفی 1033 ھ) کا مرید تھا۔ جن کی مدح میں اس نے متعدد اشعار لکھے ہیں۔

غواصی کی چار مثنویوں ''میناست ونتی''، سیف الملوک و بدیع الجمال''، ''طوطی نامہ'' اور ''مثنوی طریقت'' کے علاوہ غزلوں، نظموں، قصیدوں، مرثیوں اور رباعیوں پر مشتمل ایک دیوان بھی منظر عام پر آیا ہے۔ جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے غواصی دبستان دکن کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ اس کے کلام میں بھرتی کے شعر یا ایسے اشعار بہت کم ملتے ہیں جن میں گہرا تاثر نہیں پایا جاتا۔ اظہار بیان کی سادگی غواصی کی غزل کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ تاثر کی فراوانی، نغمگی و موسیقیت، سوز و گداز اور حقیقت نگاری کے نقطہ نظر سے اس کی غزلیں اردو غزل کی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔

مثنوی نگاری کے میدان میں بھی غواصی کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ ''میناست ونتی'' غواصی کی پہلی مثنوی ہے۔ اس مثنوی کی تاریخ تصنیف کا علم نہیں ہوتا اس میں شاعر نے اپنے آپ کو اہل علم کے سامنے ایک نووارد کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ''میناسنت ونتی'' کا قصہ ہندوستانی اصل کی ایک عشقیہ کہانی سے ماخوذ ہے۔ لیکن غواصی کا بیان ہے کہ اس نے ایک فارسی رسالے کو دکنی اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس وقت تک اس قبیل کے صرف ایک ہی قصے ''عصمت نامہ'' کا پتہ چلتا ہے جو حمیدی کی تصنیف ہے۔ اس لیے گمان غالب ہے کہ ''عصمت نامۃ'' ہی میناست ونتی کے قصے ماخذ ہے۔ اس میں ''بالا کنور'' نامی ایک راجہ کی حسین بیٹی ''چندا'' کے ایک شادی شدہ چرواہے ''لورک'' پر فریفتہ ہونے اور اس کے ساتھ راہ فرار اختیار کرنے کی داستان بیان کی گئی ہے۔ لورک کی بیوی کا نام ''مینا'' ہے جو ایک ہندوستانی باعصمت عورت ہے۔ وہ شوہر پرست بھی ہے اور وفا شعار بھی ''بالا کنور'' اپنی بیٹی کا بدلہ لینے کی غرض سے ''مینا'' کو اپنے محل کی زینت بنانا چاہتا ہے اس کام کے لیے ایک چالاک دلّالہ مقرر کی جاتی ہے۔ جو مینا کو برائی کا راستہ اپنانے کے لیے طرح طرح سے ورغلاتی ہے۔ لیکن مینا دلالہ کے جال میں گرفتار نہیں ہوتی۔ غواصی نے اس مثنوی میں مینا اور دلّالہ کی گفتگو کے درمیان اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں اور قادر البیانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس عہد کی نسوانی زبان، روزمرہ، محاورے اور ضرب الامثال کو محفوظ کر دیا ہے۔

مثنوی ''سیف الملوک اور بدیع الجمال'' کا قصہ الف لیلیٰ کے ایک فارسی نثری ترجمے پر مبنی ہے۔ جس میں مصر کے شہزادے ''سیف الملوک'' اور جنوں کی شہزادی ''بدیع الجمال'' کی عشقیہ داستان نظم کی گئی ہے۔ یہ مثنوی صرف غواصی کی ہی ایک بے نظیر مثنوی نہیں بلکہ دکنی اردو کی شاہ کار مثنویوں میں بھی شمار کی جاتی ہے۔ سیف الملوک و بدیع الجمال میں غواصی نے جذبات نگاری، سراپا نگاری، رزم نگاری اور منظر نگاری کے بڑے خوب صورت نمونے پیش کیے ہیں۔ یہ مثنوی 1035 ھ کی تصنیف ہے جسے غواصی نے صرف تیس دن (ایک ماہ) میں مکمل کیا تھا۔

مثنوی ''طوطی نامہ'' سنہ 1049 ھ کی تصنیف ہے جس کا قصہ سنسکرت کی مشہور تصنیف ''شکاسب تتی'' (طوطے کی کہی ہوئی ستر 70 کہانیاں) کے فارسی ترجمے پر مبنی ہے۔ ''شکاسب تتی'' کو مولانا ضیاالدین نخشبی نے فارسی میں منتقل کیا تھا اور انھوں نے ستر کہانیوں میں سے باون 52 کا انتخاب کیا۔ غواصی کے ''طوطی نامہ'' کا ماخذ نخشبی کا طوطی نامہ ہی ہے۔ غواصی نے بھی اختصار سے کام لیتے ہوئے باون کہانیوں میں سے صرف پنتالیس 45 کو اپنی مثنوی کے

لیے منتخب کیا ہے۔ ''طوطی نامہ'' کا قصہ اگرچہ غواصی کا طبع زاد نہیں ہے۔ لیکن قصے کی جزئیات' انسانی نفسیات کی مرقع کشی اور مناظر فطرت کے بیان میں غواصی نے اپنے شاعرانہ کمال کا اس درجہ مظاہرہ کیا ہے کہ قدیم اردو کا یہ عظیم فن پارہ محض سنسکرت یا فارسی کا ترجمہ ہی نہیں رہ جاتا بلکہ ایک اپج تصنیف کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ ''مثنوی طریقت'' کے نام سے غواصی کے ایک اور مثنوی کا پتہ چلتا ہے' جو غیر مطبوعہ ہے۔

غواصی دبستان دکن کا ایک باکمال غزل گو اور مثنوی نگار ہی نہیں تھا بلکہ بلند پایہ قصیدہ گو' بے نظیر رباعی نگار اور کامیاب مرثیہ گو بھی تھا۔ اس پر مستزاد اس کی نظمیں ہیں۔ نظم نگاری کے میدان میں وہ محمد قلی کے بعد دکنی اردو کا وہ دوسرا اہم شاعر ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. غواصی کے مرشد کا نام بتایئے۔
2. غواصی نے کتنے بادشاہوں کا زمانہ دیکھا؟
3. ''میناست ونتی'' کے چند کرداروں کے نام لکھیے۔
4. ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' کے قصے کا ماخذ کیا ہے؟
5. مثنوی ''طوطی نامہ'' کا سنہ تصنیف بتایئے۔

9.7 ابن نشاطی

قطب شاہی دور کے اہم اور بلند پایہ شاعروں میں ایک اور نام ابن نشاطی کا ہے' جس کی مثنوی ''پھول بن'' دکنی اردو کی چند منتخب مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔ ابن نشاطی کا پورا نام شیخ محمد مظہر الدین شیخ فخر الدین ابن نشاطی ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک انشا پرداز تھا لیکن اس کی انشا پردازی کا کوئی نمونہ منظر عام پر نہیں آیا۔ ''پھول بن'' سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور میں 1066ھ صرف تین ماہ میں لکھی گئی۔ ابن نشاطی فارسی اور دکنی کا بہت بڑا عالم فاضل اور ماہر عروض و بلاغت بھی تھا۔ اسے فن شاعری میں مہارت تامہ حاصل تھی خصوصاً صنائع بدائع کے استعمال میں وہ ید طولیٰ رکھتا تھا۔ پھولبن کی زبان سلیس و سادہ ہے۔ اس مثنوی کے مطالعے سے شاعر کی قادر الکلامی اور کمال فن کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ مثنوی اگرچہ فارسی تصنیف ''بساتین الانس'' کے قصے پر مبنی ہے لیکن ابن نشاطی نے اصل قصے میں بہت کچھ تبدیلیاں کی ہیں اور اسے متعدد ابواب میں تقسیم کر کے ہر باب کا آغاز ایک ایسے شعر سے کیا ہے جس میں اس باب کا خلاصہ آ جاتا ہے اور اگر تمام ابواب کے صرف عنوانی اشعار کو یکجا کر دیا جائے تو پوری مثنوی کا لب لباب پیش نظر ہو جاتا ہے۔ پھول بن کی کہانی قصہ در قصہ آگے بڑھتی ہے اور اس میں تین قصے اور چند ذیلی کہانیاں شامل ہیں۔ 1744 اشعار پر مشتمل اس مثنوی میں ابن نشاطی نے جذبات نگاری' کردار نگاری اور منظر نگاری کا کمال دکھایا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ابن نشاطی گولکنڈہ کے کس حکمراں کے دور سے تعلق رکھتا ہے؟
2. ''پھول بن'' کی مدت تکمیل اور تاریخ تصنیف بتایئے۔
3. پھول بن کی زبان و بیان کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

9.8 قطب شاہی دور کے دیگر شعرا اور نثر نگار

گذشتہ صفحات میں ہم نے قطب شاہی عہد کے چند اہم شعرا اور نثر نگاروں کا مطالعہ کیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس دور میں صرف اتنے ہی شعرا اور نثر نگار گزرے ہیں۔ بلکہ محمد قلی قطب شاہ' عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کے عہد حکومت میں چند اور شاعروں اور ادیبوں نے دکنی اردو میں تصنیف و تالیف کا کام انجام دیا ہے جن کا درج ذیل سطور میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

احمد گجراتی: شیخ احمد دراصل گجرات کا باشندہ تھا۔ محمد قلی قطب شاہ نے اسے گولکنڈہ آنے کی دعوت دی تھی۔ وہ وجہی اور غواصی کا ہم عصر تھا۔ اس کی دو مثنویوں ''لیلیٰ مجنوں'' اور مصیبت اہل بیت'' کا پتا چلتا ہے۔ اول الذکر مثنوی کے چند منتشر اوراق پروفیسر محمود شیرانی کو دستیاب ہوئے تھے۔ جن کا تفصیلی ذکر انھوں نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں کیا ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر جمیل جالبی کو کتب خانۂ انجمن ترقی اردو کراچی میں احمد کی ایک اور مثنوی ''یوسف زلیخا'' کا پتا چلا ہے جس کا تعارف انھوں نے ''تاریخ ادب اردو'' کی پہلی جلد میں کرایا ہے۔ اس مثنوی کو ڈاکٹر سیدہ جعفر نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں ''یوسف زلیخا'' دبستانِ گولکنڈہ کی پہلی مثنوی ہے۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ: مملکت گولکنڈہ کا چھٹا فرماں روا سلطان عبداللہ دکنی اردو کا ایک باکمال شاعر تھا۔ اس کا کلیات ہنوز دریافت نہیں ہوا۔ تاہم اس کے نامکمل دیوان میں ردیف ''ث'' تک 97 غزلیں ہیں۔ جن کے مطالعے سے اس کی قادر الکلامی کا پتا چلتا ہے۔ سلطان عبداللہ نے چند مرثیے اور گیت بھی اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر وہ ایک غزل گو شاعر ہے۔ سادگی بیان اور نغمگی و موسیقیت عبداللہ قطب شاہ کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کا دیوان دو مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔

احمد جنیدی: سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور کا ایک مہدوی شاعر ہے۔ اس نے ''ماہ پیکر'' کے عنوان سے 1064ھ میں ایک مثنوی تصنیف کی تھی۔ ''ماہ'' اس مثنوی کی ہیروئن کا نام ہے اور ''پیکر'' ہیرو کا۔ اسی مناسبت سے جنیدی نے اپنی مثنوی کا نام ''ماہ پیکر'' رکھا۔ دو ہزار سات سو پینتیس ابیات (2735) پر مشتمل اس مثنوی کو ڈاکٹر سیدہ جعفر نے مرتب کر کے 1986ء میں جامعہ عثمانیہ کے تحقیقی مجلّے ''قدیم اردو'' میں شائع کر دیا ہے

قطب رازی: نے اسی دور میں اپنے مرشد شاہ ابوالحسن کی فرمائش پر خواجہ بندہ نواز کے والد حضرت یوسف شاہ راجو کی مشہور زمانہ فارسی تصنیف ''تحفۃ النصائح'' کا دکنی اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ دکنی تحفۃ النصائح قصیدے کی ہیئت میں ایک طویل نظم ہے جو 786 اشعار پر مشتمل ہے۔

میراں جی حسن خدانما: عبداللہ قطب شاہ کے دور کے صاحبِ تصنیف صوفیا میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ حضرت خواجہ بندہ نواز کے سلسلۂ فیض سے تعلق رکھتے ہیں۔ خدانما نے اپنے مریدوں اور معتقدوں کی تعلیم و تفہیم کے لیے دکنی نظم و نثر میں چند رسالے تصنیف کیے تھے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

حصہ نثر : 1) شرح شرح تمہیدات عین القضات 2) رسالہ وجودیہ 3) شرح مرغوب القلوب

حصہ نظم 1) بشارت الانوار 2) دو مختصر مثنویاں 3) دو غزلیں

جہاں تک میراں جی خدانما کی نثر نگاری کا تعلق ہے۔ ان کے تینوں رسالوں میں تصوف کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''تمہیدات ہمدانی'' دراصل عبداللہ بن محمد عین القضات کی فارسی تصنیف ہے جس کی شرح خواجہ بندہ نواز نے فارسی میں لکھی تھی۔ اس شرح کا ترجمہ خدانما نے دکنی نثر میں ''شرح شرح تمہیدات عین القضات'' کے عنوان سے کیا تھا۔ اس کتاب میں سلوک و معرفت کے مسائل کی قرآن و حدیث کی روشنی میں تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ ''رسالہ وجودیہ'' اور ''مرغوب القلوب'' بھی دو مختصر نثری تصانیف ہیں جن کا موضوع تصوف ہے۔

میراں یعقوب: حضرت میراں جی خدانما کے مرید اور خلیفہ تھے۔ وہ بیک وقت شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ انھوں نے حضرت برہان الدین غریب کے خلیفہ حضرت رکن الدین عماد کی فارسی تصنیف ''شمائل الاتقیا'' کا اسی نام سے دکنی نثر میں ترجمہ کیا۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے۔ جو 1200 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ''شمائل الاتقیا'' میں تصوف کے مسائل نہایت سیدھی سادی زبان اور دل چسپ انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ میراں یعقوب نے تصوف کے مسائل کی وضاحت کے سلسلے میں تشبیہوں اور تمثیلوں سے بھی کام لیا ہے۔

حضرت شاہ راجو حسینی: قطب شاہی دور کے ایک صاحب کرامت بزرگ اور نامور صوفی تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ بندہ نواز سے ملتا ہے۔ شاہ راجو نے اپنے مریدوں، معتقدوں اور خصوصاً گھریلو خواتین کی تلقین و ہدایت کے سلسلے میں دکنی اردو میں ''سہاگن نامہ'' اور ''چکی نامہ'' کے علاوہ چند دیگر منظومات بھی تصنیف کی ہیں۔ سہاگن نامہ اور چکی نامہ میں شاہ راجو نے گھریلو کام کاج میں مصروف خواتین کی تعلیم و تفہیم کے لیے تصوف کے مسائل اور مذہبی احکام کو سیدھی سادی زبان اور عام فہم انداز میں پیش کیا ہے۔ ان تصانیف کا مقصد مذہب اور اخلاق کی تعلیم دینا اور برائیوں سے بچنے اور نیکی کے راستے کو اپنانے کی تلقین کرنا ہے۔

عابد شاہ :عہد قطب شاہی کے دور آخر کے ایک صاحب تصنیف صوفی تھے۔ان کا نام نواب الدین اور عابد تخلص تھا۔وہ حضرت شاہ راجو کے مرید تھے۔ عابد شاہ بیک وقت نثر نگار بھی تھے اور شاعر بھی۔انہوں نے ''مراۃ السالکین''، ''گلزار السالکین'' اور ''کنز المومنین'' کے نام سے تین کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔اول الذکر دو تصانیف دکنی نثر میں ہیں جن کا موضوع تصوف ہے۔''کنز المومنین'' منظوم رسالہ ہے جس کا موضوع فقہ حنفی ہے۔

عہدِ قطب شاہی کے دورِ آخر کے دو قابل ذکر شعرا طبعی اور فائز ہیں۔اول الذکر نے 1084ھ میں ''بہرام وگل اندام'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی تھی جسے ڈاکٹر نور السعید اختر نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔آخر الذکر نے 1094ھ میں ''رضوان شاہ وروح افزا'' کے عنوان سے ایک دلچسپ مثنوی تصنیف کی تھی جسے سید محمد صاحب نے مرتب کر کے منظر عام پر لایا ہے۔اس دور کی دیگر مثنویوں میں سید بلاقی کی معراج نامہ (1056ھ) عبداللطیف کی ''وفات نامہ'' (1074ھ) مختار کی ''معراج نامہ'' (1094ھ) ضعیفی کی ''ہدایات ہندی'' خواص کی ''قصہ حسینی'' قدرتی کی ''قصص الانبیا'' سیوک کی ''جنگ نامہ'' (1092ھ) اولیا کی ''قصہ ابوشحمہ'' (1090ھ) کے نام قابل ذکر ہیں۔یہ سب کی سب مثنویاں ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. احمد گجراتی نے کتنی مثنویاں لکھی ہیں؟
2. احمد جنیدی کی مثنوی کا نام بتایئے۔
3. سلطان عبداللہ نے کن اصناف میں طبع آزمائی کی؟
4. میراں جی خدانما کے نثری رسائل کے نام لکھیے۔
5. میراں یعقوب کے مرشد کا نام بتایئے۔
6. ''سہاگن نامہ'' کے مصنف کا نام لکھیے۔
7. عابد شاہ کے کسی ایک نثری رسالے کا نام بتایئے۔

9.9 خلاصہ

اس اکائی میں قطب شاہی دور (1518ء تا 1687ء) کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر پر سرسری طور پر روشنی ڈالنے کے بعد اس دور میں نشو ونما پانے والے شعر وادب کا تعارف کرایا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس دور کے اہم اور غیر اہم سبھی شعرا اور نثر نگاروں کی ادبی خدمات کو اجاگر کیا گیا ہے

قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان قلی تھا۔جس نے 1518ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا تھا۔اس کے بعد یکے بعد دیگرے مزید سات سلاطین نے سرزمین گولکنڈہ پر 169 سال تک حکمرانی کی۔کم وبیش تمام قطب شاہی سلاطین نہ صرف علم دوست اور شعرا وادبا کے سرپرست وقدر دان تھے بلکہ ان میں سے بیش تر خود بھی شعر کہتے تھے۔خصوصاً محمد قلی اور سلطان عبداللہ تو دکنی اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔اول الذکر بادشاہ کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔محمد قلی بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے۔تاہم اس نے قصیدہ، نظم اور رباعی پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔

محمد قلی کے علاوہ اس دور کے دوسرے بلند قامت شعرا میں اسد اللہ وجہی، ملک الشعرا غواصی اور ابن نشاطی کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔جنہوں نے ''قطب مشتری''، ''میناست ونتی''، ''سیف الملوک وبدیع الجمال''، ''طوطی نامہ'' اور ''پھول بن'' جیسی لازوال مثنویاں لکھی ہیں۔غواصی نے مثنویوں کے علاوہ غزلیں، قصیدے، نظمیں اور رباعیاں بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔اور وجہی اس دور کا ایک باکمال شاعر ہی نہیں تھا بلکہ اعلیٰ درجے کا نثر نگار بھی تھا۔اس کی تصنیف ''سب رس'' صرف دکنی اردو نثر کا ہی ایک لازوال کارنامہ نہیں بلکہ اردو نثر کی تاریخ میں بھی ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔

وجہی کے علاوہ قطب شاہی دور کے دوسرے نثر نگاروں میں میراں جی خدانما، میراں یعقوب اور عابد شاہ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔اسی طرح اس دور کے دیگر مثنوی نگاروں میں احمد گجراتی، جنیدی، طبعی اور فائز اور غزل گو شعرا میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی قطب شاہی دور کو مثنویوں کے دور سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔مثنوی کے بعد اس دور میں غزل کی صنف کو بہت فروغ ہوا۔ساتھ ہی ساتھ قصیدہ، مرثیہ اور رباعی کی صنف پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔

9.10 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے۔

1. محمد قلی قطب شاہ کی حیات اور ادبی خدمات کو اجاگر کیجیے۔
2. قطب شاہی دور کی مثنویوں کا سرسری جائزہ لیجیے۔
3. غواصی کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالیے۔
4. قطب شاہی دور میں اردو نثر کے ارتقا پر ایک مضمون لکھیے۔
5. ملک الشعرا وجہی کے حالات زندگی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. قطب شاہی دور کے سیاسی اور سماجی پس منظر پر روشنی ڈالیے۔
2. قطب شاہی دور کے اولین شعرا کا تعارف کروایئے۔
3. کسی دو پر نوٹ لکھیے۔ 1. ابن نشاطی 2- میراں جی خدانما 3- احمد گجراتی 4- احمد جنیدی

9.11 فرہنگ

الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی	الفاظ	معنی
مفصل	=	تفصیل سے	آب یاری	=	پانی دینا، ترقی دینا	میدان کارزار	= میدان جنگ
برسرپیکار	=	آمادۂ جنگ ہونا	سورما	=	بہادر	عاری	= خالی، قاصر
مطلق العنان	=	خودمختار، خودسر	تمثیل	=	تشبیہ دینا، مماثلت، مطابقت	توضیح	= وضاحت
الف لیلیٰ	=	ہزار راتیں، ایک داستان کا نام	فی البدیہہ	=	بے سوچے، فی الفور	حضر	= قیام، سفر کا متضاد
تامہ	=	مکمل، بھرپور	یورش	=	فساد، حملہ	ورغلانہ	= ترغیب و تحریک دینا
بہ نظر غائر	=	گہری نظر سے، باریک بینی	محیر العقول	=	عقل کو حیرت میں ڈالنے والے	مقفیٰ	= جس میں قافیے لائے جائیں
قوافی	=	قافیے کی جمع	لُبِ لُباب	=	خلاصہ، نچوڑ	تھے	= سے
گیانی	=	عالم	جم	=	ہمیشہ	گن بھر	= صاحبِ اوصاف
نچھل	=	صاف، شفاف	یو	=	یہ	ناد	= مانند
سنیا	=	سنا	کہیا	=	کہا	نوی	= نئی
سار	=	مانند	نپٹ	=	مکمل		

9.12 سفارش کردہ کتابیں

1. گیان چند جین و سیدہ جعفر — تاریخ ادبِ اردو 1700ء تک (جلد سوم و چہارم)
2. محمد علی اثر — دبستان گولکنڈہ۔ ادب اور کلچر
3. جمیل جالبی — تاریخ ادبِ اردو (جلد اوّل)
4. محمد علی اثر — دکنی شاعری، تحقیق و تنقید
5. عبدالستار ساحر — دبستان گولکنڈہ کی شاعری میں ہندوستانی عناصر
6. سیدہ جعفر — دکنی نثر کا انتخاب
7. محمد علی اثر — غواصی، شخصیت اور فن
8. محمد علی اثر و عطا اللہ خان — دیوانِ عبداللہ قطب شاہ

اکائی: 10 عادل شاہی دور میں اُردو ادب

ساخت

10.1 تمہید

10.2 بیجاپور کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر

10.3 ابتدائی دور کے شعرا و ادبا

10.3.1 میراں جی شمس العشاق

10.3.2 شاہ برہان الدین جانمؔ

10.3.3 ابراہیم عادل شاہ ثانی

10.3.4 عبدلؔ

10.4 درمیانی دور کے شعرا و ادبا

10.4.1 مقیمیؔ

10.4.2 صنعتیؔ

10.4.3 ملک خوشنودؔ

10.4.4 رستمیؔ

10.4.5 حسن شوقیؔ

10.5 آخری دور کے شعرا و ادبا

10.5.1 شاہیؔ

10.5.2 نصرتیؔ

10.5.3 امین الدین اعلیٰ

10.5.4 شاہ معظمؔ

10.5.5 مرزاؔ

10.5.6 ہاشمیؔ

10.5.7 بحریؔ

10.6 خلاصہ

10.7 نمونۂ امتحانی سوالات

10.8 فرہنگ

10.9 سفارش کردہ کتابیں

10.1 تمہید

بیجاپور کی عادل شاہی حکومت دکن کی ایک عظیم الشان، مستحکم اور خوش حال حکومت تھی۔ اس کا قیام 1490ء میں عمل میں آیا تھا۔ عادل شاہی خاندان کے نو بادشاہوں نے تقریباً دو سو سال تک سلطنت بیجاپور پر نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ 1686ء میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے

اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

عادل شاہی حکمران علوم وفنون کے دل دادہ تھے۔انھوں نے علما وفضلا' ادبا وشعرا اور دیگر اربابِ کمال کی بڑی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی۔ان کی فیاضی اور داد ودہش کی شہرت سن کر عرب وعجم کے علما اور اہل ہنر اپنے وطن کو چھوڑ کر بیجاپور چلے آئے تھے۔عادل شاہی حکمرانوں نے ان کی قدردانی کی اور انہیں انعام واکرام سے مالا مال کیا۔عادل شاہی سلاطین کے عہد میں بیجاپور علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا مرکز بن گیا تھا۔ان حکمرانوں کو تعمیرات اور فنون لطیفہ سے گہری دلچسپی تھی چنانچہ انھوں نے بیجاپور میں عالی شان محلات' خوب صورت مساجد' گنبد اور مقبرے تعمیر کروائے جن کے آثار آج بھی باقی ہیں اور بیجاپور کی عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتے ہیں۔

عادل شاہی خاندان کے پیش رو بہمنی خاندان کے حکمرانوں نے شمال کے مقابلے میں اپنے تشخص اور انفرادیت کو باقی رکھنے کے لیے دکن میں نئی تہذیبی روایات کو ترقی دی اور نئی ادبی اور لسانی روایات کی بنیاد بھی رکھی۔بہمنی سلاطین نے شمال کے مقابلے میں دکنیت کو فروغ دیا۔دیسی تہذیب' رسم و رواج اور طور طریقوں کو اہمیت دی گئی تا کہ دکن ایک علاحدہ سیاسی اور تہذیبی اکائی بن سکے۔اس رجحان کے تحت انھوں نے دکنی زبان کی بھی سرپرستی کی۔ عادل شاہی سلاطین نے بہمنیوں کی لسانی اور تہذیبی روایات کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ ان روایتوں کو بہت کچھ فروغ بھی دیا۔بالخصوص دورِ عادل شاہی کی دوسری صدی دکنی زبان اور شعر وادب کی ترقی کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔اس دور میں شاعری درباری رنگ سے آشنا ہوئی۔اصنافِ سخن کی باقاعدہ تقسیم ہوئی۔مثنویوں کے علاوہ غزلیں اور قصائد بھی لکھے گئے۔شاعری میں فکر واسلوب کی پختگی پیدا ہوئی۔

اس اکائی میں پہلے عادل شاہی دور کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر دیا گیا ہے تا کہ اس ماحول کا اندازہ ہو سکے جس میں بیجاپوری شعر وادب کی نشو ونما ہوئی۔اس کے بعد عادل شاہی دور کے اہم شعرا اور ان کے کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔آخر میں اس اکائی کے مباحث کا خلاصہ دیا گیا ہے۔

10.2 بیجاپور کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں جو حکومتیں قائم ہوئیں ان میں بیجاپور کی عادل شاہی حکومت تہذیبی وتمدنی اعتبار سے ایک ممتاز مقام کی حامل ہے۔اس سلطنت کا بانی یوسف عادل خاں اصلاً سادہ (ترکستان) کا باشندہ تھا۔وہ نوجوانی میں بیدر آیا اور سلطنت بہمنیہ کے مشہور وزیر محمود گاواں کی مدد سے ترقی کرتا ہوا بیجاپور کا صوبے دار مقرر ہوا۔1490ء میں اس نے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔یوسف عادل شاہ نہایت بہادر اور لائق حکمران تھا۔وہ علما اور فضلا کا بڑا قدردان تھا۔اس نے ایران' توران' عربستان اور روم جیسے دور دراز مقامات سے اہل کمال کو دعوت نامے بھیج کر بیجاپور بلایا۔وہ خود فارسی کا اچھا شاعر تھا۔اس نے بیجاپور میں بہت سی خوب صورت عمارتیں تعمیر کروائیں جن میں فرخ محل اور آنند محل قابل ذکر ہیں۔1510ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا اسمٰعیل عادل شاہ تخت نشین ہوا۔یہ بھی بڑا علم پرور حکمراں تھا۔وہ فارسی میں شعر کہتا تھا۔اس کا تخلص وفائی تھا۔اس نے چندا پور کے نام سے ایک شہر اور چمپا محل کے نام سے ایک عالی شان محل تعمیر کروایا۔1534ء میں اسمٰعیل عادل شاہ کا انتقال ہوا۔اس کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم عادل شاہ بیجاپور کے تخت پر بیٹھا۔ابراہیم کو علم وادب کا ذوق ورثے میں ملا تھا۔وہ اہل علم کی دل کھول کر قدر کرتا تھا۔چنانچہ جب مولانا شہیدی قمی گجرات سے بیجاپور آئے تو ابراہیم نے ان کی بڑی قدر ومنزلت کی اور انہیں پچاس ہزار ہُن عطا کیے۔اس کے دور میں بیجاپور علم وادب' موسیقی اور صناعی کا مرکز بن گیا تھا۔ابراہیم عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا علی عادل شاہ اول 1558ء میں اس کا جانشین ہوا۔وہ ملا فتح اللہ شیرازی جیسے جید عالم کا شاگرد تھا۔اس کے عہد میں عادل شاہی سلطنت بہت وسیع ہوگئی تھی کیوں کہ جنگِ تالی کوٹ کے بعد جنوبی کرناٹک کے بہت سے علاقے اس میں شامل ہو گئے تھے۔علی عادل شاہ اول نہایت اعلیٰ علمی ذوق کا مالک تھا۔اس نے ایک بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا تھا جس میں متعدد کاتب' خوش نویس' نقاش اور جلد ساز کام کرتے تھے۔منتخب کتابوں کے صندوق سفر اور قیام میں اس کے ساتھ رہتے تھے۔اسے تعمیرات سے بھی دلچسپی تھی۔بیجاپور اور شاہ پور کی فصیلیں' نل درگ کا قلعہ' پریا محل' گگن محل' جامع مسجد' چاند باولی اور اپنا ذاتی مقبرہ (آنند محل) اسی کے تعمیر کروائے ہوئے ہیں۔علی عادل شاہ کے بعد اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ ثانی 1580ء میں اس کا جانشین ہوا۔اس کے عہد میں بیجاپور صحیح معنی میں اردو ادب کا مرکز بن گیا۔ابراہیم عادل شاہ ثانی کا شمار جلیل القدر حکمرانوں میں ہوتا ہے۔وہ مغل شہنشاہ اکبر اور گولکنڈہ کے پانچویں حکمراں محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر تھا۔وہ نہ صرف علما اور شعرا کا سرپرست تھا بلکہ خود بھی ایک بلند پایہ شاعر تھا۔اپنے علم و فضل کی بدولت وہ ''جگت گرو'' کے نام سے مشہور تھا۔اس کے عہد میں جب گجرات اور احمد نگر کی سلطنتوں کو زوال ہوا تو اس نے وہاں کے علما اور اصحاب

کمال کو بیجاپور آنے کی دعوت دی۔ ملاظہوری (مصنف سہ نثر ظہوری) حکیم ابوالقاسم فرشتہ (مصنف تاریخ فرشتہ) اور ملا رفیع الدین شیرازی (مصنف تذکرۃ الملوک) اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کو ہندوستانی موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ اس نے راگ راگنیوں پر مشتمل گیت لکھے اور کتاب ''نورس'' کے نام سے ان کا مجموعہ تیار کیا۔ بیجاپور کی مغربی سمت میں اس نے ایک نیا شہر تعمیر کروایا جس کا نام نورس پور رکھا۔ بیجاپور کا سات منزلہ محل، دلکشا محل، حیدر برج اور مسجد ملکہ جہاں وغیرہ بھی اسی کے عہد کی تعمیرات ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے 1627ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمد عادل شاہ بیجاپور کا حکمران ہوا۔ یہ نہایت فیاض اور رحم دل بادشاہ تھا۔ خود شاعر نہ تھا لیکن علم و ادب کا شیدا اور شاعروں کا سرپرست تھا۔ اس کی ملکہ خدیجہ سلطان گولکنڈہ کے فرماں روا محمد قطب شاہ کی بیٹی تھی۔ اس نے فارسی خاورنامے کا اردو ترجمہ کرنے پر بیش بہا انعام کا اعلان کیا تھا۔ رستمی نے یہ ترجمہ کر کے انعام حاصل کیا تھا۔ محمد عادل شاہ اور ملکہ خدیجہ سلطان کی اردو نوازی کی وجہ سے بیجاپور میں اردو ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ بیجاپور کا مشہور زمانہ گول گنبد اسی کا بنوایا ہوا ہے۔ 1067ھ میں محمد عادل شاہ کا انتقال ہوا۔

محمد عادل شاہ کے بعد اس کے بیٹے علی عادل شاہ ثانی نے 1656ء میں عنان حکومت سنبھالی۔ علی عادل شاہ ثانی کو زندگی بھر سرکش امرا کی بغاوتوں اور مرہٹوں و مغلوں کی یورشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر جب بھی ان سے فراغت ملتی وہ ادب اور فنون لطیفہ کی طرف متوجہ ہوتا۔ وہ خود ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ اس کے عہد میں دکنی زبان اور شعر و ادب کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ علی عادل شاہ ثانی کی تعمیر کی ہوئی عمارتوں میں حسینی محل، علی محل، عرش محل اور حسینی مسجد وغیرہ اہم ہیں۔ 1672ء میں صرف پینتیس سال کی عمر میں علی عادل شاہ ثانی کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس کا کم سن لڑکا سکندر عادل شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ ایک کمزور حکمران تھا۔ اس کے عہد میں امرا کی آپسی ناچاقیاں حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ آئے دن مرہٹے تاخت کرتے رہتے تھے۔ مغلوں کی یورش کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ آخر کار 1686ء میں اورنگ زیب نے بیجاپور کو فتح کر لیا اور سکندر عادل شاہ کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ اس طرح سلطنت بیجاپور کا خاتمہ ہو گیا۔

بیجاپور کا علاقہ بہت زرخیز تھا۔ سلطنت میں مرفہ الحالی تھی۔ عادل شاہی حکمرانوں کو رعایا کی فلاح و بہبود کا بڑا خیال تھا۔ انھوں نے اپنی سلطنت میں بے شمار سرائیں، خانقاہیں، پل اور کنویں بنوائے۔ غربا و مساکین کے لیے لنگر خانے قائم کیے۔ عام لوگوں کو تیار غذا دی جاتی تھی، مشائخ اور علما کو وظائف اور انعامات ملتے تھے۔ شہر کے دروازوں پر واقعہ نویس، معتبر خبر گو اور چند سوار موجود رہتے تھے۔ دیہاتوں کی سالانہ جمع بندی کی جاتی تھی۔ بادشاہ کے اوقات کار مقرر تھے۔ وہ اہم امور میں وزرا سے مشورہ لینے کے علاوہ خود تنہائی میں بھی فیصلوں پر غور کرتا تھا۔ بادشاہ کا عادل اور منصف مزاج ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ عیدین، شب برات اور سالگرہ پر شہر آراستہ کیا جاتا اور جشن منائے جاتے تھے۔ نوروز کے موقعے پر نو دن تک نہایت تزک و احتشام کے ساتھ شہر سے دور کسی پُرفضا مقام پر جشن منایا جاتا تھا۔ الغرض عادل شاہی سلاطین کے عہد حکومت میں ملک اکثر پرامن اور رعایا اتنی خوشحال تھی کہ اس دور میں موسیقی، مصوری، نقاشی، خطاطی، تعمیرات، صنعت و حرفت، شعر و ادب اور دیگر علوم و فنون کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ آئندہ صفحات میں عادل شاہی دور میں اردو شعر و ادب کی نشو و نما کا جائزہ لیا جائے گا۔ سہولت کی خاطر اس عہد کے شعرا کو چار زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے (1) اولین دور کے شعرا و ادبا (2) وسطی دور کے شعرا و ادبا (3) آخری دور کے شعرا و ادبا (4) متفرق شعرا و ادبا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. عادل شاہی سلطنت کے بانی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔
2. علی عادل شاہ اول کے علمی ذوق کا اندازہ کن باتوں سے ہوتا ہے؟
3. ابراہیم عادل شاہ ثانی نے علوم و فنون کی سرپرستی کس طرح کی؟

10.3 ابتدائی دور کے شعرا و ادبا

10.3.1 میراں جی شمس العشاق

میراں جی شمس العشاق دراصل بہمنی عہد کے دور آخر کے صوفی شاعر ہیں۔ عادل شاہی دور میں بھی وہ بیجاپور میں موجود تھے ان کا مفصل تذکرہ بہمنی دور سے متعلق گزشتہ اکائی میں کیا گیا ہے۔

10.3.2 شاہ برہان الدین جانمؔ

برہان الدین جانمؔ، شاہ میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ انھوں نے علوم ظاہری و باطنی کا اکتساب اپنے والد سے کیا تھا۔ اپنے دور کے بڑے عارف اور صوفی تھے۔ لوگوں کو ان سے بہت فیض پہنچا۔ انھوں نے دکنی زبان میں تصوف اور سلوک کے موضوع پر متعدد رسالے تحریر فرمائے۔ ان رسالوں کے ذریعے جانمؔ نے طریقت اور معرفت کی تعلیمات کو ان مریدوں اور معتقدوں تک پہنچانے کی کوشش کی جو عربی اور فارسی سے ناواقف تھے۔ جانمؔ نے 1007ھ میں انتقال کیا اور اپنے والد کے مقبرے میں دفن ہوئے۔ جانمؔ نے مختلف نظموں کے علاوہ دوہرے خیال اور مختلف راگ راگنیوں پر مبنی گیت لکھے جنھیں ''حقیقت گیت'' کہا جاتا ہے۔ دکنی ادب کی تاریخ میں جانمؔ کی اہمیت اس لیے ہے کہ دکن کے شعرا و ادبا میں انھوں نے پہلی مرتبہ نثر کو وسیلۂ اظہار بنایا اور نثری رسالے لکھے۔ ذیل میں برہان الدین جانمؔ کی اہم تصانیف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

وصیت الہادی: یہ ایک عارفانہ نظم ہے جس میں ذکر جلی، ذکر خفی، ذکر قلبی، ذکر سری اور اسی طرح کے دیگر مسائل سلوک کا ذکر ہے۔ مزید یہ کہ اس نظم میں روح کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ نظم کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے اس کے بعد شریعت پر عمل کرنے اور شرک سے اجتناب کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

بشارت الذکر: یہ ساٹھ اشعار پر مشتمل ایک مختصر نظم ہے۔ اس کی ابتدا میں مختصر حمد و نعت ہے اس کے بعد پانچ ابواب ہیں۔ ہر باب کے تحت ذکر جلی، قلبی، روحی، سری اور خفی، پانچ اذکار کا ایک ایک کر کے ذکر کیا گیا ہے۔ اس نظم کی بحر فارسی ہے۔ اس کے اندازِ بیان اور اسلوب پر بھی فارسی اسلوب کا اثر نمایاں ہے۔

سکھ سہیلا: جانمؔ کی یہ نظم دراصل ایک صوفیانہ گیت ہے جس میں 28 بند ہیں۔ ہر بند میں تین مصرعوں کے بعد چوتھے مصرعے کی تکرار کی گئی ہے۔

منفعت الایمان: یہ بھی ایک عارفانہ نظم ہے جو 120 اشعار پر مشتمل ہے۔ نظم کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے اس کے بعد ''در بیان اعتقاد ملحداں'' کے عنوان سے ملحدوں کے عقائد بیان کیے گئے ہیں اور پھر ''در بیان نصیحت گوید'' کے زیر عنوان اس طرح کے گمراہ کن عقائد سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس نظم میں خدا کی توحید اور اس کی عظمت کا بیان بھی موجود ہے۔

نسیم الکلام: یہ 45 اشعار کی ایک مختصر نظم ہے جس میں جانمؔ نے قرآن مجید کی آیات کے ذریعے جبر و قدر کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔ آیت کے ساتھ کہیں کہیں حدیث بھی لکھ دی ہے۔

حجت البقا: یہ جانمؔ کی ایک طویل نظم ہے جو 805 اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک ایسے طالب یا مرید کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جسے اپنے علم پر غرور تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ کسی جگہ ایک مرشد کامل رہتے ہیں تو وہ انہیں دیکھنے اور ان سے گفتگو کرنے کی غرض سے ان کے ہاں پہنچا۔ اس نے مرشد سے مختلف مسائل پر سوالات کیے۔ مرشد نے ان کے تسلی بخش جوابات دیئے۔ اس نظم میں دونوں کی بحث اور سوال و جواب پیش کیے گئے ہیں۔ آخر میں طالب قائل ہو جاتا ہے اور مرشد سے بیعت کر لیتا ہے۔

ارشادنامہ: ارشادنامہ کا سنہ تصنیف 990ھ ہے۔ یہ برہان الدین جانمؔ کی سب سے بڑی نظم ہے اس میں تقریباً ڈھائی ہزار اشعار ہیں۔ نظم کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے، پھر اپنے پیر اور والد میراں جی شمس العشاق کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد وجہ تالیف پر روشنی ڈالی گئی ہے

وجہ تالیف کے بعد کتاب کے موضوعات کا ذکر کیا ہے کہ اس میں شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ ان تمہیدی بیانات کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو سوال و جواب کی شکل میں ہے۔ سوال طالب یعنی مرید کی طرف سے اور جواب مرشد کی جانب سے۔ اکبر الدین صدیقی نے 1971ء میں جانمؔ کے ''ارشادنامہ'' کو مرتب کر کے شائع کیا۔ برہان الدین جانمؔ کثیر التصانیف بزرگ گزرے ہیں۔ مذکورہ بالا نظموں کے علاوہ ''رموز الواصلین''، ''نکتہ واحد''، ''مسافرت خان میاں و بیان خلاصہ'' اور لعبتہ جانمؔ بھی ان کی نظمیں ہیں۔ نظموں کے ساتھ انہوں نے مرثیے، گیت، دوہرے اور خیال بھی لکھے۔ جانمؔ کا ایک خاص کارنامہ ''رسالہ کلمتہ الحقائق'' ہے جو نثر میں ہے۔ ذیل میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

کلمتہ الحقائق: دکنی کا یہ ایک اہم رسالہ ہے۔ ایک طویل مدت تک اسے اردو کا سب سے پہلا نثری رسالہ سمجھا جاتا رہا لیکن بعد میں ڈاکٹر جمیل جالبی

نے تحقیق کر کے بتایا کہ اردو کا پہلا نثری رسالہ ''خیر البیان'' ہے جو صوبۂ سرحد (پاکستان) کے ایک بزرگ پیر روشان بایزید انصاری کی تصنیف ہے۔

برہان الدین جانمؔ کا رسالہ ''کلمتہ الحقائق'' ایک ضخیم رسالہ ہے۔ اس میں تصوف و عرفان کے دقیق مسائل سوال و جواب کی شکل میں بیان کیے گئے ہیں۔ کلمتہ الحقائق کی عبارت میں دکنی نثر کے ساتھ ساتھ فارسی بھی شامل ہے۔ کہیں کہیں پورا جملہ فارسی کا ہے۔ ''کلمتہ الحقائق'' اس حیثیت سے اہم ہے کہ یہ دکنی کا اولین نثری کارنامہ ہے۔ جانمؔ کی دوسری تصانیف کی طرح ''کلمتہ الحقائق'' کا موضوع بھی تصوف و عرفان ہے۔

10.3.3 ابراہیم عادل شاہ ثانی

ابراہیم عادل شاہ ثانی، طہماسپ شاہ کا بیٹا اور علی عادل شاہ کا بھتیجا تھا۔ چوں کہ علی عادل شاہ کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے اس کے انتقال کے بعد ابراہیم تخت نشین ہوا۔ یہ عادل شاہی خاندان کا چھٹا بادشاہ تھا جس نے 1580ء سے 1627ء تک حکومت کی۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی گولکنڈہ کے پانچویں حکمراں محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر اور کئی باتوں میں اس کا ہم مشرب تھا۔ اسے فنون لطیفہ اور تعمیرات سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس کے علم و فضل کی وجہ سے لوگ اسے ''جگت گرو'' کہتے تھے۔ اس نے بیجاپور کے مغرب میں ایک نیا شہر بسایا جس کا نام نورس پور تھا۔ وہ فارسی اور دکنی میں شاعری کرتا تھا۔ اس کا کچھ فارسی کلام دستیاب ہوا ہے۔ دکنی میں گیتوں کا ایک مجموعہ جس کا نام ''کتاب نورس'' ہے محفوظ ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کو موسیقی سے بڑی رغبت تھی۔ ''کتاب نورس'' اس کے ذوق شاعری و موسیقی کا اظہار ہے۔ کتاب نورس کے سنہ تصنیف کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں کہ اس کی تکمیل 1004ھ اور 1008ھ کے درمیان ہوئی ہوگی۔ (مقدمۂ کتاب نورس۔ طبع ثانی۔ صفحہ 21) ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کا سنہ تصنیف 1006ھ/1597ء متعین کیا ہے۔ (تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ صفحہ 214)

''کتاب نورس'' فن موسیقی پر کوئی کتاب نہیں ہے۔ البتہ اس میں مخصوص راگ راگنیوں کے مطابق الگ الگ گیت ترتیب دیے گئے ہیں۔ اس میں سترہ راگوں کے تحت 59 گیت اور سترہ دوہرے لکھے گئے ہیں۔ ہر گیت سے پہلے راگ کا نام دیا گیا ہے۔ اس کی زبان و بیان، تلمیحات و اشارات، ہندو دیومالا کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ 1955ء میں ڈاکٹر نذیر احمد نے ''کتاب نورس'' کو مرتب کر کے شائع کیا۔

10.3.4 عبدلؔ

عبدلؔ کا پورا نام اور حالاتِ زندگی نامعلوم ہیں۔ یہ جگت گرو ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دربار سے وابستہ تھا۔ ڈاکٹر زورؔ نے قیاس کیا ہے کہ شائد اس کا نام عبدالغنی تھا۔ (بحوالہ تذکرہ اردو مخطوطات، جلد اول، مرتبہ ڈاکٹر زور، ترمیم و اضافہ ڈاکٹر محمد علی اثر صفحہ 440) قرائن سے پتا چلتا ہے کہ عبدلؔ کا تعلق دہلی سے تھا۔ ممکن ہے اس کا خاندان دہلی سے ترکِ وطن کر کے دکن میں آ کر آباد ہو گیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خود ابراہیم عادل شاہ ثانی کی علم پروری اور فیاضی کے چرچے سن کر دہلی سے بیجاپور آیا ہو۔ عبدلؔ نے 1012ھ میں ابراہیم کی فرمائش پر ''ابراہیم نامہ'' کے نام سے ایک طویل مثنوی لکھی جس میں اس نے اپنے مربی اور آقا ابراہیم عادل شاہ ثانی کے حالات نظم کیے ہیں۔ ''ابراہیم نامہ'' دبستان بیجاپور کا پہلا ادبی نقش ہے۔ اس سے پہلے جو نظمیں لکھی گئیں وہ مذہبی یا صوفیانہ تھیں۔ یہ مثنوی 712 ابیات پر مشتمل ہے۔ مثنوی کی عام روایت کے مطابق عبدلؔ نے بھی اس مثنوی کو مختلف عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ ابتدا میں حمد، نعت، مدح چاریار اور منقبتِ حضرت گیسودراز ہے۔ اس کے بعد سبب تالیف کی وضاحت کی گئی ہے۔ پھر تعریف سخن اور تعریف قلم کے ابواب ہیں اس کے بعد اصل مثنوی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس مثنوی میں عبدلؔ نے نہ صرف ابراہیم عادل شاہ ثانی کی خانگی زندگی کے واقعات محفوظ کر دیئے ہیں بلکہ اس زمانے کے رسم و رواج، آدابِ دربار، عمارات، زیورات، سیر و شکار اور موسیقی وغیرہ پر قابل قدر مواد پیش کیا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے 1955ء میں اس مثنوی کو مرتب کر کے شائع کیا ہے جس کے مقدمے میں وہ لکھتے ہیں۔ ''دراصل ابراہیم نامہ''، ''شاہ استاد'' (یعنی ابراہیم عادل شاہ ثانی) کی شان میں ایک طویل قصیدہ ہے جو بہ شکل مثنوی لکھا گیا ہے۔ اس کا موضوع خود شاہِ دکن کی ذات گرامی ہے۔ اس کا شہر، اس کا قلعہ، اس کا لشکر، اس کا عدل، اس کی سخاوت اس کی ادب نوازی اور اس کی بزم آرائی۔ یہ کوئی تاریخی مثنوی نہیں ہے لیکن اس میں ابراہیم کی شخصیت کا جو نقش ابھرتا ہے اس میں تاریخی صداقتیں جلوہ گر ہیں۔'' (مسعود حسین خاں۔ مرتب ابراہیم نامہ، طبع ثانی، مقدمہ صفحہ 18)

اپنی معلومات کی جانچ:

1. میراں جی شمس العشاق کی تصانیف کے نام بتایئے۔
2. برہان الدین جانمؔ نے کن کن اصناف میں طبع آزمائی کی؟ بیان کیجیے۔
3. ''کتاب نورس'' کس نے مرتب کی؟
4. ''ابراہیم نامہ'' کا موضوع کیا ہے؟

10.4 درمیانی دور کے شعرا و ادبا

10.4.1 مقیمیؔ

یہ سلطان محمد عادل شاہ (1037ھ سے 1067ھ) کے عہد کا ایک اہم شاعر ہے۔ اس نے ''چندر بدن ومہیار'' کے نام سے دکنی زبان میں ایک مثنوی لکھی جس میں کسی بادشاہ کی تعریف نہیں ہے۔ ''چندر بدن ومہیار'' بیجاپور کی پہلی عشقیہ مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں ایک ہندو راجکماری چندر بدن اور ایک مسلمان تاجرزادہ محی الدین (مہیار) کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ قصہ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے قصوں کی طرح دکن میں مشہور تھا۔ مقیمی نے مثنوی کے سبب تالیف میں گولکنڈہ کے ملک الشعرا ملا غواصیؔ سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ مقیمیؔ نے اسی کے تتبع میں یہ مثنوی لکھی۔ مقیمی نے اس مثنوی میں سنہ تصنیف کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بعض شواہد کی بنیاد پر ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ یہ مثنوی 1035ھ اور 1050ھ کے درمیان لکھی گئی۔

مقیمی کی مثنوی ''چندر بدن ومہیار'' دکن کی چند اہم مثنویوں میں سے ہے۔ مقیمی کا اسلوب بیان بہت زیادہ دلچسپ اور شاندار نہیں ہے مگر وہ اس بات پر نازاں ہے کہ اس نے یہ کہانی کہیں سے چرا کر نقل نہیں کی۔ یہ مثنوی اتنی مقبول ہوئی کہ بعد کے کئی شاعروں نے اس قصے کو نظم کیا۔ میرؔ کی مثنوی ''دریائے عشق'' کا پلاٹ بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ اکبرالدین صدیقی نے اس مثنوی کو مرتب کر کے 1951ء میں مجلس دکنی مخطوطات حیدرآباد، دکن کی جانب سے شائع کیا۔

10.4.2 صنعتیؔ

صنعتی کا پورا نام سید حسن شاہ محی الدین اور اس کے والد کا نام مرتضیٰ قادری عرف شاہ حضرت تھا (پروفیسر سیدہ جعفر، تاریخ ادب اردو 1700ء تک صفحہ 475) صنعتی خواجہ بندہ نواز کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ صنعتیؔ کے والد ابراہیم عادل شاہ کے مرشد تھے۔ صنعتیؔ نے 1055ھ میں ''قصہ بے نظیر'' کے نام سے ایک طویل مثنوی لکھی جس میں حضرت تمیم انصاری صحابیؓ کے عجیب وغریب اور حیرت انگیز واقعات کو قصے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ مثنوی میں اصل قصے سے قبل حمد، نعت، منقبت اور تعریف سخن کے علاوہ سلطان محمد عادل شاہ کی مدح ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس کے دربار سے وابستہ تھا۔ مثنوی ''قصہ بے نظیر'' ایک ہزار چھے سو پندرہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں ہر باب کو ''مقام'' سے موسوم کیا گیا ہے۔ کل بارہ مقامات ہیں۔ علاوہ ازیں کئی تمہیدی ابواب بھی ہیں۔ شعر کی تعریف میں جو ابیات لکھی گئی ہیں ان سے صنعتیؔ کے ادبی نظریات اور تنقیدی خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ عبدالقادر سروری نے صنعتی کی اس مثنوی کو مرتب کیا اور یہ سلسلۂ یوسفیہ کے تحت 1938ء میں شائع ہوئی۔

صنعتیؔ کی ایک اور مثنوی ''گلدستہ'' بھی ہے۔ اس میں ایک مصری شہزادہ بلعم کی فراست کا قصہ ہے جو چین کے بادشاہ فغفور شاہ کی دختر حظاقی کے سوالات کا صحیح جواب دے کر اس سے بیاہ رچاتا ہے۔ ابتدا میں حمد ونعت ہے۔ اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ ایجاز واختصار اس مثنوی کی خاص خصوصیت ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے صنعتیؔ کی اس مثنوی کو مرتب کیا جو 2003ء میں شائع ہوئی۔

10.4.3 ملک خوشنود

یہ گولکنڈے کا ایک حبشی غلام تھا۔ جسے شہزادی خدیجہ سلطان کی شادی کے موقعے پر جہیز اور ساز وسامان کے ساتھ بیجاپور روانہ کیا گیا۔ بیجاپور میں

ملک خوشنود نے بڑی ترقی کی وہ نہ صرف شاعر تھا بلکہ ایک اچھا منتظم اور سیاست داں بھی تھا۔ 1045ھ میں سلطان محمد عادل شاہ نے ملک خوشنود کو اپنا سفیر بنا کر گولکنڈہ روانہ کیا۔ گولکنڈہ میں ملک خوشنود کا نہایت شاندار استقبال ہوا۔ خوشنود نے قصائد بھی لکھے غزلیں اور مرثیے بھی لکھے اور ایک ہجو بھی لکھی لیکن دکنی ادب کی تاریخ میں خوشنود کی اہمیت اس کی مثنوی ''جنت سنگار'' کے سبب ہے۔ یہ مثنوی اس نے 1056ھ میں سلطان محمد عادل شاہ کی فرمائش پر لکھی۔ اس مثنوی میں ملک خوشنود نے امیر خسرو کی مشہور فارسی مثنوی ''ہشت بہشت'' کو دکنی کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ مثنوی تین ہزار دو سو پچاس ابیات پر مشتمل ہے۔ مثنوی ''جنت سنگار'' میں مثنوی کی روایتی ہئیت کے مطابق حمد' نعت' صفت معراج اور منقبت چہار یار موجود ہے۔ بعد ازاں حیدر آباد کے پیشوائے سلطنت میر مومن کی توصیف ہے جن سے خوشنود کو بڑی عقیدت تھی۔ پھر سلطان محمد عادل شاہ کی مدح ہے اس کے بعد اصل داستان کا آغاز کیا گیا ہے۔ ملک خوشنود ایک پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھا۔ ''جنت سنگار'' میں اس نے ''ہشت بہشت'' سے خوشہ چینی ضرور کی ہے لیکن جب بھی موقع ملا اپنی جدت طرازی' اپج اور تازہ خیالی کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ ''جنت سنگار'' کو پروفیسر سیدہ جعفر نے مرتب کر کے 1997ء میں شائع کروایا ہے۔

10.4.4 رستمی

رستمی کا نام کمال خاں اور اس کے باپ کا نام اسماعیل خاں تھا۔ اسماعیل خاں کا خاندان چھے پشتوں سے بیجاپور کے دربار میں دبیر شاہی کی خدمت پر فائز تھا۔ اسماعیل خاں کو شاہی دربار سے ''خطاط خاں'' کا خطاب ملا تھا۔ رستمی سلطان محمد عادل شاہ کے دربار کا شاعر تھا۔ وہ اپنے زمانے کا نامور ادیب اور باکمال شاعر تھا۔ وہ فارسی اور دکنی میں مہارت کے ساتھ شعر گوئی کرتا تھا۔ اسے قصیدہ' غزل اور مثنوی جیسی اصناف سخن میں کمال حاصل تھا۔ دکنی ادب کی تاریخ میں اس کی اہمیت اس کی مثنوی ''خاور نامہ'' کی وجہ سے ہے جو ابن حسام کے فارسی ''خاور نامہ'' کا ترجمہ ہے۔ محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان جو گولکنڈے کے چھٹے حکمراں سلطان محمد قطب شاہ کی دختر اور عبداللہ قطب شاہ کی بہن تھی بڑی علم پرور اور ادب دوست ملکہ تھی۔ اس نے اپنے دور کے تمام شاعروں کو یہ دعوت دی تھی کہ جو کوئی ابن حسام کے فارسی خاور نامے کا کامیاب منظوم ترجمہ کرے گا اسے انعام واکرام سے سرفراز کیا جائے گا۔ رستمی نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور ڈیڑھ سال کی مدت میں ترجمے کا کام مکمل کر کے انعام کا مستحق قرار پایا۔

رستمی کا خاور نامہ اردو کی سب سے طویل مثنوی مانی جاتی ہے جو تقریباً چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں 222 عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ خاور نامے میں حضرت علیؓ اور آپ کے ساتھیوں کی مختلف بادشاہوں' دیوؤں' پریوں' جادوگروں اور آدم خوروں سے لڑائیوں کا حال بطور داستان بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایک فرضی داستان ہے جو داستان امیر حمزہ کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ مثنوی کے اختتام پر رستمی نے فارسی نثر میں مثنوی کے سبب تالیف پر روشنی ڈالی ہے۔ ''خاور نامہ'' ایک کامیاب رزمیہ مثنوی ہے۔ اس میں میدان جنگ' اسلحہ جات' گھوڑے' حرب وضرب اور جنگی مناظر کی بھرپور تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ منظر نگاری اور سراپا نگاری کے بھی اچھے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ رستمی کی صلاحیت اور روانی طبع کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ چوبیس ہزار ابیات پر مشتمل اس طویل مثنوی میں نہ کہیں تسلسل مجروح ہوا ہے اور نہ ہی واقعات کا ارتباط کہیں منقطع ہوا ہے۔ مثنوی کے تمام اشعار ایک دوسرے سے پیوست نظر آتے ہیں۔ جس کی وجہ سے داستان میں ترتیب وتوازن اور ہم آہنگی وتسلسل کا احساس ہوتا ہے۔ رستمی کے ترجمے کو اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ یہ ترجمہ اس قدر دل کش اور پُر اثر ہے کہ اس پر ترجمے کی بجائے اصل کا گمان ہوتا ہے۔ رستمی کی اس ضخیم مثنوی کو شیخ چاند حسین نے مرتب کیا اور 1968ء میں اسے ترقی اردو بورڈ کراچی نے شائع کیا۔

10.4.5 حسن شوقی

حسن شوقی اپنے دور کا مسلم الثبوت استاد تھا۔ حسن شوقی ابتدا میں احمد نگر کے نظام شاہی دربار سے وابستہ رہا۔ 1633ء میں مغلوں نے نظام شاہی سلطنت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اسی دور زوال وانتشار کے آخری دنوں میں حسن شوقی عادل شاہی سلطنت میں آ گیا۔ اس وقت سلطان محمد عادل شاہ بیجاپور کا فرمان روا تھا۔ 1043ھ میں محمد عادل شاہ نے اسے اپنا سفیر بنا کر گولکنڈہ روانہ کیا۔ اس طرح حسن شوقی کو دکن کے تین مختلف درباروں یعنی نظام شاہی' عادل شاہی اور قطب شاہی سے وابستہ ہونے کا موقع ملا۔

حسن شوقی بیجاپور کے مشہور صوفی مولانا حبیب اللہ کا مرید تھا۔ حسن شوقی کو ایک مثنوی نگار اور غزل گو شاعر کی حیثیت سے اہمیت حاصل ہے۔ اس کی دو مثنویاں اور 21 غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ حسن شوقی کی پہلی مثنوی ''فتح نامہ نظام شاہ'' ہے جو (620) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں حسن شوقی

نے دکن کی مشہور جنگ تالی کوٹ کا حال لکھا ہے۔ یہ جنگ 972ھ/1564ء میں وجیانگر کے راجہ رام راج اور دکن کے مسلم حکمرانوں (ابراہیم قطب شاہ۔ علی عادل شاہ اول۔ حسین نظام شاہ اور علی برید شاہ) کی متحدہ افواج کے درمیان ہوئی جس میں رام راج کو شکستِ فاش ہوئی اور وہ میدان جنگ میں گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ حسن شوقی نے اس فتح کے موقعے پر منظوم فتح نامہ لکھ کر حسین نظام شاہ کے حضور میں پیش کیا۔ اس مثنوی میں حسن شوقی نے اپنے مربی حسین نظام شاہ کو اصل فاتح دکھایا ہے۔ اس مثنوی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن شوقی کو رزم و بزم دونوں پر عبور حاصل تھا۔ اس نے موقع و محل کے مطابق اسلوب و لہجہ اختیار کیا ہے۔ اور زبان و بیان میں بھی کرداروں سے مناسبت کا خیال رکھا ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس مثنوی میں بیان کردہ واقعات قابل اعتماد اور مستند ہیں۔ ''فتح نامہ نظام شاہ'' آج سے تقریباً ساڑھے چار سو سال پرانی اردو کا نمونہ ہے۔

حسن شوقی کی دوسری مثنوی ''میزبانی نامہ'' ہے۔ اس میں سلطان محمد عادل شاہ کی اس شادی کو موضوع بنایا گیا ہے جو نواب مظفر خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ میزبانی نامہ 1214 اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی میں سلطان محمد عادل شاہ کی میزبانی' سلطان کی شہر گشت' مظفر خاں کی مہمانی اور جہیز کی تفصیل نظم کی گئی ہے۔ حسن شوقی نے جشن کی دھوم دھام' میزبانی اور مہمانی کی شان و شوکت' عیش و عشرت اور آرائش و زیبائش کا ذکر ایسی ترتیب اور سلیقے سے کیا ہے کہ سجاوٹ اور سامان کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ اس مثنوی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے اس زمانے کے رسم و رواج' عادات و اطوار' طور طریقے' آداب مجلس' ملبوسات اور مختلف ظروف کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس طرح یہ مثنوی آج سے کئی صدیوں پہلے کی مسلم تہذیب و معاشرت کا مرقع پیش کرتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے 1971ء میں ''دیوان حسن شوقی'' مرتب کیا جو انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) سے شائع ہوا۔ اس میں غزلیات کے علاوہ ''مثنوی فتح نامہ نظام شاہ'' اور ''مثنوی میزبانی نامہ'' بھی شامل ہے۔ مثنویوں کی طرح غزلوں میں بھی حسن شوقی نے اپنی مہارتِ سخن اور قادر الکلامی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کی غزل خیال' اسلوب لہجے اور طرز ادا میں فارسی غزل کی پیروی کرتی ہے۔ اس کے کلام میں مٹھاس اور حلاوت کا احساس ہوتا ہے۔ حسن شوقی کی غزلیں اسی روایت کا نقطۂ آغاز ہیں جس کا نقطۂ عروج ولی اورنگ آبادی کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. مقیمی کی مثنوی کا نام بتایئے اور اس کے موضوع کی صراحت کیجیے۔
2. زبان کے اعتبار سے صنعتی کی مثنوی ''قصہ بے نظیر'' کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟
3. ملک خوشنود کون تھا؟ اس کی مثنوی کا نام کیا ہے؟
4. ''خاور نامہ'' کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔
5. دیوان حسن شوقی میں کون کون سی اصناف شامل ہیں؟

10.5 آخری دور کے شعرا و ادبا

10.5.1 شاہی

بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کا آٹھواں حکمران سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہی دکنی کا نہایت بلند پایہ شاعر تھا۔ یہ سلطان محمد عادل شاہ کا فرزند اور جگت گرو ابراہیم عادل شاہ ثانی کا پوتا تھا۔ اسے اپنے دادا ابراہیم عادل شاہ ثانی کی طرح شاعری اور موسیقی سے بڑی رغبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر دادا نے ''جگت گرو'' کا نام پایا تو پوتے نے ''استاد عالم'' کے لقب سے شہرت حاصل کی۔ سلطان علی عادل شاہ ثانی نے فنون لطیفہ اور علم و حکمت اور شعر و ادب کی بڑی سرپرستی کی۔ اس کے دربار سے کئی علما' فضلا' شعرا اور مورخین وابستہ تھے جن میں ابوالمعالی' سید نور اللہ' عبدالنبی' سید کریم اللہ اور نصرتی کے نام قابل ذکر ہیں:

علی عادل شاہ ثانی شاہی ایک قادر الکلام اور پُر گو سخنور تھا۔ وہ دکنی اور فارسی دونوں میں مشق سخن کرتا تھا لیکن اسے دکنی زبان سے بڑی محبت تھی کیوں کہ یہ اس کی مادری زبان تھی۔ شاہی نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ ''کلیاتِ شاہی'' میں قصیدے' مثنویاں' غزلیں' مخمس' مثمن' رباعیات' فردیات' گیت' کبت' دوہرے' جھولنہ اور تاریخی قطعات موجود ہیں۔ شاہی ایک حسن پرست' عیش کوش اور رند مشرب انسان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ

اس کی غزلوں میں ہجر و فراق کی تپش اور سوز و گداز کی کیفیت نہیں ملتی۔ اس کی شاعری میں کیف و طرب اور سرمستی کا احساس ہوتا ہے۔ اس نے غزلوں میں محبوب کے حسن و جمال، خدوخال اور رفتار و گفتار کی تعریف و توصیف بیان کی ہے۔ شاہی کی غزلوں کے اظہار و اسلوب اور لب و لہجے میں ندرت اور بانکپن پایا جاتا ہے۔ اس کی تشبیہات اور استعارے مقامی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اس نے ہندوستانی روایات اور ہندو دیومالا کو بڑی مہارت کے ساتھ غزل میں سمویا ہے۔ مقامی اور ملکی عناصر کی جلوہ ریزی دکنی شاعری کا امتیازی وصف ہے اور یہ وصف شاہی کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کے کلام کا پوراپس منظر ہندوستانی ہے۔ شاہی نے قصائد میں تشبیب، گریز، مدح اور دعا چاروں اجزائے ترکیبی کو بڑے قاعدے اور مہارت کے ساتھ نبھایا ہے۔ شاہی نے یہ قصیدے فارسی روایت کے تتبع میں کہے ہیں۔ فارسی قصائد کی طرح اس کے قصیدوں میں رفعت فکر، علوّ مضامین، زورِ بیان اور شوکتِ الفاظ جیسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جن کی بدولت شاہی کا شمار دکنی کے صفِ اوّل کے قصیدہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ شاہی کے کلیات میں گیت بھی ہیں جو مختلف راگ راگنیوں میں لکھے گئے ہیں۔ ان گیتوں میں سنسکرت، تہذیب اور ہندو اساطیر کے بکثرت حوالے ملتے ہیں۔ شاہی کو موسیقی سے اتنا گہرا شغف تھا کہ گیتوں کے علاوہ اس نے بعض مرثیے بھی راگوں کے آہنگ میں لکھے۔ انہیں پڑھنے کے لیے مرثیے کے اوپر راگ کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ شاہی کے سارے کلام میں غنائیت کا احساس ہوتا ہے۔

کلیاتِ شاہی کے واحد نسخے کو، جو نامکمل ہے، مولوی نصیر الدین ہاشمی نے دریافت کیا۔ 1962ء میں اسی نسخے کو سید مبارز الدین رفعت اور زینت ساجدہ نے مرتب کر کے علاحدہ علاحدہ طور پر شائع کیا۔

10.5.2 نصرتی

یہ سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہی کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ نصرتی کا خاندانی پیشہ سپہ گری تھا۔ اس کے والد عادل شاہی لشکر میں سلحدار کے عہدے پر فائز تھے۔ نصرتی نے تین بادشاہوں یعنی محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ کا زمانہ دیکھا۔ نصرتی علی عادل شاہ ثانی کی شہزادگی کے زمانے سے اس کا دوست تھا جب وہ بادشاہ ہوا تو اس نے نصرتی کو نہ صرف اپنے مصاحبوں میں شامل کیا بلکہ اپنے دربار کا ملک الشعراء بھی مقرر کیا۔ یہ منصب نصرتی کو یوں ہی نہیں دیا گیا تھا اس کے پیچھے اس کے علم و فضل کا بھی دخل تھا۔ بیجاپور میں اس کی علمیت کا شہرہ تھا لوگ اسے ملّا نصرتی کے احترامی نام سے پکارتے تھے۔ نصرتی نے طبعی موت نہیں پائی بلکہ حاسدوں نے جو اس کی عزت و عروج سے جلتے تھے سازش کر کے اسے قتل کرا دیا تھا۔ ''نصرتی شہید اہے'' کے الفاظ سے اس کا سنہ وفات 1085ھ برآمد ہوتا ہے۔ نصرتی کی قبر نگینہ باغ بیجاپور میں واقع ہے۔ نصرتی کی جو تصانیف دستیاب ہوئی ہیں ان میں تین مثنویاں (1) ''گلشنِ عشق'' (2) ''علی نامہ'' (3) ''تاریخ اسکندری'' اور ایک دیوان قصائد و غزلیات و رباعیات شامل ہے۔

مثنوی ''گلشن عشق'' نصرتی کی اولین تصنیف ہے۔ اس کا سنہ تصنیف 1068ھ ہے۔ اس میں نصرتی نے منوہر اور مدمالتی کی داستان عشق بیان کی ہے۔ ''گلشن عشق'' کا ڈھانچہ وہی ہے جو اس دور کی دیگر دکنی مثنویوں کا ہے۔ مثنوی کو مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے جیسے حمد، نعت، معراج، منقبت، مدح گیسودراز، مدح بادشاہ وغیرہ۔ ان تفصیلات کے بعد اصل داستان کا آغاز ہوتا ہے۔ ہر باب کے شروع میں نصرتی نے ایک شعر لکھا ہے جس میں اس باب کے مطالب کا خلاصہ آ جاتا ہے۔ عنوانات کے سارے اشعار ایک ہی بحر اور قافیے میں ہیں۔ اگر ان اشعار کو یکجا کر لیا جائے تو داستان کا خلاصہ سامنے آتا ہے۔ اس مثنوی کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ نصرتی نے اکثر ابواب کے آغاز میں مختلف مناظر کی مرقع کشی کی ہے اور قصے کے ضمن میں جو حالات اور واقعات پیش آتے ہیں ان کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف انسانی جذبات کی کیفیت بھی ہر موقعے پر نہایت خوبی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ اکثر ابواب کے خاتمے پر نصیحت آمیز اشعار بھی لکھے ہیں۔ ''گلشن عشق'' سے نصرتی کی شاعرانہ قدرت اور زور بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''گلشن عشق'' کو مولوی سید محمد اور مولوی عبدالحق نے علاحدہ علاحدہ مرتب کر کے شائع کروایا ہے۔

نصرتی کی دوسری تصنیف ''علی نامہ'' ایک رزمیہ مثنوی ہے جو 1076ھ میں لکھی گئی اس میں ان جنگی مہمات کا ذکر ہے جو سلطان علی عادل شاہ ثانی کو شیواجی مرہٹہ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے اور مغلوں کے حملوں کی مدافعت میں پیش آئی تھیں اس لیے اس نے اس مثنوی کا نام بادشاہ کے نام پر ''علی نامہ'' رکھا۔ ایک اعتبار سے یہ علی عادل شاہ ثانی کے ابتدائی عہد کی منظوم تاریخ ہے جو حقائق پر مبنی ہے۔ خود نصرتی نے اسے ''شاہ نامہ دکن'' قرار دیا ہے۔ نصرتی نے ''علی نامہ'' میں دربار کی زیب و زینت، سیاسی اتار چڑھاؤ اور جنگ و جدل کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب اور صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس مثنوی میں بعض ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جنھیں بیان کرنے سے تاریخ بھی قاصر ہے۔ اس

طرح یہ مثنوی مورخوں کے لیے ایک اہم تاریخی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ''گلشن عشق'' کی طرح ''علی نامہ'' میں بھی نصرتی نے ہر باب کے آغاز میں بطور عنوان ایک یا دو شعر لکھے ہیں جو ایک ہی بحر اور ایک ہی زمین میں ہیں۔ ہر شعر کے ذریعے ایک باب کا اور بحیثیت مجموعی تمام اشعار سے ساری مثنوی کا خلاصہ سامنے آتا ہے۔ مثنوی کے آغاز میں حمد، نعت، معراج، منقبت وغیرہ کے ابواب ہیں۔ مثنوی کے درمیان علی عادل شاہ کی مدح میں قصائد بھی ہیں۔ نصرتی کی اس مثنوی کو پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے مرتب کر کے شائع کروایا ہے۔

نصرتی کی تیسری مثنوی ''تاریخ اسکندری'' بھی ایک رزمیہ مثنوی ہے۔ اس کا سنہ تصنیف 1083ھ ہے۔ اس مثنوی میں نصرتی نے عادل شاہی سپہ سالار بہلول خاں اور شیواجی کے درمیان لڑی گئی جنگ کو موضوع بنایا ہے جس میں شیواجی کو شکست اور بہلول خاں کو فتح نصیب ہوئی تھی۔ نصرتی کی یہ مثنوی ''گلشنِ عشق'' اور ''علی نامہ'' کے مقابلے میں بہت ہی مختصر ہے۔ اس میں صرف (554) ابیات ہیں۔ ابتداً حمد ہے جو نہایت مختصر ہے اس کے بعد مثنوی کے نام اور سنہ تالیف کی وضاحت کر کے اصل مثنوی کا آغاز کیا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ نصرتی کا آخری کلام ہے اور یہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جو اس کے اور بیجاپور کے انحطاط کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں نہ اگلی سی شان و شوکت تھی نہ پہلے گزرے بادشاہوں کا سا جاہ و جلال تھا اور نہ ان کے سے پر عظمت کارنامے تھے۔ غرض یہ کہ شاعر کی طبیعت کو ابھارنے والی کوئی بات نہ تھی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے نصرتی کا جو دیوان مرتب کیا ہے اس میں مثنوی ''تاریخ اسکندری'' کے علاوہ قصائد، غزلیات اور رباعیات بھی شامل ہیں۔ نصرتی نہ صرف ایک باکمال مثنوی نگار شاعر تھا بلکہ قصیدہ گوئی میں بھی اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ قصیدہ گوئی میں دکنی کا کوئی شاعر اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ شوکتِ لفظی، علو مضامین اور زور بیان جو قصیدے کے اہم لوازمات ہیں نصرتی کے قصائد میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ اس کی قصیدہ گوئی صرف بادشاہوں کی مدح و ستائش تک محدود نہیں رہی بلکہ اس نے جنگ کے واقعات اور مظاہر قدرت کے بیان میں بھی بڑے پرزور قصائد لکھے ہیں۔ معیار سخن کے اعتبار سے نصرتی کے قصائد فارسی قصائد سے ٹکر لیتے ہیں۔ نصرتی غزل کا بھی مسلم الثبوت استاد تھا۔ اس کی غزلوں میں تخیل کی رنگینی، جذبے کی حرارت، معنیٰ آفرینی اور حسن بیان جیسی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ غزلوں میں اس نے عشق کی واردات، حسن کی جلوہ آفرینیوں اور محبت کے تجربات کی پراثر ترسیل کی ہے۔ نصرتی کی رباعیات اور مرثیے بھی فنی خوبیوں سے مالا مال ہیں۔

10.5.3 امین الدین اعلیٰ

سید شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپور کے مشہور صوفی شاہ میراں جی شمس العشاق کے پوتے اور شاہ برہان الدین جانمؒ کے فرزند تھے۔ وہ 1007ھ میں پیدا ہوئے اور 1085ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ (ڈاکٹر حسینی شاہد۔ سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ۔ صفحہ 119 اور 149)

شاہ امین جس طرح بیجاپور کے صوفیا میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اسی طرح دکنی ادب کی تاریخ میں بھی وہ ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے تصنیف اور تالیف کی خاندانی روایت کو آگے بڑھایا اور کئی منظوم اور نثری رسائل لکھے۔ منظومات میں ''رموز السالکین''۔ ''قربیہ''۔ ''محبّ نامہ'' اور ''وجودیہ'' اہم ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے خیال، ریختہ، غزلیں، سہیلا نیز راگ راگنیوں پر مبنی گیت بھی لکھے۔

''رموز السالکین'' شاہ امین کی ایک طویل مثنوی ہے جس میں انھوں نے تصوف کے بعض مسائل، مشاہدے اور مراقبے کے تمام مدارج اور ان کی کیفیات پر روشنی ڈالی ہے۔ ''قربیہ'' بھی شاہ امین کی ایک مثنوی ہے جس میں وحدت و کثرت، معرفتِ نفس، حقیقتِ محمدی، مشاہدہ حق اور سفلی اوصاف سے پرہیز کی اہمیت وغیرہ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ''وجودیہ'' شاہ امین کی ایک نسبتاً طویل مثنوی ہے۔ اس میں توحید، فنا اور بقا کے مضامین کے علاوہ سوال اور جواب کے طرز میں مشاہدہ نفس، پانچ عناصر، پچیس گن اور پانچ تن کی تفصیلی وضاحت کی گئی ہے۔ ''محبّ نامہ'' ایک مختصر نظم ہے جس میں شاہ امین نے ابتدا میں محبوب مجازی کا سراپا بیان کیا ہے اس کے بعد نور محمدی کی تعریف کی ہے۔ ''مدح شاہ برہان'' صنف کے اعتبار سے قصیدہ ہے اس میں شاہ امین نے اپنے والد شاہ برہان کے روحانی کمالات، باطنی فیوض اور ان کے اوصاف حمیدہ کی تعریف کی ہے۔ شاہ امین کی ایک نظم ''گفتار امین اعلیٰ'' کے عنوان سے ملتی ہے جو خاصی طویل ہے۔ اس نظم کی بحر ہندوی ہے۔ اس میں وحدت کے مسئلے پر روشنی ڈال کر ''وحدت الشہود'' کو واضح کیا گیا ہے۔ شاہ امین کے نثری رسائل کے نام یہ ہیں گنج مخفی، وجودیہ ''گفتار شاہ امین''۔ ''ارشادات ظاہر و باطن''۔ ''عشق نامہ''۔ ''شرح کلمۂ طیب''۔ ''کلمتہ الاسرار'' وغیرہ۔ دکنی نثر کے ارتقا میں شاہ امین کے ان رسائل کی بڑی اہمیت ہے۔ شاہ امین کی منظوم اور نثری تصانیف کا بنیادی موضوع تصوف و اخلاق ہے تصوف میں ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پانچ عناصر پچیس گن کے فلسفے کو مکمل کیا اور مراتب وجود کو سمجھنے کے لیے مطالعۂ نفس کی اہمیت پر زور دیا۔

10.5.4 شاہ معظم

شاہ معظم علی عادل شاہ ثانی کے دور کے ایک صوفی شاعر تھے۔انہوں نے سکندر عادل شاہ کا زمانہ بھی دیکھا۔ان کا نام محمد حسینی تھا۔اور وہ قادری تھے معظم شاہ امین الدین اعلیٰ کے خلیفہ قادر لنگا کوتال کے مرید تھے اور انہیں سے خلافت بھی حاصل کی تھی۔شاہ معظم ایک قادر الکلام سخنور تھے۔انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔مثنوی، غزل اور قصیدے کی ہیئتوں میں ان کا کلام موجود ہے۔معظم کی مثنویوں میں ''معراج نامہ''۔''ساقی نامہ'' ''مفتاح الاسرار''۔''آزادنامہ''۔''گلزار چشت'' اور ''شجرۃ الاتقیا'' اہم ہیں۔غزلوں کا ایک دیوان بھی ان کی یادگار ہے۔

معراج نامہ: معظم نے یہ مثنوی 1070ھ میں لکھی۔اس میں معراج کے واقعے کو موضوع بنایا گیا ہے۔یہ مثنوی سولہ ابواب پر مشتمل ہے ابتدائی ابواب حمد، نعت و منقبت کے لیے مختص ہیں۔

ساقی نامہ: یہ مثنوی اردو کا پہلا ساقی نامہ ہے۔مثنوی کے پہلے حصے میں معظم نے مئے و مینا اور کیف و مستی کے حقیقی مضامین باندھے ہیں اور دوسرے حصے میں ساز و نغمہ اور اس کے سرور و نشاط کو بیان کیا ہے۔اس ساقی نامے میں حقیقی اور مجازی دونوں رنگ پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔

مفتاح الاسرار: یہ مثنوی 273 اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں معظم نے اپنی روحانی سرگزشت اپنے خانوادے کی تعلیمات اور نظامِ تصوف کی تشریح کی ہے۔

آزادنامہ: یہ مثنوی ڈیڑھ سو ابیات پر مشتمل ہے۔جس میں معظم نے فقرا کی سج دھج، وضع قطع، طور طریق، مزاج و افتادِ طبع، بے نیازی و استغنا، مدارج و مقامات، بے سروسامانی، طمانیت قلب اور تعلق باللہ کا ذکر کیا ہے۔

گلزار چشت: معظم کی یہ مثنوی چار سو ابیات پر مشتمل ہے۔یہ مثنوی ایک طرح سے منظوم تذکرہ ہے جس میں حضرت خواجہ اجمیری سے حضرت برہان الدین غریب تک اس سلسلے کے بزرگوں کا حال قلم بند کیا گیا ہے۔مثنوی کا آغاز حسب روایت حمد و نعت سے کیا گیا ہے۔

شجرۃ الاتقیا: یہ معظم کی سب سے ضخیم مثنوی ہے جو پانسو اشعار پر مشتمل ہے۔''گلزار چشت'' کی طرح یہ بھی منظوم تذکرہ ہے جس میں معظم نے حضرت بندہ نواز گیسو دراز، حضرت جمال الدین مغربی، حضرت کمال الدین بیابانی، شاہ میراں جی شمس العشاق اور ان کے خانوادے کے تمام بزرگوں کا ذکر کیا ہے اور ان کے مختصر حالات زندگی اور کرامات بیان کیے ہیں۔

معظم نے غزلیات کا ایک دیوان بھی چھوڑا ہے جس میں غزلوں کے علاوہ قصیدہ اور رختیاں بھی شامل ہیں۔ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی نے ان کا یہ دیوان شائع کیا ہے۔معظم کی ایک سی حرفی بھی مشہور ہے جس میں الف سے والسلام تک ہر حرف تہجی سے ایک ایک شعر کا آغاز کیا گیا ہے۔دکنی نثر میں معظم کا ایک مختصر رسالہ ''شرح شکارنامہ'' کے نام سے ملتا ہے۔جس میں حضرت گیسو دراز کے فارسی شکارنامے کی شرح بیان کی گئی ہے۔معظم کے اس رسالے کو سید مبارز الدین رفعت اور ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے الگ الگ شائع کیا ہے۔

10.5.5 مرزا

مرزا عادل شاہی دور کا سب سے بڑا مرثیہ نگار تھا۔یہ علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں موجود تھا۔اس نے حمد، نعت، منقبت اور مرثیہ کے سوا کسی دوسری صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔یہاں تک کہ جب بادشاہ نے اپنی مدح لکھنے کی خواہش کی تو اس نے انکار کر دیا۔مرزا مرثیہ گوئی کو اپنا مذہبی فریضہ خیال کرتا تھا۔شہدائے کربلا سے اسے والہانہ عشق تھا۔چنانچہ مرثیہ پڑھتے وقت اس پر عجیب و غریب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔مرزا کی زندگی کا خاتمہ بھی اس طرح ہوا کہ عاشورہ کی شب وہ تمام رات مرثیہ خوانی کرتا رہا صبح کے وقت کسی دشمن نے اسے خنجر مار کر ہلاک کر دیا۔دوسرے دن یوم عاشورہ تھا۔علی عادل شاہ ثانی نے حکم دیا کہ سارے تعزیے اور علم ابراہیم پور کے دروازے سے جو فتح دروازہ کہلاتا تھا لے جائے جائیں۔تعزیوں اور علموں کے پیچھے مرزا کا جنازہ تھا۔مرزا کے شاگرد مرثیہ خوانی کرتے ہوئے جنازے کے ساتھ تھے۔جنازہ مرتضیٰ قادری کی درگاہ کو لیجایا گیا جہاں اس کی تدفین عمل میں آئی۔

دکن میں مرزا نام کا ایک اور مرثیہ گو شاعر تھا جو گولکنڈے کا باشندہ تھا۔وہ ابوالحسن تانا شاہ کے دربار سے وابستہ تھا۔قدیم بیاضوں میں مرزا کے تخلص سے جو مرثیے ملتے ہیں ان میں یہ بتانا مشکل ہے کہ کون سے مرثیے مرزا بیجاپوری کے ہیں اور کون سے مرزا گولکنڈوی کے۔مرزا کے مرثیے دکن میں بہت

مقبول تھے۔اس نے مختصر مرثیے بھی لکھے اور طویل مرثیے بھی۔اس کے مرثیے مسدس اور غزل کی ہئیت میں ہیں۔اس نے نوحے اور سلام بھی لکھے۔

10.5.6 ہاشمی

سید میراں میاں خاں ہاشمی علی عادل شاہ ثانی کے عہد کا ایک قادر الکلام اور پر گو شاعر تھا۔اور شاہ ہاشم مہدوی (م 1080ھ) کا مرید تھا۔ مشہور ہے کہ وہ پیدائشی اندھا تھا۔ لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ سن شعور کو پہنچنے کے بعد چیچک کی بیماری سے اس کی بینائی جاتی رہی۔ عادل شاہی حکومت کے زوال کے بعد وہ ارکاٹ چلا گیا۔ہاشمی کے سنہ وفات میں اختلاف ہے۔شمس اللہ قادری نے ''اردوئے قدیم'' میں ہاشمی کا سنہ وفات 1109ھ متعین کیا ہے جو قرین قیاس ہے۔ہاشمی کی تصانیف میں دیوان غزلیات کے علاوہ مثنوی ''یوسف زلیخا''۔''مثنوی عشقیہ''۔''معراج نامہ''،مخمس درنعت و مدح مہدی جونپوری، قصائد اور ہجو یہ مثنوی شامل ہیں۔

مثنوی ''یوسف زلیخا''، ہاشمی کی سب سے ضخیم مثنوی ہے۔ یہ پانچ ہزار ایک سو بیاسی اشعار پر مشتمل ہے۔(بحوالہ ڈاکٹر محمد علی اثر ''دکنی کی تین مثنویاں''، صفحہ 13)۔اس کا سنہ تصنیف 1099ھ ہے۔ہاشمی نے اس میں یوسف زلیخا کے روایتی قصے کو نظم کیا ہے۔پوری مثنوی (54) فصلوں میں تقسیم کی گئی ہے۔فصلوں کے عنوانات اشعار میں ہیں جنھیں یکجا کرنے سے مربوط نظم بن جاتی ہے۔یہ مثنوی ہاشمی نے اپنے مرشد کی فرمائش پر قلم بند کی۔مثنوی کے آغاز میں حمد و نعت اور ذکر معراج کے بعد سید محمد جونپوری اور اپنے مرشد سید ہاشم مہدوی کی منقبت ہے۔''یوسف زلیخا'' کسی فارسی تصنیف کا ترجمہ نہیں بلکہ طبع زاد تصنیف ہے۔اس مثنوی میں ہاشمی کی شاعرانہ صلاحیتیں بام عروج پر نظر آتی ہیں۔ قصے کی ترتیب، مختلف اور متضاد عناصر میں باہمی ربط، منظر کشی، جذبات نگاری، روانی اور بہاؤ یہ ایسی خصوصیات ہیں جن کی بدولت اس مثنوی کو فنی اعتبار سے ایک منفرد مقام حاصل ہے۔

''مثنوی عشقیہ''، جس کا ایک نام ''قصہ'' بھی ہے ہاشمی کی دوسری اہم مثنوی ہے۔اس میں ہاشمی نے کشمیر کی شہزادی اور ایک معمولی نوجوان کے عشق کی المیہ داستان اور ایک بقال زادے سے شیخ سعدی کی محبت کے قصے کو باہم مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ہاشمی نے جس خوبصورتی، سلیقے اور فن کارانہ مہارت سے قصے کا پلاٹ تیار کیا ہے وہ ان کے فن کارانہ کمال کی دلیل ہے، زبان و اسلوب اور فنی پختگی کے اعتبار سے یہ مثنوی قدیم ادب میں ایک شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔

''معراج نامہ'' میں ہاشمی نے معراج کے واقعات کو موضوع بنایا ہے۔ہاشمی نے اس واقعے کی جزئیات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔یہ ایک عوامی انداز کی مثنوی ہے جو محفلوں میں پڑھ کر سنانے کی غرض سے لکھی گئی ہے۔اس کی بحر نہایت رواں اور مترنم ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''تاریخ ادب اردو'' (جلد اول) میں ''معراج نامہ'' کا ذکر ایک علحدہ مثنوی کے طور پر کیا ہے۔لیکن افسر صدیقی امروہوی کا خیال ہے کہ ''معراج نامہ'' دراصل مثنوی ''یوسف زلیخا'' ہی کا ایک باب ہے۔ مخمس درنعت و مدح مہدی جونپوری (38) بندوں پر مشتمل ہے۔اس میں حمد و نعت، معراج مدح اولادِ علیؓ کے بعد سید مہدی جونپوری کی مدح لکھی گئی ہے۔بعد کے بند اکابر فرقۂ مہدویہ کی تعریف و توصیف میں ہیں۔

ہاشمی کا دیوان ڈاکٹر حفیظ قتیل نے مرتب کر کے 1961ء میں شائع کیا ہے۔ہاشمی کے دیوان میں ریختی کے انداز کی غزلیں ہیں۔اسے ریختی کا پہلا صاحب دیوان شاعر کہا جا سکتا ہے۔ہاشمی کا دیوان دکنی عورتوں کی گھریلو زبان، محاوروں اور کہاوتوں کا خزانہ ہے۔ہاشمی نے عورتوں کے جذبات کو عورتوں کی زبان میں اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ اس کے اشعار میں دکنی عورتوں کی آواز اور ان کا لب و لہجہ صاف سنائی دیتا ہے۔

ہاشمی نے دو قصیدے بھی لکھے تھے جو ذوالفقار خاں صوبے دار ارکاٹ کی مدح میں ہیں۔ڈاکٹر محمد علی اثر نے ان غیر مطبوعہ قصیدوں کو مرتب کر کے اپنی کتاب ''دکنی شاعری۔تحقیق و تنقید'' میں شائع کیا ہے۔ہاشمی کی ایک مختصر مثنوی ''ابیات ہندی تصنیف ہاشمی'' کے عنوان سے ہے۔یہ ایک ہجو یہ مثنوی ہے جس میں شاہ داول کی مذمت کی گئی ہے اور عورتوں کو نصیحت کی باتیں بتائی گئی ہیں۔ڈاکٹر محمد علی اثر نے اس مثنوی کو بھی مرتب کر کے اپنی کتاب ''دکنی کی تین مثنویاں'' میں شائع کیا ہے۔

10.5.7 بحری

ان کا نام سید محمود اور لقب و تخلص بحری تھا۔بحری قصبہ گوگی کے باشندے تھے جو سگر (نصرت آباد) کے مضافات میں واقع ہے۔ان کے والد بحر الدین گوگی کے قاضی تھے اور ''قاضی دریا'' کے نام سے مشہور تھے۔بحری کے والد شاہ برہان الدین جانمؒ کے خانوادے میں مرید تھے۔قاضی محمود بحری کو شیخ محمد باقر عرف منجن بحری سے نسبت و ارادت حاصل تھی۔1095ھ میں بحری گوگی سے بیجاپور گئے۔جہاں سکندر عادل شاہ ان کا معتقد تھا۔بیجاپور میں آئے

اسے دو سال ہوئے تھے کہ مغلوں نے بیجاپور پر قبضہ کرلیا۔ بحری نے بیجاپور سے نکل کر حیدرآباد کا رخ کیا۔ سفر کے دوران رہزنوں نے ان کا سارا اسباب لوٹ لیا جس میں ان کا ذخیرۂ سخن بھی تھا جو پچاس ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ حیدرآباد میں بحری دو سال ہی رہنے پائے تھے کہ اورنگ زیب نے گولکنڈہ پر بھی قبضہ کرلیا۔ زوال گولکنڈہ کے بعد وہ مدراس کی طرف نکل پڑے۔ (افسر صدیقی، مخطوطات انجمن جلد چہارم صفحہ 41) 1100ھ میں بحری اپنے پیرومرشد کے آستانے میں گوشہ گیر ہوگئے۔ (سخاوت مرزا، مقدمہ ''من لگن'' صفحہ 23) قاضی محمود بحری نے طویل عمر پائی 1130ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ بحری کی تین اہم تصانیف ہیں (1) مثنوی من لگن (2) بنگاب نامہ (3) دیوان غزلیات۔

''من لگن''، بحری کی سب سے مقبول مثنوی ہے۔ اس کا موضوع عرفان وتصوف ہے۔ یہ مثنوی انھوں نے 1112ھ میں تصنیف کی۔ من لگن اٹھارہ سو سے زائد اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں (45) ابواب ہیں۔ عنوانات فارسی میں ہیں۔ ابتدا میں حمد ونعت، بیان معراج، منقبت خلفائے اربعہ اور منقبت پیرومرشد کے بعد اورنگ زیب کی توصیف ہے۔ پھر سبب تصنیف اور شکایت روزگار کے ابواب ہیں۔ مثنوی میں بحری نے طلب حق، فضیلت انسان، کیفیت موجودات، وجود ملکوتی، منزل ذات، روح مطلق، اسرار دل وانفس، نبوت وولایت سرودسماع اور عشق وغیرہ جیسے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ من لگن کی زبان نہایت ادق اور مضامین نہایت دقیق ہیں۔ مریدوں کے اصرار پر بحری نے اس کے منتخب مضامین کا فارسی میں ترجمہ کیا جس کا نام ''عروس عرفاں'' ہے۔ 1955ء میں سخاوت مرزا نے مثنوی من لگن کو مرتب کر کے شائع کیا۔

''بنگاب نامہ''، بحری کی ایک اور تصنیف ہے جس میں انھوں نے تصوف وطریقت کے مسائل کے اظہار کے لیے بھنگ سے کنایہ کیا ہے۔ یہ نظم بارہ بندوں پر، مشتمل ہے۔ جنھیں جام کا عنوان دیا گیا ہے ہر جام میں بارہ اشعار ہیں۔ بحری کا دیوان (113) غزلیات پر مشتمل ہے۔ بحری کی غزلیات میں مجازی رنگ غالب ہے۔ ایسے اشعار بہت کم ہیں جن میں عشق حقیقی کی واردات بیان کی گئی ہو۔ بحری کا محبوب ارضی مخلوق ہے۔ ان کی غزلوں میں معشوق کے رخسار کی سرخی، چہرے کی آب وتاب، لبوں کی مٹھاس، جذبات کی آنچ اور جسم کی مہک صاف محسوس ہوتی ہے۔ 1939ء میں ڈاکٹر حفیظ سید نے کلیات بحری مرتب کر کے شائع کروایا جس میں غزلوں کے علاوہ بنگاب نامہ بھی شامل ہے۔

عادل شاہی دور، دکنی شعروادب کا سنہری دور تھا۔ اس عہد کے بے شمار شعرا ادبا پیدا ہوئے لیکن ان میں سے بہت کم کی تصانیف محفوظ ہیں۔ گزشتہ صفحات میں عادل شاہی دور کے اہم شعراوادبا کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اس دور کے دیگر نسبتاً کم اہم شعرا کے نام اور ان کے کارنامے اس طرح ہیں

امینؔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کا شاعر تھا 1048ھ میں اس نے ایک مثنوی ''بہرام وبانوے حسن'' لکھنا شروع کیا لیکن مکمل نہ کرسکا اس کے انتقال کے بعد ایک دوسرے شاعر دولتؔ نے 1050ھ میں اس ادھوری مثنوی کو مکمل کیا۔

شاہ داول نے جو برہان الدین جانم کے خلیفہ تھے ''کشف الوجود''۔ ''کشف الانوار''۔ ''چہار شہادت'' اور ''ناری نامہ'' جیسی عارفانہ مثنویاں لکھیں جانم ہی کے ایک اور خلیفہ شیخ محمود خوش دہاں سے ایک نثری رسالے کے علاوہ کئی مثنویاں جیسے ''وجودیہ''۔ ''علم الحیات''۔ ''انصاف الحق''۔ ''مقصود محمود'' اور ''نکتہ راز ونیاز'' وغیرہ یادگار ہیں۔ علیؔ حتمی اور ایاغیؔ علی عادہ شاہ ثانی کے دور کے مذہبی شعرا ہیں۔ اول الذکر نے ''پند دلبند'' کے نام سے اور آخر الذکر نے نجات نامہ (1080ء) کے نام سے دو مثنویاں لکھی ہیں۔ جنھیں ڈاکٹر محمد علی اثر نے مرتب کر کے اپنی کتاب ''دکنی کی تین مثنویاں'' میں شائع کردیا ہے۔ اسی دور کے ایک صوفی شاعر قادر لنگا کوتال تھے جو امین الدین اعلیٰ کے مرید وخلیفہ تھے انھوں نے ایک مثنوی ''معجزہ خاتون جنت'' کے علاوہ متعدد غزلیں اور حقیقت گیت لکھے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ کا کلیات کس کس نے مرتب کیا؟
2. نصرتی کی تصانیف کے نام بتایئے۔
3. امین الدین اعلیٰ کے والد اور دادا کون تھے؟
4. معظمؔ کی مثنویوں کے نام بتایئے۔
5. ہاشمیؔ کی اہم مثنوی کون سی ہے؟
6. مرزا نے کس صنف میں کمال حاصل کیا؟

10.6 خلاصہ

عادل شاہی دور دکن کی تاریخ میں ایک خاص امتیاز اور اہمیت کا حامل ہے۔ 895ھ سے 1098ھ تک اس خاندان کے نو حکمرانوں نے مملکت بیجا پور پر نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ عادل شاہی حکمران علم و ادب اور فنون لطیفہ کے نہایت شائق تھے۔ انھوں نے علما، فضلا، شعرا، ادبا اور دیگر اہل ہنر کی بڑی قدر دانی اور سرپرستی کی۔ بیجاپور میں ان کی بنوائی ہوئی کئی عمارتیں، محلات، فصیل، شہر، برج، مسجدیں، مقبرے اور کنویں وغیرہ آج بھی محفوظ ہیں اور عادل شاہوں کی عظمت رفتہ کی یادگار ہیں۔ عادل شاہی حکمران نہایت منصف مزاج اور رعایا پرور واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے بیجاپور میں ایک گنگا جمنی کلچر کو فروغ دیا۔ عادل شاہی حکومت میں دکنی زبان اور شعر و ادب کو بے مثال ترقی ہوئی۔ بیجاپور میں شاعری کی تمام اصناف پر توجہ کی گئی لیکن مثنوی اس دور کی سب سے مقبول صنف تھی۔ میراں جی شمس العشاق اور برہان الدین جانمؔ کے ہاں بیشتر نظمیں ہندوی وزن میں پائی جاتی ہیں بعد میں فارسی اصناف اور بحروں کا چلن شروع ہوا۔ عادل شاہی شعرا نے طبع زاد مثنویاں بھی لکھیں اور فارسی سے ترجمہ بھی کیا۔ طبع زاد مثنویوں میں ''چندر بدن و مہیار'' (مقیمی) ''قصہ بے نظیر'' (صنعتی) ''میزبانی نامہ'' (حسن شوقی) ''گلشن عشق'' (نصرتی) اور ''یوسف زلیخا'' (ہاشمی) اہم ہیں۔ فارسی سے ترجمہ کی ہوئی مثنویوں میں ''جنت سنگھار'' (ملک خوشنود) ''خاور نامہ'' (رستمی) اور ''بہرام و بانو ے حسن'' (دولت وامین) اہم ہیں۔ موضوعات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس دور میں مذہبی، صوفیانہ، رزمیہ، بزمیہ اور تاریخی ہر قسم کی مثنویاں لکھی گئیں۔ میراں جی شمس العشاق کی نظمیں ''خوش نامہ''۔ ''خوش نغز''۔ ''شہادت التحقیق'' جانمؔ کی نظمیں ''وصیت الہادی''۔ ''منفعت الایمان''۔ ''بشارت الذکر'' اور مثنوی ''ارشاد نامہ'' شاہ امین الدین اعلیٰ کی مثنویاں ''رموز السالکین''۔ ''قربیہ'' اور ''محب نامہ''، معظم کی مثنویاں ''شجرۃ الاتقیاء''۔ ''گلزار چشت''۔ ''ساقی نامہ''۔ ''مفتاح الاسرار'' اور بحری کی مثنوی ''من لگن'' صوفیانہ مثنویاں ہیں جن میں تصوف و طریقت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

رزمیہ اور تاریخی مثنویوں میں ''ابراہیم نامہ'' (عبدلؔ) ''فتح نامہ نظام شاہ'' و ''میزبانی نامہ'' (حسن شوقی) ''خاور نامہ'' (رستمی) ''علی نامہ''۔ ''تاریخ اسکندری'' (نصرتی) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ عشقیہ مثنویوں میں ''چندر بدن و مہیار''۔ ''گلشن عشق'' اور ''یوسف زلیخا'' اہم ہیں۔ مثنویوں سے قطع نظر دیگر اصناف میں نصرتی اور علی عادل شاہ ثانی شاہی کے قصیدے فنی اعتبار سے اہم ہیں۔ حسن شوقی، نصرتی اور شاہی اور بحری کی غزلیں تغزل کی تمام خصوصیات کی حامل ہیں۔ اسی دور میں مرزا جیسا دکنی کے سب سے بڑے مرثیہ نگار کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ مرزا کے علاوہ تقریباً تمام عادل شاہی شعرا نے بھی مرثیے لکھے ہیں۔ نصرتی، شاہی اور بعض دیگر شعرا نے رباعی میں بھی طبع آزمائی کی۔ ابتدائی دور میں ہندوی گیتوں کا بھی رواج رہا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی ''کتاب نورس'' موسیقی کے راگوں پر مبنی گیتوں پر مشتمل ہے۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی کے کلیات میں بھی ایسے گیت ملتے ہیں۔ دیگر متروک اصناف میں برہنی، حقیقت گیت، سہیلا اور سی حرفی صوفی شعراء میں مقبول رہیں۔ ان کے نمونے جانمؔ، اعلیٰ، شاہی، قادر اور معظم کے ہاں ملتے ہیں۔

عادل شاہی دور میں نثر پر بھی توجہ کی گئی۔ دکنی میں نثر کا پہلا رسالہ ''کلمۃ الحقائق'' برہان الدین جانمؔ نے اسی دور میں لکھا۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بعض اور نثری رسائل بھی لکھے۔ نثر کی روایت کو آگے بڑھانے میں جانم کے خلیفہ شیخ محمود خوش دہاں اور امین الدین اعلیٰ کے نثری رسائل نے بھی اہم خدمت انجام دی۔

10.7 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے۔

1. نصرتی کی تصانیف کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔
2. دبستان بیجاپور کے کسی تین غزل گو شعرا کا تعارف کرائیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. عبدلؔ کی مثنوی ''ابراہیم نامہ'' کی خوبیاں بیان کیجیے۔
2. بیجاپور میں دکنی شعر و ادب کے ارتقا کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر بیان کیجیے۔

3. میراں جی شمس العشاق کی تصانیف کا جائزہ لیجیے۔
4. علی عادل شاہ شاہی کی شاعری پر مختصر نوٹ لکھیے۔

10.8 فرہنگ

الفاظ	= معنی	الفاظ	= معنی	الفاظ	= معنی
ارباب کمال	= کمال رکھنے والے	فیاضی	= سخاوت	داودہش	= بخشش، فیاضی
فروغ	= روشنی، رونق	آشنا	= واقف	صناعی	= ہنرمندی، کاری گری
جلیل القدر	= نہایت معظم، بڑی شان والا	عنان	= لگام	تاخت	= لوٹ، تباہی، حملہ
مرفہ الحال	= خوش حال، آسودہ	یورش	= حملہ، فساد	تزک واحتشام	= شان وشوکت
حصار	= فصیل	ملحد	= خدا کو نہ ماننے والا	اکتساب	= کمانا، ذاتی محنت سے حاصل کرنا
بصیرت	= بینائی، آگاہی	انتساب	= منسوب کرنا		
قرائن	= قرینہ کی جمع (اندازہ، صورت)	حربی	= جنگ سے متعلق	تتبع	= تقلید

گوہر شب چراغ = ایک قسم کا لعل جو رات کو چراغ کی طرح چمکتا ہے۔ جدت طرازی = تازگی، نیاپن

ناپید	= معدوم، غائب	بدرجہ اتم	= مکمل درجے کا	دوازدہ	= بارہ
ائمہ	= امام کی جمع	غنائیت	= موسیقیت	انحطاط	= کم ہونا، گھٹاؤ

ہم مشرب = ایک ہی مسلک کا، ایک ہی طریقے کا

10.9 سفارش کردہ کتابیں

1.	ڈاکٹر جمیل جالبی	تاریخ ادب اردو (جلد اول)
2.	پروفیسر سیدہ جعفر و پروفیسر گیان چند جین	تاریخ ادب اردو 1700ء تک جلد دوم وسوم
3.	کرناٹک اردو اکیڈمی	تاریخ ادب اردو کرناٹک
4.	پروفیسر محمد علی اثر	دکنی غزل کی نشوونما
5.	پروفیسر سیدہ جعفر	دکنی میں قصیدے کی روایت
6.	ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس	دکنی ادب کے مطالعہ کی جہتیں
7.	ڈاکٹر جمیل جالبی	ادبی تحقیق
8.	پروفیسر اشرف رفیع	دکنی مثنویوں کا انتخاب
9.	پروفیسر محمد علی اثر	دکنی غزلوں کا انتخاب
10.	پروفیسر محمد علی اثر	دکنی کی تین مثنویاں
11.	پروفیسر محمد علی اثر	دکنی کی شاعری۔ تحقیق وتنقید

اکائی: 11 ولؔی اور سراؔج کے عہد میں اُردو شاعری

ساخت

11.1 تمہید

11.2 ولؔی اورنگ آبادی

11.3 قاضی محمود بحرؔی

11.4 سید محمد فراقؔی

11.5 داؤدؔ اورنگ آبادی

11.6 سراؔج اورنگ آبادی

11.7 دیگر شعرا

11.7.1 شاؔہ قاسم اورنگ آبادی

11.7.2 عاؔجز اورنگ آبادی

11.7.3 وجدؔی کرنولی

11.8 خلاصہ

11.9 نمونۂ امتحانی سوالات

11.10 فرہنگ

11.11 سفارش کردہ کتابیں

11.1 تمہید

مغل فرماں روا اورنگ زیب عالمگیر نے بیجاپور اور گولکنڈہ کو علی الترتیب 1096ھ/ 1686ء اور 1097ھ /1687ء میں فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اورنگ زیب کی فتحِ دکن اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک اہم واقعے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ قطب شاہی اور عادل شاہی حکمرانوں کی سرپرستی میں دکن میں اردو زبان و ادب نے ترقی کے جو مراحل تیز رفتاری سے طے کیے تھے ان دو عظیم الشان سلطنتوں کی تباہی نے کے نشو ونما اور ارتقا میں ایک بڑا رخنہ ڈال دیا۔

1686-87ء کے واقعات اردو زبان و ادب کے فروغ کے سلسلے میں بڑے تباہ کن نتائج کے حامل ہیں۔ بہمنی عہد اور پھر اس کے بعد قطب شاہی اور عادل شاہی ادوار میں اردو زبان ترقی کر کے ایک علمی اور ادبی زبان کے درجے تک پہنچ چکی تھی۔ خصوصاً سترہویں صدی عیسوی میں جو ادب گولکنڈہ اور بیجاپور میں تخلیق پایا وہ شعر و ادب کے نقطۂ نظر سے اعلیٰ معیارات کا حامل ہے۔ لیکن ان دو سلطنتوں کا زوال ایک ایسے انقلاب کی صورت میں رونما ہوا جس نے سرزمین دکن کی تہذیب و تمدن اور علم و فن کی بنیادیں ہلا دیں۔ 1687ء کے بعد دکن کے شاعروں اور ادیبوں کا قدردان کوئی نہ تھا۔ مغل سلاطین یا اہل شمال دکنی زبان سے بڑی حد تک ناآشنا تھے۔ دوسری طرف وہ سلاطین یا امرا جنھوں نے ایک طویل عرصے تک دکن کے فن کاروں کی سرپرستی اور قدر افزائی کی تھی خود بے سہارا ہو گئے تھے۔

جہاں تک بیجاپور کا تعلق ہے، یہ شہر جنوبی ہند کا ایک عظیم ثقافتی اور تمدنی مرکز بن چکا تھا۔ 1686ء کے بعد ہمیشہ کے لیے گوشۂ گم نامی میں چلا گیا اور یہاں کے شعرا و ادبا ایک ایک کر کے دور دراز کے مقامات جیسے کڑپہ، کرنول، ویلور، آرکاٹ اور دوسرے علاقوں کو منتقل ہو گئے۔ لیکن گولکنڈہ یا حیدرآباد کی صورتِ حال اس سے مختلف تھی۔ 1687ء میں گولکنڈہ کو فتح کرنے کے بعد عالمگیر نے اورنگ آباد کو اپنا صدر مقام بنایا تھا۔ اس لیے شعری، تمدنی اور ادبی

ذوق کی وہ چنگاریاں جو خاکِ دکن میں موجود تھیں، ان میں سے کچھ تو شعلہ بننے کی خاطر اورنگ آباد پہنچ گئیں اور کچھ اِدھر اُدھر بکھری رہیں۔ اس پُر آشوب زمانے میں بھی سرزمین دکن، شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کو برابر پیدا کرتی رہی۔ قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین نے اردو شعر و ادب کے ارتقا کا پہیہ اس قدر تیز رفتاری سے گھمایا تھا کہ 1687ء کے بعد بھی اس کی رفتار کو بہ آسانی روکا نہ جاسکا۔ دکنی شاعری کی عظیم روایات اور رجحانات فیروز، محمود، خیالی، محمد قلی، وجہی، غواصی، ابن نشاطی، مقیمی، حسن شوقی، علی عادل شاہ، شاہی، نصرتی اور ہاشمی کی وساطت سے ولی اور سراج تک پہنچتے ہیں۔ ان روایات کے اثرات کچھ کچھ نہ صرف ولی اور سراج کے معاصرین میں موجود ہیں بلکہ ان کی بازگشت شمالی ہند کے دورِ اوّل کے شعرا کے کلام میں بھی سنائی دیتی ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کی فتح دکن نے سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر سے ایک طرف شمال اور جنوب کو گھر آنگن بنا دیا تو دوسری طرف لسانی اور ادبی نقطۂ نظر سے ولی اور اس کے معاصرین نے تدریجی طور پر فارسی زبان و اسالیب کے اثرات قبول کیے اور اس طرح اردو شعر و ادب، گولکنڈہ و بیجاپور کے حدود سے نکل کر پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ولی کے مقلدین اور مدّاح صرف گجرات و دکن ہی میں نہیں بلکہ آرکاٹ، ویلور اور کڑپہ کرنول میں بھی نظر آتے ہیں۔ آئندہ صفحات میں عہدِ ولی اور سراج کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

11.2 ولی اورنگ آبادی

ولی محمد ولی، دکنی اردو کا ایک قد آور اور باکمال سخنور ہے۔ اس کے مقام پیدائش کے بارے میں محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس شاعر نے آنے والے زمانے میں اردو شعر و سخن کے دھارے کو موڑنے میں جو عظیم رول انجام دیا ہے اس کی وجہ سے اردو زبان و ادب کے بعض محققین نے اس کو اپنے مخصوص صوبوں سے منسوب کرنے کی کوشش کی۔ ولی کے بچپن کے واقعاتِ حیات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ لڑکپن اور نوجوانی کے زمانے میں اس نے کچھ عرصے گجرات اور خاص طور پر احمد آباد میں قیام کیا تھا۔ اس واقعے کا ذکر اس کے کلام میں ملتا ہے۔ شہر سورت کی تعریف میں ایک مثنوی بھی ولی کے دیوان میں موجود ہے۔ احمد آباد اور شہر سورت کے حوالوں کی وجہ سے گجرات کے بعض اہل علم نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ ولی کا وطن گجرات ہے اور نوجوانی کے زمانے میں وہ کسی وقت اورنگ آباد آئے اور یہیں بس گئے۔ اس کے برخلاف زمانہ قدیم کے مورخین، محققین اور تذکرہ نگاروں سے لے کر ڈاکٹر جمیل جالبی تک سبھی اس امر پر متفق ہیں کہ ولی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن اسی شہر میں گزرا۔ اگرچہ نوجوانی کے زمانے میں انھوں نے گجرات کا سفر کیا اور کچھ عرصے تک شاہ وجیہ الدین گجراتی کی خانقاہ میں قیام ضرور کیا ہوگا۔

ولی کے مقام پیدائش کے سلسلے میں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ ''تاریخ احمدی'' (مصنفہ مٹھن لال 1737ء) اور ''تحفۃ الکرام'' احمد آباد کی ایسی تاریخیں ہیں جن میں ولی کا نام نہیں ملتا۔ ولی ایک جہاں گرد شاعر تھا اس کے شوق سیاحت کی شہادت کم و بیش تمام تذکرے دیتے ہیں۔ اس نے نہ صرف سید ابوالمعالی کی معیت میں دہلی کا سفر کیا تھا بلکہ جنوبی ہند کے کئی شہروں کی بھی سیاحت کی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے حج بھی کیا اور زیارتِ مدینہ منوّرہ کی سعادت بھی حاصل کی۔ (ولی از نورالحسن ہاشمی۔ صفحہ 13)

احسن مارہروی نے لکھا ہے کہ ولی 1079ھ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ مولوی عبدالحق نے کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے ''دیوان ولی'' کے ایک مخطوطے میں درج قطعۂ تاریخ کو بنیاد بنا کر ولی کی تاریخ وفات 1119ھ/1707ء بتائی تھی اور ایک عرصے تک اسے مستند سمجھا جاتا رہا۔ حال ہی میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے مولوی صاحب کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے 1133ھ/1720ء تک ولی کے بقید حیات رہنے اور 1138ھ/1725ء سے پہلے کسی وقت وفات پانے کی اطلاع دی ہے۔ (تاریخ ادب اردو (جلد اول) ص 557)

ولی کی شاعری کی فضا بنیادی طور پر دکنی شاعری کی فضا ہے اس نے نہ صرف دکنی شاعری کی روایات اور رجحانات کی پاسداری کی ہے بلکہ دکنی کے عظیم المرتبت شاعروں سے استفادہ کرتے ہوئے ان زمینوں میں بھی غزلیں کہی ہیں جن میں محمد قلی، غواصی، حسن شوقی، نصرتی، شاہی، شاہ سلطان اور دوسرے شاعروں نے دادِ سخن دی ہے۔ چند شعر دیکھیے:

محمد قلی: خبر لیا یا ہے ہد ہد میرے تئیں اس یار جانی کا — خوشی کا وقت ہے ظاہر کروں راز نہانی کا

ولی: الٰہی رکھ مجھے تو خاک پا اہل معانی کا — کہ کھلتا ہے اسی صحبت سے نسخہ نکتہ دانی کا

غواصی: عاشق ہے جن تج لال کا اس مال و دھن سوں کیا غرض ہے کام جس کوں روح سوں اس کوں بدن سوں کیا غرض

ولی: تجھ زلف کے بیتاب کوں مشک ختن سوں کیا غرض تجھ لعل کے مشتاق کوں کانِ یمن سوں کیا غرض

شاہی: ساری رین تیرا مدن مج طبع میں بھرپور ہے تج صبح مکہ کے سامنے دیپک سدا مخمور ہے

ولی تشنہ لب کوں تشنگی مئے کی نہیں ناسور ہے پنبۂ مینا اسے جیوں مرہم کافور ہے

شاہ سلطان: صد سال، وصالِ حق بن جیونا سوجیوں مگس ہے یک دم خدا تھے ہل مل تل جیونا سو بس ہے

ولی ہر دل ربا کوں ہرگز دیتا نہیں ہوں دل میں دل بستگی کوں میری وہ بے مثال بس ہے

قدیم دکنی شعرا کی غزلوں پر غزلیں کہہ کر ولی نے ان سے نہ صرف اثر پذیری کا ثبوت دیا ہے بلکہ دکنی شاعری کی روایات اور رجحانات کا احترام بھی کیا ہے۔ ولی کے ابتدائی دور کے کلام میں دکنی شاعری کے گہرے اثرات ہیں۔ اس کے اس دور کے کلام کو محمد قلی، غواصی، شاہی، حسن شوقی، شاہ سلطان کے کلام کے ساتھ رکھا جائے تو ولی کی غزلوں کو دکنی کے دوسرے شعرا کی غزلوں سے الگ کرنا دشوار ہوگا۔ اس قبیل کے چند شعر دیکھیے:

سجن ہے سانولا سج کا سجیلا کٹیلا ہور ہٹیلا لٹ پٹا ہے

ترا قد یو رشکِ قیامت اچھو قیامت تلک یو سلامت اچھو

تجھ در کی طرف سندر آتا ہے ولی دائم مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

ولی کے کلام کی نمایاں خصوصیت اظہار بیان کی سادگی اور حقیقت نگاری کا رجحان ہے۔ اس کی غزلوں میں ہندوستانی تہذیب کی روح رچ بس گئی ہے۔ تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحوں کے علاوہ اس کے تخیل پر بھی ہندوستانیت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اس نے اپنے کلام میں نہ صرف ہندوستانی موسموں، پھلوں، پھولوں، باغوں، پرندوں، جانوروں، دریاوں، عیدوں، تہواروں وغیرہ کا جا بجا ذکر کیا ہے بلکہ ہندوستانی ذوق کے تقاضوں کا احترام بھی ملحوظ رکھا ہے۔ چند شعر دیکھیے۔

کوچۂ یار عین کاسی ہے جو گئی دل وہاں کا باسی ہے

اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خال ہندوے ہردوار باسی ہے

زلف تیری ہے موج جمنا کی تل نزک اس کے جیوں سنیاسی ہے

گرچہ لچھمن ترا ہے رام ولے اے سجن تو کسی کا رام نہیں

جودھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سوں اے صنم ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج

قائم چاند پوری کے بیان کے مطابق ولی نے 1112ھ /1700ء میں شمالی ہند کا سفر کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ شمالی ہند میں فارسی کا سکہ چل رہا تھا۔ حکومت اور سلطنت کی زبان فارسی تھی چوں کہ حکمرانوں کا رجحان فارسی کی طرف زیادہ تھا اور فارسی ہی کی سرپرستی اور قدر و منزلت کی جاتی تھی اس لیے شاعروں اور ادیبوں کا فارسی کی طرف جھکاؤ ایک فطری بات تھی۔ ولی کے سفرِ دہلی سے پہلے بھی اگرچہ بعض شاعروں نے اردو میں شعر گوئی کی کوشش کی تھی لیکن بنیادی طور پر ان میں سے بیشتر حضرات فارسی ہی کے شاعر تھے جو صرف منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے اردو میں کبھی کبھار شعر موزوں کر لیا کرتے تھے۔ شمالی ہند کے فارسی زدہ ماحول میں جب ولی نے اپنی اردو غزلیں سنائیں تو اہل شمال کو اس بات کا احساس ہوا کہ اردو زبان میں (جسے وہ ایک کم مایہ زبان سمجھتے تھے) اتنی گہرائی، گیرائی اور قوت اظہار موجود ہے کہ اس میں ادب بھی تخلیق کیا جا سکتا ہے۔

ولی ایک طرف دکنی زبان کی عظیم شعری روایات کا علمبردار ہے تو دوسری طرف اس کے کلام میں سفرِ دہلی کے اثرات بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔ وہ اردو شاعری کے ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں ایک طرف اردوئے قدیم کی عظیم شاہراہ اختتام کو پہنچتی ہے تو دوسری طرف شمالی ہند میں اردو شاعری کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔

قیام دہلی کے زمانے میں ولی کی ملاقات اپنے زمانے کے مشہور عالم اور شاعر شیخ سعد اللہ گلشن (متوفی 1141ھ/1728ء) سے ہوئی۔ شاہ گلشن نے ولی کی توجہ فارسی کے موضوعات شعر اور اسالیب کی طرف مبذول کرائی۔ اور انھیں اپنے کلام کو فارسی شاعری کی روایات کے سرچشمے سے سیراب کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ سفر دہلی اور شاہ گلشن سے ملاقات کا نقش ولی کے تخلیقی شعور پر دھیرے دھیرے گہرا ہوتا گیا اور بقول مصحفی جب 1132ھ/1719ء میں ان کا دیوان دلی پہنچا تو شمالی ہند کی فضائیں ولی کے نغموں سے گونجنے لگیں اور ان کے شعر بچے بچے کی زبان پر جاری ہو گئے۔

ولی زبان کا رمز شناس اور اصلاح زبان کا بہت بڑا محرک تھا۔ اس نے فارسی شاعری کے موضوعات و مضامین، تشبیہات و استعارات، روزمرہ و محاورے، تراکیب و ضرب الامثال سے دل کھول کر استفادہ کیا۔ فارسی کے بیسیوں اشعار کا بڑی خوبصورتی اور فنی مہارت سے اردو میں ترجمہ کیا اور اردو لفظیات کے خزانے کو وسعت بخشی۔ چند تراکیب دیکھیے ''شعلۂ آواز''، ''دیدۂ حیراں''، ''مسندِ گل''، ''حسنِ شور انگیز''، ''شعاعِ آفتابی''، ''رشکِ ماہِ کنعانی''، ''خوبیِ اعجازِ حسن''، ''سلطنتِ ملکِ قناعت''، ''مطربِ نغمہ ساز''

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ولی کے مقام پیدائش کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
2. ولی نے دکنی اردو کے کن کن شاعروں سے اثر قبول کیا؟
3. ولی کے سفرِ دہلی کے بعد کی شاعری پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. ولی کی شاعری کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

11.3 قاضی محمود بحری

بحری، ولی دکنی کے بزرگ ہم عصر شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا نام اور لقب سید محمود تھا اور وہ گوگی (تعلقہ شاہ پور ضلع گلبرگہ) کے متوطن تھے۔ ان کے والد کا نام سید بحر الدین تھا اور لقب قاضی دریا تھا۔ ان کا خانوادہ سبز پوش قادری کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ بحری 1022ھ میں پیدا ہوئے۔ اور انھوں نے 1130ھ میں وفات پائی۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 108 سال تھی۔ قاضی محمود بحری کو قادریہ اور چشتیہ دونوں سلاسل میں بیعت حاصل تھی۔ قادریہ سلسلے میں وہ شاہ محمد باقر کے ارادت مند اور مرید تھے جن کی مدح میں انھوں نے اپنی مثنوی ''من لگن'' میں ایک باب مختص کیا ہے۔ چشتیہ سلسلے میں وہ اپنے والد سید بحر الدین سے ارادت و اجازت رکھتے تھے جنھیں خانوادہ شاہ برہان الدین جانم میں بیعت حاصل تھی۔

بحری ایک پُر گو شاعر تھے۔ ان کی قادر الکلامی کا یہ عالم تھا کہ 1097ھ 1687ء تک جب کہ ان کی عمر 75 سال تھی اردو اور فارسی میں پچاس ہزار اشعار کہہ چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ وہ گوگی سے ترک وطن کر کے بیجاپور میں مقیم تھے۔ اورنگ زیب کی فوجوں نے جب بیجاپور پر قبضہ کیا تو بحری نے 1097ھ/1687ء میں حیدرآباد کا رخ کیا۔ دوران سفر ڈاکوؤں نے نہ صرف ان کا مال و اسباب لوٹ لیا بلکہ سرمایہ سخن بھی ضائع کر دیا۔ بحری نے حیدرآباد میں تقریباً دو سال تک قیام کیا اور جب حیدرآباد بھی اورنگ زیب عالمگیر کی قلمرو میں شامل ہو گیا تو وہاں سے وہ مدراس منتقل ہو گئے اور خود ان کے بیان کے مطابق 1100ھ میں وہ اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ محمد باقر کے آستانے میں گوشہ گیر ہو گئے۔ (من لگن از سخاوت مرزا۔ صفحہ 32)

بحری نے ایک دیوان کے علاوہ دو مثنویاں ''بنگاب نامہ'' اور ''من لگن'' اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کی چند منظومات کا پتا چلتا ہے۔ جنھیں ڈاکٹر حفیظ سید نے مرتب کر کے ''کلیات بحری'' میں یکجا کر دیا ہے۔ جہاں تک بحری کے دیوان کا تعلق ہے اس میں ایک سو تیرہ 113 غزلیں شامل ہیں۔ بحری کی مثنویوں میں متصوفانہ رنگ کا غلبہ ہے۔ جن کے مطالعے سے وہ ایک عارف کامل کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس ان کی غزلوں میں عشق مجازی کی کیفیات کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان کے خیال میں مکتبِ مجازی میں ''عشق'' کے آگے زانوے ادب تہہ کرنے سے عشق حقیقی کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔

منجہ اس مکتب مجازی میں جو عشق استاد نہ ہوتا　　تو میرے دل سوں کثرت کا سبق برباد نہ ہوتا
بحریا سر پاوں کیوں کرتا حقیقت کا سو بول　　گرنا کھڑتا سر پہ تیرے یو مجازی مار کا (معرکہ)

بحری کے کلام میں ایسے اشعار کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے جن میں روحانی کیفیات کی عکاسی یا عشق حقیقی کا بیان ہوا ہے۔ان کی بیشتر غزلوں میں محبوب کے حسن و جمال، خدوخال، رفتار و گفتار، چشم و ابرو اور لب و رخسار کی تعریف و توصیف ملتی ہے۔

دیکھ تیرے او رخ رنگیلے لال　　پھول ہوتے ہیں پھول کھل خوش حال
جے مکھ ہے آفتاب اجالا سواو تیرا　　مستک پُنم کے چاند سوں ہالا سواو تیرا
یک زلف ہور ہزار کنڈالاں سوہے تجھے　　یک چک ہوراس میں لاک ہے چالا سو اوتیرا
جانے نہ دیا دھن لک اس ہٹ نہ کئیں تو کیا کیئں　　ایسے رقیب اوپر پھٹ پھٹ نہ کئیں تو کیا کئیں

آخرالذکر شعر کی زمین میں ولی نے بھی غزل کہی ہے:

دلبر ادھر کوں تیرے کوثر نہ کوں تو کیا کوں　　میٹھے ترے لباں کوں شکر نہ کوں تو کیا کوں

ڈاکٹر جمیل جالبی بحری کی غزل گوئی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بحری کی غزلیں اسی روایت کی ترجمانی کر رہی ہیں۔جس پر شروع میں ولی چلے تھے۔اگر بحری کی غزلوں کو ولی کے ابتدائی دور کے کلام میں ملا دیا جائے تو پہچاننا مشکل ہوگا۔اسی لیے بحری کی چند غزلیں ولی سے بھی منسوب ہوگئی ہیں۔(تاریخ ادب اردو۔جلد اول صفحہ 522)

مثنوی ''بگاب نامہ'' 144 ابیات پر مشتمل ہے۔جسے بحری نے 12 بند میں تقسیم کیا ہے۔ہر بند میں 12 ابیات ہیں جسے شاعر نے جام کا نام دیا ہے اور ہر جام میں بنگ (بھنگ) یعنی شراب کی تعریف اس انداز سے کی گئی ہے کہ اس سے تصوف و معرفت کے اسرار کی توضیح و تشریح ہوتی ہے۔

''من لگن'' تصوف و عرفان کے موضوع پر بحری کی سب سے مشہور مثنوی ہے۔یہ مثنوی 1212ھ کی تصنیف ہے جب کہ بحری کی عمر 90 سال تھی۔1830 اشعار اور 45 ابواب پر مشتمل اس ضخیم مثنوی کو مولوی سخاوت مرزا نے 1955ء میں مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔من لگن کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد کے ابواب میں توحید باری۔نعت رسول مقبول ﷺ۔بیان معراج۔مدح خلفائے اربعہ۔منقبت پیر و مرشد (شیخ محمد باقر)۔توصیف بادشاہ دین پناہ اورنگ زیب عالم گیر۔سبب تصنیف اور شکایت روزگار کا بیان ہوا ہے۔تمام ابواب کو بحری نے فارسی عنوانات سے آراستہ کیا ہے۔آخری باب کا عنوان ''خاتمہ'' ہے۔دیگر 35 درمیانی ابواب میں مختلف متصوفانہ مسائل جیسے طلب حق۔فضیلت انسان۔کیفیت موجودات۔روح مطلق۔اسرار دل و نفس۔اسرار بے خودی۔سرود و سماع اور عشق وغیرہ زیر بحث آئے ہیں۔بحری نے سلوک و معرفت کے مختلف مسائل کی توضیح و تشریح کے سلسلے میں تشبیہ و استعارہ اور تمثیل و حکایت کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔

مثنوی من لگن کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے مشکل اور عسیر الفہم الفاظ کی ایک شرح سید شاہ اسمٰعیل قادری نے نواب شہامت جاہ بہادر کی فرمائش پر ''ارت من لگن'' کے عنوان سے لکھی تھی۔خود بحری نے بھی 1116ھ میں اپنے معتقدوں اور مریدوں کے اصرار پر اس کے بعض اہم موضوعات کا فارسی زبان میں ترجمہ کر کے اس کا نام ''عروس العرفان'' رکھا۔

بحری کی زبان بنیادی طور پر بیجاپوری دکنی ہے لیکن انھوں نے اپنی زبان کو ''ہندی'' اور ''ہندوی'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ

''بحری دکن کے ان شعرا میں شامل ہیں جنھوں نے اپنے سرپرست سلاطین قطبیہ و عادل شاہیہ کے زوال کے بعد بھی اپنے قدیم ذوق شعر و سخن کو جملہ لوازمات کے ساتھ عرصہ دراز تک باقی رکھا۔'' (تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول صفحہ 56)

بحری کی غزلوں میں کہیں کہیں ولی کی تحریک اصلاح زبان کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. بحری کے مقامِ پیدائش اوران کے والد کا نام بتائیے۔
2. بحری نے کتنی تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں؟
3. مثنوی ''من لگن'' کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
4. بحری کی غزل گوئی پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

11.4 سید محمد فراقی

فراقی دکنی اردو کے ان خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جن کی شہرت شمالی ہند تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ شمالی ہند کے متعدد تذکروں جیسے ''تذکرہ شعرائے اردو'' (میر حسن) ''مخزن نکات'' (قائم چاند پوری) ''مجموعہ نغز'' (قدرت اللہ قاسم) وغیرہ میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ قائم نے اپنے تذکرے (مخزن نکات) میں ذکر کیا ہے کہ فراقی نے محمد یار خاں صوبہ دار دہلی کے زمانے (1108ھ۔ 1114ھ) میں دہلی کا سفر کیا تھا (صفحہ 7)۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی فتح دکن کے بعد فراقی نے کچھ عرصے تک اورنگ آباد میں قیام کیا اور پھر جنوبی ہند پہنچ کر ویلور میں سکونت اختیار کر لی۔ (دکن میں اردو صفحہ 375) ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کا بیان ہے کہ فراقی نے فقیر اللہ آزاد اور ولی کے ساتھ اورنگ آباد سے نکل کر سورت' احمد آباد اور دلّی کا سفر کیا۔ (تذکرہ اردو مخطوطات (جلد چہارم) صفحہ 272)

ولی دکنی کے ایک شعر سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے فراقی کے ایک مصرع پر گرہ لگائی تھی۔

ولی مصرع فراقی کا پڑھوں تب جب کہ وہ ظالم
کمر سوں کھینچتا خنجر' چڑھاتا آستیں آوے

ولی نے اپنے کلام میں جہاں اپنے متعدد بے تکلف احباب کا تذکرہ کیا ہے وہیں اپنے شاعرانہ مرتبے کا فراقی سے تقابل کرتے ہوئے لکھا ہے:

ترے اشعار ایسے **نئیں** فراقی
کہ جس پر رشک آوے گا ولی کوں

موجودہ معلومات کی روشنی میں فراقی کی ایک ضخیم مثنوی ''مراۃ الحشر'' کے علاوہ اس کی دو نعتیں چند غزلیں اور بعض غزلوں کے چیدہ چیدہ اشعار دستیاب ہوئے ہیں۔ ''مراۃ الحشر'' تقریباً چار ہزار ابیات پر مشتمل ایک غیر مطبوعہ مثنوی ہے۔ جس کے مطالعے سے مثنوی کی تاریخ تصنیف' فراقی کے نام اور تخلص کے علاوہ اس کی تاریخ پیدائش پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

فراقی تخلص ہے میرا مدام — ولے اصل سید محمد ہے نام
کیا قصد تاریخ جب بولنا — یو اجمال تفصیل کر کھولنا
تو مجھ دل کیا اس وزا انتخاب — یو دیکھو جو ہے بابرکت کتاب

1132ھ

چونکہ فراقی نے یہ مثنوی 1132ھ میں بہ عمر 36 سال لکھی ہے اس لیے اس سے 1097ھ اس کی تاریخ پیدائش برآمد ہوتی ہے۔

''مراۃ الحشر'' میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے احوال قیامت بیان کیے گئے ہیں اور فراقی نے فارسی ''آخرت نامہ'' کو دکنی اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس مثنوی میں جیسا کہ فراقی نے مختلف ابواب میں واضح کیا ہے۔ نزع کی کیفیت ''بیان اہل قبور'' ''یوم حشر'' ''قیامت کی علامتیں''۔ دجال اور یاجوج ماجوج کی فتنہ انگیزی اور حضرت مہدی اور حضرت عیسیٰ کا ظہور' پل صراط اور جزا و سزا کی تفصیل بیان کی ہے۔

اس مثنوی کے علاوہ فراقؔ کی چند غزلوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جن میں مدحت رسول کے علاوہ عشق و محبت، فلسفہ و تصوف، درویشی و عزلت نشینی اور قناعت پسندی کے مضامین پیش کیے گئے ہیں۔ چند شعر دیکھیے۔

مدینے میں اگر پیدا ہوا ہوتا تو کیا ہوتا — محمدؐ کی گلی بھیتر فنا ہوتا تو کیا ہوتا
فقیراں باوجود دست و پا بے دست و پا اچھا — انوں سب کی نظر میں ان کی نظراں میں خدا اچھنا
میں جاں اچھوں مجھ دل کوں شوق اس گلبدن کا کھینچتا — بلبل کے دل کو دام بھا رشتہ چمن کا کھینچتا
مجے اے حسن کا ساقی لباں کا مئے پلاتا **نئیں** — ارے ظالم میں مرتا ہوں تجے کچہ رحم آتا **نئیں**

فراقؔ کی زبان اور موضوعات شاعری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''فراقی کی شاعری کی زبان ولیؔ کے دور اول کی شاعری کی زبان سے مزاجاً قریب ہے۔ غزلوں میں دو قسم کے موضوعات ملتے ہیں۔ ایک تو عشقیہ جس میں جذبات عشق، خواہش وصل، ہجر کی تڑپ، محبوب کی ہر ہر ادا پر جان و دل سے فریفتہ ہونے کا اظہار ملتا ہے اور دوسرا ناصحانہ ہے جس میں قناعت پر زور، ہوس و طمع سے نفرت، دشمن کو معاف کر دینے کی تلقین، درویشی، نیکی اور عزلت نشینی کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ (تاریخ ادب اردو جلد اول۔ صفحہ 560)

اپنی معلومات کی جانچ:

1. فراقؔ کا ذکر شمالی ہند کے کن تذکروں میں ملتا ہے؟
2. مثنوی ''مراۃ الحشر'' کے موضوع پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. فراقؔ کی غزلوں کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

11.5 داؤدؔ اورنگ آبادی

مرزا داؤدؔ بیگ نام داود تخلص۔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مرزا سلیمان تھا۔ داؤدؔ کے آبا و اجداد عہد عالمگیر میں بلخ سے اورنگ آباد آئے اور یہاں منصب بادشاہی سے معزز و مکرم ہوئے۔ داؤدؔ کی تاریخ پیدائش پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ داؤدؔ کو سراجؔ کا مد مقابل سمجھا جاتا تھا۔ سراج سے ان کی شاعرانہ چشمک بھی رہی ہے اور داود نے اپنے کلام میں خود کو ''ولی ثانی'' کہا ہے۔ اس لحاظ سے وہ غالباً سراج (پیدائش 1124ھ) سے عمر میں بڑے ہوں گے۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے شعر گوئی کی طرف راغب ہوئے اور فن شاعری میں انھوں نے کسی استاد کے آگے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا۔

مجھ کو کچھ علم نہیں ہے وہ خدا آپ علیم
شعر کہنا مجھے داؤدؔ خدا داد آیا

داؤد کے معاصرین میں یوں تو متعدد شعرا داد سخن دے رہے تھے لیکن سراج کے سوا وہ کسی اور کو اپنا مد مقابل نہیں سمجھتے تھے۔ اگرچہ داؤدؔ شاعرانہ کمال کے نقطہ نظر سے سراج کے مرتبے کو نہیں پہنچتے لیکن غالباً بلحاظ عمر اپنی بزرگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے اپنے کلام میں جگہ جگہ سراج پر چوٹ کی ہے:

جب سوں روشن ہے مجھ سخن کا چراغ — رشک ستیں سراج جلتا ہے
چرب زبانی نہ کر بزم سخن میں سراج — تیغ سیں گل گیر کی ورنہ کٹے گا سراج

داؤدؔ فن کارچوبی کے ماہر تھے۔ اسی رعایت سے سراجؔ نے بھی درج ذیل شعر میں ان پر چوٹ ہے۔

نہ بھول کسب قدیمی کو اپنے اے مرزا — وگرنہ بچہ کہیں کارچوب ہووے گا

داؤد کا شاعرانہ کمال یہی ہے کہ انھوں نے کلام ولی سے وسیع پیمانے پر استفادہ کیا ہے وہ کھلے دل سے ولی کی شاعری کے گن گاتے ہیں اور پیروی ولی کو باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ کئی اشعار میں انھوں نے خود کو ''ولی ثانی'' اور ولی کا مقلد کہا ہے:

علی کی ہے قسم سن شعر میرا — کہے عالم وؔلی ثانی یہی ہے
بعد از ولی ہوئے ہیں کئی شاعراں ولیکن — داؤؔد شعر تیرا مشہور ہے دکن میں
حق نے بعد از وؔلی مجھے داؤؔد — صوبۂ شاعری بحال کیا
کہتے ہیں سب اہل سخن اس شعر کوں سن کر — تجھ طبع میں داؤؔد وؔلی کا اثر آیا

داؤد اور نے وؔلی کی زمین میں بے شمار غزلیں کہی ہیں اور بعض غزلوں میں وؔلی کے مصرعوں پر گرہ بھی لگائیں ہیں۔

پڑھو ناصح انگے مصرع وؔلی کا — نصیحت عاشقاں کوں کب روا ہے
ہوا معلوم مصرع سوں وؔلی کے — پری رخسار سوں ملنا ہنر ہے
راست اے داؤؔد کہتا ہے وؔلی — عشق میں صبر و رضا درکار ہے

داؤد کے دیوان کا بیشتر حصہ محبوب کے خدو خال' لب و رخسار' چشم و ابرو اور رفتار و گفتار کی تعریف و توصیف پر محیط ہے۔ یہی ان کی شاعری کے پسندیدہ موضوعات ہیں اور اسی میں ان کی شاعری کے جوہر کھلتے ہیں:

زلف تیری دامِ عالم گیر ہے — مجہ دل وحشی کے تئیں زنجیر ہے
اے کماں ابرو تری ہر یک پلک — مارنے عاشق کوں کاری تیر ہے
جس نے وو گلبدن نہیں دیکھا — اس نے سیر چمن نہیں دیکھا
خیال اس چشم کا ہے جب سیں دل میں — سدا وحشت میں ہوں مانند آہو

داؤؔد نے صنعتِ ایہام میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے دیوان کے آخر میں ''فردیاتِ ایہام'' کے عنوان سے 29 اشعار موجود ہیں۔

عالم میں معتبر ہے اکثر سخن اُسی کا — مثل قلم جہاں میں جو دو زباں ہوا ہے
آباد کیوں نہ یاد علی میں رہوں سدا — روز ازل سو دل ہے مرا مرتضٰی نگر
ہے شباب و کباب و فصل بہار — کوئی اس وقت جو پیا لادے

لیکن یہ داؤؔد کا خاص رنگ نہیں۔ یہ محض اس دور کے رجحان کا اثر ہے۔ داؤؔد کے یہاں وؔلی کے دور اول کی شاعری کی طرح دکنی رنگ بھی موجود ہے اور دور دوم کی شاعری کی طرح فارسی شاعری کے رجحانات سے اثر پذیری کے نتیجے میں تراکیب اور اضافتوں کی کثرت بھی۔ داؤؔد کی چند اضافتیں اور ترکیبیں دیکھیے۔

''شوقِ بوے غنچۂ گل''۔ آئینۂ دل۔ دیدۂ پرخوں۔ مثلِ صورتِ دیوار۔ سینۂ تحریر حباب''بوے غبارِ راہ۔ بادۂ گل رنگ۔ چہرۂ دل دار۔ خیال روے روشن یار۔ سایہ معشوق ہر جائی۔

فراقؔی اور بحرؔی کے مقابلے میں داؤد کی زبان بہت صاف ہے اس کے کلام میں وؔلی کے ابتدائی دور کی شاعری کی طرح جگہ جگہ قدیم دکنی کے بعض الفاظ جیسے سوں۔ کوں۔ سیتی۔ منے۔ سجن۔ سریجن۔ پیو۔ موہن۔ تجہ لب۔ مجہ دل۔ تمن۔ انجھو۔ اچھنا۔ کاں۔ نیں۔ باج۔ انگے۔ یو۔ اپس وغیرہ نظر آتے ہیں جنھیں الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ بہ آسانی آج کی زبان کا روپ دیا جاسکتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. داؤدؔ نے خود کو ''ولی ثانی'' کیوں کہا ہے؟
2. داؤدؔ کے کلام کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟
3. صنعت ایہام میں داؤدؔ کا کوئی شعر لکھیے۔

11.6 سراجؔ اورنگ آبادی

سید سراج الدین سراجؔ اورنگ آبادی (1128ھ/1715ء۔1177ھ/1763ء) اُس پُرعظمت ادبی ورثے اور شعری روایات کے آخری علمبرداروں میں شمار ہوتے ہیں جو کم وبیش تین صدیوں تک دکن کے مختلف ادبی مراکز جیسے گلبرگہ، بیدر، گولکنڈہ، بیجاپور اور پھر اورنگ آباد میں نشوونما پا رہی تھیں۔ محمد قلی سے ولیؔ تک یہ ادبی روایت اپنے نشوونما اور ارتقا کی نئی منزلیں طے کرتی رہی۔ سراج کے بعد دکنی شاعری کی روایات میں بتدریج ضعف آتا گیا اور اس کی جگہ فارسی شاعری کے اثرات نے لے لی۔ ولیؔ اور سراجؔ نے دکنی شاعری کی اس عظیم روایت کا سلسلہ شمالی ہند کی شاعری سے ملا دیا۔ جس کی وجہ سے 1750ء کے بعد شمالی ہند میں فارسی شاعری کے زیر اثر نئے خطوط پر اردو شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔

سراجؔ نے بارہ سال کی عمر میں علوم متداولہ کی تعلیم مکمل کی۔ اسی زمانے میں ان پر جذب و مستی کی کیفیت طاری ہوا کرتی اور بے اختیار فارسی اشعار منہ سے جاری ہو جاتے۔ بے خودی کے عالم میں وہ گھر سے نکل کھڑے ہوتے۔ رات دن صحرا نوردی کرتے اور زیادہ تر وقت حضرت شہاب الدین غریب کے آستانے پر گزارتے۔

1146ھ / 1734ء میں جب کہ سراج کی عمر 19, 20 سال تھی۔ انہوں نے چشتیہ سلسلے کے ایک صوفی بزرگ شاہ عبدالرحمان سے بیعت کی۔ اسی زمانے میں انھوں نے اردو شاعری کا آغاز کیا اور 1152ھ/1740ء میں اپنے مرشد کے حکم کی بنا پر شاعری ترک کر دی۔ گویا پانچ، چھے سال کی مختصر مدت میں انھوں نے اپنا ضخیم دیوان مرتب کیا۔

سراجؔ نے کم وبیش تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان کے کلیات میں غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، ترجیع بند سبھی اصناف شعر ملتے ہیں۔ عشق ان کی شاعری کا بنیادی محور ہے۔ جذبۂ عشق اور سوز محبت کی وجہ سے ان کی شاعری اور شخصیت میں وسیع المشربی، خاکساری اور بے نیازی کی کیفیات پیدا ہو گئی ہیں۔ سراجؔ نے یوں تو چھوٹی بڑی بارہ مثنویاں تصنیف کی ہیں لیکن ''بوستان خیال'' ان کی ایک طویل اور اہم عشقیہ مثنوی ہے۔ جو نہ صرف عہد ولیؔ اور سراجؔ کی ایک نمائندہ مثنوی ہے بلکہ اردو کی بلند پایہ مثنویوں میں بھی شمار ہوتی ہے۔ ''بوستانِ خیال'' اس کا تاریخی نام ہے۔ جس سے نہ صرف اس کی تاریخ تصنیف 1160ھ /1756ھ کا پتا چلتا ہے بلکہ تعدادِ اشعار (1160) پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

کیا میں جب مثنوی کا خیال — تھے ہجری ہزار و صد شصت سال
شمار اس کی ابیات کا جب کیا — تو ہجری کے سن سے موافق ہوا
زبس اس میں ہے سیر گلشن تمام — رکھا ''بوستانِ خیال'' اس کا نام
عدد جب کہ اس نام کے آے ہات — مطابق ہوے سال و ابیات سات

مثنوی کے درج ذیل شعر میں سراج نے اطلاع دی ہے کہ یہ طویل مثنوی انھوں نے صرف دو دن میں لکھی ہے۔

یہ دو دن کی تصنیف ہے حسبِ حال — زبان پر نکل آیا دل کا اُبال

بوستان خیال کا قصہ اس عہد کی دیگر مثنویوں کی طرح کسی فرضی یا خیالی داستان پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس میں سراجؔ نے اپنے ذاتی اور نجی واقعات کی ترجمانی کی ہے۔ سراجؔ ایک خوبرو نوجوان پر فدا ہو گئے تھے۔ جو اُن کے یہاں درس وتدریس کے سلسلے میں آیا کرتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد اس لڑکے نے اچانک سراجؔ سے ترک تعلق کر لیا جس کی وجہ سے وہ بیکل و بے قرار رہنے لگے۔ اپنی اس رودادِ عشق کو انھوں نے ایک سردار زادہ کو اسی کے ایما پر سنایا۔ مثنوی

کا اختتام ایک مناجات پر ہوتا ہے جس میں انھوں نے خدا سے التجا کی ہے کہ ان کا دل بتوں کی محبت سے آزاد ہو جائے۔ وہ صحبت غیر سے کنارہ کشی اختیار کر کے دیر سے کعبے کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ اس طرح بوستان خیال عشق مجازی سے شروع ہو کر عشق حقیقی پر ختم ہوتی ہے۔ سراجؔ کی دیگر مثنویاں مختصر ہیں اور جن کی حیثیت مثنوی سے زیادہ مسلسل غزل کی ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی: یہ نظمیں

''ان معنی میں مثنویاں ہیں کہ ان میں مثنوی کی بحر کی پابندی اور ابیات کا التزام کیا گیا ہے۔ لیکن مزاج کے اعتبار سے یہ نظم اور غزل مسلسل کی ملی جلی شکلیں ہیں۔'' (تاریخ ادبِ اردو۔ جلد اول۔ صفحہ 581)

جہاں تک سراج کی غزل گوئی کا تعلق ہے وہ ولیؔ کے بعد اور عہد میرؔ و سوداؔ سے پہلے کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ غزل گوئی کے میدان میں ان کا کوئی ہم عصر ان کے مرتبے کو نہیں پہنچتا۔ سراج کی غزل گوئی کا نمایاں وصف سادگی بیان' سوز و گداز اور تاثر کی فراوانی ہے۔ ان کی غزلوں میں بڑا کیف ہے' وارفتگی ہے' رس ہے اور رعنائی ہے۔ جو ایک طرف ان کے جذبے کی شدت اور خلوص کی دین ہے تو دوسری طرف اس میں وہ اسلوب بیان بھی برابر کا شریک ہے۔ جو ہندوستانی اور ایرانی عناصر کے دل کش اور متوازن امتزاج کا نتیجہ ہے۔ فارسی زبان و ادب پر ماہرانہ عبور اور قدیم دکنی شاعری کے بنیادی رجحانات سے وابستگی نے ان کے کلام کو ایک رچی ہوئی کیفیت اور ایسی رنگینی و رعنائی بخشی ہے کہ سراج کی شاعری اردو غزل کی ایک منفرد آواز بن گئی۔ ایک ایسی آواز جو دو صدیوں کے گزر جانے کے باوجود آج بھی پڑھنے والوں کے لیے دل کش بھی ہے اور نئی بھی۔

سراج کو عموماً صوفی شاعر کہا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ صاحب دل صوفیوں کی صحبت میں بسر کیا' وہ مزاجاً اور عملاً صوفی تھے اور ان کے کلام میں روحانی تجربات کی حرارت بھی ملتی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کے کلام پر تصوف کا غلبہ نظر نہیں آتا۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ان کے ضخیم کلیات میں جو تقریباً تین ہزار پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ سو دو سو اشعار کو چھوڑ کر تصور عشق خالصتاً مادی اور مجازی ہے۔ سراجؔ کا تصور محبوب' دکنی اردو کے دوسرے شاعروں کی طرح ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ یہ محبوب محض تخیلی اور روایتی نہیں بلکہ اسی عالم رنگ و بو میں رہنے بسنے والا جیتا جاگتا انسان ہے جو تمام نسوانی محاسن کے ساتھ سامنے آتا ہے اور جسے سراجؔ نے گل بدن' موہن' سریجن' پیو' پری وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے:

کہاں ہے گل بدن موہن ہمارا — کہ جیوں بلبل ہے نالاں دل ہمارا
دل پری رو کوں دیکھ دنگ ہوا — دشمن جان نام و ننگ ہوا
نین کی پتلی میں اے سریجن ترا مبارک مقام دستا — پلک کے پٹ کھول کر جو دیکھوں تو مجھ کوں ماہ تمام دستا

سراج کی شاعری کا ایک اہم موضوع تصوف ہے۔ عشق میں ان کی از خود رفتگی مجاز اور حقیقت کی حدوں کو ایک کر دیتی ہے اور محبت کا دائرہ وسیع ہو کر کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ اردو شاعری میں تصوف کی روایت بہت عام ہے کم و بیش ہر شاعر کے کلام میں تصوف کے مسائل کا کچھ نہ کچھ ذکر ضرور مل جاتا ہے لیکن اردو شاعری کی تاریخ میں بہت کم شاعر ایسے نظر آتے ہیں جو عملاً صوفی بھی تھے۔ سراج کے کلام میں روحانی کیفیات اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ نمایاں ہیں۔ انھوں نے تصوف کے مسائل کو عشقیہ لب و لہجے میں سادہ' پر اثر اور دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ سراج کے ہاں فلسفہ و تصوف کے مضامین بھی ہیں اور درس اخلاقیات بھی۔ دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ بھی ہے۔ پند و نصیحت بھی ہے اور اعلیٰ اقدار کو اپنانے کی تلقین بھی۔

دو رنگی خوب نئیں یک رنگ ہوجا — سراپا موم ہو یا سنگ ہوجا
تو فنا ہو اگر بقا چاہے — نیستی میں توں دیکھ ہستی ہے
راہ خدا پرستی اول ہے خود پرستی — ہستی میں نیستی ہے اور نیستی میں ہستی
روشن ہے اے سراج کہ فانی ہے سب جہاں — مطرب غلط ہے جام غلط انجمن غلط

بقول ''ڈاکٹر جمیل جالبی'' پوری اردو شاعری کے پس منظر میں سراج کی شاعری کو رکھ کر دیکھا جائے تو وہ اردو شاعری کے راستے پر ایک ایسی مرکزی جگہ کھڑے ہیں جہاں سے میر' سودا' مصحفی' آتش' مومن' غالب اور اقبال کی روایت کے راستے صاف نظر آ رہے ہیں۔ سراج نے اردو شاعری کے بنیادی راگ کو جگایا ہے۔ اس لیے ان کی آواز سارے بڑے شاعروں کی آواز لے اور لہجے میں موجود ہے۔'' (تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ صفحہ 573)

اپنی معلومات کی جانچ :

1. سراج کی ابتدائی زندگی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
2. سراج نے شاعری کیوں ترک کی؟
3. سراج نے کتنی مثنویاں لکھی ہیں؟
4. سراج کے تصورِ محبوب پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. سراج کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

11.7 دیگر شعرا

11.7.1 شاہ قاسمؔ اورنگ آبادی

شاہ قاسم علی نام، قاسم تخلص برہان پور میں پیدا ہوئے۔ نوجوانی کے زمانے میں اورنگ آباد آئے اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو گئے۔ ان کے والد کا نام شیخ عبداللہ انصاری تھا وہ ایک درویش صفت انسان تھے۔

شاہ قاسم کو چشتیہ اور قادریہ دونوں سلسلوں میں بیعت حاصل تھی۔ چشتیہ سلسلے میں وہ شاہ فقیر علی کے مرید و خلیفہ تھے۔ قادریہ سلسلے میں ان کے مرشد و رہنما شاہ کرم اللہ بخاری تھے۔ تاہم کلام کے مطالعے سے وہ ایک رند مشرب، عشق پیشہ، حسن پرست، آزاد منش اور قلندر مزاج شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

رند مشرب ہیں قلندر، ہم جو چاہیں سو کریں — کوئی ہمارا کیا کرے گا منصب و جاگیر میں
ہم قلندر وضع بے پروا فقیر — رند مشرب عاشق بے باک ہیں

شاہ قاسم ایک قادر الکلام اور صاحب دیوان شاعر ہیں۔ مولوی سخاوت مرزا نے 1975ء میں ان کے دیوان کو مرتب کر کے انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع کر دیا۔ شاہ قاسم شاعرانہ کمال کے نقطۂ نظر سے ولیؔ اور سراجؔ کے مرتبے کو نہیں پہنچتے لیکن انھیں اپنی شاعری پر بہت ناز تھا اور وہ ولیؔ کو خود سے کم تر درجے کا شاعر سمجھتے تھے۔

آج اس وقت میں ولی نہیں حیف — مجھ سے پوچھیں صلاحِ راہِ سخن

شاہؔ قاسم کے متعدد اشعار میں خودستائی، شاعرانہ تعلّی اور فخر و مباہات کا انداز موجود ہے۔

قیام لگ تمہارے شاہ قاسم — سخن عالم کو یاد آیا کریں گے
شاہ قاسم دکن سیں تا دلی — کون دیوے ترا حساب سخن

زبان و بیان کے اعتبار سے شاہؔ قاسم، ولیؔ اورنگ آبادی سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زبان کو ''ریختہ'' کہا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی شاہ قاسم کے کلام کو ''بغیر جذبے کی شاعری'' کہتے ہیں تاہم ان کے ہاں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن میں گہرا تاثر اور سوز و نشریت پائی جاتی ہے۔

ہزار افسوس یارب یہ بہاریں یوں چلی جائیں — ہماری آہ و نالوں کی پکاریں یوں چلی جائیں
شاہ قاسم فقیر آتے ہیں — عاشق بے نظیر آتے ہیں
شاہ قاسم کا حال مت پوچھو — باز آیا ہے زندگانی سیں

11.7.2 عاجزؔ اور نگ آبادی

عارف الدین خاں عاجزؔ (متوفی 1178ھ) کے والد اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں بلخ سے ہندوستان آئے۔ عاجزؔ کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی۔ غازی الدین فیروز جنگ نے ان کے والد کو منصب سے سرفراز کیا تھا۔ عاجز ابھی کم عمر تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ والد کی وفات کے بعد عاجز نواب لشکر خاں بہادر نصرت جنگ کے زیر سایہ پرورش پاتے رہے۔ نواب مذکور کے ہمراہ وہ ہند سے اورنگ آباد آئے اور انھیں کی سفارش کی بدولت آصف جاہ اول اور پھر ناصر جنگ شہید کے درباروں تک رسائی حاصل کی۔

تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ عاجز کو مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل تھی اور وہ نہایت تیز طبع، بدیہہ گو اور منکسر المزاج انسان تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ انھوں نے کبھی اپنے کلام کو محفوظ کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کا بیشتر حصہ ضائع ہوگیا۔ اورینٹل مینوا سکرپٹ لائبریری حیدرآباد میں ان کے اردو ایوان کا ایک مخطوطہ موجود ہے۔

عاجز نے زیادہ تر مشکل زمینوں میں غزلیں کہی ہیں اور اپنے کلام میں صنائع بدائع کے اہتمام پر خصوصی توجہ دی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے کلام میں سادگی کے بجائے تصنع اور آمد کے بجائے آورد کا احساس ہوتا ہے۔

کہتے ہیں سنگلاخ زمینوں میں ہم تو شعر — پانا ہماری شوخی معنی کو ہے بکٹ
سر ہمارا توڑنے وہ سنگ دل آیا ہے آج — مرمراب کیدھر ہے یارو سنگ خارا ہے کدھر
چمن میں چل کے بجن بے حساب ساغر کھینچ — بہار رنگ گلستاں کے سر سے چادر کھینچ

عاجز نے 500 ابیات پر مشتمل ''لال و گوہر'' کے نام سے ایک مثنوی بھی تصنیف کی ہے۔ جس میں بنگالہ کے شہزادے لال اور پریوں کی شہزادی گوہر کی عشقیہ داستان بیان کی گئی ہے۔ اس مثنوی میں اس دور کی دوسری مثنویوں کی طرح محیر العقول واقعات اور مافوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی بھی ہے۔ مثنوی لال و گوہر کو بے حد شہرت حاصل ہوئی۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ 1226ھ میں میر محمد باقر نے ''حدیقۂ دل'' کے نام سے اس کو فارسی نثر میں منتقل کیا اور مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے اس کا فرنچ زبان میں خلاصہ بھی لکھا ہے۔ بمبئی اور مدراس میں یہ مثنوی کئی بار چھپ چکی ہے۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے اس کا جدید ایڈیشن بھی شائع کیا ہے۔

11.7.3 وجدیؔ کرنولی

حکیم شیخ ہدایت اللہ وجدی کا شمار عہد ولی وسراج کے قادرالکلام سخنوروں میں ہوتا ہے۔ ان کے حالات زندگی، تاریخ پیدائش و وفات اور مدفن پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ ان کے بارے میں صرف اس قدر پتہ چلتا ہے انھیں فن طب اور کتابت کے علاوہ علم نجوم، موسیقی اور شطرنج سے دلچسپی تھی۔ ان کی تین مثنویاں دریافت ہوئی ہیں۔ (1) مخزن عشق (2) پنچھی باچھا (3) تحفۂ عاشقاں

مخزن عشق وجدی کی پہلی مثنوی ہے۔ وجدی نے ''باغ جاں فزا'' سے اس کی تاریخ تصنیف 1145ھ خود نکالی ہے۔ مثنوی کا آغاز حمد و نعت اور خلفاءِ راشدین کی مدح سے ہوتا ہے اس کے بعد منقبت حضرت غوث اعظمؒ ہے۔ اور پھر وجدی نے اپنے پیر و مرشد حضرت فخر الدین شامی کی مدح لکھی ہے

کہوں اب مدح مرشد کا زبان کھول — مبارک ناوں پر گوہر سٹوں رول
جہانِ فقر فخر گرامی — جسے تھا ناوں فخر الدین شامی

مخزن عشق میں وجدیؔ نے کرنول کے نواب اسماعیل خاں پنّی کی تعریف میں ایک باب مختص کیا ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ نواب مذکور کے دربار سے وابستہ تھے۔ مخزن عشق ایک ضخیم مثنوی ہے جس میں زابلستان کے وزیر بیدار دل اور فغفور چین کی بیٹی پری رخ کے عشق کی داستان نظم کی گئی ہے۔ یہ مثنوی دراصل وجدی کے ایک رفیق دیرینہ عبدالقدوس کے مرشد شاہ صادق اورنگ آبادی کے فراہم کردہ فارسی قصے کا دکنی ترجمہ ہے جو شاہ صادق ہی کی فرمائش پر کیا گیا ہے۔

پنچھی باچھا وجدی کی 1146ھ کی تصنیف ہے۔ یہ شیخ فریدالدین عطار کی مشہور فارسی مثنوی ''منطق الطیر'' کا منظوم ترجمہ ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ وجدی نے عطار کی مثنوی کے مطالب کو آزادانہ طور پر اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ترجمہ نہیں بلکہ اپنی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ وجدی کی مثنویوں میں پنچھی باچھا کو اس کے متصوفانہ موضوع کی وجہ سے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب بمبئی اور مدراس کے مختلف مطبعوں سے متعدد بار چھپ چکی ہے۔ 1959ء میں پروفیسر سید محمد نے اسے مرتب کر کے سالار جنگ پبلشنگ کمیٹی' حیدرآباد سے شائع کیا۔

وجدی کی تیسری مثنوی کا نام ''تحفۂ عاشقان'' ہے۔ پنچھی باچھا کی طرح یہ مثنوی بھی شیخ فریدالدین عطار کی فارسی مثنوی ''گل وہُرمز'' کا دکنی ترجمہ ہے۔ ''تحفۂ عاشقان'' میں ملک روم کے بادشاہ قیصر کے شہزادے ہرمز اور حورستان کے بادشاہ فوزان کی شہزادی گل رخ کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ اس مثنوی کو وجدی نے متعدد ابواب میں تقسیم کیا ہے اور دکنی کی دوسری مثنویوں کی طرح ہر باب کے عنوان کو ایک شعر کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے جس کی بحر مثنوی کی بحر سے مختلف ہے۔ اگر تمام عنوانات کے اشعار کو جمع کر لیا جائے تو مثنوی کا خلاصہ سامنے آجاتا ہے۔ تحفہ عاشقاں ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس میں شاعر نے اپنے دور کی تہذیب و معاشرت اور رسوم و رواج کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. شاہ قاسم کا دیوان کس نے مرتب کیا؟
2. شاہ قاسم کی شاعری کے بارے میں جمیل جالبی نے کیا رائے دی ہے؟
3. عاجز کا بچپن کن حالات میں گزرا؟
4. عاجز کی مثنوی لال و گوہر کے متعلق اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
5. وجدی نے مثنوی مخزن عشق کس کی فرمائش پر لکھی؟
6. پنچھی باچھا کی خاص خصوصیت کیا ہے؟

11.8 خلاصہ

اورنگ زیب عالمگیر نے 1096ھ /1686ء میں بیجاپور اور 1097ھ /1687ء میں گولکنڈہ فتح کیا۔ ان فتوحات کے نتیجے میں دکن کی عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کا خاتمہ ہوگیا۔ ان سلطنتوں کے زوال کی وجہ سے دکن میں علم و فن اور تہذیب و تمدن کی بنیادیں ہل گئیں۔ اب اس خطے میں دکنی شاعروں اور ادیبوں کا کوئی سرپرست اور قدردان نہیں رہا تھا۔ بیجاپور کی تباہی کے بعد وہاں کے شعرا و ادیب دور دراز کے مقامات جیسے کڑپہ' کرنول' ویلور اور ارکاٹ چلے گئے۔ جہاں مقامی امرا کی سرپرستی کی توقع تھی۔ اسی طرح گولکنڈہ کے کچھ شعرا و ادیب اورنگ آباد چلے گئے جو عالمگیر کا جنوبی مستقر تھا۔ بہرحال دکن کے سیاسی زوال کی وجہ سے یہاں شعر و ادب کی تخلیق کا سلسلہ بالکلیہ طور پر رک نہیں گیا بلکہ نئے رخ سے جاری رہا۔ مغلوں کی فتح دکن کی وجہ سے شمالی ہند کے لسانی اثرات دکنی زبان پر مرتب ہوئے۔ اور دکنی زبان پر فارسی الفاظ اور اسالیب کا رنگ گہرا ہوتا گیا۔ ولی اور سراج کے علاوہ اس دور کے سب سے قدآور شاعر تھے اس لیے دور کو ولی اور سراج کا دور کہا جاسکتا ہے۔ ولی اور سراج کے علاوہ اس دور میں متعدد شعرا داد سخن دے رہے تھے جن میں قاضی محمود بحری' فراقی' داؤد اورنگ آبادی اور دیگر شعرا میں شاہ قاسم' عاجز اور وجدی کرنولی اہم ہیں۔

ولی کا نام ولی محمد اور تخلص ولی تھا۔ ان کے حالات زندگی نامعلوم ہیں۔ بعض محققین اسے گجرات کا باشندہ کہتے ہیں تو بعض اورنگ زیب کا۔ تاہم زمانہ قدیم کے مورخین اور تذکرہ نگاروں نیز عہد حال میں ڈاکٹر زور اور جمیل جالبی کی رائے ہے کہ ولی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ نوجوانی میں انھوں نے گجرات کا سفر کیا تھا۔

ولی ایک قادرالکلام شاعر تھے ان کی کلیات میں غزل۔ مثنوی۔ مخمس۔ رباعیات مرثیہ وغیرہ مختلف اصناف ملتی ہیں۔ ولی نے دکنی شاعری کی روایات اور رجحانات کی پاسداری کی۔ ولی کو اردو غزل کا مجتہد اور امام کہا جاتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے دکنی غزل کو فارسی مضامین اور فارسی اسالیب سے ملا کر غزل کا ایک نیا اسلوب ایجاد کیا۔ 1112ھ /1700ء میں ولی نے دلی کا سفر کیا۔ شمالی ہند میں ولی کے سفر کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ ولی کے اثر

سے شمالی ہند کے شعرا نے سنجیدگی کے ساتھ اردو زبان میں شاعری کا سلسلہ شروع کیا ورنہ اس سے قبل وہ فارسی میں شاعری کرنے کو باعث فخر سمجھتے تھے۔ 1132ء / 1719ھ میں ولی کا دیوان دلی پہنچا تو اس کے اشعار وہاں کے ادبی حلقوں میں نہایت مقبول ہوئے۔

قاضی محمود بحری ولی کے بزرگ ہم عصر تھے۔ وہ گوگی (تعلقہ شاہ پور ضلع گلبرگہ) کے باشندے تھے۔ انھوں نے اردو اور فارسی میں پچاس ہزار اشعار لکھے تھے لیکن ان کا یہ ادبی سرمایہ بیجاپور سے حیدرآباد کے سفر کے دوران ڈاکوؤں نے لوٹ کر تباہ کر دیا۔ بحری کی تصانیف میں ایک دیوان اور دو مثنویاں ''بنگاب نامہ'' اور ''من لگن'' محفوظ ہیں۔ بحری کی غزلوں میں عشق مجازی کا رنگ غالب ہے۔ البتہ ان کی مثنویاں عشق حقیقی اور تصوف و عرفان کے مسائل پر مبنی ہیں۔

سید محمد فراقی ولی کے کم عمر ہم عصر تھے۔ ولی کی طرح انھوں نے بھی شمالی ہند کا سفر کیا تھا۔ فراقی کی اہم تصنیف مثنوی ''مراۃ الحشر'' ہے جو تقریباً چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ فارسی کے ''آخرت نامہ'' کا ترجمہ ہے۔ اس میں قیامت سے قریب اور قیامت کے بعد پیش آنے والے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ فراقی کی غزلوں میں عشقیہ اور ناصحانہ مضامین ملتے ہیں۔

داؤد اورنگ آبادی اسی دور کے ایک اہم غزل گو شاعر ہیں۔ داؤد کے کلام پر ولی کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ وہ اپنے آپکو ''ولی ثانی'' کہتے تھے۔ داؤد کے دیوان کا بیشتر حصہ محبوب کے خدوخال، لب و رخسار، چشم و ابرو اور رفتار و گفتار کی تعریف و توصیف پر محیط ہے فراقی اور بحری کے مقابلے میں داؤد کی زبان بہت صاف ہے۔

ولی کے بعد اس دور کے دوسرے بڑے شاعر سراج اورنگ آبادی ہیں سراج نے کم و بیش تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان کی کلیات میں غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی اور ترجیع بند وغیرہ مختلف اصناف ملتی ہیں۔ وہ ایک پرگو شاعر تھے انھوں نے پانچ چھے سال کی مختصر مدت میں اپنا ضخیم دیوان مرتب کیا۔ ان کی غزل کا محور و مرکز جذبہ عشق اور سوز محبت ہے۔ ان کی غزلوں میں سوز و گداز، کیف و وارفتگی اور سادگی بیان کا احساس ہوتا ہے۔ سراج نے کئی مثنویاں لکھیں جن میں بوستان خیال نہایت اہم ہے اس میں سراج نے کسی فرضی داستانِ عشق کے بجائے ذاتی واردات بیان کی ہے۔

اس دور کے دیگر شعرا میں شاہ قاسم اورنگ آبادی صاحب دیوان شاعر ہیں وہ ایک رند مشرب، عشق پیشہ، حسن پرست اور قلندر مزاج شاعر تھے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے شاہ قاسم ولی اورنگ آبادی سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زبان کو ریختہ کہا ہے۔ ان کے اکثر اشعار میں گہرا تاثر اور سوز و نشتریت پائی جاتی ہے۔

عارف الدین خاں عاجز کا شمار بھی اس دور کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ نہایت تیز طبع اور برجستہ گو شاعر تھے۔ انہیں مختلف علوم میں مہارت حاصل تھی۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ایک اردو دیوان اور مثنوی لال و گوہر ان سے یادگار ہے۔ عاجز کو مشکل زمینوں میں شعر کہنے کا شوق تھا جس کی وجہ سے ان کی غزل کے اشعار میں تصنع اور آورد پائی جاتی ہے۔ عاجز کی مثنوی لال و گوہر جو 500 اشعار پر مشتمل ہے اپنے زمانے میں نہایت مقبول ہوئی۔

اس دور کے ایک اور قادرالبیان شاعر وجدی کرنولی ہیں۔ ان کے حالات پردہ تاریکی میں ہیں۔ دکنی زبان میں ان سے تین مثنویاں یادگار ہیں۔ مخزن عشق، پنچھی باچھا اور تحفہ عاشقاں۔ ان میں مخزن عشق وجدی کی پہلی مثنوی ہے جو 1145ھ میں لکھی گئی۔ یہ مثنوی وجدی نے شاہ صادق اورنگ آبادی کی فرمائش پر لکھی۔ پنچھی باچھا وجدی کی دوسری تصنیف ہے جو 1146ھ میں وجود میں آئی۔ یہ عطارؒ کی مشہور فارسی مثنوی منطق الطیر کا منظوم ترجمہ ہے۔ وجدی کی تیسری مثنوی تحفہ عاشقاں ہے۔ یہ بھی عطارؒ کی ایک اور مثنوی ''گل و ہرمز'' کا دکنی ترجمہ ہے۔ وجدی کی مثنویوں میں پنچھی باچھا صوفیانہ مثنوی ہے باقی دو مثنویاں عشقیہ داستانوں پر مبنی ہیں۔

11.9 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. اردو شاعری کی تاریخ میں ولی کی اہمیت کیوں ہے؟ تفصیل سے لکھیے۔

2. سراجؔ اورنگ آبادی کے تغزل کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. سید محمدؔ فراقی کی شخصیت اور ادبی کارناموں کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔
2. عاجزؔ اورنگ آبادی کی شاعری کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔
3. وجدی کی مثنوی نگاری پر تبصرہ کیجیے۔

11.10 فرہنگ

الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی
رخنہ	=	سوراخ، دیوار کا چھید	وساطت	=	وسیلہ یا واسطہ	معاصرین	=	ہم عصر، ایک زمانے کے لوگ
پرآشوب	=	مصیبتوں اور پریشانیوں سے بھرا	مقلدین	=	تقلید کرنے والے، پیروی کرنے والے	ادعا	=	دعوا کرنا
قدآور	=	دراز قد (مرادی معنی بلند مرتبت)	رازنہانی	=	چھپا ہوا بھید	مدن	=	محبت کا دیوتا۔ عشق
پنبہ	=	روئی۔ کپاس	رمزشناس	=	پوشیدہ بات سمجھنے والا	خانوادہ	=	خاندان
سلاسل	=	سلسلہ کی جمع۔ زنجیریں	ارادت مند	=	معتقد	قلمرو	=	حکومت۔ سلطنت
عسیرالفہیم	=	جس کا سمجھنا دشوار ہو	چشمک	=	دشمنی	دام	=	جال۔ پھندہ
آہو	=	ہرن	صحرانوردی	=	جنگلوں میں مارا مارا پھرنا	وسیع المشرب	=	کشادہ دل۔ کشادہ ذہن
شصت	=	ساٹھ	وارفتگی	=	آپے سے باہر ہونا۔ بے خود ہونا	رعنائی	=	زیبائش۔ دلکشی

11.11 سفارش کردہ کتابیں

1. نصیرالدین ہاشمی — دکن میں اردو
2. آل احمد سرور (مرتب) — تاریخ ادب اردو، علی گڑھ
3. پروفیسر سیدہ جعفر و گیان چند جین — تاریخ ادب اردو 1700ء تک (جلد پنجم)
4. سید ظہیرالدین مدنی — ولی گجراتی
5. ڈاکٹر زورؔ — دکنی ادب کی تاریخ
6. جمیل جالبی — تاریخ ادب اردو (جلد اول)

اکائی : 12 شمالی ہند میں اردو شاعری

ساخت

12.1 تمہید

12.2 پس منظر

12.3 شمالی ہند کے شعرا پر ولی کا اثر

12.4 شمالی ہند کی شاعری میں ایہام گوئی

12.5 خلاصہ

12.6 نمونۂ امتحانی سوالات

12.7 فرہنگ

12.8 سفارش کردہ کتابیں

12.1 تمہید

گذشتہ اکائی میں ہم نے ولی اور سراج کی زندگی کے حالات پر روشنی ڈالی اور ان کی غزل گوئی کا تفصیل سے جائزہ لیا۔ ان کے کلام کی تشریح بطور نمونہ کی گئی کہ آپ کو مزید کلام سمجھنے میں مدد ملے۔ مجموعی طور پر آپ نے شاعر کے کلام کی خصوصیات اور امتیازی حیثیت سے آگاہی حاصل کی۔ یہ اکائی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں ''شمالی ہند کی اردو شاعری'' پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس اکائی میں ہم آپ کو شمالی ہند میں اردو شاعری کے بارے میں بتائیں گے۔ ولی کے اثرات شمالی ہند کے شعرا پر جو مرتب ہوئے تھے اس کا جائزہ بھی لیا جائے گا۔ شمالی ہند کی شاعری میں ایہام گوئی اور ایہام گو شعرا کی تفصیل بھی دیں گے۔

اس اکائی کا خلاصہ بھی پیش کریں گے۔ امتحانی سوالات بھی بطور نمونہ آپ کو ملیں گے۔ فرہنگ کے تحت نئے الفاظ کے معنی بھی دیے گئے ہیں اور آپ کے مزید مطالعہ کے لیے سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی جارہی ہے۔ یقین ہے کہ آپ اس سے استفادہ کریں گے۔

12.2 پس منظر

اُردو شاعری کے وجود میں آنے کے بعد اس کے بڑھنے اور پھیلنے کا عہد سیاسی اور معاشی اعتبار سے بڑی مصیبتوں کا ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد اس قدر سیاسی افراتفری پھیل گئی اور اس قدر سیاسی بدحالی اور انتشار نمودار ہوا کہ بیان سے باہر ہے۔ عالمگیر کی وفات پر اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ شہزادہ محمد معظم نے جو کابل کا صوبے دار تھا اپنے بھائی محمد اعظم کو شکست دے کر شاہ عالم بہادر شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد جہاں دار شاہ نے عنانِ حکومت سنبھالی۔ اس کے عہد میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ اس کے بعد فرخ سیر نے اپنی بادشاہت کا دعویٰ کیا۔ فرخ سیر نے کوشش کی کہ اپنا پیچھا ''سید برادران'' سے چھڑائے لیکن وہ خود پھنس گیا۔ سید برادران ''بادشاہ گر'' بنے ہوئے تھے انھوں نے فرخ سیر کا قتل کروادیا۔ فرخ سیر کے قتل کے بعد سات ماہ کے عرصے میں سیدوں نے دو بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت پر بٹھائے۔ اس کے بعد کے دور میں ادبی اور سیاسی نقطۂ نظر سے سب سے اہم بادشاہت محمد شاہ بادشاہ کی ہے جس کے زمانے میں اردو شاعری کو ترقی ہوئی۔ اسی کی نااہلی کی وجہ سے مغلیہ سلطنت کمزور ہوتی گئی۔ رہی سہی کسر نادر شاہ نے پوری کردی۔ نادر شاہ نے بغیر جنگ کے تاوانِ جنگ دو کروڑ روپے وصول کیے۔ معمولی سی وجہ پر صبح آٹھ بجے تا شام کے تین بجے تک قتل و غارتگری کا بازار گرم رہا۔ مغلیہ سلطنت کے

سپہ سالار آصف جاہ کی مساعی سے یہ قتلِ عام رک گیا۔ اس کے بعد ہی آصف جاہ دکن جاکر خودمختار ہوگیا اور آصف جاہی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

سیاسی طور پر ناکارہ ہونے کے باوجود محمد شاہ کو فنون لطیفہ سے بڑا شغف تھا خصوصاً موسیقی سے۔ ہندوستان بھر کے تمام مشہور گویے اس کے ملازم تھے۔ محمد شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ تخت پر بیٹھا۔ اس کی حکمت عملی سے امرا ناراض ہوگئے اور بغاوت کردی۔ اس کو معزول نیز نابینا کرکے سلیم گڑھ کے قلعہ میں قید کردیا گیا جہاں وہ آخرکار مرگیا۔ احمد شاہ کے بعد جہاں دار شاہ کے بیٹے عزیز الدین کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت نشین کیا گیا۔ مغلیہ سلطنت کمزور ہوکر محض دہلی کے اطرف میں چند ضلعوں تک رہ گئی۔ اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی کی فوج گردونواح میں لوٹ مار کرکے واپس ہوئی۔ عماد الملک نے عالم گیر ثانی کو دھوکہ سے قتل کروادیا اور اس کی جگہ عالمگیر کے پرپوتے شاہ جہاں ثانی کو تخت پر بٹھایا۔ اسی دوران احمد شاہ ابدالی نے دہلی میں قتل عام کیا۔ شاہ جہاں ثانی کے زمانے میں غلام قادر خاں مغلیہ سلطنت کے سیاہ وسفید کا مالک بن گیا۔ شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکال دی گئیں۔ نابینا ہونے کے بعد بادشاہ نے سلطنت سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اکبر شاہ ثانی اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد بہادر شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ بہادر شاہ چاہتے تھے کہ ان کی جگہ جواں بخت وارث سلطنت ہو مگر لارڈ کیننگ نے اسے نامنظور کیا اور یہ طے کردیا کہ بہادر شاہ کے بعد خطاب شاہی ختم ہوجائے۔ غدر نے یہ زوال جلد ہی مکمل کردیا۔ ہنگامۂ غدر میں بہادر شاہ ماخوذ ہوئے۔ رنگون بھیج دیے گئے اور وہیں نومبر 1864ء میں ان کا انتقال ہوا۔ بہادر شاہ اعلیٰ درجے کے شاعر تھے ظفر تخلص کرتے تھے۔ یہ تھی دہلی کی مختصر سیاسی تاریخ جس میں ہماری اردو شاعری پروان چڑھی۔ تاریخی واقعات پر سرسری نظر ڈالنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ عالمگیر کے بعد کے یہ ڈیڑھ سو سال کی مدت ایک انتشار و بدامنی کی تھی۔ مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹمارہا تھا۔ یہ مقولہ خاص و عام کی زبان پر تھا ''سلطنتِ شاہ عالم از دلی تا پالم''۔

ہر ایک پیشہ ور مفلسی' بدامنی و بدحالی کے ہاتھوں عاجز و بے بس تھا۔ جس کو جدھر گوشۂ عافیت نظر آتا ادھر چلا جارہا تھا۔ ہر طرف طوائف الملوکی و انتشار پھیلا ہوا تھا۔ دیگر فنکاروں کی طرح شعرا بھی بے حال و پریشان تھے۔ اورنگ زیب کے بعد مغلیہ سلطنت کے سربراہوں میں سوائے بہادر شاہ ظفر کے کسی کے دربار سے کوئی نامور شاعر وابستہ نہیں رہا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. عالم گیر کی وفات کے بعد اس کے کون سے بیٹوں میں خانہ جنگی ہوئی؟ نام بتایئے۔
2. کس کی نااہلی کی وجہ سے مغلیہ حکومت کمزور ہوئی؟
3. مغلیہ حکومت کا آخری تاجدار کون تھا؟

12.3 شمالی ہند کے شعرا پر ولی کا اثر

مغلیہ سلطنت میں سرکاری زبان فارسی تھی۔ پڑھے لکھے حلقوں میں فارسی ہی بولی جاتی تھی۔ بادشاہِ دہلی اور اس کے تمام درباری اور اہل کار فارسی ہی میں گفتگو کرتے تھے اور اپنی فارسی دانی پر فخر کرتے تھے۔ ہندی میں اس وقت تک قابل ذکر ادب ہی نہ تھا۔ ہندی محض ایک بولی کی حیثیت رکھتی تھی۔ رفتہ رفتہ جب بھاشا کا اثر بڑھا اور فارسی کا گھٹ گیا تب ایک متوازن زبان ''اردو'' وجود میں آئی۔ قدرتی طور پر اردو شاعری میں بھاشا اور فارسی دونوں کے معیار آگئے۔ چونکہ بھاشا کا اثر محض زبان تک محدود تھا اس لیے فارسی کے وہ تمام معیار اور موضوعات اردو میں لیے گئے جو اس سے پہلے فارسی میں مروّج تھے۔ جب اردو شاعری کی ابتدا ہوئی تو ایرانی شاعری کی خصوصیات تصنّع' تصور پرستی اور مشکل پسندی اردو شاعری میں آگئیں۔ اس سلسلے میں پہلا دور ان شعرائے فارسی کا قرار دیا جاسکتا ہے جو ولی کی آمد سے پہلے محض تفنّنِ طبع کے طور پر کبھی کبھی اردو میں شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ ان میں سراج الدین علی خان آرزوؔ' ٹیک چند بہارؔ اور جعفر زٹلی کے نام خصوصیت سے لیے جاسکتے

ہیں۔ فارسی میں یہ شعرا اپنی شخصیت اور شاعری کو منوا چکے تھے مگر اردو زبان میں یہ کوئی رنگ قائم نہ کر سکے۔

ولؔی کے زیر اثر جن شعرا نے اردو میں طبع آزمائی کی ان میں حاتمؔ، آبروؔ، مضمونؔ، شاکر ناجیؔ، یکرنگ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ایہام گوئی ان میں بطور خاص شامل تھی وہ جو محسوس کرتے اسے سیدھی سادی زبان میں بیان کر دیتے تھے۔ کلام کی سادگی اور بے تکلفی لطف دیتی تھی۔ آبرو اور حاتمؔ کا کلام اس معنی میں اس دور کا صحیح نمائندہ ہے۔ جگہ جگہ پر ہندی تشبیہوں و استعاروں اور ہندی لفظوں کا استعمال بھی زیادہ ہوا ہے۔

اورنگ آباد کے اس صاحب طرز شاعر کو گزرے ہوئے ڈھائی سو سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے مگر ولی کو اردو شاعری کبھی فراموش نہیں کر سکی۔ وہ ایک بلند مینار کی طرح ہماری رہنمائی کرتا نظر آتا ہے۔ ولی سے پہلے بڑے بڑے اساتذۂ سخن کے اردو کارنامے اس اثنا میں روشناس ہو چکے تھے اور یہ بھی قطعی آشکارا ہو چکا تھا کہ وہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر نہیں تھا بلکہ محمد قلی قطب شاہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ کوئی بھی نقاد اس کے کمال انفرادیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ شاید اسی لیے پیر خان کمترین نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ ولؔی پر جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں۔

بطور شاعر عموماً اور غزل گو کی حیثیت سے خصوصاً ادبیاتِ اردو میں ولی کی جگہ مسلم ہے لیکن شمالی ہند اور خاص طور پر دہلی کی شاعری پر انھوں نے جو اثر چھوڑا ہے وہ زبان اردو کی تاریخ میں انھیں خصوصی اہمیت کا حامل بناتا ہے۔

ولؔی کا دیوان دہلی پہنچنے کے بعد ایسا مقبول ہوا کہ اس کے اشعار چھوٹے بڑوں کی زبان پر جاری ہو گئے۔ اس دیوان کو دیکھ کر دہلی کے شعرا میں یہ ولولہ پیدا ہوا کہ وہ بھی ایسی ہی شاعری اور ایسا ہی دیوان مرتب کریں۔ اس سے پہلے شمال والوں نے فارسی طرز پر مرتب کیا ہوا دیوان اردو نہیں دیکھا تھا۔ ولؔی کا یہ دیوان ان کے سامنے پہلا باقاعدہ اردو دیوان تھا جیسا کہ حاتم کے بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے ''جس شخص نے اس فن میں سب سے پہلے دیوان مرتب کیا وہ (ولؔی) تھا''۔ اس دیوان کی غزلیں تو اردو میں تھیں لیکن مزاج، آہنگ، تراکیب و بندش اور مضامین کے اعتبار سے وہ فارسی غزلوں کی طرح تھیں۔

ولی کی غزلوں میں تراکیب، تشبیہات اور استعارات اس قدر چست اور دلکش ہیں کہ شعر میں جان ڈال دیتے ہیں۔ انھوں نے نئی نئی تشبیہات وضع کیں جس نے ایک طرف کلام کی اہمیت و قدر میں اضافہ کیا دوسری طرف اردو کے دامن کو وسیع کیا۔ ولؔی میں ہندوستانی عنصر نمایاں ہے۔ ہندوستانی تلمیحات، فارسی محاورات و تراکیب اور ہندی الفاظ کو بھی انھوں نے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

ولی کے کلام کا حسن کسی ایک بات میں نہیں ہے۔ روانی، رنگینی، تنوع، رمزیت، احساس، زبان کی صفائی و چستی، ہندوستانی و فارسی عناصر کا امتزاج، دلکش الفاظ اور خوب صورت تراکیب وغیرہ نے مجموعی طور پر ولؔی کی شاعری کو وہ رنگ و روپ بخشا ہے جس نے اس کے کلام کو دوسرے تمام ہم عصر شعرا سے ممیز کر دیا ہے۔

ولؔی کا ایک بلاواسطہ اثر دہلی کی شاعری پر یہ پڑا کہ شمالی ہند میں شعر گوئی کی ابتدا ان شعرا کے ہاتھوں ہوئی جنھوں نے ولی کے اتباع میں ریختہ میں شعر کہنا شروع کیا۔ ولی کی تقلید میں دلی کا ہر شاعر صاحبِ دیوان ہونا چاہتا تھا لیکن انھیں ریختہ پر عبور نہ تھا اس لیے ایہام گوئی کا سلسلہ شروع ہوا جس کا زمانہ میرؔ و سوداؔ کے وقت تک رہا۔ ولؔی کے دیوان میں فارسی شعرا کے دواوین کی طرح حقیقی جذبات و احساسات کی ترجمانی بھی تھی۔ فلسفہ و تصوف، حسن و عشق بھی تھا اور زندگی کے عام تجربات و مشاہدات بھی اس کلام کو دیکھ کر نئے شعرا کو یوں محسوس ہوا کہ یہی وہ شاعری ہے جس کی انھیں تلاش تھی اور یہ کہ وہ خود بھی ایسی ہی شاعری کر سکتے ہیں کیوں کہ یہ شاعری فارسی کے بجائے اردو میں تھی۔ دیوانِ ولی نے ان شعرا کی تخلیقی قوتوں کو ایک کھلا راستہ دکھا دیا۔ دیوانِ ولی کا یہ اثر براعظم کے سارے اردو شعرا پر پڑا اور دیوانِ ولی سب کے لیے ایک نمونہ بن گیا۔ دکن میں سراجؔ اورنگ آبادی، داؤدؔ اورنگ آبادی، فقیر اللہ آزادؔ، شاہ قاسم علی قاسمؔ اور شاہ ترابؔ اسی رنگ سخن کی پیروی کر کے اس پر فخر کر رہے تھے۔ دہلی میں آبروؔ، ناجیؔ، مضمونؔ، حاتمؔ، یکرنگؔ اور فائزؔ وغیرہ دیوانِ ولؔی کو آنکھوں کا سُرمہ بنائے ہوئے تھے۔

ولؔی کے اس اثر کا اظہار و اعتراف عام طور پر اس دور کے شعرا نے اپنے کلام میں کیا ہے۔ یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں ولؔی کی

عظمت کا اور اثر قبول کرنے کا اعتراف کیا گیا ہے۔ سراجؔ اورنگ آبادی فرماتے ہیں :

تجھ مثل اے سراجؔ بعد ولیؔ
کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

داؤدؔ کہتے ہیں :

کہتے ہیں سب اہل سخن اس شعر کوں سن کر
تجھ طبع میں داؤدؔ ولیؔ کا اثر آیا

ایک اور جگہ داؤدؔ نے کہا ہے :

علی کی ہے قسم سن شعر تیرا
کہے عالم ولیؔ ثانی نہیں ہے

آبروؔ لکھتے ہیں :

آبرو شعر ہے ترا اعجاز
گو ولیؔ کا سخن کرامت ہے

حاتمؔ کا اعتراف عظمت پڑھیے :

حاتمؔ یہ فن شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں
لیکن ولیؔ، ولیؔ ہے جہاں میں سخن کے بیچ

ہر بڑے شاعر کی طرح دیوانِ ولیؔ میں بھی بہت سے رنگ موجود تھے۔ ہر شاعر نے اپنی پسند کے مطابق، ولیؔ کی شاعری سے اپنا محبوب رنگ لیا ہے۔ آبروؔ، مضمونؔ، ناجیؔ اور حاتمؔ نے فارسی شعرائے متاخرین کی مروجہ روایت کے زیر اثر جس میں ایہام گوئی نمایاں میلان کا درجہ رکھتی تھی۔ دیوانِ ولیؔ سے متاثر ہو کر اپنی شاعری کی بنیاد ایہام گوئی پر رکھی تھی۔ یہ طرز شاعری چوں کہ تقاضائے وقت کے مطابق اور اس دور کے مزاج کا حامل تھا۔ اس لیے اتنا مقبول ہوا کہ برعظیم کے سب چھوٹے بڑے شاعروں کا پسندیدہ طرز بن گیا۔ یہ بات ضرور ذرا حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ ایہام گوئی، ولیؔ کا بنیادی رنگِ سخن نہ ہونے کے باوجود کیسے شمال میں ریختہ کے عام رواج کے ساتھ، ایک غالب رجحان کی شکل اختیار کر گئی۔

اردو ادب کی تاریخ میں ولیؔ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ولیؔ کے ہم عصروں نے انھیں اعلیٰ درجے کا شاعر تسلیم کیا۔ خدائے سخن میر تقی میر نے انھیں ریختہ کا مسلم الثبوت استاد کہا ہے۔ محمد حسین آزادؔ نے انھیں اردو شاعری کا باوا آدم قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ولی دکنی اردو کے دورِ اوّل کے خاتم الشعرا تھے۔ ولیؔ کی شاعری دراصل غزل کی شاعری ہے۔ بقول محمد حسین آزاد جس چیز نے انھیں شہرت عام اور بقائے دوام بخشی وہ غزل ہی ہے۔ اردو ادب میں ولی کا مقام متعین کرنے کے لیے ان کی غزلوں سے ہی بحث کرنا کافی ہوگا۔ ان کی غزلوں کے محاسن درج ذیل ہیں۔

(1) زبان کی شستگی :

ولیؔ سے پہلے بھی اردو شاعری میں غزل کی روایت موجود تھی لیکن دکنی اور گجراتی زبانوں کی نامانوسیت، اس کی سحر طرازی میں مانع تھی۔ ولی نے دکنی کو اس حد تک شستہ کیا کہ وہ غزل کی سحر طرازی کے وصف کو بروے کار لا سکے۔

(2) شدتِ تاثر :

سوز و گداز کی کیفیت سے خالی ہونے کے باوجود ولی کی غزلوں میں احساس و تاثر کی شدت ہے ۔ انھوں نے اپنے تاثرات کو اچھا لب و لہجہ اور عمدہ طرز ادا دیا۔

(3) نشاطیہ عنصر :

ولؔی کی غزلوں میں مریضانہ کیفیت نہیں ہے ۔ ان کے کلام کو پڑھ کر غم کی کیفیت پیدا ہونے کے بجائے طبیعت پر شگفتگی طاری ہوجاتی ہے۔

ولؔی کا اثر صرف شمالی ہند اور بالخصوص دہلی ہی کی شاعری پر نہیں ہوا بلکہ دکن کی شاعری پر بھی ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ ولؔی سے پیش تر دکنی شعرا نے ولی کی تقلید میں دکنی زبان ترک کر کے ریختہ میں شاعری کی۔ ایسے شعرا میں سراؔج ' داؤؔد' عزلتؔ اور عاجزؔ کا نام خصوصیت سے لیا جاسکتا ہے

اپنی معلومات کی جانچ

1. مغلیہ حکومت کی سرکاری زبان کون سی تھی؟
2. ولؔی کی آمد سے پہلے شمالی ہند کے کن شاعروں نے اردو میں طبع آزمائی کی؟
3. ولؔی کی اتباع میں شمالی ہند کے کن شاعروں نے اردو میں شعر گوئی کا آغاز کیا؟
4. ولؔی کی شاعری پر ایک مختصر نوٹ لکھیے ۔
5. شمالی ہند کے کسی شاعر کا ایک ایسا شعر لکھیے جس میں ولؔی کی عظمت کا ذکر ہو۔

12.4 شمالی ہند کی شاعری میں ایہام گوئی

ایہام گوئی ایک شاعرانہ صفت ہے جس میں کسی شعر میں ایک یا ایک سے زائد الفاظ کو دو معنی میں استعمال کیا جاتا ہے ۔ خدائے سُخن میر تقی میر نے ایہام کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایہام میں جس اصطلاح پر مصرعے کا مفہوم موقوف ہوتا ہے اسے دو معنوں کا حامل ہونا چاہئیے ۔ ایک قریبی اور دوسرا بعید' جب کہ مصرع کا حقیقی مفہوم بعید کے معنوں میں پوشیدہ ہوتا ہے ۔ قریبی معنوں میں نہیں ۔

مندرجہ ذیل شعر سے یہ تعریف زیادہ واضح ہو سکے گی ۔ تلوار کی تعریف کے باب میں میر انیس کا شعر ہے ۔

دم میں ستمگروں کا بہا کر لہو پھری
سر کاٹ کے جدھر سے پھری سُرخرو پھری

اس لفظ ''سرخرو'' دو معنوں کا حامل ہے بظاہر ''سرخرو'' کے معنی کامیاب کے ہیں مگر اس کے دوسرے معنی ''سرخ چہرے'' کے ہیں اور یہاں پر یہی بعید معنی مقصود ہے یعنی لہو کی وجہ سے تلوار کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اردو میں محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں یعنی اٹھارہویں صدی عیسوی میں ایہام گوئی کی تحریک شروع ہوئی۔ شبلی نے اس دور کو ایہام کا عہد قرار دیا ہے ۔ ایہام گوئی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ شاعری اظہارِ جذبات کے بجائے الفاظ کی کاریگری بن گئی۔ جس شاعر نے ایہام گوئی میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی وہ شاہ مبارک آبرؔو ہیں۔ انھیں ایہام گویوں کا رہنما کہا جاتا ہے ۔ ان کے مقلدوں میں مضمونؔ' شاکرؔ' ناجیؔ' یکرنگؔ اور فغاںؔ کے نام قابل ذکر ہیں ۔

ان شعرا کے عہد ہی میں ایہام گوئی کے خلاف زبردست ردِعمل شروع ہوا۔ سب سے پہلے مرزا مظہرؔ جانِ جاناں نے ایہام گوئی کے خلاف برملا آواز بلند کی ۔ بعد میں قائمؔ' دردؔ اور سوداؔ نے ایہام گوئی کے خلاف زبردست جہاد کیا۔

ایہام گوئی کے بارے میں محمد حسین آزاد نے خیال ظاہر کیا کہ یہ ہندی دوہوں کے زیر اثر شروع ہوئی مگر ڈاکٹر محمد صادق نے اپنی کتاب "A History of Urdu Literature" میں اس خیال سے اس بنیاد پر اختلاف کیا ہے کہ ایہام کی صنعت فارسی شاعری میں موجود تھی۔ زیادہ قرین قیاس خیال یہ ہے کہ اردو شعرا اس صنعت سے فارسی شاعری کے توسط سے مگر اس صنعت کو ہندی دوہوں کی وجہ سے فروغ نصیب ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اٹھارہویں صدی کے وسط میں اردو کو ہندی عناصر سے پاک کرنے کی مہم شروع ہوئی تو سب سے پہلا وار اسی ایہام گوئی پر ہوا۔

ایہام گوئی اتنا آسان فن نہیں ہے جتنا نظر آتا ہے۔ ایک طرف مضمون پیدا کرنا اور دوسری طرف اس مضمون کے لیے ایک ایسا لفظ تلاش کرنا جس سے شعر کے مفہوم کو دوہری سطح پر معنی کے رشتے میں پرویا جاسکے یہ آسان بات نہیں ہے۔ اس کے لیے علم، ہنر، مشق اور سنجیدہ کاوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سنجیدگی اپنے معنوی ابتذال کے باوجود ہمیں ہر ایہام گو شاعر کے ہاں نظر آتی ہے۔ صنعت ایہام میں چند ایسی خوبیاں ہیں کہ اوسط درجے کے مذاق کے لوگ بھی شعر سے متاثر و لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ ایہام گویوں کے ہاں لفظ تازہ کی تلاش سے نہ صرف زبان میں الفاظ و مرکبات کی تعداد بڑھی بلکہ اردو شاعری کا ایک مخصوص لہجہ بھی تشکیل پانے لگا جو فارسی سے متاثر ہونے کے باوجود اس سے الگ اور ممتاز تھا۔ ایہام گویوں کی اس کوشش سے سینکڑوں ہندوی و مقامی الفاظ اس طور پر استعمال ہوئے کہ اردو زبان کا جزو بن گئے۔ نہ صرف الفاظ بلکہ ہندی شاعری کے مضامین، خیالات اور اس کے امکانات بھی اردو شاعری کے استعمال میں آ گئے۔ ایہام گوئی شاعری و زبان کا ایک فطری طرز ہے لیکن جب اس دور کے شعرا نے اصول شعر کے طور پر اسے کثرت سے استعمال کیا تو یہ طرز پامال ہو کر مبتذل ہوگیا اور نئی نسل کے شعرا نئے رجحانات کی تلاش میں تازہ گوئی کی طرف چلے گئے۔ اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی ہوئی کہ نادرشاہ کے حملے اور قتل عام کے بعد اس معاشرے کا اندازِ فکر اور رویہ بھی بدل گیا۔ خود محمد شاہ جو اپنی رنگ رلیوں کی وجہ سے رنگیلا کہلاتا تھا فقیروں کی صحبت میں بیٹھنے لگا۔ فقیروں کی صحبت میں بیٹھنا اس بات کا اشارہ ہے کہ ہوا کا رخ بدل گیا ہے جس کی وجہ سے یہ رجحان بھی اپنے تہذیبی سوتوں سے کٹ کر تیزی سے مردہ ہونے لگا۔

اس دور کا ایک اہم رویہ ''عشق'' ہے۔ اس عشق کا تعلق کسی گہری روحانی و ارادت یا باطنی کیفیت سے نہیں ہے بلکہ دوسرے معاشرتی عوامل کی طرح اس کا سارا زور ظاہر پرستی پر ہے۔ اسی لیے محمد شاہی دور کی شاعری میں کسی گہرے باطنی تجربے سے پیدا ہونے والے سوز و گداز کا پتا نہیں چلتا۔ یہ عشق چلتا پھرتا عشق ہے۔ کسی عورت کو دیکھا (یہ عورت عام طور پر طوائف ہے جسے مال و دولت سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔) چند روز اس کے عشق میں مبتلا رہے آہیں بھریں، گھر در کے چکر کاٹے، اس کے ملنے والوں سے ملے اور جب وصال نصیب ہوا تو کچھ عرصے کے بعد عشق کا خمار بھی اتر گیا اور اب عاشق نئے عشق کے لیے پھر سے تیار ہوگیا۔

اسی دور کی شاعری کا ایک اور نمایاں رجحان ''امرد پرستی'' ہے۔ ہندی شاعری میں عورت مرد سے اظہار عشق کرتی ہے۔ عربی شاعری میں مرد عورت سے اظہار عشق کرتا ہے۔ فارسی شاعری میں مرد اپنے جذبات کا اظہار مرد ہی سے کرتا ہے۔ چوں کہ اردو شاعری، فارسی زبان کے زیر اثر رہی اس لیے ظاہر ہے کہ ''امرد پرستی'' کا رجحان بھی اردو شاعری میں عام ہوگیا خصوصاً شعرائے دہلی کی شاعری میں ایسے اشعار موجود ہیں۔

اس معاشرے نے امرد پرستی کیوں اختیار کی اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مرد نے عورت کو باہر کی دنیا سے کاٹ کر چاردیواری میں بند کردیا تھا۔ ہر بڑے گھر میں مردانے اور زنانے الگ الگ حصوں میں تقسیم تھے جن میں ہر طرح کی پردہ داری ہوتی تھی۔ پردہ دار عورت سے اظہار عشق کرنا نہایت معیوب اور بے غیرتی کی بات سمجھی جاتی تھی۔ مرد، عورت کے جلوے سے محروم تھا اس کی تلافی اس نے کمسن لڑکوں سے کی۔ کمسن لڑکوں سے عشق کرنا ایران میں عام تھا جس میں عوام و خواص اور شعرا سب ملوث تھے۔ یہی روایت اردو میں بھی چل پڑی۔ قدیم زمانے میں ''امرد پرستی'' یونانی معاشرے میں بھی نظر آتی ہے۔ شمالی ہند کے ریختہ گویوں میں آبرو پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں جنھوں نے ولی کے انداز پر اپنا دیوان ریختہ مرتب کیا۔ شمالی ہند کے اس پہلے صاحبِ دیوان شاعر، محمد شاہی تہذیب کے نمائندہ اور ایہام گویوں کے مبتدی نجم

الدین شاہ مبارک آبروؔ گوالیار میں پیدا ہوئے ابتدائے جوانی میں دہلی آ گئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔

آبروؔ، سراج الدین علی خان آرزوؔ کے شاگرد اور رشتے دار تھے۔ آبروؔ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ حسن پرستی، عشق بازی، بزم آرائی، امرد پرستی کا ماحول تھا۔ زندگی سے وقتی لذت، جسمانی لطف اور نشاط حاصل کرنے کی خواہش، رندی اور کیف و سرور اور سرمستی میں سب مشغول تھے۔ آبروؔ نے جب شاعری کا آغاز کیا تو فارسی روایت کے علاوہ بھا کا شاعری بھی ان کے سامنے تھی۔ آبرو گوالیار کے رہنے والے تھے جو بھا کا کا علاقہ ہے۔ بھا کا شاعری بھی عوام میں مقبول تھی اس کے اشعار عوام کی زبان پڑ چڑھے ہوئے تھے۔ آبروؔ نے اپنی شاعری میں اصنافِ سخن تو فارسی کے برقرار رکھے تلمیحات فارسی اور ہندی دونوں سے لے کر محمد شاہی دور کا تہذیبی مزاج اس میں شامل کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی شاعری کی زبان میں بھا کا کے الفاظ بھی استعمال کیے۔

آبروؔ ایک قادرالکلام شاعر ہے وہ مشکل سے مشکل زمینوں میں بھی اس دور میں جب کہ روایت اپنی ابتدائی منزل میں ہے مربوط اور رواں شعر کہے ہیں۔ مشکل قافیوں کو بامعنی انداز میں اپنے تصرف میں لایا ہے۔ آبروؔ کی شاعری کا وہ حصہ جس میں جذبوں کی صداقت اور احساس کی سچائی، اثر و تاثر جگاتی ہے اس میں حسن بیان بھی ہے۔ روزمرہ بھی ہے اور محاورے کی رچاوٹ بھی رس گھولتی نظر آتی ہے۔ زبان کی پختگی کے آثار بھی نمایاں ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ اشعار شاعر کے دل کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں۔ وہ انسان کے آفاقی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہاں شعر ایہام برائے ایہام نہیں کہا جاسکتا، یہاں تو ذو معنی لفظوں کی مدد سے معنی میں ربط پیدا نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ صنایع، ایہام اور دوسری فنی خصوصیات فطری طور پر جذبے کے اظہار کا سہارا بن رہی ہیں۔ یہ وہ شاعری ہے جو آج بھی ہمیں اسی طرح متاثر کرتی ہے جس طرح اپنے دور میں سننے والوں کو کرتی تھی۔

دوسرے مشہور و ممتاز ایہام گو شعرا میں ناجیؔ اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ناجیؔ کا نام محمد شاکر تھا۔ ناجیؔ تخلص کرتے تھے دلی کے رہنے والے تھے یہیں پیدا ہوئے اور یہیں پروان چڑھے اور یہیں وفات پائی۔ خدائے سخن میرؔ سے ان کی ملاقاتیں بھی رہیں۔ پیشے کے اعتبار سے وہ سپاہی تھے۔ ناجی کا دیوان شروع سے آخر تک ایہام میں ڈوبا ہوا ہے۔ ناجیؔ اپنی شاعری میں اسی دائرے میں رہتے ہیں۔ یہی ان کی شاعری کا مقصد اور یہی ان کی منزل ہے۔ ناجی کے ہاں غزلیں ایہام کے ہی رنگ میں رنگی ہوتی ہیں۔ ایہام کو برتنے کی اس شعوری کوشش کی وجہ سے ناجی کی شاعری جذبے و احساس سے عاری ہوگئی اور ان کے دیوان میں بہت کم اشعار ایسے رہ گئے جو آج ہماری توجہ کو اپنی طرف مبذول کرا سکیں۔ ناجی کو زمین و آسمان کے درمیان ہر شئے اور عمل میں ایہام اور صرف ایہام نظر آتا ہے۔ وہ ایک قادرالکلام شاعر تھے جن کے ہاں رباعیات، قصائد، فردیات اور مراثی موجود ہیں۔

ایہام گوئی کی بنیاد رکھنے والوں میں تیسرا شاعر شیخ شرف الدین مضمونؔ ہے۔ مضمونؔ، سراج الدین علی خان آرزوؔ کے شاگرد تھے۔ اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ شاہ جہاں آباد (دلی) میں سکونت اختیار کی۔ ساری عمر ''زینت المساجد'' نامی مسجد میں رہے اور یہیں وفات پائی۔ نزلے سے مضمون کے سارے دانت گر گئے تھے۔ اس لیے آرزوؔ اپنے شاگردِ رشید مضمونؔ کو ''شاعرِ بیدانہ'' کہا کرتے تھے۔ طبعاً ظریف، ہشاش بشاش اور مجلسی انسان تھے۔ مضمونؔ کا دیوان نایاب ہے۔ مختلف تذکروں میں جو اشعار ملتے ہیں ان کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایہام گو شاعر ہیں لیکن چونکہ کم گو تھے اور شعر صرف اس وقت کہتے تھے جب کوئی نیا مضمون سوجھتا تھا۔ ان کے اشعار ایہام گوئی کے باوجود شگفتہ و دلنشین ہیں۔ مضمونؔ کے ہاں عام طور پر ایہام گوئی میں کھینچ تان کر مضمونؔ پیدا کرنے کی کوشش کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ان کے اشعار میں اکثر صنعتِ ایہام مضمونؔ کا حصہ بن جاتے ہیں اور شعر میں صفائی اور بے ساختگی پیدا ہو جاتی ہے۔

مصطفیٰ خان یکرنگ بھی مضمونؔ کے معاصر اور انھیں کے طرز میں شعر کہتے تھے۔ یکرنگ دلی کے رہنے والے تھے۔ خانِ جہاں لودھی کے نبیرہ اور محمد شاہ کے منصب دار تھے۔ صاحب دیوان شاعر تھے۔ یکرنگؔ کا کلام ایہام کے رنگ میں ضرور ہے لیکن ان کے ہاں ایہام کی وہ شدید صورت نہیں ملتی جو آبرو ناجیؔ کے ہاں نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں قدیم زبان اور ہندی کے اثرات بھی اتنے کم ہو گئے ہیں کہ اسے مظہرؔ اور

مضمونؔ کے رنگِ سخن کی درمیانی کڑی کہا جاسکتا ہے۔ آبروؔ اور ناجیؔ کے کلام کے بعد یکرنگ کے بعض اشعار پڑھ کر تازہ دم ہوا کے جھونکوں کا احساس ہوتا ہے۔ کلام میں سادگی بھی ہے اور جذبات و احساسات کا اظہار بھی ملتا ہے۔

ان چار ایہام گوشعرا کے علاوہ احسن اللہ احسن بھی ایہام گوشاعر ہیں۔ لیکن ان کے ایہام میں کوئی ایسی امتیازی خصوصیت نہیں ہے کہ ان کو منفرد ایہام گوشاعر کہہ سکیں ۔ یہی صورت شاہ ولی اللہ اشتیاق کے کلام میں نظر آتی ہے یعنی رنگِ سخن سعادت علی امروہوی کا ہے۔ یہ وہی سعادت علی ہیں جنھوں نے خدائے سخن میر تقی میرؔ کو ریختہ میں شعر کہنے کی ترغیب دی تھی۔ سعادت علی امروہوی صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ایہام گوئی کی طرف مائل تھے۔

عبدالوہاب یکروؔ بھی اس زمانے کے ایہام گوشاعر تھے۔ ان کے دیوان کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں کوئی انفرادی رنگ نہیں چھوڑا۔ ایہام گوئی کے اشعار ان کے دیوان میں جابجا نظر آتے ہیں۔ میر محمد سجاد ایہام گوشعرا میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

ایہام گوئی کے اس دور کی شاعری میں جذبہ و احساس دب گیا تھا۔ اس لیے اس دور کی شاعری' دستکاری کا نمونہ تو بن گئی ہے لیکن شاعری نہیں رہی۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ایہام گوئی کسے کہتے ہیں ؟
2. چند ایہام گوشعرا کے نام بتایئے ۔
3. امرد پرستی سے کیا مراد ہے ؟
4. آبروؔ یا ناجیؔ کی شاعری پر ایک نوٹ لکھیے ۔

12.5 خلاصہ

دلی میں باقاعدہ اردو شاعری کا آغاز تو ولیؔ کے دیوان کے اثر سے محمد شاہ کے زمانے سے شروع ہوتا ہے لیکن اس سے پیش تر بھی اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ خود ولیؔ 1112ھ میں دہلی آئے تھے اور اسی وقت سے ان کے کلام کی مقبولیت نے بہتوں کو اس طرف راغب کرلیا تھا۔ اسی رغبت کو دیکھ کر بعد میں حاتم' آبروؔ' فائزؔ وغیر نے اردو میں شعر کہنا شروع کردیا۔ ولی سے پیش تر دہلی میں کوئی سنجیدہ شاعر ادھر مائل نہیں دکھائی دیتا تھا۔ ولی سے شمالی ہند کے شعرا بہت متاثر ہوئے ۔ خاص طور پر اردو شاعری کو انھوں نے پسند کیا اور اردو میں شاعری کرنے لگے۔ فارسی سرکاری زبان ہونے کے علاوہ شعر و ادب کی زبان بھی تھی۔ ولی سے متاثر ہوکر شمالی ہند کے شعرا نے ان کے کمالِ انفرادیت سے انکار نہیں کیا۔ ولیؔ کا کلام شمالی ہند کے شعرا کے لیے ایک مینارۂ نور سے کم نہیں تھا۔

وہ شعرا جنھوں نے ولیؔ کے کلام اور دیوانؔ کے زیر اثر اردو میں شاعری شروع کی' ان کی ایک پہچان ایہام گوئی ہے۔ چوں کہ اردو میں شاعری کرنا انھوں نے اپنا مسلک قرار دیا تھا اور ولی کی نقل میں ان میں سے ہر ایک صاحبِ دیوان ہونا چاہتا تھا۔ اس لیے یہ دور ان ہی کے نام سے ''ایہام گویوں کا دور'' مشہور ہوا۔ ایہام گوئی کا دور دورہ اس وقت تک رہا جب تک کہ میرؔ' مرزاؔ' مظہرؔ اور یقینؔ نے اس کو مردود قرار نہ دے دیا۔

ولیؔ کی دہلی میں آمد سے شمالی ہند میں تیزی سے اردو شاعری کا چرچا ہوگیا۔ دہلوی شعرا کے کلام اور زبان میں جو خوبیاں در آئیں اس کے ذمہ دار ولیؔ تھے۔ ولیؔ کی زبان و بلاغت کا یہ اثر ہوا کہ بیدلؔ جیسا استاد فارسی بھی ریختہ یعنی اردو شاعری کی طرف متوجہ ہوا اور اردو میں ایک غزل کہہ دی ۔

ولی کا اثر صرف شمالی ہند اور بالخصوص دہلی ہی کی شاعری پر نہیں ہوا بلکہ دکن کی شاعری پر بھی ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ دکن میں ولؔی سے پیش تر دکنی زبان میں شعر گوئی موجود تھی لیکن وہ محض دکنی زبان میں تھی۔ جب عالمگیر نے اورنگ آباد کو اپنا مستقر بنایا دہلی اور شمالی ہند کی کثیر آبادی اورنگ آباد میں بس گئی۔ اس کثیر آبادی کے اثر سے شمالی ہند کی زبان اورنگ آباد اور دکن کی زبان میں مقبول ہونے لگی۔ ایہام گوشعرا نے زبان کو مربوط اور باقاعدہ بنانے میں زیادہ کوشش کی اور کامیاب ہوئے۔ صحت الفاظ اور اصلاح زبان کی کوشش میں شاہ حاتم سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایہام گوئی کو پروان چڑھانے میں آبرؔو، ناجؔی، یکرنگؔ، مضمونؔ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

12.6 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. ولؔی کی آمد سے پہلے شمالی ہند کے ادبی ماحول پر روشنی ڈالیے۔
2. شمالی ہند میں اردو کے آغاز پر ایک نوٹ لکھیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. ایہام گوئی کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے اور شمالی ہند کے شعرا کے کلام سے چند مثالیں دیجیے۔
2. شمالی ہند کے ایہام گوشعرا کے حالاتِ زندگی اور شاعری پر روشنی ڈالیے۔

12.7 فرہنگ

ایہام	=	وہم میں ڈالنا، شعر میں وہ صنعت جس میں شاعر ایک لفظ کے دو معنی لائے
تلمیحات	=	کسی قصے کی طرف اشارہ کرنا، واحد تلمیح
امرد پرستی	=	نوخیز، کمسن لڑکوں سے دل لگانا
بلاغت	=	کلام میں انتہائی درجے کو پہنچنا
رندی	=	مستی، شراب کا نشہ، بے خودی
افراتفری	=	ہل چل، پریشانی، گھبراہٹ
شغف	=	کمال، دلچسپی، بے حد محبت
پروان چڑھنا	=	آگے بڑھنا، ترقی کرنا
عنانِ حکومت	=	حکومت کی باگ ڈور
طوائف الملوکی	=	دور انتشار، بدامنی
استفادہ	=	فائدہ حاصل کرنا
مبالغہ	=	کسی بات کو بڑھا کر بیان کرنا
مروج	=	رائج دینے والا، چلانے والا
رمزیت	=	اشارہ، بات، پیچ دار بات

ندرت = نیاپن، انوکھا پن، کمیاب

متروک = ترک کیا ہوا، چھوڑا ہوا

اتباع = پیروی کرنا، تقلید کرنا

مستعار = مانگا ہوا، ادھار

مبتذل = ذلیل، حقیر، رذیل

ممیّز = تمیز کیا ہوا، پہچانا گیا

تنوع = مختلف رنگ کا ہونا

اعتراف = اقرار کرنا، تسلیم کرنا

آہنگ = نغمہ، آواز

رجحان = میلان، توجہ

سحر طرازی = جادو سا کر دینا

نشاطیہ عنصر = خوشی یا شادمانی کی باتیں

قادر الکلام = جس کو کلام پر قابو ہو

ہشاش بشاش = بہت خوش، باغ باغ

مستقر = ٹھہرنے کی جگہ، ٹھکانا

مسلک = طریقہ، قاعدہ

دستکاری = ہنر، ہاتھ کا کام

تصنع = بناوٹ

12.8 سفارش کردہ کتابیں

1. ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — دلی کا بستان شاعری
2. ڈاکٹر جمیل جالبی — تاریخ ادب اردو (جلد اول و دوم)
3. ڈاکٹر شارب ردولوی — مطالعہ ولی
4. ڈاکٹر اعجاز حسین — مختصر تاریخ ادبِ اردو

اکائی : 13 فورٹ ولیم کالج سے پہلے اُردو نثر

ساخت

13.1 تمہید

13.2 اوّلین نقوش

13.3 بیجاپور میں اردو نثر

13.4 گولکنڈہ میں اردو نثر

13.5 بیجاپور و گولکنڈہ کے زوال کے بعد اردو نثر

13.6 شمالی ہند میں اردو نثر

13.7 خلاصہ

13.8 نمونۂ امتحانی سوالات

13.9 فرہنگ

13.10 سفارش کردہ کتابیں

13.1 تمہید

زبان، خیالات کی ترسیل کا وسیلہ ہے۔ زبان کے ذریعے فکر و خیال کا اظہار دو طریقوں سے انجام پاتا ہے۔ ایک نظم اور دوسرے نثر۔ نثر کے لغوی معنیٰ ہیں پراگندہ، بکھرا ہوا، پھیلا ہوا، تتر بتر۔ لیکن اصطلاح میں نثر اس کلام کو کہتے ہیں جو نظم نہ ہو۔ نظم میں عام طور پر بحر اور وزن کی پابندی کی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف نثر میں بحر اور اوزان نہیں ہوتے۔

نثر جذبات و احساسات اور افکار و خیالات کے اظہار کا وہ اسلوب ہے جو خارجی اور داخلی خصوصیات کے اعتبار سے نظم یا شاعری سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ شاعری کے مقابلے میں نثر میں اظہار کی بڑی سہولتیں اور وسعتیں پائی جاتی ہیں۔ ہم اپنی روزمرہ کی گفتگو میں نثر ہی سے کام لیتے ہیں اور اسی کے ذریعے آپسی معاملات، لین دین اور کاروباری امور طے کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ علوم وفنون، حکیمانہ افکار اور لطیف خیالات کی ترسیل میں بھی نثر سے کام لیا جاتا ہے۔ انسان کی سماجی اور تہذیبی سرگرمیوں میں نثر کا اہم کردار ہوتا ہے۔

جب ہم اردو نثر کے ارتقا کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ اس کے ابتدائی ارتسامات، مختصر جملوں اور فقروں کی شکل میں مختلف صوفیائے کرام کے ملفوظات میں ملتے ہیں۔ قدیم تاریخ، تذکروں اور ملفوظات کے مجموعوں میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، بابا فرید گنج شکر، شیخ حمید الدین ناگوری، شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی، سید زین الدین داود خلدآبادی، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، خواجہ بندہ نواز گیسودراز اور شاہ قطب عالم وغیرہ متعدد صوفیائے کرام کے اردو فقرے نقل کیے گئے ہیں۔ بزرگانِ دین کے یہ اقوال اور ملفوظات اردو نثر کی خشتِ اوّل ہیں۔ انہیں پر مستقبل کے نثری رسالوں کی عمارت استوار ہوئی۔

اس اکائی میں اردو نثر کے آغاز سے فورٹ ولیم کالج کے قیام تک، اردو کے اہم نثر نگاروں اور ان کی تصانیف کے توسط سے اردو نثر کے ارتقا کا مطالعہ کریں گے۔

13.2 اوّلین نقوش

اردو نثر کے ارتقا کی تاریخ کا ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ اردو کی پہلی نثری کتاب کون سی ہے اور اس کے مصنف کون ہیں؟ اس سلسلے میں

مختلف ادبی مورخوں اور محققوں نے مختلف نام پیش کیے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

سید جہانگیر اشرف سمنانی

سید جہانگیر اشرف (متوفی 708 ھ) آٹھویں صدی ہجری کے صوفی بزرگ تھے۔ 23 سال کی عمر میں انہوں نے سمنان کی بادشاہت چھوڑی اور ہندوستان آ کر مختلف علما وصلحا سے ظاہری و باطنی فیض حاصل کیا۔ پروفیسر حامد حسن قادری نے ''داستانِ تاریخ اردو'' میں لکھا ہے کہ سید جہانگیر اشرف نے 708 ھ میں اردو میں تصوف پر ایک رسالہ لکھا تھا۔ اسے وہ اردو کی پہلی نثری تصنیف قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے دعوے کی بنیاد میر نذر علی درد کاکوروی کے مضمون ''اردو اور شمالی ہند'' پر رکھی جو رسالہ ''یادگار'' لاہور میں چھپا تھا۔ میر نذر علی کا بیان ہے کہ انہوں نے یہ رسالہ اورنگ آباد میں شاہ قادر اولیا کی درگاہ کے ایک خادم محبوب علی شاہ کے ہاں دیکھا تھا۔ نذر علی نے اس کتاب کا صرف دوسطری اقتباس دیا ہے جس کی زبان جدید معلوم ہوتی ہے۔ اب یہ کتاب ناپید ہے اور اس رسالے کے سارے شواہد کمزور ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اس رسالے کے اصلی ہونے کے بارے میں شبہے کا اظہار کیا تھا۔ اس لیے اس گم گشتہ رسالے کو اردو کی پہلی نثری تصنیف نہیں کہا جاسکتا۔

شیخ عین الدین گنج العلم

یہ 706 ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ علوم دینیہ کی تکمیل کے لیے گجرات کا سفر کیا۔ وہاں سے دولت آباد (دیوگیری) آئے اور سید خوندمیر علاء الدین چشتی کے مرید ہوگئے۔ اس کے بعد 737ھ میں عین آباد ساگر گئے وہاں کافی مدت گزارنے کے بعد 773 میں بیجاپور چلے گئے جہاں 795ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ شیخ عین الدین گنج العلم نے فارسی میں متعدد کتابیں لکھیں۔ حکیم شمس اللہ قادری لکھتے ہیں:

> ''آپ نے چھوٹے چھوٹے کئی رسالے دکنی زبان میں تصنیف کیے تھے۔ منجملہ ان کے تین رسالے ایک مجموعے میں کالج قلعہ سینٹ جارج کے کتب خانے میں موجود تھے۔ ان کے اوراق کی مجموعی تعداد چالیس تھی اور ان میں فرائض وسنن کے متعلق احکام ومسائل تحریر تھے'' (اردوے قدیم ص 41)

حکیم صاحب نے اردوئے قدیم میں ان رسالوں کا سنہ تصنیف نہیں دیا لیکن انہوں نے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کو بتایا کہ یہ رسائل 725ھ کی تصنیف ہیں۔ (اردو نثر کا آغاز و ارتقا ص 85) عین الدین گنج العلم 737ھ میں ساگر اور 773ھ میں بیجاپور آئے اس لیے 725ھ میں دکنی' میں ان کا رسائل تصنیف کرنا بعید از قیاس ہے۔ حکیم شمس اللہ قادری نے ان رسائل کی نثر کا کوئی نمونہ بھی نہیں دیا۔ اور اب ان رسائل کا وجود بھی نہیں ہے اس لیے انہیں اردو کی اولین نثری تصانیف نہیں مانا جاسکتا۔

خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودراز

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز (825ھ۔720/21ھ) دکن کے مشہور بزرگ ہیں۔ یہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے مرید تھے۔ بچپن میں اپنے والد کے ساتھ دولت آباد آئے پھر دہلی واپس چلے گئے۔ 801ء میں جب دہلی پر تیمور کے حملے کے آثار ظاہر ہوئے تو وہ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ دہلی سے دکن کی طرف روانہ ہوئے اور مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے 803ھ میں گلبرگہ پہنچے جہاں 825ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ حضرت گیسودراز سے فارسی اور اردو میں بکثرت تصانیف منسوب ہیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ انہوں نے اپنی عمر (105 سال) کے بقدر 105 کتابیں لکھیں۔ حضرت گیسودراز کے مرید سید محمد علی سامانی نے اپنی تصنیف ''سیر محمدی'' میں گیسودراز کی 36 تصانیف کی فہرست دی ہے جو عربی یا فارسی میں ہیں۔ اردو میں کوئی کتاب نہیں ہے۔ اسی طرح گیسودراز کے پوتے سید یداللہ حسینی کی روایت سے عبدالعزیز بن شیر ملک نے ''تاریخ حبیبی و تذکرۂ مرشدی'' لکھی جس میں حضرت کی سوانح قلمبند کی گئی ہے۔ اس میں گیسودراز کی کسی اردو کتاب کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن اردو ادب کی تواریخ میں' متعدد اردو رسالوں کو جو صوفیانہ موضوعات پر لکھے گئے ہیں حضرت گیسودراز کی تصنیف قرار دیا گیا جیسے'' معراج العاشقین''۔'' ہدایت نامہ''۔'' تلاوت الوجود''۔'' سہ بارہ''۔'' شکار نامہ''۔ د''رالاسرار''۔'' تمثیل نامہ'' اور'' ہشت مسائل'' وغیرہ۔ ان میں ''معراج العاشقین'' کو بے حد شہرت حاصل ہوئی کیوں کہ اسے مولوی عبدالحق نے 1924ء میں اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا جس میں

انہوں نے اس کتاب کو حضرت گیسودراز سے منسوب کیا ہے۔ حضرت گیسودراز سے منسوب ہونے کی وجہ سے عام طور پر ''معراج العاشقین'' کو اردو کی پہلی نثری تصنیف مان لیا گیا ۔ لیکن بعد میں ڈاکٹر حفیظ قتیل نے مدلل طور پر گیسودراز سے اس کے انتساب کو رد کیا اور بتایا کہ ''معراج العاشقین'' گیسودراز کی نہیں بلکہ بارہویں صدی کے ایک بزرگ سید مخدوم شاہ حسینی بلگانوری کی تصنیف ''تلاوت الوجود'' کے خلاصے کا خلاصہ ہے۔

شاہ میراں جی شمس العشاق

میراں جی شمس العشاق (م 902ھ) بیجاپور کے مشہور صوفی تھے ۔ ان کا شمار دکن کے اوّلین شعرا میں ہوتا ہے۔ دکنی میں ان کی متعدد عارفانہ نظمیں دستیاب ہوئی ہیں اور دکنی نثر میں ان سے مختلف رسائل منسوب کیے گئے ہیں جن کی تفصیل ذیل میں دی گئی ہے ۔ ''اردوئے قدیم'' میں شمس العشاق کے دو رسائل ''جلترنگ'' اور ''گلباس'' کا ذکر کیا ہے ۔ چوں کہ یہ رسائل ناپید ہیں اس لیے ان کی تصدیق ممکن نہیں ہے۔

مندرجہ بالا رسائل کے علاوہ ''شرحِ مرغوب القلوب''۔ ''سب رس'' اور ''سبع صفات'' نامی رسالوں کو بھی میراں جی شمس العشاق کی تصنیف سمجھا گیا لیکن بعد کی تحقیق سے پتا چلا ہے کہ یہ شمس العشاق کی تصانیف نہیں ہیں ۔

پیر روشاں بایزید انصاری

پیر روشاں (متوفی 980ھ) کا تعلق صوبۂ سرحد سے تھا ۔ ان کی سب سے اہم تصنیف ''خیرالبیان'' ہے جس میں بیک وقت چار زبانوں میں مطالب بیان کیے گئے ہیں ۔ پہلے عربی میں پھر فارسی میں اس کے بعد پشتو اور اردو میں ۔ اسے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو نثر کا قدیم ترین نمونہ قرار دیا ہے ۔ (تاریخ ادبِ اردو جلد اول ص703) خیرالبیان کو حافظ محمد عبدالقدوس قاسمی نے مرتب کر کے 1967ء میں پشاور یونیورسٹی سے شائع کیا ہے ۔ اس کی نثر کا نمونہ درج ذیل ہے ۔

''لکھ کتاب کے آغاز کے بیان جن کے سارے اکھر سہن بسم اللہ تمام ۔ میں نہ گنواوں گا مزدوری انہن کی جے لکھیں پرن بگارن اکھر کے تمکنی پرن لکھیں اسی کارن جے سہی ہوے بیان''۔ (تاریخ ادب اردو جلد اول ص 704)

اب تک کی تحقیق کے مطابق ''خیر البیان'' اردو کا پہلا مستند نثری رسالہ ہے ۔ گیان چند جین کا خیال ہے کہ ''خیرالبیان'' کی زبان پر برج بھاشا کا اثر ہے۔ اس کی زبان سولہویں صدی کی دکنی کے مقابلے میں زیادہ قریب الفہم ہے (''تاریخ ادب اردو 1700ء تک'' ج 2 ص 326)

اپنی معلومات کی جانچ :

1. سید اشرف جہانگیر سمنانی کے رسائل کا ذکر کس نے کیا ؟
2. حکیم شمس اللہ قادری نے شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالے کو کہاں دیکھا تھا؟
3. میراں جی شمس العشاق سے کون کون سے نثری رسائل منسوب کیے گئے ؟
4. اردو کا پہلا مستند نثری رسالہ کون سا ہے؟ اس کے مصنف کون ہیں؟

13.3 بیجاپور میں اردو نثر

عادل شاہی عہد حکومت (1686ء م 1097ھ / 1490ء م 895ھ) کے دوران بیجاپور، علوم وفنون، شعر و ادب اور تہذیب و تمدن کے ایک اہم مرکز کے طور پر ابھرتا گیا ۔ سرزمین بیجاپور سے بے شمار فن کار اٹھے جنہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے علم وفن اور شعر و ادب کی دنیا میں نئے سنگ میل قائم کیے ۔ دبستان بیجاپور کے شاعروں نے دکنی زبان کو اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ۔ شعرا کے علاوہ بیجاپور میں نثر نگار بھی پیدا ہوئے جنہوں نے نہ صرف دکنی زبان میں نثر کی روایت کی داغ بیل ڈالی بلکہ اس روایت کو پروان بھی چڑھایا ۔ ذیل میں بیجاپور کے اہم نثر نگاروں کے کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے ۔

شاہ برہان الدین جانمؔ

جانمؔ بیجاپور کے مشہور صوفی میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ گزشتہ اکائی میں جانمؔ کی منظومات کا تفصیلی ذکر ہو چکا ہے۔ ذیل میں ان کی نثری تصانیف کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

(1) کلمۃ الحقائق :

یہ دکنی نثر کا ایک اہم رسالہ ہے۔ پیر روشاں کے رسالے ''خیرالبیان'' کی دریافت سے قبل جانمؔ کے رسالے ''کلمۃ الحقائق'' کو اردو کی پہلی نثری تصنیف سمجھا جاتا تھا۔ اب اسے دکنی کا پہلا نثری رسالہ کہا جاسکتا ہے۔ ''کلمۃ الحقائق'' میں شریعت و طریقت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں قدیم منطق و فلسفہ کے ان موضوعات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جن پر قدیم زمانے سے بحث جاری ہے مثلاً خدا کی ذات و صفات' قدیم و حادث' تقدیر' روح اور عبادت وغیرہ۔ یہ سوال و جواب کے پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ مرید سوال کرتا ہے اور مرشد جواب دیتے ہیں۔ جانمؔ نے اپنی زبان کو گجری کہا ہے۔ ''کلمۃ الحقائق'' کے جملوں میں اُکھڑے اُکھڑے پن کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دکنی نثر کے سانچے' اظہار مطالب کے لیے کافی نہیں ہیں اس لیے جانمؔ درمیان میں فارسی جملے لکھنے لگتے ہیں۔ بعض اوقات آدھا جملہ اردو میں ہوتا ہے تو بقیہ آدھا فارسی میں۔ نثر کے درمیان مصرعے اور شعر بھی لکھے ہیں۔ بعض جملوں میں ایک آدھ لفظ ہٹانے پر جملہ شعر بن جاتا ہے۔ کلمۃ الحقائق کا سنہ تصنیف نامعلوم ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد کا خیال ہے کہ یہ رسالہ 990 ھ تا 1007 ھ کے درمیان لکھا گیا ہے۔ (حسینی شاہد مضمون ''کلمۃ الحقائق'' اردو نثر کا پہلا مستند نقش۔ نوائے ادب۔ بمبئی جولائی 1970ء ص 4)

(2) مقصود ابتدائی :

اس رسالے کا صرف ایک ہی نسخہ ہے جو ادارۂ ادبیاتِ اردو کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ کلمۃ الحقائق کے ساتھ اس کی جلد بندی کی گئی ہے۔ یہ بھی سوال و جواب کی طرز پر ہے۔ ''کلمۃ الحقائق'' اور ''مقصود ابتدائی'' کی زبان اور موضوع میں یکسانیت ہے۔ مسائل کی تشریح کا انداز بھی ایک جیسا ہے۔

(3) ارشادنامۂ نثر :

نثری رسالے میں پانچ ذیلی رسالے شامل ہیں۔ (1) ذکر جلی (2) ذکر قلبی (3) ذکر روحی (4) ذکر سری (5) ذکر خفی۔ ڈاکٹر زور اسے شاہ برہان کی تصنیف نہیں مانتے لیکن ڈاکٹر نذیر احمد' پروفیسر گیان چند جین اور پروفیسر محمد علی اثر اسے جانم کی تصنیف سمجھتے ہیں۔ ان رسائل کے علاوہ چند اور نثری رسائل بھی جانم سے منسوب ہیں لیکن ان کا انتساب مشکوک ہے۔

محمود خوش دہاں

محمود خوش دہاں شاہ برہان الدین جانمؔ کے مرید و خلیفہ تھے۔ جانمؔ نے اپنی وفات سے قبل انہیں اپنے ہونے والے صاحبزادے (امین الدین اعلیٰ) کی تربیت کی ذمے داری سونپی تھی۔ محمود خوش دہاں نے دکنی میں کئی چھوٹی بڑی مثنویاں لکھیں۔ ان کی سب سے اہم تصنیف ''معرفت السلوک'' ہے جو فارسی نثر میں ہے۔ محمود خوش دہاں نے دکنی زبان میں بھی کچھ نثری رسالے تصنیف کیے ہیں۔ ان کے ایک نثری رسالے کا نام ''رسالہ وُاجب الوجود'' ہے جس کا قلمی نسخہ اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ اس رسالے میں وجود کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ نثر کے درمیان خوش دہاں نے اقوال اور اشعار بھی استعمال کیے ہیں۔ خوش دہاں کا دوسرا نثری رسالہ ''تنبیہہ الخلائق'' ہے جس کا مخطوطہ انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) کے کتب خانے میں ہے۔ اس رسالے میں نفس اور اس کے خطرات' دل اور روح وغیرہ کے موضوعات پر متصوفانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ بیان کے لیے سوال و جواب کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو ان کے مرشد جانم نے اپنے نثری رسالے ''کلمۃ الحقائق'' میں استعمال کیا تھا۔ محمود خوش دہاں کا ایک اور رسالہ نثر میں موجود ہے۔ یہ بھی سوال و جواب کے انداز میں لکھا گیا ہے اور اس کا موضوع بھی تصوف ہے۔ اس رسالے کو خواجہ حمیدالدین شاہد نے مرتب کرکے ''رسالۂ محمود خوش دہاں بیجاپوری'' کے نام سے 1969ء میں شائع کیا۔ محمود خوش دہاں کی نثر برہان الدین جانم کی نثر کے مقابلے میں صاف اور ہموار ہے۔ ان کے ہاں ترتیب' تسلسل

اور ربط کا احساس ہوتا ہے۔ خوش دہاں کے ہاں جملوں میں جماؤ ہے۔ جملوں کی ساخت اورلفظوں کی ترتیب میں باقاعدگی ہے۔ عبارت میں فارسی جملوں کی پیوند کاری نہیں ہے۔ وہ دکنی میں وضاحت کے ساتھ اظہارِ مطالب کرتے ہیں ۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکنی نثر کی قوتِ اظہار اور ترسیلی صلاحیت بتدریج بہتر ہوتی جارہی ہے ۔

امین الدین اعلیٰ (1085ھ ۔ 1007ھ)

سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ بیجاپور کے مشہور صوفی شاہ میراں جی شمس العشاق کے پوتے اور شاہ برہان الدین جانم کے فرزند تھے ۔ یہ بھی اپنے دادا اور والد کی طرح صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ نظم اور نثر میں ان سے کئی رسالے یادگار ہیں ۔ ان کے نثری رسالوں کے نام یہ ہیں ۔ ''گنج مخفی'' ۔ ''وجودیہ'' ۔ ''گفتار شاہ امین'' ۔ ''ارشادات'' ۔ ''ظاہر و باطن''' بیان کرتے ہیں سجدیاں کا ''عشق نامہ'' ۔ ''شرح کلمۂ طیب'' اور ''کلمۃ الاسرار''

امین الدین اعلیٰ نے اپنی منظوم تصانیف کی طرح نثری رسالوں میں بھی تصوف اور طریقت کو موضوع بنایا ہے ۔ ''کلمۃ الاسرار'' ان کا سب سے اہم نثری کارنامہ ہے جو ضخامت کے اعتبار سے بھی ان کے تمام رسالوں میں سب سے طویل ہے۔ اس رسالے میں کلمۂ طیبہ اور نورِ محمدی کی تشریح ایک انوکھے انداز میں کی گئی ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد لکھتے ہیں ''کلمۃ الاسرار'' بڑے دلکش ادبی اسلوب میں لکھا گیا ہے فقرے چست' جملے رواں' صنعت ترصیع کے استعمال سے عبارت مترنم' زور بیان میں مترادفات کا پے در پے استعمال' تفہیم وتشریح کے لیے قدم قدم پر تشبیہوں' تمثیلوں' حکایتوں کا اژدہام' مسئلے کی تائید و توضیح کے لیے جگہ جگہ اشعار سے استدلال' اس رسالے کے اسلوب بیان کی وہ خصوصیات ہیں جو نہ تو خود حضرت امین کے کسی اور رسالے میں ملتی ہیں اور نہ ان کے ہم عصروں کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں' ۔ (ڈاکٹر حسینی شاہد' سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ ۔ص 35-434) امین اعلیٰ کی نثر' ترتیب' ربط اور جملوں کی ساخت کے اعتبار سے خوش دہاں کی نثر سے آگے ہے ۔ ان کی نثر میں خوش دہاں سے زیادہ قوتِ اظہار کا احساس ہوتا ہے ۔ امین الدین اعلیٰ کے والد شاہ برہان الدین جانمؔ نے ''کلمۃ الحقائق'' میں دکنی جملوں کے درمیان فارسی جملے لکھے ۔ لیکن شاہ امین کو فارسی کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑی ۔ انہوں نے نازک سے نازک معنیٰ اور باریک سے باریک مسائل کو بڑی قدرت کے ساتھ دکنی نثر میں بیان کیا ہے ۔ جانمؔ نے ''کلمۃ الحقائق'' سوال و جواب کے انداز میں لکھی ۔ خوش دہاں نے بھی اسی پیرائے کو اختیار کیا ۔ شاہ امین کے رسالے ''کلمۃ الاسرار'' میں بھی مرید سوال کرتا ہے اور مرشد جواب دیتے ہیں لیکن یہاں سوال و جواب الگ الگ نہیں جیسے ''کلمۃ الحقائق'' یا ''رسالۂ محمود'' خوش دہاں میں نظر آتے ہیں ۔ یہاں سوال و جواب مل کر ایک ہوگئے ہیں ۔ سوال پوچھے جانے کی اطلاع ہمیں جواب دینے والا ہی دیتا ہے :

> ''مرید نے پوچھا مرشد کامل سوں مرشد رہنما و اے ہادی صاحب زماں کلمہ کا معنا کیا ہے سو بولو ہور مہربانگی کرکے یو رمز مجھ پر کھولو ۔ تب مرشد نے فرمائے کہ کلمہ کا ظاہر کا معنا یو ہے کہ نہیں کوئی معبود برحق مگر اللہ ہے ہور محمدؐ بھیجے گئے اللہ کے'' ۔ (کلمۃ الاسرار مرتبہ ڈاکٹر حمیرہ جلیلی ص 57)

اپنی معلومات کی جانچ :

1. برہان الدین جانمؔ کے نثری رسائل کے نام بتایئے ۔
2. محمود خوش دہاں کے اسلوب کی خصوصیات بیان کیجیے ۔
3. ''کلمۃ الاسرار'' کی اہمیت واضح کیجیے ۔

13.4 گولکنڈہ میں اردو نثر

بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کی طرح گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت بھی دکن کی ان یادگار زمانہ سلطنتوں میں سے ہے جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی ۔ قطب شاہی سلاطین نہایت اولوالعزم اور بلند حوصلہ تھے ۔ وہ علوم وفنون کے شیدا اور شعر وادب کے بڑے قدردان

تھے ۔انہوں نے علما و فضلا' شعرا و ادبا اور اہل ہنر کی بڑی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی اور انہیں انعام و اکرام سے مالا مال کیا۔ ان کی بے دریغ داد و دہش' فیاضی اور سیر چشمی کی وجہ سے گولکنڈہ عرب و عجم کی چوٹی کے علما اور اہلِ کمال کا ماوئ بن گیا تھا ۔قطب شاہوں نے دکنی تہذیب اور دکنی زبان کے فروغ میں اہم حصہ لیا ۔قطب شاہی دور میں دکنی زبان کے بے شمار شعرا اور ادبا پیدا ہوئے جن کی بدولت گولکنڈہ' دکنی ادب کا مرکز بن گیا ۔آئندہ صفحات میں گولکنڈہ کے نثر نگاروں اور ان کی تخلیقات کا مطالعہ کیا جائے گا ۔

ملاّ وجہی

ملاّ اسد اللہ وجہی دکنی زبان کا نہایت بلند پایہ شاعر اور باکمال نثر نگار تھا ۔ وہ قطب شاہی خاندان کے پانچویں حکمران سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دربار کا ملک الشعرا تھا ۔محمد قلی قطب شاہ کے جانشین محمد قطب شاہ کے دور میں اسے شاہی عتاب کی وجہ سے مفلسی اور گمنامی کی زندگی گذارنی پڑی ۔محمد قطب شاہ کے بعد جب عبداللہ قطب شاہ تخت نشین ہوا تو قسمت اس پر دوبارہ مہربان ہوئی اور اسے شاہی دربار میں رسائی حاصل ہوئی ۔وجہی کی تصانیف میں مثنوی ''قطب مشتری'' ۔''دیوان غزلیات فارسی'' ۔''تاج الحقائق'' اور'' سب رس'' شامل ہیں ۔ ذیل میں اس کی نثری تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔

(1) تاج الحقائق

یہ وجہی کی متنازع نثری تصنیف ہے ۔ اس کا ذکر سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے اپنے مضمون ''سب رس'' میں کیا جو رسالہ اردو (اکتوبر 1924) میں شائع ہوا۔ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اور ڈاکٹر جمیل جالبی ''تاج الحقائق'' کو وجہی کی تصنیف نہیں مانتے ۔ اس کے برخلاف مولوی عبدالحق' ڈاکٹر زورؔ اور بہت سے دیگر محقق اسے وجہی کی تصنیف مانتے ہیں ۔ ڈاکٹر نور السعید اختر جنہوں نے اسے مرتب کر کے شائع کیا وہ بھی اسے وجہی کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ ان کی سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ'' تاج الحقائق'' کا اسلوب ''سب رس'' سے مشابہت رکھتا ہے ۔ ''تاج الحقائق'' میں وجہی نے مختلف اخلاقی اور صوفیانہ نکات کی تشریح کی ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے اسے ''سب رس'' کی پیش رو کہا جاسکتا ہے ۔

(2) سب رس

وجہی کا شاہکار اور دکنی نثر کا گل سرسبد ہے۔ ''سب رس'' اردو کی ادبی نثر کا اولین نمونہ ہے ۔ اس سے قبل اردو میں جو نثری رسالے لکھے گئے وہ مذہبی یا صوفیانہ موضوعات پر تھے ۔''سب رس'' خالص ادبی اور غیر مذہبی نثر کا پہلا مکمل نمونہ ہے۔ یہ اردو کی پہلی داستان بھی ہے۔

وجہی نے ''سب رس ''1045 ھ /1635 ء میں عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر لکھی ۔ اس میں جو داستان بیان کی گئی ہے وہ وجہی کی طبع زاد نہیں ہے ۔ اس نے یہ قصہ محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی مثنوی ''دستورِ عشاق'' کے نثری خلاصے ''قصہ حسن و دل'' سے لیا ہے جو فارسی میں ہے ۔ فتاحی نے قصہ حسن و دل کا خاکہ ایک سنسکرت ناٹک ''پربودھ چندرودے'' سے لیا جس کا مصنف کرشن مشر مگدھ بہار کا باشندہ تھا ۔ اس نے یہ ناٹک 1065 ء کے بعد کے قریبی زمانے میں لکھا ۔ اس ناٹک کے فارسی اور کئی دیگر زبانوں میں ترجمے ہوئے ۔ فتاحی نے اس میں کئی تبدیلیاں کیں۔ وجہی نے داستان کے واقعات فتاحی سے لیے ہیں لیکن اس میں کہیں کہیں کچھ حذف و اضافہ بھی کیا ہے ۔'' سب رس'' کی زبان آج سے تقریباً پونے چار سو برس پہلے کی زبان ہے ۔ قدیم نثر کی کتابوں میں ''سب رس'' کو اس کے خاص اسلوب کی وجہ سے بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ وجہی نے اس میں مقفیٰ اور مسجع عبارت لکھی ہے ۔ اس نے چار چار پانچ پانچ ہم قافیہ جملے لکھے لیکن اس کی عبارت میں اس قدر روانی ہے کہ کہیں آورد کا احساس نہیں ہوتا بلکہ قافیہ بندی کی وجہ سے ایک خاص حسن اور ادبی چاشنی پیدا ہوگئی ہے ۔'' سب رس''میں حسب موقع برج' مراٹھی' عربی اور فارسی کے ضرب الامثال' دوہرے اور اقوال استعمال کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ قرآنی آیات اور احادیث کے اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں جن سے وجہی کے علم و فضل کا اندازہ ہوتا ہے ۔''سب رس'' کا ایک امتیازی وصف اس کے انشائیہ نما بیانات ہیں۔ وجہی نے داستان کے درمیان مختلف موضوعات مثلاً عشق' فقر' شراب اور عقل وغیرہ کے بارے میں تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کی یہ تقریریں اردو میں انشائیے کے اولین نقوش کی حیثیت رکھتی ہیں ۔''سب رس'' ایک تمثیلی قصہ ہے اس میں مجرد جذبات اور اوصاف مثلاً

عقل، عشق، حسن، ہمت اور نظر وغیرہ کو انسانی پیکر میں پیش کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس میں معنیٰ کی دو سطحیں پیدا ہوگئی ہیں۔ یہ سارے کردار اسم بامسمیٰ ہیں۔ ان کرداروں کے باہمی توافق اور تصادم سے ''سب رس'' کا قصہ آگے بڑھتا ہے۔ بیان کی تکنیک کے اعتبار سے سب رس نہایت درجہ مکمل اور خالص تمثیل (Allegory) ہے۔ ''سب رس'' کے ذریعے وجہی نے اردو نثر کو فارسی نثر کی سطح پر لانے کی شعوری کوشش کی۔ اس کی بدولت اردو نثر ایک نئے ادبی اسلوب سے آشنا ہوئی۔ وجہی کا یہ کارنامہ اردو نثر کے ارتقا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

شاہ میراں جی خدانما (1074ھ۔1004ھ)

میراں جی خدانما گولکنڈہ کے ایک باکمال صوفی تھے۔ وہ شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری کے مرید و خلیفہ تھے۔ شاہ امین کے سلسلے میں داخل ہونے سے قبل وہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے نہایت بااعتماد ملازم تھے۔ شاہ امین سے بیعت کے بعد انہوں نے ملازمت ترک کردی اور رشد و ہدایت میں مصروف ہوگئے۔ میراں جی خدانما نے عوام الناس کو دین کی باتیں سمجھانے اور مریدوں کو سلوک و معرفت کے اسرار و رموز کی تعلیم دینے کے لیے دکنی زبان میں چار نثری رسالے تصنیف کیے جن کے نام یہ ہیں : (1) ''شرح شرحِ تمہیدات عین القضاۃ'' (2) ''رسالہ وجودیہ ''(3) ''شرح مرغوب القلوب'' (4) ''رسالہ قربیہ''۔ ان میں آخرالذکر رسالہ ناپید ہے۔ میراں جی کی ''شرح شرحِ تمہیدات عین القضاۃ'' دراصل قاضی عین القضاۃ ہمدانی کی کتاب ''تمہیدات عین القضاۃ'' کا ترجمہ وتشریح ہے۔ اصل کتاب فارسی میں ہے۔ حضرت گیسودراز نے اس کی ایک شرح فارسی میں لکھی تھی میراں جی نے اسے دکنی ملبوس میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں اصل کتاب اور حضرت گیسودراز کی شرح دونوں کی ترجمانی کی ہے۔ یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے اور کافی ضخیم ہے۔

''رسالۂ وجودیہ'' میراں جی کا ایک مختصر رسالہ ہے۔ میراں جی کے مرشد شاہ امین نے بھی اس نام کا ایک نثری رسالہ لکھا تھا۔ ''رسالہ وجودیہ'' میں میراں جی نے اپنے سلسلۂ تصوف کے بعض مسائل کی وضاحت کی ہے۔

میراں جی خدانما کا تیسرا رسالہ ''شرح مرغوب القلوب'' اسی نام کی ایک فارسی مثنوی کا نثری خلاصہ ہے۔ یہ مثنوی صوفیا کے حلقوں میں نہایت مقبول تھی اسی لیے میراں جی نے دکنی نثر میں اس کی شرح لکھی جو دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس رسالے میں میراں جی نے اصل مثنوی کے مضامین میں قرآن و حدیث کے حوالوں کا اضافہ کیا ہے۔ بیشتر محققین اسے میراں جی شمس العشاق کی تصنیف سمجھتے رہے بعد میں ڈاکٹر حفیظ قتیل نے واضح کیا کہ یہ میراں جی خدانما کی تصنیف ہے۔

میراں جی خدانما دکنی کے بہت بڑے نثر نگار تھے۔ سینکڑوں صفحات پر مشتمل ان کا نثری کارنامہ ''شرح شرحِ تمہیدات'' دکنی نثر میں قوت اظہار کی ایک نئی وسعت اور بالیدگی کا مظہر ہے۔ میراں جی کی اس تصنیف سے قبل اردو نثر کی کل متاع چند مختصر رسائل پر مشتمل تھی۔ ان کی یہ کتاب اردو کے اولین نثری سرمایے میں ایک وسیع اضافہ ثابت ہوئی۔ میراں جی کی نثر نگاری کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ اپنی بات کی وضاحت کے لیے مثالوں سے مدد لیتے ہیں۔ ان کی نثر میں سلاست اور روانی کا احساس ہوتا ہے۔ تصوف کے دقیق مسائل کو انہوں نے اپنے دور کی سادہ اور آسان زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ شاہ برہان، محمود خوش دہاں اور امین الدین اعلیٰ کی زبان اور طرز اظہار پر گجری اور بیجاپوری رنگ کی گہری چھاپ ہے۔ ان کے مقابلے میں میراں جی کی نثر پر فارسی اسلوب اور رنگ و آہنگ کا اثر غالب ہے۔ میراں جی خدانما کی نثر وجہی کا مقابلہ نہیں کرسکتی لیکن ان کی ''شرح شرحِ تمہیدات'' کو دو اعتبارات سے ''سب رس'' پر فوقیت حاصل ہے۔ ایک تو یہ کہ میراں جی کی شرح ضخامت میں ''سب رس'' سے بڑھ کر ہے۔ دوسرے یہ کہ ''سب رس'' میں وجہی نے مقفیٰ و مسجع جملوں کے ذریعے نظم اور نثر کو مخلوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ میراں جی کی شرح میں نثر کو نثر بنانے اور اسے شاعرانہ عناصر سے دور رکھنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ سادہ نثر نگاری کے اس تجربے میں جدید نثر کی دھندلی دھندلی پرچھائیاں نظر آتی ہیں اور یہ میراں جی کا نمایاں کارنامہ ہے۔

میراں یعقوب

میراں یعقوب دکنی کے ایک اہم نثر نگار ہیں۔ وہ شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری کے خلیفہ اور میراں جی خدانما گولکنڈوی کے مرید تھے۔ دکنی میں ایک ضخیم کتاب ''شمائل الاتقیا'' ان سے یادگار ہے جو نثر میں ہے۔ اصل ''شمائل الاتقیا'' فارسی میں ہے۔ یہ کتاب شاہ برہان الدین

غریب کے خلیفہ رکن الدین عماد نے اپنے مرشد کی فرمائش پر 738ھ میں تالیف کی تھی۔ اس کے تقریباً ساڑھے تین سو سال بعد میراں یعقوب نے اپنے مرشد زادے علی امین الدین کی فرمائش پر فارسی سے دکنی زبان میں اس کا ترجمہ کیا۔ لیکن میراں یعقوب نے شمائل الاتقیا کے ترجمے کا کام علی امین الدین کی وفات (1078ھ) کے بعد ان کے بھانجے شاہ میراں ابن سید حسین کی خلافت کے زمانے میں شروع کیا۔ شمس اللہ قادری کا خیال ہے کہ میراں یعقوب نے شمائل لاتقیا کا ترجمہ 1080ھ میں سرانجام دیا۔

''شمائل الاتقیا'' تقریباً ایک ہزار صفحات اور چار ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں متعدد فصلیں ہیں۔ ''شمائل الاتقیا'' کا یہ ترجمہ دکنی زبان اور نثر نگاری میں میراں یعقوب کی قدرت' عربی و فارسی سے ان کی گہری واقفیت اور ترجمہ کی بے پناہ صلاحیت کا مظہر ہے۔ میراں یعقوب نے صرف ترجمے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جا بجا وضاحت اور تشریح سے بھی کام لیا ہے۔ انہوں نے تصوف کے خشک مسائل کو تمثیلوں' تشبیہوں اور اپنے نکھرے ہوئے اسلوب سے دلچسپ بنادیا ہے۔ میراں یعقوب صرف نثر نگار ہی نہیں شاعر بھی تھے۔ انہوں نے فارسی شمائل کی نثر کے درمیان آنے والی رباعیات' قطعات اور تقریباً تین ہزار اشعار کا ترجمہ اشعار ہی میں کیا ہے۔ زبان کے ارتقا کے مطالعے میں میراں یعقوب کی ''شمائل الاتقیا'' بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ وجہی کی ''سب رس'' اور ''شمائل الاتقیا'' میں صرف 33 سال کا فرق ہے لیکن ''سب رس'' کے مقابلے میں ''شمائل الاتقیا'' کی زبان زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس میں غیر ضروری عربی اور فارسی الفاظ استعمال نہیں کیے گئے ہیں اور نہ ہی بیجاپوری مصنفوں کی طرح سنسکرت الفاظ کا سہارا لیا گیا ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں دکنی نثر کو پہلی بار علمی مسائل کی ترسیل کے لیے وسیع پیمانے پر استعمال کیا۔ ''سب رس'' کی زبان قدیم ہے اس کی مسجّع اور مقفّی نثر علمی مسائل کی وضاحت کے لیے موزوں نہیں ہے اس کے برخلاف ''شمائل الاتقیا'' کی عبارت مسجّع اور مقفّی نہیں بلکہ سیدھی سادی ہے۔ وسعتِ بیان' صلاحیتِ اظہار اور سادگیٔ اسلوب کے اعتبار سے اس کی نثر جدید نثر سے بہت قریب ہے۔

عابدؔ شاہ

عابد شاہ گولکنڈے کے آخری حکمران ابوالحسن تاناشاہ کے پیر بھائی اور شاہ راجو کے مرید تھے۔ عابد شاہ کا پورا نام نواب الدین تھا۔ شاہ راجو نے انہیں شاہ کا لقب عطا کیا تھا۔ دکنی ادب کی تاریخ میں عابد شاہ نثر نگار کی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں لیکن وہ شاعر بھی تھے۔ عابدؔ ان کا تخلص تھا۔ عابد شاہ کی تین نثری تصانیف کا پتا چلا ہے: 1) ''گلزار السالکین'' یا ''مخزن السالکین'' 2) ''کنز المومنین'' 3) ''مراۃ السالکین''

''گلزار السالکین'' میں عابد شاہ نے سالکوں کے لیے تصوف و عرفان کے مسائل قلم بند کیے ہیں۔ اس کتاب کا آغاز حمد و نعت اور شاہ راجو کی منقبت سے ہوتا ہے۔ منقبت کے اشعار میں عابد شاہ نے شاہ راجو کا ذکر جس طرح کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کتاب کی تصنیف کے وقت زندہ تھے اور چوں کہ انہوں نے 1092ھ میں وفات پائی اس لیے ''گلزار السالکین'' اس سے قبل لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں عابد شاہ نے اپنی زبان کو ''دکھنی'' کہا ہے۔ (بحوالہ ''تذکرۂ اردو مخطوطات'' (جلد اول) مرمہ ایڈیشن۔ صفحہ 512) کتاب سوال و جواب کے انداز میں لکھی گئی۔ اس کتاب کا ایک نام ''مخزن السالکین'' بھی ہے۔ عابد شاہ بلند پایہ صوفی اور بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے فقہ حنفی کے موضوع پر ''کنز المومنین'' کے نام سے ایک نثری رسالہ لکھا۔ انہوں نے یہ کتاب عربی اور فارسی کی چوبیس کتابوں کی مدد سے لکھی جن کی فہرست انہوں نے دی ہے۔ ''کنز المومنین'' میں انتیس ابواب ہیں اور ہر باب کئی فصلوں پر مشتمل ہے جن کی مجموعی تعداد 73 ہے۔ کتاب کے مشتملات کی فہرست دو صفحوں پر محیط ہے۔ ان میں مسائل شرعیہ اور مسائل معرفت کا تفصیلی ذکر ہے۔ عابد شاہ کی تیسری تصنیف ''مراۃ السالکین'' بھی تصوف کے موضوع پر ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری اینڈ ریسرچ سنٹر حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے اس کتاب کو 1092ھ سے قبل کی تصنیف قرار دیا ہے۔ (نصیر الدین ہاشمی' وضاحتی فہرست کتب خانہ آصفیہ ج 2۔ ص 204) اس کتاب میں روح' عقل' نفس اور اس کے اقسام' نور' وحدت' واحدیت وغیرہ تصوف اور فلسفے کے مسائل پر عارفانہ بحث کی گئی ہے۔

عابد شاہ کا اسلوبِ بیان سادہ اور عام فہم ہے۔ اگرچہ انہوں نے اپنی زبان کو دکنی کہا ہے لیکن ان کی عبارت پر قدامت کی چھاپ بہت گہری نہیں ہے۔ انہوں نے الفاظ کی قدیم شکلوں کے ساتھ ان کے نئے روپ بھی استعمال کیے ہیں۔ وہ نثر کے درمیان اشعار بھی درج کرتے

ہیں اور روزمرہ کی زندگی سے مثالیں بھی دیتے ہیں ۔ان کے ہاں کہیں کہیں انشا پردازی کے خوب صورت نمونے بھی ملتے ہیں ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ''سب رس'' کے اسلوب کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟
2. میراں جی خدانما کے نثری رسائل کے نام بتایئے۔
3. ''شرح شرحِ تمہیدات'' کی اہمیت بیان کیجیے۔
4. عابد شاہ کے نثری کارنامے کیا ہیں ؟

13.5 بیجاپور اور گولکنڈہ کے زوال کے بعد اردو نثر

اب تک ہم نے دبستانِ بیجاپور اور دبستانِ گولکنڈہ میں دکنی نثر کے ارتقا سے متعلق معلومات حاصل کیں ۔ اورنگ زیب کی فتوحات دکن کے نتیجے میں بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتیں زوال پا گئیں ۔لیکن دکنی زبان میں تخلیقِ ادب کا سلسلہ جاری رہا۔ آئندہ صفحات میں زوال بیجاپور اور گولکنڈہ کے بعد انجام دیئے گئے اہم نثری کارناموں کا مطالعہ کیا جائے گا۔

طوطی نامہ

یہ طوطے کی کہی ہوئی نصیحت آموز اور بصیرت افروز کہانیوں کا مجموعہ ہے ۔ اس کا اصل ماخذ سنسکرت کی مشہور کتاب ''شک سب تتی'' ہے۔ اس میں طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیاں ہیں ۔ 730ھ میں ضیاء الدین نخشبی نے ان میں سے باون کہانیوں کا فارسی میں ترجمہ کیا اور ''طوطی نامہ'' نام رکھا ۔نخشبی کی زبان نہایت ادق تھی اس لیے 1093 ھ میں سید محمد قادری نے نخشبی کے طوطی نامہ سے 35 کہانیاں منتخب کر کے سلیس فارسی میں قلم بند کیا ۔ دکنی کے کسی نامعلوم مصنف نے سید محمد قادری کے ''طوطی نامہ'' کا فارسی سے دکنی میں ترجمہ کیا ۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں محفوظ ہے جس کا سنہ کتابت 1142ھ ہے ۔ یہ حکایتیں بڑی دلچسپ ہیں اور زیادہ تر عورتوں کی بے وفائی سے متعلق ہیں ۔ اس کی عبارت مربوط اور سلیس ہے ۔

قصہ ملکہ زماں و کلام کندلہ

یہ فارسی کی ایک منظوم داستان ''جواہرِ سخن'' کا نثری ترجمہ ہے جو دکنی زبان میں کیا گیا ہے ۔ اس میں چودہ حکایتیں ہیں ۔ اس کے مترجم اور سنہ تصنیف کا پتا نہیں چلتا۔ اس کا واحد قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں ہے جس کا سنہ کتابت 1134 ھ ہے ۔فورٹ ولیم کالج کے منشی مظہر علی خاں ولا نے ''کام روپ وکام کندلا'' کے نام سے ایک قصہ لکھا تھا۔ ولا کا ماخذ موتی رام کیشو کی ''مادھونل و کام کندلا'' ہے۔ یہ قصہ ولا کے قصے سے الگ ہے۔ ڈاکٹر افضل الدین اقبال کا خیال ہے کہ یہ قصہ فورٹ سینٹ جارج کالج (مدراس) کے کسی گمنام مصنف نے انگریزوں کے لیے لکھا۔ (فورٹ سینٹ جارج کالج ۔ص 195) اس کی زبان عام فہم اور سلیس ہے ۔عبارت میں جا بجا دکنی الفاظ اور محاورے ملتے ہیں ۔ مترجم اپنی زبان کو 'کرناٹکی' کہتا ہے ۔

سنگھاسن بتیسی

یہ سنسکرت کی نہایت مشہور و مقبول داستان ہے ۔ یہ بتیس کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں چتر بھوج داس نے ''سنگھاسن بتیسی'' کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام ''شاہ نامہ'' رکھا۔فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کے قیام کے بعد للولال جی اور کاظم علی جوان نے ''سنگھاسن بتیسی'' کا اردو میں ترجمہ کیا ۔لیکن اس سے قبل چتر بھوج داس کے ''شاہ نامہ'' کا دکنی میں بھی ترجمہ ہوا جو کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے ۔لیکن دکنی قصے کے مترجم کا نام نامعلوم ہے۔ دیباچہ میں وہ لکھتا ہے ''اول یہ کتاب چتر بھوج داس بیٹا سروپ

چند بھاٹ کا فارسی زبان میں لکھ کر نام اس کا شاہنامہ رکھا ہے ۔ اور 32 حکایتاں بھوت فصاحت اور نزاکت سے ظاہر کیا ہے ۔ ہندی زبان میں اس کتاب کو ''سنگھاسن بتیسی'' کہتے ہیں ۔ (اردو نثر کا آغاز و ارتقا ۔ ص 300) دکنی ''سنگھاسن بتیسی'' فارسی کا ترجمہ ہے اس لیے اس میں فارسی زبان کا اثر نمایاں ہے اس کے مقابلے میں للو لال جی اور کاظم علی جوان کی ''سنگھاسن بتیسی'' پر ہندی کا اثر ہے ۔

محمد باقر آگاہ ویلوری (1220 ھ ۔1158 ھ)

باقر آگاہ اٹھارہویں صدی کے ایک جامع الکمالات اور یکتائے روزگار فرد تھے ۔ وہ ویلور (مدراس) کے باشندے اور اپنے عہد کے جلیل القدر عالم' قادرالبیان شاعر اور نثر نگار تھے ۔ متعدد مثنویوں کے علاوہ ایک دیوانِ غزلیات بھی ان کی تصنیف ہے ۔ آگاہ کو نظم اور نثر دونوں پر یکساں مہارت حاصل تھی انہوں نے اپنی منظوم تصانیف کے دیباچے اردو نثر میں لکھے ۔ باقر آگاہ کے دیباچے تاریخی و سوانحی' تنقیدی و تحقیقی اور ادبی اہمیت کے حامل ہیں ۔ آگاہ نے یہ دیباچے عام فہم اور سیدھی سادی بول چال کی زبان میں لکھے ۔ انہوں نے اپنی زبان کو دکنی کہا ہے لیکن ان کی نثر دکنی کے اثرات کے باوجود آج بھی تازگی لیے ہوئے ہے کیوں کہ اس کا رشتہ زمانۂ حال کی نثر سے جڑا ہوا ہے ۔ آگاہ نے یہ عام فہم اور سلیس نثر فورٹ ولیم کالج کے قیام سے بہت پہلے اور مدراس جیسے دور دراز کے علاقے میں بیٹھ کر لکھی ۔ آگاہ نے بول چال کی عام زبان میں اپنے افکار و خیالات کا اظہار کر کے اردو نثر کی روایت کو یہ نیا رنگ اور نیا اسلوب اس دور میں دیا جب شمالی ہند میں اردو نثر فارسی عبارت آرائی اور فارسی انشا پردازی کے تکلفات کی اسیر تھی ۔ آگاہ نے اپنی نثر میں عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ سے اجتناب کیا اور جملوں کی ساخت اور ترتیب میں اس بات کا خیال رکھا کہ تعقید اور پیچیدگی پیدا نہ ہو ۔ ان دیباچوں سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ دکن میں اردو نثر کی روایت اتنی مستحکم اور بالیدہ ہو چکی تھی کہ آگاہ کو سادہ اور صاف نثر میں اپنے خیالات کی ترسیل میں کوئی دشواری نہیں ہوئی ۔

دکن میں فورٹ سینٹ جارج کالج (مدراس) کے منشی ابراہیم بیجاپوری نے 1824ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے تقریباً چوبیس سال بعد انوار سہیلی کے نام سے ایک کتاب لکھی جو ملک حسین واعظ کاشفی کی فارسی انوار سہیلی کا ترجمہ ہے ۔ اس کتاب میں ابراہیم بیجاپوری نے خالص دکنی زبان استعمال کی حالاں کہ اس وقت تک معیاری اردو کا چلن سارے ہندوستان میں عام ہو چکا تھا ۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. طوطی نامہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
2. سنگھاسن بتیسی کا ماخذ کیا ہے؟
3. باقر آگاہ کے نثری دیباچوں کی کیا اہمیت ہے؟

13.6 شمالی ہند میں اردو نثر

گزشتہ صفحات میں ہم نے دکن میں اردو نثر کے آغاز و ارتقا کا تفصیلی مطالعہ کیا ۔ اب ہم شمالی ہند میں اردو نثر کی ابتدا اور اہم نثری کارناموں کا جائزہ لیں گے ۔

کربل کتھا

فضل علی خاں فضلی کی تصنیف ''کربل کتھا'' شمالی ہند میں اردو کا اولین نثری نمونہ ہے ۔ فضلی نے یہ کتاب 1145ھ/ 33-1732ء میں لکھی اور 1161 ھ / 48-1747ء میں اس پر نظر ثانی کی ۔ ''کربل کتھا'' ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف ''روضۃ الشہدا'' کا اردو ترجمہ ہے ۔ فضلی کے حالاتِ زندگی نامعلوم ہیں ۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ فضلی کا سنہ ولادت 1122ھ یا 1123 ھ ہے کیوں کہ کربل کتھا کی تصنیف کے وقت فضلی کی عمر اس کے اپنے بیان کے مطابق 22 یا 23 سال تھی ۔ اس کے والد کا نام نواب شرف علی خاں تھا ۔ فضلی محمد شاہ رنگیلے اور اس کے بیٹے احمد شاہ کے عہد میں موجود تھا ۔ کربل کتھا کی تالیف کا سبب یہ تھا کہ شرف علی خاں کے گھر میں محرم کی مجالس عزا منعقد ہوتی تھیں جن

میں ملا حسین واعظ کاشفی کی روضۃ الشہدا پڑھی جاتی تھی لیکن یہ کتاب فارسی زبان میں ہونے کی وجہ سے عورتوں کو اس کے معنی سمجھ میں نہیں آتے تھے اور اس کے پرسوز فقروں پر انہیں رونا نہ آتا تھا۔ ان خواتین کا اصرار تھا کہ کوئی صاحبِ شعور ''روضۃ الشہدا'' کا ترجمہ عام فہم زبان میں کرے تاکہ اس کتاب کے بیانات ان کی سمجھ میں آئیں اور انہیں سن کر انہیں رونا آئے۔ خواتین کی فرمائش پر فضلی نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا اور ''روضۃ الشہدا'' کا ترجمہ کیا اور اس کا نام ''کربل کتھا'' رکھا۔

فضلی نے ''کربل کتھا'' مجالس عزا کی ضرورت کے لیے تالیف کی اس لیے اس نے عبارت کی رنگینی کے ساتھ اس بات کا خاص خیال رکھا کہ اس کی زبان اہل مجلس خصوصاً عورتوں کو آسانی سے سمجھ میں آئے۔ ''کربل کتھا'' دس ابواب پر مشتمل ہے جن میں بارہ مجلسیں ہیں۔ اس کے بعد ''خاتمہ'' کے عنوان سے پانچ فصلیں ہیں۔ اس کتاب میں آنحضرتؐ کی وفات سے کربلا میں سیدنا حسینؓ کی شہادت تک کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ''خاتمہ'' کی فصلوں میں شہادت حسینؓ کے بعد کے واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ یہ تمام واقعات اس انداز سے پیش کیے گئے ہیں کہ ہر مجلس کا دوسری مجلس سے ربط و تسلسل برقرار رہتا ہے۔ ''کربل کتھا'' کی نثر آج سے کوئی پونے تین سو سال پہلے کی نثر ہے لیکن اس کے آہنگ میں فنی توازن کا احساس ہوتا ہے۔ اس کا موضوع نہایت درد انگیز ہے اس لیے اس میں شدتِ جذبات اور جوشِ بیان پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ کربل کتھا میں دکنی لہجہ بھی ملتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ولی کے دیوان سے' جو 1722ء میں دلی پہنچا' شمالی ہند کے شعرا و ادبا بے حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ کربل کتھا میں بھی ''دیوان ولی'' کا اثر دکنی الفاظ کی شکل میں نظر آتا ہے۔ ''کربل کتھا'' کا موضوع تو واقعات کربلا ہے لیکن ساری کتاب کا ماحول ہندوستانی ہے۔ شادی' بیاہ' رسم و رواج' آداب محفل' لباس' زیورات اور رہن سہن غرض زندگی کے ہر شعبے میں ہندوستانی تہذیب کا رنگ نمایاں ہے۔ اپنی خاص لسانی خصوصیات کی وجہ سے کربل کتھا اپنے دور کی زبان کا اہم نمونہ اور اردو نثر کے ارتقا کی بنیادی کڑی ہے۔

قصۂ مہر افروز و دلبر

''قصۂ مہر افروز و دلبر'' شمالی ہند میں لکھی جانے والی پہلی نثری داستان ہے۔ اس داستان کے مصنف عیسوی خاں بہادر ہیں۔ ''قصہ مہر افروز و دلبر'' کی دریافت تک عیسوی خاں اردو کے گم نام ادیب تھے لیکن ہندی میں یہ معروف تھے۔ انہوں نے ''رس چندر کا'' کے نام سے مشہور کوی بہاری کی تصنیف ''ست سئی کی ٹیکا'' (شرح) لکھی تھی۔ عیسوی خاں نرور (گوالیار) کے راجہ چھترسنگھ کے ہاں ملازم تھے۔ انھیں کی سرپرستی میں انہوں نے ''رس چندر کا'' لکھی۔ عیسوی خاں نے ''رس چندر کا'' کے علاوہ ''ست سئی'' کی ایک اردو شرح بھی لکھی تھی۔

''قصہ مہر افروز و دلبر'' کا سنہ تصنیف نامعلوم ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ عیسوی خاں نے یہ قصہ محمد شاہ رنگیلے یا احمد شاہ کے زمانے میں لکھا ہوگا۔ یہ قصہ طبع زاد ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں داستان ہے اور دوسرے حصے میں جو نسبتاً مختصر ہے نصیحتیں بیان کی گئی ہیں۔ ''قصہ مہر افروز و دلبر'' کی زبان پر کھڑی بولی کا گہرا اثر نظر آتا ہے کیوں کہ عیسوی خاں کھڑی بولی کے علاقے کا باشندہ تھا۔ اس نے داستان میں رنگارنگ دلچسپیوں اور تہذیب و معاشرت کی جزئیات و تفصیلات پر بہت زور دیا ہے۔ سراپا نگاری' خانہ باغ کی تصویر' محل کے اندرونی حصوں کے سامانِ آرائش اور جشن و جلوس کی تفصیلات نہایت باریک بینی اور خوبصورتی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

عیسوی خاں نے داستان گوئی کی روایت کے مطابق قصے کے کرداروں اور مقامات کے نام علامتی انداز کے رکھے ہیں جیسے شہر کا نام عشق آباد' بادشاہ کا نام عادل شاہ' فقیر کا نام آرزو بخش' وزیر جہاں دانش وغیرہ۔ عیسوی خاں ہندو دیومالا سے خوب واقف تھا۔ وہ اپنی اکثر تشبیہات جنہیں وہ ''اپماں'' کہتا ہے بلاتکلف ہندی شاعری سے اخذ کرتا ہے۔ اس کے اکثر فقروں پر سورداس' میرا بائی یا رحیم کے دوہوں کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اس کے پیش نظر فارسی داستانوں کے علاوہ بھگتی اور ریتی کال کی شاعری کے نمونے بھی ہیں۔ وہ زبان جو اس قصے میں استعمال کی گئی ہے عام بول چال کی زبان ہے اور سنسکرت و پراکرت الفاظ کے باوجود اپنے دور کی نمائندہ زبان ہے۔ اس اعتبار سے ''قصہ مہر افروز و دلبر'' شمالی ہند کی قدیم اردو نثر کا ایک قابل قدر نمونہ ہے۔

نوطرزِ مرصع

اس کتاب کے مصنف میر محمد حسین عطا خاں تحسین بنگال کے انگریز ناظموں کے ملازم تھے۔ کلکتے کا انگریز حاکم جنرل اسمتھ اُن پر بڑا مہربان تھا۔ 1769ء میں جب وہ انگلستان چلا گیا تو تحسین کو عظیم آباد میں متعین کیا گیا لیکن اعلا عہدیداروں سے ناچاقی کے سبب وہ ملازمت چھوڑ کر فیض آباد آ گئے اور نواب شجاع کے متوسل ہوگئے۔ ایک مرتبہ وہ جنرل اسمتھ کے ساتھ کشتی کے ذریعے کلکتہ جا رہے تھے کہ سفر کے دوران انہوں نے کسی عزیز سے ''چہار درویش'' کا قصہ سنا۔ اسے سن کر ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس داستان کو رنگین پیرایے میں اردو میں لکھنا چاہیے تا کہ اگر کوئی اردو زبان سیکھنے کا شوق رکھتا ہو تو اس کتاب سے استفادہ کرے۔

تحسین نے اسی سفر میں ''نوطرزِ مرصع'' کا ابتدائی حصہ لکھا۔ اس کے بعد ملازمت کی مصروفیات کی وجہ سے ایک طویل مدت تک وہ اس تصنیف کو آگے نہیں بڑھا سکے۔ ملازمت کو خیر باد کہہ کر جب وہ فیض آباد آئے تو شجاع الدولہ نے اسے مکمل کرنے کی فرمائش کی۔ انھیں کے حکم پر تحسین نے نوطرزِ مرصع کو مکمل کیا وہ اسے شجاع الدولہ کی خدمت میں پیش کرنے ہی والے تھے کہ شجاع الدولہ کا انتقال ہوگیا اور آصف الدولہ تخت نشین ہوئے۔ تحسین نے یہ داستان ان کی خدمت میں پیش کی۔ اس طرح یہ داستان شجاع الدولہ کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے 1774ء میں مکمل ہوئی۔

''نوطرزِ مرصع'' میں تحسین نے چار درویش کا جو قصہ پیش کیا ہے وہ ان کا طبع زاد نہیں ہے بلکہ انہوں نے ایک عزیز سے یہ قصہ سنا تھا۔ ''نوطرزِ مرصع'' میں تحسین نے چار درویش کے قصے کو اپنے مخصوص انداز میں اردو میں لکھا۔ اس قصے کی عبارت کو انہوں نے اردو زبان کو فارسی کے ساتھ ملا کر مرصع کیا تھا۔ لکھنو کی تہذیب مرصع سازی کی تہذیب تھی۔ اس لیے تحسین کی نوطرز مرصع کو اپنے زمانے میں اتنی مقبولیت ملی کہ بہت سے لکھنے والوں نے اس کی پیروی کی۔ کلکتے کے فورٹ ولیم کالج میں میر امنؔ نے اپنی مشہور زمانہ داستان ''باغ و بہار''، تحسین کی ''نوطرز مرصع''، ہی کو سامنے رکھ کر لکھی۔ ''باغ و بہار'' کی نثر سادہ و سلیس ہے جب کہ ''نوطرز مرصع'' میں تحسین نے اپنی انشا پردازی کا کمال دکھایا ہے۔ نوطرز مرصع کا اسلوب مقفّی و مسجّع ہے۔ اس کی زبان رنگین، دقیق اور طرز بیان مصنوعی و پُرتکلف ہے۔ اس میں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب اور تشبیہات و استعاروں کی اس قدر بہتات ہے کہ اکثر فقرے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے۔ چوں کہ نوطرز مرصع نواب شجاع الدولہ کی خواہش پر لکھی گئی تھی اس لیے تحسین نے ایسا اسلوب اختیار کیا جو اس دور کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں اور طبقہ خواص کا دل پسند اور محبوب اسلوب تھا۔ تحسین کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے فارسی اسلوب کو اردو کا اسلوب بنا کر اس طرح پیش کیا کہ اردو کا ایک نیا معیاری اسلوب اہل علم کے سامنے آیا۔

نوآئین ہندی

اس کتاب کے مصنف مہر چند کھتری ہیں جن کے آباواجداد لاہور کے رہنے والے تھے۔ محمد شاہ کے زمانے میں مہر کے جداعلیٰ دہلی آئے اور شاہی ملازمین میں شامل ہوگئے۔ مہر انگریزوں کے ملازم تھے۔ انگریزوں کی عملداری کے ابتدائی زمانے میں وہ پیشکار تھے۔ مہر چند نے 1203ھ 89-1788ء میں اپنی کتاب ''نوآئین ہندی'' تصنیف کی۔ اس کتاب کی وجہ تصنیف یہ تھی کہ مہر کسی انگریز کینسلی صاحب کو اردو پڑھاتے تھے۔ تدریسی ضرورت کے پیش نظر انہیں ایک ایسی کتاب کی تلاش تھی جو روزمرہ اور بول چال کے مطابق ہو اور جو خاص و عام کی سمجھ میں آئے۔ لیکن ایسی کتاب انہیں نہیں ملی۔ آخر کار انہوں نے ''آذر شاہ اور سمن رخ بانو'' کا قصہ لے کر جو فارسی میں تھا سلیس اردو نثر میں اس کا ترجمہ کیا۔ انہوں نے اس ترجمے کا نام ''نوآئینِ ہندی'' رکھا۔ انہوں نے یہ کتاب اردو زبان سکھانے کے مقصد سے لکھی۔ مہر چند کی یہ داستان ''قصہ ملک محمد و گیتی افروز'' کے نام سے بھی مشہور ہے۔ ''ملک محمد اور گیتی افروز'' کا قصہ اس داستان کا ضمنی قصہ ہے۔

مہر چند نے ''نوآئین ہندی'' اس دور میں لکھی جب شمالی ہند میں اردو نثر لکھنے کا رواج بہت کم تھا۔ اس کی نثر سادہ اور عام فہم ہے۔ اس کی عبارتیں ہر قسم کے تکلّف اور تصنّع سے پاک اور روزمرہ کی بول چال کے مطابق ہیں۔ مہر نے اس میں انشا پردازی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ اس میں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کی کثرت نہیں ہے۔ عربی و فارسی کے صرف وہی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو عام بول چال میں مروج تھے۔ تشبیہات اور استعاروں کا استعمال بھی بہت کم ہے البتہ نثر کے درمیان اشعار اور دوہے نقل کیے گئے ہیں۔ ''نوآئینِ ہندی'' تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ سادہ اور عام فہم نثر کی اس روایت کا نقشِ اول ہے جس کا بھرپور نمونہ ہمیں میر امن کی ''باغ و بہار'' میں ملتا ہے۔

عجائب القصص

مغلیہ خاندان کے سولہویں حکمران شاہ عالم ثانی (پ 1728ء م 1806ء) کو شعر و شاعری اور علم و ادب کا گہرا شوق تھا۔ فارسی، اردو اور بھاکا میں شاعری کرتے تھے۔ ان کے اردو اور فارسی کے دو اوین محفوظ ہیں۔ غزلوں کے علاوہ مثنوی، گیت، کبت اور دوہرے بھی لکھے۔ شاہ عالم ثانی نے اردو نثر میں ''شاہ شجاع الشمس'' کا قصہ بھی تصنیف کیا جس کا اصل نام ''عجائب القصص'' ہے۔ شاہ عالم نے یہ قصہ 1207ھ م 1792-93ء میں لکھا۔ غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم کی آنکھیں نکلوادی تھیں۔ اس لیے اس نابینا بادشاہ نے یہ داستان املا کروائی۔ وہ بولتے اور منشی لکھتا جاتا۔ ''عجائب القصص'' کی اہمیت اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ ایک بادشاہ کی تصنیف ہے بلکہ اس کی اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ یہ کتاب اٹھارہویں صدی عیسوی کے عہد آخر کی اردو نثر کا ایک مستند نمونہ ہے جس میں قلعہ معلّٰی کی وہ شستہ اور معیاری زبان استعمال ہوئی ہے جو اردو دانوں کے لیے ہمیشہ ایک معیار اور نمونہ رہی ہے۔ اس دور کی طرزِ معاشرت کی ترجمانی کے اعتبار سے یہ داستان ''کتاب التہذیب'' کا درجہ رکھتی ہے۔ ''عجائب القصص'' کے مطالعے سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے بھی عام فہم، سادہ و دل نشیں نثر، اردو میں موجود تھی اور اس عہد تک آتے آتے اردو نثر میں اتنی صلاحیت پیدا ہوچکی تھی کہ سلاست اور سادگی کے ساتھ بلاتکلف ایک بہت ہی طویل داستان بیان کرسکے۔ شاہ عالم ثانی نے یہ داستان انگریز نوآموزوں کے لیے نہیں لکھی بلکہ اپنی طبیعت کی اپج سے ایسی نثر لکھی جس میں کوئی لفظ غیر مانوس اور خلاف محاورہ نہیں۔ اور یہ نثر نہ صرف عام فہم تھی بلکہ خاص پسند بھی۔ ''عجائب القصص'' کی نثر نگاری سے اردو نثر پورے طور سے جدید دور میں داخل ہوجاتی ہے۔

جذبِ عشق

سید حسین شاہ حقیقتؔ جو شاہ حسین حقیقتؔ کے نام سے مشہور ہیں۔ مشہور شاعر جرأت کے شاگرد تھے۔ انہوں نے فارسی اور اردو میں کئی کتابیں لکھیں۔ حقیقت نے 1211ھ م 97-1796ء میں ''جذب عشق'' کے نام سے اردو نثر میں ایک داستان لکھی۔ اس وقت ان کی عمر 25 سال تھی۔ حقیقت کے بقول یہ ایک سچا واقعہ ہے۔ اس قصے میں انہوں نے دو باتوں کا التزام کیا ہے ایک یہ کہ عبارت سلیس، رنگین اور دلچسپ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ عبارت کے تقاضے کے مطابق اشعار آبدار درج کیے جائیں۔ ''جذب عشق'' کا قصہ میر کی مثنوی ''دریائے عشق'' سے ملتا جلتا ہے۔ اس میں پہلی بار قصے کو براہ راست بیان کیا گیا ہے اس دور کی دوسری داستانوں کی طرح اس میں قصہ در قصہ یا داستان در داستان کی روایت ترک کرکے ساری توجہ ایک قصے پر مرکوز کی گئی ہے۔ اس میں کہیں کہیں مسجّع و مقفّی عبارت لکھی گئی ہے لیکن اس میں کیف و اثر نہیں ہے۔ بہ حیثیت مجموعی ''جذبِ عشق'' کی نثر میں کوئی انفرادیت نہیں ہے۔ اس کی اہمیت بس اس قدر ہے کہ یہ اٹھارہویں صدی کی نثری تصنیف ہے۔

دیباچۂ عزلت

سید عبدالولی عزلت (1104ھ-1189ھ) اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اپنے اردو دیوان کا دیباچہ اردو نثر میں لکھا۔ عزلتؔ نے یہ دیباچہ 1172ھ یا اس سے قبل لکھا۔ اس دیباچے میں انہوں نے واضح طور پر اشارہ دیا ہے کہ ان سے پہلے کسی شاعر نے اپنے دیوان کا دیباچہ اردو میں نہیں لکھا تھا۔ عزلتؔ کا دیباچہ مختصر ہے لیکن اس کی عبارت میں روانی اور توانائی کا احساس ہوتا ہے۔ عزلتؔ کے جملوں پر فارسی کا اثر ضرور ہے تاہم ان کے اندازِ بیان اور جملوں کی ساخت سے اردو کا مزاج نمایاں ہے۔ اس میں ہندی الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ فارسی تراکیب اور استعارے کم ہیں۔ عزلتؔ نے چھوٹے چھوٹے جملوں کے ذریعے براہِ راست ابلاغ کی کوشش کی ہے۔

دیباچۂ ''سبیل ہدایت''

مرزا محمد رفیع سوداؔ نے ''سبیل ہدایت'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی جس میں ان کے ایک ہم عصر شاعر محمد تقی تقیؔ کے سلام اور مرثیے کا منظوم تجزیہ کرکے تقیؔ کی زبان و بیان کی غلطیوں پر گرفت کی گئی ہے۔ تقیؔ نے سوداؔ کے مراثی پر یہ اعتراض کیا تھا کہ انہیں سن کر رونا نہیں آتا۔

اس کے جواب میں سودا نے یہ مثنوی لکھی ۔ مثنوی سے قبل سودا نے اردو زبان میں ایک مختصر دیباچہ بھی تحریر کیا ہے ۔ سودا کی نثر کی اہمیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسے دور میں لکھی گئی جب شمالی ہند میں اردو نثر لکھنے کا رواج بہت کم تھا۔ اس دیباچے میں سودا نے شاعری کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کی صراحت کی ہے۔ اس مختصر دیباچے میں سودا نے عبارت آرائی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے جملے مقفیٰ اور مسجع ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ''سہ نثر ظہوری'' اور ''پنج رقعہ'' کی تقلید کی گئی ہے۔ چوں کہ اس وقت تک شمال میں اردو نثر کا کوئی معیار نہیں بنا تھا اس لیے عزلت ہوں یا سودا دونوں کی اردو نثر پر فارسی کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔

قرآن مجید کے تراجم

اردو نثر کے ارتقا میں قرآن مجید کے اردو تراجم کی بھی بڑی اہمیت ہے کیوں کہ ان تراجم کی وجہ سے اردو نثر میں علمی مسائل کے اظہار و ابلاغ کی وسعت پیدا ہوئی ۔ شمالی ہند میں قرآن مجید کا پہلا ترجمہ و تفسیر شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی کی ''پارہ عم'' کی اردو تفسیر ''خدائی نعمت'' ہے جس کا سنہ تالیف 1185ھ ہے۔ شاہ مراد اللہ نے روزمرہ کی عام زبان میں قرآن کے مطالب بیان کیے ہیں ۔ اس میں اس دور کی عام زبان محفوظ ہوگئی ہے۔ اس میں فارسی کے مشکل الفاظ و تراکیب سے گریز کیا گیا ہے ۔ اس تفسیر میں شاہ مراد کے پیش نظر تفہیم کا مقصد تھا اس لیے اس میں بات چیت کا لہجہ غالب ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے تیسرے فرزند شاہ محمد رفیع الدین (1163ھ ۔1233ھ) اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ انہیں علوم اسلامی کے علاوہ معقول' منقول اور ریاضی پر بھی بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے 1200ھ کے آس پاس اردو میں پہلی مرتبہ مکمل قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے۔ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ لفظی ترجمہ ہے جس میں متن قرآن کی بے حد پابندی کی گئی ہے۔ شاہ صاحب نے ہر عربی لفظ کے نیچے اس کا مناسب اردو لفظ چن کر لکھا ہے۔ انہوں نے وضاحت کے لیے تفصیل میں جانے یا ترجمے کو بامحاورہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ قرآن مجید کے متن سے ذرہ برابر ادھر ادھر نہیں ہوئے اسی لیے اس ترجمے میں اردو کے مزاج کے مطابق مربوط جملے نہیں ملتے ۔ شاہ صاحب نے سورہ بقرہ کی اردو نثر میں ایک تفسیر بھی لکھی جس کا نام ''تفسیر رفیعی'' ہے۔ اس تفسیر کی زبان رواں اور اسلوب سادہ ہے۔ شاہ رفیع الدین کا طرز خطیبانہ اور پُرزور ہے۔ وہ اپنی بات اختصار سے پیش کرنے کی قدرت رکھتے ہیں ۔ انہوں نے عبارت آرائی اور رنگینی سے اجتناب کیا ہے۔

شاہ عبدالقادر (1167ھ ۔ 1230ھ) شاہ ولی اللہ دہلوی کے چوتھے فرزند تھے ۔ یہ شاہ رفیع الدین سے چھوٹے تھے۔ انہوں نے قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا اور مختصر تفسیر لکھی جس کا تاریخی نام ''موضح قرآن'' ہے۔ اس کا سنہ تالیف 1205ھ ہے۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ لفظی نہیں بلکہ بامحاورہ ہے۔ اس کے جملوں کی ساخت اردو انشا کے مطابق ہے۔ اس میں روزمرہ اور محاوروں کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ شاہ عبدالقادر کی زبان میں ایک خاص رچاوٹ پائی جاتی ہے۔ انہوں نے قرآن کے گہرے مطالب کو عام بول چال کی زبان میں بیان کر کے اردو نثر کو نہ صرف وقار بخشا بلکہ مذہبی اور علمی افکار کو بیان کرنے کی روایت کو بھی آگے بڑھایا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. فضل علی خاں فضلی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں ؟ لکھیے۔
2. ''قصہ مہر افروز و دلبر'' کے اسلوب کی اہم خصوصیات کیا ہیں ؟
3. تحسین کی ''نوطرزِ مرصع'' کی زبان و بیان کو دقیق کیوں کہا جاتا ہے؟
4. اٹھارھویں صدی میں قرآن مجید کے دو اہم ترجمے کون سے ہوئے ؟

13.7 خلاصہ

اردو میں نثر کے تحریری سرمایے کی ابتدا صوفیائے کرام کے اقوال اور ملفوظات سے ہوتی ہے جو قدیم کتابوں میں محفوظ ہیں ۔ اردو کی پہلی نثری تصنیف اور اس کے مصنف کے تعین کے سلسلے میں ماضی میں مختلف محققوں نے سید جہانگیر اشرف سمنانی ' شیخ عین الدین گنج العلم'

خواجہ بندہ نواز گیسودراز اور شاہ میراں جی شمس العشاق کے نام پیش کیے۔ لیکن ان بزرگوں سے منسوب رسائل یا تو ناپید ہیں یا بعد کے زمانے کے کسی دوسرے مصنف کی تصنیف ثابت ہو چکے ہیں۔ موجودہ تحقیق کے مطابق اردو کی پہلی نثری تصنیف ''خیرالبیان'' ہے۔ جس کے مصنف پیر روشناں بایزید انصاری ہیں۔

دکنی زبان میں پہلا نثری رسالہ بیجاپور کے مشہور صوفی بزرگ شاہ برہان الدین جانم نے لکھا۔ ''خیرالبیان'' کی دریافت سے قبل ''کلمۃ الحقائق'' ہی کو اردو کو پہلی نثری تصنیف سمجھا جاتا تھا۔ ''کلمۃ الحقائق'' کا موضوع تصوف ہے۔ یہ رسالہ سوال و جواب کے پیرایے میں لکھا گیا ہے۔ اس میں اردو جملوں کے درمیان فارسی جملے لکھے گئے ہیں۔ کہیں آدھا جملہ اردو میں ہے تو آدھا جملہ فارسی میں۔ ''کلمۃ الحقائق'' کے علاوہ جانم کے بعض اور نثری رسائل بھی دستیاب ہوئے ہیں جیسے ''مقصود ابتدائی'' اور ''ارشاد نامۂ نثر'' وغیرہ۔ جانم کے خلیفہ محمود خوش دہاں نے بھی دکنی میں تصوف و معرفت کے مسائل پر مبنی نثری رسائل تصنیف کیے جیسے رسالہ ''واجب الوجود''۔ ''رسالہ تنبیہہ الخلائق'' اور ''رسالہ محمود خوش دہاں'' وغیرہ۔ خوش دہاں کی نثر میں ترتیب و تسلسل اور جامعیت و قطعیت کا احساس ہوتا ہے۔ جانم کے بیٹے شاہ امین الدین اعلیٰ نے بھی دکنی نثر میں کچھ رسالے لکھے جیسے ''گنج مخفی''۔ ''وجودیہ''۔ ''گفتار شاہ امین''۔ ''عشق نامہ'' اور ''کلمۃ الاسرار'' وغیرہ۔ ان میں کلمۃ الاسرار اہم ہے۔ یہ بڑے دلکش ادبی اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ اس میں فقرے چست اور جملے رواں ہیں۔ شاہ امین کی نثر ان کے والد جانم کی نثر کے مقابلے میں ترقی یافتہ ہے۔

گولکنڈہ میں نثر نگاری کا آغاز بیجاپور کے بعد ہوا۔ گولکنڈہ کا پہلا نثر نگار ملا وجہی ہے جو سلطان محمد قلی قطب شاہ کا ملک الشعرا تھا۔ اس نے عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں بادشاہِ وقت کی فرمائش پر دکنی زبان میں ''سب رس'' کے نام سے پہلی نثری داستان لکھی۔ اس کا قصہ اس نے ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی مثنوی ''دستور العشاق'' کے نثری خلاصے ''قصہ حسن و دل'' سے اخذ کیا۔ ''سب رس'' دکنی نثر کا شاہکار اور اردو کی ادبی نثر کا پہلا نمونہ ہے۔ اس میں وجہی نے مقفّٰی اور مسجّع جملے لکھے۔ قصے کے درمیان وجہی نے مختلف موضوعات پر طویل تقریریں قلمبند کی ہیں جو انشائیے کا اولین نمونہ ہیں۔ ''سب رس'' کے ذریعے اردو نثر ایک جست میں ارتقا کی کئی منزلیں سر کرتی نظر آتی ہے۔ ''سب رس'' کے علاوہ وجہی نے ''تاج الحقائق'' کے نام سے بھی ایک نثری کتاب لکھی۔

شاہ میراں جی خدانما عبداللہ قطب شاہ کی حکومت کے ایک عہدیدار تھے۔ وہ شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری کے مرید و خلیفہ تھے۔ انہوں نے چار نثری رسائل تصنیف کیے جن کے نام یہ ہیں (1) شرح شرحِ تمہیداتِ عین القضاۃ (2) رسالہ وجودیہ (3) شرح مرغوب القلوب (4) رسالہ قربیہ۔ میراں جی خدانما دکنی کے بہت بڑے نثر نگار تھے۔ ان کی تالیف ''شرح شرح تمہیدات'' سیکڑوں صفحات پر مشتمل ہے۔ میراں جی خدانما کے مرید و خلیفہ میراں یعقوب نے رکن الدین عماد کی فارسی تصنیف ''شمائل الاتقیا'' کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا جو تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ انہوں نے دکنی نثر کو علمی مسائل کی ترسیل کے لیے پہلی بار اس قدر وسیع پیمانے پر استعمال کیا۔

گولکنڈہ کے ایک اہم نثر نگار عابد شاہ ہیں جن کی تین نثری تصانیف کا پتا چلا ہے (1) ''گلزار السالکین''۔ ''مخزن السالکین'' (2) ''کنزالمومنین'' (3) ''مرأۃ السالکین''۔ عابد شاہ کا اسلوبِ بیان سادہ اور عام فہم ہے۔ بعد کے دور میں ''طوطی نامہ''۔ ''قصہ ملکہ زماں و کام کندلہ'' اور ''سنگھاسن بتیسی'' دکنی کی اہم نثری داستانیں ہیں جن کے مصنفوں کے نام نامعلوم ہیں اٹھارہویں صدی کے دوران باقر آگاہ نے اپنی منظوم تصانیف کے نثری دیباچے لکھے۔ مدراس کے فورٹ سینٹ جارج کالج کے منشی ابراہیم بیجاپوری نے 1825ء میں دکنی زبان میں ''انوار سہیلی'' لکھی جب کہ دکنی زبان کا چلن ختم ہو چکا تھا۔

شمالی ہند میں اردو نثر کا پہلا مستند نمونہ فضل علی خاں فضلی کی ''کربل کتھا'' ہے۔ یہ ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف ''روضۃ الشہدا'' کا اردو ترجمہ ہے جو بالخصوص خواتین کے لیے کیا گیا ہے۔ فضلی نے 1145ھ میں ''کربل کتھا'' لکھی اور 1161ھ میں اس پر نظر ثانی کی۔ اس کا موضوع کربلا کے واقعات ہیں اس لیے اس میں بیان کی دردانگیزی اور شدتِ جذبات پر زور دیا گیا ہے۔ ''کربل کتھا'' کی زبان پر دکنی اثرات بھی نظر آتے ہیں۔

''قصہ مہر افروز و دلبر'' شمالی ہند کی پہلی نثری داستان ہے۔ اس کا مصنف عیسوی خاں بہادر ہندی کا بھی مشہور ادیب ہے۔ ''قصہ مہر

افروز و دلبر'' کا سنہ تصنیف نامعلوم ہے۔ قرائن سے پتا چلتا ہے کہ اس نے یہ قصہ محمد شاہ رنگیلے یا احمد شاہ کے زمانے میں لکھا ہوگا۔ یہ داستان مصنف کی طبع زاد ہے اس کی زبان پر کھڑی بولی کے اثرات نمایاں ہیں۔

میر محمد حسین عطا خاں تحسین نے 1774ء سے کچھ قبل ''نوطرز مرصع'' لکھی جس میں چہار درویش کا قصہ پیش کیا گیا ہے۔ ''نوطرز مرصع'' کا اسلوب مقفی و مسجع ہے۔ اس کی نثر دقیق اور رنگین ہے۔ اس میں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کی بہتات ہے۔ تحسین نے اردو نثر کو فارسی اسلوب کا اچھا رنگ و آہنگ دیا جس سے صرف اہل علم لطف لے سکتے ہیں۔ اسے سمجھنا عوام کے بس کی بات نہیں۔

تحسین کے برخلاف مہر چند کھتری نے 89-1788ء میں جب ''نوآئین ہندی'' لکھی تو اس میں ایسی زبان استعمال کی جو تکلف اور تصنع سے پاک اور روزمرہ کی بول چال کے مطابق تھی۔ اسے سادہ اور عام فہم نثر کا نقش اول کہا جاسکتا ہے۔

مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی نے 93-1792ء میں ''عجائب القصص'' کے نام سے ایک داستان لکھی جس میں اس دور کی طرز معاشرت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ ''عجائب القصص'' کی زبان بھی سادہ اور عام فہم ہے۔ جس میں کوئی لفظ غیر مانوس اور خلاف محاورہ نہیں۔

سید شاہ حسین حقیقتؔ نے جو جرأت کے شاگرد تھے 97-1796ء میں ''جذب عشق'' کے نام سے ایک داستان لکھی جس کا قصہ میر کی مثنوی ''دریائے عشق'' سے ملتا جلتا ہے۔

شمالی ہند میں نثر نگاری کی اولین کاوشوں میں سید عبدالولی عزلتؔ اور مرزا محمد رفیع سوداؔ کے نثری دیباچے بھی شامل ہیں جو انہوں نے اپنی منظوم تصانیف پر لکھے۔ اسی دور میں قران مجید کے اردو تراجم اور تفاسیر سے بھی اردو نثر کے ارتقا کو ایک نئی جہت ملی۔ اس ضمن میں شاہ عبدالرفیع کا تحت اللفظ ترجمۂ قرآن اور ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر کا بامحاورہ ترجمۂ قرآن قابل ذکر ہیں۔

13.8 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالات کے تیس تیس سطر میں جواب دیجیے۔

1. بیجاپور میں اردو نثر کے آغاز و ارتقا کا جائزہ لیجیے۔
2. اردو نثر کی تاریخ میں ملا وجہیؔ کے مقام و مرتبے کا تعین کیجیے۔
3. شمالی ہند میں اٹھارھویں صدی کے دوران لکھی گئی داستانوں پر روشنی ڈالیے۔

ذیل کے سوالات کے پندرہ پندرہ سطر میں جواب دیجیے۔

1. اردو نثر کے فروغ میں میراں جی خدانما کے کارناموں پر روشنی ڈالیے۔
2. ''کربل کتھا'' پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
3. اٹھارھویں صدی کے دوران قرآن مجید کے اہم اردو تراجم کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔

13.9 فرہنگ

گلِ سرسبد	=	پھولوں کی ٹوکری میں سب سے اوپر رکھا ہوا پھول، بڑا پھول
نوآموز	=	نوسیکھ، وہ شخص جو ابھی کسی کام میں پختہ نہ ہو
تصوف	=	وہ علم جس کے ذریعے صفائی قلب حاصل ہو
سلیس	=	صاف، آسان اور رواں زبان یا عبارت
متوسل	=	وسیلہ ڈھونڈنے والا، نزدیکی چاہنے والا

طریقت = انسان کے دل کو پاک کرنے کا طریقہ

ملفوظات = ملفوظ کی جمع، بزرگوں کے ارشادات

آورد = زبردستی طبیعت میں کسی بات کا لانا

مجرد = تنہا، اکیلا، وہ شئے جو مادہ سے پاک ہو

جلیل القدر = عالی مرتبہ، بڑے رتبے کا

جید = خوب، کھرا، زبردست

متنازع = وہ چیز جس پر جھگڑا ہو

پیش رو = آگے آگے چلنے والا

تعقید = بیان کی پیچیدگی

باطنی = اندرونی، دلی

خشت = اینٹ

ارتسامات = نقوش

ضخامت = موٹائی، حجم

اژدہام = ہجوم، کثرت

ملبوس = پہننے کے کپڑے

مضمر = پوشیدہ، مخفی

ابلاغ = پہنچانا

خانوادہ = خاندان

جامع الکمالات = بہت سے کمالات رکھنے والا

حادث = نئی چیز جو پہلے نہ ہو/مخلوق

رموز = رمز کی جمع، پوشیدہ باتیں

ناپید = وہ چیز جو پائی نہ جائے

مربوط = ربط کیا گیا، بندھا ہوا

اسرار = بھید، پوشیدہ باتیں

استوار = مضبوط، پائیدار

فیض = فائدہ

ترسیل = بھیجنا

گم گشتہ = کھویا ہوا

تفہیم = سمجھانا

رشد = ہدایت، تعلیم

بالیدگی = نمو، بڑھاؤ

آبدار = چمک دار

پیرایہ = انداز، ڈھنگ

13.10 سفارش کردہ کتابیں

رفیعہ سلطانہ	اردو نثر کا آغاز و ارتقا	حیدرآباد
جمیل جالبی	تاریخ ادب اردو (جلد اول)	دہلی
جمیل جالبی	تاریخ اردب اردو (جلد دوم)	دہلی
گیان چند جین	اردو کی نثری داستانیں	دہلی
سیدہ جعفر	دکنی نثر کا انتخاب	دہلی
شہناز انجم	اردو میں ادبی نثر کا ارتقا	دہلی
سیدہ جعفر، گیان چند جین	اردو ادب کی تاریخ 1700ء تک	دہلی

اکائی : 14 دہلی کا دبستانِ شاعری

ساخت

14.1 تمہید

14.2 پس منظر

14.3 میر تقی میرؔ

14.4 مرزا محمد رفیع سوداؔ

14.5 خواجہ میر دردؔ

14.6 میر سوزؔ

14.7 مرزا غالبؔ

14.8 مومنؔ

14.9 ذوقؔ

14.10 ظفرؔ

14.11 شیفتہؔ

14.12 حالیؔ

14.13 محمد حسین آزادؔ

14.14 دبستانِ دہلی کی خصوصیات

14.15 خلاصہ

14.16 نمونۂ امتحانی سوالات

14.17 فرہنگ

14.18 سفارش کردہ کتابیں

14.1 تمہید

یہ اکائی اردو شاعری کے ایک مشہور دبستان یعنی دبستانِ دہلی کے بارے میں ہے۔ اس دبستان سے متعلق شاعروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں میرؔ، سوداؔ، دردؔ وغیرہ کے کلام اور ان کی خصوصیات کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں غالبؔ اور ان کے معاصرین کی غزل گوئی کا سیر حاصل جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہم نے دبستان دہلی کی خصوصیات بھی بیان کی ہیں۔ آخر میں ہم اس اکائی کا خلاصہ پیش کریں گے۔ اپنی معلومات کی جانچ کے لیے نمونہ سوالات بھی درج کیے گئے ہیں۔ اس اکائی میں آپ کو امتحانی سوالات بھی بطور نمونہ ملیں گے۔ فرہنگ کے تحت نئے الفاظ کے معنی بھی ہیں۔

آپ کے مزید مطالعے کے لیے سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی جارہی ہے۔ یقین ہے کہ آپ ان سے استفادہ کریں گے۔

14.2 پس منظر

اردو شاعری عہد قدیم سے مختلف مراکز پر نشوونما پاتی رہی ہے۔ ان ادبی مراکز میں دہلی اور لکھنو کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ان دونوں مراکز کو ان کی مخصوص خصوصیات کی بنا پر تاریخِ ادبِ اردو میں دو علاحدہ دبستانوں (دبستان دہلی۔ دبستان لکھنو) کی حیثیت حاصل ہے۔

دبستانِ دہلی کے شعرا اور ان کی شاعری کی خصوصیات پر روشنی ڈالنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سرسری طور پر اس دور کی دہلی کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر کو بھی اجاگر کیا جائے۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات 1707ء میں ہوئی۔ یہی وہ سال ہے جو نہ صرف مغلیہ سلطنت کے انحطاط و زوال کا نقطۂ آغاز بنا بلکہ ہندوستان کی سیاسی و سماجی بدحالی کے آغاز کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوا۔ اگرچہ اورنگ زیب نے اپنی وسیع و عریض سلطنت کو اپنے تینوں بیٹوں معظم، اعظم اور کام بخش میں تقسیم کرکے ان کو جنگ و جدال سے بچانے کا انتظام کرلیا تھا۔ تاہم شہزادوں نے اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے باپ کے مرتے ہی اپنی تلواریں بے نیام کرلیں۔ اور تخت و تاج حاصل کرنے کے لیے آمادۂ جنگ ہوگئے۔ جعفر زٹلی جو ان واقعات کا چشم دید گواہ ہے، لکھتا ہے :

کہاں اب پایئے ایسا شہنشاہ — مکمل اکمل و کامل دل آگاہ
رگت کے انجھواں دل روتا ہے — نہ میٹھی نیند کوئی سوتا ہے
ازیں سو اعظم وزیں سو معظم — زمیں کے واسطے لڑتے ہیں باہم

غرض اورنگ زیب کے بڑے بیٹے معظم نے اپنے دونوں بھائیوں کا صفایا کرکے شاہ عالم بہادر شاہ کا لقب اختیار کرکے 1707ء میں تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس نے صرف پانچ سال کے مختصر سے عرصے میں ہیضے کے مرض میں مبتلا ہوکر 1712ء میں وفات پائی۔ بہادرشاہ نیک دل، فیاض اور پاکیزہ اخلاق کا مالک تھا۔ تاہم امورِ سلطنت کے اعتبار سے وہ ناکام رہا۔ مورخوں نے اس کو ''شہِ بے خبر'' کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ جو اتفاق سے اس بادشاہ کے تخت نشین ہونے کا مادۂ تاریخ بھی ہے۔

بہادر شاہ کے چار بیٹے عظیم الشان، رفیع الشان، معز الدین جہاں دار شاہ اور خجستہ اختر جہاں شاہ تھے۔ یہ چاروں بھی آپس میں برسرِ پیکار ہوئے اور جہاں دار شاہ نے تینوں بھائیوں کو ہلاک کرکے 1712ء کو تخت و تاج کا مالک بن بیٹھا۔ وہ ایک بدچلن اور عیاش حکمران ثابت ہوا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ اس نے اپنی محبوبہ لال کنور کو جو ایک طوائف تھی امتیازِ محل کا خطاب دے کر اپنی ملکہ بنالیا تھا۔ اس عیش پسند بادشاہ کے دور میں علما و فضلا کو دربار سے خارج کردیا گیا تھا۔ اور ان کی جگہ بھانڈوں، مسخروں اور گویوں نے لے لی تھی۔

بہ قول ڈاکٹر ثنا الحق :

> '' اورنگ زیب جیسے محنتی، جفاکش اور دین دار حکمران کے کاہل بیٹے اور عیاش پوتے کی بدولت، اس کی وفات کے چھے سال بعد ہی ملک کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ عوام میں اخلاقی پستی، بے مروتی، بد معاملگی عام ہوگئی۔'' (میر و سودا کا دور ص 23)

جہاں دار شاہ کی نااہلی اور عیش و عشرت کی زندگی سے اس کے بھتیجے فرخ سیر نے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے سید حسین علی اور سید عبداللہ کے ساتھ بنگال سے فوج لے کر اپنے چچا پر حملہ آور ہوا۔ اس حملے کی تاب نہ لاکر بہادر شاہ لال کنور کے ساتھ فرار ہوگیا۔ لیکن بہت جلد گرفتار کرلیا گیا اور پھر بڑی بے دری سے قتل کردیا گیا۔ فرخ سیر نے 1713ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ تاہم اس کے مراسم سید برادران سے زیادہ عرصے تک خوش گوار نہ رہ سکے۔ بادشاہ کی ناعاقبت اندیشی سے دوسرے امرا بھی اس سے نالاں تھے۔ بالآخر سید برادران نے اسے گرفتار کرکے پہلے اسے اندھا کردیا اور پھر قتل کروادیا۔ فرخ سیر کے بعد سید برادران نے رفیع الشان کے بیٹے رفیع الدرجات کو تخت پر بٹھایا جو صرف تین ماہ کے بعد فوت ہوگیا۔ اس کے بعد بھی ایک مختصر عرصے میں سید بھائیوں نے کئی کٹ پتلی بادشاہوں کو تخت پر بٹھایا، جن میں سے ایک روشن اختر بن خجستہ اختر بن شاہ عالم محمد معظم تھا جس نے محمد شاہ کے لقب سے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ اس کی تخت نشینی 1719ء کو عمل میں آئی جب کہ وہ صرف 18 سال کا ناتجربہ کار شہزادہ تھا۔ سیاسی اعتبار سے محمد شاہ ایک نااہل اور ناکارہ بادشاہ تھا لیکن وہ پہلا مغل حکمران ہے جس کا اردو کلام ملتا ہے اور جسے فنونِ لطیفہ سے بے حد لگاؤ تھا۔ اس کے دربار سے کئی ممتاز موسیقار وابستہ تھے۔ اس نے کئی راگ راگنیاں، گیت اور ٹھمریاں ایجاد کیں۔

محمد شاہ کی وفات' کے بعد احمد شاہ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس کے دور حکومت میں ملک کی حالت نہایت ابتر تھی۔ روہیلوں کی بغاوت' امرا کی سازشیں' نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملے' قتل و غارت گری' لوٹ مار اور خانہ جنگی کا ایک سلسلۂ لامتناہی چلتا رہا۔ انھیں غیر یقینی حالات میں احمد شاہ نے 1754ء میں وفات پائی۔ اس دوران عمادالملک کو سلطنت کے انتظامی امور میں بڑا عمل دخل حاصل ہوگیا تھا۔ چنانچہ اسی کی سعی و کاوش سے جہاں دار شاہ کے بیٹے عزیز الدین کو عالم گیر ثانی کے لقب سے تخت سلطنت پر بٹھایا گیا۔ عماد الملک اور عالمگیر ثانی میں جب کسی وجہ سے نا اتفاقی ہوگئی تو اس نے عالمگیر ثانی کو 1751ء میں موت کے گھاٹ اتار دیا اور عالمگیر کے پڑ پوتے کو شاہ جہاں ثانی کے لقب سے تخت و تاج کا مالک بنایا۔ اس دور میں احمد شاہ ابدالی نے پھر قتل و غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا۔ اس بار اس نے 1761ء میں دہلی پر بھی قبضہ کرلیا۔ اور شاہ عالم ثانی کو تخت نشین کیا۔ یہ زمانہ بھی دہلی میں افراتفری اور خانہ جنگی کا تھا۔ کبھی روہیلوں نے سر اٹھایا تو کبھی حصول تخت کے لیے مرہٹوں نے ہنگامے کھڑے کیے۔ یہاں تک کہ بادشاہِ وقت کو اندھا کر کے اسے تخت سے بے دخل کر دیا گیا۔ بقول میر:

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

اس صورت حال سے انگریزوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اور 1803ء میں لارڈ کینگ نے دہلی پر قبضہ کرلیا لیکن نام بادشاہ ہی کا رہا۔ یہاں تک کہ 1807ء میں اکبر شاہ ثانی تخت پر بیٹھا اور 1837ء میں بہادر شاہ ثانی نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس طرح یکے بعد دیگرے کئی بادشاہ تخت سلطنت پر جلوس کرتے اور ختم ہوتے جارہے تھے لیکن دراصل کوئی بادشاہ نہ تھا سب کٹ پتلی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام افلاس' بیروزگاری' افراتفری اور انتشار کی وجہ سے مصیبتوں میں گھرے ہوئے تھے۔ جس کسی کو جہاں بھی گوشۂ عافیت نظر آتا ادھر چلا جارہا تھا۔ ان غیر یقینی حالات کی وجہ سے انگریزوں کی بن آئی۔ ان کا اثر و رسوخ اس قدر بڑھ گیا کہ لارڈ کینگ نے اعلان کیا کہ اب کوئی بادشاہ نہیں بنے گا اور مغلیہ حکومت کے جانشینوں کو پرنس کہا جائے گا۔ دھیرے دھیرے انگریزوں کا اقتدار بڑھنے لگا اور مغلیہ سلطنت برائے نام رہ گئی۔ بہادر شاہ ظفر آخری مغل حکمران تھے۔ انگریز ان سے اقتدار چھین لینے کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ چنانچہ 1857ء کی بغاوت میں ان پر باغیوں کی پشت پناہی اور حمایت کا الزام لگا کر انھیں گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا گیا جہاں انھوں نے نومبر 1862ء میں آخری سانس لی۔ ان کو رنگون ہی میں سپردِ خاک کیا گیا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اورنگ زیب نے کس سنہ میں وفات پائی؟
2. اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کا جانشین کون بنا؟
3. شاہ عالم بہادر شاہ کو ''شہہ بے خبر'' کیوں کہا جاتا ہے؟
4. کس مغل حکمران نے لال کنور کو امتیاز محل کا خطاب دے کر اپنی ملکہ بنایا؟
5. کس مغل بادشاہ کو شعر و سخن اور موسیقی سے دلچسپی تھی؟
6. بہادر شاہ ظفر نے کب اور کن حالات میں وفات پائی؟

14.3 میر تقی میرؔ

میر تقی نام اور میرؔ تخلص تھا۔ 1135ھ کو اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے منہ بولے چچا سید امان اللہ سے حاصل کی۔ میر کے والد سید عبداللہ درویش صفت انسان تھے۔ تقریباً تیرہ سال کی عمر میں میر اپنے والد کی شفقت سے محروم ہوگئے۔ امان اللہ بھی راہی عدم ہوئے۔ ان حالات میں میر نے تیرہ سال کی عمر میں دہلی کا پہلا سفر کیا۔ وہاں صمصام الدولہ نے ان پر مہربانی کرتے ہوئے ایک روپیہ روزآنہ مقرر کیا۔ کچھ عرصے بعد وہ دہلی سے آگرہ چلے آئے۔ ایک روپیہ روزانہ ان کو صمصام الدولہ کی وفات تک ملتا رہا۔ انتقال کے بعد یہ بند

ہوگیا۔ پریشان ہوکر 17 سال کی عمر میں دوبارہ دہلی پہنچے اور اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خان آرزوؔ کے ہاں قیام کیا۔ سوتیلے بھائی کے بہکانے سے ان کو سوتیلے ماموں کا گھر چھوڑنا پڑا وہ اور علاحدہ رہنے لگے۔

ادب و انشاء کی تعلیم آرزوؔ اور میر جعفر علی سے حاصل کی۔ سعادت علی امروہوی کی ترغیب سے ریختہ گوئی شروع کی۔ میر اپنی عمدہ شاعری کی وجہ سے دہلی اور لکھنو میں مقبول ہو چکے تھے۔ مختلف امرا و روسا نے ان کی ہمت افزائی کی۔ میرؔ کی ذاتی زندگی بہت ہی پر درد، پُر آشوب ماحول میں بسر ہوئی۔ ان کے عشق اور عقیدۂ حیات کو حالات نے بہت یاس انگیز بنا ڈالا۔ وہ اس یاسیت کو اتنے موثر انداز میں بیان کرتے ہیں کہ دوسروں کے دل میں نشتر کی طرح اتر جاتے ہیں۔ بے کسی اور بربادی ان کے خاص موضوع ہو کر رہ گئے۔ اسی حسرت زدگی کے باعث ان کے انداز میں ایسی صفائی و شستگی، سادگی اور روانی آ گئی ہے جسے مترنم زدہ پر کاری کہا جاسکتا ہے۔ شاعری کے فن سے وہ بخوبی واقف تھے اس لیے وہ ایسی دلکش تصویریں کھینچتے ہیں جس میں لطافت کی جھلک نظر آتی ہے۔ میرؔ نے اپنی زندگی شاعری کے لیے وقف کردی، شاعری ان کی زندگی کا اہم جزو بن گئی۔ محمد حسین آزادؔ نے انھیں اردو زبان کا قدیم جوہری لکھا ہے۔ میرؔ صاحب کے بہتر 72 نشتر مشہور ہیں۔

میرؔ کی شاعری کے چراغ کے سامنے دوسرے شعرا کی شمع شاعری کی لو مدھم تھی یہاں تک کہ سوداؔ بھی اس سے بچ نہ سکے۔ سوداؔ خود کو دنیائے غزل کا بڑا شاعر سمجھتے تھے۔ ان کے چاہنے والے اس کی تائید کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ میدان غزل میں میرؔ نے سوداؔ کو مات دیدی تھی۔ میرؔ کا مرتبہ بلند رہا۔ میرؔ کی شاعری ایک بیکراں سمندر ہے جو اپنے دامن میں اتھاہ گہرائی رکھتی ہے۔ میرؔ کی شاعری یاسیت اور قنوطیت کے باوجود غم کی تیز لے رکھتی ہے جو صرف ان کی ذات تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ کروڑوں کو اپنا ہمنوا بناتی گئی۔ ان کی شاعری کی غنائیت، سوز و گداز، نغمگی اور دلکشی اسلوب نے میرؔ کو اردو کا سب سے بڑا غزل گو بنادیا ہے۔ قاری میرؔ کے غم کو اپنا غم سمجھتا ہے یہی ان کی شاعری کا کمال ہے۔ اردو غزل گویوں میں میرؔ کو وہی شاعرانہ عظمت حاصل ہے جو حافظ کو فارسی غزل گویوں میں حاصل ہے۔ قطعیت کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ میر شہنشاہ غزل ہیں۔ ''خدائے سخن'' ہیں اس میدان میں کوئی ان کا حریف نہیں۔

شاعری کے فن پر دسترس صرف ذوقِ سلیم سے حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی شاعری اضطراری کیفیت کا نتیجہ ہے۔ مشق اور محنت سے یہ فن سیکھا جاتا ہے۔ میرؔ نے حسنِ بیان کے ساتھ ساتھ لطفِ زبان پر بھی زور دیا۔ میرؔ نے جتنی تراکیب استعمال کی ہیں وہ شاید ہی کسی نے استعمال کی ہوں گی۔ اردو شاعری میں نئی ترکیب ڈھالنے کا سہرا میرؔ ہی کے سر جاتا ہے۔ بعد کے شعرا میں غالبؔ اور اقبالؔ نے نئی نئی ترکیبوں سے اردو شاعری کو مالا مال کیا اور اردو شاعری کی لفظیات میں اضافہ کیا۔ میرؔ کے یہاں کوئی لفظ غیر شاعرانہ نہیں ملتا۔ میر نے فنِ شاعری کو شعوری طور پر نکھارا اور بڑی محنت کی۔ ان کی شاعری میں آمد کی کیفیت ہر جگہ نظر آتی ہے۔ یہ آمد کسی الہامی کیفیت کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس میں الفاظ اور تراکیب کے ذخیرے پر پکڑ اور عشق کی بڑی اہمیت ہے۔ روانی لفظیات پر دسترس سے آتی ہے۔ میرؔ کی دل آویزی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ اپنے واردات اور حالات کو پُر تاثیر اور انوکھے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ایک عالم پر چھا جاتے ہیں۔ اور بات دل میں اتر جاتی ہے۔ میرؔ ناکام ہوتے ہیں مگر ہمت نہیں ہارتے۔ ان کی شاعری درد انگیز ضرور ہے لیکن زہرناک اور مردم بیزار نہیں ہے۔ ان کو انسان کی عظمت پر پورا بھروسہ ہے اور اس کو وہ سہل چیز نہیں سمجھتے۔ میرؔ نے غمِ عشق اور غمِ جہاں کو مردانہ وار اٹھایا ہے۔ وہ ڈوب کر ابھر سکتا ہے اور مرنے کے بعد بھی آگے چلنے کا عزم رکھتا ہے۔

میرؔ کی غزل کا مطالعہ نامکمل رہ جائے گا اگر زبان کے سلسلے میں ان کی خدمات کا جائزہ نہ لیا جائے۔ بول چال کی زبان سے گہرا رشتہ قائم رکھنے کی وجہ سے سادگی میرؔ کے فن کا مزاج بن گئی ہے۔ میر نے گلی کوچوں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بولی جانے والی عام بول چال کی زبان کو شاعری میں استعمال کرکے بیک وقت دو کام کیے ہیں۔ ایک یہ کہ شاعری کا رشتہ براہِ راست سارے معاشرے سے جوڑ دیا اور دوسرے یہ کہ عام بول چال کی زبان تخلیقی شعور کی بھٹی میں پک کر ایسی نکھری کہ اس کی قوت اظہار دوچند ہوگئی اور اس کا ارتقا تیز ہوگیا۔

تغزل کے میدان میں میرؔ کا کوئی جواب اردو شاعری میں نہیں۔ انھوں نے جس درد اور سوز کے ساتھ اپنے تجربات کو رقم کیا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ان کے کلام میں موسیقیت اور ترنم بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ میرؔ کا سوز و گداز تخیلی نہیں ہے۔ میر نے زبان کے تعلق سے اردو شاعری کو بہت کچھ دیا انھوں نے اردو کو محدود علاقائیت سے نکال کر وسیع، مہذب، شستہ و شگفتہ بنانے کی کوشش کی۔ انھوں نے اردو زبان کا

پورا خیال رکھا اسے ہندوستانیت سے الگ نہیں کیا۔ سینکڑوں ہندی الفاظ استعمال کیے' دیوالی' ہولی کا ذکر کیا متعدد غزلوں کی فضا ہندوستانی ہے۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ میرؔ نے اردو شاعری پر اپنی انفرادیت کا گہرا نقش چھوڑا ہے۔ یہ انفرادیت موضوع میں بھی ہے اسلوب میں بھی اور زبان و بیان میں بھی۔ سادگی و پُر کاری' نشتریت' گداز اور دل کو چھو لینے کی خصوصیات میں ان کا کلام بے مثل ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. میر تقی میرؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
2. میرؔ اپنی شاعری میں کیسی زبان استعمال کرتے ہیں؟
3. میرؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

14.4 مرزا محمد رفیع سوداؔ

مرزا محمد رفیع نام' سودا تخلص تھا۔ 1706ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ میر کے بڑے معاصر اور اردو زبان کے ان شعرا میں سے ہیں جن کا نام اردو شاعری میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ان کے والد مرزا محمد شفیع دہلی کے بڑے تاجر تھے۔ والد کے انتقال کے بعد ورثے میں جو بھی ملا اسے بڑی لاپروائی سے خرچ کیا۔ یہاں تک کہ ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ اس زمانے میں طوائف الملوکی کا دور تھا۔ فوجی نظام درہم برہم تھا۔ مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹمارہا تھا۔ سوداؔ نے اپنے مخمس اور شہر آشوب میں اس دور کے حالات کی صحیح مرقعہ کشی کی ہے۔

دہلی کی تباہی کے بعد دیگر شعرا کی طرح سوداؔ نے بھی نقلِ مقام کیا اور لکھنو چلے آئے۔ نواب شجاع الدولہ والیِ اودھ سوداؔ کی شاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے بعد ان کے فرزند آصف الدولہ نے بھی سوداؔ کی بڑی سرپرستی کی۔ سودا نے فارغ البالی کی زندگی گذاری۔

سوداؔ نے میر کے برخلاف پہلے فارسی میں شاعری شروع کی اور اس کے بعد خان آرزو کی ہدایت پر اردو کی طرف متوجہ ہوگئے۔ سودا میں شعر گوئی کی غیر معمولی صلاحیت تھی جیسے ہی وہ فارسی سے اردو کی طرف آئے ان کی شاعری کے جوہر چمک اٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی شاعری کی شہرت دلی سے نکل کر سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔

شاعری کے علاوہ سوداؔ کو کُتّے پالنے کا بھی شوق تھا۔ جو دہلی کے علاوہ فیض آباد اور لکھنو ہجرت کرنے کے بعد بھی باقی رہا۔ سوداؔ مختلف درباروں سے وابستہ رہے۔ ایک عرصہ تک وہ دلی میں رہے۔ 5 نومبر 1759ء میں عالمگیر ثانی کے قتل کے بعد احمد شاہ ابدالی نے دلی پر حملہ کردیا تھا۔ سب عماد الملک دہلی چھوڑ کر سورج مل جاٹ کے پاس چلے گئے تھے۔ سودا بھی ان کے ساتھ تھے۔ فرخ آباد میں کچھ عرصہ گذارا وہاں سے فیض آباد چلے آئے اور نواب شجاع الدولہ کے دربار سے منسلک ہوگئے۔ نواب نے دو سو روپیہ ماہوار مقرر کیا۔ آصف الدولہ نے اپنے والد شجاع الدولہ کی مقرر کردہ سودا کی تنخواہ بحال رکھی۔ بعد میں چھ ہزار سالانہ کی جاگیر سوداؔ کے لیے مقرر کیا۔ آصف الدولہ نے جب فیض آباد سے لکھنو کو اپنا مستقر بنالیا تو سودا بھی لکھنو چلے آئے۔ انھوں نے 27 جون 1781ء میں لکھنو میں وفات پائی۔ آقا امام باقر کے باڑے میں دفن ہوئے۔

سودا نے دوسرے معاصرین کے مقابلے میں اپنے دور کی زیادہ نمائندگی کی ہے۔ میرؔ کے برخلاف سوداؔ اس بگڑتے ہوئے ماحول میں بھی خوش اسلوبی سے زندگی بسر کرنے کا پورا سلیقہ رکھتے تھے۔

قصیدہ گوئی میں سودا سب سے بڑے شاعر تھے۔ ہجویات سودا کے مطالعے سے جو تصویر سامنے آتی ہے اس میں سوداؔ ایک جلد بھڑک اٹھنے والے انسان نظر آتے ہیں۔ جب کسی سے ناراض ہوتے تو فوراً اپنے غلام غنچہ کو حکم دیتے۔ غنچہ لانا تو میرا قلمدان' ذرا میں اس کی خبر لوں''۔

خواجہ باسط جیسے عالم سے کسی نے دریافت کیا کہ میر اور سودا کی شاعری میں کیا فرق ہے۔ انھوں نے فوراً جواب دیا ''میر کی شاعری میں آہ ہے اور سودا کی شاعری میں واہ ہے''۔

سودا رکھ رکھاؤ اور سلیقے کے انسان تھے۔ وضع داری اور شرافت نے ان کے مزاج میں خوشگوار رنگ پیدا کیا۔ ظرافت ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ قدرتِ بیان ایسی تھی کہ ذرا سی دیر میں اشعار موزوں کردیتے تھے۔ سودا کی غزل انتشار کے دور میں اعتدال کی آواز

ہے۔ افراتفری کے زمانے میں توازن کی آواز ہے۔ سودا کی غزلوں کی ایک خاص بات ہے ہمواری۔ فیض احمد فیض نے لکھا کہ میر کے اچھے شعر واقعی سودا کے بہترین اشعار سے کہیں زیادہ بلند ہیں مگر یہ بھی صحیح ہے کہ سودا کے بہت بُرے اشعار بھی میر کے بُرے اشعار سے بہت بہتر ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سودا کی غزلیں کم و بیش متوازن نہیں۔ سودا نے غزل کا دائرہ ذات سے معاشرے تک وسیع کردیا۔ اردو غزل میں تہذیبی آمیزے کی تشکیل کا عمل سودا کی غزل میں نمایاں ہے۔ سودا نے اپنے دور کے توازن اور اعتدال کو اپنی غزلوں میں سمو لینے میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئے ہیں اور اسی لیے وہ اپنے دور کی آواز ہی نہیں اس تہذیبی آمیزے کا بھی اشارہ بن گئے جو اردو کی پہچان سمجھا جاتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. دہلی سے لکھنو پہنچ کر سودا کس بادشاہ کے دربار سے وابستہ ہوئے؟
2. سودا نے کس صنف سخن میں کمال حاصل کیا؟

14.5 خواجہ میر درد

خواجہ میر نام اور دردؔ تخلص تھا۔ درد کے ماں باپ دونوں سادات سے تھے۔ والد کا نام خواجہ ناصر تھا عندلیب تخلص کرتے تھے۔ 1133ھ میں درد دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے اساتذہ مفتی دولت اور سراج الدین علی خان آرزو تھے۔ مذہبی تعلیم درد نے اپنے والد سے حاصل کی تھی۔ موسیقی سے دردؔ کو بے حد لگاؤ تھا وہ خود اس کے ماہر تھے۔ یہ شوق بھی ان کو اپنے والد کی طرف سے ملا تھا۔

ابتدا میں دردؔ نے شاہ عالم بادشاہ کی فوج میں نوکری کی اور سپاہی پیشہ اختیار کیا۔ بعد میں اس ملازمت سے بددل ہو کر سبکدوش ہوگئے۔ انتیس برس کی عمر میں دنیا کو چھوڑ کر درویشی اختیار کی۔ والد کے انتقال کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ اخلاق اور انکسار دردؔ کی طبیعت میں ابھر کر آ گیا تھا۔ کبھی انھوں نے اپنی خودستائی نہیں کی۔ خودداری' درویشی' خدا پر بھروسہ اور ثابت قدمی ان کی سیرت اور شخصیت میں رچ بس گئی تھی۔ موسیقی سے دلچسپی تھی' ہندوستان کے بڑے بڑے موسیقار ان سے تعلیم حاصل کرنے دہلی آیا کرتے تھے۔ دردؔ کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی مذہبیت اور خداشناسی تھی۔ ان کی مذہبیت ان کی زندگی کے دوسرے شعبوں پر چھائی ہوئی تھی۔ 1199ھ میں اردو کے اس درویش شاعر نے دہلی میں وفات پائی۔ وفات کے وقت دردؔ کی عمر چھیاسٹھ 66 سال کی تھی۔

دردؔ نے درویشانہ زندگی گزاری جن چیزوں پر ان کا ایمان اور یقین تھا وہی خیالات ہمیں ان کی شاعری میں بھی ملتے ہیں۔ ان کی زندگی اور شاعری میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج ان کا درجہ اردو شاعری میں بہت اونچا مانا جاتا ہے۔ ان کو اردو شاعری کی عمارت کے چار ستونوں میں سے ایک ستون کہا جاتا ہے یعنی وہ لوگ جنھوں نے شاعری کو ترقی دی اس کو بہت سی خامیوں اور برائیوں سے پاک کیا' اس کے اصول اور قاعدے مقرر کیے۔ باقی تین ستون تھے مرزا مظہر جانِ جاناں' مرزا محمد رفیع سوداؔ اور میر تقی میرؔ ہیں۔

دردؔ کے کلام کو اگر غور سے پڑھا جائے تو یہ خصوصیت بھی نظر آئے گی کہ ان میں کوئی خلافِ تہذیب یا معیارِ اخلاق سے گری ہوئی بات نہیں ملے گی۔ ان کی محبت کا معیار اونچا اور پاکیزہ ہے۔ وہ ایک صوفی بزرگ تھے۔ ان کے پاکیزہ خیالات کا ان کی شاعری میں جابجا اظہار ملتا ہے۔ دنیا سے بے تعلقی کا اظہار ان کے یہاں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ دنیاوی شان و شوکت سے وہ نفرت کرتے تھے اس کا اظہار ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ سادگی' زبان و بیان کی دلکشی ان کے کلام میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. دردؔ نے کس بادشاہ کی فوج میں ملازمت اختیار کی تھی؟
2. دردؔ کی شاعری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

14.6 میر سوزؔ

سید محمد میر نام' سوزؔ تخلص تھا۔ ان کے والد دہلی کے رہنے والے تھے جن کا نام سید ضیاء الدین تھا۔ بزرگوں کا وطن بخارا تھا۔ پہلے میر

تخلص کرتے تھے لیکن میر تقی کی شہرت کے باعث اسے ترک کر دیا اور سوز تخلص اختیار کیا۔ آزاد منش آدمی تھے زندگی خاکساری سے بسر کی۔ دہلی کی تباہی کے بعد فرخ آباد اور اس کے بعد فیض آباد اور پھر لکھنو چلے آئے۔ مگر قسمت راس نہ آئی۔ آصف الدولہ کے انتقال کے بعد مرشد آباد چلے گئے۔ یہاں پر بھی تقدیر نے ان کا ساتھ نہیں دیا اس لیے پھر لکھنؤ واپس آئے یہاں کچھ سال بعد انتقال کیا۔

سوز تیراندازی، شہہ سواری اور فنون سپاہ گری میں ماہر تھے۔ ورزش کا بھی بہت شوق تھا۔ ستار بھی اچھا بجاتے تھے۔ کلام ان کا سیدھا سادا تھا۔ تکلف اور تصنع نام کو نہیں تھا۔ یہاں تک کہ تشبیہیں، استعارے، اضافتیں اور فارسی ترکیبیں بھی شاذ ہی پائی جاتی ہیں جو کچھ لطف ہے وہ محض صفائی محاورہ اور شیرینیٔ زبان کا ہے۔ سوز اس سادگی کے قائل تھے جو صرف سادے ہندی الفاظ سے پیدا کی جائے۔ انھوں نے فارسی ترکیبوں سے بھی کام لیا اس لیے سوز کے یہاں خوش نمائی زیادہ ہے۔

سوز کا دیوان ضخیم نہیں ہے اس میں غزلیں زیادہ ہیں۔ ایک مثنوی ہے اور تھوڑی سی رباعیاں اور چند مخمس۔ سوز کے پڑھنے کا انداز خاص تھا۔ نفسِ مضمون کے مطابق اداکاری بھی کرتے تھے گویا اس طرح اپنے کلام میں زور اور اثر پیدا کر دینا چاہتے تھے۔ قدیم اور متروک الفاظ کا استعمال بھی ان کے پاس زیادہ ہے۔ دیوانِ سوز کے مطالعے سے پہلی بات تو یہ سامنے آتی ہے کہ سوز، میر، سودا، درد سے مختلف قسم کے شاعر تھے۔ ان کے کلام میں وہ تہہ داری اور گہرائی نہیں ہے جو میر اور درد کے ہاں ملتی ہے اور نہ وہ تخیل ہے جو سودا کے ہاں نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں وہ انفرادیت بھی نہیں ہے جو میر اور سودا کو ہر دور اور زمانے کا شاعر بنا دیتی ہے۔ سوز بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ان کا موضوع بھی عشق ہے۔ اس عشق میں نہ تو گہرائی ہے اور نہ وہ تجربات جو میر کے ہاں نظر آتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. سوز کا پورا نام کیا تھا؟
2. سوز نے کن کن اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی؟

14.7 مرزا غالب

مرزا غالب دبستانِ دہلی کے دوسرے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا نام مرزا اسد اللہ خاں تھا اور تخلص غالب۔ پہلے اسد تخلص تھا جس کو تبدیل کر کے غالب کر دیا۔ 1797ء میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں پائی۔ شادی کے بعد جب ان کی عمر صرف تیرہ برس کی تھی مستقل طور پر شاہ جہاں آباد (دہلی) میں رہنے لگے۔ غالب کی تعلیم اگرچہ باقاعدہ طور پر کم ہوئی لیکن انھوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور اپنے ذوق کی بنا پر فارسی زبان اور شاعری کا گہرا مطالعہ کیا۔ غالب کے والد پہلے آصف الدولہ والی اودھ کے ہاں اور پھر حیدرآباد کی فوج میں ملازم تھے۔ والد کے انتقال کے بعد چچا نے غالب کی پرورش کی۔ چچا کے انتقال کے بعد ایک جاگیر کے عوض سات سو روپیہ سالانہ کا پنشن غالب کو ملتا رہا۔ غالب نے کبھی ذاتی مکان نہیں بنایا۔ کرائے کے مکان ہی میں گزارا کیا۔ اسی طرح وہ کتابیں بھی نہیں خریدتے تھے۔ کتب خانے سے منگوا کر پڑھتے تھے۔

غالب زندگی میں مالی اعتبار سے کبھی آسودہ نہیں رہے ان کے اخراجات ہمیشہ آمدنی سے زیادہ رہے۔ 1857ء کے بعد ان کا وظیفہ بند ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں مقدمے کی پیروی کرنے کے لیے وہ دہلی سے کلکتہ گئے کیوں کہ اس زمانے میں کلکتہ انگریزی حکومت کا پایۂ تخت تھا۔ مالی منفعت کی توقع پر غالب نے بعض امرا اور انگریز عہدے داروں کی شان میں قصیدے بھی لکھے لیکن ان کو ہمیشہ اپنی عزت نفس کا بھی بڑا خیال تھا۔ انھوں نے صرف ایسے لوگوں کی مدح کی جن کا رتبہ اس زمانے میں بہت بلند تھا۔ غالب کی گفتگو اور ان کی شخصیت میں بڑی جاذبیت تھی وہ بڑے ظریف طبع تھے ان کے بے شمار لطیفے مشہور ہیں۔ ان کے دوستوں کا دائرہ بہت وسیع تھا جس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل تھے۔ غالب کی زندگی میں رندی اور سرمستی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اپنے خطوط میں اپنی ساری خوبیاں اور خامیاں بیان کر دی ہیں۔ ذوق کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر نے غالب کو اپنا استاد مقرر کیا۔ 72 سال کی عمر میں 1869ء میں غالب نے انتقال کیا اور درگاہ حضرت نظام الدین کے احاطے میں دفن کیے گئے۔

غالبؔ کی شخصیت کی طرح ان کی زبان کا دائرۂ عمل بھی بہت پہلو دار اور وسیع ہے۔ جس میں ایک طرف روایت کی رچاوٹ اپنا کام کررہی ہے تو دوسری طرف بغاوت کرتی ہوئی ذہنیت اپنا الگ راستہ نکال کر ایک ایسا چمن کھلا رہی ہے جس کا منظر آج کی شاعری سے الگ اور مختلف ہے۔ غالب کی زبان نے آنے والے دور کے شعرا کے ہر طبقے کو متاثر کیا۔ اس میں حالیؔ، فانیؔ، اصغرؔ، شادؔ، یگانہؔ، حسرتؔ بھی شامل ہیں۔

غالبؔ کی شاعری میں ان کے مزاج اور ان کے طرزِ فکر کو بھی بہت دخل ہے۔ طبیعتاً وہ آزاد مشرب، مزاج پسند، ہر حال میں خوش رہنے والے انسان تھے لیکن نگاہ صوفیوں کی رکھتے تھے۔ زمانے نے جتنی قدر ان کی، کی جانی چاہیے تھی، نہیں کی جس کا انھیں افسوس تھا اس کے باوجود ان کے صوفیانہ اور فلسفیانہ تفکر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اوّل اوّل تو انھوں نے بیدلؔ کا رنگ اختیار کیا بعد میں انھوں نے میر کی سی سادگی لیے متوازن انداز میں اپنا ایک رنگ قائم کیا۔ عاشقانہ انداز کے مضامین میں بھی غالبؔ نے اپنا ایک الگ راستہ نکالا۔ شدتِ احساس نے ان کے تخیل کو باریک تر مضامین کی طرف رہ نمائی کی۔ گہرے واردات قلب کا پُر لطف نفسیاتی تجزیہ اردو شاعری میں اس وقت تک سوائے مومن کے کسی نے نہیں پیش کیا تھا۔ غالبؔ نے فارسیت کے باوجود اردو کی بنیادی صفت اور مزاج کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اس طرح زبان کی ساخت پر گہرا اثر ڈالا۔ غالب نے اردو زبان کو ذہنی و عقلی رنگ دیا۔ نئی تراکیب اور بندشیں وضع کرکے زبان میں علوی خیالات کے اظہار کا مسئلہ آسان کردیا۔ اردو زبان کے نسائی لہجے میں مردانہ پن کے عناصر و آہنگ کو ابھارا اور اس میں گہرے اور لطیف جذبات و احساسات کے اظہار کی صلاحیت پیدا کی۔ غالبؔ نے ایک طرف خود کو عام طرز ادا کی ضرورت کے موافق بدلا اور دوسری طرف کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنی ادا کرنے کی کوشش کی۔ اسی لیے غالبؔ کی شاعری ارض و سما کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنے کے فن سے وہ واقف تھے۔ غالب کے ایک بند کا ایک مصرع اپنے اندر ایک عالم رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج غالب ایک شاعر کے بجائے قوم کے نمائندہ شاعر ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. غالب کب اور کس مقام پر پیدا ہوئے؟
2. غالب نے ابتداً فارسی کے کس شاعر کے رنگ میں غزلیں کہیں؟
3. غالب کو شاعر کی حیثیت سے کیوں مقبولیت حاصل ہوئی؟

14.8 مومنؔ

محمد مومن خاں نام اور مومنؔ تخلص تھا، غالبؔ کے معاصرین میں مومنؔ کا اپنا ایک مقام ہے۔ غالبؔ کی طرح مومنؔ بھی اپنی انفرادیت لیے ہوئے تھے۔ مومن خاں مومن 1800ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم غلام نبی خاں دہلی کے ممتاز حکیم تھے۔ شاہ عبدالعزیز نے مومن کا نام رکھا۔ شاہ عبدالقادر سے عربی سیکھی۔ طِب والد اور چچا سے سیکھا۔ ریاضی اور رمل سے بھی دلچسپی تھی۔ شطرنج کے کھلاڑی تھے۔ موسیقی اور عملیات میں دخل تھا۔ شاعری میں بہ وجہ عاشق مزاجی لگاؤ پیدا ہوا جو دن بدن بڑھتا ہی گیا۔ شروع میں شاہ نصیرؔ کو اپنا کلام دکھایا۔ شاعری یا طبابت کو اپنا ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ ابتدائی زندگی عاشقی میں کٹی بعد کو سید احمد بریلوی سے بیعت کی اور تائب ہوکر بقیہ عمر صلاح و تقویٰ کے دوران گزاردی۔ 1851ء کو اپنی چھت پر مرمت کی نگرانی میں اچانک پاؤں پھسلا اور نیچے گر پڑے اس کے پانچ ماہ بعد انتقال کیا۔

مومنؔ نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر جس صنفِ سخن کے لیے وہ مشہور ہوئے وہ غزل ہے۔ مومنؔ نے گوشت پوست کے محبوب سے محبت کی، اس کا ذکر مومنؔ کے یہاں ''پردہ نشین'' کے خطاب سے ملتا ہے۔

مومنؔ کی نازک خیالی میں ان کے اسلوب کی ندرت اور شاعرانہ شوخی دونوں شامل ہیں۔ نازک خیالی کا ایک بڑا سبب روشِ عام سے ہٹ کر چلنے کی خواہش کی تکمیل بھی ہے۔ مومنؔ کا مشہور شعر ہے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس شعر کو سن کر غالبؔ پھڑک اٹھے اور کہا مومنؔ یہ شعر مجھے دے دے اور میرا دیوان لے لے۔ اشارے اور کنایے کے پردے میں مومنؔ اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔ اس کو قاری داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مومنؔ کے کلام کی جادوگری جہاں ان کے خیالات اور اظہار کے پیچ وخم میں ہے وہیں ان کی سادگی کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ تشبیہات و استعارات' صنائع و بدایع کو بھی مومنؔ نے بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔ مقطع میں مومنؔ نے تخلص کو اس طرح خوبصورتی سے نبھایا ہے کہ دوسرے الفاظ اسی سے مطابقت رکھتے ہیں۔ تخلص کو خوبی سے نبھانے میں مومن کا نام سرفہرست ہے مثلاً ایک شعر ملاحظہ ہو:

عمر ساری تو کٹی عشقِ بُتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

اپنی معلومات کی جانچ :

1. مومنؔ کو کن علوم وفنون سے دلچسپی تھی؟
2. غالبؔ نے مومنؔ کے کس شعر کو سن کر کہا تھا کہ مومنؔ یہ شعر مجھے دے دے اور میرا سارا دیوان لے لے۔؟
3. مومن کی شاعری پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

14.9 ذوقؔ

شاہ نصیرؔ کے شاگرد' بہادر شاہ ظفرؔ کے استاد تھے۔ ان کا نام شیخ محمد ابراہیم اور ذوقؔ تخلص تھا۔ 1789ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد شیخ رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول کے سپرد ہوئی جن کو شعر گوئی کا بڑا شوق تھا۔ ان کے طلباء میں اسی وجہ سے شوق پیدا ہوا۔ مدرسے کے بعد باقاعدہ تعلیم میاں عبدالرزاق کے مکتب میں ہوئی۔ اس کے بعد ذوقؔ شاہ نصیرؔ کے شاگرد ہوئے۔ ذوقؔ نے غیر معمولی صلاحتیں دکھائیں۔ شاہ نصیر اپنی اُستادی خطرے میں محسوس کرکے ذوقؔ کی تعلیم کی طرف کم توجہ دینے لگے۔ ٹالنا شروع کیا۔ یہاں اُستاد اور شاگردی کا سلسلہ نتیجتاً ختم ہوگیا۔ ذوقؔ نے کافی محنت کرکے خود ہی اپنی غزلوں پر نظر ثانی شروع کی بہت جلد وہ دہلی میں مشہور ہوگئے۔ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار کو جب استاد کی ضرورت محسوس ہوئی تب نظرِ انتخاب ذوقؔ پر پڑی۔ دربارِ دہلی سے ان کو ''خاقانیٔ ہند'' کا خطاب دیا گیا۔ ظفر جب بادشاہ ہوئے تب ذوقؔ کی تنخواہ چار روپے سے سو روپے تک ہوگئی۔ اڑسٹھ سال کی عمر میں 1854ھ میں ذوقؔ کا انتقال ہوا۔

ذوقؔ کو الفاظ کی نشست کا ابتدا ہی سے بے حد شوق تھا۔ کثرتِ مطالعہ اور زورِ طبع کی بدولت نئی نئی اور طویل بحروں میں شعر کہنا شروع کیا۔ رعایتِ لفظی ذوقؔ کے آرٹ کا خاص جزو ہے اور ان کے کلام کی خصوصیت بقول محمد حسین آزاد ''تازگیِ مضمون' صفائیِ کلام' چستیِ ترکیب' خوبیِ محاورہ اور عام فہمی ہے۔ ذوقؔ نے زندگی کے حقائق کو ناصحانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ تشبیہ و استعارے ان کے اتنے اچھے نہیں ہوتے۔ البتہ حُسنِ تعلیل' محاورے اور روزمرہ کو ذوقؔ نے خوب برتا ہے۔ ذوقؔ نے قدیم الفاظ بھی ترک کردیے۔ سوائے چند ابتدائی غزلوں کے ان کے دیوان میں 'ٹک' یارو' جانِ من وغیرہ الفاظ نہیں پائے جاتے۔ ذوقؔ کے کلام میں یوں تو شاہ نصیرؔ' ناسخؔ' دردؔ' مصحفیؔ و انشاءؔ سب کا رنگ پایا جاتا ہے لیکن سوداؔ کا ڈھنگ بیش تر ہے خصوصاً قصائد میں بلکہ اپنے قصائد کی داغ بیل انھوں نے سوداؔ کے قصائد پر ہی ڈالی ہے۔ سلیقے سے نگینے کی طرح جڑے ہوئے الفاظ' شان وشوکت اور علمیت سے بھرپور صنائع لفظی ومعنوی۔ یہ تمام اہتمام ذوقؔ کے قصائد میں نظر آتے ہیں۔ سوداؔ کے بعد اردو ادب میں خصوصاً قصائد میں ذوقؔ کا ہی مقام رہا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ذوقؔ نے کن کن اصنافِ سخن میں شہرت حاصل کی؟
2. ذوقؔ کے کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

14.10 ظفرؔ

بہادر شاہ نام، ظفرؔ تخلص تھا۔ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار تھے۔ غالبؔ کے شاگرد تھے۔ پہلے ذوقؔ کے شاگرد رہے۔ ظفرؔ کے دورِ انتشار میں اردو شاعری نے ترقی کے مدارج طے کیے۔ لکھنؤ میں ناسخؔ و آتشؔ، دہلی میں شاہ نصیرؔ، احسانؔ، قاسمؔ اور ممنونؔ کی دھوم تھی۔ شہزادگی کے زمانے میں ظفر کو موسیقی سے شوق اور فنونِ لطیفہ سے ذوق تھا۔ طبیعت موزوں تھی مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ دہلی کے تمام باکمال شعرا ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا کلام سناتے اور ظفر کے جوہر کمال پر صیقل کرتے تھے۔ تواضع و انکساری ظفرؔ کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

تصوف، اخلاق اور معاملہ بندی ان کے خاص موضوع ہیں۔ زبان کی صفائی اور روزمرّہ بول چال کی زبان میں بہ قول حالی، ظفر کا تمام دیوان اول سے آخر تک یکساں ہے۔ کلیات میں تقریباً تیس ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔ حمد، نعت، سلام، مرثیہ، مسدس، مخمس، قطعات اور رباعیات ان کے دیوان میں موجود ہیں۔ 1857ء کے سانحۂ غدر کے بعد اس شکست خوردہ بادشاہ کو رنگون کی جیل بھیج دیا گیا جہاں 7 / نومبر 1862ء کو ان کا انتقال ہوا۔

ظفرؔ ایک طرف صوفی ہیں اور معلم اخلاق کے روپ میں دنیا کی بے ثباتی، عبرت، پند و نصائح کے مضامین باندھتے ہیں تو دوسری طرف ردِعمل کے طور پر جرأت کی طرح معاملہ بندی اختیار کرتے ہیں۔ محاورہ بندی کا بہت شوق ہے۔ ہندی الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں اور حتی الامکان فارسی ترکیبوں اور بندشوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ دلی کی پرانی زبان کے دلدادہ ہیں اس لیے متروک الفاظ بلا تکلف استعمال کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو غلط الفاظ اور غیر مانوس ترکیبوں سے بھی احتراز نہیں کرتے۔ رعایت لفظی کا بھی شوق ہے۔ سلاستِ زبان ان کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے لیکن مضامین میں تازگی نہیں پائی جاتی۔ اس کی وجہ زیادہ تر ان کی زندگی کے حادثات کہے جاسکتے ہیں جس نے ان کو تمام عمر پژمردہ بنائے رکھا۔ مصائب اٹھاتے تھے دل کے ناسوروں پر شاعری کا مرہم لگاتے تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں آپ بیتی کا رنگ زیادہ پایا جاتا ہے جس پر شاعری کا معمولی پردہ پڑا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ظفرؔ کا پورا نام کیا تھا اور وہ کس کے شاگرد تھے؟
2. ظفرؔ کے کلام کی خصوصیات بیان کیجیے۔

14.11 شیفتہؔ

محمد مصطفےٰ خاں نام شیفتہ تخلص تھا شعر گوئی اور سخن فہمی کا بڑا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ شیفتہؔ 1806ء میں بہ مقام دہلی پیدا ہوئے ان کے والد نواب مرتضیٰ خاں اپنے زمانے کے بڑے رئیس تھے۔ جہاں گیر آباد کا علاقہ نیلامی میں خریدا تھا جو ان کے خاندان میں بعد میں بھی میراث کی حیثیت سے قائم رہا۔ شیفتہؔ نے تعلیم و تربیت مشہور اساتذہ سے حاصل کی۔ شعر و سخن کی محفلوں میں غالبؔ، صہبائیؔ، آزردہؔ، ذوقؔ، احسانؔ، وحشتؔ، تسکینؔ اور حالیؔ کے ہم صحبت رہے۔ شیفتہؔ، مومنؔ کے شاگرد رشید تھے۔ آزردہؔ اور وحشتؔ سے زیادہ مراسم تھے۔ اکیس برس کی عمر میں اپنا دیوان ترتیب دیا۔ فارسی میں بھی شیفتہ شاعری کرتے تھے۔ حسرتی تخلص کرتے تھے۔

1254ھ میں سفر حجاز کو گئے واپس آنے پر شعر گوئی کی طرف توجہ کم کردی۔ 1286ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ تصانیف میں دیوان اردو، دیوان فارسی، رقعاتِ فارسی، تذکرۂ گلشن بے خار مشہور و معروف ہیں۔

گرمی اور لذت جو ان کے کلام میں خداداد ہے۔ الفاظ کی شان و شوکت اور چستی ترکیب بھی پائی جاتی ہے جو کسی وقت سوداؔ اور شاہ نصیرؔ کا حصہ تھی۔ کلام میں بندش الفاظ اور تراکیب اور رعایت لفظی اسی طرح کی ہے جو غالبؔ اور خاص کر کلام مومنؔ میں پائی جاتی ہے۔ متانت

اور سنجیدگی ان کے یہاں بھری پڑی ہے کسی بھی موقعے پر تہذیب کے پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے۔

شیفتہ کی سخن فہمی کا ثبوت ان کا مشہور تذکرہ ''گلشن بے خار'' ہے جس پر شعرا کے کلام کے متعلق انھوں نے بڑی جچی تلی رائیں لکھی ہیں۔ ان کے معاصرین بھی ان کے مذاقِ سخن کے معترف و مداح تھے جن میں غالب اور حالی پیش پیش ہیں۔ حالی نے بہت کچھ شیفتہ ہی کے فیضِ صحبت سے حاصل کیا۔ تصوف کے مضامین' پندوحکمت مومن کی سی نزاکتِ خیالی اور ہلکی سی شوخی و ظرافت شیفتہ کے یہاں خاص چیزیں ہیں۔ تذکرہ گلشن بے خار میں شیفتہ کی آرا کو اب بھی مستند سمجھا جاتا ہے اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. شیفتہ نے کن شعرا کی صحبت میں شعر گوئی میں کمال حاصل کیا ؟
2. شیفتہ کی سخن فہمی کے مداح ان کے معاصر شعرا میں کون تھے ؟
3. شیفتہ کے تذکرے کا نام بتائیے۔

14.12 حالی

1837ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ خواجہ الطاف حسین نام اور حالی تخلص تھا۔ نو سال کی عمر میں والد کا انتقال ہوگیا۔ تعلیم و تربیت کا انتظام بھائی' بہنوں نے کیا۔ حالی کو حصولِ تعلیم کا بے حد شوق تھا اس لیے فارسی' عربی اور اردو مختلف اساتذہ سے سیکھی۔ عزیزوں نے مجبور کر کے سترہ سال کی عمر میں ان کی شادی کردی۔ لیکن علم و ادب کے اس شیدائی نے اس قید کو تسلیم نہیں کیا اور روپوش ہو کر دہلی چلے آئے۔ یہاں مولوی نوازش علی سے صرف ونحو اور منطق پڑھی۔ غالب سے فارسی پڑھی اور شاعری میں اصلاح لی۔ عربی کی تعلیم کی تکمیل نہیں ہونے پائی پھر پانی پت واپس ہوئے اس اثنا میں غدر ہوگیا۔ چھ' سات برس پانی پت ہی میں رہے اور مختلف لوگوں سے منطق و فلسفہ' حدیث و تفسیر پڑھی۔

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کی مصاحبت نے حالی کے ذوقِ ادب کو جلا بخشی۔ حالی' شیفتہ کے ہاں جہانگیر آباد آ گئے۔ شیفتہ کی صحبت نے ان کے مذاق اور غالب کی شاگردی نے ان کے کمالِ شاعری پر بہت اثر ڈالا۔ شیفتہ کی وفات کے بعد حالی لاہور میں گورنمنٹ بک میں ملازم ہوگئے جہاں انھیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابیں درست کرنی پڑتی تھیں اس لیے ان کو انگریزی خیالات اور انگریزی طرز ادا سے مناسبت پیدا ہوگئی۔ کرنل ہالرائیڈ ناظم تعلیمات تھے انھوں نے لاہور میں جدید طرز کے مشاعروں کی بنا ڈالی۔ حالی نے ان مشاعروں کے لیے چار مثنویاں لکھیں جو آج تک مقبول ہیں۔ 1914ھ میں حالی نے وفات پائی۔ حالی کی تصانیف میں مقدمۂ شعر و شاعری' حیات سعدی' یادگارِ غالب' حیاتِ جاوید وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ وہ جدید شاعری کے علم بردار تھے۔ اردو شاعری میں اصلیت' جوش اور سادگی کی روح پیدا کردینے کے علاوہ دہلویت ان کے کلام میں بڑی خوبی اور استادی سے رچی ہوئی ہے۔

حالی کے کلام کو سن کر غالب نے کہا تھا گرچہ میں کسی کو شعر و سخن کا مشورہ نہیں دیتا مگر تمہارے بارے میں میری یہ رائے ہے کہ تم شعر نہ کہوگے تو اپنے آپ پر ظلم کروگے۔ حالی کے ہم عصر دانشور شاعر و ادیب سرسید احمد خاں' ڈپٹی نذیر احمد' محمد حسین آزاد' شبلی نعمانی ہیں ان پانچوں کو ''اردو کے عناصر خمسہ'' کہا جاتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. حالی کا نام کیا تھا اور وہ کس مقام پر پیدا ہوئے ؟
2. حالی کا کلام سن کر غالب نے ان کو کیا مشورہ دیا ؟
3. حالی کی دو مشہور تصانیف کے نام بتائیے۔

14.13 محمد حسین آزاد

نام محمد حسین' آزاد تخلص۔ مولوی محمد باقر کے بیٹے تھے۔ محمد باقر اپنے دور کے بہت بڑے صحافی تھے جن کی ادارت میں شمالی ہند میں

سب سے پہلا اردو اخبار نکلا۔ ذوقؔ، باقر کے جگری دوست تھے۔ ان ہی کے سائے میں آزادؔ کی تربیت ہوئی۔ شاعری میں بھی آزادؔ، ذوقؔ کے شاگرد رشید رہے۔

غدر کے ہنگامے میں آزاد کے والد محترم کو شہید کر دیا گیا۔ گھر لٹ گیا پریشان ہو کر آزاد لاہور پہنچے اور سررشتہ تعلیم کے دفتر میں ملازم ہوگئے۔ اسی محکمے میں آزادؔ کو اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع ملا۔ انجمن پنجاب کی بنا ڈالی جہاں پر آئے دن جلسے اور مشاعرے ہوا کرتے تھے۔

سرکاری کام سے کابل، بخارا اور ایران کا سفر کیا۔ تعلیمات کے ناظم کرنل ہالرائیڈ ان کے بڑے قدرداں تھے۔ ان ہی کی سربراہی میں قصص الہند کا دوسرا حصہ لکھا۔ ''نیرنگِ خیال'' کے دو حصوں میں انگریزی مضمون نویسی کا چربہ اُتارا۔ ''آبِ حیات'' جدید طرز کا تذکرہ ہے۔ دربار اکبری، سخن دانِ فارس وغیرہ آزادؔ کی دیگر مشہور تصانیف ہیں۔ ان کے علاوہ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ انجمن پنجاب میں وہ اپنا کلام سنا کر داد حاصل کرتے تھے۔ انجمن پنجاب میں حالیؔ بھی ان کے ساتھ تھے۔ آخر عمر میں اپنی بیٹی کی وفات کے صدمے سے آزاد مخبوط الحواس ہوگئے۔ 1910ء میں آزاد نے وفات پائی۔

انگریزی ادب کی تقلید میں اردو شاعری میں جدید نیچرل رنگ پیدا کرنے کا سہرا ان ہی کے سر ہے لیکن اپنے پرانے دہلوی رنگ کے بھی پوری طرح ماہر تھے۔

اردو ادب میں علمی اور ادبی حیثیت سے آزاد کا ایک منفرد مقام ہے۔ وہ ایک صاحبِ طرز انشا پرداز تھے۔ ان کی طرزِ انشا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آزادؔ کے ساتھ شروع ہوئی اور ان کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔ ان کا سب سے بڑا نثری کارنامہ ہے۔ اس سے آزاد کے خیالات، افکار و رجحانات اور دلچسپیوں کا پتا چلتا ہے۔ آزاد اردو کے عناصرِ خمسہ میں شمار ہوتے ہیں وہ ایک پہلودار شخصیت کے حامل تھے۔ ایک شاعر، ایک ادیب، ایک تذکرہ نگار، ایک مترجم اور مورخ کی حیثیت سے ان کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. لاہور پہنچ کر آزادؔ نے کہاں ملازمت اختیار کی ؟
2. آزاد نے جدید شاعری کے فروغ کے سلسلے میں کس انجمن کی بنیاد ڈالی ؟

14.14 دبستانِ دہلی کی خصوصیات

''دہلویت'' نام ہے ایک نقطۂ نظر، ایک افتادِ طبع، ایک مزاجِ شعری کا جسے سمجھنے کے لیے لکھنویت سے قدم قدم پر مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ اختلاف دراصل آصف الدولہ والیِ اودھ کے زمانے سے شروع ہوتا ہے جب کہ دہلی اجڑ چکی تھی اور دیگر فن کاروں کی طرح شعرا بھی اپنا ملجا و ماوا دوسرے مقامات میں تلاش کر رہے تھے۔ ان دوسرے مقامات میں سب سے زیادہ پُر امن اور مستحکم مقام اودھ تھا۔ اس لیے دہلی سے جو نقل مقام کرتا تو وہ اودھ چلا آتا۔ آرزوؔ، فغاںؔ، سوداؔ، میرؔ، میر حسنؔ، حسرتؔ، مصحفیؔ کے علاوہ دیگر اوسط درجے کے شاعر ادیب اور فن کار نواب شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد اور آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنو آتے رہے اور آخر یہیں پیوند زمین ہوگئے۔ ان ہی بزرگوں اور ان کے اخلاف اور شاگردوں کی بہ دولت لکھنو میں شعر و شاعری کا چرچا ہوا اور اتنا ہوا کہ پھر وہاں کے لوگوں میں بھی اس کی صلاحیت اور اس کا مذاق پیدا ہوا۔ ان لوگوں نے پھر اپنے طرز کو خاص اپنا مذاق ہی قرار دے کر دہلی سے اسے ممتاز قرار دیا۔ حالانکہ اہل دہلی ہمیشہ دہلی ہی کو مستند قرار دیتے رہے لیکن اہلِ لکھنؤ نے اپنا مرکز ہی مستند مانا اور منوایا۔

دراصل لکھنویت دہلویت کے مقابلے میں شعر و شاعری کا ایک دوسرا رُخ ہے۔ دہلی کے وہ شعرا جو لکھنو میں آ گئے تھے یہاں کے تمدن اور خوش حالی سے متاثر ہوئے اور ان کے کلام میں دہلی سے علاحدہ بعض چیزیں پائی جانے لگیں جنھیں بعد میں بعض لکھنوی شعرا نے اپنایا اور چمکایا مثلاً جہاں تک مشکل گوئی کا تعلق ہے سوداؔ اور میرؔ کی کئی غزلیں مشکل زمینوں میں ہیں۔ انشاءؔ و مصحفیؔ کے معرکوں نے مشکل زمینوں میں دو غزلے اور سہ غزلے کہنے قادر الکلامی کی سند ہی قرار دے دیا۔ یہی لے تھی جو آگے چل کر ناسخؔ و آتشؔ اور ان کے شاگردوں میں بڑھ کر اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ جو خارجی شاعری کی ایک خصوصیت قرار پائی۔ دہلوی شاعری فقر و فاقے میں پروان چڑھی۔ تصوف دہلی کے تمدن کا خاص طریقہ فکر و نظر رہا ہے اور

اس میں کیا ہندو کیا مسلمان سب ہی شریک تھے۔ لکھنو میں معاشی مرفہ حالی اور شیعیت دونوں کے باعث یہ چیز وہاں عام نہ ہوسکی۔

شعرائے دہلی اور لکھنو زبان و بیان اور طرز فکر میں مختلف زاویۂ نگاہ رکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ اختلاف اپنے مقام پر اہمیت اور مقبولیت اختیار کرتا گیا اور اس کی باقاعدہ تعلیم و تربیت ہونے لگی اس طرح شعر و شاعری کے دو باقاعدہ اسکول یعنی دبستان قائم ہوگئے۔ بعد میں راسخ اور شاد عظیم آبادی نے دہلی طرز تخیل کو لکھنوی زبان کے ساتھ ملا کر عظیم آباد میں ایک تیسرے اسکول کی بنیاد ڈالی جس کو زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی البتہ عصر حاضر کے تقاضوں نے ایک جدید اسکول کا اضافہ کیا۔ اس طرح شاعری کے تین باقاعدہ اسکول ہوگئے۔ (1) دہلی اسکول (2) لکھنو اسکول (3) جدید اسکول۔

جدید اسکول کو دہلی اسکول اور لکھنو اسکول کے مقابلے میں زیادہ شہرت نہ مل سکی۔

دبستانِ دہلی کی خصوصیات :۔

1. طرزِ بیان سادہ اور سلیس ہے۔
2. معاملات' واقعات سچے اور اصلی ہوتے ہیں۔
3. جذبات حقیقی ہوتے ہیں اس لیے سوز و گداز کافی ہوتا ہے۔
4. اخلاق اور تصوف کا رنگ نمایاں طور پر ہوتا ہے۔
5. جدید معنی خیز ترکیبیں' لطیف استعارے اور نادر تشبیہیں استعمال کی جاتی ہیں۔
6. الفاظ سے زیادہ خیالات کی صفائی اور پاکیزگی پر زور دیا جاتا ہے۔
7. آمد کی کیفیت سارے کلام میں نظر آتی ہے۔
8. مختصر غزلیں ہوتی ہیں جنھیں سہل ممتنع کہا جاتا ہے۔
9. ابتذال یعنی عریاں نگاری سے پرہیز کیا جاتا ہے۔
10. زبان مردانہ ہے۔ محبوب بھی بعض جگہوں پر مرد ہی نظر آتا ہے۔

14.15 خلاصہ

اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی کا دور ہندوستان کی سیاسی زندگی میں ایک پُر آشوب عہد ہے۔ مغلوں کا جاہ و جلال' ملک کا امن و سکون' فنکاروں اور دانشوروں کی قدر و قیمت سب پر زوال آرہا تھا۔ جاٹوں' مرہٹوں' سکھوں اور روہیلوں کے حملوں نے عسکری نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات سے لے کر بہادر شاہ ظفر کی رنگون جلا وطنی تک ملک نے کیا کیا انقلابات دیکھے اس کی کہانی بہت طویل ہے۔

ایک طرف سیاسی اور سماجی تحریکیں بن اور بگڑ رہی تھیں۔ دوسری طرف دہلی علم و فضل کے مدارج تیزی سے طے کر رہا تھا۔ دہلی مشائخ' علما' شعرا اور ادیبوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ دہلی میں زوال کے باوجود اہلِ فن اور اہل ہُنر کا مجمع تھا۔

دور اول کے شعرا میں میرؔ' سوداؔ' دردؔ اور سوزؔ کا شمار ہوتا ہے۔ دہلی کی تباہی کے بعد میر' سوداؔ اور سوزؔ نے نقلِ مقام کیا اور لکھنو چلے آئے۔ دردؔ نے انتہائی مشکل حالات کے باوجود دہلی کو نہیں چھوڑا۔ میرؔ نے اپنی عمدہ شاعری کی وجہ سے دہلی اور لکھنو میں اپنا بُلند مقام بنایا۔ ان کے سامنے دوسرے شعرا کی شمعِ شاعری کی لو مدھم ہوگئی تھی۔ اردو غزل گویوں میں میرؔ کو وہی شاعرانہ عظمت حاصل ہے جو حافظ شیرازی کو فارسی غزل گویوں میں حاصل ہے۔ وہ شہنشاہ غزل تھے۔ ''خدائے سخن'' تھے۔ دہلی کی طرح لکھنؤ میں بھی میرؔ کی عظمت کو تسلیم کیا گیا۔ نواب آصف الدولہ نے ان کی بڑی قدردانی کی۔ تنخواہ مقرر کی۔ میر کے ہم عصر شعرا نے بھی لکھنؤ میں بہت عزت پائی۔ آصف الدولہ کے والد نواب شجاع الدولہ بھی ان کے سرپرست تھے۔

سوداؔ نے زندہ دلی کے ساتھ اس وقت کے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ وہ خوش اسلوبی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے فن سے واقف تھے۔ سوداؔ اردو قصیدہ کے سب سے بڑے شاعر ہیں ان کے بعد اگر کوئی قصیدہ گو شاعر کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ ذوق ہیں۔

میر سے کسی نے سوال کیا تھا کہ دہلی میں کتنے شاعر ہیں تب میرؔ نے کہا تھا صرف میں' بعد میں انھوں نے سودا کو بھی شامل کرلیا۔ درد کو آدھا شاعر اور سوز کو پاؤ شاعر کہا۔ میر کے حساب سے اس زمانے میں پونے تین شاعر دہلی میں موجود تھے۔

دردؔ تصوف کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ ان کے کلام میں کوئی خلاف تہذیب یا غیر معیاری بات نہیں ہے۔ دنیا سے بے تعلقی کا اظہار ان کے ہاں نمایاں ہے۔ سوزؔ بھی اس دور کے ایک اہم شاعر تھے۔ انھوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی۔

دبستان دہلی کے دورِ دوم کے شعرا میں غالبؔ اور ان کے معاصرین اہمیت رکھتے ہیں۔ غالبؔ کو اپنی عزتِ نفس کا بڑا خیال تھا۔ وہ بہت ہی زندہ دل انسان تھے۔ بات میں بات پیدا کرنا جانتے تھے۔ ایک اچھے غزل گو ہونے کے علاوہ اردو میں انھوں نے خطوط نگاری کا سہل انداز ایجاد کیا۔ غالب کے معاصرین میں مومنؔ ایک اہم مقام کے حامل تھے۔ نازک خیالی' ندرتِ اسلوب مومنؔ کا انفرادی رنگ تھا۔ ذوقؔ بہادر شاہ ظفرؔ کے اُستاد تھے۔ سوداؔ کے بعد بڑے قصیدہ گو شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ قصیدوں کے ساتھ غزل گوئی بھی کی۔ غالبؔ اور ذوقؔ کے درمیان علمی معرکے بھی ہوئے۔ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر بھی اچھے غزل گو تھے۔ ان کی وجہ سے دہلی میں شعر و شاعری کی رونق باقی تھی۔ اردو شاعروں کی ظفرؔ نے بڑی سرپرستی کی۔ غالب کے ہم عصر شعرا میں شیفتہؔ' حالیؔ' آزادؔ بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تمام شعرا کے کلام میں دبستان دہلی کی ساری خصوصیات موجود تھیں۔

14.16 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. دبستانِ دہلی کی خصوصیات بیان کیجیے۔
2. میرؔ اور سوداؔ کے عہد کو اردو کا زرین عہد کیوں کہا جاتا ہے؟
3. غالبؔ اور ان کے معاصرین پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. میرؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔
2. مومنؔ یا ذوقؔ کی شاعرانہ عظمت کو اجاگر کیجیے۔
3. دہلی اور لکھنو اسکول کے امتیازات پر روشنی ڈالیے۔

14.17 فرہنگ

خاقانیٔ ہند = ایران کے مشہور قصیدہ گو شاعر کا نام' ہند کا خاقانی

شہر آشوب = وہ نظم جس میں کسی شہر کی پریشانی و بربادی کا ذکر ہو

غنچہ = پھول کی کلی' پھول بننے سے پہلے کی شکل

معاصرین = ایک ہی دور یا زمانے کے رہنے والے

مخمس = وہ نظم جس کے ہر بند میں پانچ مصرعے ہوں

سخن فہمی = شاعری کا شعور' شاعری کی جانچ

دل آویزی = دل کو اپنی طرف کھینچنے والی خوبی

مخبوط الحواس = عقل سے عاری، پاگل، دیوانہ

رؤسا = رئیس کی جمع، پیسے والے

ضخیم = بڑا، موٹا، بڑے حجم والا

قادر الکلام = جس کو کلام پر قدرت ہو

امرا = امیر کی جمع، دولت مند

خودستائی = خود اپنی تعریف کرنا

شیرینی زبان = زبان کی مٹھاس

ہجرت = نقل مقام کرنا

عندلیب = بُلبل

تصنّع = بناوٹ

دبستان = اسکول، مکتب

ارض و سما = زمین و آسمان

تفکر = فکر

رگت = خون

رونا = رونا

انحطاط = زوال

فارغ البالی = آرام کی زندگی، خوش حالی

خدائے سخن = شاعری کا خدا، اُستادِ سخن

عزتِ نفس = خودداری، شان، عظمت

معاملہ بندی = بیتی ہوئی باتوں کو نظم کرنا

سجادہ نشین = پیر یا بزرگ کا جانشین

رندی = شراب نوشی، مے کشی

قنوطیت = منفی انداز کی سوچ

علوی = فرشتہ، اعلیٰ درجہ کا

سوز = جلن، دکھ، درد

طوائف الملوکی = دورِ انتشار

ندرت = نیاپن، انوکھا پن

دسترس = پہنچ

آہنگ = نغمہ آواز

انجھو = آنسو

شہاں = شبہ کی جمع، سلاطین

14.18 سفارش کردہ کتابیں

1) ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — دہلی کا دبستانِ شاعری

2) ڈاکٹر جمیل جالبی — تاریخ ادب اردو (جلد دو، حصہ دوم)

3) ڈاکٹر ثنا الحق — میر اور سودا کا دور

4) ڈاکٹر محمد حسن — دہلی میں اردو شاعری کا سماجی اور ادبی پس منظر

5) ڈاکٹر اعجاز حسین — مختصر تاریخ ادب اردو

اکائی 15 : فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات

ساخت

15.1 تمہید

15.2 فورٹ ولیم کالج کے قیام کے اغراض و مقاصد

15.3 ڈاکٹر جان گل کرسٹ

15.4 اردو کے دوسرے انگریز پروفیسران

15.5 میر امن

15.6 سید حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس

15.7 میر بہادر علی حسینی، مرزا علی لطف

15.8 مولوی امانت اللہ، مظہر علی خاں ولا، مرزا جان طپش

15.9 میر کاظم علی جواں، شیخ حفیظ الدین، خلیل خاں اشک

15.10 مولوی اکرم علی، نہال چند لاہوری، منشی بنی نارائن جہاں

15.11 میر عبداللہ مسکین، للولال کوی، مرزا محمد فطرت

15.12 میر محی الدین فیض، سید حمید الدین بہاری

15.13 خلاصہ

15.14 نمونۂ امتحانی سوالات

15.15 فرہنگ

15.16 سفارش کردہ کتابیں

15.1 تمہید

انگریز ہندوستان میں اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے آئے۔ اس زمانے میں تجارتی کمپنیاں اپنی حفاظت کے لیے فوج بھی رکھتی تھیں۔ انگریزوں کی ایک کمپنی جس کا نام ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' تھا تجارتی اغراض کے لیے ہندوستان آئی اور موقع پا کر ہندوستان پر حکومت کرنے لگی۔ انگریز عہدے داروں کو اردو سکھانے کے لیے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج 1800ء میں قائم کیا گیا۔ اردو میں نثری کتابیں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے بہت کم تھیں۔ جتنی کچھ بھی تھیں ان کی زبان بے حد مشکل تھی اور اس میں قافیے اور وزن کا بھی اہتمام کیا گیا تھا یعنی اس کی عبارت مقفیٰ و مسجع ہوا کرتی تھی۔ اسی وجہ سے فورٹ ولیم کالج میں نثری کتابیں لکھوائی گئیں۔ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا کہ زبان عام فہم اور بیان میں سادگی اور سلاست ہو۔ اس غرض سے فورٹ ولیم کالج میں انشا پرداز یعنی منشی مقرر کیے گئے۔ چونکہ طبع زاد کتابیں لکھنے میں بہت وقت صرف ہوتا ہے اس لیے فارسی یا ہندوستانی زبانوں میں لکھی گئی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کروایا گیا۔ ابتدائی چار پانچ سالوں میں کوئی چھپّن کتابیں اردو میں منتقل کی گئیں اور یہ کام انھیں منشیوں نے انجام دیا۔ جس کی وجہ سے مختلف موضوعات پر اردو میں نثری کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ فراہم ہوگیا۔ جس کی زبان سادہ سلیس اور آسان تھی۔ فورٹ ولیم کالج کا یہ کارنامہ اردو ادب اور خاص طور پر اردو نثر کی تاریخ میں عہد آفریں قرار دیا جاسکتا ہے اور سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

15.2 فورٹ ولیم کالج کے قیام کے اغراض و مقاصد

فورٹ ولیم کالج کا قیام انگریز عہدے داروں کو اردو سکھانے کے لیے عمل میں آیا۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے اسی بات کو بڑی وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا ہے:

> ''ایسٹ انڈیا کمپنی نے فورٹ ولیم کالج کو بالکل افادی بنیاد پر قائم کیا تھا۔ نظمائے کمپنی کا اصل منشا کلکتہ میں چند ارباب قلم کو یکجا جمع کر کے ان سے اپنے انگریز اہل کاروں اور عہدہ داروں کے لیے ایسی سلیس درسی کتابیں لکھوانا تھا جن کا طرز بیان شاعرانہ نزاکتوں اور لفظی موشگافیوں کی بجائے سیدھا سادہ اور عام فہم ہو۔ اس کالج کے تقریباً تمام مصنفوں کو اس بات کا بہت کم موقع دیا گیا کہ وہ قلم کی سحر کاریوں سے اپنے ذاتی جذبات و خیالات کی ترجمانی کرتے۔ کالج کے ارباب اقتدار کو ضروری نصابی کتب کی تیاری میں عجلت تھی۔ اس لیے ان مصنفوں سے بجائے مستقل کتابیں تصنیف کرانے کے مشہور، متبادل اور بالخصوص فارسی کی عام پسند کتابوں کے ترجمے کرائے گئے''۔ (پیش لفظ ''ارباب نثر اردو'')

فورٹ ولیم کالج میں جو کتابیں تیار ہوئیں وہ ایسے لوگوں کے لیے تھیں جو اردو زبان سیکھنا چاہتے ہوں۔ اردو میں مبتدیوں کے پڑھنے کے لیے کتابیں نہیں تھیں۔ اس کی ضرورت یوں پیش نہیں آتی تھی کہ ابتدائی تعلیم فارسی اور عربی میں ہوا کرتی تھی۔ فارسی رسم خط سے جو واقف ہو جاتا تھا وہ اردو آسانی سے لکھ پڑھ سکتا تھا۔ اردو عام بول چال کی زبان تھی اور یہی مادری زبان بھی ہوا کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں نہ صرف سادہ اور سلیس زبان میں کتابیں تیار کی گئیں بلکہ اردو قواعد کی کتابیں اور لغات بھی تیار کی گئیں۔ خود اردو کے پروفیسر اور صدر جان گلکرسٹ نے یہ کام انجام دیا۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اردو میں جو نثری کتابیں تھیں وہ بہت ادق زبان میں تھیں اور مقفیٰ و مسجع بھی ہوا کرتی تھیں۔ مبتدیوں کے لیے یہ کتابیں قطعی غیر موزوں تھیں۔ چند کتابیں ضرور ایسی تھیں جن کی زبان آسان تھی لیکن ایسی کتابیں تمام تر مذہبی تھیں۔ ان کتابوں کا موضوع اسلامی تعلیمات اور عقائد تھا۔ اس کے علاوہ تاریخ اور دوسرے علمی موضوعات پر اردو میں کتابیں نہیں تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علمی اور ادبی کاموں کے لیے ایک مدت تک فارسی ہی استعمال کی جاتی تھی۔ اس بات کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اردو کے بڑے بڑے شاعروں نے اردو شعرا کے جو تذکرے لکھے وہ فارسی میں لکھے گئے۔ میر تقی میر نے اپنا تذکرہ ''نکات الشعرا'' فارسی ہی میں لکھا۔ مصحفی نے کئی تذکرے جیسے ریاض الفصحا'' تذکرۂ ہندی گویاں عقد ثریا تمام کے تمام تذکرے فارسی ہی میں لکھے۔ اسی طرح میر حسن اور قائم چاند پوری نے بھی اردو شعرا کے تذکرے فارسی ہی میں لکھے۔ میر نے اپنی آپ بیتی ''ذکر میر'' فارسی ہی میں لکھی۔ غالبؔ نے مغلیہ سلطنت کی تاریخ ''مہر نیم روز'' اور ''ماہِ نیم ماہ'' کے نام سے لکھی تو فارسی ہی میں لکھی۔ غرض یہ کہ تمام علمی اور ادبی کام فارسی ہی میں ہوا کرتے تھے۔ اسی لیے اردو نثر میں کتابیں بہت کم تعداد میں ملتی ہیں۔ اسی وجہ سے فورٹ ولیم کالج میں سادہ اور سلیس اردو زبان میں کتابیں لکھوائی گئیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. فورٹ ولیم کالج میں سادہ اور سلیس اردو زبان میں کتابیں لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ بیان کیجیے۔
2. فورٹ ولیم کالج کے قیام کے اغراض و مقاصد بیان کیجیے۔

15.3 ڈاکٹر جان گل کرسٹ

گل کرسٹ کا پورا نام جان بارتھ وک گل کرسٹ (John Barth Wick Gilchrist) تھا وہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی میں وہ ڈاکٹر کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور ہندوستان آئے۔ ہندوستان آئے تو انہوں نے فارسی اور اردو سیکھنی شروع کی اور یہ زبانیں سیکھنے کے لیے انہوں نے ہندوستانی لباس اختیار کیا اور اردو زبانوں کے مرکز دہلی اور لکھنؤ میں رہ کر فارسی اور اردو سیکھی۔ کمپنی کی طرف سے بھی

ہندوستانی زبانیں سیکھنے کے لیے ترغیب دی جاتی تھی یعنی تیس روپے الاؤنس دیا جاتا تھا۔ ڈاکر گل کرسٹ نے اردو زبان سیکھنے میں خصوصی دلچسپی لی۔ انہوں نے کمپنی کو مطلع کیا کہ اب فارسی کو دفتری زبان بنائے رکھنے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اردو کو دفتری زبان بنانا زیادہ مفید ہوگا۔ بعد میں 1832ء میں اردو سرکاری زبان قرار دی گئی۔ گو اس وقت تک گل کرسٹ اپنے وطن لندن روانہ ہو چکے تھے لیکن ان کی تجویز پر عمل کیا گیا۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے گل کرسٹ نووارد انگریز عہدے داروں کو فارسی کی تعلیم دیا کرتے تھے اور بغیر کسی معاوضے کے انہیں نوشت وخواند کے قابل بنا کر دیا کرتے تھے۔ جب لارڈ ولزلی گورنر جنرل بن کر جب ہندوستان آئے تو انہوں نے کمپنی کے ملازمین کے لیے اعلیٰ پیمانہ پر ایک کالج کے قیام کی سفارش کی لیکن کمپنی کے دوسرے عہدے داروں نے بڑی کانٹ چھانٹ کے بعد ایک کالج کے قیام کی منظوری دی۔ 1800ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتے میں قائم ہوا۔ گل کرسٹ کی خدمات کو دیکھتے ہوئے انہیں کالج کا صدر اور پروفیسر بنایا گیا۔ گل کرسٹ صرف چار سال تک ہی کالج کی خدمات انجام دیتے رہے اور خرابیٔ صحت کی وجہ سے اپنے وطن لندن لوٹ گئے۔ لیکن ان چار سالوں میں انہوں نے فورٹ ولیم کالج میں تمام ہندوستان سے قابل اور لائق ماہرین زبان کو جمع کر دیا اور ان سے تصنیف وتالیف کا کام ان سے اس طرح لیا کہ ان کے جانے کے بعد بھی فورٹ ولیم کالج کے ماہرین زبان تصنیف وتالیف میں لگے رہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے خود انگلستان میں جب ادارۂ شرقیہ Oriental Institute قائم کیا تو گل کرسٹ کو اردو کی پروفیسری پر معمور کیا۔ اس ادارہ میں صرف ان کو تعلیم دی جاتی تھی جو طبی عہدے پر فائز ہو کر ہندوستان جاتے تھے۔ وہ اس ادارے میں 1825ء تک یعنی اس ادارے کے برخاست ہونے تک کام کرتے رہے۔ بعد میں وہ اپنے طور پر کمپنی کے امیدواروں کو اردو پڑھاتے رہے۔ 88 سال کی عمر میں 1841ء میں گل کرسٹ کا انتقال ہوا۔

گل کرسٹ کی تصنیف وتالیف کا سلسلہ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے بہت پہلے 1787ء سے شروع ہوتا ہے۔ اسی سال انہوں نے انگریزی ہندوستانی لغت تیار کرنی شروع کی۔ وہ تقریباً تیس سال تک تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔ انہوں نے حسب ذیل کتابیں لکھی تھیں:

1. انگریزی ہندوستانی لغت: وہ کوئی نو سال تک مسلسل اس لغت کو تیار کرنے میں لگے رہے۔ ہر لفظ کی اصل اس لغت میں بتائی گئی ہے کہ لفظ کس زبان کا ہے۔ یہ لغت 1792ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔
2. ہندوستانی علم اللسان: یہ اردو لسانیات پر کتاب ہے۔ آخر میں انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی کی ایک فرہنگ دی گئی ہے۔ مقدمہ میں اردو قواعد زبان کو پیش کیا گیا ہے۔
3. اردو کی صرف ونحو: اردو قواعد کی یہ کتاب فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں شامل تھی۔ میر بہادر علی حسینی نے ''اردو رسالہ گل کرسٹ'' کے نام سے اس کا خلاصہ لکھا۔
4. مشرقی زبان داں: اردو زبان سیکھنے کا آسان طریقہ پیش کیا گیا ہے۔ اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو کی فرہنگ بھی شامل ہے۔ آلات جنگ کے اردو نام بھی دیئے گئے ہیں اور زبان کے ابتدائی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔
5. اردو زبان پر مختصر مقدمہ: ''یہ مشرقی زبان داں'' کا خلاصہ ہے۔
6. ہندی کی آسان مشقیں: فورٹ ولیم کالج کے ابتدائی اور آخری امتحانات کے لیے یہ کتاب لکھی گئی۔
7. فارسی افعال کا جدید نظریہ فارسی افعال کی تشریح کی گئی ہے۔ افعال کے اردو اور انگریزی مترادفات بھی دیے گئے ہیں۔
8. اجنبیوں کے لیے رہنمائے اردو: انگریزوں کو اردو سکھانے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی۔
9. بیاض ہندی: فورٹ ولیم کالج کے مولفین کے کارناموں کا انتخاب۔
10. عملی خاکے: اس میں اردو الفاظ کی قرأت اور ان کے صحیح تلفظ کے اصول پیش کیے گئے ہیں۔
11. ہندی الفاظ کی قرأت۔ اس میں ہندی الفاظ کی قرأت کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔
12. اتالیق ہندی: اردو نوشت وخواند آسانی سے سیکھنے کے طریقے۔ اس میں فارسی سیکھنے والوں کی بھی رہنمائی کی گئی ہے۔

13. ہندی عربی آئینہ: اس میں عربی کے ایسے الفاظ کی تشریح کی گئی ہے جن کا اردو سے گہرا تعلق ہے۔

14. مکالمات انگریزی و ہندوستانی: اہل یورپ کو بول چال سکھانے اور ہندوستانیوں کے ساتھ روزمرہ کی گفتگو کرنے کے طریقے سکھائے گئے ہیں۔

15. مشرقی قصے: اس میں حکایات لقمان اور دوسرے مشرقی قصے اور افسانے فارسی، برج بھاشا اور سنسکرت سے ترجمہ کر کے یکجا کیے گئے ہیں۔ ان کے ترجموں میں گل کرسٹ کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کے دوسرے اہل قلم نے بھی حصہ لیا ہے۔

16. ہندی داستاں گو: اس میں فارسی اور دیوناگری رسم الخط کے اردو میں استعمال کے متعلق بحث کی گئی ہے۔

مذکورہ بالا گل کرسٹ کی کتابوں سے ظاہر ہے کہ اردو سیکھنے کے لیے جن بنیادی کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے اس کو پورا کرنے کی انہوں نے کوشش کی۔ قواعد زبان اور تدوین لغت کا کام گل کرسٹ نے سب سے پہلے کیا۔ اردو سیکھنے کے لیے بنیادی کتابوں کا جتنا اور جیسا ذخیرہ انہوں نے فراہم کیا وہ ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔

15.4 اردو کے دوسرے انگریز پروفیسران

ڈاکٹر گل کرسٹ کے انگلستان لوٹنے کے بعد کپتان ٹامس روبک (Captain Thomas Roobuck) اردو کے پروفیسر اور صدر مقرر ہوئے۔ ان کا تعلق فوج سے تھا۔ گل کرسٹ کی وجہ سے انہیں اردو کا شغف پیدا ہوا۔ انہوں نے کالج کے اہل قلم کو تصنیف و تالیف کی طرف راغب کیا اور کئی کتابیں شائع کیں۔ ان کو شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ بنی نارائن جہاں کو خاص طور پر تصنیف و تالیف پر آمادہ کیا۔ اور ان سے اردو شعرا کا تذکرہ لکھوایا۔ گل کرسٹ نے ''ہندوستانی لغت'' کی تدوین کی تو اس میں وہ شریک رہے۔ انہوں نے بھی کئی کتابیں لکھیں۔ ''لغت جہاز رانی'' کے عنوان سے لغت لکھی۔ اس کے ساتھ ایک مختصر اردو قواعد بھی شامل کی۔ ان کی دوسری کتاب '' ترجمان ہندوستان '' (Hindustan Interpreter" ہے۔ اس میں بھی قواعد زبان کی تشریح کی گئی ہے۔ ان اردو کتابوں کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کی تاریخ بھی انہوں نے لکھی ہے۔

کپتان جوزف ٹیلر Captain Jozeph Taylor

کپتان جوزف ٹیلر اردو کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے بھی ایک مبسوط اردو انگریزی لغت لکھی ہے۔ ڈاکٹر ولیم ہنٹر (Dr. William Hunter) ان کے شریک کار تھے۔ بعد میں ولیم اسمتھ نے اس پر نظر ثانی کر کے اس کا مختصر اڈیشن شائع کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. فورٹ ولیم کالج کے قیام کے اغراض و مقاصد بیان کیجیے۔
2. جان گل کرسٹ کی اردو خدمات کا جائزہ لیجیے۔
3. جان کرسٹ کے بعد اردو کے کون کون سے انگریز پروفیسران ہوئے؟

15.5 میر امن دہلوی

میر امن دہلوی کو جتنی شہرت اور جیسی مقبولیت حاصل ہوئی ویسی فورٹ ولیم کالج کے کسی بھی مصنف کے حصے میں نہیں آئی۔ میر امن تخلص تھا، نام میر امان تھا۔ ہمایوں کے عہد میں ان کے آبا و اجداد ہندوستان آئے۔ مغلیہ دربار سے وابستہ رہے۔ یہ سلسلہ عالم گیر ثانی تک قائم رہا۔ میر امن کا آبائی وطن دہلی ہی تھا۔ نادر شاہ درانی کے حملے سے دہلی تباہ ہوگئی۔ اور وہاں کے لوگ دلی چھوڑ کر دوسری جگہ جانے لگے۔ میر امن اس کے باوجود دلی

میں رہے۔ لیکن جب روزگار کے لالے پڑ گئے تو پھر پٹنہ اور اس کے بعد کلکتہ پہنچے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فورٹ ولیم کالج کو لائق آدمیوں اور منشیوں کی ضرورت تھی۔ منشی بہادر علی حسینی ان کے دوست تھے۔ وہ پہلے سے فورٹ ولیم کالج میں خدمت انجام دے رہے تھے۔ انہیں کی توسط سے وہ کالج میں ملازم ہوگئے۔ وہ کالج میں کب تک کام کرتے رہے اس بات کا علم نہیں ہے۔ البتہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ 1801ء میں کالج میں ملازم ہوگئے تھے۔ انہوں نے 1802ء اپنی دونوں کتابیں مکمل کر لی تھیں۔ اس کے بعد وہ کالج میں کیا خدمت انجام دیتے رہے اور انہوں نے کون سے کام انجام دیے اس کے تعلق سے کوئی تحقیقی مواد نہیں ملتا۔ ان کی پیدائش کی تاریخ اور وفات کی تاریخ کے بارے میں معلومات نہیں ہیں۔ اردو کے اتنے اہم ادیب کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔

میر امن نے قصہ چہار درویش کو ''باغ و بہار'' کے نام سے لکھ کر شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ ''باغ و بہار'' اس کا تاریخی نام ہے یعنی اگر اس کے حروف کے اعداد کو جوڑ لیا جائے تو اس کا سنہ تصنیف نکل آتا ہے۔ قصہ چہار درویش فارسی کا ایک مشہور قصہ ہے۔ اس قصہ کا اصلی مصنف کون تھا اس کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ بات مشہور تھی کہ یہ قصہ امیر خسرو نے حضرت نظام الدین اولیا کو اس وقت سنایا جب وہ بیمار تھے۔ میر امن نے بھی یہی بات لکھی ہے۔ لیکن بعد کی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ قصہ امیر خسرو کا لکھا ہوا نہیں تھا۔ بیرونی اور اندرونی شہادتوں سے یہ بات پائے ثبوت کو پہنچتی ہے کہ امیر خسرو کے بعد کے زمانے میں یہ قصہ لکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر قصہ چہار درویش میں تمباکو اور بارود کا ذکر ہے جب کہ یہ دونوں چیزیں ہندوستان میں امیر خسرو کے ایک سو سال بعد استعمال ہوئیں۔ بہر حال یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ یہ قصہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے۔

اُردو میں میر امن سے پہلے میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے قصہ چہار درویش کو ''نوطرز مرصع'' کے نام سے لکھا تھا۔ تحسین کا یہ قصہ بہت ادق زبان میں ہے اور اس کی عبارت مقفیٰ اور مسجع ہے۔ قصہ چہار درویش کو میر محمد علی خاں شوق اورنگ آبادی نے اردو میں نظم کیا ہے۔ اس کی زبان دکنی ہے۔ عوض زرین نے بھی قصہ چہار درویش کو مختصر کر کے ''نوطرز مرصع'' کے نام سے لکھا ہے۔ اس طرح قصہ چہار درویش کو بہت سے لوگوں نے لکھا لیکن ان سے کوئی واقف بھی نہیں ہے لیکن ''باغ و بہار'' اب بھی شوق و ذوق سے پڑھی جاتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا اور اہم سبب یہ ہے کہ اس کا اسلوب اس قدر پر کشش اور خوب صورت ہے کہ قصہ چہار درویش کو جتنی اور جیسی مقبولیت اور شہرت اس کتاب سے حاصل ہوئی وہ کسی اور کتاب سے حاصل نہیں ہوسکی۔ میر امن کی ''باغ و بہار'' نے نہ صرف اردو میں شہرت پائی بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ ایل۔ ایف۔ اسمتھ نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا وہ بھی اتنا مقبول ہوا کہ اس کے کئی اڈیشن مدراس، کلکتہ، لندن اور لکھنؤ سے شائع ہوئے۔ پھر ڈنکن فاربس نے 1857ء میں انگریزی میں اس کا خلاصہ شائع کیا۔ گارساں وتاسی نے فرانسیسی میں اس کا ترجمہ کیا۔ غلام محمد خاں خیبر نے ''خریطۂ سرور'' کے نام سے اسے منظوم کیا۔ سید محمد نے اپنی کتاب ''ارباب نثر'' اردو میں اس کے ترجموں کی تفصیل دینے کے بعد بجا طور پر لکھا ہے:

> ''میر امن کے ترجمے کے سوا آج کسی کے ترجمے کو لوگ جانتے بھی نہیں۔ میر امن نے اپنے ترجمے میں ایسی سحر کاری کی ہے کہ وہی اب تک مقبول ہے اور جب تک اردو زبان زندہ ہے مقبول رہے گا۔ اس کی قدر و قیمت میں سرور ایام کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جائے گا''۔ (ارباب نثر اردو۔ ۴۳)

''باغ و بہار'' لکھنے کے بعد ''گنج خوبی'' کے نام سے میر امن نے ملا حسینی کاشفی کی مشہور کتاب ''اخلاق محسنی'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ جیسا کہ فارسی کتاب کے نام سے ظاہر ہے اس میں اخلاقی حکایتوں کو پیش کر کے نصیحت آموز نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ لیکن یہ کتاب غیر معروف رہی۔

15.6 سید حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس

میر امن دہلوی کے بعد فورٹ ولیم کالج کے جن مصنفین کو اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوئی ان میں سید حیدر بخش حیدری اور شیر علی افسوس کے نام آتے ہیں۔ یہ کئی کتابوں کے مترجم تھے۔ حیدری بھی دہلی ہی کے باشندے تھے۔ حیدری کے والد نے ان کی تعلیم و تربیت کا بہت اچھا انتظام کیا

تھا۔ان کو کئی بہت اچھے اساتذہ ملے۔جب حیدری کو معلوم ہوا کہ فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کے مواقع نکل رہے ہیں تو انہوں نے فورٹ ولیم کالج کا رخ کیا اور اپنی کتاب ''قصہ مہر و ماہ'' ڈاکٹر گل کرسٹ کو پیش کی۔گل کرسٹ کو اس کتاب کی زبان پسند آئی اور انہوں نے حیدری کو فورٹ ولیم کالج میں ملازمت دے دی جہاں وہ زندگی بھر تصنیف و تعلیم میں مشغول رہے۔حیدری کے حالات زندگی کی تفصیل بھی نہیں ملتی۔حیدری کی پہلی تصنیف ''قصہ مہر و ماہ'' ہے۔دوسری کتاب فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہونے کے بعد لکھی۔یہ حضرت امیر خسرو کی فارسی مثنوی کا نثری ترجمہ ہے جو قصہ 'لیلی مجنوں' کے نام سے کیا گیا ہے۔ان کی تیسری کتاب ''طوطا کہانی'' ہے۔طوطا کہانی سنسکرت زبان کی ''شکا سب تتی'' پر مبنی ہے۔شکا سب تتی کے معنی ہیں ''طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیاں''۔اس کتاب کے فارسی میں کئی ترجمے ہوئے۔سب سے پہلے فارسی کے عالم مولانا ضیا الدین بخشی نے اس کا ترجمہ کیا۔گو یہ ترجمہ مشکل اور ادق زبان میں تھا اس کے باوجود بہت مقبول ہوا اور اس کے بعد میں کئی خلاصے لکھے گئے۔شیخ ابوالفضل کے علاوہ ملا سید محمد قادری نے بھی اس کا خلاصہ لکھا ہے۔حیدری نے ملا سید محمد قادری کے خلاصے کو اردو میں منتقل کیا ہے۔حیدری کے اس ترجمے کو انگریزی میں بھی منتقل کیا گیا تھا۔حیدری کی تیسری کتاب ''آرائشِ محفل'' یعنی قصہ حاتم طائی کو بے حد شہرت حاصل ہوئی۔گو کہ یہ قصہ بھی فارسی ہی سے ترجمہ کیا گیا ہے لیکن اس میں اتنا ردو بدل اور اتنے اضافے کیے گئے ہیں کہ بقول سید محمد اس کو ''ترجمہ کہنے کی بجائے حیدری کی تالیف کہا جائے تو زیادہ اچھا ہے''۔

حیدری نے حضرت نظامی گنجوی کی مشہور فارسی مثنوی 'ہفت پیکر' سے متاثر ہو کر اسی طرز پر اردو مثنوی 'ہفت پیکر' ہی کے نام سے لکھی۔یہ مثنوی شاید شائع نہیں ہوئی۔اس کے ایک آدھ قلمی نسخے ملتے ہیں۔''تاریخ نادری'' میں حیدری نے نادر شاہ کے حالات و واقعات اس کے انتقال کے زمانے تک قلم بند کیے ہیں۔یہ تاریخ بھی فارسی ہی میں لکھی گئی تھی جس کا ترجمہ حیدری نے اردو میں کیا۔''گل مغفرت'' کے نام سے حیدری کی جو کتاب ملتی ہے وہ فارسی کی ''روضۃ الشہدا'' کا ترجمہ ہے۔حیدری نے ''روضۃ الشہدا'' کا ترجمہ ''گلشن شہیداں'' کے نام سے کیا تھا۔پھر اس کا ایک انتخاب کیا اور اس کا نام ''گل مغفرت'' رکھا۔یہ انتخاب بھی تصنیف کی شان رکھتا ہے کیونکہ حیدری نے جگہ جگہ نظم و نثر میں اتنے اضافے کیے ہیں کہ اسے ترجمہ نہیں کہا جا سکتا۔اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے کئی ایڈیشن نکلے۔اس کتاب کا ترجمہ فرانسیسی میں بھی ہوا۔شیخ عنایت اللہ کی مشہور فارسی کتاب ''بہار دانش'' کا ترجمہ حیدری نے ''گلزار دانش'' کے نام سے کیا۔لیکن اس کا کوئی نسخہ نہیں ملتا۔شاید یہ شائع نہیں ہوا۔''گلدستہ حیدری'' میں حیدری کے مضامین' دیباچے اور نظمیں ملتی ہیں۔اس کے صرف قلمی نسخے ملتے ہیں۔یہ بھی زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوا۔گلدستہ حیدری کے 6 حصے ملتے ہیں۔ (1) مجموعہ مراثی (2) مجموعہ حکایات (3) قصہ مہر و ماہ (4) قصہ لیلی مجنوں کا دیباچہ (5) دیوان غزلیات (6) تذکرہ شعرائے اردو۔اس تذکرے کا نام انہوں نے ''گلشن ہند'' رکھا تھا۔لیکن چونکہ یہ شائع نہیں ہوا اس لیے مرزا علی لطف نے اپنے تذکرے کا نام بھی ''گلشن ہند'' رکھا۔میر امن کی طرح حیدری کا بھی سنہ وفات نہیں ملتا۔

حیدر بخش حیدری کی طرح میر شیر علی افسوس بھی فورٹ ولیم کالج کے بہت ہی مشہور و معروف مصنفین میں سے ہیں۔افسوس کے دادا اقاف سے محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے اور نواب عمدۃ الملک کے ملازم ہوئے۔افسوس دہلی میں 1735ء میں پیدا ہوئے۔نواب کے انتقال کے بعد افسوس کے والد پٹنہ گئے اور بعد میں اودھ پہنچ کر وہاں کی سرکار میں ملازمت کی۔اس کے بعد حیدر آباد آئے اور یہیں انتقال کیا۔افسوس اودھ کے قیام کے زمانے میں لکھنؤ کے ایک نواب کے لڑکے کے اتالیق مقرر ہوئے۔لکھنؤ میں اس زمانے میں اردو کے چوٹی کے شعرا میر تقی میر' مرزا رفیع سودا' مصحفی' انشا اور جرات کے علاوہ بہت سے شاعر جمع تھے۔افسوس کو لکھنؤ کے کئی بڑے بڑے امرا کی سرپرستی حاصل ہوئی۔لکھنؤ جب اجڑنے لگا تو افسوس نے شاعری کا شغل ترک کیا اور درس و تدریس سے وابستہ ہوئے۔جب فورٹ ولیم کالج میں لائق اور قابل منشیوں کی ضرورت پیش آئی تو ایک نواب نے ایک انگریز کرنل سے افسوس کی سفارش کی اور وہ فورٹ ولیم کالج میں دو سو روپے ماہوار پر ملازم ہوئے۔فورٹ ولیم کالج میں تصنیف و تالیف میں مصروف رہنے کے بعد 1805ء میں وفات پائی۔

افسوس نے اپنا ''دیوان'' لکھنؤ میں ترتیب دیا تھا۔لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اشاعت کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہونے

کے بعد عمل میں آئی۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کے قصائد کے بعد نواب آصف الدولہ اور مارکوس ویلزلی گورنر جنرل ہند کی مدح میں قصیدہ ہے۔ لیکن افسوس کا شاہکار ان کی کتاب ''باغ اردو'' ہے۔ یہ شہرۂ آفاق کتاب ''گلستان'' سعدی کا ترجمہ ہے۔ گلستان کا یہ ترجمہ ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔ افسوس کے ترجمے کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ سعدی کی ''گلستان'' کا ترجمہ کرنے کے بعد افسوس سے دوسروں کی ترجمہ کردہ کتابوں پر نظر ثانی اور تصحیح کا کام لیا گیا۔ اس کے علاوہ فورٹ ولیم کالج نے بعض بڑے اردو شاعروں کے کلام کا انتخاب بھی شائع کیا تھا۔ اس کام میں بھی افسوس شریک رہے۔ کلیات سودا کا انتخاب افسوس اور دوسروں نے کیا اور سودا نے ہر صنف سخن میں جو کچھ کہا ہے اس کا بہترین نمونہ اس انتخاب میں پیش کیا گیا ہے۔ ''باغ اردو'' کے بعد افسوس کا دوسرا اہم کارنامہ ''آرائش محفل'' ہے۔ منشی سجان نے ہندوستان کی بہت ہی معتبر اور مستند تاریخ ''خلاصۃ التواریخ'' کے نام سے فارسی میں لکھی تھی۔ اسی تاریخ کو افسوس نے ''آرائش محفل'' کے نام سے اردو میں منتقل کیا۔ اس کی زبان بہت سلیس وصاف ہے۔

15.7 میر بہادر علی حسینی، مرزا علی لطف

میر بہادر علی حسینی کے حالات بھی پردۂ اخفاء میں ہیں۔ ان کے والد سید عبداللہ کاظم تھے۔ حضرت شاہ عبدالقادر نے جو قرآن شریف کا پہلا اردو ترجمہ کیا اس کا اہتمام کرنے میں اور اس کی اشاعت کے سلسلے میں سید عبداللہ کاظم نے بہت کام کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہادر علی حسینی دہلی ہی کے باشندے تھے۔ میر بہادر علی، میر امن سے پہلے فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوگئے تھے۔ میر امن ہی کے ذریعہ فورٹ ولیم کالج پہنچے۔ میر بہادر علی نے فورٹ ولیم کالج کے لیے چار کتابیں لکھیں اور دوسری کتابوں کے لکھنے میں ڈاکٹر گل کرسٹ کی مدد کی۔

بہادر علی حسینی نے ''نثر بے نظیر'' کے عنوان سے سحر البیان کے قصے کو نثر میں لکھا۔ گل کرسٹ نے یہ کام اس لیے کروایا کہ اردو سیکھنے والے انگریز پہلے اس قصے سے واقف ہو جائیں اور پھر ''سحر البیان'' پڑھیں تو اس مثنوی کو سمجھنے میں انہیں سہولت ہوگی۔ اسی وجہ سے مثنوی سحر البیان کے ساتھ اس کو شائع کیا گیا۔ بعد میں اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ میر بہادر علی حسینی کی دوسری کتاب ''اخلاق ہندی'' ہے۔ یہ کتاب سنسکرت کی کتاب ''ہنو پادیشا'' کے فارسی ترجمے کا اردو ترجمہ ہے۔ فارسی میں اس کے دو تین ترجمے ہوئے تھے۔ یہ اردو ترجمہ فارسی ترجمے ''مفرح القلوب'' سے کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے ''بیاض ہندی'' میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے اقتباسات شائع کیے تھے۔ اس میں ''اخلاق ہندی'' کا ایک طویل اقتباس شائع کیا تھا۔ بعد میں پوری کتاب شائع کی گئی۔ اس کتاب کی زبان و بیان میں کوئی خاص دلکشی نہیں ہے۔ حسینی کا تیسرا کارنامہ ''تاریخ آسام'' ہے۔ شہاب الدین لھاش ابن ولی محمد نے فارسی میں جو ''تاریخ آسام'' لکھی تھی یہ اسی کا اردو ترجمہ ہے۔ بہادر علی کی تاریخ کا کوئی نسخہ نہیں ملتا۔ گل کرسٹ نے لکھا ہے کہ فرانسیسی میں اس کا ترجمہ ہوا تھا۔ حسینی کی چوتھی کتاب ''رسالہ گرسٹ'' ہے۔ یہ کتاب گل کرسٹ کی کتاب ''ہندوستانی صرف ونحو'' کی تخلیص ہے گل کرسٹ نے اردو زبان کی قواعد اور صرف ونحو کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک مبسوط کتاب ''ہندوستانی کی صرف ونحو'' کے نام سے مرتب کی تھی۔ یہ نصاب میں تو داخل تھی لیکن اس کی ضخامت کی وجہ سے اردو سیکھنے والوں کو مشکل پیش آئی تھی۔ اس لیے گل کرسٹ نے اس کا خلاصہ مرتب کروایا۔ انگریزوں نے اردو قواعد کو مرتب کرنے کا کام اس لیے کیا کہ اردو قواعد کی کتابیں اس زمانے میں لکھی ہی نہیں گئی تھیں۔ گل کرسٹ کی کتاب ضخیم ہونے کی وجہ سے اور اس کی مانگ بھی نہ ہونے کی وجہ سے اس کو دوبارہ شائع کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس وجہ سے وہ کتاب کم یاب ہوتے ہوئے نایاب ہوگئی اور اس کی جگہ حسینی کے ''رسالہ گل کرسٹ'' نے لے لی۔ اردو ادب میں چونکہ تلمیحات کے سلسلے میں اور یوں بھی قرآن شریف کے حوالے آتے ہیں۔ گل کرسٹ نے قرآن شریف کے ترجمے کا کام بھی شروع کروایا تھا اس کام کے لیے بہادر علی حسینی اور مولوی عنایت اللہ کو مقرر کیا گیا بعد میں کاظم علی جوان اور دوسرے علما اس کام میں شریک ہوگئے۔ گل کرسٹ کے قیام تک یعنی 1804ء تک یہ کام برابر ہوتا رہا لیکن جب گل کرسٹ کو خرابی صحت کی بنا پر اپنے وطن انگلستان لوٹنا پڑا تو یہ کام ہمیشہ کے لیے ادھورا رہ گیا۔

مرزا علی لطف اپنے تذکرہ ''گلشن ہند'' کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ نثر میں ان کا یہی ایک کارنامہ ہے۔ مرزا علی نام تھا اور لطف تخلص۔ لطف

کے ''تذکرہ گلشن ہند'' کو مولوی عبداللہ خاں سابق منتظم کتب خانۂ آصفیہ نے حیدرآباد میں شائع کیا۔ ان کے والد کاظم بیگ خاں فارسی کے شاعر تھے۔ لطف کے آبا و اجداد استرآباد سے نادرشاہ کے ساتھ دہلی آئے اور مستقل طور پر یہیں کے ہو رہے۔ لطف دہلی ہی میں پیدا ہوئے۔ وہ دہلی کی تباہی تک وہاں رہے اور پھر وہاں سے نکلے۔ اس زمانے میں لکھنؤ اور حیدرآباد ایسے مقامات تھے جہاں کا رخ اہل علم وفن کیا کرتے تھے۔ لطف کو اس بات کی توقع نہیں تھی کہ لکھنو میں فکر روزگار سے آزاد رہ سکیں گے۔ اس لیے انہوں نے حیدرآباد جانے کا ارادہ کرلیا۔ وہ چند روز عظیم آباد اور پٹنہ میں رکتے ہوئے دکن آنا چاہتے تھے۔ لیکن جب کلکتہ پہنچے تو ڈاکٹر گل کرسٹ سے ملاقات ہوئی اور یوں فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہو کر اپنا مشہور اور معروف تذکرہ ''گلشن ہند'' لکھا۔ یہ تذکرہ مکمل کرنے کے بعد وہ حیدرآباد آئے۔ یہاں ان کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ اس زمانے کے ممتاز دکنی شاعر شیر محمد خان ایمان کی وجہ سے سرکار عالی سے چار سو روپیہ ماہوار وظیفہ اور ایک پالکی عنایت ہوئی۔ اعظم الامرا نے ان کی لطیفہ گوئی سے محظوظ ہو کر انہیں اپنے مصاحبین میں شامل کیا اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کردی۔ انہوں نے ایک قصیدہ لکھ کر ارسطو جاہ کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ ارسطو جاہ مدارالمہام کے جلیل القدر عہدے پر فائز ہوئے اور جب ان کا انتقال ہوا تو سر سالار جنگ اول کے جد امجد میر علم اس عہدے سے سرفراز ہوئے۔ لطف نے ان کی مدح میں قصیدے لکھ کر ان کے دربار میں بھی باریابی حاصل کرلی۔ لطف کا انتقال 1822ء میں حیدرآباد میں ہوا۔

لطف نے اپنا ایک کلیات بھی مرتب کیا تھا لیکن وہ اب ناپید ہے البتہ اس کلیات کا انتخاب ''دیوان منتخب'' کے نام سے تاج پریس حیدرآباد نے شائع کیا تھا۔ لطف کا شمار اردو کے بڑے شاعروں میں نہیں ہوتا۔ اصل میں ان کی تمام تر شہرت ''گلشن ہند'' کی وجہ سے ہے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر انہوں نے اپنا تذکرہ مرتب کیا۔ دراصل یہ علی ابراہیم خان کے فارسی تذکرہ ''گلزار ابراہیم'' سے ماخوذ ہے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کے کہنے پر انہوں نے اس فارسی تذکرہ کو سامنے رکھ کر اپنا تذکرہ مرتب کیا ہے۔ تذکرہ کی زبان سلیس اور سادہ نہیں ہے۔ اس کی عبارت مقفیٰ اور مسجع ہے لیکن اس تذکرہ کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے بہت سی باتیں ایسی لکھی تھیں جو اس زمانے کے تذکروں میں عام طور پر نہیں ملتیں جیسا کہ انہوں نے شعرا کے حالات ہی بیان نہیں کیے ہیں بلکہ اس دور کے ماحول اور پس منظر کو بھی پیش کیا ہے۔ عام تذکروں کے مقابلے میں شعرا کے حالات بھی زیادہ مفصل طور پر پیش کیے ہیں۔ میر حسن کی مثنوی ''گلزار ارم'' کے اقتباسات انہوں نے دیے ہیں ورنہ یہ مثنوی اس زمانے میں کہیں نہیں ملتی تھی۔ اسی طرح میر اثر کی مثنوی ''خواب وخیال'' کا تذکرہ تو کیا جاتا تھا لیکن لطف نے اس مثنوی کا بھی ایک حصہ پیش کیا ہے۔ ان ہی باتوں کی وجہ سے لطف کے اس تذکرے کو بڑی اہمیت اور شہرت حاصل ہوئی۔

اپنی معلومات کی جانچ

4. میر امن کی اردو نثر میں کیوں اور کیا اہمیت ہے؟
5. حیدر بخش حیدری کی تصانیف بیان کیجیے۔
6. شیر علی افسوس کی کون سی کتابیں ہیں؟
7. بہادر علی حسینی اور مرزا علی لطف کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

15.8 مولوی امانت اللہ، مظہر علی خاں ولا، مرزا جان طپش

مولوی امانت اللہ چونکہ فارسی اور عربی کے جید عالم تھے اس لیے فورٹ ولیم کالج میں انہیں عربی اور فارسی کی کتابوں کے ترجمے پر مامور کیا گیا۔ ان کے حالات کی تفصیل بھی نہیں ملتی۔ مولوی امانت اللہ کی پانچ کتابیں ملتی ہیں۔ (1) ہدایت الاسلام (عربی) (2) ہدایت الاسلام (اردو) (3) جامع الاخلاق (4) صرف اردو منظوم (5) ترجمۂ قرآن مجید۔

مولوی امانت اللہ نے ''ہدایت الاسلام'' کے عنوان سے عربی میں کتاب لکھی تھی۔ یہ بہت ضخیم کتاب تھی اور عربی جاننے والے بھی کافی کم ہو چکے تھے۔ ادھر فورٹ ولیم کالج قائم ہو گیا تھا اردو انشا پردازوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر مولوی امانت نے اپنی کتاب

ہدایت الاسلام کواردو میں منتقل کیا اور گل کرسٹ کو پیش کیا۔گل کرسٹ ان کے علم وفضل سے متاثر ہوئے اور انہیں عربی اور فارسی کی ادق کتابوں کے ترجمہ کے لیے کالج میں مامور کیا۔ ہدایت الاسلام (عربی) کو مولوی امانت نے دوحصوں میں تقسیم کیا۔ ہدایت اور اسلام (اردو) کی پہلی جلد ڈاکٹر گل سرکٹ کی وجہ سے کالج کی جانب سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ ہدایت الاسلام کی دوسری جلد کا بھی جب مولوی امانت نے ترجمہ کرلیا تو انہیں اور میر بہادر علی حسینی کو قرآن شریف کے ترجمے کا کام سونپا گیا لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد گل کرسٹ کو خرابی صحت کی بنا پر وظیفۂ حسن خدمت پر کالج کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا پڑا۔اور ہدایت الاسلام کی دوسری جلد اور قرآن شریف کا ترجمہ کالج کی طرف سے شائع نہیں ہوسکے لیکن مولوی امانت نے اپنے طور پر اس کا ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ اور ہدایت الاسلام کی دوسری جلد کسی اور نے شائع کی۔گل کرسٹ کے جانے کے بعد کپتان جیمس مونٹ ان کی جگہ اردو کے پروفیسر ہوئے۔انہوں نے فارسی کی مشہور ومعروف کتاب ''اخلاق جلالی'' کے ترجمے کا کام مولوی امانت اللہ کو سونپا۔مولوی امانت نے اخلاق جلالی کا ترجمہ جامع الاخلاق کے عنوان سے کیا۔ یہ مولوی امانت اللہ کا بڑا ہی گراں قدر کارنامہ ہے کیوں کہ ''اخلاق جلالی'' حد سے زیادہ ادق کتاب ہے اور اس کا ترجمہ کرنا لوہے کے چنے چبانے سے کم نہ تھا۔لیکن مولوی امانت نے اپنے علم وفضل اور محنت شاقہ سے اس کام کو پائے تکمیل تک پہنچایا۔ یہ کتاب اردو میں بھی دقیق اور مشکل ہے۔مولوی امانت اللہ کی آخری تصنیف ''صرف اردو منظوم'' ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ اردو کی منظوم قواعد ہے۔

مظہر علی خان ولا کے حالات بھی نہیں ملتے۔مظہر علی خان کا تخلص ولا تھا۔انہوں نے ممنون، مرزا جان طپش اور غلام ہمدانی مصحفی سے مشورۂ سخن کیا۔ وہ ہندی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔ ولا نے کوئی سات کتابوں کا ترجمہ کیا لیکن صرف دو ایک کتابیں ہی ان کی شائع ہوئیں۔ (1) ''مادھونل اور کام کندلا'' یہ کتاب ہندی سے اردو میں نقل کی گئی ہے۔ یہ ایک برہمن مادھونل ور ایک رقاصہ کام کندلا کی داستان عشق ہے۔ (2) ترجمۂ کریما: سعدی شیرازی کے مشہور پندنامہ ''کریما'' کو ولا نے اردو میں منظوم منتقل کیا۔ یہ بہت اچھا ترجمہ ہے (3)ہفت گلشن: ناصر علی خان واسطی بلگرامی نے یہ کتاب فارسی میں لکھی تھی۔ ولا نے اسی نام سے اسے اردو میں منتقل کیا۔اس کتاب کے ذریعہ تہذیب اور اخلاق کے قاعدے بیان کیے گئے ہیں اور نصیحت آموز کہانیاں اور حکایتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ (4) ڈاکٹر گل کرسٹ کی نگرانی میں ولا نے ''اخلاق ہندی'' لکھی۔اس میں اخلاقی اسباق اور حکایات ملتی ہیں۔ (5) بیتال پچیسی: ولا کا مشہور کارنامہ بیتال پچیسی ہے۔ یہ کتاب سنسکرت میں لکھی گئی تھی۔ برج بھاشا میں اس کا ترجمہ ہوا۔ برج بھاشا سے ولا نے اس کو اردو میں منتقل کیا۔ بیتال نامی ایک شخص پچیس کہانیاں بیان کرتا ہے۔ بیتال ایک مردہ ہے جس کو ایک جوگی نے بھوت بنادیا ہے۔ یہ بھوت ہی کہانیاں بیان کرتا ہے۔للولال کوی نے اس ترجمے میں ولا کی مدد کی تھی۔ بیتال پچیسی میں اس کثرت سے ہندی الفاظ استعمال ہوئے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے ہندی کتاب کو اردو رسم الخط میں پیش کیا گیا ہے۔ (6) تاریخ شیر شاہی: یہ شیر شاہ سوری کے عہد کی تاریخ ہے۔ یہ فارسی سے کپتان جیمس مونٹ کی فرمائش پر اردو میں منتقل کی گئی ہے۔ یہ ولا کا ایک اہم کارنامہ ہے۔گارساں دتاسی نے اس کا ترجمہ فرانسیسی میں کیا تھا۔لیکن یہ شائع نہیں ہوئی۔ (7) جہانگیر نامہ: گارساں وتاسی نے لکھا ہے کہ دلا نے ''تزک جہانگیری'' کے ایک حصے کا ترجمہ ''جہانگیر نامہ'' کے عنوان سے کیا تھا۔ ولا کی یہ کتاب کہیں نہیں ملتی۔

مرزا جان طپش گو خود فورٹ ولیم کالج کے باقاعدہ منشیوں اور اہل قلم میں شامل نہیں تھے لیکن وہ فورٹ ولیم کالج کے لیے کام کرتے تھے۔ دوسرے مترجمین کی کتابوں پر نظر ثانی اور اساتذہ قدیم کے کلام کا انتخاب وہ کیا کرتے تھے۔شاعر کی حیثیت سے بھی وہ ایک مقام رکھتے تھے۔ طپش کے آباواجداد بخارا سے ہندوستان آئے طپش دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ سنسکرت بھی جانتے تھے۔ان کا کلیات کالج کی جانب سے شائع ہوا۔مختلف تذکرہ نگاروں نے انہیں کہنہ مشق اور اچھا شاعر قرار دیا ہے اور ان کے کلام میں زبان کی صفائی، فصاحت اور مضامین کی تازگی کی تعریف کی ہے۔کالج نے ان کی ''شاعرانہ'' قابلیت کے اعتراف میں گراں قدر صلہ دیا۔طپش کی یادگار ان کی گراں قدر کتاب ''شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان'' ہے۔اس کتاب میں اردو محاورات اور روزمرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب ڈھاکہ کے ایک رئیس کے ایما پر لکھی گئی۔اس میں قواعد زبان سے بھی بحث کی گئی ہے۔اس میں 275 محاورات کی تشریح کی گئی ہے۔اور ہر محاورہ کی سند میں اساتذہ کا کوئی شعر پیش کیا گیا ہے۔ طپش نے سند میں دکنی

اساتذہ جیسے ولی، سراج، غربت اور دوسرے شعرا کے اشعار بھی دیے ہیں۔ ''بہار دانش'' کے عنوان سے طپش نے میر حسن کی سحر البیان کے طرز پر ایک طویل مثنوی لکھی ہے۔ یہ طپش کا شاہکار ہے۔ انہوں نے ہر لحاظ سے میر حسن کی تقلید کی ہے۔ طپش نے ممکنہ حد تک اپنی مثنوی میں وہ تمام خوبیاں پیدا کی ہیں جو سحر البیان میں ملتی ہیں۔ یہ مثنوی سب سے پہلے کالج کی جانب سے شائع ہوئی۔ طپش سے ''یوسف زلیخا'' بھی منسوب کی جاتی ہے۔ فارسی کے مشہور قصے یوسف زلیخا کو طپش نے اردو میں منظوم کیا ہے۔ لیکن یہ ناپید ہے۔

15.9 میر کاظم علی جوان، شیخ حفیظ الدین، خلیل خاں اشک

میر کاظم علی نام اور جوان تخلص تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے مشہور منشیوں میں تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے لیکن جب دلی پر تباہی آئی تو یہ بھی اوروں کی طرح دلی کو خیر باد کہنے پر مجبور ہو گئے۔ مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے اور وہاں ایک عرصہ گزرنے کے بعد مشہور شعرا میں شمار ہونے لگے۔ کاظم علی، جواں عربی، فارسی کے علاوہ برج بھاشا سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ لکھنؤ کا ریزیڈنٹ کرنل اسکاٹ ان کی علمی قابلیت سے متاثر ہوا اور فورٹ ولیم کالج کے لیے ان کی سفارش کی۔ کالج سے وابستہ ہونے کے بعد کلکتہ ہی کے ہو رہے اور تمام عمر تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ جوان کی تین کتابیں ملتی ہیں۔ (1) شکنتلا ناٹک: گل کرسٹ کے کہنے پر شہرہ آفاق ڈرامہ ''شکنتلا'' کو ہندی سے اردو میں منتقل کیا۔ لیکن وہ زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوا۔ گل کرسٹ نے اپنی ''بیاض ہندی'' میں اس کا ایک طویل اقتباس شائع کیا۔ ''شکنتلا'' کالی داس نے سنسکرت میں لکھا تھا۔ لیکن ہندی میں بھی اس کے کئی ترجمے ہوئے۔ جوان نے ہندی سے اردو میں منتقل کیا۔ اس ڈرامے کے ترجمے میں للو لال کوی نے کاظم علی جوان کی مدد کی۔ کاظم علی کا دوسرا کارنامہ ''بارہ ماسہ'' یا ''دستور ہند'' ہے۔ سال کے بارہ مہینوں میں ہندو اور مسلمان جو جو تیوہار یا عید کرتے ہیں ان کی ساری تفصیل جزئیات سمیت اس مثنوی میں پیش کی گئی ہے۔ ''بارہ ماسہ'' لکھنے کے بعد جوان قرآن مجید کے ترجمے کے کام میں لگ گئے لیکن جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے ڈاکٹر گل کرسٹ کے انگلستان چلے جانے کے بعد یہ کام ان کے جانشینوں کی بے التفائی کا شکار ہو گیا۔ جوان کی تیسری کتاب ''تاریخ فرشتہ'' ہے۔ اس تاریخ کے ایک بڑے حصے کا ترجمہ جو سلاطین بہمنی کے تعلق سے ہے، جوان نے کیا تھا۔ ان کتابوں کے علاوہ جوان نے شعرائے اردو کے کلام کے انتخاب کا کام دوسرے مولفین کے ساتھ انجام دیا جیسے کلیات میر کا انتخاب، کاظم علی کے ساتھ مولوی محمد اسلم، منشی غلام قادر اور مرزا جان طپش نے کیا۔ کلیات سودا کا انتخاب کاظم علی نے شیر علی افسوس کے ساتھ کیا۔ یہ انتخاب بہت اچھے ہیں اور سلیقے سے چھپے ہوئے ہیں۔ جوان نے ''سنگھاسن بتیسی'' کے ترجمے میں للو لال کوی کی مدد کی۔ اسی طرح حفیظ الدین کی کتاب ''خرد افروز'' پر نظر ثانی کی۔ دوسری کئی کتابوں کی ترتیب و اشاعت میں بھی جوان نے حصہ لیا۔

شیخ حفیظ الدین احمد کے جد اعلیٰ نے عرب سے دکن میں بود و باش اختیار کی۔ حفیظ الدین کے دادا دکن سے بنگال میں مستقل سکونت اختیار کی۔ وارن ہٹنگز گورنر جنرل ہند نے کلکتہ میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا جو نیٹو کالج کہلاتا تھا۔ حفیظ الدین کے والد وہاں مدرس ہو گئے۔ والد نے ان کی تربیت پر شخصی طور پر توجہ کی۔ حفیظ الدین نے عربی فارسی میں بہت اعلیٰ قابلیت پیدا کی۔ جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو ان کی قابلیت کے مدنظر ان کو کالج میں عربی و فارسی کا استاد مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے درس و تدریس کے ساتھ ترجمے کا کام بھی سپرد کیا۔ فارسی کی مشہور کتاب ''عیار دانش'' کو انہوں نے ''فرد افروز'' کے نام سے اردو میں منتقل کیا۔ ''عیار دانش'' اصل میں کلیلہ دمنہ کا قصہ ہے جس کو فارسی میں کئی لوگوں نے لکھا۔ ملا حسینی الواعظ کاشفی نے اسے ''انوار سہیلی'' کے نام سے فارسی میں منتقل کیا تھا۔ اسی قصے کو علامہ ابوالفضل نے ''عیار دانش'' کے نام سے لکھا۔ ''خرد افروز'' کو ڈاکٹر گل کرسٹ نے اپنی ''بیاض ہندی'' میں شامل کر کے شائع کیا۔ پوری کتاب بعد میں شائع ہوئی۔ اس کے کئی ایڈیشن نکلے۔ انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا۔

خلیل علی خان اشک کی کتاب ''قصہ امیر حمزہ'' بے حد مشہور و معروف کتاب ہے لیکن خود اس کا مصنف بڑی حد تک گم نامی میں رہا ہے۔ ''داستان امیر حمزہ'' صدہا بلکہ ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے۔ اشک کی زندگی کے بارے میں کہیں سے بھی مواد نہیں ملتا۔ خود اشک نے بھی اپنے

بارے میں کہیں بھی کچھ نہیں لکھا ہے۔ ''داستان امیر حمزہ'' فارسی میں لکھی گئی تھی لیکن اس کا حقیقی مصنف کون تھا۔ یہ بات صحیح طور پر معلوم نہیں ہے۔ سید محمد لکھتے ہیں :

> ''ہمارے پیش نظر جو نسخہ ہے اس میں اشک نے لکھا ہے کہ یہ قصہ سلطان محمود غزنوی (۹۹۸ء تا ۱۰۳۰ء) کے خوش کرنے اور اس فاتح اعظم کو ملک گیری و کشور کشائی کے لیے آمادہ و تیار رکھنے کے لیے کئی ایک راویوں اور داستان گویوں نے چودہ جلدوں میں تصنیف کیا'' (ارباب نثر اردو ۵۰۲)

اسی طرح ایک اور جگہ خود اشک نے اسے ملا جلال ملحی سے منسوب کیا ہے۔ برٹش میوزیم یں جو نسخہ ہے اس میں شاہ ناصر الدین احمد کو اس کا مصنف بنایا گیا ہے۔ بعضوں کے نزدیک یہ فیضی کے تخلیقی دماغ کی اختراع ہے۔ یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سب سے پہلے فارسی میں لکھا گیا یا عربی میں ۔ اشک اور دوسرے مولفین کے جو نسخے ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے اصل فارسی کتاب اتنی طویل نہیں تھی۔ بعد کے اہل قلم نے اس میں مسلسل اضافے کیے ہیں۔ ''داستان امیر حمزہ'' کو سب سے پہلے صاف اور سلیس زبان میں خلیل خان اشک نے لکھا ہے۔ زبان میں یہ اہتمام اس لیے بھی ضروری تھا کہ یہ کتاب نو آموز ان اردو کے لیے لکھی گئی تھی۔ اشک کے سوا جن لوگوں نے بھی اس داستان کو لکھا اس کی زبان اتنی زیادہ صاف و سلیس نہیں تھی۔ حافظ سید عبداللہ بلگرامی نے بھی اس کو لکھا تھا۔ یہ بہت مقبول ہوا اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ بعد میں سید تصدق حسین نے بھی اس کو لکھا چونکہ وہ عربی اور فارسی کے بڑے عالم تھے اس لیے ان کی زبان پر عربی اور فارسی کا گہرا اثر ہے۔ پھر یہ کہ انہوں نے ''فسانہ عجائب'' کی جیسی مقفیٰ و مسجع زبان بڑے افتخار کے ساتھ استعمال کی ہے۔ اس لیے اشک کی داستان امیر حمزہ اپنی زبان کی صفائی اور سلاست کے اعتبار سے دوسری داستانوں سے ممتاز اور منفرد ہے۔ اس داستان کے علاوہ اشک کا دوسرا کارنامہ ''واقعات اکبر'' ہے کپتان ولیم ٹیلر کے کہنے پر اشک نے ابوالفضل کی مشہور کتاب ''اکبر نامہ'' کا اردو میں واقعات اکبر کے نام سے ترجمہ کیا لیکن یہ کتاب شائع نہیں ہوئی اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اب کہیں محفوظ بھی ہے یا نہیں۔ خلیل علی خان کا تخلص اشک تھا اور وہ شاعر بھی تھے لیکن ان کا کلام محفوظ نہیں ہے اور داستان میں ان کے جو چند ایک اشعار مل جاتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معمولی درجے کے شاعر تھے۔

15.10 مولوی اکرام علی، نہال چند لاہوری، منشی بنی نارائن جہاں

مولوی اکرام علی گل کرسٹ کے انگلستان لوٹنے کے بعد فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔ کپتان جان ولیم ٹیلر کی ایما پر انہوں نے رسائل اخوان الصفا' میں سے کئی ایک رسالوں کا ترجمہ عربی سے اردو میں کیا۔ اخوان الصفا بصرہ کی ایک مشہور علمی انجمن تھی۔ کوئی دس اہل علم اور اہل قلم افراد اِس انجمن کے ممبر تھے۔ ان ہی کی تحقیق اور علمی موشگافیوں کا نتیجہ اخوان الصفا کے اکیاون رسالے ہیں۔ ان رسالوں میں بہت ہی انوکھے لیکن دلچسپ موضوعات پر بحثیں کی گئی ہیں۔ اکرام علی نے جس رسالے کا ترجمہ کیا ہے اس کا موضوع انسان کے اشرف المخلوقات ہونے سے متعلق ہے۔ مولوی اکرام علی گم نام آدمی تھے ان کے تعلق سے کہیں سے بھی کوئی معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔ اس کے سوا مولوی اکرام علی کی کوئی کتاب نہیں ملتی

نہال چند لاہوری فورٹ ولیم کالج کے ایک مشہور منشی تھے۔ ان کے حالات زندگی بھی پردہ اخفا میں ہیں۔ آبا و اجداد دہلی کے تھے۔ ولی کی تباہی کے بعد لاہور میں بود و باش اختیار کی۔ ایک انگریز کپتان کی وساطت سے ڈاکٹر گل کرسٹ کے ہاں پہنچے۔ اور فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تالیف و ترجمہ میں انہیں ملازم رکھ لیا گیا۔ نہال چند لاہوری کا صرف ایک ہی کارنامہ ''مذہب عشق'' ملتا ہے۔ تاج الملوک اور بکاولی کا قصہ فارسی میں لکھا گیا ہے۔ اسی قصے کو نہال چند لاہوری نے ''مذہب عشق'' کے نام سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ اس قصہ کو شیخ عزت اللہ بنگالی نے فارسی میں لکھا تھا۔ اس قصہ کو اس زمانے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس لیے اسے اردو میں منتقل کرنے کے لیے گل کرسٹ نے کہا ''مذہب عشق'' اس کا تاریخی نام ہے جس سے 1270ء نکلتا ہے۔ اس قصے کے اب تک بیسیوں اڈیشن نکل چکے ہیں۔ اس کی مقبولیت کو دیکھ کر دیا شنکر نسیم نے ''گلزار نسیم'' کے نام سے اس کو نظم کا جامہ پہنایا۔ ''مذہب عشق'' کی زبان و بیان پر فارسی کا اثر ہے اور سادگی و سلاست کم ہے۔

منشی بنی نارائن جہاں فورٹ ولیم کالج کے غیر معروف مولفین میں سے ہیں۔ بنی نارائن شاعر تھے اور جہاں ان کا تخلص تھا۔ بنی نارائن لاہور کے رہنے والے تھے۔ گو وہ امیر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن گردش زمانہ نے ان کو بدحال اور تنگ دست کر دیا تھا۔ تلاش روزگار میں ہندوستان کے مختلف شہروں میں گھومتے رہے۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کی خبر سنی اور قسمت آزمانے وہاں گئے لیکن کوئی بارہ سال تک انہیں کالج میں ملازمت نہیں ملی۔ کپتان ٹامس روبک کے زمانے میں حیدر بخش حیدری کی سفارش سے کالج میں ملازمت ملی۔ کالج میں آنے کے بعد انہوں نے دو کتابیں (1) چارگلشن اور (2) تذکرہ دیوان جہاں لکھیں گارساں وتاسی کی اطلاع کے مطابق انہوں نے ''تنبیہ الغافلین'' کا ترجمہ کیا تھا۔ گارساں وتامی نے جہاں کے تعلق سے یہ بھی کہا ہے کہ وہ مشرف بہ اسلام ہوگئے تھے۔ ''تنبیہ الغافلین'' کے ترجمے سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ ان کی کتابیں زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوسکیں۔ ''تذکرہ دیوان جہاں'' بہت اہم تذکرہ ہے اس اعتبار سے کہ یہ شعرا کا تذکرہ ہے لیکن اس میں ایسے شاعروں کا تذکرہ شامل ہے جن کا شاعری میں تو بلند درجہ نہیں ہے نثر نویسی میں البتہ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ''چارگلشن'' بنی نارائن کی وہ تالیف ہے جس میں ایک عشقیہ قصے کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ قصہ بنی نارائن نے فورٹ ولیم سے وابستہ ہونے سے پہلے لکھ لیا تھا۔ جب یہ قصہ کپتان ٹامس روبک اور کپتان ولیم ٹیلر کو دکھایا گیا تو انہوں نے اسے پسند کیا اور اس کا کافی صلہ بنی نارائن کو دیا گیا۔ اس دور کے ایک نثری نمونے کے طور پر اس کتاب کی اہمیت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ تذکرہ دیوان جہاں جس کا ذکر پچھلے صفحات پر آچکا ہے۔ اس میں 125 شعرا کا ذکر ہے۔ اس کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے ہوئی ہے۔ اس میں شعرا کا تذکرہ بھی ہے اور جہاں کا دیوان بھی ہے۔ بنی نارائن کی تیسری کتاب ''تنبیہ الغافلین'' ہے۔ یہ کتاب مولانا رفیع الدین کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔

15.11 میر عبداللہ مسکین، للولال کوی، مرزا محمد فطرت

میر عبداللہ مسکین فورٹ ولیم کالج کے بہت غیر معروف منشی ہیں۔ سید محمد مصنف ''ارباب نثر اردو'' کی تحقیق کے مطابق مسکین سودا کے ہم عصر تھے اور مرثیہ گو تھے۔ مسکین گل کرسٹ کے زمانے میں فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوئے۔ گل کرسٹ کی کتاب ''بیاض ہندی'' میں یہ شریک کار تھے۔ مسکین اپنے زمانے کے مشہور و مقبول مرثیہ گو تھے۔ ان کا مرثیہ جو حضرت مسلم بن عقیل اور آپ کے صاحبزادوں کی شہادت کے بارے میں لکھا گیا ہے بے حد مقبول ہوا۔ اس کی اس مقبولیت کی بنا پر اسے نثر میں بھی لکھا گیا تھا۔ مسکین کے اس مرثیہ کا ترجمہ گاوساں وتاسی نے فرانسیسی میں کیا اور شائع کیا تھا۔

للولال کوی گو ہندی زبان کے مشہور عالم اور شاعر تھے اور راست طور پر انہوں نے اردو میں ترجمہ نہیں کیا لیکن جو کتابیں ہندی اور برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ ہوئی تھیں ان میں وہ بہت مدد کرتے تھے۔ ان کی ہندی بھی مشکل اور سنسکرت آمیز نہیں تھی۔ انہوں نے کوئی چھ کتابیں ہندی میں لکھیں (1) پریم ساگر (2) راج نیتی (3) سبھا بلاس (4) مہادیو بلاس (5) لطائف ہندی (6) سنگاسن بتیسی۔ ان تمام کتابوں میں صاف اور سلیس ہندی میں للولال نے لکھا ہے۔

مرزا محمد فطرت، فورٹ ولیم کالج کے بہت ہی گم نام مصنفین میں سے ہیں وہ بہت ہی معمولی درجے کے شاعر تھے۔ ان کا اہم کارنامہ جارج ہائڈلے کی انگریزی میں لکھی کتاب قواعد میں ترمیم و اضافہ کرنا ہے۔ جارج ہائڈلے نے 1772ء میں قواعد اردو، انگریزی لکھ کر شائع کی تھی۔ ہندوستان کی زبان سے واقف ہونے کے لیے ہندوستان آنے والے انگریز اس سے استفادہ کرتے تھے۔ اس وجہ سے اس کتاب کے کئی اڈیشن خود انگلستان میں شائع ہوئے۔ اور ہر اڈیشن میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہا۔ فطرت کا بھی ترجمہ اڈیشن 1801ء میں لندن سے شائع ہوا۔ فطرت نے بائبل کا ترجمہ دل ہنٹر کی مدد سے اردو میں کیا۔

15.12 میر محی الدین فیض، سید حمید الدین بہاری

میر محی الدین نام فیض تخلص۔ دہلی کے متوطن تھے۔ اس زمانے میں جب گل کرسٹ اردو زبان کی تحصیل کے لیے شہر شہر گھوم رہے تھے ان کی ملاقات فیض سے ہوئی اور وہ انہیں کلکتہ لے آئے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر انہوں نے شیخ فرید الدین غفار کے ''پند نامہ'' کا منظوم ترجمہ ''چشمہ فیض'' کے عنوان سے اردو میں کیا۔ اس کے سوا فیض کی کوئی اور کتاب نہیں ملتی۔

سید حمید الدین بہاری کے نام کے جزو ''بہاری'' سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہار کے رہنے والے تھے۔ گل کرسٹ کو اردو ہی سے دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس کے کلچر اور اس کی تہذیب سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ اسی وجہ سے جہاں تک ممکن تھا اس نے یہاں کی تہذیبی زندگی کے عناصر کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ اسی لیے اس نے قرآن شریف کے ترجمہ کا کام بھی شروع کروایا تھا۔ اس نے چونکہ ہندوستان میں آنے کے بعد ہی اسلامی اور ہندوستانی تہذیب کے مختلف عناصر سے انگریزوں کو واقف کروانے کے لیے کام کیا۔ اسی لیے یہاں کی اخلاقیات، قصص و حکایات، تاریخ اور تذکرے کی کتابوں کے ترجمے کروائے۔ اسی سلسلے میں اس نے ہندوستانی کھانوں کے تعلق سے ایک کتاب سید حمید الدین بہاری سے مرتب کروائی۔ اس کتاب کا عنوان ''خوان الوان'' ہے۔ یہ کتاب حمید الدین کی تالیف تھی یا ترجمہ یقین کے ساتھ کچھ کہا نہیں جاسکتا کیونکہ اس نام کی کتاب فارسی میں دستیاب نہیں ہوئی ہے۔ اس کتاب میں میٹھوں اور کھانوں کے نام، ان کے اجزا اور ان کے پکانے کے طریقوں کی ساری تفصیل ملتی ہے۔ کتاب کے آخر میں ''مصطلحات طعام خانہ'' کی فرہنگ دی گئی جس سے ان تمام متعلقہ اصطلاحات کی تشریح ہوجاتی ہے جو اس کتاب میں استعمال ہوئی ہیں۔ اس کے سوا ان کی کوئی کتاب نہیں ملتی۔

15.13 خلاصہ

فورٹ ولیم کالج کا قیام 1800ء میں عمل میں آیا۔ اس کو قائم کرنے کا مقصد نووارد انگریز عہدے داروں کو ہندوستانی زبان اور یہاں کے طور طریقوں سے آشنا کرنا تھا۔ کالج تو قائم ہوا کمپنی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لیکن اس سے اردو ادب اور خاص طور پر اردو نثر کو بے حد فائدہ پہنچا۔ فورٹ ولیم کالج میں جو کتابیں لکھی گئیں ان کی نثر سادہ اور سلیس رکھی گئی کیونکہ یہ انگریزوں کو اردو سکھانے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ اردو میں جو نثری کتابیں تھیں ان کی نثر نو آموزگان کے لیے بے حد مشکل تھی۔ پہلے تو اس لیے کہ ان میں فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔ دوسرے یہ کہ مقفیٰ اور مسجع نثر میں لکھی گئی تھیں۔ چند کتابیں سلیس و سادہ نثر میں تھیں لیکن وہ کتابیں یا رسالے مذہب اسلام کے مسائل اور عقائد کی توضیح اور تشریح کے لیے لکھے گئے تھے۔ اس لیے ان کو بھی نہیں پڑھایا جاسکتا تھا۔ نئی کتابیں لکھوانے کے لیے ایسے ادیبوں کو جمع کرنا جو نئے افسانے، کہانیاں اور حکایتیں جلد از جلد لکھ سکیں ممکن نہ تھا۔ اس لیے جو کتابیں فارسی یا اردو کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں تھیں ان کا ترجمہ کروایا گیا۔ یہ آسان طریقہ تھا اس لیے فورٹ ولیم کالج میں درس و تدریس کے ساتھ ترجمہ و تالیف کا شعبہ بھی قائم کیا گیا۔

فورٹ ولیم کالج کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے اس لیے کہ اردو نثر کو سادہ، سلیس اور ہر قسم کے مضامین ادا کرنے کے قابل بنایا۔ لیکن اس کے باوجود رنگین اور مقفیٰ نثر لکھنے کا رواج ایک مدت تک ختم نہیں ہوا۔ رجب علی بیگ سرور نے فورٹ ولیم کالج کے ختم ہونے کے بعد اپنی کتاب ''فسانۂ عجائب'' لکھی تو میر امن کی کتاب ''باغ و بہار'' پر اعتراض کیا۔ امن نے ''باغ و بہار'' کے دیباچہ میں لکھا تھا جب تک کوئی شخص ''دلی کا روڑا'' بن کر نہ رہے وہ ایسی زبان نہیں لکھ سکتا۔ رجب علی بیگ سرور نے ''فسانہ عجائب'' میں میر امن پر چوٹ کی۔ دلی کے روڑے ہیں محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج نے بہر حال سادہ اور سلیس نثر کے نمونے اردو کو دیے اور اس نثر کی ایسی بنیادیں فراہم کردیں جس پر آنے والی نسلوں نے موجودہ نثر کی شاندار عمارت کھڑی کردی۔ اردو نثر سکھانے کے لیے ساتھ ساتھ گل کرسٹ کا یہ بھی منشا تھا کہ ہندوستان آنے والے انگریز یہاں کے رسم و رواج، طور طریقے، ماحول غرض کہ تہذیب و معاشرت سے بھی واقف ہوجائیں۔ اس وجہ سے فورٹ ولیم کالج میں دلچسپ

انداز میں زبان کے ساتھ یہاں کی زندگی سے مجموعی طور پر واقفیت کے لیے قصے' کہانیوں اور حکایتوں کی کتابوں کے زیادہ سے زیادہ ترجمے کروائے کیونکہ قصے کہانیاں یعنی فکشن کے ذریعہ کسی ملک کے بارے میں جتنی گہری واقفیت ہوسکتی ہے وہ کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوسکتی۔ اسی وجہ سے کمیونزم کے نظریہ کو پیش کرنے والے کارل مارکس نے لکھا ہے کہ میں نے فرانس کی زندگی کے بارے میں بالزاک کے ناولوں کے ذریعہ جتنا زیادہ جانا ہے کہ وہ کسی اور ذریعہ سے نہیں۔ اسی وجہ سے افسانوی ادب کی کتابوں کا فورٹ ولیم کالج میں بہت زیادہ ترجمہ ہوا۔ اس کا یہ بھی مفہوم نہیں کہ دوسرے علوم کی کتابوں کا ترجمہ نہیں ہوا۔ تاریخ اور تذکرے کی کتابیں بھی ترجمہ کی گئیں۔ ذیل میں ان کتابوں اور فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی کتابوں کی فہرست دی جارہی ہے۔ گل کرسٹ کے زمانۂ قیام یعنی 1800ء سے 1804ء تک فورٹ ولیم کالج میں جتنا اور جیسا کام ہوا اس کے بعد نہیں ہوا۔ خود گل کرسٹ نے بہت کتابیں لکھیں اور مرتب کیں۔

گل کرسٹ : (1) انگریزی ہندوستانی لغت (2) ہندوستانی علم اللسان (3) اردو کی صرف ونحو (4) مشرقی زبان دان (5) اردو زبان پر مختصر مقدمہ (6) ہندی کی آسان مشقیں (7) فارسی افعال کا جدید نظریہ (8) اجنبیوں کے لیے رہنمائے اردو (9) بیاض ہندی (10) عملی خاکے (11) ہندی الفاظ کی قرأت (12) اتالیق ہندی (13) ہندی عربی آئینہ (14) مکالمات انگریزی و ہندوستانی (15) مشرقی قصے (16) ہندی داستان گو (یہ تمام کتابیں صرف گل کرسٹ کے زور قلم کا نتیجہ نہیں ہیں۔ ان کتابوں کی تالیف میں اس نے فورٹ ولیم کالج کے دوسرے اہل قلم کی مدد لی ہے۔)

میر امّن : (1) باغ و بہار (2) گنج خوبی۔

سید حیدر بخش حیدری : (1) قصہ مہر و ماہ (2) قصہ لیلیٰ مجنوں (3) طوطا کہانی (4) آرائشِ محفل (5)ہفت پیکر (6) تاریخ مادری (7) گل مغفرت (8) گلزار دانش (9) گلدستۂ حیدر (10) تذکرۂ گلشن ہند۔

میر شیر علی افسوس : (1) دیوان افسوس (2) باغ اردو (3) آرائش محفل۔

میر بہادر علی حسینی : (1) نثر بے نظیر (2) اخلاق ہندی (3) تاریخ آسام (4) رسالہ گل کرسٹ۔

مرزا علی لطف : (1) کلیات لطف (2) تذکرہ گلشن ہند۔

مولوی امانت اللہ : (1) ہدایت الاسلام عربی (2) ہدایت الاسلام (اردو) (3) ترجمہ قرآن مجید (4) جامع الاخلاق (5) صرف اردو

مظہر علی خاں ولا : (1) مادھونل اور کام کندلا (2) ترجمہ کریما (3)ہفت گلشن (4) اتالیق ہندی (5) بیتال پچیسی (6) تاریخ شیر شاہی (7) جہانگیر نامہ

مرزا جان طپش : (1) کلیات گلشن (2) شمس البیان فی مصطلاحات ہندوستان (3) بہادر دانش (4) یوسف زلیخا

کاظم علی جوان : (1) شکنتلا ناٹک (2) بارہ ماسہ (3) تاریخ فرشتہ۔

شیخ حفیظ الدین : (1) خرد افروز

خلیل علی خان اشک : (1) قصہ امیر حمزہ (2) اکبر نامہ۔

مولوی اکرام علی : (1) اخوان الصفا۔

نہال چند لاہوری : (1) مذہب عشق۔

بینی نارائن جہاں : (1) چار گلشن (2) دیوان جہاں (3) تنبیہہ الغافلین۔

سر عبداللہ مسکین : (1) مرثیہ ہائے مسکین۔

للو لال کوی : (1) پریم ساگر (2) راج نیتی (3) سبھا بلاس (4) مہادیو بلاس (5) لطائف ہندی (6) سنگاسن بتیسی۔

مرزا محمد فطرت : (1) عہد نامہ جدید۔

محی الدین فیض : (1) چشمہ فیض۔

سید حمید الدین بھاری : (1) خوان الوان۔

15.14 نمونۂ امتحانی سوالات

1. فورٹ ولیم کالج کب اور کیوں قائم کیا گیا؟ بیان کیجیے۔
2. جان گل کرسٹ نے سادہ اور سلیس نثر کو رواج دینے میں اپنے طور پر کیا کام کیا اور دوسروں سے کیا کام لیا؟ بیان کیجیے۔
3. میر امن اور ''باغ و بہار'' کی اردو نثر میں کیا اور کیوں اہمیت ہے؟
4. سید حیدر بخش حیدری اور میر شیر علی افسوس نے اردو ادب کی کیا خدمات انجام دیں؟
5. میر بہادر علی حسینی اور مرزا علی لطف کی ادبی خدمات بیان کیجیے۔
6. مولوی امانت اللہ، مظہر علی خان ولا اور مرزا جان طپش نے کون سی کتابیں لکھیں اور ان کے موضوعات کیا تھے؟
7. میر کاظم علی جوان، شیخ حفیظ الدین، خلیل خان اشک کی نثری خدمات کا جائزہ لیجیے۔
8. مولوی اکرام علی، نہال چند لاہوری اور منشی بنی نارائن جہاں کی تالیفات کا جائزہ لیجیے۔
9. میر عبداللہ مسکین، للو لال کوی اور مرزا محمد فطرت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ بیان کیجیے۔
10. میر محی الدین فیض اور سید حمید الدین بہاری کی کتابوں کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔
11. قصص اور حکایات سے ہٹ کر فورٹ ولیم کالج میں علمی موضوعات پر جو کتابیں لکھیں گئیں ان کی تفصیل بیان کیجیے۔

15.15 فرہنگ

ریاض = باغات، سرسبز و شاداب مقامات فُصحا = خوش گفتار لوگ

نوشت و خواند = لکھنا پڑھنا مبسوط = پھیلی ہوئی، وسیع

مرصع = نگینوں اور جواہر سے جڑا ہوا، مناسب یا موزوں الفاظ کی نظم یا نثر جس میں الفاظ نگینوں کی طرح جڑے ہوں

ماہ نیم ماہ = آدھے مہینے کا چاند، چودھویں کا چاند لسان = زبان، بولی

مہر نیم روز = آدھے روز کا سورج، دوپہر کا سورج، پوری بلندی پر رہنے والا سورج

فریطہ = لفافہ، تھیلا

تاریخی نام = ایسا نام جس کے حروف سے تاریخ نکلتی ہو۔عربی میں ایک سے لے کر ہزار تک ہر حرف کے مقدار مقرر ہیں جو حسب ذیل دیے جارہے ہیں اور جن کو آسانی سے یاد رکھا جاسکتا ہے :

ابجد = الف کا ۱ ' ب کے ۲ ' ج کے ۳ ' د کے ۴

ہوز = ۵ ' ۶ ' ۷

حُطی = ۸ ' ۹ ' ۱۰

کلمن = ۲۰ ' ۳۰ ' ۴۰ ' ۵۰

سعفص = ۶۰ ' ۷۰ ' ۸۰ ' ۹۰

قرشت = ۱۰۰ ' ۲۰۰ ' ۳۰۰ ' ۴۰۰

ثخذ = ۵۰۰ ' ۶۰۰ ' ۷۰۰

ضظغ = ۸۰۰ ' ۹۰۰ ' ۱۰۰۰

15.16 سفارش کردہ کتابیں

1. سید محمد : ارباب نثر اردو
2. وقار عظیم : فورٹ ولیم کالج، تحریک اور تاریخ (لاہور)
3. ڈاکٹر عبیدہ بیگم : فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات (لکھنؤ)
4. ڈاکٹر گیان چند جین: اردو کی نثری داستانیں

اکائی 16 : فورٹ سینٹ جارج کالج کی اردو خدمات

ساخت

16.1 تمہید
16.2 ایسٹ انڈیا کمپنی
16.3 کالج کے قیام کے مقاصد
16.4 عمارت
16.5 شعبہ تعلیم
16.6 شعبہ تصنیف وتالیف
16.7 پریس
16.8 تصانیف پر انعامات
16.9 کتب خانہ
16.10 چند انگریز مصنفین
16.11 چند ہندوستانی مصنفین
16.12 خلاصہ
16.13 نمونہ امتحانی سوالات
16.14 فرہنگ
16.15 سفارش کردہ کتابیں

16.1 تمہید

تعلیم وتمدن کی آبیاری میں یونان، مصر وروما کی طرح ہندوستان کا شاندار حصہ رہا ہے۔ قدیم دور کی ہندوستانی جامعات نالندہ یونیورسٹی، ٹکسلا یونیورسٹی اور دالبی یونیورسٹی اور دکن کی مشہور بدھ مت کے عالم ناگارجنا کی خانقاہ وغیرہ بین الاقوامی شہرت کی حامل تھیں۔ یہاں مشرقی ایشیا اور مغربی ایشیا سے بے شمار طالب علم آئے اور اپنی علمی پیاس بجھانے کے بعد واپس چلے گئے۔ ان میں فاہیان، ہیونگ سانگ، مسعودی اور بیرونی قابل ذکر ہیں۔ ابو ریحان البیرونی ہندوستان میں پڑھا اور اہل ہند کو پڑھایا بھی۔ بنارس کے کئی ہزار چوٹی کے پنڈتوں (عالموں) نے اکٹھا ہوکر اسے ودیا ساگر (علم کا سمندر۔ بحرالعلوم) کا خطاب دیا تھا پہلے تو عربوں پھر تیموری نسل کے مغل بادشاہوں نے ہندوستان کو علم وحکمت سے مالا مال کیا۔ لیکن مغل سلطنت کے زوال کے بعد ایک ایسا دور آیا کہ فوجی طاقت ہی نہیں بلکہ علم وہنر میں بھی ہندوستان پیچھے رہ گیا۔ یوروپی اقوام، پرتگالی، ڈچ اور پھر بعد میں فرانسیسی اور انگریز سامراج نے ہندوستان جنت نشان کی بہت ساری دولت لوٹی اور ہمارا وطن ہندوستان معاشی حیثیت سے پسماندہ بن کر رہ گیا لیکن ساتھ ساتھ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یورپی اقوام خصوصاً اہل برطانیہ نے ہندوستان کا قدیم علمی ورثہ جو عربوں، ایرانیوں اور ترکوں کے توسط سے یورپی اقوام کو پہونچا تھا ان علوم وفنون کو مزید ترقی دیکر ہندوستان کو واپس کیا۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس کے ذریعہ سامراجی انگریزوں نے ہندوستانیوں کے تعاون سے زریں کارنامے انجام دیے۔ آئندہ صفحات میں فورٹ سینٹ جارج کالج کی اردو خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

16.2 ایسٹ انڈیا کمپنی

اٹھارویں صدی عیسوی کے شروع میں جب کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت مستحکم بنیادوں پر قائم ہوچکی تھی انگریزی کمپنی نے تجارتی

اور حکومتی اغراض کے لیے اپنے ملازمین کو ہندوستانی زبانوں، ہندوستانی رسم و رواج اور ہندوستانی طور طریقوں سے واقف کروانا ضروری سمجھا کیونکہ اس وقت کمپنی میں اور ہندوستان میں ملازمت کے خواہش مند افراد جو ہندوستان پہنچ رہے تھے وہ مقامی زبانوں اور ہندوستانی تہذیب و تمدن سے بالکل بیگانہ ہوتے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے انگلستان یا ہندوستان میں کوئی انتظام نہ تھا۔ اس وقت کمپنی میں کئی عہدے تھے جیسے نو آموز (Apperntice) منشی (Writer)، گماشتہ (Factor) جونیر مرچنٹ (Junior Merchant)، سینئر مرچنٹ (Senior Merchant) کونسل (Council) صدر (President)۔ ان سب عہدوں میں منشی (Writer) کے عہدے کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ابتدا میں اس عہدے کے لیے معیار قابلیت کی کوئی شرط نہ تھی لیکن 1674ء کے قانون کے تحت منشیوں کا باقاعدہ تقرر شروع ہوا۔ ان کی بھرتی انگلستان میں ہوتی۔ اس عہدے کے لیے عموماً ایسے نوجوانوں کو منتخب کیا جاتا تھا جن کی عمریں پندرہ سے اٹھارہ سال کے درمیان ہوتیں ان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ سیول (کشوری) اور ملٹری (فوجی) دونوں ذمہ داریاں پوری کریں گے۔ منشیوں (Writers) کا تقرر پانچ سال کے معاہدے پر سالانہ دس پونڈ پر کیا جاتا تھا۔ اس مدت کے ختم پر انہیں مزید تین سال کے لیے سالانہ بیس پونڈ پر دوبارہ مامور کیا جاتا تھا۔ ان منشیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ہندوستان میں پہلی بار مدراس کے انگریز گورنر جوزف کالکٹ (Joseph Collect) نے 1717ء میں فورٹ سینٹ جارج اسکول کی بنیاد ڈالی جسے بعض تذکروں میں رائٹرس کالج (Writers College) کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ یہ ادارہ برسوں مدراس کے فورٹ سینٹ جارج کے احاطہ میں کام کرتا رہا اور آگے چل کر فورٹ سینٹ جارج کالج کے نام سے مشہور ہوا۔

1798ء میں جب لارڈ ویلزلی گورنر جنرل مقرر ہو کر ہندوستان آیا تو اس نے سب سے پہلے ملازمین کمپنی کو اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم دلانے کی ضرورت محسوس کی اور ایک اسکیم بنا کر نظمائے کمپنی (Directors East India Company) کو بھیجی اور ان سے ایک کالج قائم کرنے کی اجازت چاہی۔ لارڈ ڈویلزلی نے نظمائے کمپنی کی منظوری کا انتظار کیے بغیر 4 مئی 1800ء کو کلکتہ میں ''فورٹ ولیم کالج'' کا افتتاح کر دیا۔ اور اس کالج کو سیول ملازمین کی تربیت (ٹریننگ) کا ایک ''مرکزی ادارہ'' قرار دیا۔ گورنر جنرل کے حکم پر مدراس اور بمبئی سے سیول ملازمین اور آفیسرس ''فورٹ ولیم کالج'' کو تعلیم کے لیے بھیجے جانے لگے۔ لیکن 1802ء میں ''فورٹ ولیم کالج'' کی مرکزی حیثیت ختم کر دی گئی اور مدراس گورنمنٹ نے اپنے منشیوں اور دیگر ملازمین کو ٹریننگ کے لیے کلکتہ بھیجنا بند کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مدراس اور بمبئی کی پریسیڈنسیوں کو یہ پسند نہ تھا کہ صرف کلکتہ پریسڈنسی ہی میں یہ انتظام رہے اور اس کو مرکزیت حاصل ہو۔ اس کے علاوہ خود نظمائے کمپنی ''فورٹ ولیم کالج'' کے مخالف تھے۔ انہوں نے کالج کو ختم کرنے کی بہترین ترکیب یہ سوچی کہ اس قسم کے متوازی کالج مدراس اور بمبئی میں بھی قائم کیے جائیں اس کے علاوہ مجلس نظمائے کمپنی نے ایک تجویز یہ بھی منظور کر لی کہ فورٹ ولیم کالج کے بجائے خود انگلستان میں ایک ایسی قسم کی درسگاہ قائم کر دی جائے۔ جس کے امتحانات پاس کیے بغیر کسی کو ہندوستان نہ بھیجا جائے۔ چنانچہ 1805ء میں انگلستان کے ایک نواحی علاقے ہرٹ فورڈ شائر میں ہیل بری کالج قائم کیا گیا اور مدراس کے قدیم مرکز فورٹ سینٹ اسکول/رائٹرس کالج کی تنظیم جدید کی گئی۔

ہندوستانی مورخ ڈاکٹر بی۔ بی۔ مشرا نے اپنی کتاب ''دی سنٹرل ایڈمنسٹریشن آف دی ایسٹ انڈیا کمپنی'' میں بیان کیا ہے کہ گورنمنٹ مدراس نے سیول ملازمین کو مقامی زبانوں کی تعلیم دینے کے لیے 1808ء میں فورٹ سینٹ جارج اسکول کا از سر نو احیاء کیا۔ ڈاکٹر مشرا کے برخلاف انگریز مورخ ایچ۔ ڈی۔ لو (H.D.Love) نے فورٹ سینٹ جارج اسکول کی تنظیم جدید اور کالج کے قیام کا سنہ 1812ء بتایا ہے۔ ''ہسٹری آف دی سٹی آف مدراس'' کے مصنف پروفیسر سری نواس چاری بھی فورٹ سینٹ جارج کالج کے قیام سنہ 1812ء ہی بتاتے ہیں۔

بادی النظر میں فورٹ سینٹ جارج کالج، فورٹ ولیم کالج کے سقوط کے بعد ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کالج کی باضابطہ تنظیم گو 1812ء میں ہوئی لیکن اس سے پہلے ہی سے یہ ادارہ مسلسل اپنی خدمات انجام دے رہا تھا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے ملازمین کو کن چیزوں سے واقف کروانا ضروری سمجھا؟
2. ایسٹ انڈیا کمپنی میں کتنے عہدے تھے؟ ان میں کس عہدے کو خاص اہمیت حاصل تھی؟
3. مدراس کے گورنر نے 1717ء میں کس اسکول کی بنیاد ڈالی؟ یہ اسکول اور کس نام سے موسوم تھا؟

4. فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا افتتاح کس سنہ میں ہوا اور فورٹ سینٹ جارج کالج کب قائم ہوا؟
5. ہیل بری کالج کب اور کہاں قائم ہوا؟

16.3 کالج کے قیام کے مقاصد

فورٹ سینٹ کالج کے قیام کے بھی وہی مقاصد تھے جو فورٹ ولیم کالج کے تھے۔ دونوں کالجوں کے پیش نظر جونیر سیول ملازمین (منشیوں) کی تعلیم و تربیت کا انتظام تھا۔ لیکن فورٹ سینٹ جارج کالج کو فورٹ ولیم کالج پر ایک طرح کی برتری حاصل تھی کیونکہ یہاں صرف منشی (Writers) ہی نہیں آتے تھے بلکہ وکلاء اور ججوں کی بھی ٹریننگ ہوتی تھی۔

ڈاکٹر مشرا نے ''دی سنٹرل ایڈمنسٹریشن آف دی ایسٹ انڈیا کمپنی میں لکھا ہے کہ 1827ء میں فورٹ سینٹ کالج کا نیا نصاب ترتیب دیا گیا اور مقامی السنہ کے ساتھ ساتھ سنسکرت، اردو اور فاسی زبان کو بھی نصاب میں شامل کیا گیا۔ فورٹ ولیم کالج کے نمونہ پر یہاں یورپین اساتذہ کو مامور نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس کالج کے جو ممتحن مقرر ہوئے تھے وہ بھی بغیر کسی معاوضے کے اپنی خدمات انجام دیتے تھے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. فورٹ سینٹ جارج کالج کے قیام کا کیا مقصد تھا؟
2. فورٹ سینٹ جارج کالج کو فورٹ ولیم کالج پر کیا برتری حاصل تھی؟
3. فورٹ سینٹ جارج کالج کا نیا نصاب کب ترتیب دیا گیا تھا؟

16.4 عمارت

فورٹ سینٹ جارج اسکول 1717ء سے 1812ء تک مدراس کے احاطہ میں ہی کام کرتا رہا۔ 1812ء میں جب اسکول کی تنظیم عمل میں آئی تو جگہ ناکافی ہونے لگی چنانچہ 1816ء میں مسٹر گیارو (Mr. Garrow) کا مکان دس سال کے پٹہ پر حاصل کیا گیا۔ دس بارہ سال بعد 1827ء میں کالج ایک مالدار ارینی تاجر مسٹر موریٹ (Mr. Moorat) کے مکان میں منتقل ہوا۔ انگریز مورخ ایچ۔ڈی۔لو (H.D. Love) نے اپنی کتاب ''رزٹچس آف اولڈ مدراس'' (جلد سوم) میں بیان کیا ہے کہ یہ عمارت گورنمنٹ مدراس نے نوے ہزار (90,000) روپے کے سرمایہ سے خریدی تھی۔ اس عمارت کا ایک وسیع اور شاندار کمرہ ''کالج ہال'' کے نام سے موسوم کیا گیا تھا جہاں برسوں مختلف تہذیبی پروگرام اور ڈرامے اسٹیج ہوتے رہے۔

فورٹ سینٹ جارج کالج کی جس قدر تفصیلات ملتی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کالج تقسیم کار کے لحاظ سے کئی حصوں میں بانٹا ہوا تھا۔ اس میں ایک طرف تعلیمی شعبہ تھا تو دوسری طرف دارالتصنیف و تالیف پھر اسی کے ساتھ کالج کا پریس اور ایک شاندار وسیع کتب خانے کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. فورٹ سینٹ جارج اسکول 1717ء سے 1812ء تک کہاں کام کرتا رہا؟
2. فورٹ سینٹ جارج کالج 1816ء میں کہاں قائم ہوا ؟
3. 1827ء میں فورٹ سینٹ جارج کالج کہاں منتقل ہوا ؟ اس عمارت کی تفصیل لکھیے۔

16.5 شعبۂ تعلیم

فورٹ سینٹ جارج کالج کا شعبہ تعلیم دکنی، ہندوستانی، اردو، عربی، فارسی، سنسکرت، تلگو، ملیالم، کنڑی اور تامل زبان کے شعبوں کے علاوہ قانون اور ریاضی کے شعبوں پر مشتمل تھا۔ تراب علی نامی اس کالج کے شعبہ عربی، فارسی اور اردو کے صدر تھے۔ حسن علی ماہلی شعبہ فارسی اور ریاضی میں استاد تھے۔ منشی

شمس الدین احمد، منشی ابراہیم بیجاپوری، منشی مظفر، محمد مہدی واصفؔ، مرزا عبدالباقی وفاؔ، سید تاج الدین تاج اور غلام دستگیر وغیرہ برسوں اس کالج میں درس و تدریس کی خدمت بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ اس تعلیمی ادارہ میں کام کرنے والے اساتذہ کو عام طور پر ''منشی'' کے لقب سے موسوم کیا جاتا تھا۔ جو اس دور میں ارباب علم و عمل کے لیے مخصوص تھا۔ کالج کے شعبۂ تعلیم میں اساتذہ کی کمی تھی کیونکہ اس دور کے علما شعرا اور ادبا ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کو اپنے لیے کوئی عزت کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے۔ کالج کے قائم ہونے کے بعد بھی کالج کے ارباب ذمہ دار کافی دنوں تک اس فکر میں رہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں سے ارباب کمال کو بلا کر کالج کے شعبہ کو وسعت دی جائے۔ اس طرح تراب علی نامی، حسن علی ماہلی، منشی ابراہیم بیجاپوری اور مرزا عبدالباقی وفاؔ وغیرہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے مدراس آئے تھے اور یہ سب فورٹ سینٹ جارج کالج سے وابستہ تھے۔ حسن علی ماہلی کے متعلق محققین کا بیان ہے کہ وہ اپنے وقت کے زبردست مشاہیر علما میں تھے۔ عالم یگانہ و فاضل فرزانہ تھے۔ علم عربی و فارسی میں منتخب زمانہ تھے۔ مرزا عبدالباقی وفاؔ کے متعلق ''اشارات بینش'' کے مصنف سید محمد بینش رقم طراز ہیں کہ وفاؔ اہل زبان، فصیح البیان صاحب کمالات تھے۔ علم عربیہ اور مختلف علوم و فنون میں بہرہ دانی رکھتے تھے۔ مدراس میں ان کے جیسا باکمال ولایت سے کم آیا ہوگا۔

فورٹ سینٹ جارج کالج میں مقامی علما اور شعرا بھی درس و تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ ان میں منشی شمس الدین احمد، منشی مظفر، مہدی واصفؔ، غلام دستگیر اور محمد خاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ خصوصاً مہدی واصف جو سترہ سال فورٹ سینٹ جارج کالج سے وابستہ رہے۔ تین سو کتابوں کے مصنف یا مولف تھے۔ ان سب حضرات کی موجودگی سے اس کالج کا چرچا سارے ہندوستان میں ہونے لگا۔ چنانچہ منشی شمس الدین احمد اپنی مشہور کتاب ''حکایات الجلیلہ ترجمہ الف لیلہ دلیلہ'' کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں ''چرچا ہر ایک علم کا یہاں تک بڑھا کے بلدہ مدراس مخزن و معدن سب علوم کا بن گیا۔''

فورٹ سینٹ جارج کالج میں تامل کے لیے چدامبرا اور ستوسوامی پلے، کنڑ کے لیے بی۔ جی۔ بانگلوں اور ملیالم کے لیے سی۔ ایم۔ رش کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اس کالج کے ا۔ ڈی۔ کیمبل نے تلگو زبان کی قواعد لکھی۔ ٹامل اسکالر Beschi نے شیخ چلی ٹامل میں لکھی اور ملیالم کے اسکالر M.Whish نے ملیالی ڈکشنری پر کام کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. فورٹ سینٹ جارج کالج کا شعبہ تعلیم کن شعبوں پر مشتمل تھا۔
2. کالج کے صدر شعبہ عربی و فارسی و ہندوستانی کون تھے؟
3. ''منشی'' کے لقب سے کون موسوم تھے؟
4. فورٹ سینٹ جارج کالج کے چند مشہور اساتذہ کے نام بتایئے۔
5. شمس الدین احمد نے ''حکایات الجلیلہ'' کے دیباچہ میں کیا لکھا ہے؟

16.6 شعبۂ تصنیف و تالیف

فورٹ سینٹ جارج کالج میں تصنیف و تالیف کا ایک علحدہ شعبہ تھا جہاں سے ہندوستانی (اردو) دکنی، عربی، فارسی اور دیگر مقامی زبانوں میں ادبی تصانیف کے علاوہ مختلف مفید اور دلچسپ موضوعات پر لکھی ہوئی کتابیں شائع ہوئیں قانون اور ریاضی کی متعدد کتابیں بھی کالج کی جانب سے طبع ہوئی تھیں۔ صرف و نحو، لغت، قواعد، داستان، تاریخ، سوانح اور اخلاقیات جیسے موضوعات پر دکنی میں خاص طور پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ اس کالج کی اردو مطبوعات و مخطوطات جو دستیاب ہوئے ہیں وہ زیادہ تر دکنی زبان میں ہیں۔ حکایات الجلیلہ ترجمہ الف لیلتہ ولیلہ، دکنی انوار سہیلی، سنگھاسن بتیسی، گلستان اور بعض دیگر کتابوں کی زبان کو ان کے مترجمین دکنی قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر مسعود حسین خان نے منشی ابراہیم بیجاپوری کی ''دکنی انوار سہیلی'' کو ''قدیم اردو کا آخری بڑا نثری کارنامہ قرار دیا ہے۔''

اس موقعہ پر اس کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ اس کالج کے بعض مصنفین جیسے سید تاج الدین اور منشی مظفر اپنی تصانیف کو دکنی کے بجائے ''کرناٹکی محاورہ'' سے موسوم کرتے ہیں ''ملکہ زماں و کام کندلہ'' کے مترجم نے بھی اپنی زبان کو ''کرناٹکی محاورہ'' سے موسوم کیا ہے۔ تامل ناڈو کا صوبہ پہلے صوبہ کرناٹک کہلاتا تھا اس لیے وہاں کی دکنی زبان 'کرناٹکی محاورہ'' سے موسوم کی جانے لگی تھی۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. فورٹ سینٹ جارج کالج کی جانب سے کن کن موضوعات پر کتابیں شائع ہوئیں؟
2. فورٹ سینٹ جارج کالج کی دکنی کی کون سی کتابیں بڑی مشہور ہیں؟
3. دکنی انوار سہیلی کے متعلق پروفیسر مسعود حسین خان نے کیا لکھا ہے؟

16.7 پریس

فورٹ سینٹ جارج کالج کا اپنا پریس (مطبع) بھی تھا جہاں سے اکثر کتابیں شائع ہوئی ہیں۔اس پریس سے سب سے پہلی کتاب ڈاکٹر ہنری ہیرس (Dr. Henry Harris) کی ہندوستانی زبان کا تجزیہ اور اس کی قواعد و لغت (Analysis Grammar & Dictionary of Hindustany Language) ہے جو 1791ء میں شائع ہوئی۔اس میں جنوبی ہند میں بولی جانے والی اردو یا دکنی الفاظ کا بھی اچھا ذخیرہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر ہنری ہیرس کا یہ کارنامہ گل کرسٹ کے کارنامے سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔مگر یہ لغت اب کم یاب بلکہ نایاب ہے۔اس کتاب کے علاوہ تراب علی نامی کی ''وسیط النحو''، منشی محمد ابراہیم بیجاپوری کی ''دکنی انوار سہلی'' سید امیر حیدر بلگرامی کی ''منتخب الصرف'' قاضی ارتضا علی خاں کی ''فرائض ارتفیہ'' اور ''نقود الحساب'' وغیرہ اسی کالج کے پریس سے شائع ہوئی تھیں

نصابی کتابیں کالج پریس کے علاوہ مقامی مطبعوں سے بھی شائع ہوئی تھیں۔چنانچہ مدراس کے مشہور مطبع ''اعظم الاخبار'' سے پانچ کتابیں دو جلدوں میں شائع ہوئی تھیں۔پہلی جلد میں اخلاق ہندی اور چہار درویش اور دوسری جلد میں اخوان الصفاء بکاولی اور گلستان نامی کتابیں شامل تھیں۔پھر مدراس کے قدیم مطبع ''جامع الاخبار'' سے بھی کتابیں علیحدہ علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہوئی تھیں۔اس مطبع سے فورٹ سینٹ جارج کالج کے طلبہ کے لیے رسالہ گلکرسٹ سرکیولر آرڈرس، رسالہ حروف تہجی، قانون خرد کوٹ مدراس، قواعد لشکری، گلستان سہ باب، میزان الحساب، عربی حکایت لطیفہ، تعلیم نامہ، صفت الحریر جیسی مفید کتابیں شائع ہوئی تھیں۔

''پرنٹنگ پریس ان انڈیا'' کے مصنف اے۔کے۔پرولکر کا بیان ہے کہ کنڑ اور تلگو زبان کی چھپائی کی ابتدا بھی فورٹ سینٹ جارج کالج کے مطبع سے ہوئی۔ 1820 میں اسی مطبع سے اے۔ڈی۔کیمبل (A.D. Campbell) کی تلگو زبان کی قواعد شائع ہوئی تھی

اپنی معلومات کی جانچ :

1. فورٹ سینٹ جارج کالج پریس سے سب سے پہلی شائع ہوئی کتاب کون سی تھی؟
2. ڈاکٹر ہنری ہیرس (Dr. Henry Harris) کی کتاب کا نام کیا تھا؟
3. کالج پریس کی چند کتابوں کے نام لکھیے۔
4. فورٹ سینٹ جارج کالج کی نصابی کتابیں کالج پریس کے علاوہ اور کہاں کہاں سے شائع ہوئیں؟

16.8 تصانیف پر انعام واکرام

فورٹ سینٹ جارج کالج کا انتظامی بورڈ اچھی تصنیف پر مصنف کی حوصلہ افزائی کرتا اور انہیں انعام واکرام سے نوازا کرتا تھا۔چنانچہ قاضی ارتضا علی خان کو ''نقود الحساب'' پر ایک ہزار ہُن انعام دیے گئے۔تراب علی نامی کو بھی ''وسیط النحو'' پر ایک معقول معاوضہ ملا تھا۔مہدی واصف کے مشہور عربی تذکرہ ''حدیقۃ المرام فی تذکرہ العلماء الاعلام'' سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاوضہ سات ہزار روپے تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے عہدہ داروں کو مقامی زبانیں سیکھ کر امتحان میں کامیابی حاصل کرنے پر انعام واکرام اور معقول خدمتوں سے سرفراز کرتی تھی۔چنانچہ گورنر مدراس سر ہنری پاٹنجر (Sir Henry Pottinger) نے سپریم گورنمنٹ کے حکم پر ایک اعلان ''یونیڈ سروس گزٹ'' میں شائع

کروایا تھا۔اس اعلان کو مدراس کے مشہور اردو اخبار ''اعظم الاخبار'' نے 22/اپریل 1852ء کو اس طرح شائع کیا تھا۔

''یونیڈ سروس گزٹ میں لکھا ہے کہ مدراس کے گورنر سر ہنری **پاٹنجر** صاحب بہادر سوپریم گورنمنٹ کے حکم موافق اس ملک کے تمامی شمشیر بند سرداروں کو اطلاع دیتے ہیں کہ اگر کوئی سرداران سات زبانوں میں سے دو زبان یا زیادہ سیکھ کر امتحان دیوے تو اس کو سرکار کی طرف سے ایک مشت ہزار روپے ملیں گے سوائے اس کے دے (دہ) لوگ معقول خدمتوں پر مامور ہووئیں گے۔''

مقامی زبانیں سیکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ نکلا کے فورٹ سینٹ جارج کالج کے اکثر سولجر (سپاہی) ہندوستانی (اردو) ہندی (دکنی) اور فارسی وغیرہ سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے اور روانی کے ساتھ ان زبانوں میں گفتگو کر سکتے تھے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. فورٹ سینٹ جارج کالج کے انتظامی بورڈ نے کن کن تصانیف کو انعام واکرام سے نوازا تھا؟
2. ایسٹ انڈیا کمپنی مقامی زبانیں سیکھنے اور امتحان پاس کرنے پر کیا کرتی تھی؟
3. گورنر مدراس سر ہنری پاٹنجر (Sir Henry Pottinger) نے کیا اعلان کیا تھا۔

16.9 کتب خانہ

فورٹ سینٹ جارج کالج کے تحت ایک شاندار کتب خانہ بھی تھا۔اس کتب خانہ کے کیٹلاگوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تامل، تلگو، کنڑی، مرہٹی، ملیالم، سنسکرت، بنگالی، اڑیا، ہندی، برمی اور جاری زبانوں کے ساتھ اردو و دکنی زبان کی بھی بے شمار کتابیں تھیں۔اس کتب خانہ کی بعض دکنی کتابوں کا تذکرہ حکیم شمس اللہ قادری نے بھی کیا ہے۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ''شیخ عین الدین گنج العلم کے رسائل نیز شمس العشاق اور شاہ میراں جی کی دکنی تصانیف گل باس وجل ترنگ فورٹ سینٹ جارج کالج کے کتب خانے میں موجود تھیں۔

ولیم ٹیلر (William Taylor) نے اس بے نظیر کتب خانے کے جملہ مخطوطات کے دو ضخیم کیٹلاگ (فہرست کتب) مدراس کے فورٹ سینٹ جارج گزٹ پریس سے شائع کیے تھے۔پہلی جلد جو (678) صفحات پر مشتمل ہے۔1857ء میں شائع ہوئی جب کہ دوسری جلد جس کے (864) صفحات ہیں۔1860ء میں طبع ہوئی۔ولیم ٹیلر نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ فورٹ سینٹ جارج کالج کے کتب خانہ میں مخطوطات کے تین شاندار ذخیرے تھے۔یہ ذخیرے (1) میکنزی (2) ایسٹ انڈیا ہاوس اور (3) براؤن کلکشن کے ناموں سے موسوم تھے۔کرنل میکنزی (Col Mackenzie) جو سرویر جنرل آف انڈیا کے عہدے پر فائز تھے۔ان کا ذخیرہ میکنزی کے نام سے مشہور ہوا۔یہ ذخیرہ بہت قیمتی سمجھا جاتا تھا۔ولیم ٹیلر نے اس ذخیرے کے بارے میں لکھا ہے:

''ہندوستان سے متعلق تاریخی دستاویزات کا اتنا بیش قیمت ذخیرہ یورپ یا ایشیا میں آج تک کسی فرد واحد نے جمع نہیں کیا۔''

غرض فورٹ سینٹ جارج کالج کی وجہ سے نہ صرف اردو زبان بلکہ دکنی زبان وادب کا نثری ادب پیدا ہوا اور اس کی اشاعت کے ذرائع بھی مہیا ہوئے اور طباعت کی سہولتوں کے باعث بہت ہی قلیل عرصہ میں یہاں کی کتابیں خاص و عام میں شوق سے پڑھی جانے لگیں۔اس طرح اس کالج کی بدولت آسان، سلیس اور عام فہم نثر نگاری کی ایک شاندار روایت قائم ہوئی۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. فورٹ سینٹ جارج کالج کے کتب خانے میں کن کن زبانوں کی کتابیں تھیں؟
2. حکیم شمس اللہ قادری نے فورٹ سینٹ جارج کالج کی کن دکنی کتابوں کا ذکر کیا ہے؟
3. فورٹ سینٹ جارج کالج کے کتب خانہ کی فہرست کس نے ترتیب دی تھی؟
4. فورٹ سینٹ جارج کالج کے کتب خانہ میں مخطوطات کے کون سے تین شاندار ذخیرے تھے۔

16.10 چند انگریز مصنفین

فورٹ سینٹ جارج کالج کے انگریز مصنفین میں ڈاکٹر ہنری ہارس (Henry Harris) الکسانڈر ڈنکسن کیمبل (E.D. Campbell)، تھامس روبک (Thomos Reobuck) کیپٹن گرین آوے (Capt. Greenaway) اور ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور (Edward Balfour) قابل ذکر ہیں۔ چند انگریز مصنفین کا ذکر درج ذیل ہے۔

16.10.1 ڈاکٹر ہنری ہیرس

ڈاکٹر ہنری ہیرس فورٹ سینٹ جارج اسکول رائٹرس کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ 1785ء میں افواج مدراس میں اسٹنٹ سرجن مقرر ہوئے۔ 1791ء میں انگریزی و ہندوستانی اور ہندوستانی و انگریزی لغت مع گرامر (Analysis, Grammar and Dictionary of Hindustanee Language) کے نام سے مدراس سے شائع کی۔ جو گل کرسٹ کی لغت سے بہتر ہے۔ گل کرسٹ نے اس لغت کی تیاری میں ڈاکٹر ہنری ہارس کی محنت اور عرق ریزی کی داد دی ہے اور لکھا ہے کہ یہ کتاب ہندوستانی زبان سے مولف کی کماحقہ واقفیت کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کرتی ہے۔

16.10.2 تھامس روبک

تھامس روبک فورٹ سینٹ جارج اسکول/رائٹرس کالج کے فیض یافتہ تھے۔ افواج مدراس کے ایک افسر تھے۔ لفٹنٹ سے کیپٹن کے درجے تک ترقی کی تھی۔ ان کو اردو زبان سے خاص دلچسپی تھی۔ انہوں نے متعدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں برٹش انڈیا مانیٹر (British India Monitor) کی دو جلدیں قابل ذکر ہیں۔ یہ کتاب مدراس سے شائع ہوئی تھی اور فورٹ سینٹ جارج کالج کے نصاب میں تھی۔ روبک کی ''لغت جہاز رانی'' بھی مشہور ہے اس میں بحریہ اور جہاز رانی کی تمام اصطلاحیں اور الفاظ انگریزی اور اردو میں دیے گئے ہیں۔ ایسے الفاظ اور جملوں کا بھی کثیر ذخیرہ ہے جو انگریزی کمانداروں کو میدان جنگ اور بارکس میں ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ بول چال میں کارآمد ہو سکتے ہیں۔ روبک کی ایک اور کتاب ترجمان ہندوستان (Hindustany Interpreter) بھی قابل ذکر ہے اس میں قواعد زبان اردو کے ابتدائی مسائل کا ذکر ہے یہ کتاب لندن اور پیرس سے شائع ہوئی ہے۔ اہل یورپ کو اردو زبان کی تحصیل میں ان کتابوں سے بہت مدد ملتی رہی ہے۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی ہندوستانی لغت میں تھامس روبک نے بھی دو سال کی رخصت لے کر ان کا ہاتھ بٹایا تھا۔ بعد میں تھامس روبک کی خدمات فورٹ ولیم کالج کلکتہ نے حاصل کر لیں۔

16.10.3 کیپٹن گرین اوے

گرین اوے (Greenaway) افواج مدراس میں کیپٹن کے عہدہ پر مامور تھے۔ ان کا تعلق فوج کی (46) چھالیسویں رجمنٹ سے تھا۔ وہ فورٹ سینٹ جارج کالج کے فارغ التحصیل تھے۔ دکنی میں مہارت تھی شاعر بھی تھے۔ ان کی ایک کتاب ''علی بابا چالیس چور'' دستیاب ہوئی ہے۔ جو اردو کا قدیم ترین اور دکنی کا اولین ڈراما ہے۔ یہ ڈراما 1852ء میں ''تعلیم الاخبار پریس'' مدراس سے شائع ہوا۔ 1984ء میں راقم الحروف نے اسے اپنے مقدمے کے شائع کر دیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے اس کی اشاعت پر لکھا کہ ''اب اندر سبھا' گوپی چند جالندھر' بلبل بیمار' خورشید' سجاد سنبل اور صولت عالم گیری اردو کے پہلے ڈرامے کے مقابلے سے خارج ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب اردو ڈرامے کی تحقیق میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔''

16.10.4 ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور

اردو داں طبقہ میں جس طرح کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے گلکرسٹ کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ اسی طرح مدراس کے فورٹ سینٹ جارج کالج کے ڈاکٹر ایڈورڈ بالفور کا نام بھی ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر بالفور فورٹ سینٹ جارج کالج سے بھی وابستہ رہے۔ وہ کالج کے بورڈ آف اگزامنر

کے ممبر بھی رہے۔ مدراس کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج کے لیے ایک انجمن ''مجمع علم و ہنر'' کے نام سے قائم کی تھی۔ کتب خانہ تمام اہل اسلام (محمڈن پبلک لائبریری) اور مدرسہ اعظم مدراس کے قیام میں بھی بالفور کا بڑا حصہ ہے۔ بالفور نے کئی کتابیں لکھیں جن میں درج ذیل قابل ذکر ہیں۔
(1) گلدستۂ سخن (2) کتاب علم نجوم (3) اردو اور انگریزی میں دنیا کے اعداد و شمار کا نقشہ (4) علم ہیئت کا رسالہ (5) رسالۂ علم کیمیا (6) اصول فن قبالت (Outlines of Midwifery) ''اصول فن قبالت'' اہل فرنگ کے طبیبوں کی پہلی کتاب ہے جس کا اردو میں ترجمہ ہوا۔ یہ کتاب ڈاکٹر بالفور کا ایک بہترین علمی کارنامہ ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. فورٹ سینٹ جارج کالج کے چند انگریز مصنفین کے نام بتایئے۔
2. ڈاکٹر ہنری ہیرس کی کتاب کا نام اور موضوع لکھیے۔
3. تھامس روبک کی کون سی کتاب مدراس سے شائع ہوئی؟
4. اردو کے پہلے مطبوعہ اور اولین دکنی ڈرامے کا نام اور اس کے مصنف کا نام لکھیے۔
5. ڈاکٹر بالفور کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

16.11 چند ہندوستانی مصنفین

فورٹ سینٹ جارج کالج کے ہندوستانی مصنفین میں تراب علی نامی، سید حسین شاہ حقیقت، حسن علی ماہلی، منشی غلام حسین معاون خان، مفتی محمد تاج الدین حسین خان بہجت، مرزا عبدالباقی وفا، مہدی واصف، سید تاج الدین، محمد خاں، منشی غلام دستگیر، منشی مظفر، منشی محمد ابراہیم بیجاپوری، منشی شمس الدین احمد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان مصنفین کا مختصر تذکرہ اور ان کی اہم تصانیف کا ذکر ذیل میں کیا گیا ہے۔

16.11.1 تراب علی نامی

تراب علی نامی کا شمار فورٹ سینٹ جارج کالج کے عالم و فاضل اساتذہ میں ہوتا ہے۔ انہیں جو اعزاز اور عزت بخشی گئی وہ شاید ہی کسی دوسرے استاد کو نصیب ہوئی ہو۔ غالب کے عزیز دوست علامہ فضل حق خیرآبادی کے والد علامہ فضل امام خیرآبادی، تراب علی نامی کے ہم سبق اور ہم عمر ساتھی تھے۔ نامی 1813ء میں فورٹ سینٹ جارج کالج سے وابستہ ہوئے اور اپنی وفات اکتوبر 1826ء تک کالج سے وابستہ رہے۔ وہ عربی فارسی اور اردو شعبے کے صدر تھے۔ عربی فارسی کی کئی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ شاہ حسین حقیقت نے 1801ء میں ''خزینۃ الامثال'' لکھی جس میں عربی اور اردو کے زبان زد امثال یکجا کیے گئے ہیں اس کتاب میں عربی امثال کا اردو ترجمہ تراب علی نامی کا کیا ہوا ہے۔ یہ کتاب 1854ء میں مطبع مصطفائی لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ تراب علی نامی نے سفرنامہ ایران عرب و عراق بھی لکھا ہے۔

16.11.2 سید حسین شاہ حقیقت

حقیقت بلخ (ترکستان) کے ایک ممتاز خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بریلی میں پیدا ہوئے چودہ پندرہ برس کی عمر میں لکھنؤ آئے اور جرأت کے ادبی حلقے میں داخل ہوئے۔ فورٹ سینٹ جارج کالج میں میر منشی تھے۔ 1833ء میں مدراس میں انتقال ہوا۔ کئی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں: (1) جذب عشق (عشقیہ داستان، فارسی سے ترجمہ) (2) تحفۃ العجم (فارسی لغت) (3) تذکرۂ احبا (4) خزینۃ الامثال (عربی فارسی اردو زبان زد امثال کا مجموعہ) (5) مثنوی ہشت گلزار (6) مثنوی میر امن طوطا (7) ہفت نسخہ (8) دیوان

حقیقت صاحب دیوان شاعر ہیں لیکن ان کا دیوان اب تک شائع نہیں ہوا۔

16.11.3 مہدی واصفؔ

فورٹ سینٹ جارج کالج کے ارباب قلم میں مہدی واصف بے حد مشہور ہیں وہ نہ صرف اردو، فارسی، عربی، ترکی، انگریزی، فرنچ بلکہ متعدد دیسی زبانوں جیسے تلگو، مرہٹی، تامل، ملیالم اور سنسکرت سے واقف تھے۔ وہ مختلف زبانوں کے ادیب، مصنف، مرتب اور مترجم تھے۔ ایک لغت نویس کی حیثیت سے بھی ان کی بڑی اہمیت ہے۔ مہدی واصف موصل (عراق) کے صدیقی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ 1802ء میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ فطری ذکاوت نے انہیں مختلف السنہ پر حاوی کیا تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد تراب علی نامی کے توسط سے سترہ سال کی عمر میں فورٹ سینٹ جارج کالج سے وابستہ ہوئے اور سترہ سال تک اپنی خدمات انجام دیں پھر وظیفہ لے کے اس کو چھوڑا۔ اس طرح مہدی واصف 1818ء سے 1835ء تک فورٹ سینٹ جارج کالج سے وابستہ رہے۔ پھر درس و تدریس اور تالیف و ترجمہ میں ہمہ تن مصروف رہے پھر نواب محمد غوث خان کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ محکمہ عالیہ میں مترجمے کی خدمات انجام دیں۔ 1855ء میں حیدرآباد آئے اور مدرسہ دارالعلوم میں عربی استاد کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔ آخر 1873ء میں حیدرآباد میں وفات پائی۔ ابو محمد عمر الیافعی کا بیان ہے کہ مہدی واصفؔ تقریباً تین سو کتابوں کے مصنف یا مولف تھے۔ واصفؔ نے ساری زندگی اپنے بزرگوں کی علمی روایات کے تسلسل کو آگے بڑھانے میں گزار دی۔

مہدی واصفؔ نے ''انگریزی، ہندوستانی اور فارسی لغت'' مرتب کی جو 1851ء میں مدراس سے شائع ہوئی 1843ء میں ''دلیل ساطع'' شائع ہوئی جو سنسکرت، ہندی، فارسی، اردو لغت ہے۔ 1851ء میں فارسی اردو لغت ''مناظر اللغات'' کے نام سے مرتب کی۔ 1844ء میں ''مجمع الامثال'' مرتب کی جو قدیم و جدید امثال پر ایک عمدہ کتاب ہے۔

مہدی واصف ایک قادر الکلام شاعر تھے ان کے دو دیوان ہیں ایک دیوان مسکین اور دوسرا نعتیہ دیوان ''روضۂ رضوان'' ہے یہ دونوں دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ واصفؔ کا فارسی دیوان ''دیوان واصفؔ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مہدی واصف فارسی اور اردو دونوں میں فکر سخن کرتے تھے فارسی میں واصف اور اردو میں مسکین تخلص کرتے تھے۔ وہ مثنوی گو بھی تھے۔ واصف ایک تذکرہ نویس بھی تھے فارسی میں معدن الجواہر اور عربی میں صدیقۃ المرام فی تذکرہ العلماء الاعلام ان کی یادگار ہیں انہوں نے کئی عربی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔

فورٹ سینٹ جارج کالج کے نصاب میں مہدی واصف کی فارسی حکایات دل پسند، لطائف عجیبہ اور حکایات نادرہ شامل تھیں۔ مہدی واصف نے عربی حکایات کا اردو ترجمہ ''حکایات لطیفہ'' کے نام سے کیا تھا۔ یہ کتاب فورٹ سینٹ جارج کالج کے بستدیان دکنی کے نصاب میں شامل تھی۔

مہدی واصف نے ضروریات زمانہ کو محسوس کر کے دینی اور اسلامی علوم کی مختلف کتابوں کو اردو میں منتقل کیا۔ مہدی واصف نے اردو زبان و ادب کی بڑی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ان کے ادبی کارنامے ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے۔

16.11.4 ابراہیم بیجاپوری

فورٹ سینٹ جارج کالج کے مصنفین میں منشی محمد ابراہیم بیجاپوری اپنے ترجمے ''دکنی انوار سہیلی'' کی وجہ سے خاص طور پر ممتاز و معروف ہیں۔ یہ ترجمہ فورٹ سینٹ جارج کالج کے فوجی افسروں کے لیے کیا گیا تھا اور فورٹ سینٹ جارج کالج کے انتظامی بورڈ کی جانب سے یہ کتاب کالج ہی کے پریس سے 1240 مطابق 1824ء میں شائع ہوئی تھی۔ دکنی انوار سہیلی جو چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ٹائپ حروف میں شائع ہوئی ہے۔ آخر میں فرہنگ ہے۔ انوار سہیلی ایک مقبول عام کتاب ہے اس کا دنیا کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کی حکایتوں نے ہر ملک کے شعر و ادب پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں اس کتاب میں حکومت کے رموز اور اخلاقی نصیحتوں کو کہانیوں کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ انوار سہیلی اگرچہ پند و موعظت، اخلاق و تہذیب پر لکھی ہوئی کتاب ہے لیکن اس کی تمام حکایتوں اور مثالوں کا مقصد ادب، تربیت اور تزکیۂ نفس ہے۔ دکنی انوار سہیلی اگرچہ ترجمہ ہے لیکن مترجم نے اس محنت اور خوبی سے ترجمہ کیا ہے کہ انہیں مترجم کے بجائے مولف کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ دکنی انوار سہیلی بقول منشی ابراہیم بیجاپوری مسلسل تین سال کی شبانہ روز کوچہ گردی، عرق ریزی اور جانفشانی کا نتیجہ ہے۔

16.11.5 منشی شمس الدین احمد

فورٹ سینٹ جارج کالج کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کالج کی جانب سے اردو میں پہلی بار الف لیلہ کی دو سو راتوں کا اردو ترجمہ شائع ہوا۔ اس کے مترجم اسی کالج کے ایک مشہور مدرس منشی شمس الدین احمد تھے۔

منشی شمس الدین مولوی عبدالرحیم کے فرزند اور قصبہ سعادت بندر کے متوطن تھے یہ قصبہ ساحل مدراس سے جانب جنوب (39) کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ مقام آج کل موضع کولم (Covelong) ضلع جنگل پیٹ کے نام سے مشہور ہے نواب ارکاٹ سعادت اللہ خان کی وجہ سے اس قصبہ کا نام سعادت بندر رکھا گیا قصبہ مذکور صحابیٔ رسول ﷺ حضرت تمیم انصاریؓ کے مزار اقدس کی وجہ سے مشہور و معروف ہے۔ منشی شمس الدین احمد کی تعلیم و تربیت سعادت بندر میں ہوئی تھی وہ عربی، فارسی اور اردو کے ماہر تھے انگریزی بھی اچھی جانتے تھے۔ اپنی نوجوانی ہی میں وہ فورٹ سینٹ جارج کالج سے وابستہ ہو گئے تھے۔ جس زمانے میں انہوں نے الف لیلہ کا ترجمہ کیا اس وقت انہیں کالج میں ملازم ہوئے تیس سال ہو چکے تھے۔

منشی شمس الدین احمد کی ''حکایات الجلیلہ ترجمہ الف لیلتہ ولیلہ کی پہلی جلد 1836ء میں شائع ہوئی اس میں داستان الف لیلہ کی سو راتوں کا عربی سے اردو میں راست ترجمہ ہے۔ اس کی دوسری جلد بھی اسی کالج کی جانب سے 1839ء میں مدراس ہی سے شائع ہوئی۔ اس میں بھی سو راتوں کا تذکرہ ہے۔ ''حکایات الجلیلہ'' کا ماخذ شیخ احمد بن محمود کی عربی الف لیلہ ولیلتہ ہے یہ کتاب 1818ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ منشی شمس الدین احمد کی ''حکایات الجلیلہ'' اتنی مقبول ہوئی کہ اسے فورٹ سینٹ جارج کالج کے نصاب میں شامل کیا گیا اور ساتھ ہی مزید راتوں کے ترجموں کا سلسلہ چل پڑا۔ ''حکایات الجلیلہ'' صرف اس لیے اہم نہیں ہے کہ یہ دکنی نثر میں لکھی گئی ہے بلکہ اس کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ یہ الف لیلہ جیسی مشہور و معروف داستان کا پہلا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب آمان سلیس اور بامحاورہ دکنی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس پر ترجمہ سے زیادہ تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔

16.11.6 منشی مظفر

فورٹ سینٹ جارج کالج کے بالکل غیر معروف منشیوں میں ایک منشی مظفر بھی ہیں انہوں نے 1814ء میں ''حیدر نامہ'' تصنیف کیا تھا جو میسور کے فرماں روا نواب حیدر علی خان کے حسب نسب ان کے حالات زندگی اور عروج کی داستان ہے اس میں ٹیپو سلطان شہید کے بھی حالات بیان کیے گئے ہیں۔ مظفر نے یہ تمام واقعات سنہ وار قلم بند کیے گئے۔ حیدر نامہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں اور دوسرا سالار جنگ لائبریری میں موجود ہے۔ مظفر کی زبان اپنے بعض ہم عصروں کے مقابلے میں قدیم محسوس ہوتی ہے لیکن ان کی عبارتیں بے ساختہ ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ :

1. فورٹ سینٹ جارج کالج کے چند مشہور ہندوستانی مصنفین کے نام لکھیے۔
2. تراب علی نامی کون تھے؟
3. سید حسین شاہ حقیقت کی کتابوں کے نام لکھیے۔
4. مہدی واصف نے کن زبانوں کی ڈکشنریاں مرتب کیں؟ ان کے نام بتائیے۔
5. دکنی انوار سہیلی کب اور کہاں سے شائع ہوئی اس کے مترجم کون تھے؟
6. داستان الف لیلہ کا پہلا اردو ترجمہ کس نام سے ہوا اس کے مترجم کون تھے؟
7. ''حیدر نامہ'' کیا ہے؟ اس کے مصنف کون ہیں؟

16.12 خلاصہ

شمالی ہند میں جس طرح فورٹ ولیم کالج کلکتہ ایک اہم علمی مرکز تھا اسی طرح جنوبی ہند میں فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس بھی ایک اہم علمی

ادارے کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔فورٹ سینٹ جارج کالج کا ذکر اردو ادب کے مورخین نے نہیں کیا حالانکہ یہ کالج انیسویں صدی کے تین چار دہوں تک دکنی اردو کی ترویج اور اشاعت کا ایک اہم مرکز تھا۔اس کالج کے مقاصد بھی وہی تھے جو فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے تھے۔ان دونوں اداروں کا مقصد جونیر سیول ملازمین کی تعلیم وتربیت اور انہیں ہندوستانی زبانوں سے واقف کروانا تھا۔

فورٹ ولیم کالج پر فورٹ سینٹ جارج کالج کو ایک طرح سے تفوق حاصل تھا وہ یہ کہ یہاں ادب کے ساتھ قانون' ریاضی اور عربی و فارسی و دکنی کے علاوہ دوسری ملکی زبانوں کی بھی تعلیم دیجاتی تھی۔اس لیے یہاں صرف منشی (رائٹر) ہی نہیں آتے تھے بلکہ وکلا،اور ججوں کو بھی تربیت دی جاتی تھی۔

فورٹ ولیم کالج کی طرح فورٹ سینٹ جارج کالج کے قیام کا مقصد بھی اہل ہند کا فائدہ نہیں تھا بلکہ کمپنی تجارتی اور حکومتی اغراض کے لیے اپنے ملازمین کو ہندوستانی زبانوں' ہندوستانی رسم ورواج اور ہندوستانی طور طریقوں سے واقف کروانا چاہتی تھی۔

ہندوستان کی تاریخ کا یہ وہ زمانہ ہے جب کہ سلطنت مغلیہ کے اقتدار کو زوال آچکا تھا سرکاری زبان کی حیثیت سے فارسی کی وہ منزلت باقی نہیں رہی تھی جو مسلمانوں کے عروج واقبال کے زمانے میں تھی۔اس وقت سارے ہندوستان میں اردو ہی ایک ایسی زبان تھی جو عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے دوسری ملکی زبانوں کے مقابلے میں اردو کی زیادہ سرپرستی کی اور جہاں فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی میں کتابیں تیار کی جارہی تھیں وہیں فورٹ سینٹ جارج کالج میں اردو کی قدیم شکل ''دکنی'' کا پرچار ہورہا تھا اور اس کی توسیع واشاعت سے خاطر خواہ دلچسپی لی جارہی تھی۔

انگریزوں نے اردو میں اپنے ادب کو منتقل کرنے کے بجائے فارسی اور سنسکرت وغیرہ کی مقبول کتابوں کا دکنی میں ترجمہ کروایا اسکی وجہ یہ تھی کہ ایک طرف تو خود اہل ہند خصوصاً دکن اور جنوبی ہند کے لوگوں کے ذریعے ان میں دلچسپی لی جاتی تھی اور دوسری طرف دکن اور جنوبی ہند کے مذاق وخیالات کو سمجھنے میں ان سے کافی مدد مل سکتی تھی۔اس طرح کمپنی کے زیر اثر ہندوستان میں اور خصوصاً دکن اور جنوبی ہند میں اردو نثر نگاری کی تحریک آگے بڑھی۔اردو نثر کے فروغ واشاعت میں انگریزوں کا جو حصہ رہا اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے فورٹ سینٹ جارج کالج کو بالکل افادی بنیاد پر قائم کیا تھا نظمائے کمپنی کا اصل منشا مدراس میں چند ارباب قلم کو یکجا کر کے ان سے اپنے انگریز اہل کاروں اور عہدہ داروں کے لیے ایسی سلیس درسی کتابیں لکھوانا تھا جن کا انداز بیان شاعرانہ' نزاکتوں اور لفظی موشگافیوں کی بجائے سیدھا سادہ اور عام فہم ہو۔کالج کے ارباب مقتدر نے چونکہ عربی' فارسی اور دیسی زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی اور دکنی زبانوں کو بھی نصاب میں شامل کیا تھا اس لیے فورٹ سینٹ جارج کالج کی طرف سے ان تمام زبانوں کی کتابوں کی اشاعت عمل میں آتی رہی۔اگر چہ کہ فورٹ سینٹ جارج کالج کے قائم ہونے سے پہلے ہی صوبہ کرناٹک (تامل ناڈو) میں اردو تصانیف کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا لیکن کوئی باقاعدہ اور منظم تحریک موجود نہ تھی۔مصنفین اپنے طور پر تصنیف وتالیف میں مصروف تھے اور نثر کے مقابلے میں نظم کی طرف اہل قلم زیادہ مائل تھے۔فورٹ سینٹ جارج کالج کی ذمہ دار شخصیتوں نے سلیس اور عام فہم نثر نگاری کا مقصد متعین کر کے کام شروع کیا تھا وہ کالج کے اساتذہ سے آسان زبان میں کتابیں لکھوا رہے تھے اس طرح فورٹ سینٹ جارج کالج جنوبی ہند کا وہ پہلا علمی وادبی ادارہ تھا جو دکنی زبان میں فروغ واشاعت کے لیے باقاعدہ اور منظم طریقے پر کام کررہا تھا۔اس طرح اس کالج نے آسان' سلیس اور عام فہم نثر نگاری کی ایک شاندار روایت قائم کردی۔بقول پروفیسر رفیعہ سلطانہ:

''یہ دکنی زبان وادب کا وہ اہم ادارہ تھا جس کو تاریخ ادب میں جگہ نہیں ملی۔لیکن جس نے زبان وادب کی مشاطگی میں حسب حیثیت حصہ لیا تھا''

غرض ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں اردو زبان نے بڑی مقبولیت حاصل کرلی تھی اور انگریز حکمرانوں کی دلچسپی کی وجہ سے بھی اس زبان کو مقبولیت حاصل ہورہی تھی۔ کرومنڈل سے مالابار تک ہر جگہ اردو بولی جاتی تھی۔

16.13 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے۔

1. فورٹ سینٹ جارج کالج کے انگریز مصنفین کی خدمات پر رشنی ڈالیے۔

2. فورٹ سینٹ جارج کالج کے ہندوستانی مصنفین کی خدمات پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔
3. فورٹ سینٹ جارج کالج کی اردو خدمات پر ایک جامع مضمون لکھیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. فورٹ سینٹ جارج کالج کے قیام کی وجوہات اور مقاصد پر روشنی ڈالیے
2. فورٹ سینٹ جارج کالج کے شعبۂ تعلیم اور شعبۂ تصنیف وتالیف پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. فورٹ سینٹ جارج کالج کے پریس اور کتب خانہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ مختصراً لکھیے۔

16.14 فرہنگ

الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی
ودیاساگر	=	علم کا سمندر، بحرالعلوم	سامراجی	=	شہنشایت پسند۔شہنشاہی حکومت کا حامی			
منشی	=	رائٹر (Writer)	سیول	=	کشوری	ملٹری	=	فوجی
بادی النظر	=	سرسری نظر سے، ابتدائی نظر میں، دیکھتے ہی				فاضل فرزانہ	=	زیادہ پڑھا ہوا، عاقل، دانا
بلدہ	=	شہر، نگر، قصبہ	مخزن	=	خزانہ، گودام	مطبع	=	پریس
وے	=	وہ	عرق ریزی	=	کمال محنت، نہایت ہی جانفشانی	السنہ	=	لسان کی جمع، زبانیں

16.15 سفارش کردہ کتابیں

1. افضل الدین اقبال
   1) مدراس میں اردو ادب کی نشو ونما
   2) فورٹ سینٹ جارج کالج، دکنی زبان وادب کا ایک اہم مرکز
   3) ایسٹ انڈیا کمپنی کے علمی ادارے، فورٹ ولیم کالج وفورٹ سینٹ جارج کالج تقابلی وتنقیدی جائزہ
2. رفیعہ سلطانہ — اردو نثر کا آغاز وارتقا
3. سمیع اللہ — انیسویں صدی میں اردو تصنیفی ادارے

اکائی 17 : دلی کالج کی اُردو خدمات

ساخت

17.1 تمہید
17.2 دلی کالج
17.3 تصانیف، طلبہ، اساتذہ
17.4 خلاصہ
17.5 نمونہ امتحانی سوالات
17.6 فرہنگ
17.7 سفارش کردہ کتابیں

17.1 تمہید

اس اکائی میں ہم نے دلی کالج کے پس منظر، اس کے قیام اور اس کے انتظامیہ وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔ دلی کالج کے قیام کا مقصد، ہندوستانیوں کو انگریزی اور مغربی علوم سے واقف کرانا تھا۔ ہم نے اس سلسلے میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دلی کالج کے اساتذہ اور یہاں سے فارغ ممتاز طلبہ کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس بارے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظما اور حکومت کا کیا رویہ تھا یہ بھی واضح کیا گیا ہے۔ دلی کالج سے جن کتابوں کے ترجمے ہوئے اور جن کی اشاعت عمل میں آئی ان کی بھی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ غرض دلی کالج کی اردو خدمات کا ایک روشن منظر سامنے آتا ہے۔

17.2 دلی کالج

دلی کالج کے نام سے جس ادارے نے آگے چل کر ہندوستانی معاشرے میں ایک انفرادی اور امتیازی مقام حاصل کیا اس کی ابتدائی صورت غازی الدین خاں کے مدرسہ کی تھی۔ بانیِ سلطنتِ آصفیہ، حیدرآباد نظام الملک آصف جاہ اول کے والد میر شہاب الدین غازی الدین خاں فیروز جنگ ثانی گجرات کے صوبہ دار تھے۔ انھوں نے اپنی حیات میں بیرونِ دلی اپنے لیے ایک مقبرہ اور اُسی کے ساتھ ایک مسجد تعمیر کرائی تھی۔ غازی الدین خاں کا انتقال 1716ء میں احمد آباد میں ہوا۔ ان کی تدفین اسی مقبرہ میں عمل میں آئی۔ بات آئی گئی ہو جاتی لیکن ان کی وفات کے کوئی پون صدی بعد یعنی 1792ء میں اس عمارت میں ایک مدرسہ کا قیام عمل میں آیا جو غازی الدین خاں کا مدرسہ کہلایا۔ اس مدرسہ میں دینیات، عربی اور فارسی کی تعلیم کا انتظام تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ انگریز جو تاجر کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے۔ اب حکومت کے معاملات اور عوام کے سیاہ وسفید میں بھی دخیل ہو چکے تھے۔ انھیں ہندوستانیوں پر اپنی گرفت اور مضبوط کرنے کی بھی فکر تھی اور وہ یہاں عیسائیت کی تبلیغ بھی چاہتے تھے لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظما نے نہایت محتاط رویہ اختیار کر رکھا تھا بلکہ ایک طرح کمپنی کے نظما میں اس بارے میں اختلافِ رائے بھی پایا جاتا تھا۔ چنانچہ 1793ء میں ولیم ولبرفورس کی یہ تجویز مسترد کر دی گئی کہ ہندوستان کو ایسے افراد روانہ کیے جائیں جو مدرس اور مشنریوں کے فرائض انجام دے سکیں۔ بعد ازاں قطِ بنگال کے زمانے میں چارلس گرانٹ نے ہندوستان میں نظام حکومت انگریزی میں چلانے کے علاوہ یہاں کے مدارس میں انگریزی ذریعہ تعلیم کی تجویز کی جس کو ایسی قبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ البتہ 1797ء میں اس بات کی اجازت دی گئی کہ عیسائی مبلغین ہندوستان جا کر تبلیغ کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ انگریزی کی تعلیم کا سوال تو یہاں نہیں اٹھا لیکن فارسی سنسکرت اور عربی کے قدیم نسخوں کو محفوظ کرنے اور ان زبانوں میں تعلیم کی گنجائش پر

زور دیا گیا۔ 1813ء میں اس نوع کی تجاویز اور بھرپور طریقہ کے ساتھ سامنے آئیں کہ ہندوستان میں علم وادب کے فروغ کے لیے کام کیے جائیں' ہندوستان کے اہل علم اصحاب کی ہمت افزائی کی جائے اور سماجی اور سائنسی علوم کی یہاں ترویج واشاعت ہو۔ یہ تجاویز کامیاب ہو جائیں لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کی آپسی چپقلش نے ان کو روبہ عمل لانے نہیں دیا۔ اس پس منظر میں دلی کالج کی شروعات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ 17 جولائی 1823ء کو مجلس تعلیمات عامہ کا قیام عمل میں آیا جس نے انگلستان کو رپورٹ روانہ کرتے ہوئے ہندوستان کی خستہ تعلیمی حالت کو اجاگر کیا۔ ٹیلر نے بتایا کہ شہر میں اول تو تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہیں اور جیسا بھی ہے مالیہ کی کمی کے باعث اس کی حالت بُری ہے ہر چند کہ اہلِ علم اور علما و اساتذہ موجود ہیں لیکن مالیہ کی عدم فراہمی کے باعث ان کی خدمات سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔ یوں ایک طرف نئی نسل تعلیم سے بے بہرہ ہو رہی ہے تو علما اور اساتذہ بیروزگاری کا شکار ہیں۔ ٹیلر نے اتفاق ہی کہیے کہ اپنی رپورٹ میں غازی الدین حیدر خاں کے مدرسہ کا حوالہ دے دیا کہ اس مدرسہ کی حالت انتہائی خراب ہے۔ عمارت بھی خستہ ہے اور معیار تعلیم بھی پست۔ اس مرحلہ پر حالات نے یہ دلچسپ اور سازگار موڑ لیا کہ ٹیلر کی خدمات کو انگلستان سے منظوری حاصل ہوگئی بلکہ غازی الدین خاں کے مدرسہ ہی میں کالج کھولنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ یہ 1825ء کی بات ہے کہ غازی الدین خاں کا مدرسہ دلی کالج میں تبدیل ہوگیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سفارش پر پارلیمنٹ نے ہندوستان میں تعلیم کے لیے ایک لاکھ روپے کی منظوری بھی دیدی۔ اس کے علاوہ (7115) روپے مدرسہ کی عمارت میں ترمیم وغیرہ کے لیے بھی دیے۔ اس رقم میں سے دلی کالج کے لیے ماہانہ (500) روپے مقرر کیے گئے اور جب انگریزی شعبہ قائم ہوا تو یہ رقم ماہانہ (750) روپے ہوگئی۔ خود جوزف ہنری ٹیلر اس مدرسہ کے پرنسپل مقرر ہوئے اور ان کی تنخواہ (175) روپے ماہانہ قرار پائی۔ صدر مولوی کی تنخواہ (120) روپے اور دو مولویوں کے لیے (50) (50) روپے۔ دیگر مولوی فی کس (25) اور (20) روپے کے تھے۔ طلبہ کے لیے وظائف مقرر ہوئے اور کالج کی سرگرمیوں میں باضابطگی آئی۔ سالانہ رپورٹ باقاعدہ مجلس تعلیمات عامہ کو روانہ کی جانے لگی جس میں اساتذہ کی کارکردگی' سالانہ امتحانات کے نتائج اور دوسرے امور درج ہوتے تھے۔ انگریزی شعبہ کے قیام سے عام مسلمانوں میں شکوک وشبہات پیدا ہوئے کہ یہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی سازش ہے۔ چنانچہ نواب اعتمادالدولہ سید فضل علی خاں بہادر' وزیر بادشاہ اودھ نے جو دل میں قوم کا درد رکھتے تھے انگریزی حکومت کو ایک لاکھ ستر ہزار کی خطیر رقم حوالہ کرتے ہوئے تجویز کی کہ اس رقم کو جو وقف کی صورت میں ہوگی۔ حکومت کے (5) فیصد والے سود میں لگایا جائے اور اس کی آمدنی سے دلی میں مسلمانوں کے لیے ایک درس گاہ قائم کی جائے۔ حکومت نے اس رقم کو قبول کرلیا لیکن علحدہ درس گاہ کا قیام عمل میں نہیں آسکا اور طے پایا کہ اس رقم کا منافع دلی کالج کے مشرقی علوم کے طلبہ کے لیے صرف کیا جائے گا اور نواب صاحب گورنمنٹ کالج کے مہتمم یا افسر سمجھے جائیں گے اور پروفیسروں اور طلبہ کا انتخاب ان کے نام سے ہوگا۔ نواب صاحب کا انتقال 1830ء میں ہوا۔ انھوں نے اس وقف کا نگراں اپنے داماد سید حامد علی خاں کو مقرر کیا تھا تاکہ حکومت کو وقتاً فوقتاً توجہ دلائی جائے لیکن نہ تو پروفیسروں اور طلبہ کا انتخاب ان کے نام سے ہوا اور نہ وظائف ان کے نام سے دیے گئے حتیٰ کہ کالج میں ان کی کوئی یادگار بھی قائم نہیں کی گئی۔ ہوا تو بس یہ کہ اس رقم سے کالج کی آمدنی میں اضافہ ہوا اور حامد علی خاں کالج کمیٹی کے رکن ہوئے۔ انگریزی شعبہ کے قیام کی وجہ سے بہت واویلا مچا یہاں تک کہ انتظامیہ کو برائے نام ہی سہی انگریزی جماعت مشرقی شعبہ سے علحدہ کردینی پڑی کیونکہ دونوں کے پرنسپل بھی ایک تھے اور کالج بھی ایک اور کالج کی کمیٹی بھی ایک۔ بر سبیل تذکرہ اس کا ذکر ہوجائے کہ انگریزی شعبہ کی مخالفت کے باوجود انگریزی پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا 1831ء میں یہ تعداد (300) تک پہنچ گئی تھی۔

دلی کالج کے مشرقی اور مغربی شعبوں میں ہمیشہ ہی رسہ کشی رہی تھی۔ مشرقی شعبہ کے نزدیک علم وادب سے مراد مشرقی علوم اور ادبیات تھے۔ وہ انگریزی سے بغض رکھتے تھے ان کا کہنا تھا کہ مغربی علوم کو مشرقی زبانوں میں ترجمہ کرکے پیش کیا جانا چاہئے جب کہ مغربی شعبہ کا موقف تھا کہ مغربی علوم کو مشرقی زبانوں میں پیش کیا نہیں جاسکتا۔ انھیں انگریزی ہی میں پڑھا جانا چاہیے۔ 1834ء میں جب لارڈ میکالے ہندوستان آئے اور مجلسِ تعلیماتِ عامہ کے صدر نشین ہوئے تو مغربی شعبہ کا پلہ بھاری ہوگیا۔ میکالے نے اپنی سفارشات میں عربی اور سنسکرت کی کتابوں کی اشاعت مسدود کردینے مدرسہ عالیہ کلکتہ اور سنسکرت کالج بنارس کو بند کردینے' دلی کالج کے طلبہ کو وظایف کی اجرائی روک دینے اور رقم سے دیگر شہروں میں انگریزی پڑھائے جانے والے مدارس کھول دینے پر زور دیا۔ ایسا نہیں کہ مشرقی شعبہ کمزور تھا۔ لیکن ان کی آواز موثر نہ ہوئی اور لارڈ میکالے کی تجاویز منظور

ہوگئیں اور 1835ء سے ان پر عمل بھی شروع ہوگیا۔ مغربی شعبہ کی مخالفت کی وجہ سے عربی، فارسی اور سنسکرت کو نظر انداز کرتے ہوئے ان زبانوں کی تعلیم اردو میں ہوتی رہی اور دلی کالج کا ذریعۂ تعلیم اردو برقرار رہا۔ ریاضی، سائنس، فلسفہ، تاریخ، اخلاقیات اور دیگر مضامین اردو میں پڑھائے جانے لگے اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ دیسی زبانوں کے طالب علم اپنی تعلیم ترک کرنے پر مجبور ہوئے لیکن یہ صورتِ حال تادیر قائم نہیں رہی کہ 1836ء میں جب لارڈ آک لینڈ گورنر جنرل ہو کر آئے تو انھوں نے ایسی تعلیمی پالیسی اختیار کی کہ دونوں گروہ، مشرقی اور مغربی مطمئن ہوگئے۔ انھوں نے صاف صاف مشرقی مدارس میں مشرقی تعلیم کی ترقی و توسیع کی حمایت کی۔ انھوں نے اعلیٰ قابلیت کے حامل مدرسین کو معقول تنخواہوں کے ساتھ مامور کیا طلبہ کو وظائف جاری کیے۔ اور مشرقی زبانوں کی مفید کتابوں کی اشاعت کی پرزور حمایت کی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مشرقی مدارس کے لیے مختص رقم انہی مدارس پر صرف کی جائے اور جو رقوم تاحال ادا نہیں کی گئی ہیں وہ ادا کر دی جائیں لیکن کتابوں کی قلت اور ان کی عدم دستیابی ایسے اسباب تھے کہ مغربی علوم کی تدریس دیسی زبانوں میں ممکن نہ ہوسکی حتیٰ کہ سنسکرت، عربی اور فارسی بھی انگریزی میں پڑھائے جانے لگے۔ گویا دیسی زبانوں کی کسمپرسی دیدنی تھی۔ ایسے میں مختلف رکاوٹوں کے باوجود ایک دلی کالج ہی تھا جہاں مغربی علوم مثلاً ہیئت، ریاضی اور فلسفہ وغیرہ کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ 1876ء کی رپورٹ میں صراحت کے ساتھ درج ہے کہ عربی اور فارسی کے علاوہ سائنس کی جماعتیں بھی تھیں اور سائنس کے مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے اور ریاضی، فلسفہ اور تاریخ وغیرہ جیسے مضامین میں شعبہ انگریزی کے طلبہ کے مقابلہ میں اردو طلبہ کا معیار اونچا تھا جس کی اس وقت کے ڈپٹی کلکٹر اور رکن لوکل کمیٹی دلی کالج اور سکریٹری کونسل آف ایجوکیشن بنگال نے بھی ستائش کی۔ 40-1839ء کی رپورٹ سے بھی ظاہر ہے کہ ''اردو کی جماعتوں کی ترقی قابل تعریف ہے''۔

1841ء کی بات ہے کہ فیاکس بتروس اس کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہ نہایت قابل ہی نہیں اردو کے تعلق سے نہایت ہمدرد شخص تھے۔ انھوں نے کتابوں کی قلت کو دور کرنے کے لیے 1841ء میں ایک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد جملہ علوم وفنون کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا بھی تھا۔ اس کمیٹی نے آگے چل کر اور نام بھی اختیار کیے لیکن اس کا مقصد بہر کیف ترجمے کے اصولوں کی تدوین تھا۔ کوشش یہ تھی کہ ترجمے سہل اور آسان زبان میں ہوں۔ اس اندیشہ سے کہ کہیں ہندوستانیوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے ان ترجموں پر مولویوں اور پنڈتوں سے نظر ثانی بھی کرالی جاتی تھی۔ بتروس نے ایک کام اور یہ کیا کہ اردو اور انگریزی کے شعبوں کو ملا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک اردو اور انگریزی کو قریب نہیں لایا جائے گا اردو والوں کے دلوں میں انگریزی اور انگریزوں سے اپنائیت کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ وہ چاہتے تھے کہ دلی کالج کے تعلیم یافتہ افراد کو یہیں ملازمت بھی ملے، وغیرہ۔ مجموعی طور پر بتروس کی کوشش سے اردو والوں کو فائدہ ہی ہوا۔ بتروس سے ممکن ہے اور فائدے بھی ہوتے لیکن اپنی علالت کے باعث 1849ء میں دو سال کی رخصت لے کر وہ انگلستان واپس ہوگئے۔ ان کا پھر ہندوستان آنا نہیں ہوا۔ اور اسی سال ان کی جگہ الوائس اسپرنگر کا تقرر ہوا۔ اسپرنگر نے فارسی اور عربی کی طرف توجہ دی۔ ان کے دور میں کئی معیاری کتابیں لکھی گئیں۔ سرسید نے ''آثار الصنادید'' اور ماسٹر رامچند رنے ''فوائد الناظرین'' انہی کی ایما پر شائع کیا۔ اسپرنگر نے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے مشرقی اور مغربی شعبوں کا انضمام عمل میں لایا اور نصابِ تعلیم بھی یکساں کر دیا گیا۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ اردو تعلیم کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ انگریزی شعبہ کے طلبہ نے بھی اردو تعلیم سے دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس شعبہ کے 240 میں سے 31 طلبہ اردو پڑھتے تھے اور مجموعی طور پر 460 طلبہ میں سے 418 طلبہ اردو پڑھنے والے تھے۔ اردو طلبہ کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہونے لگا۔ اردو کے شعبۂ سائنس میں نیچرل فلاسفی اور مخلوط ریاضی پر بھی اردو میں لکچروں کا اہتمام کیا گیا اور پھر جلد ہی فارسی طلبہ کے لیے اردو پڑھنا لازمی قرار پایا۔ اور جب اردو شعبے کو علیحدہ قائم کرنے کی تجویز رکھی گئی تو اس وقت کے لفٹنٹ گورنر نے اس تجویز کی بھرپور ستائش کی اور تمام طلبہ اردو میں درس پانے لگے۔ 1856ء تک یہی صورتِ حال رہی لیکن 1857ء کی جنگ آزادی میں سب کچھ لٹ لٹا گیا۔ کتب خانہ تباہ ہوگیا۔ کئی اساتذہ مارے گئے یا ادھر ادھر ہوگئے۔ آخر کار کالج بند ہوگیا اور پھر کہیں 1864ء میں اس کی تقدیر جاگی۔ حالات بتدریج سنبھلتے گئے لیکن نئے موڑ سامنے آئے۔ اردو زبان میں تالیف و ترجمہ پر کم توجہ دی جانے لگی۔ حتیٰ کہ اپریل 1877ء میں اس کالج نے دم توڑ دیا اور اس کو لاہور کالج میں ضم کر دیا گیا اور دلی کالج کی روایت تاریخ کا ایک حصہ بن گئی۔

اپنی معلومات کی جانچ:

نوٹ: ہر سوال کا جواب دو، تین سطروں میں دیجیے۔

1. دلی کالج کے قیام کی تجویز کس نے کی اور یہ کہاں قائم ہوا۔
2. دلی میں مسلمانوں کے لیے ایک درس گاہ قائم کرنے کی تجویز کس کی تھی۔
3. بتروس کی تجاویز لکھیے۔

17.3 تصانیف، اساتذہ، طلبہ

دلی کالج اور اس نوعیت کے اداروں میں یہ چیز اہمیت رکھتی ہے کہ درسی کتب بروقت تیار اور طلبہ کو دستیاب ہوں، دیسی زبانوں کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کی مخالفت کرنے والوں کا بڑا اعتراض یہی ہوتا ہے کہ ان زبانوں میں درسی کتب نہیں ہیں اور ہیں بھی تو ان کا معیار پست ہوتا ہے۔ چنانچہ اس دقت کا سامنا کرنے کے لیے دلی کالج کے خصوص میں 1835ء میں سرکاری تعلیمی کمیٹی قائم کی گئی۔ ہر چند کہ اس سے قبل اسکول بک سوسائٹی نے بہت سی مفید کتابیں اردو میں شائع کی تھیں لیکن یہ ابتدائی نوعیت کی تھیں۔ تھوڑی بہت رکاوٹوں کے بعد لارڈ اکلینڈ نے تعلیمی کتابوں کے ترجمے کی طرف توجہ دلائی اور اس مقصد کے لیے 1841ء میں ایک ذیلی کمیٹی بھی قائم کی گئی۔ جس کا دائرہ کار صرف ونحو پر کتابوں کی تیاری اور اس کے لیے اہل اشخاص کا انتخاب قرار پایا۔ اس بارے میں سب نے اتفاق کیا کہ درسی کتابیں پہلے انگریزی میں لکھوائی جائیں اور پھر ان کا ترجمہ اردو اور دیگر زبانوں میں ہو۔ ضروری کتابوں کی ایک فہرست بھی تیار کی گئی جن میں دیسی زبان کی ریڈریں، ہندوستان کے بعض اضلاع کے حالات، تاریخ بنگلہ، ہندوستان کی عام تاریخ اور اخلاقی تعلیم پر ایک رسالہ وغیرہ شامل تھے۔ لیکن اس سمت عملی طور پر کوئی خاص پیشرفت نہیں ہوئی۔ البتہ جلد ہی ایک اور انجمن، ''انجمن اشاعتِ علوم بذریعہ السنہ ملکی'' کا قیام عمل میں آیا جس کے مقاصد میں یہ باتیں شامل تھیں کہ عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی سے اعلیٰ درجہ کی کتابیں اردو بنگالی اور ہندی میں ترجمہ کی جائیں۔ اسی انجمن نے انگریزی سے اردو میں ترجمے کے لیے چند قواعد بھی مرتب کیے مثلاً سائنس کا ایسا لفظ جس کا مترادف اردو میں نہیں مثلاً سوڈیم، کلورین وغیرہ تو ایسے لفظ کو من وعن اردو میں لے لینے میں تکلف نہ ہونا چاہیے۔ اسی طرح ایسے خطابات اور القاب وغیرہ جن کے مساوی خطابات اور القاب اردو میں نہیں پائے جاتے مثلاً ڈیوک، بشپ اور رول وغیرہ انھیں بھی اسی طرح اردو میں لے لیں۔ اس کے علاوہ سائنس کا ایسا لفظ جس کا مترادف اردو میں پایا جاتا ہو تو اردو کا لفظ ہی استعمال کرنا چاہیے جیسے آئرن کے لیے لوہا اور منسٹر کے لیے وزیر وغیرہ۔ اسی طرح مرکب الفاظ کے تعلق سے بھی قاعدے تدوین کیے گئے۔ ویسے اس امر پر خاص طور پر زور دیا گیا کہ انگریزی الفاظ کے استعمال سے ممکنہ طور پر گریز کیا جانا چاہیے۔ اسی طرح یہ بات بھی واضح کی گئی کہ ترجمہ لفظ بہ لفظ نہ ہو بلکہ ترجمہ کا مقصد جملے کے معنی ومطلب کو صحیح طور پر ادا کرنا ہو۔ اس کمیٹی سے فائدہ اردو کو زیادہ ہوا۔ اگرچہ انجمن اردو، بنگالی اور ہندی میں ترجموں کے لیے قائم کی گئی تھی لیکن اردو کے سوائے کسی اور زبان میں ترجمے نہیں ہوئے۔ اس موقع پر یہ بھی کہا گیا کہ اردو ترجموں کے لیے سب سے موزوں جگہ دلی کالج ہے کیونکہ اردو صوبہ جات مغربی اور بہار میں سرکاری زبان ہے اس لیے اس کی اہمیت ہندی سے زیادہ ہے۔ اس زمانے میں اردو ہی میں سب سے زیادہ کتابیں مرتب اور شائع ہوئیں اور شروع ہی سے اس انجمن پر دلی کالج کی گرفت مضبوط رہی۔ بتروس کی پرنسپل شپ کا دور خاص طور پر اردو کے حق میں سازگار رہا کہ 1841ء سے انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہونا شروع ہوا۔ اچھے ترجموں پر معاوضہ بھی دیا جانے لگا۔ اور جب کسی انگریزی درسی کتاب کا اردو میں ترجمہ ہو جاتا اور اس کی اشاعت عمل میں آتی تو اس کی حیثیت وہی ہوتی جو اصل انگریزی کتاب کی ہوتی۔ 1845ء میں بتروس نے بیماری کے سبب رخصت لی اور یورپ چلے گئے۔ اسپرنگر ان کے جانشین بن کر آئے۔ اسپرنگر نے بھی کتابوں کے ترجموں اور ان کی اشاعت کا کام اسی ذوق وشوق سے انجام دیا۔ ترجموں کو تیار کرانے اور ان کی کتابی صورت میں اشاعت کے اخراجات ایک خانگی سوسائٹی ادا کرتی تھی۔ لیکن حکومت بھی اس ضمن میں امداد کرتی کہ

کتاب کی اشاعت کے بعد اس کے متعدد نسخے حکومت خرید لیتی اور یہ کالجوں اور مدرسوں میں تقسیم کرائے جاتے۔ سرکاری مالی تعاون کا اس سے بھی اندازہ ہوگا کہ دلی کالج کے پرنسپل نے ریاضیات، طبعی جغرافیہ، تحلیلی ہندسہ اور مخلوط ریاضی پر کتابیں شائع کرنے کی تجویز پیش کی حکومت نے اس تجویز کو منظور کرلیا اور حکومت کی خواہش پر لوکل تعلیم کمیٹی نے ان کتابوں کے اردو ترجموں کی طباعت کا تخمینہ بھیجا اور اس سفارش کے ساتھ کہ یہ کام ماسٹر رام چندر کے حوالہ کیا جائے جو یورپی سائنس کے مدرس ہیں اور ''فوائد الناظرین'' اور ''محب ہند'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ کمیٹی نے اس توقع کا اظہار کیا کہ ماسٹر رام چندر ان کتابوں کا عمدہ ترجمہ کریں گے۔ اس کے مصارف کمیٹی برداشت کرے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کو ایک علمی زبان بنانے کی یہ ایک وقیع سعی تھی جو نہایت اہتمام کے ساتھ عمل میں آئی۔ کمیٹی نے کوئی 128 کتابوں کو لکھوایا اور ان کی اشاعت ہوئی۔ چند کتابوں کے عنوانات درج کیے جاتے ہیں کہ ان کے معیار کا اندازہ ہو۔ تحریر اقلیدس، تاریخ ہند، عملی علم ہندسہ، تاریخ اسلام، تاریخ یونان، تاریخ روما، انتخاب شعرائے اردو، اصول علم ہیئت، قانون مال، تاریخ ایران، جغرافیہ قدیم کے نقشے، طبعی نباتات، علم معدنیات، حرکیات وسکونیات، حکمائے یونان، احوال المفسرین اور ان کے علاوہ اردو شعراء سودا، میر، درد اور جرات وغیرہ کے دواوین اور کئی کتابیں۔

دلی کالج کی سرگرمیوں کے سلسلے میں مختلف کمیٹیوں کے علاوہ کالج کے پرنسپلوں اور اساتذہ کا غیر معمولی حصہ رہا۔ ان پرنسپلوں نے اردو کو علمی طور پر بلند معیار پر لانے کی مساعی کیں اور ان میں سے بعض نے تو غیر معمولی اپنائیت اور ہمدردی سے کام لیا۔ یہاں ابتدا ہی سے یہ صورت رہی۔ غازی الدین خاں کے مدرسہ نے جب 1825ء میں دلی کالج کی صورت اختیار کی تو جے۔ ایچ۔ ٹیلر کا کالج کے سکریٹری اور سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ان کی اور بھی ذمہ داریاں تھیں اور وہ کالج کے لیے کچھ ایسا وقت صرف نہیں کرسکتے تھے۔ مجلس مقامی نے یہ تجویز پیش کی کہ کالج کے لیے مستقل طور پر کوئی پرنسپل ہو چنانچہ 1841ء میں حکومت نے اس تجویز کو منظور کیا اور ایف بتروس کا 600 روپے ماہانہ پر بحیثیت پرنسپل تقرر عمل میں آیا۔ بتروس لائق، قابل اور کارکرد شخصیت تھے اور مغربی علوم کی ترویج اور دیسی زبانوں میں ان کے ترجموں کے حامی۔ دلی کالج کے سلسلہ میں بھی انھوں نے بہت سی اصلاحیں کیں اور مشرقی شعبہ کو ترقی دینے میں نمایاں حصہ ادا کیا کہ اس کو انگریزی شعبہ کے برابر وقیع اور اہم بنادیا۔ بتروس کے بعد اے۔ اسپرنگر پرنسپل مقرر ہوئے یہ عربی زبان وادب کے عالم تھے اور دلی کے علمی حلقوں میں ان کو عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ انھوں نے یہاں جلد ہی اپنا مقام بنالیا۔ اس کے علاوہ دلی ورنیکلر سوسائٹی کے یہ روح رواں تھے۔ اس سوسائٹی نے اردو زبان کے ذریعہ مغربی علوم کی اشاعت میں بڑا کام کیا ہے۔ اسپرنگر نے کالج کی ترقی میں دلچسپی لی، خصوصاً مشرقی شعبہ کے نصاب میں ان کی اصلاحیں اہمیت رکھتی ہیں۔ کئی کتابوں کو ترتیب دیا اور چھپوایا۔ ان کے زمانے میں کالج کی انتظامی حالت بھی بہتر تھی۔ فروری 1848ء میں اسپرنگر کو شاہ اودھ کے کتب خانہ کی فہرست تیار کرنے کا کام سونپا گیا۔ یہ لکھنو چلے گئے۔ جنوری 1850ء میں یہ اپنی خدمت پر واپس ہوئے لیکن دو، چار ماہ علالت کا سلسلہ رہا اور پھر مئی 1850ء میں ان کی خدمات بنگال منتقل کردی گئیں اور جے۔ کارگل دلی کالج کے پرنسپل ہوئے۔ کارگل کے بعد 1854ء میں ٹیلر کو عارضی طور پر پرنسپل بنایا گیا۔ 1857ء میں یہی پرنسپل تھے۔ ان ہنگاموں میں ان کی بے دردی کے ساتھ موت ہوئی۔ ٹیلر کالج کے مقبول ترین پرنسپلوں میں تھے۔ یہ طلبہ کو اور طلبہ ان کو بہت زیادہ چاہتے تھے۔ وہ لائق ہی نہیں تھے، نیک سیرت اور نیک اطوار بھی تھے۔

1857ء کے ہنگاموں میں کالج بند ہوگیا اور چھ، سات سال بعد 1864ء میں جب کھلا تو ایڈمنڈ ولمٹ جو ٹرنٹی کالج انگلستان سے تعلق رکھتے تھے، پرنسپل کی حیثیت سے آئے۔ وہ ریاضی کے بڑے عالم تھے اور کالج کے درجوں اور انٹرنس کی جماعتوں کو ریاضی پڑھاتے تھے و نیز اردو اور عربی سے انگریزی میں ترجموں کی تصحیح کا کام بھی کرتے لیکن اپنی علالت کے سبب یہ زیادہ دن یہاں نہیں رہ سکے۔ دلی کالج کے اساتذہ میں پروفیسر ایلس کا نام بے حد معروف ہے۔ یہ انگریزی زبان وادب کے بڑے عالم تھے۔ طلبہ میں بھی مقبول تھے لیکن شراب نوشی کی عادت اس قدر تھی کہ ان کی مقبولیت متاثر ہوئی ان کی تنزلی عمل میں آئی اور وہ پروفیسر سے سکنڈ ماسٹر بنادیے گئے۔ پھر بھی وہ کالج کی جماعتوں کی تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔

مشرقی شعبہ کے اساتذہ میں مولوی مملوک علی کا نام پہلے لیا جانا چاہیے۔ یہ نہایت قابل اور عالم فاضل شخصیت تھے۔ فارسی، عربی اور اردو تینوں

زبانوں پر انھیں قدرت حاصل تھی اور پھر ان زبانوں پر ہی نہیں علم وفنون پر بھی ان کا ملکہ تھا۔ حافظہ بھی اچھا تھا۔ طلبہ ہر وقت ان کو گھیرے رہتے تھے۔ تحریر اقلیدس کا ترجمہ انہوں نے اردو میں کیا۔ چار مقالہ اول کا اور دو مقالوں (آخر کے گیارھویں اور بارھویں) کا ترجمہ بھی ان کا کیا ہوا ہے۔ انھوں نے سننِ ترمذی کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔ شاہ جہاں آباد کے رہنے والے تھے۔

مولوی امام بخش صہبائی کے نام سے کون واقف نہیں۔ یہ فارسی کے بہت بڑے عالم' مصنف اور شاعر تھے۔ آج بھی ان کے علم وفضل کا لوہا مانا جاتا ہے۔ فارسی میں ان کی تصانیف کے علاوہ اردو صرف ونحو پر ان کی اچھی کتاب ہے۔ حدائق البلاغت کا اردو ترجمہ بھی انھوں نے کیا اور شعرائے اردو کا انتخاب بھی انہی کا ہے۔

مولوی سبحان بخش بھی دلی کالج کے نامور استاد تھے ''محاوراتِ ہند'' ان کی مشہور کتاب ہے۔ وفیاتِ ایمان'' ترجمہ تاریخ ابنِ خلکان بھی انہی کا کیا ہوا ہے انھوں نے تزک تیموری کا بھی اردو ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ تذکرہ مفسرین اور تذکرۂ حکماء بھی انہی کے ہیں۔

ماسٹر رام چندر دلی کالج ہی کے طالب علم تھے اور یہیں سائنس کے استاد مقرر ہوئے۔ سائنس کی تعلیم اردو زبان میں دیتے تھے اور طلبہ میں مقبول تھے۔ یورپی سائنس کے مدرس ہوئے اور 50 روپے تنخواہ پائی۔ انھوں نے اردو میں الجبرا اور علم مثلث پر کتابیں لکھیں۔ انھوں نے ایک رسالہ ''فوائد الناظرین'' بھی نکالا جو پندرہ روزہ تھا اس میں اکثر علمی مباحث ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے ایک اور رسالہ محبِ ہند کے نام سے بھی جاری کیا۔ یہ بہت اچھے مدرس تھے اور اپنے موضوع پر قدرت رکھتے تھے۔ انھوں نے انگریزی کتابوں کی مدد سے ایک کتاب جبر ومقابلہ لکھی اور ایک رسالہ اصولِ علم مثلث بالجبر اور تراش ہائے مخروطی میں اور علم ہندسہ بالجبر میں لکھا۔ انھوں نے اپنی کتاب کلیات وجزئیات بھی شائع کی۔ ان کی ایک اور کتاب تفرقی احصا ہے۔ انھوں نے عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا بعد میں ان کا میلان مذہب کی طرف ہوگیا اور انھوں نے مذہبی مباحث پر کتابیں لکھنی شروع کیں۔ 1857ء کے ہنگاموں میں وہ مصیبتوں کا شکار ہوئے۔ جنوری 1858ء میں وہ نیو ہیڈ ماسٹر ٹاسن سول انجینئرنگ کالج مقرر ہوئے۔ ستمبر 1885ء میں دلی ڈسٹرکٹ اسکول کے صدر مدرس ہوئے۔ خرابی صحت کے باعث وظیفہ لے لیا لیکن بعد میں پٹیالہ میں ناظم تعلیمات ہوگئے۔ ان کا انتقال 1890ء میں ہوا۔ شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین بھی اسی کالج کے طالب علم تھے۔ پہلے اسسٹنٹ پروفیسر عربی مقرر ہوئے بعد میں پروفیسر کے عہدہ پر ترقی پائی۔

ماسٹر پیارے لال بھی دلی کالج کے طالب علم تھے ماسٹر رام چندر اور مولانا صہبائی جیسے اساتذہ سے انھوں نے تحصیلِ علم کیا۔ تکمیل تعلیم کے بعد گڑگاؤں اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے' پھر دلی نارمل اسکول کے 1864ء میں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق ہوئے اور پھر مدراس کے انسپکٹر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ انھوں نے اردو کی خدمت نہایت گرمجوشی سے کی۔ ان کی کتابوں میں سے چند ہیں۔ قصص ہند (حصہ اول)' قصص ہند (حصہ سوم) اور تاریخ انگلستان وغیرہ۔ پیارے لال کا انتقال 1914ء میں ہوا۔

بھیروں پرشاد بھی دلی کالج کے طالب علم تھے۔ بی۔اے میں یونیورسٹی میں اول آئے اور یہاں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ اشرف علی منشی تھے اور نہایت قابل۔ انھوں نے تاریخ کشمیر کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ رسالہ اصولِ حساب میں بابو ہردیو سنگھ کی مدد کی اور بریف سروے آف ہسٹری کے اُردو ترجمے کی صحت کی۔ پنڈت رام کشن دہلوی مدرس تھے' انگریزی فارسی اور اردو میں مہارت رکھتے تھے۔ ایک رسالہ علم طب میں انگریزی سے ترجمہ کیا۔ اصولِ قوانین دیوانی وفوجداری' اصول قانونِ کلکٹری' اصول قوانین گورنمنٹ' سیر اسلام کے چوتھے باب وغیرہ کا اردو میں ترجمہ کیا۔ فنِ زراعت پر اُن کی کتاب ''مزید الاموال باصلاح الاحوال'' ہے۔ ماسٹر حسینی بچوں کی تعلیم پر مقرر تھے۔ تاریخ مغلیہ' تاریخ ایران' قانون محمدیؐ فوجداری اور قانون دیوانی وغیرہ ان کے ترجمے ہیں۔ ہردیو سنگھ منشی تھے۔ رسالہ پیمائش (دو حصوں میں) انہی کی تالیف ہے۔ انھوں نے ڈیمورگن کی کتاب اصولِ حساب کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ ماسٹر نور محمدؐ۔ مولوی حسن علی خاں' ماسٹر وزیر علی اور ماسٹر امیر علی بھی کالج کے لائق اور مقبول اساتذہ میں تھے۔

اب چند ایسی شخصیات کا ذکر جنھوں نے دلی کالج سے فیض اٹھایا' یہاں طالب علم رہے۔ ان کے کارناموں سے اردو ادب کی تاریخ رنگین اور معطر ہے۔ اس سلسلے میں ماسٹر رام چندر اور پیارے لال کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ ایسے دیگر اصحاب میں شمس العلما ڈاکٹر نذیر احمد ہیں۔ ان کے ناولوں اور

اردو ادب میں ان کی خدمات سے کون واقف نہیں۔ محمد حسین آزاد کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اردو میں جدید شاعری کے تعلق سے مولانا آزاد کی گراں قدر خدمات ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ نے ریاضی کی تمام شاخوں پر و نیز تاریخ، جغرافیہ، اخلاقیات اور طبعیات پر کئی کتابیں لکھیں۔ مولوی ضیاء الدین بھی ہیں۔ ان کی کتاب ''رسوم ہند'' (پہلا حصہ) ہے۔ پتمبر بھی دلی کالج کے ذہین طلبہ میں تھے۔ ماسٹر رام چندر کے ہم جماعت 1845ء میں کالج سے انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے بھیجے گئے۔ بعد ازاں دلی میں پہلے دیسی سول انجینئر مقرر ہوئے۔ موتی لال دہلوی بھی کالج کے ممتاز طالب علم تھے۔ انگریزی کی اعلیٰ قابلیت کے حامل تھے۔ ختم تعلیم پر بورڈ آف ایڈمنسٹریشن لاہور میں فارسی مترجم ہوئے۔ اس کے بعد بھی مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ لیکن اردو سے اپنے شغف کو جاری رکھا۔ پلوٹارک کے تذکرہ سسرو کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ایک تذکرہ شعرا بھی لکھا۔ اردو اور فارسی پر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ بھیروں پرشاد بھی لائق طالب علم تھے۔ انھوں نے کئی میڈل حاصل کیے۔ کالج ہی میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوگئے۔ پنڈت من پھول بھی کالج کے قدیم طلبہ میں ممتاز تھے۔ مولوی ذکا اللہ اور ماسٹر رام چندر کے شاگرد تھے۔ پنجاب گورنمنٹ میں میر منشی مقرر ہوئے تھے۔ سری رام بھی اچھے طالب علم تھے۔ پہلے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ بعد ازاں ریاست الور میں دیوان مقرر ہوئے۔ حکم چند نے بھی اعلیٰ لیاقت کا مظاہرہ کیا۔ تعلیم ختم کرنے پر حیدرآباد دکن میں اعلیٰ خدمت پر مامور ہوئے۔ ان کی قابلیت مسلم تھی۔ نند کشور نے دلی کالج سے بی۔ اے کیا اور پنجاب میں انسپکٹر آف اسکولس کے عہدہ پر فائز رہے۔ ماسٹر کیدار ناتھ نے بھی یہیں تعلیم پائی اور گورنمنٹ ہائی اسکول میں سکینڈ ماسٹر ہوگئے۔ پیرزادہ محمد حسین اور خواجہ محمد شفیع الدین دونوں اسی کالج کے طالب علم رہے۔ پیرزادہ نے سفرنامہ ابن بطوطہ کا اردو ترجمہ کیا۔ ان کی علمی قابلیت مسلمہ تھی۔ خواجہ محمد شفیع نے بھی کتابیں لکھیں۔ میر ناصر علی ایڈیٹر ''صلاحِ عام'' بھی دلی کالج کے طالب علم تھے۔ ماسٹر پیارے لال کے چھوٹے بھائی مدن گوپال نے بھی دلی کالج میں تعلیم پائی لیکن کالج کے بند ہوجانے کی وجہ سے انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا، الہ آباد ہائی کورٹ سے سندِ وکالت حاصل کی، ولایت سے بیرسٹر ہوکر آئے اور لاہور میں وکالت کرنے لگے۔ انھوں نے پروفیسر جیوائز کی منطق کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ماسٹر جانکی پرشاد بھی لائق شخص تھے۔ ذات کے برہمن تھے لیکن عیسائیت قبول کرلی تھی۔ سین سٹیفن ہائی اسکول دلی میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ پنڈت دھرم نارائن کا شمار بھی دلی کالج کے لائق اور مقبول اساتذہ میں ہوتا ہے۔ انھوں نے سیاسی معاشیات کا اردو میں ترجمہ کیا۔ تاریخِ انگلستان کے ایک حصے بھی ترجمہ ان کا کیا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے لیے مل کی سیاسی معاشیات کا انتخاب بھی کیا۔ ان کی یہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ کالج کے ایک اور لائق طالب علم شیو نارائن تھے۔ انھوں نے ہندوستان کا جغرافیہ اردو میں لکھا اور سروپ نارائن کے اشتراک سے علمِ طبعیات کا ترجمہ کیا۔ مولوی کریم الدین بھی کالج کے طالب علم تھے۔ پانی پت وطن تھا لیکن دلی کے ہوکر رہ گئے تھے۔ ان کا مطبع بھی تھا۔ انھوں نے کئی کتابیں لکھیں جن میں سے چند خاصی مشہور ہوئیں۔ تعلیم النساء، گلستانِ ہند، تذکرہ شعرائے ہند (طبقات شعرائے ہند) گلدستہ نازنیناں، تذکرۃ النساء، ترجمہ ابوالفدا، تذکرہ شعرائے عرب اور دیگر کئی رسالے وغیرہ۔ غرض دلی کالج کی اردو خدمات کئی زاویوں سے اہم، اطمینان بخش اور لائق تحسین ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1) دلی کالج کے کسی ایک پرنسپل کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

2) ماسٹر رام چندر نے اردو ادب کی کیا خدمت انجام دی، لکھیے۔

3) دلی کالج کے کسی دو طالب علموں کی کتابوں کے نام لکھیے۔

17.4 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے آپ کو دلی کالج کے قیام کے پس منظر، اس کے انتظامیہ اور اس کی مالی حالت کے بارے میں واقف کرایا۔ ہم نے یہ بھی بتایا کہ دلی کالج کے پرنسپلوں، اساتذہ اور طلبہ نے کس طرح اس کالج کی خدمت کی۔ دلی کالج سے کتابوں وغیرہ کی اشاعت کب اور کیسے عمل میں آئی۔ تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے خاکے کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

دلی کالج کا قیام 1825ء میں جوزف ہنری ٹیلر کی ایماء پر عمل میں آیا۔ یہ کالج مدرسۂ غازی الدین خاں کی عمارت میں قائم ہوا جہاں پہلے عربی و فارسی اور دینیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ انگریز جنھوں نے تجارت کی غرض سے سرزمین ہندوستان پر قدم رکھا تھا دھیرے دھیرے حکومت کے معاملات میں بھی دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہندوستان پر اپنے قدم مضبوطی کے ساتھ جمانا چاہتے تھے اور یہاں عیسائی مذہب کی تبلیغ بھی کرنا چاہتے تھے۔ اس پس منظر میں دلی کالج کا آغاز ہوا۔ اس کالج کا مقصد جدید علوم کو عام کرنا اور انگریزی زبان کو بنیادی اہمیت دینا تھا۔ دلی کالج میں مشرقی اور مغربی دونوں علوم کے شعبے قائم کیے گئے لیکن ان شعبوں میں ایک عرصے تک ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی تاہم 1836ء میں جب لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل بن کر آئے تو انھوں نے ایسی تعلیمی پالیسی اختیار کی کہ مشرقی اور مغربی علوم کے دونوں گروہ مطمئن ہو گئے۔ انھوں نے مشرقی زبانوں کی ترقی و توسیع اور مفید کتابوں کی اشاعت کی پرزور حمایت کی۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف رکاوٹوں کے باوجود دلی کالج میں مختلف مغربی علوم جیسے علم ہیئت، فلسفہ، ریاضی وغیرہ اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔

دلی کالج کی سرگرمیوں کے سلسلے میں ایک طرف مختلف کمیٹیوں نے نمایاں کردار ادا کیا تو دوسری طرف کالج کے پرنسپلوں اور قابل اساتذہ نے بھی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ جن میں خصوصی طور پر درج ذیل پرنسپلس اور اساتذہ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔ ایف بتروس۔ اسپرنگر۔ کارگل۔ ٹیلر۔ ایڈمنڈ ولمٹ۔ پروفیسر ایلس۔ مولوی مملوک علی۔ امام بخش صہبائی۔ مولوی سبحان بخش۔ ماسٹر رام چندر۔ ڈاکٹر ضیاء الدین۔ ماسٹر پیارے لال۔ بھیروں پرشاد وغیرہ۔ اس کالج سے استفادہ حاصل کرنے والے مشہور اہل قلم ہیں۔ ماسٹر رام چندر، پیارے لال کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، ذکا اللہ۔ موتی لال۔ حکیم چند، نند کشور۔ خواجہ محمد شفیع۔ میر ناصر علی۔ مدن گوپال۔ جانکی پرشاد۔ دھرم نارائن اور مولوی کریم الدین اہم ہیں۔

17.5 نمونہ امتحانی سوالات

1. دلی کالج کے قیام کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے بتلایئے کہ وہ کن نشیب و فراز سے گزرا؟
2. دلی کالج کے اساتذہ اور پرنسپلوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔
3. دلی کالج کی جانب سے شائع شدہ کتابوں اور وہاں کے معروف طلبہ کی خدمات پر روشنی ڈالیے؟

17.6 فرہنگ

کسمپرسی	=	ایسی حالت جس میں کوئی پوچھنے والا نہ ہو
مترادف	=	ایسے الفاظ جن کے معنی ایک ہی ہوں
مبلغین	=	ملبغ کی جمع، تبلیغ کرنے والے
شغف	=	بے حد محبت، بے انتہا رغبت
تدوین	=	جمع کرنا، مرتب کرنا
مسلّم	=	تسلیم شدہ، مانی ہوئی
خستہ	=	بدحال، مفلس
اشتراک	=	شرکت، ساجھا
تخمینہ	=	سرسری حساب

افزوں = زیادہ، بہت

تنزلی = کمی، زوال

خطیر = کثیر، بہت

مسدود = بند، ختم

چپقلش = جھگڑا

ایماء = اشارہ

سعی = کوشش

میلان = رجحان

گرم جوشی = شوق، جوش

17.7 سفارشی کتب

1. مولوی عبدالحق — مرحوم دلی کالج
2. الطاف حسین حالی — مقالاتِ حالی
3. نورالحسن نقوی — تاریخ ادب اردو

اکائی: 18 اردو شاعری کا دبستانِ لکھنو

ساخت

18.1 تمہید

18.2 دبستانِ لکھنؤ کا پس منظر

18.3 دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات

18.4 دبستانِ لکھنؤ کے ممتاز شعرا

18.4.1 قلندر بخش جرأت

18.4.2 میر انشاءاللہ خان انشا

18.4.3 غلام ہمدانی مصحفی

18.4.4 امام بخش ناسخ

18.4.5 خواجہ حیدر علی آتش

18.5 خلاصہ

18.6 نمونۂ امتحانی سوالات

18.7 فرہنگ

18.8 سفارش کردہ کتابیں

18.1 تمہید

گزشتہ اکائی میں ہم نے دہلی کالج کے قیام کے پس منظر پر روشنی ڈالی اور اس کالج کی اردو خدمات کا سیر حاصل جائزہ لیا۔ یہ اکائی اردو شاعری کے ایک اہم دبستان، دبستانِ لکھنؤ کے بارے میں ہے اس اکائی میں ہم دبستانِ لکھنؤ کے پس منظر پر روشنی ڈالیں گے۔ اس دبستان شاعری کی خصوصیات کا جائزہ لیا جائے گا اور پانچ ممتاز شاعروں کے کلام پر اختصار کے ساتھ تبصرہ کیا جائے گا۔ ہم اس اکائی کا خلاصہ بھی پیش کریں گے۔ امتحانی سوالات بطور نمونہ درج کیے گئے ہیں۔ فرہنگ کے تحت نئے الفاظ کے معنی بھی ہیں اور آپ کے مزید مطالعہ کے لیے سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی۔ یقین ہے آپ ان سب سے استفادہ کریں گے۔

18.2 دبستانِ لکھنؤ کا پس منظر

اورنگ زیب کے آخری دور سے ہی مغل سلطنت کے زوال کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ راجپوتانہ، مالوہ، بندیل کھنڈ اور گجرات وغیرہ میں بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور مرہٹوں کی سرکشی سے ملک کے حالات دگرگوں ہوتے جا رہے تھے اور اس کے لازمی ردعمل کے طور پر خزانہ خالی ہو رہا تھا اور ملک کے انتظامیہ اور فوج کی حالت بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ اورنگ زیب کے بعد حالات مزید ناگفتہ بہہ ہو گئے۔ وقفہ وقفہ کے بعد کئی بادشاہ یکے بعد دیگرے دہلی کے تخت پر بیٹھے۔ معظم، جہاندار شاہ، فرخ سیر، رفیع الدرجات، رفیع الدولہ اور پھر محمد شاہ، ان میں رفیع الدرجات نے تو صرف تین مہینے اور چند دن ہی حکومت کی۔ نادر شاہ کا حملہ اس دور کا اہم ترین واقعہ ہے۔ 1737ء میں نادر شاہ نے دہلی میں قیامت برپا کر دی محمد شاہ کی فوج کو شکست ہوئی اور دہلی ایسی برباد ہوئی کہ اس کی مثال مشکل ہی سے دی جا سکتی ہے۔ مغلوں کے دور میں فارغ البالی اور عیش و عشرت کا حال سن کر ایران اور افغانستان سے اہل ہنر ہندوستان آنے لگے تھے ان میں سید محمد امین نیشاپوری بھی تھے۔ جو آگے چل کر لکھنؤ کے سیاہ و سپید کے مالک بھی بنتے ہیں۔

نادرشاہ کے حملے کے بعد بھی لگ بھگ (120) سال کہنے کو مغل سلطنت قائم رہی لیکن اس پر سلطنت ہونے کی تہمت تھی۔ بکھراؤ تیزی سے جاری تھا جس کے نتیجے میں سلطنت کا جو بھی حال ہوا ہو' اہل علم' علما' فضلا اور شاعروں پر بُرا وقت آن پڑا ان کی سرپرستی کرنے والے خود چھپر کی تلاش میں بدحواس و ہراساں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ کیسی کیسی نادر روزگار شخصیات دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوئیں اور اس کے نتیجے میں دیگر مقامات نے رونق پائی۔ ریاست اودھ بھی ان میں سے ایک ہے۔

سید محمد امین نیشاپوری' بہادر شاہ کے دور میں ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ پہلے یہ گجرات کے صوبہ دار سربلند خان کے ہاں ملازم رہے اور پھر دہلی پہنچ کر اتنی اہمیت اختیار کر لی کہ سعادت خاں کا خطاب پایا اور معاشرہ پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور جلد ہی پنج ہزاری منصب دار بن گئے انہوں نے آگرہ' اکبرآباد میں صوبہ داری بھی کی اور ملک کے انتشار و اختلال اور کمزور ہوتی ہوئی حکومت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اودھ کا رخ کیا اور اپنی حکومت قائم کر لی۔ اور اجودھیا سے چار میل دور' دریائے گھاگرا کے کنارے نیا دارالخلافہ بھی بسا دیا۔ اور خود سعادت خان برہان الملک ہو گئے۔ برہان الملک نے انتظام سلطنت پر توجہ دی' صوبہ داری اور زمینداروں پر قابو پایا' آمدنی میں اضافہ کے اقدامات کیے کہ صوبہ اودھ کی سالانہ آمدنی خاصی بڑھ گئی۔ انہوں نے معاہدہ کر کے مرہٹوں کو بھی خاموش کرا دیا تھا لیکن جب نادرشاہ نے حملہ کیا تو برہان الملک کی حکمت عملی کارگر نہ ہوئی حتی کہ انہوں نے زہر کا پیالہ پی کر خودکشی کر لی۔ برہان الملک نے صوبہ کو ہر لحاظ سے مستحکم اور ترقی یافتہ بنانے کی مساعی کیں لیکن شعر و ادب سے بھی انہیں دلچسپی تھی۔ کہیں ان کا ایک آدھ فارسی شعر بھی ملتا ہے۔ برہان الملک کے بعد شجاع الدولہ آصف الدولہ' وزیر علی' سعادت علی خان' غازی الدین حیدر' نصیر الدین حیدر' محمد علی شاہ' امجد علی شاہ اور آخر میں واجد علی شاہ اودھ کے حکمران ہوئے۔ نواب شجاع الدولہ نے لکھنؤ بسایا تھا لیکن جلد ہی فیض آباد واپس ہوئے لیکن آصف الدولہ نے اپنے عہد میں پھر فیض آباد کی بجائے دارالخلافہ کے اعتبار سے لکھنؤ کو ترجیح دی۔ دہلی جیسے جیسے اجڑتی گئی' لکھنؤ کی رونق میں اضافہ ہوتا گیا۔ دہلی کی بدحالی اور پریشانیوں سے تنگ آ کر اہل علم و ہنر دلی ترک کرنے پر مجبور ہوئے اور جس کو جدھر موقع ملا اُدھر کا رخ کیا۔ اودھ کے علاوہ فرخ آباد' اورنگ آباد' حیدرآباد' مرشد آباد اور ارکاٹ وغیرہ کی طرف لوگ جوق در جوق جانے لگے۔

امین الدین سعادت خان برہان الملک نیشاپوری کا تعلق ایران سے بھی تھا۔ ایران میں صفویہ سلاطین نے مذہب اثنا عشری کے فروغ اور استحکام میں کافی عقیدت اور دلچسپی سے کام لیا تھا۔ مرثیہ نگاری بھی اسی زمانے میں عام ہوئی بلکہ اس کو ادبی حیثیت بھی حاصل ہوئی۔ برہان الملک اور دوسروں کی وجہ سے یہ رنگ ہندوستان اور پھر اودھ لکھنؤ پہنچا۔ حتی کہ واجد علی شاہ جن کی رنگ رلیاں مشہور ہیں اپنے عقیدہ کے بڑے پکے تھے۔ غرض بتدریج یہ عقیدہ لکھنؤ کی تہذیب کا جزو بن گیا اور اس کی شناخت کی حیثیت حاصل کر لی۔ اس کے نتیجے میں مرثیہ نگاری کو فروغ ہوا۔ مرثیہ نگاری اس سے قبل اگرچہ کہ دکن میں رائج تھی اور شمالی ہند میں بھی بعض شاعر مرثیہ گو تھے لیکن لکھنو میں اس صنف نے جو بے پناہ ترقی حاصل کی اس کا جواب کہیں نہیں ملتا۔ انیسؔ' دبیرؔ' ضمیرؔ' خلیقؔ' تعشقؔ' مونسؔ اور اسؔ تو محض چند نام ہیں ورنہ ایسے شاعروں کی کمی نہیں جن کے مراثی کے ضخیم ضخیم مجموعے موجود ہیں۔ مذہبی عقیدت کی وجہ سے مرثیہ گوئی ہی کو نہیں مرثیہ خوانی کو بھی فروغ ہوا اور مراثی پڑھنا لکھنؤ والوں کا ایک خاص فن بن گیا۔

دبستان دہلی میں جو رکھ رکھاؤ' سنجیدگی' ثقہ پن اور متانت تھی اس کی ایک بڑی وجہ تصوف کو بتائی جاتی ہے۔ مذہب اثنا عشری کے مقلدین کو تصوف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ کہا جاتا ہے ایران میں صوفیہ کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا گیا تھا جس کے نتیجے میں لکھنؤ میں بھی تصوف کو شاعری سے خارج کر دیا گیا حالانکہ تصوف ابتدا ہی سے اردو شاعری اور بالخصوص صنفِ غزل کی فطرت میں تھا' دبستانِ گولکنڈہ اور دبستانِ بیجاپور کے شاعروں کے ہاں بھی لیکن خاص طور پر ولیؔ اور سراجؔ کی غزل تصوف سے مزین تھی۔ سراج کے صوفی ہونے میں شبہ بھی کس کو ہے۔ ہمارے اس دور کے شاعروں نے بے راہ روی سے کام لیا ہو لیکن تصوف کی روک تھی کہ شعرا زیادہ بھٹکنے سے باز رہتے تھے اسی طرح ہزار عشقِ مجازی کے چکر میں ہوں' شعرا نے عشقِ حقیقی سے اپنا رشتہ توڑا نہیں تھا اور شاعر تصوف سے نسبت نہ بھی رکھتا ہو' تصوف برائے شعر گفتن تو اس کے پاس تھا ہی۔ لیکن جب لکھنؤ میں شاعری میں تصوف کا عمل دخل نہ رہا تو شاعری عشق مجازی کا اظہار بن کر رہ گئی اور عیش گزیدہ تہذیب و معاشرت نے آگے چل کر شاعری کو جنس زدہ بنایا۔ فحش گوئی اور عریانیت بھی عام ہو گئی۔ ہوس ناکی کا سکہ چلا۔ عورت بلکہ طوائف اعصاب پر سوار ہو گئی۔ یہاں شجاع الدولہ کا ذکر ضروری ہے۔ شجاع الدولہ کو حسین عورتوں کی صحبتیں پسند تھیں وہ اپنا زیادہ وقت انہی کے ساتھ گزارتے تھے۔ طوائفیں تو ان کے ساتھ سفر میں بھی رہتی تھی۔ وزرا' امرا' روسا' اور نوابین بھی اسی شوق کے اسیر تھے۔ شاعروں نے بھی اسی راہ کو اپنایا اور اب معاملہ بندی والی شاعری بھی شروع ہو گئی۔ یہی باتیں بہت زیادہ منفی نوعیت کی تھیں کہ معاشرت کے اس منظر نامہ

نے خیالات کو بھی بگاڑا اور زبان، لہجہ و اسلوب کو بھی چنانچہ ہزل گوئی اور فحاشی ایک صنف بن گئی اور یار لوگوں نے اس میں کمال حاصل کرنے اور نام پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس میں سنجیدہ اور خشک لوگ بھی تھے جنھوں نے ہزل تو نہیں کہی لیکن انہوں نے واسوخت ضرور کہے امانت کے واسوخت مشہور ہیں۔ معاشرت اور شاعری کے اس بگڑے منظر نامہ میں جس صنف کے آگے آنے کی گنجائش نکلی وہ ریختی ہے۔ ہر چند کہ ہندی شاعری میں جذباتِ عشق کا اظہار عورت کی جانب سے کیا جاتا ہے لکھنؤ کے معاشرہ میں بھی جب عورتوں کو اہمیت حاصل ہوگئی اور نسائیت عام مزاج بن گئی تو ہندی شاعری کو دیکھتے ہوئے ریختہ کے جواب میں ریختی کہی جانے لگی۔ گویا اب تک جو باتیں چپکے چپکے اور پردہ میں کہی جاتی تھیں وہ دوٹوک واضح انداز میں برملا کہی جانے لگیں اور بقول شخصے مردوں کے جذبات، خیالات اور زبان پر نسائیت اس قدر غالب آ گئی کہ ریختہ کے جواب میں ریختی کو ترقی دیکر بے حیائی کی باتیں بے شرمی سے نظم کی گئی اور یہ فضا کچھ ایسی پھیلتی گئی کہ عام خیالات، زبان اور محاورے پر نسائیت غالب آ گئی۔ ہر چند کہ مرثیے کی طرح ریختی کے آغاز کا سہرا بھی دکن کے سر ہے اور ہاشمی کا نام اس سلسلے میں اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن لکھنؤ کے شاعروں نے مرثیہ کی طرح ریختی میں بھی کمال پیدا کیا۔ رنگین اور جان صاحب کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

لکھنؤ کی تہذیب اور ثقافت نے بھی لکھنؤ شاعری کے پس منظر کی حیثیت سے اپنا حصہ ادا کیا جس طرح لکھنؤ کی تہذیب تصنع، بناوٹ، تکلف اور ظاہری چیزوں سے عبارت تھی، لکھنوی شاعری نے بھی یہی رخ اختیار کیا۔ لکھنؤ کے شاعروں نے کیا کہنا چاہیے پر نہیں، کیسے کہنا چاہیے پر زور دیا۔ معنی و مفہوم پر نہیں طرزِ ادا پر وقت صرف کیا جانے لگا۔ اب تک حسن و عشق کے جذبات اور ان کی کیفیات پر توجہ دی جاتی تھی محسوسات اور تاثرات کی اہمیت تھی لیکن اب حسن کے ظاہر اور لوازماتِ حسن اور اعضائے جسمانی کے بیان کو شاعری قرار دیا گیا۔ جذبات و احساسات کی قدر نہیں رہی حسن کے لوازمات آرائش اور زیورات کا بیان کیا جانے لگا۔ اسی طرح شعر میں معنویت پیدا کرنے کے لیے نہیں بلکہ شعر کے ظاہری رنگ و روپ کو نئی نئی شکلیں دی گئیں۔ رعایت لفظی اور ضلع جگت عام ہوئے۔ تشبیہ اور استعارے کی نوک پلک درست کی جانے لگی، کنایات اور تلمیحات وغیرہ نے جگہ پائی، لفاظی کو راہ ملی اور شاعری الفاظ کا پٹارا بن گئی، معنی آفرینی کی طرف کون توجہ کرتا، قافیہ پیمائی آرٹ بن گئی۔ شاعری کسی معاشرتی، اخلاقی اور تہذیبی مقصد کے لیے استعمال نہیں کی جانے لگی اس کا مقصد وقت گزاری، سستی تفریح اور جنسی تلذذ حاصل کرنا ہوگیا۔ ایسے پس منظر میں اگر لکھنؤ کے دبستان کا وقار برقرار رہا تو مرثیہ، نعت، منقبت اور کسی حد تک مثنوی جیسی اصناف سے جس میں مذہبی معتقدات کی وجہ سے بے راہ روی اور سستے پن کو راہ پانے کی گنجائش نہیں رہی۔ اس طرح لکھنؤ کا دبستانِ شاعری اپنی منفی خصوصیات کے باوجود مرثیہ جیسی اصناف اور اصلاحِ زبان کی تحریک کے باعث اردو ادب میں اونچے مقام کا حامل ہے۔ آیئے اس پس منظر میں ہم دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کی خصوصیات کا مطالعہ کریں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. سید محمد امین نیشاپوری کون تھے اور کہاں سے ہندوستان آئے تھے؟
2. ریختی سے کیا مراد ہے؟
3. دبستانِ لکھنؤ کی شاعری میں تصنع اور بناوٹ کے کیا اسباب ہیں؟

18.3 دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات

دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات سے مراد وہ خصوصیات ہیں جن کو لکھنؤ کے شاعروں نے اختیار کیا اور یہ خصوصیات قدیم اور کلاسیکل شاعری سے جدا ہیں۔ لکھنؤ کا معاشرہ تصنع، بناوٹ اور ظاہری چمک دمک کا معاشرہ تھا یہاں محبوب کی دلی کیفیات اور حسن و عشق کے جذبات اور محسوسات پر توجہ نہیں دی گئی بلکہ محبوب کے اعضائے بدن اور اس کی ظاہری چمک دمک کو موضوع بنایا گیا۔ اس دور میں واقعہ بھی یہی ہے کہ طوائفوں اور پیشہ ور عورتوں کی وجہ سے حسن اور حسن کے جلوے عام تھے۔ کوٹھوں پر جانے اور حسن بازاری تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں تھی۔ محبوب زن بازاری تھا حقیقی محبت کا سوال کہاں پیدا ہوتا۔ خود بادشاہ عیش پسند تھے، نازنینوں کے جمگھٹے ان کے ساتھ رہتے تھے اور شرم و حیا کا سماج میں کوئی کردار نہیں رہا تھا۔ ''ہر چیز کہ سلطان پسند ہنر است'' کی طرح بادشاہ کی تقلید کرتے ہوئے وزرا، امرا اور روسا بھی حسن کے دیوانے تھے۔ حقیقی محبت نہیں تھی صرف دکھاوا تھا۔ شاعر بھی محض ظاہر اور

خارجی کیفیات کو منظوم کر دیتے تھے۔ جذبات و احساسات سے عاری یہ کلام محض لب و رخسار کمر، دہن، چال ڈھال، انداز و ادا اور وصال کے سستے بیانات تک محدود تھا۔ دلی کیفیات کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ دیتا بھی کون؟ جب کہ نہ اپنے دل کی کسی کو فکر تھی اور نہ محبوب کے دل سے کوئی واقف تھا وہ تو اس کے ظاہری حسن کی دلکشی سے صرف محظوظ ہونا چاہتے تھے۔ اس نوع کے لکھنوی شعرا کے ہاں پچاسوں اشعار ملیں گے۔

لکھوں کیا حال میں دیوانہ اپنی ناتوانی کا
ہوا طوقِ گراں گردن میں وہ چھلّہ نشانی کا

کس قدر صاف ہے تمہارا پیٹ
صاف آئینہ سا ہے سارا پیٹ

بندے کانوں میں نہیں تعویذ بازو میں نہیں
وہ ستارہ صبح کا ہے یہ ستارہ شام کا

آتشِ رنگِ حنا سے شمع ہیں سب انگلیاں
دستِ جاناں میں مرا مکتوب پروانہ ہوا

دیکھی جو قبا تیری بسنتی
پھاڑا گیندے نے پیرہن زرد

لکھنؤ کے زوال آمادہ معاشرہ میں ہوس پرستی عام تھی، گانے والیوں اور بازاری عورتوں کی بہتات تھی چونکہ اخلاقی اقدار کا بھی ایسا پاس و لحاظ نہیں تھا اسی لیے جو بات بھی کی جاتی کسی پاس و لحاظ کے بغیر اور جو کام بھی کیا جاتا علانیہ، جذبات و احساسات کی پاکیزگی اور اظہار کی سنجیدگی اور بردباری کا کہیں پتہ نہیں تھا لہجہ بھی عامیانہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر معاملہ بندی کو فروغ ہوا۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ معاملہ بندی اردو شاعری میں نئی بات نہیں دبستان دکن کے شاعروں میں بھی یہ رہی اور پھر دہلی کے ثقہ اور سنجیدہ مزاج شاعروں نے بھی اس خصوص میں توجہ دی لیکن لکھنؤ کے دبستان میں معاملہ بندی نے عجیب و غریب صورت اختیار کر لی اور حد تو یہ ہے کہ جرأت جیسے شاعر نے جس کی پرورش و داخت دہلی میں ہوئی معاملہ بندی میں بام عروج تک رسائی حاصل کی اور رکیک جذبات کا اظہار انتہائی رکیک اور غیر مہذب پیرایہ میں کیا۔ اس کے علاوہ ناسخ کے ہاں بھی معاملہ بندی بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ آتش نے بھی معاملہ بندی سے کام لیا ہے لیکن ناسخ سے کم۔ عام شاعروں کے یہاں بھی معاملہ بندی ملتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رات کو چوری چھپے پہنچا جو میں
غل مچایا اس نے دوڑو چور ہے

مستی میں میں لگا ہی چکا تھا اسے گلے
بہکا جو پاؤں ہاتھ کمر سے نکل گیا

اور جرأت کا یہ قطعہ ملاحظہ ہو:

کل واقفِ راز اپنے سے وہ کہتا تھا یہ بات
جرأت کے یہاں رات جو مہمان گئے ہم

کیا جانئے، کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

جذبات و احساسات سے بے نیاز رہ کر شعر میں صناعی سے اور صرف صناعی سے کام لیا جانے لگا۔ چنانچہ اسی صناعی کے نتیجے میں رعایت لفظی اور ضلع جگت کو فروغ حاصل ہوا۔ یوں کہئے شعر کا مطلب گم ہونے لگا صرف الفاظ کی بازی گری ہوتی رہی۔ ایسا لگتا ہے کہ شعرا کا مقصود معنویت پیدا کرنا تھا بھی نہیں۔ مقصود یہی تھا کہ بس الفاظ کی بازی گری ہوتی رہے۔ اس کا لازمی حاصل یہ رہا کہ شاعری، شاعری نہ رہی، ہنرمندی اور صنعت گری کا نام شاعری قرار پایا۔ رعایت لفظی کے سلسلے میں یہ اشعار ہیں:

قبر کے اوپر لگایا نیم کا اس نے درخت
بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

بیٹھے تکیہ بھی لگا کر نہ کبھی اس دن سے
ہم فقیروں نے لیا جب سے سہارا تیرا

ساری رگیں ہوئی ہیں تنِ زار پر نمود
بے طاقتی نے جسم کو مسطر بنا دیا

معطّر اس کے نہانے سے بسکہ آب ہوا
حبابِ بحر ہر اک شیشۂ گلاب ہوا

کبھی جو میٹھی نظروں سے وہ دیکھے
کہوں آنکھوں کو میں بادام شیریں

تشبیہات اور استعارات سے۔یقیناً شعر سنور اور نکھر جاتا ہے۔ظاہری طور پر ہی بانکپن کا حامل نہیں ہوتا معنوی طور پر بھی تہہ دار اور طرح دار ہو جاتا ہے لیکن شرط یہی ہے کہ تشبیہات وغیرہ دور از کار اور بعید از فہم نہ ہوں بالکل واضح نہ بھی ہوں لیکن آسانی سے سمجھ میں آ جائیں۔انیسؔ، دبیرؔ اور نسیمؔ وغیرہ نے لکھنؤ دبستان سے تعلق رکھنے کے باوجود فصیح، سلیس، شستہ اور معنی خیز تشبیہات و استعارات وغیرہ سے کام لیا لیکن لکھنؤ کے عام شاعروں کے یہاں تشبیہات، گنجلک، رکیک اور زیادہ تر چیستانیت لیے ہوئے ملتی ہیں کہ کلام کا لطف جاتا رہتا ہے۔ان سے متاثر ہونے کا کیا سوال، طبیعت ان سے اِبا کرنے لگتی ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ کے شاعروں کے ہاں تشبیہات وغیرہ کا استعمال، دور کی کوڑی ہے۔اس نوع کے بھی چند اشعار دیکھیے:

لحد پر مہ وشوں کا پا کے مجمع — ستارے ٹوٹے پڑتے ہیں زمیں پر
گل برگِ تر سمجھ کے لگا بیٹھی ایک چونچ — بلبل ہمارے زخم جگر کے کھرنڈ پر
صیدِ دل کیوں کر بچے صیاد تیرے پیچ سے — زلف مثلِ دام ہے اور خال مثلِ دانہ ہے
گل اگر مکھڑا ہے تیرا تو ہے رنگیں عندلیب — شعلہ ہے عارض ترا تو دل مرا پروانہ ہے
زلف اس کی لے کے دل کو پھریوں ہوئی ہے برہم — ڈس کر کسی کو جیسے ناگن شتاب الٹے
ہر اک انگلی ہے اس کی شمع کافور — ہتھیلی اک بلوری شمع داں ہے

یہی حال مبالغہ آرائی کا ہے۔مبالغہ آرائی شاعری میں ہو سکتی ہے لیکن ایک حد تک۔ورنہ حد سے زیادہ مبالغہ آرائی اور نا قابل قیاس، برداشت نہیں کی جا سکتی۔لکھنوی شعرا نے اور تو کچھ نہ کیا، خیالات کے طوطا مینا اڑاتے رہے اور ایسی ایسی مبالغہ آرائی سے کام لیا کہ توبہ ہی بھلی! ہاں بعض ''شاعروں نے اعتدال سے بھی کام لیا لیکن کم۔مبالغہ آرائی کی یہ خصوصیت بھی لکھنوی شاعروں کا امتیاز ہے۔چند اشعار:

ناتواں ایسا ہوں گر سایہ پڑے دیوار کا — گر پڑے گویا کہ سقف آسماں بالائے سر
لاغر ہوں اس قدر کہ دکھائی نہ دوں گا میں — اپنی طرح کرے گا مجھے بے نشاں دہن

دبستان لکھنؤ کی یہ چند خصوصیات ہیں جن کا اجمالی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔جہاں تک اور خصوصیات کا تعلق ہے۔ان کے بارے میں جاننے کے لیے آپ سفارش کردہ کتب کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

ایک بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ دبستانِ لکھنؤ میں جہاں عریانت، فحش گوئی، نسائیت اور جنس زدگی عام تھی، مرثیہ، نعت اور منقبت جیسی اصناف نے ایک اعتدال اور توازن پیدا کیا۔اگر انیسؔ، محسنؔ، دبیر اور نسیمؔ جیسے شعرا اس ہونا کی اور ابتذال کے سیلِ بے اماں کو نہ روکتے تو پتہ نہیں دبستان لکھنؤ کی شاعری اور کون سا رخ اختیار کرتی۔

دبستانِ لکھنؤ کی ایک اہم اور ممتاز خصوصیت تحریکِ اصلاح زبان ہے۔تحریکِ اصلاح زبان میں ایک عنصر، دہلی کی حکومت، تہذیب اور زبان و شاعری سے خود کو ممیز کرنا تھا اور خاص طور پر شعر و ادب میں اپنے تشخص کو قائم کرنا تھا۔اس خصوص میں ناسخ کو اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے سنسکرت اور ہندی کے الفاظ کو اردو ٹکسال سے باہر نکالا۔حالانکہ دبستانِ دکن اور دبستان دہلی کی شاعری میں دکھنی کا ایک باعث سنسکرت اور ہندی کے الفاظ اور لہجہ بھی ہے۔جب کہ ناسخ نے ان کو مسترد کرتے ہوئے عربی اور زیادہ تر فارسی کے الفاظ کو جگہ دی تذکیر و تانیث کے اپنے قاعدے بنائے۔بیشتر متروکات کو رد کیا۔ دہلی سے جدا اصطلاحات داخل کیں۔یہ کام دہلی سے تھوڑی بہت ضد میں بھی ہوا اور اس کے قدرے منفی اثرات بھی مرتب ہوئے لیکن اس سے زبان کی بڑی حد تک اصلاح بھی ہوئی۔البتہ بعض شعرا ایسے ضرور ہیں کہ جنھوں نے ناسخ کی پورے طور پر پیروی نہیں کی مثلاً آتش نے ناسخ کے کئی پہلوؤں سے اتفاق نہیں کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. معاملہ بندی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔

2. دبستان لکھنؤ میں خارجیت سے کیا مراد ہے؟ تحریر کیجیے۔
3. کن اصناف کی وجہ سے دبستان لکھنؤ کی شاعری میں توازن اور اعتدال پیدا ہوا۔

18.4 دبستانِ لکھنؤ کے ممتاز شعرا

آپ نے دبستان لکھنؤ کی شاعری کے پس منظر اور اس دبستان کی خصوصیات سے آگاہی حاصل کی۔ اب ہم آپ کو دبستان لکھنؤ کے شاعروں سے واقف کرائیں گے۔ اگرچہ دبستان لکھنؤ کے شاعروں کی فہرست بے حد طویل ہے لیکن ہم یہاں صرف چند ممتاز شاعروں اور ان کے کلام پر روشنی ڈالیں گے۔

18.4.1 قلندر بخش جرأت

قلندر بخش جرأت، دبستان لکھنؤ کے ممتاز شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ امتیاز لکھنؤ ی شاعری کی خصوصیت، معاملہ بندی ہے۔ جرات دہلی میں پیدا ہوئے لیکن بچپن ہی سے لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں انہوں نے جعفر علی حسرت سے مشورہ سخن کیا۔ نواب محبت اللہ خان نے جرات کی سرپرستی کی اور ان کے کفیل رہے۔ بیشتر شعرائے لکھنؤ کی طرح جرأت نے بھی تصوف سے بے گانگی اختیار کی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری میں سوقیانہ جذبات، ہوس پرستی، نسائیت اور فحش گوئی کو راہ پانے کا موقع ملا۔ لکھنوی شاعری کی خصوصیات اپنی جگہ ان کے علاوہ جرات کے پاس زبان و بیان کی حد تک صفائی، سادگی اور فصاحت پائی جاتی ہے۔ جرات نے اگر معاملہ بندی کی طرف توجہ نہیں کی ہوتی تو یقیناً ان کے شاعرانہ کمال کو قبولیت حاصل ہوتی، اعتبار ملتا۔ چند اشعار:

اپنے پہلو سے جب وہ اٹھ کے چلا اے جرأت
اس کا منہ دیکھ کے بس رہ گئے مجبور سے ہم

پڑے ہے بزم میں جس شخص پر نگاہ تری
وہ منہ کو پھیر کے کہتا ہے اف پناہ تری

کل تم نہ تھے تو رات تھی پیارے بہت طویل
اب ہو تو دیکھ **لیجیو** دم میں کرے ہے آج

طلب اس سے کل جو مئے کی تو بھرا ہوا زمیں پر
مجھے شوخ نے دکھا کر قدح شراب الٹا

18.4.2 میر انشا اللہ خان انشا

میر انشا اللہ خاں انشا بھی دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد میر ماشا اللہ خاں صاحب علم اور ممتاز شاعر تھے۔ اگرچہ دہلی میں بھی وہ شاہ عالم کے مقربین میں شامل تھے لیکن ان کی زندگی کا اہم حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ انہوں نے انشا کی تعلیم پر پوری توجہ دی۔ لکھنؤ میں عیش و عشرت کے ماحول اور مصحفی سے چپقلش نے انشا کی شاعری کو موڑ دیا اور ان کی شاعری میں سوقیانہ رنگ در آیا۔ انشا کبھی سعادت علی خان کی مصاحبت میں رہے لیکن 1810ء میں انشا کی سعادت علی خاں سے بگڑ گئی۔ کہتے ہیں ان کی تنخواہ بھی بند ہوگئی۔ دیوانگی کا حملہ بھی ہوا اور آخری زندگی نہایت کسمپرسی میں گزری اور انہی حالات میں 1817ء میں انتقال کیا۔

انشا کے کلام پر ہر چند کہ دلی کے دبستان کے اثرات بھی ملتے ہیں لیکن دبستان لکھنؤ کی ساری خصوصیات ان کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ ان کے ہاں الفاظ کی شان، تراکیب کا شکوہ، محاورہ بندی، خارجیت، تصنع اور بناوٹ سب مل جاتے ہیں۔ زبان پر ان کو بے مثل قدرت تھی جس کا اظہار ان کے قصیدوں میں بھی ہوتا ہے۔ لکھنوی رنگ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ آپ حسن پہ اپنے گھمنڈ کرتے ہیں
کہ اپنے شیش محل میں ہی ڈنڈ کرتے ہیں

جی چاہتا ہے شیخ کی پگڑی اتاریئے
اور تان کر پٹاخ سے اک دھول ماریئے

میں نے جو وجد میں یہاں جیب کو پھاڑ غش کیا
کہتے ہیں اس نے بھی وہاں موند کواڑ غش کیا

لگی غلیل سے ابرو کی دل کے داغ کو چوٹ
پر ایسے ہے کہ لگے تڑ سے جیسے زاغ کو چوٹ

18.4.3 غلام ہمدانی مصحفی

غلام ہمدانی مصحفی بھی ان شعرا میں ہیں جنہوں نے دلی سے سکونت ترک کر کے لکھنؤ کو آباد کیا۔ ان کی عربی اور فارسی کی تعلیم دہلی میں ہوئی۔ انہوں نے فن عروض میں بھی مہارت حاصل کی۔ لکھنؤ میں انشا سے معرکہ آرائی کا سامنا کرنا پڑا اور پھر یہاں کے معاشرتی تہذیبی اور شعری تقاضوں سے ہم آہنگی بھی کرنی تھی لیکن انہوں نے اپنے رنگ کو لکھنؤ کے رنگ سے جدا رکھنے کی پوری پوری کوشش کی۔ مصحفی صرف شاعر نہیں، اعلیٰ پایہ کے ناقد بھی تھے انہوں نے اپنے اردو اور فارسی کے تذکروں میں شعر و شاعری پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے انہوں نے ایہام گوئی کو ناپسند کیا اور فصاحت و بلاغت کی ستائش کی۔ مصحفی کی شاعری، صرف شاعری نہیں انہوں نے قصائد اور غزلوں وغیرہ میں اپنے دور کے انتشار و اختلال اور مصائب و آلام کی تصویر کشی بھی کر دی ہے۔ مصحفی کے دہلی سے لکھنؤ آنے کا ایک بڑا مقصد یہاں کی فیاضی، دریا دلی اور شاعروں کی سرپرستی سے استفادہ کرنا تھا لیکن لکھنؤ میں بھی ان کی مالی حالت خراب رہی یہی پس منظر تھا جس کی وجہ سے ان کے مزاج میں تلخی اور ترشی نے جگہ بنالی۔ ان کے کلام میں یہ سارا پس منظر روشن ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ناداری کا کئی اشعار میں حوالہ دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

ہر چند کہ ہم فاقوں سے جان دیتے ہیں — تنخواہ تو کب نعیم خان دیتے ہیں
ہے لب پہ خوشامد اور غضب کے مارے — بیٹھے ہوئے جی میں گالیاں دیتے ہیں

.....

شاہا کہ وسیع ہے ترا دستِ سخا — گزرے کئی ماہ ازرہِ لطف و عطا
انعام ہوا تھا جو دو شالہ مجھ کو — رنگت کے لیے وہ کھٹائی میں پڑا

اور یہ غزل کے اشعار:

زیرِ دیوارِ چمن ذبح مجھے کر صیاد — شاید اڑتے ہوئے یاں سے میرے پر جائیں کہیں
دل میں کہتے تھے ملے یار تو کچھ اس سے کہیں — مل گیا وہ تو نہ اک حرف زبان سے نکلا
چھیڑے ہے اس کو غیر تو کہتا ہے اس سے یوں — کوئی کھڑا نہ ہو پسِ دیوار دیکھنا

18.4.4 امام بخش ناسخ

امام بخش ناسخ، دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعروں میں بھی ممتاز ہیں۔ ایک بلند مرتبت شاعر کی حیثیت سے بھی ناسخ کی اہمیت ہے اور اصلاح زبان کے سلسلے میں ان کی خدمات تاریخ کا حصہ ہیں۔ اصلاح زبان کے سلسلے میں انہوں نے سنسکرت کے ثقیل الفاظ اور قدیم ہندی محاورات وغیرہ کو خارج کیا اور ان کی جگہ مانوس عربی اور فارسی کے الفاظ داخل کیے۔ غزل کی زمینوں میں تصرف کیا اور غزل کو عاشقانہ جذبات کے علاوہ دیگر مضامین کی ادائی کے قابل بنایا۔ تذکیر و تانیث کے اصول بنائے، ردیف اور قافیے کے آداب طے کیے وغیرہ۔ ناسخ نے قطعات اور رباعیات وغیرہ بھی کہی ہیں لیکن ان کا اصل شعری سرمایہ غزلوں پر مشتمل ہے اور غزلوں کا رنگ وہی ہے جو دبستان لکھنؤ کا رنگ ہے۔ شکوہ الفاظ، بھاری بھر کم تشبیہات اور استعارات، صنعتوں کا استعمال، بلند پروازی اور خیال کی نزاکت وغیرہ سب کچھ۔ قافیے اور ردفیں بھی بڑی بھاری بھاری لیکن معنویت کی کمی، بوجھل پن اور تاثیر ندارد۔ ناسخ کے ہاں لکھنؤ کا عام رنگ نظر آتا ہے۔ محبوب کے لوازم خارجی اور متعلقاتِ ظاہری کو انہوں نے جگہ جگہ منظوم کیا ہے۔ ناسخ کے انداز بیان سے قاری فوراً متاثر ضرور ہوتا ہے لیکن جب معنویت کی تہیں کھولنے کی کوشش کی جاتی ہے تو ناکامی ہوتی ہے۔ غرض کہ ناسخ کا کلام دبستان لکھنؤ کا نمائندہ کلام ہے۔ اشعار ہیں:

کس ادا سے تو نے شانہ اپنے بالوں میں کیا — سر پر ہر محبوب کے خط مانگا ارا جلوہ
مار ڈالا جسے جان کے جوں قاتل نے — زلفِ مشکیں میں یقین ہے وہ مرا دل ہوگا

18.4.5 خواجہ حیدر علی آتش

خواجہ حیدر علی آتش، خواجہ علی بخش کے بیٹے تھے۔ بزرگوں کا وطن بغداد تھا۔ اجداد ترکِ وطن کر کے ہندوستان آئے اور دہلی میں پرانے قلعے میں سکونت اختیار کی۔ آتش کا سنہ ولادت 1778ء ہے۔ انہوں نے ایک طویل عمر پائی اور 1867ء میں انتقال کیا۔ انہوں نے باقاعدہ کوئی تعلیم حاصل نہیں کی البتہ صاحبِ علم امیروں کی صحبت میں رہ کر بہت کچھ حاصل کیا۔ لکھنؤ آ کر انہوں نے مصحفی کی شاگردی اختیار کی۔ طبیعت میں فقیری غالب تھی کسی دربار سے تعلق پیدا نہیں کیا۔ آتش نے فارسی میں بھی شاعری کی۔ فارسی کی نازک تشبیہات وغیرہ پر آتش کی نظر گہری تھی۔ آتش نے لکھنوی رنگ اختیار کرنے کے باوصف دبستان دہلی کے کئی خصوصیات کو برقرار رکھا۔ اسی طرح انہوں نے اصلاح زبان کے سلسلہ میں ناسخ کے بہت سے متروکات کو قبول نہیں کیا اس کی وجہ سے یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ مصحفی کے شاگرد تھے۔ آتش نے خارجی موضوعات کو بھی اختیار کیا اور محبوب کے سراپا پر بھی نظر رکھی لیکن اسی کے ساتھ ان کے پاس صاف شستہ زبان بھی ہے۔ مضامین میں شوخی، رنگینی اور رعنائی پائی جاتی ہے تو زبان میں سادگی اور روانی بھی ہے۔ ان کے ہاں کبھی کبھار بندش سست ہوجاتی ہے اور محاوروں کا غلط استعمال بھی ملتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر مواد اور طرز ادا میں ان کے ہاں توازن اور اعتدال ہے۔ اس طرح انہوں نے لکھنؤ دبستان کی شدت کو کم کرنے میں اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ آتش کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے نغمہ ساز کا
شبہ ہوجاتا ہے پردے سے تری آواز کا

معرفت میں تیری ذات پاک کے
اڑتے ہیں ہوش و حواس ادراک کے

آنکھوں سے جائے اشک ٹپکنے لگا لہو
آتش جگر کو دل کی مصیبت نے خوں کیا

تنہائی ہے، غریبی ہے، صحرا ہے، خار ہے
کون آشنائے حال ہے کس کو پکاریئے

بیڑا ہمارے قتل کا کیوں کر اٹھاؤ گے
کس کر کمر بندھی ہے تو دردِ شکم ہوا

اپنی معلومات کی جانچ:

1. جرات کی شاعری کی اہم خصوصیت کیا ہے؟
2. انشا کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔
3. ناسخ کی دبستان لکھنؤ میں کیا اہمیت ہے؟

18.5 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے آپ کو دبستان لکھنؤ سے واقف کرایا۔ وہ پس منظر بتایا گیا جس میں دبستان لکھنؤ وجود میں آتا ہے۔ تمہید کے تحت آپ نے اس اکائی کے بارے میں معلومات حاصل کیں آپ یہ جان چکے ہیں کہ دبستان لکھنؤ کی شاعری کی کیا خصوصیات ہیں۔ دبستان دہلی میں جو اخلاقی عناصر، سادگی اور ثقہ پن تھا اس کی وجہ تصوف بتائی جاتی ہے۔ چونکہ لکھنوی شاعری میں تصوف کا عمل دخل نہیں تھا اس لیے شاعری محض عشق مجازی کا اظہار بن کر رہ گئی۔ دولت کی فراوانی اور عیش و عشرت کے ماحول کی وجہ سے شاعری عریاں نگاری اور صنف نازک کے اعضائے جسمانی، بناؤ سنگھار اور اس کی آرائش و زیبائش کی عکاس و ترجمان ہوگی اور بوالہوسی کا شکار ہوگئی۔ اقبال کے الفاظ میں دبستان لکھنؤ کے شعرا کے اعصاب پر عورت سوار ہوگئی۔

اسی طرح لکھنوی شعرا نے شعر کے معنوی حسن پر توجہ کرنے کی بجائے اس کے ظاہری حسن کو ہی سب کچھ سمجھا یہی وجہ ہے کہ تشبیہ و استعارہ، صنائع و بدائع کا اہتمام کیا جانے لگا رعایت لفظی اور ضلع جگت کو راہ ملی۔ شاعری، سستی تفریح اور وقت گزاری کا ذریعہ بن گئی۔ اس سے جنسی تلذذ حاصل کیا جانے لگا اور قافیہ پیمائی، جھوٹ اور مبالغے کو آرٹ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

ہم نے دبستان لکھنؤ کے پانچ ممتاز شاعروں کے بارے میں آپ کو بتایا۔اس طرح اس دبستان کے بارے میں آپ کی واقفیت خاصی ہو چکی ہوگی اس اکائی میں آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی۔آخر میں امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں اور مشکل الفاظ کے معنی بھی۔ہم نے سفارشی کتب کی فہرست بھی دی ہے کہ آپ مزید مطالعہ کر سکیں۔

18.6 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے۔

1. دبستان لکھنؤ کا پس منظر تحریر کیجیے۔
2. دبستان لکھنؤ کی شاعری کی کیا خصوصیات ہیں؟
3. دبستان لکھنؤ کے کن ہی تین شاعروں کے بارے میں اظہار خیال کیجیے۔

18.7 فرہنگ

الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی	الفاظ	= معنی
ابتذال	=	اخلاقی پستی	سرکشی	=	بغاوت، نافرمانی	دگرگوں	= الٹ پلٹ، تہہ و بالا
ناگفتہ بہہ	=	جس کا نہ کہنا بہتر ہو، شرمناک	تہمت	=	الزام	ترجیح	= فضیلت، برتری
فروغ	=	روشنی	ضخیم	=	بڑے حجم والا، موٹا	ثقہ	= معتبر
ہزل	=	بے ہودہ، وہ نظم جس میں مسخرے پن کے مضامین ہوں				زن	= عورت
واسوخت	=	نظم جس میں معشوق کے ظلم و ستم کا حال بیان کر کے اس سے بیزاری کا اظہار کیا جاتا ہے				بہتات	= کثرت، زیادتی
ریختی	=	وہ نظم جو عورتوں کی بولی میں کہی جائے	بعید از فہم	=	جو سمجھ میں نہ آئے	ابا	= نفرت، اختلاف
ضلع جگت	=	پہلو دار بات، جس میں رعایت لفظی پائی جائے					

18.8 سفارش کردہ کتابیں

1. ابواللیث صدیقی — لکھنؤ کا دبستان شاعری
2. علی جواد زیدی — دو ادبی اسکول
3. رام بابو سکسینہ — تاریخ ادب اردو

اکائی 19 : نظیر اکبرآبادی۔ ہندوستانی تہذیب کا نمائندہ

ساخت

19.1 تمہید

19.2 حالات زندگی

19.3 اردو میں نظم نگاری کا پس منظر

19.4 نظیر کی نظم نگاری

19.5 محاکات نگاری اور لسانی خصوصیات

19.6 خلاصہ

19.7 نمونہ امتحانی سوالات

19.8 فرہنگ

19.9 سفارش کردہ کتابیں

19.1 تمہید

نظیر اکبرآبادی تاریخ ادب اردو میں ایک غیر معمولی اہمیت کا حامل سخن ور ہے۔ اردو میں باقاعدہ نظم نگاری کا آغاز نظیر اکبرآبادی سے ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ نظیر سے پہلے اردو میں نظم نگاری ناپید تھی۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ اور ملک الشعرا غواصی سے لے کر نظیر اکبرآبادی تک متعدد شاعروں نے مثنویوں، غزلوں اور قصیدوں کے ساتھ ساتھ نظم نگاری پر بھی توجہ کی ہے لیکن اس میدان میں نظیر اکبرآبادی کا نام ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اکائی میں ہم نظیر کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔

19.2 حالاتِ زندگی

نظیر اکبرآبادی اردو شاعری کا ایک بے انتہا بلند قامت نام ہے۔ قدیم تذکروں میں نظیر اکبرآبادی کی زندگی کے بارے میں مختصراً ذکر کیا ہے۔ ان کے شاگردوں میں ایک نام حکیم میر قطب الدین باطن کا بھی ہے۔ انہوں نے نظیر اکبرآبادی کا ذکر نسبتاً تفصیل کے ساتھ اپنے تذکرے ''گلستانِ بے خزاں'' میں کیا ہے۔ نظیر کے ایک ہم سوانح نگار پروفیسر مسعود عبدالغفور شہبازؔ نے اپنی مشہور کتاب ''زندگانی بے نظیر'' میں ان کی حیات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے والد کا نام محمد فاروق تھا۔ اور نظیر ان کی تیرھویں اولاد تھے۔ نظیر کی تاریخ پیدائش کے بارے میں محققین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے لیکن اس بات پر اتفاق رائے ہے کہ وہ محمد شاہ ثانی کے عہد میں پیدا ہوئے۔ عام طور پر ان کی پیدائش 1735ء مان لی گئی ہے۔

نظیر اکبرآبادی کو ابتدا ہی سے مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ عہد طفلی میں دلی نادر شاہ کے پے در پے حملوں سے دوچار رہی جس کی وجہ سے اہل دلی کو اپنی زندگی عسرت میں بسر کرنی پڑی اور آخر میں نظیر کو بھی دلی چھوڑ آگرہ میں سکونت اختیار کرنی پڑی۔ لہٰذا ترکِ وطن کے بعد نظیر اکبرآبادی دہلوی کے بجائے اکبرآبادی کہلائے جہاں ان کی زندگی بسر ہوئی۔ وہ ایک علم دوست شخص تھے جنہیں اردو اور فارسی کے علاوہ عربی اور دیگر ہندوستانی زبانوں پر بھی دست رس تھی۔ نظیر نے خود کے حالاتِ زندگی، ذوق شوق اور اپنے حلیہ اور قد و قامت کو دلچسپ پیرائے میں نظم کیا ہے:

کہتے ہیں جو نظیر سُنیے ٹک اس کا بیاں
تھا وہ معلم غریب بزدل و ترسندہ جاں

فضل نے اللہ کے اس کو دیا عمر بھر
عزت و حرمت کے ساتھ پارچہ و آب و ناں

منہم نہ تھا علم سے کچھ بھی عربی کے اسے
فارسی میں ہاں مگر سمجھے تھا کچھ ایں و آں

شعر و غزل کے سوا شوق نہ تھا کچھ اسے
اپنے اسی شغل میں رہتا تھا خوش ہر زماں

سست روش، پست قد، سانولا ہندی نژاد
تن بھی کچھ ایسا ہی تھا قد کے موافقِ عیاں

ماتھے پہ اک خال تھا، چھوٹا سا مَسّے کے طور
تھا وہ پڑا آن کر، ابروؤں کے درمیاں

نظیر رنگین مزاج اور شوقین انسان تھے۔ وہ صحبت پسند آدمی تھے اور بچوں، جوانوں اور بوڑھوں میں بھی مقبول تھے اور مختلف قسم کے کھیل، تماشوں اور تفریحوں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ معلّمی ان کا پیشہ تھا اور زندگی بھر وہ اسی پیشہ سے منسلک رہے۔ پیشہ حد درجہ شریفانہ تھا مگر اس کا مقدر مفلسی تھا چنانچہ خود کہتے ہیں:

وہ جو غریب غربا کے بچے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

چنانچہ ان کی زندگی بھی عسرت ہی میں بسر ہوئی۔ آگرے کے گلی کوچوں اور بازاروں میں میلوں ٹھیلوں میں ان کی زندگی گذری۔ وہ عوام سے قریب رہے۔ لہذا عوامی زندگی، زندگی کے معاشرتی پہلوؤں ہندوؤں اور مسلمانوں کے رسم و رواج اور عقائد سے انہیں قرب حاصل رہا ہے اور اسی ملی جلی ہندوستان تہذیب کو اور طریقۂ زندگی کو انہوں نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ دکن کے تاجدار سلطان محمد قلی قطب شاہ کی طرح وہ عوامی زندگی سے قریب ہیں۔ لہذا وہ عوامی اور عوام پسند شاعر کی حیثیت سے چاہے اپنے عہد میں خواص میں مقبول نہ رہے ہوں، مگر وہ عوام کے دلوں پر حکمرانی کرتے رہے۔

نظیر اکبرآبادی کا انتقال 1830ء میں ہوا۔ سنّی اور شیعہ مسلک کے لوگوں نے انہیں برابر اپنے دل میں جگہ دی تھی۔ وہ دونوں ہی فرقوں میں مقبول تھے لہذا ان کی نماز جنازہ بھی سُنی اور شیعہ دونوں طریقوں سے پڑھائی گئی۔ تدفین میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی برابر کے شریک تھے۔ نظیر اکبرآبادی کے شاگردوں میں ہندو اور مسلمان دونوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. نظیر کے والد کا نام کیا تھا؟

2. نظیر کس پیشے سے وابستہ تھے۔

3. ''زندگانی بے نظیر'' کے مولف کا نام بتایئے؟

19.3 اردو میں نظم نگاری کا پس منظر

اردو میں نظم نگاری کی ابتدا اگر چہ انگریزوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد شروع ہوئی۔ محمد حسین آزاد' الطاف حسین حالی اور ان کے معاصرین نے اسے تحریک کی صورت میں آگے بڑھایا' مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو میں نظم نگاری کا شعور ابتدا ہی سے رہا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی شاعری اگر چہ غزل کی ہی شاعری ہے' تاہم ان کی غزلوں میں نظم کا پیرایہ اور موضوعات موجود ہیں۔ قلی قطب شاہ کی شاعری میں جسے اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر کہا جاتا ہے' مختلف موضوعات پر بے شمار نظموں میں جدید نظم کے کھلے ڈلے نمونے ملتے ہیں۔ عید' دیوالی' دسہرہ' شب برات جیسے موضوعات پر اس کی غیر شعوری طور پر لکھی گئی نظمیں آج کہی جانے والی نظموں کے نقوش ہیں۔ نظم نگاری میں ہیئت اور پیرایہ بیان کے علاوہ موضوع کی وحدت کی بڑی اہمیت ہے اور محمد قلی قطب شاہ سے منسوب نظمیں اس کی مثال ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کے بعد اردو کی مختلف مثنویوں میں ایسے حصے بھی موجود ہیں جنہیں نظم کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ سلسلہ قدیم مثنویوں کے علاوہ ''عہد میر'' تک ملتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کا تعلق بھی اسی عہد سے ہے۔ اردو غزل اگر چہ اردو شاعری کا طرۂ امتیاز ہے مگر یہی اس کی ساری کائنات نہیں ہے' دیگر اصنافِ شعر کے ساتھ نظم کا بھی ہمارے یہاں شعور موجود تھا جس کو پہلی مرتبہ ایک شان اور وقار کے ساتھ نظیر اکبر آبادی نے اپنی شاعری میں برتا۔ نظیر اردو کے ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ انہیں غزل پر بھی دست رس حاصل تھی اور تمام تر ہنرمندی اور شاعرانہ بانکپن کے ساتھ انہوں نے غزلیں کہیں جو تاریخ ادب اردو میں نظر انداز ہوتی رہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ نظیر اکبر آبادی کی شناخت نظم سے قائم ہوئی۔ عجیب بات ہے کہ نظیر کی نظم نگاری کو اردو شاعری میں وہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جس کی وہ مستحق تھی۔ نظم نگاری کی نظیر کی یہ شعوری مگر انفرادی کوشش تھی جسے غزل کی چکاچوند میں وہ اعتبار نہیں حاصل ہوسکا جسے بعد کے عہد میں غزل کے ساتھ اعلیٰ مقام حاصل ہوا۔

نظیر اکبر آبادی اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں پیدا ہوئے۔ ان کا عہد میر' سودا اور میر حسن کا عہد تھا اور یہ سبھی شاعر اردو غزل کے اساتذۂ سخن میں بے انتہا مقبول اور مشہور تھے۔ یہ عہد اردو غزل کا زرین دور تھا۔ سماجی اعتبار سے یہ عہد ایک زوال آمادہ تاریخ کا دور تھا جس میں سماجی زندگی کی ہر سطح پر انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ پرانی اقدار ختم ہو رہی تھیں' حکومت کی چولیں ڈھیلی پڑ چکی تھیں' معاشی زندگی تباہ ہو چکی تھی۔ غربت و افلاس مقدر بن چکا تھا۔ صنعت و حرفت جو زندگی گذارنے کا بہت بڑا سہارا تھی رو بہ زوال تھی۔ ہنرمندوں اور فنکاروں کی معیشت برباد ہو چکی تھی اور جاگیردارانہ نظام کی بنیادیں ہل چکی تھیں جن کے سہارے عام زندگی کا گذارا ہوتا تھا۔ نظیر اکبر آبادی نے جب آنکھیں کھولیں وہ افلاس و ادبار کا دور تھا۔ 1830ء میں نظیر اکبر آبادی کے انتقال تک ہندوستانی معاشرہ جس ذہنی اذیت سے گذر رہا تھا' اس کے اشارے غزل میں کبھی کبھار اشاروں اور کنایوں میں بھی بیان ہوئے ہیں' لیکن نظیر نے اپنے اظہار کے لیے نظم کا پیرایہ اختیار کیا۔ شاعری صرف داخلی جذبات کے اظہار کا نام نہیں ہے' اسے خارجی زندگی کا واقعاتی بیان بھی کرنا ہوتا ہے' اور عصری زندگی کو وسیع تر سیاق میں بالتفصیل بیان کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

نظیر اکبر آبادی نے اپنے عہد کی اس اہم ترین ضرورت کے اظہار کے لیے نظم کا پیرایہ اختیار کیا اگر چہ ان کی یہ انفرادی کوشش اس عہد میں انہیں سے مخصوص رہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ نظیر کی نظم نگاری کی یہ انفرادی کوشش اردو نظم نگاری کے آسمانوں کو چھوتی ہے اور اس ضمن میں بقول تاراچند نظیر اردو شاعری کے آسماں پر سب سے الگ اور سب سے روشن اور چمکدار ستارے کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کیے ہوئے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. نظیر سے پہلے نظم کی کون سی اصناف مرثیوں کے لیے مستعمل تھیں؟

2. نظیر اردو کے علاوہ کون سی زبانوں پر مہارت رکھتے تھے؟
3. نظیر نے کن کن موضوعات پر نظمیں کہی ہیں؟
4. آدمی نامہ میں نظیر نے کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟
5. نظیر کے کلام میں ہندوستانی تہذیب کی نشاندہی کیجیے۔

19.4 نظیر کی نظم نگاری

جیسا کہ ابتدا میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اردو میں نظم کوئی نئی ایجاد نہیں ہے بلکہ یہ ہماری شعری اصناف میں اور بطورِ خاص مثنوی کا ایک داخلی جز رہی ہے، لیکن اردو شاعری پر جس صنفِ سخن کی حکمرانی رہی ہے وہ غزل اور محض غزل تھی۔ نظیر اکبرآبادی نے پہلی بار اس میں حتی المقدور وسعت پیدا کی اور ترجیع بند اور ترکیب بند میں جو مرثیوں کے پیمانے تھے، انہیں اردو نظم کے لیے برتا اور اپنی اس ادبی کاوش میں نظم کے اس پیرایۂ اظہار کی نہ صرف شعوری داغ بیل ڈالی بلکہ وسعت میں اسے ہمدوش ثریا کر دیا اور موضوع میں تنوع کی دلکشی کے ساتھ آسمان سے ہمکنار کر دیا۔ غزل، مثنوی، مرثیہ وغیرہ اردو کی اصنافِ شعر موضوعات اور ہیئت کی پابند تھیں۔ نظیر نے اظہارِ خیال کے لیے نظم میں جو پیرایہ بیان عطا کیا وہ اسقدر طاقت ور اور توانا تھا کہ حسن و عشق کی وارداتوں کے بیان پر بھی قدرت رکھتا تھا اور حسن و عشق کی دنیا سے باہر انسان کے دلی جذبات، عصری حالات و رجحانات اور سماجی مسائل، فقر و فاقہ، مناظرِ قدرت، روزی روٹی کے مسائل، توکل و استغنا کے علاوہ ہر طرح کے مظاہر کو اور سماج میں پیش آنے والے سانحات اور واقعات کو من و عن بیان کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔

نظیر اکبرآبادی صوفیانہ مزاج رکھتے تھے اور انسانی دکھ درد کا واقعاتی بیان کرنے پر انہیں قدرت حاصل تھی۔ وہ عصری زندگی کو اپنی شاعری کا جز بنا لیتے تھے، مشاہدہ کی یہ باریکی ان کے معاصرین میں کسی حد تک صرف سودا کی شاعری کا حصہ ہے لیکن جس انداز سے نظیر نے اپنی شاعری میں عصری زندگی، میلوں ٹھیلوں، خوشیوں اور غموں کی نقش نگاری کی ہے۔ قومی یکجہتی کو ایک مقصدِ حیات کے طور پر پیکر شاعری میں پیش کیا ہے۔ مختلف مذہب کے تئیں جس احترام کو اپنی شاعری میں ملحوظ رکھا ہے، وہ نظیر کی شاعری کے تقریباً نصف صدی گذر جانے کے بعد تک ہمارے شعری منظرنامے پر ابھر نہیں سکا۔ نظیر اکبرآبادی کے بعد انگریزی شاعری کے زیر اثر اور ''انجمن پنجاب'' کے زیر سایہ اردو نظم کو اپنی نئی زندگی نصیب ہوئی جو ہماری ادبی تحریک کا حصہ بھی اور ادبی تحریک کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے نظیر اکبرآبادی کی نظم نگاری کے برعکس جوان کی انفرادی کوشش تھی۔ آزاد اور حالی کے بعد توانا درخت بن گئی۔ انفرادی کوشش اور ان کوششوں سے ملنے والی عظمتیں اپنی جگہ مسلم ہوتی ہیں، لیکن جب ادب اور فن کسی تحریک کے زیر اثر آتے ہیں تو ان کا ارتقا تیز تر ہو جاتا ہے۔ اس میں توانائی اور وجاہت پیدا ہوتی ہے اور اسے مختلف زاویہ ہائے نظر سے شعر و ادب میں برتا جاتا ہے۔ اس میں تجربات کی بوقلمونی شامل رہتی ہے، لیکن انفرادی سطح پر کی گئی کوششیں، شعر و ادب کی تحریکوں میں رہنمایانہ حیثیت حاصل کر لیتی ہیں۔ نظیر اکبرآبادی کی نظم نگاری کو بھی اردو نظم میں رہنمایانہ حیثیت حاصل ہے۔

انسان سماجی جاندار ہے۔ وہ اپنے ماحول اور اطراف سے تجربے حاصل کرتا ہے۔ اسی کا مشاہدہ اس کی فکر کو تیز اور شعور کو بیدار رکھتا ہے۔ اگر وہ سماجی زندگی کے تئیں حساس اور باخبر ہو تو اس کا ماحول اور اس ماحول میں حاصل شدہ تجربات سے وہ اپنی ذہنی سطح کے اعتبار سے کام لیتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی ایک بڑے فنکار اور شاعر تھے۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی اور برج زبان کے عالم تھے۔ لہذا انہوں نے اپنے علم، تجربے، عصری زندگی اور ماحول کے تقاضوں سے علمی و ادبی اعتبار سے کچھ لیا بھی ہے تو بہت کچھ اسے دیا بھی ہے۔ نظیر نے اپنے اطراف کی سماجی زندگی کو، رہن سہن کو، طرز زندگی کو، میلوں ٹھیلوں کو، بزرگوں کو، عرس کو مختلف ہندو اور مسلمان تہواروں کو، تاج محل کو، یہاں تک کہ کورے برتنوں، جانوروں، کگڑی جیسی سبزیوں کو بھی انتہائی فنکاری سے اور فلسفیانہ اور علامتی طور پر نظم کیا ہے۔ عوامی زندگی اور موضوعات کو نظیر نے جس انداز سے پیش کیا ہے اور موضوعات کو جو اہمیت دی

ہے وہ ان کی فکر وخیال کی بالغ ترقی پسندی تھی۔ اردو میں ترقی پسند تحریک پر نظیر کی اس فکر کے اثرات ہیں۔ نظیر کی اس ترقی پسندیت کا اندازہ نظیر پر ترقی پسند ناقدین مثلاً احتشام حسین اور مجنوں گورکھپوری کے مضامین سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ ترقی پسند ادب کی ادب اور شاعری سے جو توقعات تھیں، نظیر کی شاعری اس کے لیے خشت اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔

نظیر اکبرآبادی کی فکر اور زندگی کے بارے میں ان کے رویے میں بڑی وسعت ہے، یہ وسیع القلبی اور وسیع النظری اگرچہ اردو شعر وادب کا مزاج رہی ہے اور اسی نے اس زبان وادب کو 'ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علامت بنادیا ہے' مگر اس کی اعلیٰ ترین مثال نظیر اکبرآبادی کی شاعری ہے۔ اس موضوع کو نظیر کے ناقد نے سراہا ہے اور ان کی اس فکر کا احترام کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ مگر دوسری زبانوں کے ادیب بھی اس مثبت فکر اور رویے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اس کا خوب اعتراف بھی کیا۔ پروفیسر احتشام حسین نے اس ضمن میں ایک ہندی ناقد کا قول نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اس خشک اور اجاڑ سنگم پر آ کر نظیر نے اذان بھی دی اور سنکھ بھی پھونکا، تسبیح بھی لی اور جینو بھی پہنا، محرم میں روئے تو ہولی میں بھانڈ بھی بنے، رمضان میں روزے رکھے تو سلونوں پر راکھی باندھنے کو مچل پڑے، شبرات پر مہتابیاں چھوڑیں تو دیوالی پر دیب سجائے، نبی، رسول، ولی، پیر، پیغمبر کے لیے جی بھر کے لکھا تو کرشن جی، مہادیو، نرسی، بھیروں اور نانک کو بھی خراج عقیدت پیش کیا۔ گل وبلبل پر کہا تو آم اور کویل کو پہلے یاد رکھا۔ پردے کے ساتھ بسنتی ساڑی بھی یاد رہی اور تو اور گرمی، برسات اور سردی پر بھی لکھا۔ بچوں کے لیے ریچھ کا بچہ، کوا، ہرن، گلہری کا بچہ، تربوز، کنکوے بازی، بلبلوں کی لڑائی، ککڑی، تیراکی، تل کے لڈو پر لکھنے بیٹھے تو بچہ بن گئے۔ ہر بچہ گلی کوچے میں گاتا پھر رہا ہے۔ جوانوں اور بوڑھوں کو پند دینے بیٹھے تو لوگ وجد میں آ گئے، جیسے قرآن، حدیث، وید، گیتا، اپنشد، پران سب گھول کر پی جانے والا کوئی پہونچا ہوا بزرگ بول رہا ہو''۔

مذکورہ ساری باتیں ہماری ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی بنیادیں ہیں جن پر اردو زبان وادب کو بجا طور پر فخر ہے۔ نظیر کی شاعری صرف شاعری نہ ہو کر ہماری قومی تہذیب کی تاریخ کا مرقع ہے اور یہی نظیر کی بنیادی اہمیت بھی ہے۔ نظیر نے اپنے ہم عصروں میں چاہے کوئی بلند مرتبہ حاصل نہ کیا ہو، تاہم بعد کی اردو شاعری پر اس کے خاموش اثرات مرتب ہوئے اور وہ سارے موضوعات اور زندگی کے تئیں رویے بیسویں صدی کی اردو شاعری کا حصہ بنے۔ جو شاعر اپنے معاصرین میں مقبول نہ ہوسکا اس نے بعد کی اردو شاعری کو متاثر ہی نہیں کیا بلکہ اس کے لیے روشنی کا باعث ثابت ہوا۔ 1936ء میں ابھرنے والی ترقی پسند تحریک اور اس کے موضوعات سب سے پہلی مرتبہ نظیر کی شاعری میں نمایاں ہوئے۔ غریبی، افلاس، روٹی، کپڑا اور مکان اور محنت ومزدوری یہ سب نظیر کی شاعری میں موجود ہیں۔ لہٰذا انفرادی سطح پر وہ اردو ادب میں ترقی پسندانہ خیالات کے رہنما تھے اور ہمیں ترقی پسندی کی مارکسی نقطۂ نظر کے تحت نہیں بلکہ انسانی فکر کے پس منظر میں اس کی توضیح وتعریف کرنی ہوگی۔ نظیر کی شاعری کا تنوع اردو کے نظم گو شاعروں کو بہت کم نصیب ہوا ہے۔ بعد کے آنے والے اردو شاعروں میں موضوعات کے تنوع کی یہ دولت نایاب اقبال اور جوش کا حصہ ہے۔

نظیر کے یہاں موضوعات کا جو تنوع ہے، وہی تنوع ان کی نظموں کے شعری اصناف میں بھی ہے۔ ان کی نظمیں مسدس، مخمس، مثلث، ترجیع بند اور ترکیب بند وغیرہ مختلف پیرایۂ بیان رکھتی ہیں۔ نظیر کے موضوعات عام انسانی زندگی اور اس سے متعلق بوقلموں مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ کی ایک نظم ''آدمی نامہ'' ہے۔ ساری کائنات آدم اور آدمی ہی کے گرد گھومتی ہے۔ اس اشرف المخلوقات کے مختلف رنگ ہیں اور یہ مختلف رنگ اس کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ عام آدمی بھی ہے، بادشاہ وفقیر بھی ہے، نمازی اور پاکباز بھی ہے، ابدال وغوث وولی بھی ہے، غرض اس کے ہزار رنگ ہیں۔ نظیر نے آدمی کی اس متنوع زندگی کی جو تصویر کشی کی ہے، اس سے آدمی کی نفسیات اور سماجی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔ ''آدمی نامہ'' کے چند بند ملاحظہ کیجیے:

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی　　اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی　　نعمت جو کھا رہا ہے، سحر ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا　　شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا بر ملا　　یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہوچکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں　　بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نماز یاں　　اور آدمی ہی ان کے چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یہ ساری نظم انسانی زندگی کا مرقع ہے اور غیر معمولی مشاہدہ اور فلسفیانہ اندازِ فکر اور اپنے آہنگ کی وجہ سے ایک شہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

روٹی اور روزی کا مسئلہ انسانی سماج کا ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کو بھی نظیر نے اپنے غیر معمولی مشاہدہ اور بلند فکر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نظیر کے زمانہ میں ابھی مارکسی فلسفہ اور اشتراکیت کا دور دور تک پتہ نہیں تھا، مگر نظیر کی فکر میں گہرائی تھی اور ضروریاتِ زندگی اور اس میں پیش آنے والے مسائل کا انہیں ادراک تھا، وہ گہرے مشاہدے اور توانا فکر کے شاعر تھے اور زندگی میں روٹی کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ بھوکے پیٹ بھجن نہیں ہوسکتا۔ ان کی نظم ''روٹیاں'' اس پس منظر میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ چند بند یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں
پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں
سینے اوپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے
یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے
ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہی جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

روٹی نہ پیٹ میں ہو تو پھر کچھ جتن نہ ہو
میلے کی سیر، خواہشِ باغ و چمن نہ ہو

بھوکے غریب دل کی خدا سے لگن نہ ہو
سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو
اللہ کی بھی یاد دلاتی ہیں روٹیاں

کپڑے کسی کے لال ہیں روٹی کے واسطے
لمبے کسی کے بال ہیں روٹی کے واسطے
باندھے کوئی رومال ہیں روٹی کے واسطے
سب کثیف اور کمال ہیں روٹی کے واسطے
جتنے ہیں روپ سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی کا رب ازل سے ہمارا تو ہے ضمیر
روکھی بھی روٹی حق میں ہمارے ہے شہد و شیر
یا پتلی ہوئے ' موٹی خمیری ہو یا فطیر
گیہوں کی ' جوار باجرے کی جیسی ہو نظیر
ہم کو تو سب طرح کی خوش آتی ہیں روٹیاں

نظیر کا مزاج قلندرانہ تھا۔ اس نظم میں بھوک کا فلسفہ ہے' ان کی قلندرانہ استغنا ہے اور یہ زندگی کرنے کا ہنر سکھاتی ہے۔ اسی نوعیت اور موضوع پر ان کی ایک اور نظم چپاتیاں بھی ہے۔ پہلی مخمس ہے اور دوسری مسدس۔ یہ نظمیں اپنے آہنگ اور سے بھی پہچانی جاتی ہیں۔ صرف ایک بند ملاحظہ ہو:

جب تلک روٹی کا ٹکڑا ہو نہ دسترخوان پر
نے نمازوں میں لگے دل اور نہ کچھ قرآن پر
رات دن روٹی چڑھی رہتی ہے سب کے دھیان پر
کیا خدا نور برسے ہے ' پڑا ہر نان پر
دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے
اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

نظیر نے روٹی' چپاتی' غربت و مفلسی کے تجربات خود سہے ہیں۔ یہ ان کے عہد کے معاشرہ کی جیتی جاگتی اور متحرک تصویریں ہیں جو انہوں نے اپنی نظموں میں بیان کی ہیں۔ یہی نہیں خود ان تجربات سے گزرے ہوئے ہیں۔ لہذا ان کی شاعری خیال آرائی نہیں بلکہ تجربہ کی شاعری ہے۔ اور اسی لیے اس میں سوز اور دردمندی ہے:

جو اہلِ فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں
مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اسے بے بتاتے ہیں
وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
ان کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

نظیر اکبرآبادی ایک وسیع المشرب انسان تھے۔ وہ آدمی اور آدمیت کے ثناخواں تھے اور اس کا احترام کرتے تھے۔ بحیثیت ایک ہندوستانی انہیں اپنے وطنِ عزیز سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ یہاں کی تہذیبی زندگی سے جذباتی طور سے وابستہ تھے اور مذہبی مناقشات سے دور تھے۔ وہ صلح کل کے قائل تھے ہندوؤں اور مسلمانوں سے انہیں عقیدت تھی' ان کے مذہبی معتقدات کا وہ احترام کرتے تھے۔ جہاں انہیں اپنے اسلامی عقائد کا احترام تھا اور حمد باری اور رسول سے عقیدت تھی' جس کا اظہار انہوں نے حمد و نعت میں کیا ہے' وہ اپنی ہندوستانی ثقافت اور معتقدات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کے فلسفہ و فکر سے واقف تھے' ہندو علم الاصنام اور اس سے متعلق سارے واقعات سے وہ پوری طرح واقف تھے' یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں رام' کرشن' دیوالی اور دسہرا بھی موجود ہے۔ اور ان کی مختلف نظموں میں ہندو مذہب کی تاریخی بصیرت بھی ہے۔ ان کی نظموں میں عام اردو شاعری کے برعکس ہندوستانی زندگی کے اشارے اور کنایے اور تلمیحیں زیادہ نظر آتی ہیں۔ ''بنجارہ نامہ'' جو زندگی کا فلسفہ پیش کرتی ہے۔ اس میں بھی انہوں نے ہندوستانی فضا بنائی ہے۔

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں !مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے ' دن رات بجا کر نقارہ
کیا بدھیا ' بھینسا ' بیل 'شتر ' کیا گوئی ' پلّا ' سر بھارا
کیا گیہوں' چانول' موٹھ مٹر' کیا آگ دھواں کیا انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا ' جب لاد چلے گا بنجارہ

یہ پوری نظم زندگی اور دنیا کی بے ثباتی کا اشاریہ ہے جو توکل اور صوفیانہ تعلیمات کے اثر کا نتیجہ ہے۔

19.5 محاکات نگاری اور لسانی خصوصیات

نظیر اکبرآبادی کی شاعری محاکات کی بھی اعلیٰ مثال پیش کرتی ہے۔ جذبات نگاری کی فنکارانہ پیش کش اردو شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔ فطرت نگاری میں بھی اردو شاعری میں بہترین مرقع پیش کیے گئے ہیں۔ جنگل' پہاڑ' کھیت اور کھلیان' سورج کا طلوع و غروب یہ اور اس طرح کے کئی مناظر اردو شاعری میں انتہائی فنکاری کے ساتھ پیش کے گئے ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی اور حالی' آزاد سے ہوتے ہوتے اقبال' جوش اور احسان دانش وغیرہ انگنت شاعروں کے یہاں اس کی مثالیں وافر تعداد میں ملتی ہیں' لیکن اردو شاعری کو منظر نگاری کا سہرہ اعلیٰ پیمانہ پر نظیر کی دین ہے۔ سردی' گرمی اور برسات ہمارے اہم ترین موسم ہیں اور ان پر اردو کے شاعروں نے خوب لکھا ہے۔ نظیر ان میں سے ایک اور نام ہے۔ ان کی نظم ''جاڑے کی بہاریں'' اس ضمن میں ایک منتخب نظم ہے۔ ایک بند پیش ہے:

جب ماہ اگھن کا ڈھلتا ہو' تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو' تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
دن جلدی جلدی چلتا ہو' تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
پارا بھی برف پگھلتا ہو' تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
چلّا خم ٹھونک ابھرتا ہو' تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

یہ نظم محاکات کی عمدہ مثال ہے اور ایسے اور اس طرز کے متعدد نمونے نظیر کی شاعری میں محفوظ ہیں۔

نظیر اکبرآبادی لسانی اعتبار سے اردو کا ایک بہت ہی اہم اور دلچسپ شاعر ہے۔ اس کی لفظیات عام آدمی کی لفظیات ہے جو وہ روزانہ زندگی میں برتتا ہے۔ اس میں عربی، فارسی کے ساتھ برج اور عام بولیوں کے الفاظ ہیں جو انیسویں صدی کے ہندوستان کی تہذیبی زندگی کا حصہ تھے اور جو اب متروک ہو رہے ہیں۔ فیلن نے لسانی اور ادبی ہر دو لحاظ سے نظیر اکبرآبادی کو ''ہندوستانی'' شاعری کا نمائندہ شاعر کہا ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں۔ نظیر نے ہندوستان کی قومی زبان کے لیے راہیں ہموار کیں اور اردو شعر و ادب کو تنوع کی دلکشی عطا کی۔ یہ انفرادیت انیسویں صدی میں کسی دوسرے اردو شاعر کو حاصل نہیں ہو سکی۔ اردو نظم میں نظیر کی شاعری کی رہنمایانہ حیثیت مسلم ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. نظیر کی منظر نگاری پر ایک نوٹ لکھیے؟
2. نظیر کی شاعری کی لسانی خصوصیات پر اظہار خیال کیجیے۔

19.6 خلاصہ

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں نظیر اکبرآبادی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ اپنی جگہ ایک دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اردو کی کم و بیش تمام شعری ہیئتوں جیسے غزل، مثنوی، رباعی کے علاوہ نظم کی دیگر غیر مروجہ ہیتوں جیسے ترکیب بند، ترجیع بند وغیرہ کو بھی اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ نیز شاعری کے علاوہ بقول محمد علی اثر ''انہوں نے اور بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ نثر میں ان کی درج ذیل کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔ ''انشائے نظیر'' قدر متین، فہم قرین، بزم عیش، رعنائے زیبا، بازار حسن اور طرز تقریر''۔ شاعری میں ضخیم کلیات کے علاوہ انہوں نے مثنوی حسن و عشق اور ایک کتاب ''خالق باری'' کے انداز میں لکھی۔'' (نظیر شناسی۔ ص ۱۶۔۲۶)

نظیر کا مزاج قلندرانہ تھا۔ انہوں نے اپنی نظموں میں اپنے معاشرے کی جیتی جاگتی اور متحرک تصویریں پیش کی ہیں۔ وہ تصور پرست نہیں بلکہ حقیقت پسند شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنے مشاہدات، احساسات اور تجربات زندگی کو سادگی اور حقیقت پسندی کے ساتھ نظموں کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ ایک ہندوستانی ہونے کے ناتے انہیں اپنے وطن عزیز سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ یہاں کی تہذیبی زندگی سے جذباتی طور پر وابستہ تھے۔ وہ مذہبی جھگڑوں سے دور تھے اور صلح کل کے قائل تھے۔ وہ ایک طرف اسلامی عقائد کا دل سے احترام کرتے تھے تو دوسری طرف ہندوں کے مذہبی اعتقادات اور علم الاصنام سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے نیز ہندوستانی ثقافت اور معتقدات سے بھی آگہی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں اسلامی اعتقادات اور عقیدوں پر بھی نظمیں ملتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ رام، کرشن اور دیوالی، دسہرہ پر بھی۔ انہوں نے فارسی اور عربی کے علاوہ اپنے دور کی دوسری مروجہ زبانوں اور بولیوں سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اردو شاعری کے ذخیرہ الفاظ کو بے حد وسیع کیا ہے۔

19.7 نمونہ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. نظیر کے واقعات حیات پر روشنی ڈالیے۔
2. نظیر نے اردو شاعری کی کون کون سی اصناف پر طبع آزمائی کی؟
3. نظیر کی شاعری میں منظر نگاری کی نشاندہی کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

1. نظیر کو ہندوستان تہذیب کا نمائندہ کیوں کہا جاتا ہے؟
2. اردو نظم کے ارتقا میں نظیر کے مرثیے کا تعین کیجیے۔
3. نظیر کی نظم نگاری کی خصوصیات کو اجاگر کیجیے۔

19.8 فرہنگ

الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی
عہد طفلی	=	بچپن	مہر	=	سورج	پارچہ	=	ٹکڑا
نمرود	=	ایک بادشاہ جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا				ترسندہ	=	ترسا ہوا
ٹک	=	ذرا	منہم	=	واقفیت	قزاق	=	ڈاکو
ایں وآں	=	یہ وہ	خال	=	تل			
شداد	=	ایک بادشاہ جس نے زمین پر جنت بنوائی تھی						

19.9 سفارش کردہ کتابیں

1. اکبر علی بیگ و محمد علی اثر — نظیر شناسی
2. شمس الحق عثمانی — نظیر نامہ
3. راحت سلطانہ — آئینہ نقد و نظر
4. سید احتشام حسین — اردو ادب کی تنقیدی تاریخ

اکائی 20 : اُردو شاعری۔ 1857ء کے بعد

ساخت

20.1 تمہید

20.2 نظمیہ شاعری

20.3 انگریزی نظموں سے استفادہ

20.4 غزلیہ شاعری

20.5 خلاصہ

20.6 نمونہ امتحانی سوالات

20.7 فرہنگ

20.8 سفارش کردہ کتابیں

20.1 تمہید

1857ء کی پہلی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد ہندوستانی سیاست اور سماج کا منظر نامہ بڑی تیزی سے بدلنے لگا۔ ایک طرف انگریزوں نے آزادی کے متوالوں اور دانشوروں کو قتل یا ملک بدر کرنا شروع کیا' ساتھ ہی ساتھ منصوبہ بند انداز سے انہیں محکومیت کا احساس دلایا اور دوسری طرف پوری قوم بدلے ہوئے حالات کا سامنا کرنے سے گریز کرنے لگی۔ نفسیاتی الجھن اور مایوسی اسے عملی زندگی سے کنارہ کش کرتی گئی۔ مغربی اور مشرقی قدروں کی آویزش سے سماجی اور معاشی توازن بگڑ گیا۔ سارے مسلمات' تصورات اور روایات میں بکھراؤ اور ٹوٹ پھوٹ ہوتی گئی۔ ہر طرف نئے حالات' نئے معاملات اور نئے مسائل پیدا ہونے لگے جس سے قوم کے دانشور اور قلمکار متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس تازیانے سے ان کی سوچ کو مہمیز لگی اور آہستہ آہستہ ان کے فکر و عمل میں تبدیلی آنے لگی۔ قدامت پرستی اور ہر نئی چیز سے بدکنے کا رجحان قوم کو عصری دھارے سے الگ کر رہا تھا اس لیے دانشوروں اور قلمکاروں نے نئے حالات سے سمجھوتا کرنے کا تہیہ کیا اور قدیم اور جدید کے امتزاج سے سامنے آنے والے قدر و معیار کو اپنایا۔ سرسید اور ان کے ہم نواؤں کی تحریک نیز لاہور بک ڈپو کے دارالترجمہ اور انجمن پنجاب سے اس میلان کو مزید تقویت ملی۔

اس دور کے شاعروں کے پاس بے مثال کلاسیکی سرمایہ تھا۔ خاص کر پیش روؤں ۔ غالب' مومن' ذوق' ظفر' انیس اور دبیر کا تازہ کار شعری اثاثہ تھا جس میں فکری اور حسّی سطح پر بھی اور اظہار و اسلوب کے لحاظ سے بھی تقلید اور اجتہاد کے وافر نمونے موجود تھے مگر بیشتر شاعر اپنی تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ ایک خاص نہج پر کر رہے تھے۔ ان کے ہاں حسن و عشق کے خارجی نکتے گوشے' تصور کے ہلکے پھلکے موضوعات' خمریات' زبان دانی' قادر الکلامی اور قافیہ پیمائی وغیرہ کی بڑی اہمیت تھی۔ غزل کی زلف گرہ گیر انہیں اسیر کیے ہوئے تھی۔ نئے ادبی نظریوں اور شعری سانچوں کے سامنے آنے سے شاعروں کے مزاج میں تبدیلی آنے لگی۔ کئی روشن خیال شاعر پہلی بار اپنے شعری سرمایے کی تنگ دامانی سے آگاہ ہوئے اور ان کے فکر و شعور میں تغیر رونما ہوا۔ اس دوران مغربی خیالات' سانچے' آہنگ اور اسلوب ان کے لیے بادنما ثابت ہوئے۔ شاعری کے متعینہ ڈھرے سے انحراف ہونے لگا اور نئی صورتیں پیدا کی گئیں۔ رمز و ایما سے بھری ہوئی صنف غزل کی جگہ بیانیہ شاعری کی نئی صنف نظم (جسے اس زمانے میں مختصر مثنوی کہا گیا) متعارف ہوئی اور دھیرے دھیرے سامعین اور قارئین کا حلقہ بنا کر مقبولیت کے زینے طے کرنے لگی۔ ہر طرف غزل گوئی کے متوازی نظم نگاری کا میدان ہموار ہونے لگا۔ اسی کے ساتھ غزل' قطعہ' رباعی' ترکیب بند' شہر آشوب وغیرہ کے موضوعاتی اور اسلوبیاتی زاویے بھی بدل گئے۔

سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی' انسٹیٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق اردو کے ادیبوں اور شاعروں کے لیے نئی روشنی کے میناروں سے کم نہ تھے۔ ان کے ذریعے اردو والوں کے ذہن ومزاج میں بنیادی تبدیلی لانے کی سعی جمیل کی گئی۔ جہاں انہیں مغربی علوم اور زبانیں سیکھنے کی ترغیب دی گئی وہیں شاعری کے پیش پا افتادہ موضوعات اور اسالیب سے الگ ہٹ کر نئی دنیائیں آباد کرنے کا پیغام بھی دیا گیا۔ سرسید اردو شاعری کے بنیادی ڈھانچے میں خوشگوار تغیر چاہتے تھے۔ وہ جذبات پر عقل' قدامت پر جدت اور جمود پر حرکت کو فوقیت دیتے تھے۔ تعقل پسندی' حقیقت نگاری' فطرت پرستی' اجتماعیت اور مادیت ان کے نزدیک مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ شعر وادب میں وسعت چاہتے تھے اور زمانے کے بدلتے ہوئے دھارے سے اسے جوڑنا چاہتے تھے۔ اس عہد کے نثر نگاروں کے ساتھ ساتھ شاعروں نے بھی ان کا اثر لیا اور شاعری میں عصری موضوعات کی عکاسی کے علاوہ اخلاقی قدروں کو اجاگر کرنا شروع کیا۔

19 ویں صدی کی آخری تین دہائیوں کے دوران سرسید کی تعمیری اور اخلاقی تحریک کے اثرات بڑھنے لگے اور تازہ دم شاعر۔ آزاد' حالی' شبلی' اسماعیل میرٹھی' سرور جہاں آبادی' نظم طباطبائی' شرر لکھنوی' اکبر الہ آبادی' شاد عظیم آبادی' چکبست اور اقبال وغیرہ مختلف سطحوں پر اپنی قوت ایجاد واختراع کا مظاہرہ کرنے لگے۔

20.2 نظمیہ شاعری

اردو میں نظمیہ شاعری کی روایت بہت پرانی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ' غواصی' عبداللہ قطب شاہ' فائز دہلوی اور نظیر اکبرآبادی کے ہاں اس کی واضح اور متنوع مثالیں ملتی ہیں جو مختلف شعری ہیئتوں میں ہیں۔ غزل مسلسل' مسدس' مختصر مثنوی' قطعہ' ترکیب بند وغیرہ اس کی رائج اور مقبول صورتیں تھیں۔ بعض ہیئتوں میں بعد کے شاعروں مثلاً میر' سودا' مومن' غالب وغیرہ کے ہاں بھی یک موضوعی مختصر نظمیں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر میر کی مثنوی 'گھر کا حال' مومن کی جہادیہ مثنوی اور غالب کی مثنوی درصفت انبہ' قطعہ ذکر کلکتہ' پابینی روٹی کو سامنے رکھا جاسکتا ہے۔ بہرحال 1857ء کے بعد جب سخن فہم لوگ تتر بتر ہوگئے اور بدلے ہوئے حالات میں سخن فہموں اور سخن پروروں کی نئی کھیپ سامنے آنے لگی تو اشارے کنائے والی صنف غزل کے متوازی یک موضوعی شاعری مختلف ہیئتوں میں اُبھر کر سامنے آنے لگی۔ اس المیے کے تعلق سے اس دور کے جوانوں کے ساتھ ساتھ ضعیف العمر شاعروں نے بھی اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ غالب کی عمر ساٹھ سال سے اوپر ہوچکی تھی مگر تاریخ کے ان سیاہ لمحوں کو انہوں نے اپنے ایک قطعے میں محفوظ کردیا ہے۔ قطعہ کے پانچ شعر نیچے درج کیے جاتے ہیں۔

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک — تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا — وہی رونا تن و دل و جاں کا

دہلی میں دانشوروں' ادیبوں' شاعروں اور دوسرے اہل حکمت بڑی تعداد میں تہہ تیغ ہورہے تھے۔ ان میں سرسید احمد خاں کے دوست امام بخش صہبائی اور محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر بھی تھے۔ قتل وغارت گری کے علاوہ انگریزوں نے بے شمار اہلِ علم وحرفت کو ملک بدر کرکے کالا پانی (جزیرۂ انڈمان) بھیج دیا۔ انہیں میں منیر شکوہ آبادی بھی تھے۔ انہوں نے کئی نظمیں۔ داغ غم' فریاد زندانی' مصائب قید' قید سے نجات وغیرہ لکھی ہیں۔ اسیری کے دوران انہوں نے رباعیاں بھی کہی ہیں' جن میں قید کی تکلیفوں کا پرسوز بیان ہے۔ 'مصائب قید' کے ان شعروں سے ایک فنکار اور دانشور کے ساتھ انگریزوں کے بہیمانہ سلوک کا اندازہ ہوتا ہے۔

پانی تھا نایاب مثل آبرود — چاہتے تھے خنجر و شمشیر سے
مثل گوہر جانتے اس کو عزیز — قطرۂ پیکاں جو ملتا تیر سے
گالیاں کھانے کو تھیں یا زخم و داغ — تھا یہ حاصل مطبخ تقدیر سے
روٹیاں گوہر کی گویا ملتی تھیں — نانِ گندم تھی سوا اکسیر سے
گھاس ترکاری کے بدلے تھی نصیب — خشک تر تھی سبزۂ شمشیر سے
بھینس کی سانی سے بدتر حال تھی — سخت دانہ دانۂ زنجیر سے

یہ رباعی بھی قید و بند کے مظالم کی روداد ہے۔

ہر چند کے زنداں میں جگر جلتا ہے — پر چھوڑ کے صعف ہمیں کب ٹلتا ہے
اٹھتے ہیں عصا کے زور سے پاؤں منیر — ٹٹو لاٹھی کے خوف سے چلتا ہے

آخری تاجدار ہند بہادر شاہ ظفر نہ صرف انگریزوں کے ظلم و ستم کا شکار ہوئے بلکہ انہیں ملک بدر کر کے رنگون میں قید کر دیا گیا۔ اجنبی جگہ اور ناآشنا ماحول میں وہ قید کی صعوبتیں جھیلتے رہے اور اپنی لاچاری اور مجبوری کے کھرے احساس کو لفظوں میں پروتے رہے۔ نظم 'قید فرنگ' میں ان کی بے پناہ مایوسی شعروں میں اس طرح ڈھلتی ہے۔

جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں — ہووے گا سر پہ چرخ بھی جائیں گے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زنداں پہ آسماں — چھٹنا محال اس سے ہے جب تک ہے تن میں جاں

جو آ گیا ہے اس محل تیرہ رنگ میں
قیدِ حیات سے ہے وہ قید فرنگ میں

1857ء کے بعد عمل اور ردعمل کا جو طوفان آیا تھا' وہ آہستہ آہستہ تھما اور سرسید کی جدوجہد سے امن و سکون کا ماحول بننے لگا تو انگریزوں نے مغربی ادبیات کے ترجموں سے ہندوستان کے ادبی منظرنامے کو بدلنے کی کوشش کی۔ انگریزی کے اثر سے نظم نگاری مرکزی حیثیت کی حامل ہوگئی۔ فطرت اور سماج کے ان گنت موضوعات اور مسئلوں پر نظمیں لکھی جانے لگیں۔ 'انجمن پنجاب' کے ذریعے جو داغ بیل ڈالی گئی تھی وہ سارے ملک میں پھیل گئی۔ اولین نظم نگاروں کے سرخیل محمد حسین آزاد تھے۔ انہوں نے مثنوی کی ہیئت میں کئی نظمیں لکھیں۔ 'شب قدر' صبح امید' حب وطن' خواب امن' وداع انصاف' گنج قناعت' ابر کرم وغیرہ ان کی اہم نظمیں ہیں۔ 'حبِ وطن' کے تمہیدی حصے سے ان کے اسلوب اور انداز پیش کش کا پتا چلتا ہے۔

ہے قول جملہ تجربہ کارانِ فارسی — اور کہتے ہیں یہ نظم نگارانِ فارسی
حبِ وطن ز ملکِ سلیماں نکو تراست — خارِ وطن ز سنبل و ریحان نکو تراست
سلطانِ دل کا گرچہ یہی حکم عام ہے — اور متفق اسی پہ زمانہ تمام ہے
پر ملک مصلحت کا ہے کچھ انتظام اور — اس سلطنت کو چاہئے طرز نظام اور
حبِ وطن اسے نہیں کہتے کہ باغ سے — نکلے جو گل تو خاک ہو فرقت کے داغ سے
حبِ وطن نہ یہ ہے کہ پانی میں گر نہ ہو — ماہی کی زندگی کسی صورت بسر نہ ہو

اس کے بعد خیال ارتقا پذیر ہوتا ہے اور اس کے دوسرے بند سامنے آتے ہیں۔ آزاد نے نظم میں ہیئت کے دوسرے تجربے بھی کیے ہیں۔ ان کی نظم الوالعزمی کے لیے کوئی سدّ راہ نہیں' میں پانچ مصرعوں کا بند ملتا ہے۔ ہر بند کے چار مصرعوں کے لیے الگ الگ ردیف اور قافیے متعین کیے

گئے ہیں مگر پانچویں مصرعے میں پہلے بند کے ردیف قافیے کی پابندی کی گئی ہے۔ اس نظم کے دو بند سے یہ خصوصیت واضح ہو جائے گی۔

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو　　باغ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو　　ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

ہیں کوہ و دشت جیسے کہ پھولا پھلا چمن　　دامن میں ہیں بھرے ہوئے نسرین ونسترن
نہریں ادھر اُدھر ہیں امیدوں کی موجزن　　اس دشت میں نہ دوڑ سکو بن کے گر ہرن
کبک دری کی طرح خراماں چلے چلو

قیام لاہور کے دوران انگریزوں سے حد درجہ قربت کی بنا پر آزاد انگریزی نظموں کی وسعت سے آشنا بھی ہوئے اور مرعوب بھی۔ انگریزوں کے ایما پر انہوں نے اردو کی نظمیہ شاعری میں توسیع کی عملی کوشش کی۔ اسلوب اور ہیئت میں تنوع اور نیرنگی پیدا کی۔ مواد اور موضوع میں تازہ کاری اور کشادگی لانے کی سعی کی۔ نظموں کے مجموعے 'نظم آزاد اور خم کدۂ آزاد' پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے یہ رائے دی جاسکتی ہے کہ آزاد کی نظموں میں خیالات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ اس میں رنگارنگی اور بوقلمونی ہے۔ زبان شستہ اور رواں ہے لیکن اسلوب فارسی زبان کے اثر سے قدرے بوجھل ہے۔ اس میں حالی کے اسلوب کی طرح سادگی اور حلاوت نہیں ہے۔ ہیئت انگریزی نظموں کے گہرے اثر سے ترتیب پائی ہے۔ ایک طرف ان خصوصیتوں سے ان کے تخلیقی رویے کا تقلیدی رنگ سامنے آتا ہے اور دوسری طرف ان سے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ نظمیہ شاعری کے موضوعاتی 'اسلوبیاتی اور ہیئتی دامن پر سدا بہار گل بوٹے لہلہانے لگتے ہیں۔

حالی نے ابتداً 'انجمن پنجاب' کے مناظموں کے لیے نظم نگاری کی اور مثنوی کی ہیئت میں نظمیں لکھیں۔ پھر نظمیہ شاعری سے کچھ ایسی رغبت ہوئی کہ 'مدوجزر اسلام جیسا لاثانی شاہکار پیش کیا۔ حالی کے ہاں زبردست قوت مشاہدہ تھی۔ وہ اپنے آس پاس کے حالات کو کھلی آنکھوں سے بھی دیکھتے تھے اور محسوسات کی آنکھوں سے بھی۔ اپنی نظم 'برکھارت' میں وہ مشاہدوں کو سمیٹ کر ایک حسین منظر ترتیب دیتے ہیں مگر بڑی سلاست کے ساتھ۔ یہ ٹکڑا اس پر دال ہے

بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی　　آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی
گھنگور گھٹائیں چھا رہی ہیں　　جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں
کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی　　قدرت ہے نظر خدا کی آتی
سورج نے نقاب لی ہے منہ پر　　اور دھوپ نے تہہ کیا ہے بستر
باغوں نے کیا ہے غسلِ صحت　　کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت

حالی کی تخصیص یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی چھوٹی بڑی باتوں کو بڑی آسانی سے بالکل سامنے کے لفظوں میں باندھنے پر قادر ہیں۔ ان کا اسلوب نہ بہت تہہ دار اور مشکل ہے اور نہ فارسی و عربی کے لفظوں سے بوجھل۔ وہ عموماً ایسے لفظوں سے اپنی شعری دنیا آباد کرتے ہیں جو کسی بھی زبان کے ہوں مگر اردو کی کائناتِ شاعری میں رائج ہوں اور آسانی سے سمجھے جاسکتے ہوں۔ اس سلسلے میں ان کی نظم 'مناظرۂ رحم و انصاف' کے یہ اشعار شہادت دے رہے ہیں۔

ایک دن رحم نے انصاف سے جاکر پوچھا
کیا سبب ہے ترا نام ہے دنیا میں بڑا
نیک نامی سے ترے سخت تحیّر ہے ہمیں
ہاں سنیں ہم بھی کہ ہے کون سی خوبی تجھ میں
دوستی سے تجھے کچھ دوستوں کی کام نہیں
آنکھ میں تیری مروت کا کہیں نام نہیں
اپنے بیگانے ہیں سب تیری نظر میں یکساں
دوست کو فائدہ ہے تجھ سے نہ دشمن کو زیاں
قتلِ انسان ہمیشہ سے ہے عادت تیری
سیکڑوں چڑھ گئے سولی پہ بدولت تیری
جان اور مال سے نمرود کو کھویا تو نے
اور فرعون کو دریا میں ڈبویا تو نے
فوج راون کی لڑائی میں کھپائی کس نے
آگ لنکا میں سوا تیرے لگائی کس نے

مناظر فطرت، کردار سازی، فرض شناسی، حق پرستی، اتحاد اور اتفاق کی برکتیں، تحصیل علم، دولت وثروت کی بے ثباتی، تکبّر سے نفرت، عیش و عشرت سے بیزاری، زندگی کا اتار چڑاؤ وغیرہ ایسے معاملے اور مسئلے ہیں جن پر حالی کی نگاہیں ٹکتی ہیں اور اپنے ردعمل کا تخلیقی سطح پر اظہار کرتے ہیں جو ان کی ذہنی بیداری، روشن خیالی اور مذہبی مزاج کی آئینہ داری ہے۔ کہیں کہیں ان کا سیاسی شعور بھی نظموں میں ابھر آیا ہے۔ اس ضمن میں آزادی کی قدر، انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی، 'سیاست' وغیرہ جیسی نظموں کے نام سامنے آتے ہیں۔ ان میں حالی اپنی نرم خوئی کے ساتھ ہم وطنوں کی تن آسانی کی گرفت بھی کرتے ہیں اور انہیں آزادی کی قدر و قیمت سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ بسا اوقات وہ قدرے طنزیہ پیرایہ بھی اختیار کرتے ہیں۔ نظم سیاست، میں فرنگیوں کی پر فریب چالوں پر محتاط تبصرہ کیا ہے۔ ان کا تربیت یافتہ ذہن ومزاج سب کچھ دیکھنے، سننے اور سمجھنے کے باوجود انہیں بھرنے نہیں دیتا ہے۔ بڑے ضبط اور توازن کے ساتھ وہ اپنے ہم وطنوں کو حقیقت حال سے واقف کراتے ہیں۔

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح — واں پاؤں جمانے کے لیے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اس کے یہ تھی مشورہ دیتی — یہ حرف سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو
پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر — مانو اسے اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو

کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو لیکن
جو بات سبک ہو اُسے منہ سے نہ نکالو

نظمیہ شاعری میں حالی کی شہرت ان کے شاہکار 'مدوجزر اسلام' (جو مسدس کی ہیئت میں ہونے کے سبب 'مسدس حالی' کے نام سے مشہور ہے) کی بنا پر ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نظمیں 'مناجات بیوہ' 'چپ کی داد' اور 'شکوۂ ہند' قابل قدر ہیں۔

شبلی نہ صرف ایک بڑے نقاد، مورخ اور عالم تھے بلکہ انہوں نے کئی اچھی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی نظموں میں روح عصر موجود ہے۔ وہ توانا سیاسی بصیرت اور سماجی شعور رکھتے تھے۔ یہ اشعار ان ہی خصوصیتوں کا اظہار کرتے ہیں۔

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ جوش انگیزئ طوفانِ بیداد و بلاتا کے
یہ لطف اندوزئ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

انہوں نے اپنی قوم کو جگانے کا فریضہ بھی انجام دیا۔ وہ بڑے عالمانہ انداز سے قوم کو درس بھی دیتے ہیں اور نصیحت بھی کرتے ہیں۔

تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو — دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار
یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں — کر دیا ذرۂ افسردہ کو ہم رنگ شرار
یا کوئی جاذبۂ ملک و وطن تھا جس نے — کر دیے دم میں قوائے عملی سب بیدار
ہے اسی مے سے یہ سرمستی احرار وطن — ہے اسی نشہ سے یہ گرمیٔ ہنگامۂ کار

اسماعیل میرٹھی عام طور پر بچوں کے شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں لیکن انہوں نے باشعور قارئین کے لیے بھی نظمیں لکھی ہیں۔ 'آزادی غنیمت ہے' 'اتحاد' 'اچھا زمانہ آنے والا ہے' 'کورانہ انگریز پرستی' وغیرہ اچھی نظمیں ہیں۔ 'کورانہ انگریز پرستی' میں انگریزی کے الفاظ بڑی چابکدستی سے استعمال کیے ہیں اور نصیحت آمیز انداز میں کورانہ تقلید کی مضحک تصویر کشی کی ہے۔

نہ کچھ ادب ہے نہ اخلاق نے خدا ترسی — گئے ہیں ان کے خیالات سب سمندر پار
وہ اپنے زعم میں لبرل ہیں یا ریڈیکل ہیں — مگر ہیں قوم کے حق میں بصورت اغیار
نہ انڈین میں رہے وہ نہ وہ بنے انگلش — نہ ان کو چرچ میں آنر نہ مسجدوں میں بار

ان کا یہ طرز اکبر الہ آبادی کی یاد دلاتا ہے جو ان کے ہمعصر ہیں اور مشرقی تہذیب کے بڑے علم بردار ہیں۔ انہوں نے ہر مغربی چیز کا بڑے منجھے ہوئے انداز میں مذاق ہے۔ یہ شعر دلیل کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں۔

اندھیری رات میں جنگل میں ہے عیاں انجن — کہ جس کو دیکھ کے حیران چشم غول بھی ہے
شگفتہ پارک میں ہر سمت رہروؤں کے — نظر نواز ہے پتّی حسین پھول بھی ہے
جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبر — تو ہرج کیا ہے جو ساتھ اس کے ڈیم فول بھی ہے

ظفر علی خاں، چکبستؔ اور اقبالؔ نے اس دور میں زبردست قومی شاعری کی۔ وطن کے ذرے ذرے سے محبت اور عقیدت کا جذبہ ان کی نظموں میں رواں دواں ہے۔ ظفر علی خان کی نظمیں طاقت ایمان، ہندوستان، تخت یا تختہ، انقلاب ہند، آزادی کا بگل اور فریاد جرس وغیرہ اپنے دور کی

اس لہر کی نشاندہی کرتی ہیں جو تمام ہندوستانیوں کے دل میں اٹھ رہی تھی اور جس سے انگریز دہشت زدہ تھے۔ اپنی طرح طرح کی چالوں سے اس لہر کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔ چکبست کی وطنی شاعری میں بھی یہ عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ اپنی نظم 'فریادِ قوم' میں ہم وطنوں کو جھنجھوڑتے اور للکارتے ہیں

جو دب کے بیٹھ رہے سر اٹھاؤ گے پھر کیا　　عدوئے قوم کو نیچا دکھاؤ گے پھر کیا
جفا وجور کی ذلت مٹاؤ گے پھر کیا　　تم اپنے بچوں کو قصے سناؤ گے پھر کیا

رہے گا قول یہی ان سے ان کی ماؤں کا
لہو رگوں میں تمہاری ہے بے حیاؤں کا

علامہ اقبال کی شاعری کی ابتدا بھی اسی ماحول میں ہوئی جہاں ہر طرف فطرت پرستی' حب وطن' اتحاد و اتفاق اور انقلاب کے ترانے گائے جا رہے تھے۔ انہوں نے بھی اس رجحان کو قبول کیا اور اپنے مشاہدوں کو لفظوں کا حسین جامہ عطا کیا۔ 'ہمالہ' ابر کہسار' بچے کی دعا' ہندوستانی بچوں کا قومی گیت' ترانۂ ہندی' آفتاب صبح' تصویر درد' نیا شوالہ وغیرہ اسی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ زمانے کے بدلتے تیور پر بھی اقبال کی نظر ہے مگر ان کے پیغام میں نغمگی اور مٹھاس ہے۔ 'نیا شوالہ' کے ان شعروں سے اس کا پتا چلتا ہے۔

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی　　آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ　　دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے　　سارے پجاریوں کو مے پیت کے پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

داغ دہلوی' شاد عظیم آبادی' نظم طباطبائی' سرور جہاں آبادی اور عبدالحلیم شرر بھی اسی سماج اور ماحول میں سانس لے رہے تھے۔ ان کی شاعری میں بھی کہیں کہیں عصری موضوعات کی آئینہ داری ہوئی ہے۔ داغ دہلوی کا شہر آشوب (دہلی) اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس میں 19 ویں صدی عیسوی کے آخری حصے کی دہلی کا حال زار آنسو کے قطروں کی طرح لفظوں میں نمایاں ہوا ہے۔

فلک نے قہر و غضب تاک تاک کر ڈالا　　تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکا یک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا　　غرض کہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا

جلی ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچیں ہیں پتیاں کانٹوں میں جو گلاب کی تھیں

اس طرح یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ 1857ء کے بعد کم و بیش تمام شاعروں نے ملک کے روز افزوں بدلتے ہوئے ماحول و مزاج کی تصویر کشی میں کہیں کوتاہی نہیں کی۔ تاریخی حقائق اردو شاعری کے حرف و صوت میں سما گئے ہیں۔ کبھی کھل کر اور کبھی اشارے کنائے میں۔ ان کی تصویر کشی ہوئی ہے۔ اسی کے ساتھ پہلی بار شاعروں نے خود کو نیچر اور زندگی سے گہرے طور پر جوڑنے کی سعی کی اور ان کے اچھوتے پہلوؤں کا احاطہ کیا۔ جہاں تک شعری ہیئت کا تعلق ہے' اس دور کے شاعروں نے اظہار کے تمام مقبول پیرائے اختیار کیے ہیں۔ اس لیے نظمیہ شاعری مثنوی' مسدس' رباعی' قطعہ اور ترکیب بند سب سے عبارت ہے اور ہر ہیئت میں روایت کی پابندی کے ساتھ اجتہاد کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ 1914ء تک آتے آتے جدید شعری رجحان حاوی ہو کر روایت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. محمد حسین آزاد کی پانچ نظموں کے نام لکھیے۔
2. الطاف حسین حالی کی پانچ نظموں کے نام لکھیے۔
3. شبلی کی نظموں کی خصوصیت بتایئے۔
4. اسماعیل میرٹھی اور اکبرالہ آبادی کی نظموں کا امتیازی وصف تحریر کیجیے۔
5. ظفر علی خاں کی پانچ نظموں کے نام بتایئے۔
6. چکبست نے کس نظم میں ہندوستانیوں کو جھنجھوڑنے کی سعی کی ہے؟
7. 1857ء سے 1914ء تک کی نظمیہ شاعری کا محاکمہ کیجیے۔
8. اس عہد کی نظمیہ شاعری کی ہیئتوں کے نام لکھیے۔

20.3 انگریزی نظموں سے استفادہ

انگریزوں نے ہندوستان میں مغربی علم و ادب کو متعارف اور رائج کرنے کی غرض سے کئی سطحوں پر باضابطہ کوششیں کیں۔ لاہور بک ڈپو کا دارالترجمہ اس ضمن میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں انگریزی کی کتابوں کا اردو ترجمہ انگریز ہی کیا کرتے تھے اور زبان و بیان درست کرنے کے لیے مقامی منشی بحال کیے گئے تھے۔ اس کام کے لیے حالی بھی چار سال لاہور میں مقیم رہے۔ آزاد پہلے ہی سے قیام پذیر تھے۔ اس دوران نثر کے علاوہ انگریزی شاعری کے بھی ترجمے ہوئے اور بڑی تیزی سے ان کا اثر اردو شاعری پر ہونے لگا۔ اچھوتے موضوعات اور مختلف ہیئتیں شاعروں کو تقلید اور استفادے پر مجبور کرنے لگیں۔ انگریزی شاعروں کی فطرت پرستی، منظر نگاری اور تخیلی پرواز نے خاص طور پر مقامی شاعروں کو متاثر کیا نیز معریٰ نظم (Blank Verse) کی ہیئت بیانیہ شاعری میں قافیے کی جکڑ بندی سے نجات دلا رہی تھی۔ اس لیے 1857ء کے آس پاس یا اس کے بعد شعور کی آنکھیں کھولنے والا ہر شاعر موضوع اور ہیئت ہر دو سطح پر انگریزی شاعری کی متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ محمد حسین آزاد کو اس لحاظ سے اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے اردو میں پہلی بار نظم معریٰ کا تجربہ کیا۔ ان کی نظم 'جغرافیۂ طبعی کی پہیلی' اس ہیئت کی پہلی اردو نظم ہے۔ ہر چند یہ بچوں کے لیے لکھی گئی پھر بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کا پہلا بند اس طرح ہے:

ہنگامۂ ہستی کو — گر غور سے دیکھو تم
ہر خشک و تر عالم — صنعت کے تلاطم میں
جو خاک کا ذرہ ہے — یا پانی کا قطرہ ہے
حکمت کا مرقع ہے — جس پر قلم قدرت
انداز سے ہے جاری — اور کرتا ہے گلکاری

اک رنگ کہ آتا ہے
سو رنگ دکھاتا ہے

آزاد نے ایک اور معریٰ نظم لکھی تھی جس کا عنوان 'جذب دوری' ہے۔ یہ دراصل انگریزی نظم کا ترجمہ ہے۔ آزاد کے علاوہ اسماعیل میرٹھی، عبدالحلیم شرر، نظم طباطبائی اور اقبال نے انگریزی نظموں سے استفادہ کیا اور ترجمے بھی کیے۔ اسماعیل میرٹھی کی نظمیں 'چڑیا کے بچے' اور 'تاروں بھری

رات' معریٰ ہیں۔ شرر کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے معریٰ نظم کو رائج کرنے اور استحکام بخشنے کے لیے باقاعدہ تحریک چلائی۔ خود بھی نظمیں لکھیں' ڈراموں میں اسے استعمال کیا اور اس کی وسعتوں پر اپنی تحریروں میں روشنی ڈالی۔

نظم طباطبائی بھی اس روش سے متاثر تھے۔ انہوں نے انگریزی نظموں کے ترجمے کیے جن میں گرے کی مشہور اسٹنز افارم ایلیجی کا منظوم ترجمہ ''گورغریباں'' نہایت دلکش ہے۔ اس پر طبع زاد ہونے کا گمان ہوتا ہے مگر طباطبائی سے پہلے پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اسٹنز افارم کا تجربہ کرتے ہوئے نظم ''تہنیت کامیابی'' لکھی تھی جو اردو میں اسٹنز افارم کا پہلا نمونہ ہے۔ ویسے انہوں نے ملٹن' ٹینی سن اور شیکسپیر کی نظموں کا معریٰ ترجمہ بھی کیا ہے۔

علامہ اقبال نے بھی انگریزی نظموں سے اخذ و استفادہ کیا ہے۔ 'بانگ درا' کی کئی نظمیں اس کی شاہد ہیں۔ ایک مکڑا اور مکھی' ایک پہاڑ اور گلہری' ہمدردی' ماں کا خواب' پیام صبح' عشق اور موت' نالۂ فراق وغیرہ اسی نوعیت کی نظمیں ہیں۔

اس تفصیل سے یہ ظاہر ہے کہ 1857ء کے بعد اردو میں انگریزی نظموں سے اخذ اور استفادے کا رجحان پیدا ہوا۔ انگریزی دانی کے ساتھ ساتھ اس میں گہرائی اور جامعیت آتی گئی۔ انگریزی نظموں کے موضوع و مواد' انداز' اظہار اور ساخت و ہیئت کی تقلید کی گئی۔ نظم معریٰ یا اسٹنز افارم کی بعض اردو شکلیں اسی کی مثالیں ہیں۔ اخذ' استفادہ اور ترجمہ کے عمل سے اردو نظم میں بامعنی' خوشگوار اور خوش نما وسعت آئی اور جان پڑ گئی۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. اردو میں سب سے پہلے معریٰ نظم کس نے لکھی؟
2. اردو میں معریٰ نظم کا پہلا نمونہ کس عنوان سے شائع ہوا؟
3. اسماعیل میرٹھی کی دو معریٰ نظموں کے عنوان بتایئے۔
4. نظم طباطبائی نے گرے کی ایلیجی کا کس ہیئت میں اور کس عنوان سے ترجمہ کیا؟
5. علامہ اقبال کی کون سی ابتدائی نظمیں انگریزی سے ماخوذ ہیں؟
6. اردو میں اسٹنز افارم کا پہلا نمونہ کس نے پیش کیا اور اس کا عنوان کیا ہے؟

20.4 غزلیہ شاعری

1857ء کے بعد ملک کے سیاسی' سماجی' اقتصادی' مذہبی اور تہذیبی حالات کی تبدیلی نے جیسے اردو شاعروں کو خواب خرگوش سے جگا دیا۔ بدلتے ہوئے قدر و معیار' بگڑتے ہوئے توازن اور مختلف سطحوں پر بیداری کی تحریکات سے اردو شاعری کی مقبول ترین صنف غزل بہت متاثر ہوئی۔ اس کا محور عشق و عاشقی چکنا چور ہو گیا۔ نئے میدان کی تلاش اور تروتازہ پھل کھلانے کی جستجو میں صنف غزل نظر انداز بھی ہوئی اور معتوب بھی ہوئی۔ اس میں خارجیت' مبالغہ' لفظی عشوہ گری اور قافیہ پیمائی جیسی کمزوریوں پر ایسا شور و غوغا ہوا کہ لافانی اور شاہکار نمونے بھی دب کر رہ گئے۔ ایک طرف حالی نے اپنی سادہ لوحی میں یہاں تک کہہ دیا

یہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر

اور دوسری طرف آزاد نے زمانے کی تنقید اور تضحیک کی پروا کیے بغیر شاعری کو اپنا رنگ روپ دینے کی صدا لگائی۔

تمہاری سینہ فگاری کوئی تو دیکھے گا　　نہ دیکھے اب نہ دیکھے، کبھی تو دیکھے گا

1857ء تک غزلیہ شاعری میں اپنی ایک پہچان رکھنے والے جو شاعر زندہ تھے۔ ان میں غالب، ظفر اور شیفتہ اہم تھے۔ ان کی غزلوں میں پہلی جنگ آزادی کے المناک انجام سے حزنیہ عناصر میں زبردست اضافہ ہوا۔ خاص کر غالب اور ظفر کے آخری دور کی غزلیں ایک مایوس نے کی نمائندہ ہیں۔ بعد کے اہم شاعروں میں امیر مینائی، داغ دہلوی، جلال لکھنوی اور شاد عظیم آبادی عام طور پر اپنی دھن میں رہے۔ ان پر حالی اور آزاد کی چیخ پکار کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ دو چار شعر میں عصری حالات کی دھمک ملنا ایک غیر شعوری عمل ہے۔ محسن کاکوروی اپنے استاد امیر مینائی کی نکالی ہوئی راہ پر چل کر ایک بڑے نعت گو بن گئے اور انہوں نے اپنی ساری تخلیقی صلاحیت حُبِّ رسولؐ کے شعری اظہار کے لیے مختص کر لی۔ نسبتہً جوان شاعروں میں ریاض خیرآبادی خمریات میں گم رہے مگر علامہ اقبال ایسے باشعور اور بالغ نظر تھے کہ ابتدائے شاعری ہی میں نئی لہر سے آشنا ہو گئے۔ اپنی غزلوں کو بھی نیا اسلوب و آہنگ دیا۔

اردو شاعری کے اس منظر نامے میں اگر ایسے شاعر کی تلاش کی جائے جس نے غزلیہ سطح پر اس منظر نامے میں نیا رنگ بھرنے کی سنجیدہ کاوش کی ہو تو حالی ہی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے آواز دی:

سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی　　چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

سرسید کے پیغام 'جب زمانہ بدلے تم بھی بدل جاؤ' کو منظوم کرنے کے ساتھ ساتھ حالی نے غزل میں رمز و ایما اور علائم کو ایک نئی جہت دینے کا بھی کامیاب تجربہ کیا۔ یونیورسٹی بل پر ان کا یہ شعر کتنا تازہ، شگفتہ اور چبھتا ہوا ہے

رہے گی کس طرح راہ ایمن کہ رہ نما بن گئے ہیں رہ زن
خدا نگہباں ہے قافلوں کا، اگر یہی رہزنی رہے گی

اپنے غزلیہ لہجے میں تبدیلی پر کہتے ہیں

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر　　شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

حالی نے غزلوں میں درس اخلاق کس خوبصورتی اور سادگی سے دیا ہے

بڑھاؤ نہ آپس میں الفت زیادہ　　مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا　　مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

ان کے اس اکہرے بیان کے ساتھ ساتھ اشاراتی اور تہہ دار اظہار کا یہ انداز بھی ہے، جس میں غزل کا بنیادی وصف بھی ظاہر ہوا ہے اور عصری سچائی بھی سامنے آ گئی ہے

دلوں میں ڈالنا ذوقِ اسیری　　کمند گیسوئے خم دار سے پوچھ

.....

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا　　ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

اور یہ آفاقی سچائی غزلیہ شعر میں کس قدر نکھر گئی ہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حالی نے غزل کے موضوعاتی دائرے میں کشادگی اور پھیلاؤ لاکر اسے زمانی معیار عطا کیا ہے۔ اس عمل میں انہوں نے سادہ اور اکہرے اسلوب کا بھی تجربہ کیا اور مروجہ ایمائی اسلوب میں بھی نئی مصنوعی لہر دوڑائی جو بعد میں زیادہ جامع اور پرکار ہوکر اقبال کے ہاں ابھری ہے۔

اخلاقی عناصر، عمل کی ترغیب، آزادی کی تمنا، نئی نسل کی تربیت، بیتے دنوں کی یادیں، مایوس کن حالات وغیرہ ایسے مسائل تھے جو اس دور کے ہر ذی شعور فرد کو بے چین کیے ہوئے تھے۔ غزل گو شاعروں نے انہیں بڑی ہنرمندی اور احتیاط سے باندھا ہے۔

آغاز کو کون پوچھتا ہے انجام اچھا ہو آدمی کا (داغ)

عیش کے جلسے ہجوم آلام کے شعبدے ہیں گردش ایام کے
مٹ گئی ہے دل سے آزادی کی یاد کتنے خوگر ہوگئے ہم دام کے (اسماعیل میرٹھی)

جوانی کی دعا لڑکوں کو ناحق لوگ دیتے ہیں
یہی لڑکے مٹاتے ہیں جوانی کو جواں ہو کر (اکبرالہ آبادی)

سرورِ عیش و نشاط کیسے، بدل گئے رنگ ہی جہاں کے
سنا نہ تھا کان سے جو ہم نے، وہ آنکھ سے انقلاب دیکھا (داغ)

زندگی نام تھا جس کا، اسے کھو بیٹھے ہم اب امیدوں کی فقط جلوہ گری باقی ہے (چکبست)

ان غزلیہ شعروں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ 1857ء سے 1914ء تک شاعروں نے نہ صرف نظم کے ذریعے روح عصر پیش کی بلکہ غزل میں بھی معنوی توسیع کی اور عصری تاریخ کو جمالیاتی موسیقیائی اور ملفوظی پیرایہ عطا کر کے محفوظ کر دیا۔ ابتدا میں غزل کے موضوع اور اسلوب میں تبدیلی لانا ایک چیلنج تھا جسے خندہ پیشانی سے قبول کیا گیا اور تخلیقی جوہر ایک نیا رخ اختیار کر کے ابھرا۔ فنکاری کو ایک نئی جہت ملی اور غزل کے نئے امکانات پیدا ہوئے جس سے غزلیہ روایت کی آب و تاب میں اضافہ ہوا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. غزل کے نئے تقاضوں کو کس شاعر نے پورا کیا؟
2. 1857ء کے بعد کون کون موضوعات غزل میں پیش کیے گئے؟
3. اس دور کے تین غزلیہ شعر درج کیجیے۔
4. کن شاعروں نے غزل کو نیا رخ دینے کی کوشش کی؟
5. حالی کی غزلوں میں کیسا بدلاؤ آیا؟
6. 1857ء کے بعد کی غزلوں کا مختصر محاکمہ کیجیے۔

20.5 خلاصہ

1857ء کی پہلی جنگ آزادی میں ناکامی سے ہندوستان کا سیاسی، سماجی، اخلاقی اور تہذیبی شیرازہ بکھرنے لگا۔ سارے مسلمات، تصورات اور روایات شکست و ریخت کے عمل سے گزرنے لگے۔ بدلے ہوئے ماحول میں نئے نئے مسئلے پیدا ہوئے۔ طرح طرح کی پیچیدگیاں سامنے آئیں جن کا لامحالہ اثر دانشوروں اور قلمکاروں پر بھی پڑا۔ اس دور کے سب سے بڑے دانشور اور قلمکار سرسید احمد خاں نے سب سے پہلے بڑی سنجیدگی کے

ساتھ اس کا احتساب کیا اور سائنٹفک سوسائٹی قائم کر کے مغربی علم و ادب کا شغف عام کرنے کی جدوجہد کی۔ وہ عقل کی روشنی میں حرکت و عمل کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک فطرت پرستی اور حقیقت نگاری کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ اردو شاعری کی خارجیت' مریضانہ عشق پرستی اور مبالغہ سے بیزار تھے۔ اسی لیے انہوں نے شاعری میں انقلاب آفریں تغیر کی ترغیب دی۔ اخلاقیات' کردار سازی اور سماجی تعمیر پر زور دیا۔ بعد میں انسٹیٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں بھی اس کی تشہیر کی۔ جس کی بنا پر ادبی سطح پر ایک لہر پیدا ہوگئی اور شعرا بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اس لیے سرسید تحریک (علی گڑھ تحریک) کو کلاسیکی شاعری سے الگ بننے والی شعری روایت کا اولین سرچشمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

سرسید تحریک سے نئی شاعری کی راہ ہموار ہو رہی تھی کہ اسی دوران لاہور میں 'انجمن پنجاب' خاصی فعال ہوگئی۔ لاہور بک ڈپو کے دارالترجمہ میں انگریزی کتابوں کے ترجمے ہونے لگے۔ کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں انجمن کا ماہانہ موضوعی مشاعرہ یا مناظمہ ہونے لگا۔ آزاد شاعری کے نئے تقاضوں پر لکچر دینے لگے اور حالی کے ساتھ کئی مختصر مثنویاں (ابتدا میں نظم کو مختصر مثنوی کہا گیا) لکھ کر ان مشاعروں میں شریک ہوئے جس سے آہستہ آہستہ نظم نگاری کے لیے ماحول سازگار ہونے لگا۔

یوں تو نظم ایک زمانے سے اردو شاعری کی مختلف ہیئتوں میں پیش ہوتی رہی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ' فائز دہلوی اور نظیر اکبرآبادی کے ہاں اس کی متنوع مثالیں ہیں۔ اس کی مقبول ہیئتوں میں غزل مسلسل' مسدس' مختصر مثنوی' قطعہ' ترکیب بند وغیرہ تھیں 1857ء کے بعد بیانیہ شاعری یا موضوعی شاعری کے لیے بھی یہی ہیئتیں اپنائی گئیں۔ غالب نے دہلی کی تباہی کا پر درد منظر اپنے ایک قطعہ میں' منیر شکوہ آبادی نے کالا پانی کی مصیبتوں کو ایک قطعہ میں اور بہادر شاہ ظفر نے قید فرنگ کا حال مسدس کی ہیئت میں بیان کیا ہے۔ 'انجمن پنجاب' کے ذریعے نظم نگاری کا چلن ہوا تو ایک عرصے تک مثنوی کی ہیئت چھائی رہی۔ محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کی کئی مشہور نظمیں اسی ہیئت میں ہیں۔ بعد میں ان دونوں نے دوسری ہیئتیں بھی اپنائیں۔ حالی کی شاہکار نظم' مدوجزر اسلام' مسدس کی ہیئت میں ہے۔ موضوعات کے لحاظ سے مناظر فطرت' حقیقت بیانی' وطن پرستی' آزادی کی خواہش' فرض شناسی' اخلاقیات' اتحاد و اتفاق کی برکتیں' تحصیل علم کی ترغیب وغیرہ جیسے مقدس اور مثبت جذبوں کی ترجمانی کی گئی۔ بچوں اور نوجوانوں کی کردار سازی پر بھی توجہ دی گئی۔ اس دور کے اکثر شاعران اہم پہلوؤں کی ترجمانی میں مصروف تھے اور سماج کی تعمیر نو میں سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔ شبلی' نذیر احمد' اسماعیل میرٹھی' اکبرالہ آبادی' ظفر علی خاں' چکبست اور اقبال اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔

ان ہی ایام میں انگریزی نظموں سے براہ راست اخذ' استفادہ اور ترجمہ بھی کیا گیا۔ انگریزی کی دو نظمیہ ہیئتیں نظم معریٰ (blank verse) اور اسٹنز افارم (stanzaform) اردو میں داخل ہوئیں۔ آزاد کی نظم 'جغرافیۂ طبعی کی پہیلی' اردو میں معریٰ نظم کا پہلا نمونہ ہے۔ جب کہ دتاتریہ کیفی نے پہلا اسٹنز افارم' تہنیت کامیابی' کے عنوان سے لکھا۔ ان کے علاوہ اسماعیل میرٹھی' شرر' نظم طباطبائی اور علامہ اقبال نے مغرب کے شاعروں گرے' ملٹن' ٹینی سن' شیکسپیئر' ورڈس ورتھ وغیرہ سے اخذ و استفادہ کیا اور بسا اوقات اپنی پسندیدہ نظموں کا ترجمہ کیا۔

بدلے ہوئے حالات میں نظم نگاری کی لہر سے غزلیں قدرے نظر انداز ہوتی رہیں۔ روایتی غزل گوئی جاری رہی۔ اس کی بھرپور آبیاری نہیں ہوسکی پھر بھی حالی نے کسی حد تک غزل کا بنیادی مزاج بدلنے کی سعی کی۔ غزل میں روح عصر کی کارفرمائی اور نیا اسلوب و آہنگ ان ہی کی دین ہے۔ ان کے بعد اس اچھوتے طرز پر اسماعیل میرٹھی' داغ دہلوی' اکبرالہ آبادی' چکبست وغیرہ نے بھی گاہے گاہے شعر کہے۔ اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ 1857ء سے 1914ء تک کا عہد نظم نگاری کے نام منسوب ہے۔ اس عہد میں موضوع' اسلوب اور ہیئت کی سطحوں پر نظم میں جتنا تنوع' بوقلمونی اور گہما گہمی ہے' غزل میں نظر نہیں آتی۔ روایتی غزلیں کہی جارہی تھیں مگر تازہ کاری پر جوش اور ولولہ کے ساتھ بہترین تخلیقی صلاحیت صرف نہیں کی گئی۔ اس کے باوجود غزل میں کسی قدر روح عصر نظر آتی ہے۔ غزل گو شعرا نے اپنے تخلیقی جوہر اور مہارت کو نیا رخ دے کر اس صنف میں امکانات پیدا کر دیے ہیں۔

20.6 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. 1857ء کے بعد کی شاعری میں ہونے والی تبدیلیوں کے محرکات کی نشاندہی کیجیے۔

2. 1857ء سے 1914ء تک کی نظمیہ شاعری کا منظر نامہ ترتیب دیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. اردو نظم نگاری کے تعلق سے محمد حسین آزاد کی کارگزاریوں کا جائزہ لیجیے۔
2. حالی کی نظمیہ شاعری پر روشنی ڈالیے۔
3. نظم نگاری میں انگریزی سے کس طرح اخذ و استفادہ کیا گیا؟ مفصل لکھیے۔
4. اس عہد کی غزلیہ شاعری پر ایک نوٹ لکھیے۔

20.7 فرہنگ

مشاعرہ	=	جس مجلس میں بالخصوص غزلیں پڑھی جائیں	لافانی	=	جو فنا نہ ہو Immortal
مناظمہ	=	جس مجلس میں صرف نظمیں پڑھی جائیں	تعقل پسندی	=	Rationalism
حقیقت نگاری	=	Realism	فطرت پرستی	=	Naturalism
مادیت	=	Matterialism	موضوع	=	Theme, Topic, Subject
اسلوب	=	Style	کبک دری	=	پہاڑی چکور
ہیئت	=	Form	صنف	=	Genre
شاہکار	=	Master Piece	مطبخ	=	باورچی خانہ، رسوئی گھر

20.8 سفارش کردہ کتابیں

1. علی جواد زیدی — اردو میں قومی شاعری کے سو سال
2. عنوان چشتی — اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے
3. عبادت بریلوی — جدید شاعری
4. ابواللیث صدیقی — آج کا اردو ادب
5. زرینہ عقیل احمد — حالی ایک عہد ساز فنکار
6. ڈاکٹر اسلم فرخی — محمد حسین آزاد

اکائی 21 : اُردو نثر 1857ء کے بعد

ساخت

21.1 تمہید

21.2 ناول

21.3 افسانہ

21.4 ڈرامہ

21.5 انشائیہ

21.6 تذکرہ

21.7 تاریخ ادب

21.8 تنقید

21.9 مضمون، مقالہ اور خطبہ

21.10 طنز و مزاح

21.11 سیرت النبیؐ

21.12 سوانح عمری

21.13 تاریخ

21.14 صحافت

21.15 سفر نامہ

21.16 لغت، لسانیات، درسی کتب وغیرہ

21.17 خلاصہ

21.18 نمونۂ امتحانی سوالات

21.19 فرہنگ

21.20 سفارش کردہ کتابیں

21.1 تمہید

1857ء میں پہلی جنگ آزادی کے خوں چکاں انجام سے ہندوستانی تاریخ ایک معنی خیز موڑ لیتی ہے۔ اس سال سقوط دہلی اور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر (1775ء ..... 1862ء) کی جلاوطنی سے وہ نوآبدیاتی منصوبہ (Colonial Plan) مکمل ہوگیا، جس کی پیش بندی ڈھائی سو سال پہلے کی گئی تھی۔ ملک کے اہم علاقوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی توسیع اور بالادستی، پرائیویٹ حفاظتی فوج کی تشکیل، پلاسی کی جنگ (1757ء) نواب سراج الدولہ کی شہادت (1757ء) ٹیپو سلطان کی شہادت (1799ء) نواب واجد علی شاہ کی کلکتہ منتقلی (1856ء) اسی کی اہم کڑیاں تھیں جو اورنگ زیب کے انتقال (1707ء) کے بعد گاہے گاہے رونما ہوئیں۔ 1857ء کا المیہ اس سلسلے کی آخری نتیجہ خیز کڑی یا Climax ہے جس کا عام ہندوستانیوں پر بڑا منفی اثر ہوا۔ حوصلہ شکنی اور فکری انتشار سے سیاسی اور سماجی منظر نامہ بدلنے لگا۔ سارے مسلمات، تصورات، روایات اور اقدار میں

بڑی تیزی سے ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی۔ سیاسی، سماجی، معاشی، اخلاقی اور تہذیبی اتھل پتھل سے عوام الناس میں مایوسی، محرومی، ہزیمت اور پیچ و تاب کا ایسا شدید احساس پیدا ہوا کہ فکر و عمل کے اعتبار سے سماج تین طبقوں میں بٹ گیا۔ ایک طبقہ عملی زندگی سے کنارہ کش ہو کر گمنامی کے غار میں جا چھپنے پر آمادہ تھا۔ دوسرا مشرقی طرز میں ذرا بھی ترمیم نہیں چاہتا تھا اور اس پر سختی سے کار بند رہنا اپنا ایمان جانتا تھا۔ جب کہ تیسرا طبقہ عقل و فہم کی روشنی میں خود احتسابی کے عمل سے گذر رہا تھا اور سماجی، تہذیبی، اخلاقی اور ادبی رویوں میں لچک پیدا کرنے پر مستعد تھا تا کہ بدلے ہوئے حالات کے تحت ہر سطح پر خوشگوار اور متوازن تبدیلی آئے اور عملی زندگی میں قوم کا وجود باقی رہے۔ اس طبقے کے سرخیل اور پیش رو سرسید احمد خاں (1817ء۔ 1898ء) تھے۔ انہوں نے ہی مختلف سطحوں پر اس نظریے کو پھیلانے میں پہل کی۔ سماجی، تہذیبی یا ادبی محاذ پر ان سے متاثر ہونے والوں میں الطاف حسین حالی (1837ء۔ 1914ء) محمد شبلی نعمانی (1857ء۔ 1914ء) نذیر احمد (1836ء۔ 1910ء) محمد حسین آزاد (1830ء۔ 1910ء) محسن الملک (1817ء۔ 1907ء) ذکا اللہ، چراغ علی، سید احمد دہلوی، وحید الدین سلیم، شاد عظیم آبادی، شرر لکھنوی، نواب سید محمد آزاد، منشی سجاد حسین وغیرہ تھے۔ ان میں سے بعض قلمکار ہر جگہ سرسید کی ہم نوائی کر رہے تھے اور بعض صرف ادبی سطح پر ان سے اتفاق رکھتے تھے۔

ان ادیبوں کے ذریعے اردو ادب بالخصوص نثر کو ایک نیا رخ ملا۔ عصری تقاضوں کے مدنظر ادب میں قومی اصلاح اور تعمیر نو کا پہلو شد و مد کے ساتھ ابھرا۔ نثر کی ہمہ جہت ترقی ہوئی۔ کئی تخلیقی اور غیر تخلیقی اصناف روشناس ہوئیں اور ادب کے استحکام اور استقامت کا سبب بنیں۔ نثر کی تخلیقی اور غیر تخلیقی اصناف کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

21.2 ناول

ناول نامیاتی زندگی، سماج اور ماحول کی ایسی عکاسی ہے جس میں ایک پلاٹ کے تحت قصہ، کردار، مکالمہ، ماحول و منظر اور نقطۂ نظر ایک دوسرے میں سمائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اردو میں اس کی ساخت و ہیئت انگریزی کے زیر اثر بنی ہے اور عام طور پر نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن ان کے پہلے ناول مراۃ العروس (1869ء) سے قبل دو ناول خط تقدیر (مصنفہ منشی کریم الدین مطبوعہ 1862ء) اور ریاض دلربا (مصنفہ منشی گمانی لولی مطبوعہ 1863ء) وجود میں آ چکے تھے۔ نذیر احمد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کی تربیت کے لئے ناول لکھنا شروع کیا اور دھیرے دھیرے اس کا دائرہ پھیلایا۔ اخلاقی، گھریلو اور نسوانی مسئلے آگے جا کر اس دور کے سیاسی اور سماجی حقائق سے ہم آہنگ ہو گئے۔ بنات النعش، توبۃ النصوح، رویائے صادقہ، **محضات**، آیامیٰ، فسانۂ مبتلا اور ابن الوقت ان کے وہ ناول ہیں جن میں انہوں نے اپنے مذہبی شعار، اخلاقی شعور، عصری آگہی اور سماجی بصیرت کے عکس بکھیرے ہیں۔ ان کی ناول نگاری کا بنیادی مقصد اصلاح اور تعمیر نو ہے۔ وہ عصری زندگی کی کھری سچائیاں سامنے لا کر عوام کو جھنجھوڑنا چاہتے ہیں، انہیں بیدار کرنا چاہتے ہیں تا کہ سماج بہتر ہو سکے۔ اسی بنا پر انہوں نے واقعہ کردار اور مکالمے کے دائرے محدود رکھے ہیں۔ ان کی زبان و بیان پر عربی کی ہلکی چھاؤں ہے۔ عام فہم زبان اپنانے کے باوجود کہیں کہیں عربی کے ثقیل اور نامانوس الفاظ اور مقولے بھی بے اختیار لکھ جاتے ہیں، جس سے بسا اوقات عبارت بوجھل ہو جاتی ہے ورنہ ان کی نثر سادہ ہے۔ یہ مثال دیکھی جا سکتی ہے :۔

> ''محمودہ۔ محتاج کے سر میں کیا سینگ ہوتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر محتاجی اور کیا ہوگی کہ آپ کا ایک دن بھی بے نوکروں کے نہیں کٹ سکتا۔ بھلا میں پوچھتی ہوں، ماما نہ ہو تو کھانا کون پکائے۔ لونڈیاں نہ ہو تو پانی کون پلائے۔ منہ کون دھلائے، پنکھا کون جھلے، چیز کون اٹھا کر دے، چارپائی کون بچھائے، بچھونے کون کرے، گھر میں جھاڑو کون دے۔ یہ تو روزمرہ کے کام ہیں۔ کھانا، کپڑا، برتن، زیور اور ضرورت کی کل چیزیں چھوٹی یا بڑی یہاں تک کہ پانی پینے کا مٹی کا آبخورہ، کنگھی، سوئی، سلائی کیا آپ نے اپنے ہاتھوں بنائی ہیں؟'' (بنات النعش)

نذیر احمد نے اپنے مشاہدوں کو لگاتار ناول کا روپ دیا جس سے اردو میں ناول نگاری جڑ پکڑنے لگی۔ حالی، شاد، سرشار، رسوا، شرر، سجاد حسین، رشیدۃ النساء، محمد علی طیب، مرزا محمد سعید، آغا شاعر، سرفراز حسین، پریم چند وغیرہ اس صنف کی طرف راغب ہوئے اور بڑی تعداد میں ناول لکھے گئے

جن میں مجالس النساء، (حالی) صورت الخیال (شاد) فسانۂ آزاد اور سیر کہسار (سرشار) ملک العزیز ورجنا' دلکش' فردوس بریں (شرر) نجوگ' صبح زندگی اور شام زندگی (راشد الخیری) شریف زادہ' ذات شریف اور امراؤ جان ادا (رسوا) اصلاح النساء (رشیدۃ النساء) ہیرے کی کنی (آغا شاعر) خواب ہستی (مرزا محمد سعید) شاہد رعنا (سرفراز حسین) اسرار معابد' ہم خرما و ہم ثواب اور جلوہ ایثار (پریم چند) اس دور کے اہم ناول ہیں۔ اس طرح 1857ء سے 1914ء تک کی مدت میں ناولوں کا ایک ذخیرہ ہوگیا' جس میں موضوع اور اسلوب کے تقلیدی نمونے بھی ہیں' ارتقائی بھی اور اختراعی بھی۔ موضوعات اکثر عصری اور پیش روزندگی کے علاوہ تاریخ اسلام سے ماخوذ ہیں اور ان کی بنت میں اصلاح اور پند و نصیحت موجود ہے۔ اس کے برعکس نثر کے اسلوب میں خاصا تنوع ہے۔ سپاٹ اور خشک نثر بھی ہے' شگفتہ اور رواں بھی ہے اور قدرے مرصع اور آراستہ بھی۔ نذیر احمد' سرشار' شرر اور پریم چند اس دور کے ممتاز اسلوب ساز ناول نگار ہیں۔ کردار نگاری کے لحاظ سے نذیر احمد اور سرشار کامیاب ہیں۔ مرزا ظاہر دار بیگ' ابن الوقت' خوجی اور آزاد لافانی کردار ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اولین اردو ناولوں میں فن کی پوری پابندی نہیں کی گئی۔ ان پر قصہ گوئی کا رجحان حاوی رہا۔ نظریہ حیات' قصہ' ماحول اور کردار کی موجودگی کے باوجود پلاٹ ڈھیلا ڈھالا اور کمزور ہے۔ اردو میں اس صنف کا یہ ابتدائی اور تشکیلی دور ہے' اس لیے خامیاں ناگزیر ہیں۔ ناول نگاروں نے جس طرح اس صنف کے پھلنے پھولنے کی راہ ہموار کی' اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خاص کر اردو نثر کو ہمہ جہت بنانے اور ہر طرح کے خیالات کا ترجمان بنانے میں ان کا اہم کردار رہا ہے۔

21.3 افسانہ

مختصر افسانہ زندگی کے کسی اہم واقعے یا گوشے کی ترجمانی کا فن ہے۔ واقعہ حیات میں تکنیکی سطح پر تخیلی کتر بیونت سے اس طرح کہانی پن پیدا کیا جاتا ہے کہ وحدت تاثر برقرار رہے۔ اس کی بنیادی ہیئت حکایتوں اور بعض داستانوں اور ناولوں میں ملتی ہے تاہم اردو میں یہ صنف انگریزی کے سائے میں جنم لیتی ہے۔ 20 ویں صدی کی پہلی دہائی میں یوروپی افسانوں کے ترجمے ہوئے پھر سجاد حیدر یلدرم' پریم چند' نیاز فتحپوری' حکیم احمد شجاع اور سلطان حیدر جوش وغیرہ نے طبع زاد افسانے لکھے۔ نامور افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم کا افسانہ ''نشہ کی پہلی ترنگ'' 1900ء میں شائع ہوا۔ محققین کے مطابق یہ اردو میں پہلا طبع زاد افسانہ ہے۔ اس کے بعد فکشن کے عہد ساز قلمکار پریم چند کا پہلا افسانہ دنیا کا انمول رتن' 1907ء میں چھپا پھر ان کے دوسرے افسانے شیخ مخمور' صلۂ ماتم' بڑے گھر کی بیٹی وغیرہ منظر عام پر آئے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ' سوز وطن' 1909ء میں طبع ہوا۔ یہ اردو میں طبع زاد افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ معروف عالم اور ادیب نیاز فتحپوری نے اپنا پہلا افسانہ' ایک پارسی دوشیزہ کو دیکھ کر' 1910ء میں لکھا جو 1913 میں چھپا۔ ان کے علاوہ حکیم احمد شجاع اور سلطان حیدر جوش نے بھی اس صنف میں اپنے فکر و فن کا مظاہرہ کیا۔

1914ء تک زیادہ افسانے تو نہیں لکھے گئے جو افسانے بھی منظر عام پر آئے۔ ان سے اردو میں اس صنف کے نکھرنے سنورنے اور مقبول ہونے کا موقع ملا۔ موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے ان افسانوں میں دو متوازی رو ملتی ہیں۔ پہلی رو کا ڈنڈا علی گڑھ ادبی تحریک سے ملتا ہے۔ زندگی کا سماجی اور اصلاحی نہج سے مشاہدہ' مغربیت کی چبھن' مشرقی روایات کا تحفظ بھی ہے اور صاف' سادہ اور عام فہم اظہار بھی ہے۔ اس میں حقیقت پسندی کے کئی اوصاف ملتے ہیں اور پریم چند اس کے علم بردار بن کر ابھرتے ہیں۔ جب کہ دوسری رو میں زندگی کا دل لبھانے والے حسن اور جذباتی آسودگی دینے والے پہلو کا ادراک' حقائق سے بھاگ' کر تصوراتی ماحول میں پناہ لینے کا میلان اور اس کا رنگین اور موثر بیان ملتا ہے۔ یہ دراصل رومانیت کا پیش خیمہ ہے اور یلدرم اور نیاز اس کے رہنما ہیں۔

یہ کہنا درست ہوگا کہ 1857ء کے بعد اردو میں صنف افسانہ متعارف ہوئی اور 1914ء تک اس کے جو نمونے سامنے آئے ان میں موضوع اور اسلوب دونوں سطح پر اصلاح اور تعمیر کی یکرنگی کم ہوئی۔ انسانی ذہن و فکر کا تنوع اور بیان کی وسعت تشت از بام ہوئی۔ موضوع کا انتہائی ذاتی گوشہ اور اسلوب کا تاثراتی اور جمالیاتی رخ ابھرا جو اردو نثر کے معنی خیز پھیلاؤ اور رنگا رنگ ارتقا کے لیے خوش آئند ثابت ہوا۔

21.4 ڈراما

ڈراما ادب کی قدیم ترین صنف ہے۔ اس میں مکالمہ و پس منظر اور حرکت و عمل کے ذریعے کوئی قصہ یا واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ روایتی

ڈرامے کے تین لازمی عناصر' وحدت زماں' وحدت مکاں اور وحدت تاثر ہیں۔مگر اب ان میں ترمیم کر کے طرح طرح کے تجربے کئے گئے ہیں۔ اردو میں ڈراما کی روایت 19 ویں صدی کے وسط میں واجد علی شاہ کے رہسوں اور سید آغا حسن امانت لکھنوی کے 'اندر سبھا' سے شروع ہوئی۔ رہسوں اور اندر سبھا کی زبان منظوم تھی۔ان کی عوامی مقبولیت کی بنا پر 1887ء میں مرزا ہادی حسن رسوا نے اپنا مشہور ڈراما 'مرقع لیلیٰ مجنوں' بھی نظم میں لکھا۔تاہم ان ہی ایام میں نثری ڈراما لکھنے کا چلن ہوا۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق بہرام جی فردوں جی مرزبان کا ترجمہ کیا ہوا 'خورشید' اردو میں نثری ڈرامے کا پہلا نقش ہے۔اسے ایدل جی جمشید جی کے گجراتی ڈرامے سے 1871ء میں ترجمہ کیا گیا۔اس کے بعد سید ابوالفضل الغیاض کا طبع زاد نثری ڈراما 'صولت عالمگیری' 1875ء میں کلکتہ میں چھپا۔ پھر نواب سید محمد آزاد کا 'نوابی دربار' 1878ء میں اودھ پنچ میں شائع ہوا۔''سطوت تیموری''، ''بلبل بیمار''، ''لیل ونہار''، ''نازاں'' وغیرہ بھی ابتدائی دور کے ڈرامے ہیں جو نثر میں لکھے گئے یا نثر اور نظم دونوں کا مجموعہ ہیں۔

یوں تو 19 ویں صدی کے آخری دور میں کئی نثری ڈرامے لکھے گئے اور ڈھاکہ' کلکتہ اور بمبئی میں اسٹیج بھی ہوئے مگر منظوم ڈراموں کا سحر ٹوٹا نہیں تھا۔اس دور میں نثری ڈرامے زیادہ مقبول نہیں ہو سکے۔ اسلوب کے لحاظ سے ان ڈراموں کی نثر ابتداً مقفیٰ تھی یا شعریت آمیز مگر جلد ہی عام بول چال میں بھی مکالمے لکھے جانے لگے۔ٹکسالی محاوروں میں گل افشانی' شوخی اور ظرافت کے نمونے ملنے لگتے ہیں۔ایک نسوانی مکالمہ دیکھیے :

''عزت حرمت جائے گی ٹھینگے سے (انگوٹھا دکھا کر) ناک کٹے گی' جس کی کٹے گی' اپنی جوتی کی نوک سے جو تم کو ایسا ہی لحاظ ہوتا تو آج کلیجہ کیوں پکا پکا کر پھوڑا کر دیے''۔ (نوابی دربار)

1914ء تک کے ڈراموں میں مقفیٰ' مسجع اور شعری خصوصیت کا حامل نثری اسلوب عام بول چال اور محاوروں سے مملو اسلوب کے ساتھ چلتا ہے بعد میں پیچھے چھوٹ جاتا ہے اور جدید نثری اسلوب اپنی سادگی اور شگفتگی کے ساتھ ڈراموں پر چھا جاتا ہے۔اردو نثر کی ارتقائی تصویر مذکورہ ڈراموں کے مطالعے سے بھی جھلکتی ہے۔

21.5 انشائیہ

انشائیہ کسی نکتے کے تعلق سے ابھرنے والی نشاطیہ ذہنی ترنگ کی ترجمانی کا فن ہے۔اس میں بات سے بات پیدا کرتے ہوئے اور لفظوں سے کھیلتے ہوئے دھیمی ظرافت پیدا کی جاتی ہے۔ یہ انگریزی کے Light Essay سے قریب ہے۔ملا وجہی کی ''سب رس'' اور غالب کے خطوط کی بعض عبارتوں میں اس کی جھلک ملتی ہے۔اس کا ابتدائی نقش محمد حسین آزاد کے مضامین کے مجموعہ ''نیرنگ خیال'' میں ملتا ہے۔گرچہ یہ انگریزی کے تمثیلی مضامین کا بالکل آزادانہ ترجمہ ہے مگر آزاد کی اختراع پسند طبیعت نے اس کے اکثر مضامین کے ماحول اور معاملات کو نرالے انداز سے بدل دیا ہے اور ایک طرح سے طبع زاد بنا دیا ہے۔تمثیلی مضامین کے اس مجموعے میں 'سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ' بہت دلچسپ مضمون ہے۔ سچ اور جھوٹ کو مجسم کر کے 'ملکہ صداقت زمانی' اور 'دروغ دیوزاد' کے کردار میں ڈھالا گیا ہے۔ان کے درمیان کی معرکہ آرائی پر لطف انداز میں پیش کی گئی ہے۔ 'شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار' میں بھی بیان کا جادو جگایا گیا ہے۔ عبارت آرائی کے علاوہ چلتی پھرتی اور منہ بولتی تصویریں اتارنے میں آزاد کو دست رس حاصل ہے۔کسی کسی جگہ خاکہ نگاری کا رنگ ملتا ہے۔مناسب لفظوں' برمحل محاوروں' چست بندشوں' اشاروں اور استعاروں سے وہ بڑی چابکدستی کے ساتھ کھیلتے ہیں اور موقع بہ موقع ظرافت کی بوچھار بھی کرتے ہیں۔علامہ شبلی کا یہ محاکمہ بڑا جچا تلا ہے کہ ''آزاد گپ بھی ہانک دے تو وحی معلوم ہوتی ہے''۔ بے شک ''نیرنگ خیال'' اردو نثر کا ایک شاہکار ہے۔اس کی صدائے بازگشت شرر' خواجہ حسن نظامی' مرزا فرحت اللہ بیگ وغیرہ کے انشائیوں میں ملتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ناول کی تعریف لکھیے۔

2. ''ریاض دلربا'' کس کا ناول ہے؟
3. 'ایامیٰ'' کے مصنف کا نام بتایئے۔
4. اردو کے پہلے طبع زاد افسانے کا نام بتائے۔
5. 1914ء تک لکھے جانے والے پانچ اہم افسانوں اور ان کے مصنفوں کے نام لکھیے۔
6. اردو میں نثری ڈرامے کا پہلا نقش کون سا ہے؟
7. اردو کے پہلے طبع زاد نثری ڈرامے کا نام بتایئے۔
8. محمد حسین آزاد کے کسی اہم انشائیہ کا نام بتایئے۔
9. محمد حسین آزاد کے بعد کن لوگوں نے انشائیے لکھے؟

21.6 تذکرہ

غیر تخلیقی نثر کی ایک اہم صنف تذکرہ ہے۔ اس کا شمار تاریخ ادب کے اہم مصادر میں ہوتا ہے۔ تذکرہ نگاروں کا بنیادی مقصد مختلف عہد اور مقام کے شاعروں بالخصوص غزل گوؤں کا پسندیدہ کلام محفوظ کرنا تھا۔ اس میں ضمنی طور پر شاعروں کے بہت مختصر حالات اور کبھی کبھار ایک آدھ جملے میں کلام پر رائے بھی درج کردی جاتی تھی۔ یہ صنف فارسی سے اردو میں آئی۔ 18 ویں صدی کے وسط سے اردو شاعروں کے تذکرے لکھے جانے لگے۔ ان میں اکثر حالاتِ شعرا اور رائے فارسی زبان میں ہے۔ 1801ء میں مرزا علی لطف نے اردو میں تذکرہ نگاری کی داغ بیل ڈالی۔ 1857ء کے بعد لکھے جانے والے اردو تذکروں میں سخن شعرا (عبدالغفور نساخ) انتخاب یادگار (امیر مینائی) چمن انداز (درگا پرشاد نادر) طور کلیم (سید نورالحسن) جلوۂ خضر (صغیر بلگرامی) وغیرہ اہم ہیں۔ نساخ بنگال کے رہنے والے تھے۔ ان کے تذکرے میں بنگال اور بہار کے ایسے بہت سے شاعروں کا ذکر ہے، جن کی شمولیت دوسرے تذکروں میں نہیں ہے۔ اس طرح سخن شعرا (مطبوعہ 1874ء) سے اردو شاعری کا ایک وسیع کینوس سامنے آتا ہے اور زبان و ادب کی مقبولیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

'جلوۂ خضر' (جلد مطبوعہ اول 1885ء جلد دوم 1890ء) اس لحاظ سے امتیاز رکھتا ہے کہ اس میں نہ صرف آٹھ سو شاعروں کے کوائف اور کلام ہیں بلکہ محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' (مطبوعہ 1880ء) کی کئی فروگذاشتوں کی نشاندہی ہوئی ہے نیز متروک و مروج لفظوں اور محاوروں کی چھان بین اور تقابل کی ایک مثال بھی قائم ہوئی ہے۔ اس لیے ادب اور زبان دونوں کے تعلق سے یہ تذکرہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

یہ کہنا درست ہوگا کہ اردو میں تذکرہ نگاری سے اطلاعاتی زبان (Informative Language) کی خاصی ترقی ہوئی اور تاریخ ادب کے شعری حصے کے لیے قیمتی مواد اکٹھا ہوا۔ محدود طور پر مجلسی، لسانی اور عروضی رایوں سے تنقید کی لکیریں بھی بنیں جن سے بیسویں صدی کی راہیں متعین ہوئیں۔

21.7 تاریخ ادب

نثر کی غیر تخلیقی اصناف میں تاریخ ادب بہت پیچیدہ اور کثیر الجہات صنف ہے۔ متعلقہ زبان کی ارتقائی تاریخ، اس کی ساری تخلیقات، تذکرے، بیاضیں، سیاسی تاریخ، اخلاقیات، مذہبیات، سماجیات، نفسیات، عمرانیات وغیرہ اس کے تصرف میں آتے ہیں۔ ان سب کے مجموعی تجزیے سے عہد بہ عہد رنگا رنگ ادبی منظر نامہ ابھرتا ہے۔ اردو میں اس کی بنیاد محمد حسین آزاد اور شبلی نعمانی کے ذریعے پڑی۔ 1880ء میں آزاد کی شہرۂ آفاق کتاب ''آب حیات'' شائع ہوئی جو تاریخ ادب اردو کا پہلا نمونہ ہے۔ اس میں انہوں نے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کا ایک نقشہ بھی کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ ولی دکنی سے لے کر انیس تک تمام ممتاز شاعروں کی شخصیت اور شاعری پر اظہار خیال کیا ہے اور مقصد سے پانچ ادوار قائم کیے ہیں۔

ہر دور کی ابتدا ادبی ماحول کے تذکرے سے ہوتی ہے پھر اس میں شاعروں کی ''بولتی چالتی اور چلتی پھرتی تصویریں سامنے آن کھڑی'' ہوتی ہیں۔ اشعار کے حوالے سے آزاد نے اپنی تنقیدی رائیں بھی دی ہیں اور موقع بہ موقع انشا پردازی اور مرقع نگاری کا جوہر بھی دکھایا ہے۔ اس عمل میں ان کی سحر البیانی بھی سامنے آئی ہے اور اسلوب سازی بھی۔ اس میں شک نہیں کہ حقائق کی پیش کش میں آزاد سے بھول چوک ہوئی ہے۔ بہت سی من گھڑنت اور سنی سنائی باتیں درج ہوگئی ہیں مگر اس دور کے کسی ادیب سے مواد کی چھان پھٹک کی زیادہ توقع رکھنا مناسب نہیں۔ اس لیے تاریخ ادب کے نقش اول کی حیثیت سے ''آب حیات'' کی شہرت ہے۔

آزاد کے ہمعصر شبلی نعمانی نے شعرالعجم (مطبوعہ 1908ء۔ 1918ء) میں فارسی ادب کی تاریخ لکھی۔ اس میں انہوں نے ادوار کے علاوہ شعری صنف و ہیئت کے لحاظ سے بھی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ فارسی شاعری کی ابتدا و ارتقا' نوعیت' شاعری کی مابیت اور اصناف' شاعروں کی حیات اور تخلیقات کا جامع احاطہ کیا ہے جس سے ایران و ہند کی تاریخی جلو میں فارسی شاعری کا ارتقا نظر آتا ہے۔ اس لیے یہ بیک وقت فارسی شاعری کی عمدہ تاریخ بھی ہے اور تنقید بھی۔

اس دور میں ادبی تاریخ نگاری سے اردو نثر میں یہ اضافہ ہوا کہ شاعر اور شاعری کے تعلق سے ادیبوں اور عالموں کے خیالات نثر میں تفصیل سے لکھے جانے لگے جس سے بعد میں مرقع نگاری اور تنقید و تجزیہ کی ترویج میں مدد ملی۔

21.8 تنقید

ادبی تنقید تخلیقات کی جانچ پرکھ' محاسن و معائب کی نشاندہی اور جمالیاتی تعریف و تحسین ہے۔ موضوع و مواد' زبان و اسلوب اور ساخت و ہیئت کے علاوہ مجموعی تاثر سے بحث اس کا بنیادی کام ہے۔ اسی کے نتیجے کے طور پر تخلیقات کے قدر و معیار کا تعین ہوتا ہے۔ یوں تو تذکرہ نگاروں نے شاعروں کے کلام پر کہیں کہیں ذاتی رائے دے کر اردو میں تنقید کی بنیاد رکھ دی تھی مگر اس کی باضابطہ ابتدا 1857ء کے بعد انگریزی کے اثر سے ہوئی۔ سرسید' حالی' شبلی' آزاد اور شہباز نے اپنی مختلف تحریروں میں ادب پر اظہار خیال کیا اور اردو شعر و ادب میں مثبت اور خوشگوار تبدیلی کی راہ ہموار کی۔ ان کے تنقیدی خیالات' مضامین اور خطبات میں کئی جگہ موجود ہیں۔ اس سلسلے میں حالی کی یہ تخصیص ہے کہ انہوں نے لاہور کے دارالترجمہ اور انجمن پنجاب سے وابستگی کے دوران انگریزی سے منتقل ہونے والے جن خیالات کا نوٹ تیار کیا تھا' اس کی مدد سے اپنے دیوان کا ایک مبسوط مقدمہ لکھ ڈالا اور 1893ء میں دیوان کے ساتھ چھپوایا۔ حسن اتفاق کہ وہی مقدمہ اردو تنقید کی پہلی کتاب بن گیا اور دیوان سے الگ ہوکر ''مقدمۂ شعر و شاعری' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں شاعری کی کنہیات اور مبادیات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور آخر میں اردو غزل' مثنوی' قصیدہ اور مرثیہ پر عملی تنقید کرتے ہوئے اصلاح کی تجویزیں پیش کی گئی ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر تک اس طرح کا کوئی کام اردو نثر میں نہیں ہوا۔ یہ اپنی مثال آپ ہے۔

شبلی نعمانی کی کتابیں' شعرالعجم اور موازنۂ انیس و دبیر' بھی تنقیدی حوالہ رکھتی ہیں۔ اول الذکر کے چوتھے حصے میں شبلی کے تنقیدی افکار ابھر کر سامنے آئے ہیں جب کہ ثانی الذکر میں تقابلی تنقید کے اولین نقوش ملتے ہیں۔ ان دونوں میں تنقید کی مشرقی قدریں ارتقا پذیر ہوئی ہیں۔ آزاد کی معروف کتاب ''آب حیات'' پہلے ہی داد تحسین حاصل کر چکی تھی۔ اس میں بھی تنقید کی کرچیاں موجود ہیں۔ امداد امام اثر کی 'کاشف الحقائق' (مطبوعہ 1897ء) اور شاد عظیم آبادی کی 'فکر بلیغ' بھی اولین تنقیدی تحریروں کی اہم یادگار ہیں۔

اس دور کی تمام تنقیدی تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ ان میں شعری تنقید کی مبادیات پر نکتہ آرائی کی گئی ہے۔ جانچ پڑتال کے اصول اور ضابطے بنانے کی سعی کی گئی ہے۔ ادیبوں کی سوچ کا دائرہ کار اور انداز جدا جدا ہے۔ حالی شاعری کے اصلاحی اور اخلاقی پہلو پر زور دیتے ہیں تو شبلی محاکات' تخیل اور احساسات پر۔ آزاد زبان و بیان کے حسن اور تاثیر کے دلدادہ ہیں تو اثر اخلاقی اور سماجی عناصر کے۔ اگر ان تنقیدوں میں قدر مشترک ہے تو مغربی تنقید کے اصول اور اندام سے استفادہ ہے۔ شروع کے بعض تنقید نگار مغربی ادب اور تنقید سے کچھ ایسے مرعوب ہوئے کہ انہیں اردو شاعری

محدود اور پھیکی معلوم ہونے لگی۔ حالی جیسے نستعلیق قلم کار بھی اپنی شدید بیزاری پر قابو نہ پا سکے اور یہاں تک کہہ گئے :

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر　　عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر

زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر　　ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر

ہوا علم دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

ظاہر ہے یہاں حالی کا راسخ اخلاقی نظریہ بھی کام کر رہا ہے مگر شاعری کے سارے کلاسیکی سرمایے پر ایسی منفی رائے دینا تنقید نہیں تنقیص ہے۔

بہر حال مغرب کے اثر سے اردو میں نظری تنقید، تقابلی تنقید اور عملی تنقید کے دستور اور قاعدے ترتیب پانے لگے اور اس کے ابتدائی نقوش بھی ابھر کے سامنے آئے۔ اسی کے ساتھ نثر میں ایک نیا موڑ آیا۔ بیانیہ میں بہت سی اصطلاحیں رائج ہوئیں، جن کا تعلق تشریح، وضاحت اور تجزیہ کے علاوہ علم عروض اور علم بیان سے ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں تنقید کے چلن سے نثر کے دائرے میں گوناگوں پھیلاؤ آیا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. تذکرہ 'سخن شعرا' کے مصنف کا نام بتائیے۔
2. 'آب حیات' اور 'شعر العجم' کے سنین اشاعت بتائیے۔
3. تاریخ ادب کی تعریف پیش کیجیے۔
4. 'مقدمۂ شعر و شاعری' پہلی بار کس سن میں منظر عام پر آیا؟
5. شبلی نے تنقید میں کون سی کتابیں لکھیں؟
6. 1914ء تک شائع ہونے والی پانچ تنقیدی کتابوں کے نام بتائیے۔

21.9 مضمون، مقالہ اور خطبہ

1857ء سے قبل سرسید احمد خاں علمی، تحقیقی اور تاریخی کام میں سرگرم تھے۔ ان کی کتاب 'آثار الصنادید' مشہور ہو چکی تھی۔ اس المیے کے بعد انہوں نے دور اندیشی اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے ایسی نثری تحریریں پیش کیں، جن کی بدلے ہوئے ماحول میں گہری سیاسی اور سماجی معنویت تھی۔ 'تاریخ سرکشی ضلع بجنور' اور 'اسباب بغاوت ہند' ان کی اہم تحریریں ہیں اور اپنا سیاسی حوالہ رکھتی ہیں مگر سرسید کی ہمہ گیر کوشش جہات شخصیت کی تیز شعاع غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کے قیام (1864ء) اور اس کے ترجمان میں ملتی ہے۔ سفر انگلستان سے واپسی پر 'تہذیب الاخلاق' (1870ء) کے اجرا سے مزید شعاع ریزی ہوئی۔ آسان اور عام فہم نثر میں انگریز مصنفوں ایڈیسن اور اسٹیل کے طرز پر ایسے مضامین چھپنے لگے جن کا مقصد مغربی علوم کو عوام میں متعارف کرانا بھی تھا اور مسلم معاشرے میں اصلاح، تعمیر نو اور تعلیمی بیداری سے روشن خیالی لانا بھی تھا۔ علی گڑھ کو مرکز بنانے کے بعد سرسید کی تعمیری اور اصلاحی سرگرمیوں میں اور شدت آئی۔ مختلف موضوعات پر خود بھی لاتعداد مضامین لکھے اور دوسرے قلمکاروں کو بھی ترغیب دی۔ جلسوں میں پڑھنے کے لیے مقالے اور خطبے لکھے اور اپنی نثری تحریروں سے ایک اجتماعی تحریک چھیڑ دی۔ تقلید پرستی، توہم پرستی، جہالت، رسم و رواج، کاہلی، خوشامد، ظاہر داری، ریاکاری، قومی نفاق، تعلیم کی اہمیت، تعلیم نسواں، ضبط اوقات، صفائی، تعقل پسندی، خود اعتمادی، اپنی مدد آپ امید کی خوشی وغیرہ ایسے اہم اور اچھوتے موضوعات ہیں، جن پر سرسید نے بڑی جرأت کے ساتھ مضامین لکھے اور اپنے استدلالی اور منطقی انداز سے عوام الناس کو بھولا ہوا سبق پڑھایا۔ ان کے مضامین، مقالے اور خطبات کی کلیدی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آسان، سلیس اور عام فہم زبان میں لکھے گئے

ہیں۔انہیں ہر طبقے کے لوگ پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ سرسید کا پیغام آسانی سے عوام کے ذہن میں سرائیت کرنے کی توانائی رکھتا ہے۔ ایک مضمون کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اکثروں کا خیال ہے کہ آپس میں اتفاق ہوتو رسموں میں اصلاح وترقی ہو گویا وہ اصلاح وترقی کو اتفاق پر منحصر رکھتے ہیں مگر میں اس رائے سے بالکل مختلف ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ رسموں کی اصلاح وترقی کا ذریعہ اتفاق نہیں ہے بلکہ اختلاف ہے۔جس شخص کے دل میں اصلاح وترقی کا خیال ہواس کو چاہیے کہ خود نہایت استقلال اور مضبوطی اور بہادری سے تمام قوم سے اختلاف کرے اور اس رسم کو توڑے یا اس میں اصلاح وترقی کرے۔''
> (مضمون: رسم ورواج)

یہ درست ہے کہ سرسید کے مضامین میں نہ فورٹ ولیم کالج والی شگفتہ ٹکسالی نثر ہے اور نہ غالب کی رواں اور بے تکلف نثر ہے بلکہ سادہ' سپاٹ اور ایک حد تک خشک نثر ہے۔انہوں نے جان بوجھ کر یہ نثری اسلوب اپنایا تھا۔ان کے سامنے موضوعات کی ایک وسیع دنیا تھی' جسے سجانے کے لیے ایک سیدھا سادہ اور ڈھیلا ڈھالا اسلوب درکار تھا تا کہ علم و آگہی کا ہر رنگ آسانی سے اس میں سما جائے۔ مثبت بحث و مباحثے کے دروازے کھل سکیں اور عوام کے ذہن وفکر میں کشادگی اور بالیدگی آسکے۔

سرسید کے علاوہ محسن الملک' شبلی' حالی' نذیر احمد' آزاد' وقار الملک' چراغ علی' ذکا اللہ' سید احمد دہلوی' فضل حق آزاد' شرر' مہدی افادی' وحید الدین سلیم' سجاد حسین' سید سلیمان ندوی' ابوالکلام آزاد' سید محمد آزاد وغیرہ اس دور کے اہم مضمون اور مقالہ لکھنے والے ہیں۔ ان قلم کاروں کی دلچسپیوں کا میدان بڑا پھیلا ہوا ہے۔ مذہبیات' قرآنیات' سماجیات' تہذیب وتمدن' شخصیات' سیرت' اخلاقیات' فلسفہ' سائنس' قواعد اور تنقید سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔نتیجتاً بے شمار خیال انگیز مضامین معرض وجود میں آئے۔اب کئی قلمکاروں کے مضامین' مقالوں اور خطبوں (لکچر) کے مجموعے چھپ کر منظر عام پر آچکے ہیں۔

21.10 طنز ومزاح

طنز ومزاح انسان کی خوش طبعی' حاضر دماغی اور لطیف اور تیز روفکری میلان کا آئینہ دار ہے۔اس کا اظہار تکلم اور تحریر دونوں میں ہوتا ہے۔ حکایتوں' قصوں اور داستانوں میں کہیں کہیں پر مزاح جملے مل جاتے ہیں۔ غالب کے خطوط میں بھی کئی جگہ ظریفانہ کرنیں پھوٹتی ہیں مگر طنز ومزاح نگاری کا باقاعدہ آغاز لکھنو کے اخبار 'اودھ پنچ' سے 1877ء میں ہوا۔اس میں سرشار' سجاد حسین' مرزا مچھو بیگ ستم ظریف' جوالا پرشاد برق' احمد علی شوق' نواب سید محمد آزاد وغیرہ نے انسانی کمزوریوں' اخلاقی گراوٹ' معاشی بدحالی اور سماجی برائیوں پر تیکھی نظر ڈالی اور دل کھول کر ہنسنے ہنسانے کے مواقع پیدا کیے۔ اپنی شوخی' طرحداری اور بانکپن کی ملفوظی پھلجھڑیاں چھوڑیں اور اسی میں بعض قلم کاروں نے فکری نکتے بھی بڑی ہنرمندی سے سموئے جس سے تحریروں کے بعض گوشے مزاح سے آگے بڑھ کر طنز کی چبھن پیدا کرتے ہیں اور زیریں لہر کے طور پر کچھ عصری پیغام کے حامل بھی ہوجاتے ہیں۔

''اودھ پنچ'' کے لکھنے والے ادیب بیسویں صدی کے پہلے دو دہوں میں بھی چھائے رہے اور طنز ومزاح کا ایک دفتر جمع ہوگیا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان تحریروں میں ایڈیسن کی طرح کا لطیف مزاح بھی ہے۔ والٹر کا تیز اور طرب انگیز طنز بھی ہے اور ہندوستانی چوپال والا پھکڑ پن' ٹھٹھول اور ذاتیاتی چھیڑ چھاڑ بھی ہے۔اگر کمزور اور پلید مضامین کو نظر انداز کرتے ہوئے طنز ومزاح کے جامع اور پائیدار مضامین اکٹھا کیے جائیں تو اس عہد میں روایت ساز تحریروں کا ایک ایسا وقیع ذخیرہ ملے گا جس کی حیثیت اردو طنز ومزاح کی کائنات کے محور کی سی ہے۔

21.10.1 مکتوبات

مکتوبات عموماً قلم برداشتہ لکھے جاتے ہیں۔ اس کی کوئی خاص ہیئت نہیں ہوتی ۔ بس لکھنے کی ایک معمولی ترتیب ہوتی ہے۔ اس میں انسانی جذبات اور احساسات کے بے دھڑک اجاگر ہونے کا پورا امکان ہوتا ہے۔ بہت محتاط مکتوب نگار بھی لفظوں اور جملوں میں کہیں نہ کہیں ایسے اشارے ضرور چھوڑ جاتا ہے جن سے ذہن و دل کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انسانی شخصیت کے مطالعے میں دوسری تحریروں کے ساتھ مکتوبات کی بھی اہمیت ہے۔ کئی ادیبوں کے مکاتیب ادب عالیہ میں شمار ہوتے ہیں۔ انگریزی میں چارلس لیمب اور اردو میں غالب کے مکتوبات شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔

1857ء کے بعد کے مکتوب نگاروں میں غالب کے علاوہ سرسید، شبلی، حالی، نذیر احمد، محسن الملک وغیرہ کے مکاتیب علمی و ادبی نثر کے اعلیٰ نمونہ ہیں۔ غالب اپنے بنے بنائے ڈھرے پر شگفتہ، بے تکلف اور مکالماتی نثر لکھتے ہیں تاہم سرسید کے ہاں مضامین اور خطبات والی گہری سنجیدگی قدرے کم ہوئی ہے۔ دھیمی دھیمی شوخی، بے تکلفی اور ظرافت سے ان کا نثری اسلوب لہلہا اٹھتا ہے۔ شبلی کے مکتوبات میں برجستہ، لطیف، خوبصورت اور نکتہ آفریں جملے لکھنے کا کم و بیش وہی رجحان ہے جس سے ان کے نثری اسلوب کی ایک پہچان بنتی ہے۔

حالی، نذیر احمد اور محسن الملک کے مکاتیب میں سادگی، سلاست اور روانی کے علاوہ ایک طرح کا تدریسی انداز ملتا ہے۔ ان کے مزاج کا بنیادی عنصر پند اور نصیحت میں عیاں ہوتا ہے۔ خاص کر نذیر احمد نے اپنے بیٹے بشیر الدین احمد کے نام جو مکاتیب لکھے ہیں، حد درجہ نصیحت آمیز ہیں۔

سرسید اور ان کے معاصروں کے مکاتیب اگر موضوعاتی اعتبار سے دیکھے جائیں تو ان میں ذاتی باتوں کے علاوہ مشرقی اور مغربی زبان و ادب، عصری تعلیم، تہذیب، سائنس، اخلاق اور مذہب وغیرہ پر خیال افروزی ملے گی۔ اس لیے ان تمام قلم کاروں کی شخصیت اور کارناموں کے بامعنی مطالعے میں ان کے مکاتیب اہم مصدر کا درجہ رکھتے ہیں۔ مکاتیب کے مجموعے بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انیسویں صدی میں نذیر احمد کے مکتوبات کو سید عبدالغفور شہباز نے 'موعظۂ حسنہ' کے نام سے 1887ء میں شائع کیا تھا اور غالباً سرسید کے معاصروں میں یہ پہلا مجموعۂ مکتوبات ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. اردو میں مضمون نگاری کس کے ذریعے رائج ہوئی۔
2. سرسید کے پانچ مضامین کے نام لکھیے۔
3. مضامین سرسید کی نثری خصوصیات بتائیے۔
4. سرسید کے ہم عصر پانچ مضمون نگاروں کے نام لکھیے۔
5. ''اودھ پنچ'' میں لکھنے والوں کے نام بتائیے۔
6. ''اودھ پنچ'' کس سن میں شائع ہوا؟
7. اس میں طنز و مزاح کے خاص موضوعات کیا تھے؟
8. مکتوب نگاری کی تعریف کیجیے۔
9. مکتوبات کے پہلے مجموعے کا نام بتائیے۔
10. سرسید اور ان کے رفقا کے مکتوبات کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

21.11 سیرت النبی ﷺ

سیرت النبیؐ نگاری نثر کی ایک نہایت نازک اور مشکل صنف ہے۔ اس کے لیے قرآن و حدیث اور کلاسیکی عربی زبان و ادب کی گہری اور

مستحکم جانکاری ضروری ہے نیز عشق رسولؐ کا صادق جذبہ بھی لازمی ہے۔ پختہ اور محتاط قلم کار ہی اس صنف میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ تاریخی شخصیت کے طور پر غیر مسلموں نے بھی حضورؐ کی سیرت لکھی ہے تاہم اکثر اعتدال اور انصاف نہیں برت سکتے ہیں۔

1857ء کے بعد سب سے اہم سیرت نگار علامہ شبلی ہیں۔ ان کی ''سیرۃ النبیؐ'' (جلد اول 1916ء) ایک امتی' ایک عاشق رسولؐ اور ایک محقق کا عمدہ تحریری سرمایہ ہے۔ اس کے مقدمے میں اصول حدیث اور اصول سیرت نگاری پر عالمانہ انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ''ظہور قدسی'' والا باب' فصاحت' بلاغت' انشا پردازی اور جوش بیان کی ایک مثال ہے۔ ''سیرۃ النبیؐ'' کا کچھ حصہ اور حاشیہ شبلی کے شاگرد رشید سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے۔ مگر تمام بنیادی مواد' تفصیل اور واقعات اہم عربی کتابوں سے شبلی کے جمع کیے ہوئے ہیں۔

شبلی سے قبل مفتی عنایت احمد کی ''حبیب اللہ'' (1858ء) حکیم ناصر علی غیاث پوری کی ''انوار ناصری'' (1864ء) قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی ''مہر نبوت'' (1899ء) اور ''رحمۃ اللعالمین'' (1912ء) شفق عماد پوری کی ''حدیقۂ آخرت'' (1910ء) وغیرہ منظر عام پر آ چکی تھیں۔ ان سب کتابوں سے حیات طیبہ کے کئی گوشے منور ہوئے ہیں۔ ان میں کہیں روایتی اور پرشکوہ نثر ملتی ہے اور کہیں سادہ' استدلالی اور تشریحی۔ اردو نثر کی ارتقائی لکیروں کی شناخت میں سیرۃ النبیؐ پر لکھی ہوئی مذکورہ کتابیں بھی اپنا عصری حوالہ رکھتی ہیں۔

21.12 سوانح عمری

سوانح عمری کسی شخص کی زندگی کے حالات اور اہم واقعات کی تدریجی تفصیل پر مبنی ہوتی ہے۔ اس میں شخص کے امتیازات اور خدمات کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک ذیلی حصہ ہے۔ اس سے کسی کے ذہن و مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور اس کے دور کو بھی۔

اردو میں 1857ء کے بعد کئی سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ شبلی اور حالی نے اس پر خاص توجہ دی۔ شبلی کی سوانح 'مولانا روم' 'النعمان' اور 'الغزالی' اہم کتابیں ہیں۔ مولانا روم' امام ابوحنیفہ اور امام غزالی تینوں ہی کئی سو سال پیشتر گذرے ہیں۔ اس لیے شبلی ان کی سوانح عمریوں میں قدیم عربی' فارسی سوانح اور تذکروں کی خوشہ چینی کرتے ہیں نیز ان کے کارناموں' عقائد' تصوف' افکار اور مسائل پر زیادہ گفتگو کرتے ہیں۔ اس بنا پر یہ کتابیں سوانح نگاری کے معیار پر کھری نہیں اترتیں۔ اردو میں ان تین عظیم شخصیتوں کی پیش کش یقیناً شبلی کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ ان ہی کی طرح حالی نے ''حیات سعدی'' میں شیخ سعدی کی سوانح سے زیادہ ان کے کلام اور دوسری تصنیفوں کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کے برعکس ''یادگار غالب'' اور ''حیات جاوید'' میں انہوں نے ایسی شخصیتوں پر قلم اٹھایا جنہیں انہوں نے قریب سے دیکھا اور پرکھا تھا۔ اپنے استاد غالب کی زندگی اور خدمات پر بڑی میانہ روی اور اعتدال کے ساتھ لکھا ہے اور نہایت اہم بنیادی مواد فراہم کیا ہے۔ جب کہ سرسید کی فعال علمی اور سماجی شخصیت سے نہ صرف وہ متاثر تھے بلکہ مرعوب بھی تھے جس کا اثر ''حیات جاوید'' میں جگہ جگہ موجود ہے۔ اس کتاب کے ایک کامیاب سوانح عمری نہ ہونے کا یہی سبب ہے۔

ان دونوں جید ادیبوں کے علاوہ عبدالغفور شہباز نے نظیر اکبرآبادی کی سوانح عمری ''زندگانیٔ بے نظیر'' لکھی۔ عرش گیاوی نے استاد شاعر تسلیم کی سوانح ''حیات جاودانی'' لکھی۔ اس طرح 1857ء کے بعد اردو نثر میں سوانح نگاری کی ایک روایت بنی اور سادہ' سنجیدہ اور اطلاعاتی نثری زبان کی ترقی ہوئی۔

21.13 تاریخ

تاریخ کسی علاقے' ملک یا دنیا میں رونما ہونے والے اہم اور یادگار واقعات اور دوسرے متعلقات کی ایک زمانی دستاویز ہے۔ علامہ شبلی اپنے عہد کے ایک اچھے مورخ ہیں۔ انہوں نے المامون (1889ء) اور الفاروق (1899ء) جیسی اہم کتابیں لکھیں۔ انہوں نے دونوں میں عربی' فارسی اور ترکی کی مستند کتابوں سے استفادہ کیا اور اپنے سفر مصر و شام و روم کے دوران کتب خانوں سے مواد حاصل کیا۔ ان کتابوں میں متعلقہ دور کے

ماحول، سماج، سیاست اور تمدن کی تفصیل درج کرتے ہوئے مذکورہ شخصیتوں کی زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ شبلی کی خاص توجہ ان دونوں شخصیتوں کے کارناموں پر ہے اور مورخ کی حیثیت سے وہ صاف ستھری نثر میں انہیں کو منور کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کتابوں کو تاریخ کا قابل قدر نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔ سرسید کی کتابیں ''تاریخ سرکشی بجنور'' اور ''اسباب بغاوت ہند'' خالص تاریخ تو نہیں مگر تاریخی حوالہ رکھتی ہیں۔

محمد حسین آزاد کی بادشاہ اکبر کے متعلق ''دربار اکبری'' اور بچوں کے لیے قصص ہند، بھی تاریخی نوعیت کی اچھی کتابیں ہیں۔ ان کے ہمعصر ذکا اللہ کی ''تاریخ ہندوستان'' (دس جلدیں) اجودھیا پرشاد منیری کی ''ریاض تربیت'' بھوانی لال کی ''کلیہ تاریخ ہندوستان'' شاد عظیم آبادی کی ''تاریخ صوبۂ بہار'' خدا بخش خاں کی ''تاریخ عظیم آباد' سید احمد دہلوی کی ''بزم آخر'' وغیرہ بھی تاریخ کی قابل ذکر کتابیں ہیں جو 1914ء تک لکھی گئیں اور اردو نثر کے پھیلاؤ کا سبب بنیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. 1857ء کے بعد کی اہم سیرۃ النبیؐ کا نام لکھیے۔
2. سیرۃ النبیؐ کی تعریف پیش کیجیے۔
3. سوانح عمری کیا ہے؟
4. شبلی اور حالی کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کے نام الگ الگ لکھیے۔
5. نظیر اکبر آبادی کی سوانح سب سے پہلے کس نے لکھی؟
6. شبلی نے کون کون سے تاریخ کی کتابیں لکھیں؟
7. سرسید نے تاریخی نوعیت کی کون سی کتابیں لکھیں؟
8. محمد حسین آزاد کی مورخانہ صلاحیت کن کتابوں سے ظاہر ہوتی ہے؟
9. تاریخ کسے کہتے ہیں؟

21.14 صحافت

صحافت علم و ادب کی ایسی شاخ ہے جس کا مدار خبر رسائی پر ہے۔ سیاسی، سماجی، مذہبی، تجارتی، علمی، ادبی غرض ہر طرح کی خبریں اور اطلاعات نیز ان کے تجزیے مرتب اور مطبوعہ صورت میں قارئین تک پہنچانے کا یہ ایسا عمل ہے جس میں مختلف النوع مضامین اور تحریریں بھی شامل کردی جاتی ہیں۔ اخبار کی ادارت اور علمی و ادبی رسالے یا جریدے کی ادارت میں خاصا فرق ہے۔ دونوں میں مواد کی ترتیب کا اصول بھی الگ الگ ہے۔

1857ء کے بعد چھپنے والے اردو کے اخبار اور رسائل میں اودھ اخبار، آگرہ اخبار، دبدبۂ سکندری (رام پور) اودھ پنچ، پیسہ اخبار، علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق، الندوہ، سفیر، اکمل الاخبار، آصف الاخبار، خورشید دکن، آفتاب دکن، الہلال، عظیم الاخبار، اخبار الاخبار، ہر الفوائد وغیرہ اہم ہیں جو دہلی، لکھنؤ، علی گڑھ، رام پور، ندوہ، حیدرآباد، کلکتہ، پٹنہ، مظفر پور اور آرہ سے شائع ہوئے۔ ان میں مضامین، مقالے اور دوسری تحریریں ہوا کرتی تھیں۔ عام قارئین کو مدنظر رکھتے ہوئے مشمولات کی زبان سادہ اور آسان ہوتی تھی۔ اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ اس دور کی صحافت نے اردو نثر کے متنوع رنگ ابھارے اور عوام کے بڑے حلقے سے رشتہ استوار کرنے میں مثالی رول ادا کیا۔

21.15 سفرنامہ

اردو میں سفرنامے کے نہج پر پہلی تحریر غالباً سرسید کی ہے۔ وہ اپنے سفر لندن کے اہم حالات و واقعات مضامین اور خطوط میں لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ ان تحریروں میں سفرنامے کی بہت سی خصوصیتیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ سرسید کے پنجاب کے سفر کی روداد اقبال علی نے 'سید احمد ان

کا سفر نامۂ پنجاب' کے نام سے لکھی ہے۔ اقبال علی اس سفر میں ان کے ساتھ تھے۔ سفر نامے سے پنجاب میں سرسید کی تمام سرگرمیوں۔ چندہ کی تگ و دو' تقریریں' اکابرین سے ملاقات' تعلیمی ماحول بنانے کی سعی وغیرہ پر روشنی پڑتی ہے۔

ایک اور سفر نامہ محمد حسین آزاد کا ''سیر ایران'' ہے۔ اس کی ادبی حیثیت سے زیادہ اس کی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔

بیرونِ ملک کا ایک اہم سفر نامہ علامہ شبلی نے ''سفر نامۂ روم و مصر و شام'' کے نام لکھا۔ اس میں انہوں نے ترکی' شام اور مصر جیسے مسلم ملکوں کے طرز حیات' مذہبی رجحان' اخلاقی معیار' تہذیبی و تمدنی حالات اور تعلیمی روش کا خاص طور پر احاطہ کیا ہے۔ قاہرہ' بیت المقدس' بیروت اور قسطنطنیہ وغیرہ کے اہم مقامات کی خاصی تفصیل لکھی ہے۔ اسکول' کالج' مدرسے' ہوسٹل' کتب خانے' اخبار' قلم کار اور ان کی تصانیف وغیرہ کے مشاہدوں سے بھی نتائج اخذ کیے ہیں۔ وہ ایک عالم تھے اس لیے سیاسی ڈھانچے' عدلیہ' انتظامیہ اور سماجی نظام پر زیادہ توجہ نہیں دیتے ہیں ورنہ ان کا سفر نامہ اور جامع ہوتا۔ پھر بھی اس کے بین السطور میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں۔

بہر حال اس دور میں سفر نامہ لکھنے کی کوشش کی گئی اور جو ایک آدھ نمونے سامنے آئے۔ وہ نثری شہ پارے کا درجہ تو نہیں رکھتے لیکن عصری دستاویز ضرور کہے جاسکتے ہیں۔

21.16 لغت' لسانیات' درسی کتب وغیرہ

اس دور میں ادبی کتابوں کے علاوہ محمد حسین آزاد نے کئی درسی کتابیں اردو ریڈریں' فارسی ریڈریں' قند پارسی' لغت اردو' قواعد اردو و فارسی' حکایات آزاد وغیرہ بھی ترتیب دیں۔ نذیر احمد نے منتخب الحکایات' چند پند' صرف صغیر' نصاب خسرو' رسم الخط' مبادی الحکمت وغیرہ لکھیں۔ جلال لکھنوی کی سرمایۂ زبان اردو' تنقیح اللغات اور مفید الشعرا اور سید احمد دہلوی کی طفلی نامہ' ہادی النساء' علم اللسان اور فرہنگ آصفیہ معروف کتابیں ہیں۔ اسی نوع پر رشحات صغیر (صغیر بلگرامی) رسالہ سرمۂ تحقیق (شوق تیموری) بھی عمدہ تحریریں ہیں۔ اس کے علاوہ قانون' جغرافیہ' مال گذاری کا دستور' سائنس' معاشیات' اصطلاحات (ادبی اور تکنیکی) وغیرہ پر بھی رسالے اور کتابیں لکھی گئیں یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کی گئیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. 1857ء اور 1914ء کے درمیان چھپنے والے پانچ اخبارات کے نام لکھیے۔
2. ''تہذیب الاخلاق'' کس نے جاری کیا تھا؟
3. بیرون ملک کا پہلا سفر نامہ کس نے لکھا؟
4. بیرون ملک کا پہلا سفر نامہ کن ملکوں پر محیط ہے؟
5. اردو سفر نامے کا پہلا نقش کن تحریروں میں ملتا ہے؟
6. محمد حسین آزاد نے کون سی درسی کتابیں لکھیں؟
7. نذیر احمد کی ترتیب دی ہوئی درسی کتابوں کے نام بتائیں۔

21.17 خلاصہ

1857ء کے المیے کے بعد سرسید آثار سے امکان کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ایک مستحکم مجتہد' مصلح اور قلم کار کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی سربراہی میں عصری علم و ادب میں اضافے' اصلاح اور تعمیر نو کی جدوجہد شروع ہوتی ہے۔ بہت سے قلم کار ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ حالی' شبلی' نذیر احمد' محمد حسین آزاد' محسن الملک' ذکا اللہ' چراغ علی' مہدی افادی' شوق نیموی' شاد عظیم آبادی وغیرہ کی عملی یا فکری یا تحریری

حمایت ملتی ہے۔ جس سے اردو نثر کی سمت و رفتار کا تعین ہوا۔ موضوع' اسلوب اور ہیئت کی سطح پر خوشگوار تبدیلی آئی۔ تصنیف' تالیف' ترجمہ اور ترتیب کا ٹھوس اور رنگا رنگ کام ہوا۔ ناول' افسانہ' نثری ڈراما اور انشائیہ کے وافر ابتدائی نمونے سامنے آئے۔ تنقید' تاریخ' سفر نامہ' مضمون' مقالہ' طنز و مزاح' سوانح عمری' صحافت' مکتوبات' لغت' لسانیات' قواعد وغیرہ سے متعلق بنیادی مگر سدا بہار تحریریں ظہو پذیر ہوئیں۔ ان گوناگوں نقوش سے نثر کی تخلیقی اور ادبی طرز کے ساتھ ساتھ علمی وضع بھی بنی۔ چوں کہ نثر کے اس عہد زریں کی پشت پر سرسید کی حرکی شخصیت تھی اور علی گڑھ سے شروع ہونے والی تعلیمی اور ادبی جدوجہد کی گونج سارے ملک میں سنائی دینے لگی تھی۔ اس لیے اسے سرسید تحریک یا علی گڑھ تحریک کا عہد بھی کہا جاتا ہے۔

21.18 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. 1857ء کے بعد اردو نثر میں کون کون سی تخلیقی اور غیر تخلیقی صنفیں داخل ہوئیں؟ ہر ایک کا تعارف کرائیے۔
2. اس دور کی اردو ناول نگاری کا تفصیلی خاکہ پیش کیجیے۔
3. اردو میں مضمون نگاری کی ابتدا و ارتقا پر روشنی ڈالیے۔
4. سیرت النبیؐ اور سوانح عمری کے اولین نمونوں کا جائزہ لیجیے۔
5. تنقید کی تعریف پیش کرتے ہوئے اردو تنقید کا ابتدائی منظر نامہ ترتیب دیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. افسانہ کسے کہتے ہیں؟ اردو کے اولین افسانہ نگاروں کی کارگزاریوں پر اظہار خیال کیجیے۔
2. اردو کے ابتدائی نثری ڈراموں کی تفصیل لکھیے۔
3. تاریخ اور تاریخ ادب کے باہمی ربط کا ذکر کرتے ہوئے تاریخ ادب کے ابتدائی نمونوں پر تبصرہ کیجیے۔
4. 1857ء کے بعد انشائیہ اور طنز و مزاح کے کیسے نمونے سامنے آئے؟ احاطہ کیجیے۔
5. سرسید کے نثری کارناموں کا جائزہ پیش کیجیے۔

21.19 فرہنگ

مسلمات = اجتماعی (مذہبی) القان (Dogmas)

تصور = عام یقین (Concept)

روایت = چلن' رواج (Tradition)

قدر = مانی ہوئی بات (Value)

صنف = مواد اور ہیئت کے لحاظ سے فن کا علاحدہ نمونہ (Genre)

طبع زاد = اختراع شدہ

تخلیقی = اختراعی (Creative)

مقفیٰ = قافیے دار (Rhythmical)

سوانح عمری = حیات و خدمات کی تفصیل (Biography)

عنوان = تحریر کا اشاریہ (Title)

موضوع = نفس تحریر (Topic)

مواد = حقائق وشواہد (Matter)

اسلوب = طرز بیان (Style)

اسلوبیات = طرز بیان کا مفصل مطالعہ (Stylistics)

ہیئت = مواد کی پیش کش کا ڈھانچا (Form)

صحافت = میڈیا کے ذریعے خبریں یا افکار فراہم کرنے کا عمل (Journalism)

سفرنامہ = سیر وسیاحت کی روداد (Travellogue)

بین السطور = سطروں کے درمیان لکھی ہوئی خاص اشاراتی باتیں (Between the lines)

درسیات = نصابی تحریریں یا کتابیں

21.20 سفارش کردہ کتابیں

1. پروفیسر نورالحسن نقوی — تاریخ ادب اردو
2. اعجاز حسین — تاریخ ادب اردو
3. عشرت رحمانی — اردو ڈراما۔ تاریخ وتنقید
4. وقار عظیم — داستان سے افسانے تک
5. ڈاکٹر فرمان فتحپوری — اردو افسانہ اور افسانہ نگار
6. خلیق احمد نظامی — سرسید
7. عبادت بریلوی — اردو تنقید کا ارتقا
8. سید عبداللہ — سرسید اور ان کے رفقا
9. یوسف سرمست — بیسویں صدی میں اردو ناول

اکائی 22 : انجمن پنجاب کی تحریک

ساخت

22.1 تمہید

22.2 پس منظر

22.3 محمد حسین آزاد

22.4 انجمن پنجاب کا قیام

22.5 اغراض و مقاصد

22.6 تنقید کا فروغ اور موضوعاتی مشاعرے

22.7 الطاف حسین حالی

22.8 خلاصہ

22.9 نمونہ امتحانی سوالات

22.10 فرہنگ

22.11 سفارش کردہ کتابیں

22.1 تمہید

اس اکائی میں 1857ء کے بعد اردو ادب اور خصوصاً اردو شاعری میں جدید رجحانات کے زیر اثر وجود میں آنے والی تحریک ''انجمن پنجاب'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ابتداً اس اکائی میں انجمن پنجاب کے قیام اور اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے اور پھر اردو میں جدید نظم کے فروغ کے سلسلے میں انجمن پنجاب کی خدمات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

1857ء سے قبل اردو شاعری میں یا تو فرضی قصوں پر مشتمل عشقیہ مثنویاں لکھی جاتی تھیں یا پھر سلاطین، امرا اور رؤسا کو خوش کرنے کے لیے یا ان سے انعام و اکرام اور مال و دولت حاصل کرنے کے لیے مبالغہ آمیز قصیدے لکھے جاتے یا پھر فرسودہ اور روایتی موضوعات پر مشتمل غزلیں کہی جاتیں۔ ان تمام اصناف میں غزل ہی کا پلہ بھاری تھا اور مشاعروں کی محبوب صنف سخن بھی غزل ہی تھی۔ طرحی مشاعروں میں مصرع طرح دیا جاتا، جس کو سامنے رکھ کر تمام شاعر اسی بحر اور اسی قافیے کی پابندی کے ساتھ غزلیں کہتے تھے۔ ان غزلوں میں خیال سے زیادہ طرز بیان اور فکر سے زیادہ صناعی اور تزئین کاری کو اہمیت حاصل تھی۔ نئے اور اچھوتے مضامین سے زیادہ صحت زبان پر زور دیا جاتا تھا۔ گویا قدیم طرز کی شاعری میں مواد اور خیال کو ثانوی اور اسلوب، آرائش اور صحت زبان کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ اس روایت کے خلاف سب سے پہلے محمد حسین آزاد نے آواز اٹھائی اور اردو میں جدید طرز کی شاعری یا موضوعاتی مشاعروں کی نیو رکھی۔ ان مشاعروں میں طرحی مصرع کے بجائے کوئی موضوع تجویز کیا جاتا تھا جس پر تمام شاعروں کو نظمیں لکھنے کی دعوت دی جاتی۔ اس تحریک نے اردو میں نہ صرف نظم نگاری کے لیے میدان ہموار کرنے میں اپنا کردار ادا کیا بلکہ اردو نظم کے فروغ و ارتقا میں بھی غیر معمولی خدمات انجام دیں۔

22.2 پس منظر

انیسویں صدی کے نصف دوم کا زمانہ اردو شعر و ادب کے جدید دور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اس دور میں اردو شاعری

انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں سے متاثر ہوئی۔ 1857ء سے قبل اردو شعر و ادب کا سرمایہ بڑی حد تک فارسی ادب کے زیر اثر نشو و نما پاتا رہا اور ہماری شاعری کا بیشتر سرمایہ غزلوں پر مشتمل تھا یا پھر قصیدوں، مثنویوں، مرثیوں اور رباعیوں پر۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ 1857ء سے قبل اردو میں نظم نگاری ناپید تھی۔ محمد قلی قطب شاہ سے نظیر اکبر آبادی تک متعدد شاعروں نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ نظم نگاری کے میدان میں نظیر اکبر آبادی کا نام ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

جدید علم و فنون اور مغربی شعر و ادب سے اثر پذیری کے نتیجے میں اردو میں نظم گوئی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ علی گڑھ تحریک کے علمبرداروں نے اردو شاعری کے دائرے کو وسیع کرنے اور اسے نئی جہتوں سے آشنا کرنے کے سلسلے میں ایک ناقابل فراموش رول انجام دیا ہے۔ سرسید احمد خان شاعری کے افادی پہلو سے بخوبی واقف تھے اور شاعری کو قوم کی اصلاح کے لیے ایک آلہ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے الطاف حسین حالی سے ''مسدس مدوجزر اسلام'' جیسی شاہکار نظم لکھوائی جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے۔ اس نظم میں حالی نے قوم کے عروج و زوال کی داستان بڑے دلکش اور موثر انداز میں بیان کی ہے۔ مسدس حالی کے بارے میں سرسید کہا کرتے تھے کہ قیامت کے دن جب خدا مجھ سے سوال کرے گا کہ دنیا میں تو نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے تو میں جواب دوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. 1857ء سے پہلے کی اردو شاعری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
2. 1857ء سے پہلے کس نظم گو شاعر نے شہرت حاصل کی؟
3. مسدسِ حالی کے بارے میں سرسید نے کیا کہا تھا؟

22.3 محمد حسین آزاد کی خدمات

جدید اردو شاعری کے آغاز اور نشو و نما کے سلسلے میں انجمن پنجاب کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اردو کے صاحب طرز ادیب اور باکمال شاعر محمد حسین آزاد انجمن پنجاب کے روح رواں تھے۔ انہوں نے اس انجمن کے پلیٹ فارم کے ذریعے اہلِ علم حضرات کو جدید شاعری کی اہمیت اور افادیت سے آشنا کرنے کی کامیاب تحریک چلائی اور جدید طرز کے مشاعروں کی بنیاد رکھی۔

آزاد، محمد باقر کے فرزند اور دہلی کالج کے فارغ التحصیل تھے۔ انہوں نے شیخ محمد ابراہیم ذوق سے شاعری کے آداب و رموز سیکھے تھے۔ 1857ء کے واقعہ کے بعد جب ان کے والد کو سزائے موت سنائی گئی تو آزاد نے دہلی سے ترک وطن کر کے لاہور میں پناہ لی۔

دہلی کالج کا شیرازہ بکھرنے کے بعد یہ کالج گورنمنٹ کالج لاہور میں ضم کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے لاہور علم و ادب اور شعر و سخن کی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ آزاد کے علاوہ دہلی سے لاہور پہنچنے والے ادیبوں اور شاعروں میں مولوی کریم الدین احمد، پنڈت من پھول، مولوی سید احمد دہلوی، پیارے لال آشوب، درگا پرشاد نادر اور الطاف حسین حالی جیسے اہل علم شامل تھے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. محمد حسین آزاد کے والد کا نام کیا تھا؟
2. آزاد نے شاعری کے رموز و آداب کس سے سیکھے؟

22.4 انجمن پنجاب کا قیام

انجمن پنجاب کا قیام 21 جنوری 1865ء کو پنڈت من پھول کی صدارت میں عمل میں آیا۔ جس کے افتتاحی اجلاس میں حکومت کے عہدے داروں کے علاوہ انگریزوں کے خیر خواہوں نے بھی شرکت کی۔ پنڈت من پھول نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا تھا کہ کلکتہ اور لکھنؤ کی طرح لاہور میں بھی

ایک ایسی ادبی انجمن کی بنیاد رکھی جائے جس کے ادبی جلسوں کی روداد اور مباحث کو چھپوا کر ان کی تشہیر کی جائے۔ پنڈت جی نے اس انجمن کا نام ''انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب'' (Society for the diffusion of Useful Knowledge in Punjab) تجویز کیا تھا جسے سبھی عہدیداروں اور اراکین نے منظور کرلیا۔ یہی انجمن بعد میں انجمن پنجاب کے نام سے مشہور ہوئی۔

پنڈت من پھول کے بعد انہیں کی خواہش پر ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر (Dr. G.W.Lietnor) کو اس انجمن کا صدر بنایا گیا جو ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے تھے اور لوگوں میں ان کی قابلیت اور ادب نوازی کے خوب چرچے تھے۔ انجمن پنجاب کے سرپرست اور محرک کرنل ہالرائڈ تھے لیکن انجمن کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا سہرا ڈاکٹر لائٹنر ہی کے سر ہے۔ آغا محمد باقر نے لکھا ہے کہ ''1857ء کے تباہ کن ہنگاموں کے بعد ہندوستان کے معاشرتی اور تعلیمی نظام کا شیرازہ منتشر ہوگیا تھا۔ جب ان لوگوں کے ہوش وحواس بجا ہوئے جو اس بگڑے ہوئے نظام کو دوبارہ سنبھالنے کے اہل تھے تو جگہ جگہ انجمنیں اور سبھائیں قائم ہوئیں۔ چنانچہ بنارس، لکھنؤ، شاہ جہاں پور، بریلی اور کلکتہ کو اس قسم کی انجمنیں قائم کرنے کا شرف حاصل ہے۔

[بحوالہ ''محمد حسین آزاد''۔ حصہ اول مرتبہ اسلم فرخی ص - 211]

اپنی معلومات کی جانچ:

1. انجمن پنجاب کا قیام کب عمل میں آیا۔ اس کے پہلے اجلاس میں کون کون شریک تھے؟
2. پنڈت من پھول نے انجمن پنجاب کا کیا نام تجویز کیا تھا؟
3. ڈاکٹر لائٹنر کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

22.5 اغراض ومقاصد

1) قدیم مشرقی علوم کا احیا
2) صنعت وتجارت کا فروغ
3) باشندگان ملک میں دیسی زبان کے ذریعہ علوم مفیدہ کی اشاعت
4) علمی وادبی، معاشرتی وسیاسی مسائل پر بحث
5) صوبے کے بارسوخ اہل علم طبقات اور افسران حکومت میں رابطہ
6) پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے خطوں کے ساتھ روابط اور تعلقات کی استواری

مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے نہ صرف یہ کہ مدرسے اور کتب خانوں کے قیام کی تجویز رکھی گئی بلکہ مختلف سماجی وتہذیبی علمی وادبی اور تعلیمی و اخلاقی موضوعات پر مضامین پڑھنے، لیکچرز منعقد کرنے اور ان پر بحث ومباحثوں کے لیے جلسے منعقد کرنے کا بھی منصوبہ بنایا گیا۔ جس میں شرکا کو اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی حاصل رہے۔ انجمن کی آواز دور دور تک پہنچانے کے لیے رسائل جاری کرنے کا بیڑہ اٹھایا گیا نیز کتب خانے اور دارالمطالعے قائم کیے جانے اور طلبہ کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے اور ان کی قدر افزائی کے لیے انعامات واسناد دیے جانے کی تجاویز رکھی گئیں۔

محمد حسین آزاد نے 11 فروری 1865ء کو منعقدہ انجمن پنجاب کے جلسے میں اپنا پہلا مضمون سنایا۔ جس کا عنوان تھا ''در بابِ رفعِ افلاس'' 22 فروری اور 17 اپریل کے جلسوں میں انہوں نے علی الترتیب ''اہل ہند کو اپنے سود و بہبود میں خود کوشش کرنی چاہیے'' اور ''ترقی تجارت ہندوستان'' پڑھا۔ انجمن کے ابتدائی جلسوں میں مضامین ومقالات پیش کرنے والوں میں آزاد کے علاوہ ڈاکٹر لائٹنر، پنڈت من پھول، پروفیسر علمدار حسین، بابو چندر ناتھ، بابو نوین چندر رائے اور مولوی عزیز الدین کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بیش تر اہل علم کے مضامین انجمن پنجاب کے سہ ماہی رسالے ''رسالہ انجمن اشاعت مطالب'' میں شائع ہوئے۔ ان جلسوں میں چونکہ محمد حسین آزاد کے مضامین سب سے زیادہ پسند کیے گئے۔ اس لیے ڈاکٹر لائٹنر نے انجمن کے

اخراجات پر آزاد کو لکچرر مقرر کرنے کی تجویز پیش کی جو منظور کر لی گئی۔ لکچرر کی حیثیت سے آزاد کے تقرر اور پھر استقلال کے بعد انہوں نے انجمن پنجاب کو ایک فعال اور کارکرد ادارے کی حیثیت دے دی۔ انجمن کے لکچرر کے درج ذیل فرائض تھے۔

1. جو مضامین پسند اور منظور کیے جائیں ان کو عوام میں مشہور کرے۔
2. ہفتے میں دو تین مرتبہ لکچر حسب منشا کمیٹی پڑھا کرے۔
3. تحریری لکچر بھی سلیس و دلچسپ اردو میں بنا کر پیش کرے۔
4. رؤسا کے مکانوں پر حاضر ہو کر ادب کے ساتھ مضامین مذکورہ سنایا کرے اور ہر نوع کی ترغیب و تحریک کرے۔
5. رسالے کی طباعت، ترتیب اور مضامین کی درستی وغیرہ کرے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''اس عہدے (لکچرر) پر محمد حسین آزاد کی تعیناتی نے انجمن پنجاب کی تحریک کو نئی توانائی دی۔ انہوں نے اس حیثیت میں اتنی عمدہ خدمات سرانجام دیں کہ ڈاکٹر لائٹنر آہستہ آہستہ انتظامی امور کے پس منظر میں اوجھل ہوتے گئے۔ اور ادبی پس منظر میں محمد حسین آزاد بتدریج نمایاں ہونے لگے۔ آزاد نے ایک اور اختراع یہ کی جلسۂ عام کے اختتام پر روایتی مشاعرے کا اضافہ کر دیا اور یوں انجمن پنجاب کے مقاصد کے فروغ کے لیے اس میں عوامی دلچسپی کا سامان بھی فراہم کر دیا۔'' (اردو ادب کی تحریکیں۔ ص 371-372)

ڈاکٹر منظر اعظمی نے گارساں دتاسی کے حوالے سے اطلاع دی ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر نے آزاد کو انجمن کا لکچرر نہیں بلکہ سکریٹری مقرر کیا تھا۔

'' 27 مارچ 1867ء کو ڈاکٹر لائٹنر کی تجویز پر ان کو (آزاد کو) انجمن کا سکریٹری بنا دیا گیا۔ آزاد نے انجمن میں ایک نئی روح پھونک دی اور صرف سال بھر کے اندر 36 مضامین لکچر اور تبصرے پڑھے۔''

(اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ ص 126)

اپنی معلومات کی جانچ:

1. انجمن پنجاب کے مقاصد کی تکمیل کے لیے کون کون سے منصوبے بنائے گئے؟
2. انجمن پنجاب کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالیے

22.6 تنقید کا فروغ اور موضوعاتی مشاعرے

انجمن پنجاب نے جہاں ایک طرف اپنے جلسوں میں پیش کئے جانے والے مقالات و مضامین پر بحث و تبصرے کے ذریعہ اردو میں تنقید نگاری کے لئے فضا ہموار کر دی تو دوسری طرف نئی طرز کے مشاعروں کی طرح ڈال کر اردو میں نظم نگاری کی باضابطہ تحریک چلائی۔ انجمن کے جلسوں میں مذکورہ مقالات کے علاوہ ''اردو کی نشو و نما اور اصلیت''، ''شمس ولی اللہ'' اور ''شاہ حاتم'' کے زیر عنوان آزاد کے مضامین مباحثے کے لیے پیش کیے گئے تھے۔ یہ مضامین اردو میں جدید تنقید کی روایت کے نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان جلسوں میں پڑھے جانے والے مضامین پر شرکائے محفل کو علمی و ادبی نکات پر اظہار رائے کا موقع دیا جاتا تھا۔ اس طرح انجمن پنجاب ہی سے مجلسی تنقید کا بھی آغاز ہوا۔ جس کا تسلسل اور ارتقا بیسویں صدی میں ''حلقہ ارباب ذوق'' اور ترقی پسند تحریک کی ادبی محفلوں میں نظر آتا ہے۔ آغا محمد باقر کے قول کے مطابق:

''یہ انجمن ہندوستان کی سب سے بڑی سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ مقبول انجمن تھی۔ تمام پنجاب کے بڑے بڑے عہدیدار کیا انگریز، کیا دیسی سب اس کے ممبر تھے..... پہلے سال چار رسائل سے (انجمن

کی) جو فہرست تالیفات بنتی ہے اس میں کتابوں کی تعداد 26 ہے..... یہی وہ ماحول تھا جس میں اردو نظم نگاری اور موضوعاتی مشاعروں کی تحریک شروع ہوئی۔'' (مقالاتِ آزاد۔ص 451)

انجمن پنجاب کا سب سے اہم کارنامہ اردو میں جدید طرز کے مشاعروں کی ترویج و اشاعت ہے۔ ان مشاعروں میں آزاد کے دوش بدوش حالی نے بھی نہ صرف یہ کہ شاعروں کی رہنمائی و ہمت افزائی کی بلکہ خود بھی عملی طور پر مختلف موضوعات پر بڑی دلکش اور موثر نظمیں لکھیں۔ حالی کو اس بات کا علم تھا کہ آزاد کے ذہن میں ایک عرصے سے جدید طرز کی شاعری کو فروغ دینے کا خیال کارفرما تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''لاہور میں کرنل ہالرائڈ ڈاکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کی ایما سے مولوی محمد حسین نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا یعنی 1874ء میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی موضوع کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا تا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔ میں نے بھی اسی زمانے میں چار مثنویاں ایک برسات پر دوسری امید پر، تیسری رحم و انصاف پر اور چوتھی حب وطن پر لکھیں۔'' (دیباچہ مسدسِ حالی ص 11)

ڈاکٹر انور سدید کے بیان کے مطابق اردو شاعری کی اصلاح کا یہ خیال آزاد کے ذہن میں اگست 1868ء میں پیدا ہوا لیکن اردو شاعری کی تحریک کا واضح تصور اس وقت سامنے آیا جب انہوں نے 7 مئی 1874ء کو (در باب نظم و کلام موزوں کے عنوان سے) نیچر کی شاعری پر ایک مدلل تقریر کی تھی اور اردو شاعری کی قباحتوں کو تفصیل سے آشکار کیا تھا۔ آزاد نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ:

''اے گلشن فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغے اور بلند پروازی کے بازوؤں سے اڑے۔ قافیوں کے پروں سے فرفر کرنے لگے۔ لفاظی اور شوکت الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھنے لگے اور استعاروں کی تہہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم، کسی شئے پر رغبت یا اس سے نفرت، کسی شئے سے خوف و خطر، کسی شئے پر قہر یا غضب، غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو اس کے بیان سے وہی اثر، وہی جذبہ، وہی جوش سننے والوں کے دلوں پر چھا جائے جو اصل کے مشاہدے سے ہوتا ہے۔ بے شک مبالغے کا زور، تشبیہ و استعارے کا نمک زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر پیدا کر دیتا ہے لیکن نمک اتنا ہی چاہیے کہ جتنا نمک، نہ کہ تمام کھانا نمک نمک۔'' (مقالاتِ آزاد۔ مرتبہ آغا محمد باقر۔ص 429)

حالی اور آزاد نے محسوس کیا کہ زندگی کے بے شمار مظاہر اور مسائل ایسے ہیں جنہیں شاعری کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ ہماری شاعری کی قدیم روایات شاعروں کو نئی راہوں پر چلنے سے روکتی ہیں۔ قدیم طرز کے مشاعروں میں عموماً کوئی طرحی مصرع دیا جاتا تھا جس پر تمام شاعروں کو مخصوص قافیہ، ردیف اور بحر کی پابندی کرتے ہوئے غزلیں لکھنی ہوتیں۔ اس کے برخلاف انجمن پنجاب کے مشاعروں میں کوئی موضوع تجویز کیا جانے لگا جس پر تمام شاعروں کو نظمیں کہنی ہوتی تھیں۔ اس طرح انگریزی شاعری کے زیر اثر اردو میں نظم گوئی کا آغاز ہوا۔

آغا محمد باقر کی تحقیق کے مطابق انجمن پنجاب میں جدید طرز کے دس مشاعرے منعقد ہوئے۔ مشاعروں کے آغاز سے پہلے 9 اپریل 1874ء کو ہونے والے جلسے میں آزاد نے نئی شاعری کے امکانات کے موضوع پر ایک عالمانہ مضمون پڑھا اور ''شب قدر'' کے عنوان سے اپنی ایک نظم بھی سنائی۔ آزاد کا مضمون اور نظم بے حد پسند کی گئی چنانچہ جلسہ کے اختتام پر کرنل ہال رائیڈ نے کہا کہ ''اس وقت مولوی محمد حسین نے جو مضمون پڑھا اور رات کی حالت پر جو اشعار سنائے وہ بہت قابل تعریف ہیں۔ یہ نظم ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس طرز کا جس کا رواج مطلوب ہے۔'' انجمن پنجاب کا پہلا مشاعرہ 30 مئی 1874ء کو ''برسات'' کے موضوع پر منعقد ہوا۔ دوسرا مشاعرہ 30 جون 1874ء کو ہوا جس کا موضوع ''زمستان'' تھا۔ اس مناظمے میں شریک ہونے والے چند شعراء کے نام یہ ہیں۔ محمد حسین آزاد، انور حسین ہما، مرزا اشرف بیگ خان اشرف دہلوی، مولوی قادر بخش، الٰہی بخش رفیق، اموجان دلی دہلوی،

شاگرد غالب، مولوی مقرب علی انیس، مولوی عطا اللہ خان عطا، اس طرح دیگر آٹھ مشاعرے علی الترتیب ''امید'' ''حب وطن'' ''امن'' ''انصاف'' ''مروت'' ''قناعت'' ''تہذیب'' اور ''اخلاق'' کے زیر عنوان منعقد ہوئے۔ روز بروز مشاعروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور مشاعروں کی شہرت ہندوستان بھر میں پھیل گئی۔

اخبار و رسائل میں ان مشاعروں کی تعریف میں بہت کچھ لکھا گیا اور انجمن پنجاب کی تقلید میں میرٹھ میں ''نظم سوسائٹی'' اور دہلی میں ''دہلی لٹریری سوسائٹی'' کے نام سے انجمنیں تشکیل دی گئیں۔ جہاں بالترتیب امید کے موضوع پر سید محمد مرتضیٰ بیان اور مولوی سیف الحق ادیب نے ''برسات'' کے عنوان سے نظمیں پیش کیں۔

یہ دونوں موضوعات انجمن پنجاب کے مشاعروں کے ابتدائی موضوعات سے ماخوذ ہیں۔ بقول روشن اختر کاظمی:

> ''آزاد کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی کوششوں سے اردو شاعری کو حیات نو بخشی اور وہ شاعری جو کہ فرسودہ اور از کار رفتہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کے جسدِ مردہ میں نئی روح پھونک دی۔ آزاد نے شاعری کی اہمیت، اس کی ترویج و ترقی، اصلاح و ترمیم کی طرف بالغ نظر حضرات کو متوجہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔''

آزاد کی نظموں کا مجموعہ (مجموعہ۔ نظم آزاد) جدید اردو شاعری کے ابتدائی اور مثالی نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں موضوعات و مضامین کی رنگارنگی اور تنوع بھی ہے اور شاعرانہ فنکاری کے سبب بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

آ اے شب سیاہ کہ لیلائے شب ہے تو
عالم میں شاہزادیِ مشکیں نسب ہے تو
آمد کی تیری شان تو زیب رقم کروں
پر اتنی روشنائی کہاں سے بہم کروں
ہونا وہ بعد شام شفق سے عیاں ترا
اڑنا وہ آبنوس کا تختِ رواں ترا
چمکے گا لشکر اب جو ترا آسمان پر
فرماں نشان میں بھی اڑے گا جہان پر
تا صبح ہووے کارگہہ روزگار بند
آرام حکم عام ہو اور کاروبار بند

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اردو تنقید کے فروغ میں انجمن پنجاب کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
2. انجمن پنجاب کے مشاعروں کی چند اہم خصوصیات کو اجاگر کیجیے۔
3. انجمن پنجاب کے مشاعروں کے اثرات کی نشاندہی کیجیے۔
4. انجمن پنجاب کو فعال اور کارگر دبنانے کے سلسلے میں مولانا محمد حسین آزاد کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

22.7 الطاف حسین حالی

اس میں شک نہیں کہ انجمن پنجاب کے روح رواں محمد حسین آزاد تھے، انہوں نے اپنی نظموں، تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ جدید طرز کے

مشاعروں کی حمایت میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔لیکن جدید شاعری کی تحریک کو مہمیز لگانے اور نئی نسل کو جدید اردو شاعری کی طرف راغب کرنے کا سہرا الطاف حسین حالؔی کے سر ہے۔

حالؔی پانی پت کے ایک غریب اور قدامت پسند خاندان میں پیدا ہوئے۔تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں دہلی پہنچے۔نوجوانی کا زمانہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اور مرزا غالب کی صحبت میں گزرا۔1857ء کے دل دہلا دینے والے واقعات کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔وہ ایک صاحب فکر انسان اور دردمند دل کے مالک تھے۔سرسید احمد خان کی صحبت نے ان کے جوہر کو چمکایا۔ابتداً انہوں نے شیفتہؔ غالبؔ اور مومنؔ کے زیر اثر قدیم طرز کی غزلیں لکھیں۔بہ حیثیت غزل گو حالی کا مقام نہایت بلند ہے۔اگر وہ جدید اردو شاعری کے بانی نہ بھی ہوتے تو ان کی غزلیں ہی اردو شاعری میں ان کا نام باقی رکھنے کے لیے کافی تھیں۔

انگریزی شاعری کے زیر اثر اردو شاعری کو انقلابی تبدیلیوں سے روشناس کروانے کا سہرا آزادؔ اور حالؔی دونوں کے سر ہے۔لیکن حالؔی نے عملاً شاعری کے نئے نظریے کی مدلل اور عالمانہ انداز میں تشریح وتلقین کی۔وہ ایک طرف انجمن پنجاب کے مقبول شاعر تھے تو دوسری طرف ان کا ''مقدمہ شعر و شاعری'' جدید اردو شاعری کے اعلان نامے (Manifesto) کی حیثیت رکھتا ہے۔اس تصنیف میں حالی نے شاعری کا نیا نظریہ پیش کیا ہے۔انہوں نے زبان کے مقابلے میں خیال کی اہمیت پر زور دیا۔لفظی ومعنوی صنعتوں کے مقابلے میں سادگیِ بیان کو ترجیح دی۔حالی کے نزدیک اچھا شعر وہ ہے جس میں سادگی، جوش اور اثر ہو۔بہ حیثیت شاعر حالی کا ایک یادگار کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سرسید کی فرمائش پر ایک طویل نظم ''مسدس مدوجزر اسلام'' لکھی۔حالی کی اس نظم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور ان کے اجداد کے کارنامے یاد دلا کر ان میں نیا حوصلہ پیدا کرنے کا شاندار کارنامہ انجام دیا۔بہ قول پروفیسر مجتبیٰ حسین، حالی نے ہمارے سامنے ایک آئینہ رکھ دیا جس میں ہم اپنے خدوخال دیکھ سکتے تھے اور جب لوگوں کو اپنی بگڑی ہوئی شکل نظر آئی تو بہت چراغ پا ہوئے مگر ''مسدس حالی'' کے آئینے پر گردوغبار نہ آسکا۔وہ اسی طرح حالات کی عکاسی کرتا رہا۔شعرا دھیرے دھیرے نظم کی طرف بڑھنے لگے۔سیاسی شعور بڑھنے لگا۔مغربی ادبیات کے اثرات تیزی سے پھیلنے لگے۔جمہوریت کا احساس اور معاشی انصاف کا تقاضہ زور پکڑنے لگا۔مسلمانوں کی عظمت رفتہ سے متعلق ''مسدس حالی'' کا ایک بند ملاحظہ کیجیے۔جس سے حالی کے کلام کی سادگی اور پُرکاری کا اندازہ ہوتا ہے:

نہیں اس طبق پر کوئی براعظم　　نہ ہوں جس میں ان کی عمارات محکم
عرب، ہند، مصر، اندلس، شام، ویلم　　بناؤں سے ان کی ہے معمور عالم
سر کوہ آدم سے تا کوہ بیضا
ملے گا جہاں جاؤگے کھوج ان کا

انجمن پنجاب کی تحریک کے زیر اثر اردو میں نظم نگاری کا رجحان نشوونما پانے لگا اور پھر آسمان شاعری پر یکے بعد دیگرا سماعیلؔ میرٹھی، سرورؔ جہاں آبادی، چکسبتؔ، نظمؔ طباطبائی، عظمت اللہ خان جیسے نظم نگار درخشاں ستاروں کی صورت میں نمودار ہونے لگے۔حالؔی اور آزادؔ کی اس تحریک کا نقطہ عروج بیسویں صدی کے نصف اول میں کلام اقبال کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. انجمن پنجاب کے فروغ کے سلسلے میں حالی کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
2. شاعری کے جدید نظریات کی ترویج واشاعت کے لیے حالی نے کون کون سے کارنامے انجام دیے؟

22.8 خلاصہ

زبانوں سے اثر قبول کیا اور اردو میں باقاعدہ جدید طرز کے مشاعروں کی تحریک شروع ہوئی ''جو انجمن پنجاب'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

انجمن پنجاب کا قیام لاہور میں 21 جنوری 1865ء کو عمل میں آیا۔ اس انجمن کے محرک کرنل ہال رائڈ ڈاکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب تھے۔ اس کی تنظیم و بندوبست کا سہرا ڈاکٹر لائٹنر کے سر ہے جو ایک صاحب بصیرت انسان اور گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل تھے۔ پنڈت من پھول انجمن پنجاب کے پہلے صدر تھے جن کی ایما پر بعد میں ڈاکٹر لائٹنر کو اس انجمن کا صدر بنایا گیا۔ اگر چہ انجمن پنجاب کے محرک اور منتظم دونوں انگریز عہدے دار تھے لیکن اس انجمن کے روح رواں اور اسے مقبول، موثر اور کارکرد بنانے والے مولانا محمد حسین آزاد تھے۔ ڈاکٹر لائٹنر آزاد کی کارکردگی سے اتنے خوش تھے کہ انہوں نے آزاد کو مستقل طور پر انجمن کا لکچرر مقرر کیا۔

اردو میں موضوعاتی نظموں کا آغاز دکنی دور ہی میں ہو چکا تھا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کو اردو میں موضوعاتی نظموں کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ محمد قلی سے نظیر اکبر آبادی تک اور بھی متعدد شاعروں نے نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن اردو ادب کے دکنی دور کے بعد ہر دور میں صنف غزل کا پلہ بھاری رہا۔ غزل کے بعد جن اصناف سخن پر توجہ کی گئی ان میں مثنوی، قصیدہ اور مرثیے کی صنف اہمیت رکھتی ہے۔ موضوعاتی نظموں کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔

انجمن پنجاب میں پیش کیے گئے مضامین پر مباحثے بھی ہوتے تھے جس کی وجہ سے ایک طرف اردو تنقید کو نشو ونما کا موقع ملا تو دوسری طرف شاعری میں مغربی ادب سے اثر پذیری کے نتیجے میں نئے امکانات اور نئے رجحانات کو فروغ حاصل ہوا۔

انجمن پنجاب کے کل دس مشاعرے ہوئے۔ جس میں آزاد بھی شریک تھے۔ الطاف حسین حالی نے اگر چہ صرف چار مشاعروں میں کلام سنایا تھا تاہم وہی انجمن کے مقبول شاعر تھے۔ حالی اور آزاد نے محسوس کیا کہ شاعری میں روایتی اور فرسودہ مضامین کو دہرانے کے بجائے نئے موضوعات پر طبع آزمائی کی جائے۔ ان کا خیال تھا کہ زندگی میں بے شمار مظاہر اور مسائل ایسے ہیں جنہیں شاعری کا موضوع بنایا جاسکتا ہے لیکن مشرقی شاعری کی قدیم روایات ہمیں نئی ڈگر پر چلنے سے روکتی ہیں۔ قدیم طرز کے مشاعروں میں غزل کا سکہ چل رہا تھا۔ مشاعروں میں عموماً کوئی مصرع طرح دیا جاتا تھا اور شاعروں کو اسی زمین و بحر اور قافیے کے التزام کے ساتھ غزلیں کہنی ہوتیں۔ اس کے برخلاف انجمن پنجاب میں طرحی غزلوں کے بجائے کسی مخصوص موضوع پر مربوط اور مسلسل نظم سنانی ہوتی۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں کی بنیاد آزاد نے رکھی تھی تاہم اس کو فروغ دینے میں مولانا حالی نے ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ انجمن کے مشاعروں میں شرکت کی وجہ سے ان میں اتنی قادرالکلامی پیدا ہوئی کہ وہ ''مسدس مدوجزر'' جیسی شاہ کار طویل نظم لکھنے پر قادر ہو گئے۔ انجمن پنجاب کی تحریک اور جدید طرز کے مشاعرے مبالغہ، تصنع، بناوٹ، جھوٹ، بے جا لفاظی اور آرائش کے خلاف پہلی منظم اور فعال تحریک تھی جس کے دیرپا اور دوررس اثرات سامنے آئے۔ حالی اور آزاد کے بعد اردو شاعری نے طویل عرصے تک اتنے نظم نگار پیدا کیے کہ ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس صنف میں اتنی سکت، توانائی، گنجائش اور طاقت آ گئی ہے کہ اس کے مقابلے میں غزل کی صنف بے جان معلوم ہونے لگی۔

22.9 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. انجمن پنجاب کے قیام اور اس تحریک کے فروغ کے سلسلے میں آزاد اور حالی کی خدمات کو اجاگر کیجیے۔
2. اردو میں موضوعاتی نظموں اور شاعری کے جدید نظریے کی ترویج میں آزاد اور حالی کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
3. انجمن پنجاب کی تحریک نے اردو شعر و ادب میں ایک نئی تبدیلی پیدا کی۔ وضاحت کیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. انجمن پنجاب کے قیام اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالیے۔
2. انجمن پنجاب کے اغراض و مقاصد کی نشاندہی کرتے ہوئے انجمن میں پیش کیے گئے مضامین کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کیجیے۔

22.10 فرہنگ

الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی
فروغ	=	روشنی، رونق، ترقی	مبالغہ	=	حد سے بڑھانا
رؤسا	=	رئیس کی جمع، امیر	صناعی	=	ہنرمندی، کاری گری
روح رواں	=	وہ شخص جس پر کسی کام کا دارومدار ہو	فارغ التحصیل	=	تعلیم یافتہ
احیا	=	دوبارہ جاری کرنا، تجدید	استقلال	=	مستقل ہونا
دوش بہ دوش	=	ساتھ ساتھ	ماخذ	=	اخذ کیے ہوئے، لیے ہوئے
ازکاررفتہ	=	پرانا، کام کے ناقابل	مہمیز لگانا	=	ایڑ لگانا، آگے بڑھانا
محرک	=	حرکت دینے والا، اکسانے والا	ایما	=	خواہش، اشارہ
فرسودہ	=	پرانا	نیو	=	بنیاد
ناپید	=	مفقود، معدوم	توانائی	=	طاقت
حیات نو	=	نئی زندگی	چراغ پا ہونا	=	ناراض ہونا
سکہ چلنا	=	حکم چلنا، رعب بیٹھنا			

22.11 سفارش کردہ کتابیں

1. منظر اعظمی — اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ
2. انور سدید — ادبی تحریکیں، از

اکائی 23 : علی گڑھ تحریک

ساخت

23.1 تمہید

23.2 پس منظر

23.3 1857ء کے واقعات، سرسید اور ان کی تحریک

23.4 سائنٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق

23.5 اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات

23.6 خلاصہ

23.7 نمونۂ امتحانی سوالات

23.8 فرہنگ

23.9 سفارش کردہ کتابیں

23.1 تمہید

اس اکائی میں علی گڑھ تحریک کا تعارف کروایا گیا ہے۔ یہ تحریک اردو ادب کی ایک مقبول اور فعال تحریک تھی اور اردو کی دیگر ادبی تحریکوں کے مقابلے میں اس کے بڑے دیرپا نتائج برآمد ہوئے۔ چونکہ اس کا مرکز علی گڑھ تھا۔ اس لیے علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی اور سرسید احمد خان اس کے سب سے بڑے علم بردار اور محرک تھے اس لیے اسے سرسید تحریک کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

1857ء کی جنگ آزادی اس تحریک کا نقطہ آغاز ہے۔ یہی وہ سال ہے جب کہ ہندوستانیوں نے انگریزوں کے مجرمانہ عہد اقتدار کے خلاف بغاوت کی تھی۔ جو ناکام رہی اور اسی سال سلطنت مغلیہ کا اختتام ہوا۔ علی گڑھ تحریک کا دوسرا اہم اور مثبت پہلو یہ ہے کہ انگریزوں کے دور اقتدار میں ہندوستان میں کئی سماجی، معاشرتی اور ادبی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

سرسید احمد اپنے عہد کے ایک صاحب بصیرت مصلح تھے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ 1857ء کے ہنگاموں کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں پر بہت زیادہ ظلم و زیادتی کی۔ چنانچہ مسلمانوں کو انگریزوں کے عتاب سے بچانے اور ان کے ذہن کو صاف کرنے کے لیے ''سرکشی بجنور'' اور ''اسباب بغاوت ہند'' جیسی کتابیں تصنیف کر کے یہ ثابت کیا کہ 1857ء کی بغاوت کے ذمے دار صرف مسلمان اور ہندوستانی نہیں بلکہ یہ بغاوت انگریزوں کی کوتاہیوں اور غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے اپنے مقالات اور مضامین کے ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان انگریزوں کے بدخواہ نہیں۔

سرسید کی نظر مسلمانوں میں پائی جانے والی کمزوریوں اور برائیوں پر بھی تھی۔ وہ اپنی قوم کو جہالت کی پستی اور تنگ نظری کے اندھیرے سے نکال کر اعلیٰ تعلیم کے اجالے میں لانا چاہتے تھے ان میں بلند خیالی اور وسعت نظر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ ہندوستانیوں کو پہلے ذہنی طور پر انگریزوں سے مقابلے کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے۔ اور ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغربی علوم فنون سے اپنی قوم کو بہرہ مند کرنا چاہتے تھے۔

مغربی علوم و فنون اور انگریزی ادبیات سے اثر پذیری کے نتیجے میں نہ صرف اردو شعر و ادب میں تبدیلیاں آئیں بلکہ متعدد نئی اصناف بھی وجود میں آئیں۔

23.2 پس منظر

سکوت و جمود کی یک رنگی کو توڑ کر اس میں تحرک و تبدل کی رنگا رنگی اور تنوع پیدا کرنے کے عمل کو تحریک کہتے ہیں۔ ادب میں جب کبھی یکسانیت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں یا سکوت و انجماد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو ادبی تحریک اس میں تحرک و تغیر پیدا کرتی ہے اور اس کی کہنگی کو زائل کر کے تازگی تنوع اور نیرنگی پیدا کرتی ہے۔ علی گڑھ تحریک اردو کی ادبی تحریکوں میں سب سے فعال اور توانا تحریک ہے جس کے بڑے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ اس تحریک کا نقطۂ آغاز دراصل 1857ء کی جدوجہد آزادی ہے۔

1857ء کا سال ہندوستان کی تاریخ میں سیاسی، سماجی اور ادبی نقطۂ نظر سے ایک انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی سال مغلیہ حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اسی سال ہندوستانیوں نے انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایک عظیم الشان جدوجہد کی جو ناکام رہی۔ اور اسی سال ہندوستان پر غیر ملکی حکومت مسلط ہوگئی۔ ایک تہذیب نے دم توڑ دیا تو دوسری تہذیب نے نئی زندگی پائی۔ انگریزوں کے تسلط کے زیر اثر ملک میں کئی سماجی معاشرتی اور ادبی انقلابات رونما ہوئے۔ سرسید احمد خان اس تحریک کے سب سے بڑے علمبردار اور محرک اول تھے۔ اگر 1857ء کا انقلاب نہ ہوتا تو شاید سرسید کی زندگی کا دھارا کسی اور سمت میں بہنے لگتا اور وہ اپنے رفاہی کاموں اور تصنیفی سرگرمیوں میں منہمک رہتے۔

انگریز تجارت کی غرض سے ہندوستان میں سترھویں صدی سے وارد ہونے لگے تھے۔ لیکن اٹھارویں صدی کے اختتام تک وہ ملک کے کچھ حصوں کے حکمراں بن گئے۔ اور انیسویں صدی کے ربع دوم میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں ان کا اقتدار ملک کے ایک بڑے حصہ پر ہو گیا تھا۔ بہ قول پروفیسر احتشام حسین:

> ''سچ یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی لٹیروں کی ایک تنظیم تھی جس نے اپنے ایک صدی کے مجرمانہ عہد اقتدار میں ملک کو اچھی طرح لوٹا۔ اگر بالواسطہ اس سے کچھ فائدہ بھی پہنچ گیا اور کسی طرح کے نئے شعور کا ظہور بھی ہوا تو اس کے تاریخی اسباب تھے۔ جن سے روگردان نہیں ہوا جا سکتا تھا۔'' [اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ صفحہ 179]

انگریزوں کے لیے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی حکمت عملی بے حد کارگر ثابت ہوئی۔ اسی پالیسی کے تحت انہوں نے ہندوستان کے مختلف طبقوں خصوصاً ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان حب الوطنی، بھائی چارگی اور قوم پرستی کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کی موثر کوشش کی۔ یہی سبب ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے مختلف طبقے آپس میں برسرپیکار رہنے لگے۔ مغلیہ سلطنت کو گہن لگنے کے بعد وہ روز بہ روز روبہ زوال ہونے لگی۔ ملک کے مختلف صوبے یکے بعد دیگرے خودمختار ہونے لگے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے میں انگریزوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور سرزمین ہند پر اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے۔

1857ء کی جدوجہد آزادی کے زوال کے کئی اسباب تھے۔ اول تو یہ کہ ہندوستانیوں میں نہ تو کوئی تنظیم اور باقاعدگی تھی اور نہ ہی اس بغاوت کے پیچھے کوئی سوچا سمجھا منصوبہ ہی تھا۔ دوسرے یہ کہ مادی نقطۂ نظر سے انگریزوں کے مقابلے میں ہندوستانیوں میں عشر عشیر بھی طاقت نہیں تھی۔ اس طرح ہندوستان کی پہلی جدوجہد آزادی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اگرچہ کہ ہندوستان کے سارے طبقات نے مل کر اس بغاوت میں حصہ لیا تھا لیکن بہ حیثیت مجموعی مسلمانوں نے انگریزوں کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا تھا۔ اس لیے یہی طبقہ خصوصیت کے ساتھ انگریزوں کا معتوب بنا۔ انگریزوں کو یہ احساس بھی تھا کہ انہوں نے حکومت بہر حال مسلمانوں سے چھین لی ہے اور اس طبقہ کو پوری طرح کچل کر وہ ہندوستان میں اپنے قدم مضبوطی کے ساتھ جما سکتے ہیں۔ چنانچہ انگریزوں نے انتقامی کارروائی کے طور پر مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے برطرف کیا۔ ان کی جاگیریں، مناصب اور وظائف بند کر دیے۔ بے شمار لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ متعدد افراد کو کالے پانی کی سزا دی گئی۔ لاتعداد اشخاص تختۂ دار پر چڑھا دیے گئے اور لاکھوں گھر اجاڑے گئے۔ سر سید احمد خان لکھتے ہیں:

> ''کوئی آفت ایسی نہیں تھی جو اس زمانے میں ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی، کوئی بلا آسمان

سے نہیں چلی جس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔ جو کتابیں اس ہنگامے کی بابت تصنیف ہوئیں ان میں بھی یہی کہا گیا کہ ہندوستان میں مفید اور بدذات کوئی نہیں مگر مسلمان ! مسلمان ! مسلمان ! کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں لگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جس کے بارے میں یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اٹھایا تھا۔'' [بحوالہ ''ادیب'' زبان وادب کی تاریخ نمبر 1993 ص 220]

اپنی معلومات کی جانچ :

1. تحریک کسے کہتے ہیں؟
2. کن وجوہات کی بنا پر 1857ء کا سال ہندوستان کی تاریخ میں ایک انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔
3. پہلی جدوجہد آزادی کی ناکامی کے اسباب بیان کیجیے۔

23.3 1857ء کے واقعات اور علی گڑھ تحریک

1857ء کے واقعات نے سرسید کو بے حد متاثر کیا۔ اس زمانے میں عام طور پر ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو جس تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑا اس کی تفصیلات سرسید نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ انہوں نے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑنے والی اس قیامت صغریٰ کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ بے گناہوں کو تباہ و برباد ہوتے دیکھ کر ان کا دل تڑپ اٹھا۔ وہ ترک وطن پر آمادہ تھے لیکن قوم کے درد نے انہیں اپنے ہم وطنوں کو مصیبت میں چھوڑ کر گوشہ عافیت میں پناہ لینے سے روک دیا۔ سرسید اپنی قوم کا کھویا ہوا وقار بحال کرنے کے لیے تادم آخر کوشاں رہے۔ مسلمانوں کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے انہوں نے متعدد مضامین لکھے۔ حکمرانوں سے دوستی کی پیش کش کی لیکن اس کے صلے میں انہیں کافر کا فتویٰ دیا گیا اور غدار کہا گیا۔ اس کے باوجود سرسید نے ہمت نہیں ہاری اور بڑی پامردی اور بلند حوصلگی کے ساتھ اپنی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے مسلسل کوشاں رہے اور بالآخران کی یہ سعی وکاوش مخالفتوں کے باوجود کارگر ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

> ''وہ قوم جس کے جان بر ہونے کے آثار نظر نہ آتے تھے' سرسید کی کوشش سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ترقی کے راستے پر گامزن ہوئی۔ سرسید کی یہ کوشش سرسید تحریک کہلائی اور چونکہ اس کا مرکز علی گڑھ تھا اس لیے علی گڑھ تحریک کے نام سے یاد کی گئی'' [بحوالہ: ''ادیب'' زبان وادب کی تاریخ نمبر۔ صفحہ 222]

علی گڑھ تحریک بنیادی طور پر ایک اصلاحی تحریک تھی جس کا مقصد مسلمانوں میں پائے جانے والے عیوب ونقائص کو دور کر کے انہیں فلاح و بہبود کے راستے پر گامزن کرنا تھا۔ سرسید اس تحریک کے روح رواں تھے۔ وہ مسلمانوں کو عہد جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنی قوم کو فرسودہ روایات اور توہم پرستی کے رجحان سے کنارہ کش ہونے' زندگی کے مادی مسائل سے دلچسپی لینے اور تجدد و تحرک کے میدان کو اپنانے کا درس دیا۔ سرسید کا دور مسلمانوں کی پستی اور انتشار کا زمانہ تھا۔ اس دور کے مسلمانوں میں دنیا بھر کی برائیاں اور خرابیاں موجود تھیں۔ ان میں ایک طرف جہالت' بے علمی اور بے حسی تھی تو دوسری طرف سستی' کاہلی' چاپلوسی' خوشامد' تعصب اور ریاکاری جیسے عیوب بھی موجود تھے۔ یہاں تک کہ وہ کھانے پینے' اٹھنے بیٹھنے کے آداب اور شرفا کی طرز گفتگو سے بھی بے بہرہ تھے۔ سرسید کی ان سارے مسائل پر نظر تھی۔ اس لیے انہوں نے مسلمانوں میں جدوجہد کی نئی روح پھونکنے کا فقید المثال کارنامہ انجام دیا۔

سرسید نے انگریزوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ انگریز عہدہ داروں کیساتھ انہوں نے چھوٹی بڑی متعدد خدمات پر کام کیا تھا۔ 1857ء کے ہنگامے میں انسانی ہمدردی کے جذبے سے انہوں نے بعض انگریز عہدہ داروں اور ان کے اہل خانہ کی جانیں بچائی تھیں۔ انگریزوں کی تہذیب وتمدن' اخلاق و

معاشرت اور علوم وفنون میں جو باتیں قابل تعریف تھیں سرسید انہیں بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ 1857ء کے واقعات کے بعد ہندوستانی دانشوروں نے محسوس کیا کہ انگریز جیسی طاقتور اور منظم قوم کا مقابلہ ہندوستانیوں کے لیے سردست ممکن نہیں۔ اول تو اس لیے کہ ہماری قوم نہایت پسماندہ اور حد درجہ غیر منظم ہے۔ دوسرے یہ کہ مادی نقطہ نظر سے انگریزوں سے مقابلے کی طاقت بھی ہندوستانیوں میں نہیں تھی۔ اس لیے مصلحانِ قوم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ موجودہ مرحلے میں ہندوستانیوں کا انگریزوں سے مقابلہ کرنا دیوار سے سر ٹکرانے کے برابر ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ عملاً ہندوستانی اور انگریز ایک قابل عمل سمجھوتہ پر پہنچ جائیں اور ہندوستانی قوم انگریزوں کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغربی علوم وفنون سے استفادہ کرے اور اس طرح پہلے ذہنی طور پر انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لیے خود کو پوری طرح تیار کر لے۔ ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور مسلمانوں میں سرسید اور ان کے رفقا نے یہ ذمہ داری قبول کی۔ اس کے بعد سرسید کی ساری زندگی اس کام کے لیے وقف ہوگئی کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے درمیان ایک ایسا سمجھوتہ ہو جائے کہ مسلمان اس ملک میں عزت کے ساتھ زندگی گزار سکیں اور ملک کے کاروبار میں اپنا موثر کردار ادا کر سکیں۔

سرسید نے ہندوستانی مسلمان نوجوانوں کو مغربی زبان وادب اور علوم وفنون سے فیض یاب کرنے کے لیے 1869ء میں انگلستان کا سفر بھی کیا تھا اور اس سفر کا مقصد ایک طرف مسلمانوں کے لیے ایک ایسا تعلیمی منصوبہ پیش کرنا تھا جس کے سہارے مسلمانوں کی نئی نسل متمدن دنیا میں اپنا موثر حصہ ادا کر سکے اور دوسری طرف ایک ایسے تعلیمی ادارے کے خواب کو عملی جامہ پہنانا تھا جس میں مسلمان نوجوانوں کو مغربی علوم وفنون کی بھی تعلیم دی جائے اور اس کے پہلو بہ پہلو مشرقی تہذیب یا اسلامی تمدن کی بنیادی خوبیاں بھی ان کی سیرت میں برقرار رہیں۔ انگلستان میں کم وبیش ڈیڑھ سال قیام کرنے کے بعد 1870ء میں سرسید جب ہندوستان واپس آئے تو 4 مئی 1875ء کو انہوں نے اپنے دیرینہ خواب کو ''مدرسۃ العلوم مسلمانان'' (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) کی صورت میں عملی جامہ پہنایا۔ پہلے یہ ادارہ صرف اسکول کی جماعتوں تک محدود تھا۔ اور پھر بعد کو یہاں کالج کی سطح پر بھی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ ڈاکٹر منظر اعظمی لکھتے ہیں:۔

''سرسید اس مدرسہ سے چار طرح کے تعلیم یافتہ پیدا کرنا چاہتے تھے:

1. وہ جو انگریزی کے ذریعہ تعلیم حاصل کر کے سرکاری اعلیٰ عہدے اور عزتیں پائیں۔
2. وہ جو انگریزی کے ذریعہ تعلیم پا کر مغربی علوم کو اردو میں منتقل کریں۔
3. وہ جو انگریزی کے ذریعہ تعلیم پا کر ایسی لیاقت حاصل کر لیں جس کا معیار انگلستان کے کالجوں کے برابر ہو۔
4. وہ جو عربی اور فارسی میں کمال حاصل کر کے مسلمانوں کے قدیم سرمایے کو موجودہ نسلوں تک پہنچائیں۔''

[اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ۔ صفحہ 229]

اپنی معلومات کی جانچ :

1. سرسید پر 1857ء کے واقعات کا کیا اثر ہوا؟
2. علی گڑھ تحریک کو اصلاحی تحریک کیوں کہا جاتا ہے؟
3. سرسید نے انگلستان کا سفر کیوں کیا تھا؟

23.4 سائنٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق

سرسید نے اپنے علمی و اصلاحی مقاصد کے حصول کے لیے غازی پور میں ایک انجمن قائم کی تھی جس کا نام سائنٹفک سوسائٹی (Scientific Society) تھا۔ یہ سوسائٹی سائنٹفک انداز میں سیاسی، سماجی اور تمدنی مسائل پر غور وخوص کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ جب ان کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا تو انہوں نے سوسائٹی کا دفتر بھی علی گڑھ منتقل کر دیا۔ اس سوسائٹی کی طرف سے ''اخبار سائنٹفک سوسائٹی'' جاری کیا گیا جس کا نام بعد میں تبدیل کر کے ''علی

گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' رکھا گیا۔ اس اخبار میں ایک کالم اردو میں ہوتا اور ایک انگریزی میں تا کہ مسلمان اور انگریز بیک وقت ان مسائل سے آگاہ ہوسکیں جوان کے پیش نظر تھے۔ اس رسالے کے ذریعہ سرسید نے مسلمانوں کی آواز کو حکمران طبقے تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی تھی اور پھر اپنے اصلاحی خیالات کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں 1870ء میں اپنا مشہور رسالہ ''تہذیب اخلاق'' جاری کیا۔ اس رسالے کا مقصد 1857ء کی تباہ حال قوم کو سماجی، اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے دوبارہ زندگی بخشنا تھا۔ سرسید اور ان کے رفقاء اس رسالے میں روزمرہ کے اہم مسائل پر بڑے سلجھے ہوئے اور عالمانہ مضامین لکھا کرتے تھے۔ اس رسالے نے 1857ء کی بغاوت کے بعد مسلمانوں کی بازآبادکاری میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ خواجہ الطاف حسین حالؔی، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی، مسٹر آرنلڈ، محسن الملک، وقار الملک، اعظم جنگ، چراغ علی، ذکاءاللہ، دینا ناتھ گنگولی، کاشی ناتھ، سمیع اللہ خان، حاجی محمد اسماعیل، منشی پیارے لال، وحیدالدین سلیم وغیرہ ''تہذیب الاخلاق'' میں مضامین لکھا کرتے تھے۔

''تہذیب الاخلاق'' کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اردو میں مضمون نگاری کے فروغ میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ اس رسالے میں شائع ہونے والے سبھی مضامین معیاری ہوتے تھے۔ ان مضامین نے نہ صرف لوگوں کی ذہنیت کی تربیت کی بلکہ ان میں روشن خیالی پیدا کی اور ان کے سوچنے اور سمجھنے کے انداز کو بھی بدل دیا۔ ''تہذیب الاخلاق'' نے اردو شعر وادب کی قدیم وجدید تمام اصناف پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

> ''مرحوم سرسید اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں ایک کالج ہی نہیں قائم کیا تھا بلکہ وقت کی تمام علمی وادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ اس حلقہ کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور اس کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔ ہندوستان کے کسی موقت الشیوع رسالے نے شاید ہی ایسے گہرے اثرات وقت کی دماغی رفتار پر ڈالے ہوں گے جیسے کہ تہذیب الاخلاق سے مرتب ہوئے۔ فی الحقیقت جدید علم وادب کی بنیادیں اسی رسالے نے استوار کیں اور اس کو اس قابل بنا دیا کہ آج ہر طرح کے علمی اور ادبی مطالب ادا کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی قابل ذکر اہل قلم ایسا ہوگا جو اس مرکزی حلقہ کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ جدید ہندوستان کے بہترین مسلمان مصنف اس حلقہ کے زیر اثر پیدا ہوئے اور یہیں نئے قسم کی اسلامی تحقیق وتصنیف کی راہیں پہلے پہل کھولی گئیں۔ اردو کی نئی شاعری کی بنیاد اگرچہ لاہور میں پڑی تھی مگر اس کو نشوونما یہیں کی آب وہوا سے ملی..... اردو خطابت کی پہلی درسگاہ یہی تھی اس دور کے تمام مشہور مقرروں کو اسی حلقے نے پیدا کیا اور اگر پیدا نہیں کیا تھا تو ان کے لیے پلیٹ فارم یہیں مہیا کیا گیا۔''

[کانوکیشن ایڈریس۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔ 20 فبروری 1949]

اپنی معلومات کی جانچ :

1. سائنٹفک سوسائٹی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
2. مضمون نگاری کے فروغ میں رسالہ تہذیب الاخلاق کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
3. تہذیب الاخلاق کے چند معروف لکھنے والوں کے نام بتائیے۔

23.5 اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات

علی گڑھ تحریک کی مختلف النوع خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس تحریک نے اردو شعر وادب پر بڑے گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کیے۔ خصوصاً اردو ادب کو مغربی علوم وفنون سے فیض یاب کرنے میں علی گڑھ تحریک نے ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ سرسید احمد خان اور

ان کے نامور رفقاء الطاف حسین حالی، نذیر احمد، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، وقار الملک، محسن الملک اور چراغ علی اس تحریک کے ممتاز اراکین تھے۔ بعد کو اس عظیم الشان تحریک سے وابستہ ہونے والے شعراء اور ادیبوں میں وحید الدین سلیم، نواب عماد الملک، عبدالحلیم شرر، نواب صدر یار جنگ، ڈاکٹر ضیاء الدین، آفتاب احمد خان، مولوی عبدالحق، طفیل احمد، ظفر علی خان، سجاد حیدر یلدرم، عزیز مرزا، عنایت اللہ، حسرت موہانی، رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر عابد حسین، غلام السیدین، ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد مجیب قابل ذکر ہیں:

جہاں تک اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات کا تعلق ہے، فورٹ ولیم کالج کی کوششوں اور مکاتیب غالب کی مقبولیت کے باوجود اردو نثر ابھی تک فارسی زبان و ادب کے رجحانات سے بے حد متاثر تھی۔ عام بول چال کی سیدھی سادی زبان تحریر میں استعمال نہیں ہوتی تھی۔ انگریزی زبان کے زیر اثر سرسید اور ان کے رفقاء نے عام بول چال کی زبان کو تحریر میں استعمال کرنے کی کامیاب تحریک چلائی۔ اس تحریک کا مقصد عبارت آرائی سے گریز کرتے ہوئے اپنے مشاہدات، تجربات اور خیالات کو سیدھے سادے اور عام فہم لیکن موثر انداز میں پیش کرنا تھا۔ دوسرے الفاظ میں خیال کو بنیادی اہمیت دی گئی اور زبان و بیان کی خوبیوں کو ثانوی۔ سرسید کے نزدیک تخلیق ادب بیکاری کا مشغلہ نہیں بلکہ یہ زندگی اور سماج کو سنوارنے، سدھارنے اور بہتر بنانے کا سب سے اچھا ذریعہ ہے۔ ان کے خیال میں ادب میں زندگی کے مسائل کی اس طرح ترجمانی ہونی چاہیے کہ اس سے زندگی اور معاشرے کو فائدہ پہنچے۔ اس طرح وہ ادب کے افادی پہلو کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں۔ سرسید بنیادی طور پر ایک سماجی مصلح تھے۔ اس مقصد کی تبلیغ و تلقین کے لیے فطری طور پر انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اردو زبان کا استعمال کیا اور اس طرح اردو زبان بالواسطہ طریقے پر سرسید کی عظیم الشان سماجی تحریک سے وابستہ ہوگئی۔ چونکہ سرسید کا اسلوب پر اثر تھا اس لیے نہ صرف ان کے ہم نوا بلکہ مخالفین بھی جو ان کی مخالفت میں اخبار اور رسالے نکالتے تھے، نادانستہ طور پر سرسید کی زبان اور ان کے اسلوب کی پیروی کرتے تھے۔ اس طرح سماجی انقلاب کی اس جدوجہد میں اردو نثر کا سادہ اور موثر اسلوب خود بہ خود اردو لکھنے والوں میں رواج پا گیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے بالکل درست لکھا ہے:

> ''سرسید اور ان کی جماعت کے لوگوں نے اردو کو جو علمی اعتبار سے اس وقت تک ایک بے مایہ زبان تھی، تھوڑے عرصے میں اعلیٰ علمی جواہر ریزوں سے مالا مال کر دیا۔'' [سرسید اور ان کے نامور رفقا۔ صفحہ 58]

علی گڑھ تحریک کی سعی و کوشش سے انگریزی زبان و ادب کے زیر اثر متعدد اصناف ادب جیسے ناول، مختصر افسانہ، تنقید، انشائیہ، سوانح عمری وغیرہ اردو میں رائج ہوئے۔ سرسید نے انگریزی کے مشہور ادیبوں جوزف ایڈیسن (Joseph Eddison) اور رچرڈ اسٹیل (Richard Steele) کی تقلید میں اپنے رسالے تہذیب الاخلاق میں مختلف سماجی، اخلاقی، علمی، دینی اور سیاسی مسائل پر خود بھی مضامین لکھے اور اپنے رفقاء سے بھی لکھوائے۔ اس طرح مختصر مضمون (Essay) اور انشائیے (Light Essay) کی صنف اردو میں رواج پانے لگی۔ ان مضامین کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں ایک طرف سائنٹفک انداز اور عقلیت پسندی پر زور دیا جاتا تو دوسری طرف غیر ضروری لفاظی اور عبارت آرائی سے گریز کیا جاتا تھا۔ اسلوب بیان کی سادگی اور تاثر کی فراوانی اس تحریک کی بنیادی خصوصیت تھی۔ غرض علی گڑھ تحریک ایک عظیم الشان اصلاحی، علمی اور ادبی تحریک تھی جس کے بڑے دور رس اور دیرپا نتائج سامنے آئے۔ بقول پروفیسر نور الحسن نقوی:

> ''ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو سرسید اور علی گڑھ تحریک کے احساں سے گراں بار نہ ہو۔ اس تحریک نے بے عملوں کو جدوجہد عمل کا درس دیا۔ ماضی کے پرستاروں کو حال کی اہمیت سے آشنا کیا۔ تنگ نظروں کو وسعت نظر سکھائی۔ بزرگوں کے کارناموں پر فخر کرنے والوں کو اپنی ذات میں خوبیاں پیدا کرنے پر آمادہ کیا۔ مشرق کے پجاریوں کو مغرب کے کارناموں سے آشنا کیا۔ دنیا کو بے حقیقت بتانے والوں کو دنیا میں نیکی کمانے اور آخرت کے لیے توشہ جمع کرنے کا راستہ دکھایا۔ اس عظیم الشان تحریک نے سوتوں کو جگایا اور مردوں میں جان ڈالی۔ مختصر یہ کہ علی گڑھ تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کو زندہ قوموں کی طرح زندگی گزارنے اور سربلند ہو کر جینے کا سلیقہ سکھایا۔''

[پروفیسر نور الحسن نقوی۔ ادیب (سہ ماہی) 1993ء ص 231]

اپنی معلومات کی جانچ :

1. مضمون نگاری کے فروغ کے سلسلے میں ''تہذیب الاخلاق'' کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
2. مغربی علوم کے زیر اثر اردو ادب میں کون کون سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔
3. سرسید کے رفقا کے نام بتلایئے۔

23.6 خلاصہ

اس اکائی کے مطالعے سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ تحریک سے کیا مراد ہے اور سرسید تحریک نے ہندوستانی سماج اور مسلمانوں کی زندگی کے مختلف شعبوں کو کس طرح متاثر کیا اور اردو شعر و ادب پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔

1857ء کی جدوجہد آزادی کے لیے ہندوستان کی تاریخ میں سیاسی' سماجی' تہذیبی اور ادبی نقطہ نظر سے انقلابات رونما ہوئے۔ اسی سال مغل حکمرانوں کا طویل دور اقتدار اختتام کو پہنچا اور اسی سال ہندوستانیوں نے انگریزوں سے ٹکر لینے کی ناکام کوشش کی اور اسی سال انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔

سرسید احمد خان جو اپنے عہد کے ایک مفکر' مدبر اور مصلح تھے انہوں نے 1857ء کے واقعات کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ 1857ء کی جدوجہد آزادی میں ہندوستان کے سبھی طبقوں نے انگریزوں سے مقابلہ کیا تھا تاہم مسلمانوں کا طبقہ سب سے زیادہ معتوب بنا۔ انگریزوں کو اس بات کا احساس تھا کہ انہوں نے مسلمانوں سے اقتدار چھین لیا ہے اور اسی طبقے نے انہیں اقتدار سے ہٹانے کی جی توڑ کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے انتقامی کارروائی کے طور پر مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ اپنا نشانہ بنایا۔ ان کی جاگیریں ضبط کرلیں۔ سرکاری ملازمتوں سے بے دخل کردیا اور متعدد مسلمانوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ سرسید نے مسلمانوں کے کھوئے ہوئے وقار کو واپس لانے کے لیے زندگی بھر جدوجہد کی۔ یہی جدوجہد اور سعی و کاوش علی گڑھ تحریک کہلاتی ہے۔ چونکہ سرسید اس کے محرک اور نمائندے تھے اس لیے اس تحریک کو سرسید تحریک بھی کہا گیا۔

سرسید نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ انہیں جذبہ فکر و عمل سے روشناس کیا۔ اور ان میں پائی جانے والی کوتاہیوں اور برائیوں کی اصلاح کی۔ علی گڑھ تحریک اور سرسید کی کوششیں کسی ایک میدان تک محدود نہیں تھیں بلکہ مذہب' تعلیم' معاشرت اور ادب یعنی مسلمانوں کے جملہ مسائل حیات پر محیط تھیں۔

علی گڑھ تحریک نے اردو ادب کو بھی متاثر کیا۔ زبان و بیان کی صناعی اور آرائش کے مقابلے میں خیال اور مواد کی اہمیت پر زور دیا۔ مغربی ادب سے استفادہ کرنے اور اس کی خوبیوں کو اپنانے اور ہمارے ادب کی خامیوں کو دور کرنے کی تلقین کی۔ جس کے نتیجے میں اردو میں کئی جدید اصناف جیسے ناول' افسانہ' تنقید' انشائیہ' تنقید' سوانح وغیرہ مروج ہوئیں۔

23.7 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. تحریک کی تعریف کرتے ہوئے علی گڑھ تحریک کی خصوصیات کا جائزہ لیجیے۔
2. 1857ء کی جدوجہد آزادی کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایئے کہ مسلمانوں کے کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کرنے کے لیے سرسید نے کیا کیا اقدامات کیے؟

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. 1857ء کے ہنگاموں کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟
2. اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کا کیا اثر پڑا؟

23.8 فرہنگ

الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی
دیرپا	=	دیر تک رہنے والا، مضبوط	اقتدار	=	حکومت، طاقت، بڑائی
صاحبِ بصیرت	=	دانا، عقلمند، بصیرت والا	مصلح	=	اصلاح کرنے والا
بدخواہ	=	برا چاہنے والا	بہرہ مند	=	فائدہ اٹھانے والا
جمود	=	جم جانا، تعطل	یک رنگی	=	یک رخاپن، یکسانیت
تنوع	=	رنگا رنگی	رفاہی	=	رفاہ سے متعلق، فائدے کا کام
عشر عشیر	=	بہت تھوڑا، دسویں حصے کا دسواں حصہ	معتوب	=	جس پر عتاب نازل ہو
قیامت صغریٰ	=	چھوٹی قیامت	فقید المثال	=	بے مثال، غیر معمولی
مختلف النوع	=	مختلف قسم کے، مختلف نوعیت کے	حکمت عملی	=	تدبیر، پالیسی
مثبت	=	جو منفی نہ ہو	عتاب	=	غصہ، غضب، قہر
سکوت	=	جسمیں ہلچل نہ ہو، خاموشی	نیرنگی	=	رنگا رنگی، کئی رنگوں کا مجموعہ
روگراں	=	انحراف	مفسد	=	فساد پھیلانے والا
پس ماندہ	=	پیچھے رہا ہوا۔ غریب			

23.9 سفارش کردہ کتب

1. منظر اعظمی — اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ
2. انور سدید — ادبی تحریکیں
3. اعجاز حسین — تاریخ ادب اردو، مرمہ ایڈیشن
4. محمد علی اثر — مقالات اثر

اکائی : 24 : اردو شاعری عہد اقبال میں

ساخت

24.1 تمہید

24.2 عہد اقبال میں اردو شاعری کے رجحانات

24.2.1 رزمیہ شاعری

24.2.2 غزلیہ شاعری

24.2.3 نظمیہ شاعری

24.2.4 شخصی مرثیہ

24.3 عہد اقبال کے غزل گو شعرا

24.3.1 علامہ اقبال

24.3.2 فصاحت جنگ جلیل مانک پوری

24.3.3 فانی بدایونی

24.3.4 یاس یگانہ چنگیزی

24.3.5 شاد عظیم آبادی

24.3.6 سیماب اکبر آبادی

24.3.7 ریاض خیر آبادی

24.3.8 جگر مراد آبادی

24.3.9 عزیز لکھنوی

24.3.10 اصغر گونڈوی

24.3.11 فراق گورکھپوری

24.3.12 جمیل مظہری

24.4 عہد اقبال کے نظم گو شعرا

24.4.1 علامہ اقبال

24.4.2 اکبر الہ آبادی

24.4.3 برج نرائن چکبست

24.4.4 سرور جہاں آبادی

24.4.5 حفیظ جالندھری

24.4.6 نظم طباطبائی

24.4.7 جوش ملیح آبادی

24.4.8 اسمٰعیل میرٹھی

24.4.9 تلوک چند محروم
24.4.10 عظمت اللہ خان
24.5 خلاصہ
24.6 نمونۂ امتحانی سوالات
24.7 فرہنگ
24.8 سفارش کردہ کتابیں

24.1 تمہید

علامہ اقبال کا عہد اسی لیے اہمیت کا حامل ہے کہ اس دور میں ایسے شاعر اور نثر نگار پیدا ہوئے جنھوں نے ہر صنفِ نثر و نظم کے فروغ میں حصہ لیا۔ شاعری کی بیشتر اصناف کو فروغ حاصل ہوا۔ غزل کی بڑھتی ہوئی شہرت کے دور میں علامہ اقبال نے نظم کی طرف توجہ دی۔ علامہ اقبال بیک وقت کامیاب غزل گو شاعر ہی نہیں بلکہ نظم گو شاعر بھی ہیں۔

اقبال کے دور میں غزل کے مختلف انداز موجود تھے۔ رنگین غزل، غزل مسلسل، روایتی غزل، رومانوی غزل، متصوفانہ غزل اور مسائلی غزل کے ذریعے اردو غزل کا قافلہ رواں دواں تھا۔ اقبال نے جس دور میں غزل گوئی کی طرف توجہ دی۔ اس عہد میں منشی محی الدین فوق، فانی بدایونی، سیماب اکبرآبادی، عزیز لکھنوی، اصغر گونڈوی، فصاحت جنگ جلیل، یاس یگانہ چنگیزی، شاد عظیم آبادی، ریاض خیرآبادی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری اور جمیل مظہری کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ جن کی شاعری میں غزل کے عاشقانہ، صوفیانہ، یاسیت اور روایتی انداز کی نمائندگی ہوتی ہے۔

اقبال نے بذاتِ خود نظم کی شاعری کو فکر و فلسفہ سے وابستہ کر دیا۔ اقبال سے قبل اردو کی نظمیہ شاعری میں مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، قطعات کا چلن عام تھا۔ حالی اور محمد حسین آزاد نے نیچرل شاعری اور اکبر الہ آبادی نے طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی بنیاد رکھی تھی۔ اسی طرح شخصی مرثیہ اور وطنی شاعری کے علاوہ موضوعاتی نظموں کی روایت بھی پروان چڑھ رہی تھی۔ علامہ اقبال کی نظمیہ شاعری میں ان تمام اندازِ شاعری کی جھلکیاں محسوس کی جاسکتی ہیں۔ علامہ اقبال نے مثنوی کے انداز میں ''ساقی نامہ'' اور ''واسوخت'' کے طرز کو بھی اپنی نظموں میں جگہ دی۔ اقبال کے معاصر نظم گو شعرا میں اکبر الہ آبادی، برج نرائن چکبست، نظم طباطبائی، جوش ملیح آبادی، اسمٰعیل میرٹھی، تلوک چند محروم اور حفیظ جالندھری کا شمار ہوتا تھا جنھوں نے نظم نگاری کی جانب توجہ دی لیکن اقبال کا کمال یہی ہے کہ انہوں نے بے شمار موضوعات پر نظمیں لکھتے ہوئے تصورِ عشق، تصور خودی، تصورِ فقر اور تصورِ انسان کامل کے فلسفے کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ اقبال بنیادی طور پر غزل اور پابند نظم کے شاعر ہیں جنھوں نے شاعری میں ہیئت کے تجربوں اور تکنیکی تبدیلیوں کی طرف توجہ نہیں دی وہ خود کہتے ہیں:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

بنیادی طور پر اقبال شاعر ہیں اور انہوں نے اپنی شاعری میں قوم و ملت اور ملک و سماج کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل اور ان کے موزوں حل کے لیے شاعری کو ایک وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔ اقبال اپنے دور کے شاعروں سے خود متاثر بھی ہوئے اور اس دور کے شاعروں کو متاثر بھی کیا۔ اسی لیے اقبال کی شاعری اپنے دور کی عکاس اور دنیا کے ہر قسم کے مسائل کا موزوں حل تلاش کرنے کی متقاضی نظر آتی ہے۔

24.2 عہدِ اقبال میں اردو شاعری کے رجحانات

اقبال کے عہد سے قبل اردو شاعری کو دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کے توسط سے فروغ حاصل ہو چکا تھا۔ جب ان دونوں دبستانوں کی

حیثیت ماند پڑنے لگی تو رامپور، بھوپال اور حیدرآباد کے درباروں نے اردو شاعری کی ترقی اور ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اقبال کے عہد تک دبستانوں کی روایت باقی تھی لیکن دبستان ٹوٹ رہے تھے۔ اقبال کا کمال یہی ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کی اردو شاعری سے بھرپور استفادہ کیا۔ اقبال اپنی شاعری میں ''مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر'' جیسے خیال کو پیش کر کے استفادے کے بے شمار دروازے کھول دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے کلام میں ترجمہ شدہ نظموں کا سلسلہ بھی دکھائی دیتا ہے جب کہ اقبال کے عہد میں انگریزی سے اردو شاعری میں ترجمہ کی روایت کو نادر کاکوری اور سید علی حیدر نظم طباطبائی اور دوسرے شعرا کی جانب سے فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ ان کی شاعری پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ داغ دہلوی سے استفادے کے باوجود علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے چنانچہ ''دبستانِ دہلی'' کے انداز سے استفادے کے ساتھ ساتھ ''دبستان لکھنؤ'' کے طرز و انداز سے وہ پوری طرح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں وطنیت کے تاثرات مولانا حالی، محمد حسین آزاد اور برج نرائن چکبست سے استفادہ کا نتیجہ ہیں تو دوسری جانب علامہ اقبال کی مثنوی پر ''ساقی نامہ'' گلزار نسیم کی لکھنوی روایت کا اثر ہے۔ وہ امیر مینائی کی لکھنوی شعری حسیت ''واسوخت'' کے طرز و انداز کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ واسوخت کے طرز میں اقبال کی نظمیں شکوہ اور جواب شکوہ اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ غرض عہد اقبال میں اردو شاعری اپنی روایات سے استفادہ کر رہی تھی اور اقبال نے اسی روش کو اپنی شاعری میں شامل کیا۔

24.2.1 عہد اقبال میں رزمیہ شاعری

اقبال کے عہد تک عام طور پر مرثیہ کی شاعری کو اردو کی رزمیہ شاعری کا درجہ حاصل تھا۔ بیشتر دہلوی اور لکھنوی شعرا ''کربلائی مرثیے'' لکھ کر رائائی ادب تخلیق کر رہے تھے۔ اس قسم کی شاعری میں رزمیہ کے تمام عناصر شامل نہ تھے۔ دکن میں محمد نصرت نصرتی نے ''علی نامہ'' اور کمال خاں رستمی نے ''خاور نامہ'' لکھ کر رزمیہ شاعری کی بنیاد رکھی تھی اور فارسی میں فردوسی کے ''شاہنامۂ اسلام'' کو رزمیہ شاعری کی حیثیت سے مقبولیت حاصل ہو چکی تھی لیکن اردو کے شعری سرمایے میں ''رزمیہ'' کی کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ مولانا حالی نے ''مسدس حالی'' لکھ کر اردو میں طویل نظم کی بنیاد رکھ دی تھی۔ علامہ اقبال کے ہمعصر شعرا میں ابوالاثر حفیظ جالندھری نے اردو میں ''شاہنامۂ اسلام'' لکھ کر رزمیہ شاعری کی کمی کو پورا کیا۔ اقبال کے عہد میں اردو شاعری نہ صرف موضوعاتی سطح پر فروغ پا رہی تھی بلکہ صنفی اور فنی اعتبار سے بھی اردو شاعری میں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ حفیظ جالندھری نے رزمیہ شاعری کے علاوہ موضوعاتی نظمیں اور گیت بھی لکھے جس کا اثر علامہ اقبال کی شاعری پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں رزمیہ عناصر بھی کارفرما ہیں جو ان کے معاصر شعرا کی خصوصیت ہے۔ بچوں کی نظموں میں اقبال نے اپنے عہد کے اثر کو قبول کرتے ہوئے ''گیت'' کا انداز روا رکھا ہے تاہم اقبال نے حفیظ جالندھری کے گیتوں کے انداز یعنی مختصر بحر میں بند پر مشتمل نظمیں لکھنے کے انداز کو روا نہیں رکھا لیکن رزمیہ شاعری کا رجحان اقبال کے کلام میں ''شاہنامۂ اسلام'' سے استفادے کا نتیجہ ہے۔

24.2.2 عہد اقبال کی غزلیہ شاعری

اقبال نے غزل کی شاعری میں دہلوی اور لکھنو دونوں دبستانوں سے استفادہ کیا ہے۔ بنیادی طور پر وہ داغ دہلوی کے شاگرد تھے لیکن لکھنوی غزل کے اثرات کو بھی قبول کیا۔ اقبال کے عہد میں غزل کی روایت تین مختلف انداز سے فروغ پا رہی تھی۔ پہلا انداز روایتی غزل کو قبول کرنے والے شعرا کا تھا جو حسن و عشق کی واردات کو غزل میں پیش کرنے کے حامی تھے۔ ایسے شعرا میں احمد حسین مائل حیدرآبادی۔ علامہ نجم آفندی، فانی بدایونی، غلام قادر گرامی، صفی لکھنوی اور منشی محمد الدین فوق کا شمار ہوتا ہے۔ غزل کے دوسرے انداز کو روا رکھنے والے شاعر بھی روایتی غزل کے قائل تھے لیکن تصوف، اخلاق اور روحانیت کو غزل میں شامل کرنے کے بھی حامی تھے۔ عہد اقبال کے ایسے شعرا میں اصغر گونڈوی، امجد حیدرآبادی، ظفر علی خاں، حکیم محمد حسین عرشی وغیرہ تھے جنھوں نے غزل کی روایتی تہذیب میں اخلاقیات، روحانیات، مذہبیات اور تصوف کے مسائل کو شامل کرنے پر توجہ دی۔ غزل کے تیسرے انداز کو اختیار کرنے والے شعرا میں جمیل مظہری، عزیز لکھنوی، سیماب اکبرآبادی، فراق گورکھپوری وغیرہ تھے انھوں نے حالات اور مسائل کو غزل کی شاعری میں شامل کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اس طرح اقبال کے عہد میں اردو غزل میر و غالب اور حالی کے مزاج سے بالکل

مختلف ہوگئی۔ علامہ اقبال کی غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ سے استفادے کے ساتھ غزل کے روایتی، نیم روایتی اور جدید رجحانات کو قبول کیا۔ اس لیے ان کی غزلوں میں روایت اور جدید انداز کا حسین امتزاج دکھائی دیتا ہے۔

24.2.3 عہدِ اقبال میں نظمیہ شاعری

اقبال کے دور تک اردو نظم تین مختلف موضوعات سے وابستہ تھی۔ حالی اور آزاد کی وجہ سے نیچرل شاعری کو مقبولیت حاصل ہو چکی تھی جبکہ اکبر الہ آبادی کے توسط سے طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو عروج حاصل ہوا۔ نظم لکھنے کی قدیم روایت برقرار رہی یعنی غزلِ مسلسل، مثلث، مربع، مخمس، مسدس اور مسمط کے انداز کو فروغ دیا گیا۔ موضوعاتی اعتبار سے نظم شہر آشوب، واسوخت، متزاد، ترکیب بند، ترجیع بند، قطعہ بند وغیرہ سے وابستہ تھی۔ اقبال اور ان کے عہد کے شعرا نے اسی ڈگر کو اختیار کرنا شروع کیا۔ اس عہد تک آزاد نظم، معری نظم کے تجربے ہو چکے تھے، لیکن اقبال اور ان کے معاصر شعرا نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ اقبال کے عہد میں نظمیہ شاعری کو عروج حاصل ہو چکا تھا۔ یوروپی زبانوں جیسے انگریزی، جرمنی اور فرانسیسی زبانوں کی نظموں کے اردو ترجمے ہونے لگے۔ اسی طرح مشرقی یعنی ایشیائی زبانوں جیسے عربی، فارسی، ترکی، ہندی اور سنسکرت نظموں کے ترجموں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اردو کی نظمیہ شاعری میں انگریزی اصناف جیسے پیروڈی اور سانیٹ پر توجہ دی جانے لگی تھی۔ اسی طرح ہندی سے گیت اور دوہے بھی اردو میں لکھے جانے لگے لیکن اقبال اور ان کے معاصر نظم نگار شعرا نے روایتی پابند نظم کے طرز کو پسند کیا۔ اقبال کے ہمعصر نظم گو شعرا میں اکبر الہ آبادی، میر غلام بھیک نیرنگ، کشن پرشاد شاد، مولانا ظفر علی خاں، آغا حشر کاشمیری، برج نرائن چکبست، تلوک چند محروم اور حفیظ جالندھری کا شمار ہوتا ہے۔ اقبال کی طرح یہ تمام شعرا پابند نظم کے قائل تھے چنانچہ اقبال کے دور کی تمام تر نظمیہ شاعری کو موضوعاتی اور پابند نظم کی علمبردار پیامی شاعری کا درجہ دیا جائے گا۔ اردو کی پیامی نظمیہ شاعری کا سلسلہ حالی، شبلی اور اکبر الہ آبادی سے ہوتا ہوا علامہ اقبال کے عہد میں داخل ہوتا ہے۔ علامہ اقبال اور ان کے معاصر شعرا کے کلام میں پابند موضوعاتی نظموں کا تسلسل دکھائی دیتا ہے۔

24.2.4 عہد اقبال میں شخصی مرثیہ

عموماً کسی معروف و مشہور شخصیت کی وفات پر اس کی اچھائیوں اور خوبیوں ذکر نیز رنج و غم کے اظہار پر مبنی شاعری کو شخصی مرثیہ کہا جاتا ہے۔ اردو میں کربلائی مرثیے کے بعد شخصی مرثیہ کی روایت عام ہوئی۔ مومن خان مومن اور مرزا غالب کے بعد دہلی میں خواجہ الطاف حسین حالی نے شخصی مرثیے کو عام کیا جبکہ لکھنو میں صفی لکھنوی اور برج نرائن چکبست کے ذریعے شخصی مرثیہ کو فروغ حاصل ہوا۔ علامہ اقبال نے مختلف مذاہب اور سماج سے تعلق رکھنے والی معروف شخصیات کی اموات پر شخصی مرثیے لکھے۔ انہوں نے اپنے عہد میں رحلت کرنے والے اشخاص پر ہی نہیں بلکہ بہت پہلے گذر جانے والے اشخاص کے مرثیے بھی لکھے۔ غالب، رام چندر جی اور گرونانک وغیرہ پر لکھے ہوئے اقبال کے شخصی مرثیے اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح ''والدہ مرحومہ کی یاد'' میں اور لینن پر لکھے ہوئے شخصی مرثیے ان کے دور کی یادگار ہیں۔ اقبال نے ہمہ جہت شخصیتوں کے شخصی مرثیے لکھے۔ انہوں نے غزل مسلسل، نظم، مثنوی اور قصیدے کی ہیئت میں شخصی مرثیے تحریر کیے۔ اقبال کے شخصی مرثیوں میں خراج اور عقیدت کے ساتھ ساتھ ان کے کارناموں کا ذکر نمایاں ہے۔ اس لیے اقبال کے شخصی مرثیوں کی انفرادیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اقبال کے بیشتر معاصر شعرا کے کلام میں بھی شخصی مرثیے کا یہی انداز دکھائی دیتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. اقبال کے چند ہمعصر غزل گو شاعروں کے نام بتائیے۔
2. اقبال کے معاصر نظم گو شاعروں کے نام لکھیے۔
3. اقبال کے شخصی مرثیوں کی خوبیاں بتائیے۔
4. اقبال کے دور کی چند شعری اصناف کا تعارف کروائیے۔

24.3 اقبال کے عہد کے چند غزل گو شعرا

اردو شاعری میں غزل کی روایت کافی قدیم ہے۔ اقبال کے دور میں غزل کے تین مختلف انداز نمایاں تھے جنہیں روایتی غزل، اخلاقی موضوعات سے متعلق غزل اور مسائل سے تعلق رکھنے والی غزل کا درجہ حاصل تھا۔ اقبال کی غزلوں میں ان تینوں انداز کی نمائندگی ملتی ہے۔ اقبال کے عہد میں ان تینوں قسم کے غزل گو شعرا موجود تھے جن کا تعارف پیش ہے۔

24.3.1 علامہ اقبال

عصرِ جدید کے شاعروں میں علامہ اقبال کا شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے بیک وقت غزل اور نظم گوئی دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی۔ غزل گو شاعر کی حیثیت سے علامہ اقبال نے داخلی جذبات کی نمائندگی بھی کی اور خارجی جذبات کو بھی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اقبال کی شاعری کا ابتدائی دور قدیم رنگ کا پاسدار رہا۔ مرزا داغ دہلوی سے استفادے کی وجہ سے ان کی غزل گوئی پر قدیم رنگ تغزل چھایا رہا۔ اقبال کی غزل گوئی کے پہلے دور میں لاہور کے اساتذہ مرزا ارشد گورگانی اور نیر ناظم حسین ناظم کا اثر غالب رہا۔ علامہ اقبال نے مرزا داغ کے بعد ان شعرا سے استفادہ اور مشورۂ سخن کیا تھا۔ اسی لیے اقبال کی غزل گوئی کا پہلا دور روایتی انداز سے وابستہ ہے۔ بانگ درا کے حصہ اول کی غزلیں اسی روش کی نمائندگی کرتی ہیں۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی — مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا — خطا اس میں بندہ کی سرکار کیا تھی

•••

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں — مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی — بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

غزل گوئی کے دوسرے دور میں اقبال نے زبان کی نزاکتوں اور لفظوں کے محل استعمال پر عبور حاصل کیا۔ اس دور میں داغ کے مخصوص رنگِ سخن اور انداز فکر کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ جب دوسرے دور میں اقبال کو غزل گوئی پر عبور حاصل ہوگیا تو انہیں بلندیوں کی تلاش ہوئی اور وہ غیر شعوری طور پر غالب کی طرف مائل ہوئے۔ یہ عمل اقبال کی غزل کے ارتقا کا تیسرا مرحلہ تھا لیکن غالب بھی غزل گوئی میں اقبال کی منزل مقصود نہ بن سکے۔ غالب کا رنگ و آہنگ اقبال کی غزل گوئی میں ملاحظہ ہو

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی — ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی
عذر آفرینِ جرمِ محبت ہے حسن دوست — محشر میں عذر تازہ نہ پیدا کرے کوئی

بانگِ درا کے حصہ دوم اور سوم کی پندرہ غزلوں میں اقبال کا رشتہ داغ اور غالب سے ٹوٹ چکا ہے۔ اقبال کی ابتدائی غزلوں میں مخصوص لب ولہجہ کبھی خطیبانہ اور اکثر اوقات بیانیہ کے انداز میں ابھرتا ہے۔ غزل گوئی کے چوتھے مرحلے میں پہنچ کر اقبال کی غزلیں فکر و فن کے اظہار کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ ''بال جبریل'' کی غزلوں میں انقلابی رجحان نمایاں ہے اور وہ غزل کے سانچے میں رہتے ہوئے نظم کی سرحدوں سے مل جاتی ہیں۔ چوتھے دور میں اقبال جس غزل کو اپناتے ہیں۔ وہ غزلِ مسلسل کا رجحان ہے۔ اس قسم کی غزل کے بانی خود اقبال ہیں اور اس کے خاتم بھی۔ اقبال نے اس نئی غزل کو ہیئت اور زبان کے اعتبار سے منفرد رکھا۔ ان کی مسلسل غزلوں میں نظمیت جھلکنے لگتی ہے اور یہ کوئی عیب بھی نہیں۔

خودی کی خلوتوں میں مصطفائی — خودی کی جلوتوں میں کبریائی
زمیں و آسماں و کرسی و عرش — خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

•••

کوہِ شگاف تیری ضرب، تجھ سے کشادِ شرق و غرب　　تیغِ ہلال کی طرح عیشِ نیام سے گذر

علامہ اقبال نے اپنی غزلوں میں انسانیت کی ہمہ گیری، اعلیٰ تخیل کی پیش کشی کے علاوہ شعری حسیت سے وابستگی کو روا رکھا ہے تاہم ان کی غزل گوئی پہلے دور میں روایت سے وابستگی، دوسرے دور میں بنیادی روایت سے انحراف کرتی اور تیسرے دور میں انقلابی رجحانات کو غالب کے انداز میں پروان چڑھاتی اور چوتھے یعنی آخری دور میں غزل کا انداز نظمیت سے وابستہ کرتی نظر آتی ہے۔ انہوں نے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے رجحانات کے علاوہ فکر اور تصورات سے غزل کو وابستہ کر کے اس صنف کو وسعت بخشی۔ اقبال کی غزل گوئی میں موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے نئی جہت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے روایتی غزل بھی لکھی اور اس سے انحراف کے ذریعہ غالب کی طرح انقلابی غزل بھی لکھی لیکن غزل گو شاعر کی حیثیت سے اقبال نے غزلِ مسلسل کی روایت کو فروغ دے کر غزل کی شاعری کو نظم سے قریب کر دیا۔ اس طرح اقبال کی غزل گوئی انفرادیت سے وابستہ ہے اور ہر دور کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کو اختیار کرتے ہوئے نظمیہ خصوصیات کی علمبرداری ہو جاتی ہے۔

24.3.2　فصاحت جنگ جلیل مانکپوری

جلیل حسن جلیل کی تاریخ پیدائش 1283ھ م 1862ء درج ہے۔ ان کے والد عبدالکریم اور دادا عبدالرحیم دونوں حافظ قرآن تھے۔ گنگا کے کنارے ایک بستی مانکپور آباد ہے۔ جلیل کا تعلق اسی علاقے سے ہونے کی وجہ سے وہ مانکپوری کہلائے۔ ابتدائی تعلیم اور ختم قرآن نیز عربی و فارسی کا درس اپنے گھر پر والد سے لیا۔ لکھنو سے قربت کی وجہ سے مانک پور اس دور میں شعر و ادب کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ چنانچہ طالب علمی کے دور سے ہی جلیل شعر موزوں کرنے لگے۔ 1883ء میں جلیل کے بھائی خلیل نے امیر مینائی سے تلمذ حاصل کیا اور جلیل خط و کتابت کے ذریعے اصلاح لینے لگے۔ شعری صلاحیتوں اور شرافت نفس کی وجہ سے امیر مینائی کے دل میں گھر کر گئے۔ ''امیر اللغات'' کی تیاری کے لیے استاد نے شاگرد کو رام پور بلا لیا۔ دفتر امیر اللغات کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ لغات کا کام مالی مشکلات کی وجہ سے رک گیا تو جلیل نے پہلے کانپور اور پھر بھوپال کا رخ کیا۔ وہاں پذیرائی نہیں ہوئی تو حیدرآباد کا رخ کیا۔ چنانچہ بادشاہ وقت کے استاد مقرر ہوئے اور نواب فصاحت جنگ کے خطاب سے نوازے گئے۔ میر محبوب علی خاں کے انتقال پر 1335ھ میں میر عثمان علی خاں کے استاد مقرر ہوئے۔ یکم صفر 1365ھ م 6 جنوری 1946ء کو رات میں انتقال کیا اور خطۂ صالحین نامپلی میں سپرد خاک ہوئے۔ ان کی یادگار نثری کتابیں ''تذکیر و تانیث''۔ ''معیار اردو'' اور ''اردو کا عروض'' سوانح امیر مینائی اور تاریخ دکن'' ہیں جب کہ شعری مجموعے ''تاجِ سخن، جانِ سخت اور روح سخن'' شائع ہو چکے ہیں۔ جلیل مانکپوری کو غزل میں کمال حاصل ہے۔ انہوں نے شاہ دکن کے قصائد بھی لکھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

اٹھا دیا تو ہے لنگر ہوا کے جھونکوں میں　　کدھر سفینہ ہے ساحل کہاں نہیں معلوم
پھنسا کے دام میں پیری کے بیکس و تنہا　　کدھر گئی میری عمرِ رواں نہیں معلوم
نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں　　وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

...

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے　　جب تم چلو، زمین چلے، آسماں چلے
جب تم ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال　　اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی

ان کی غزلوں میں صوفیانہ رنگ ملاحظہ ہو

سارے جہاں میں جلوہ نما ہے وہ خود مگر　　سارے جہاں سے آپ کو پنہاں کیے ہوئے
میں عکس ہوں آئینہ امکاں میں تمہارا　　تم سا جو نہیں کوئی تو مجھ سا بھی نہیں ہے
کسی میں تاب کہاں تھی کہ دیکھتا اس کو　　اٹھی نقاب تو حیرت نقاب ہو کے رہی

24.3.3 فانی بدایونی

غزل کی شاعری میں یاسیت کو پیش کرنے والے شاعر فانی بدایونی کا پورا نام محمد شوکت علی خاں تھا۔ 13 ستمبر 1879ء کو قصبہ اسلام نگر ضلع بدایون میں پیدا ہوئے۔ نسلاً پٹھان تھے۔ آبائی وطن کابل تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ اصالت خاں بادشاہ شاہ عالم کے دور میں ہندوستان آئے۔ 1857ء کی فتنہ انگیزیوں میں ان کی آبائی جائیداد دوسو مواضعات منسوخ کردی گئی۔ فانی کے والد شجاعت علی خاں ولد غلام نبی خاں رئیس اعظم بدایوں پولیس کے محکمے میں ملازمت کے لیے مجبور ہوئے۔ فانی کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق مکتب میں ہوئی۔ آٹھ نو سال کی عمر میں عربی اور فارسی کی متداولہ کتابیں' پڑھ لیں۔ 1897ء میں انٹرنس کامیاب کیا۔ 1901ء میں بریلی کالج سے بی۔اے اور 1908ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ وزیر آباد ہائی اسکول میں استاد کی حیثیت سے کام کیا۔ جس کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول میں تقرر ہوا۔ بعد میں ڈپٹی انسپکٹر گونڈہ ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد ملازمت کے بعد استعفیٰ دیدیا۔ لکھنؤ' آگرہ' بدایوں اور بریلی میں وکالت کی۔ ان کے تین مجموعے دیوانِ فانی۔ باقیات فانی اور عرفانیات فانی شائع ہوچکے ہیں۔ 1906ء سے 1911 تک شعر گوئی چھوڑ دی۔ غزل کی شاعری میں افسردگی اور حزن کو بیان کرنے میں کمال حاصل تھا۔ حیدرآباد منتقل ہوئے۔ فانی نے اقبال کو ناظم کا درجہ دیا۔ وہ اقبال کے ہمعصر غزل گو شاعر ہیں اور فن برائے فن کے قائل ہیں۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے فانی کی شاعری کے رنگ کو پسند نہیں کیا۔ ان کا انتقال 26 اگست 1941ء کو بمقام حیدرآباد ہوا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن — غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

•••

نا مراد رہنے دے' نامراد جیتے ہیں — ساز بن گیا اک اک نالہ ساز سا ہو کر

•••

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے — دل پہ گھٹا سی چھائی ہے' کھلتی ہے نہ برستی ہے

•••

موت کا انتظار باقی ہے — آپ کا انتظار تھا نہ رہا

24.3.4 یگانہ چنگیزی

مرزا واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی 1884ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرزا پیارے صاحب آبائی جاگیردار ہونے کے باوجود زیادہ خوشحال نہ تھے۔ یگانہ نے پٹنہ کے بڑے علما اور دانشوروں کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔ ابتدا میں یاس اور بعد میں یگانہ تخلص کرنے لگے۔ سید علی خان بیتاب سے اصلاح سخن لی۔ پھر استاد نے شاد عظیم آبادی کے سپرد کردیا۔ 1904ء میں کلکتہ گئے۔ مٹیا برج میں قیام رہا۔ جہاں شہزادہ محمد مقیم بہادر کے صاحبزادوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے عظیم آباد واپس چلے گئے۔ 1906ء میں لکھنؤ پہنچے جہاں ان کی زندگی ہنگامہ آرائیوں اور معرکوں میں بسر ہوئی۔ 1913ء میں شادی ہوئی۔ 1926ء سے 1928ء تک لاہور میں قیام کیا۔ اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر علی گڑھ چلے آئے۔ دربار داری پسند نہ تھی چنانچہ حیدرآباد پہنچے تو 1928ء میں عثمان آباد میں سب رجسٹرار کے عہدے پر فائز رہے۔ 1932ء میں ان کا تبادلہ لاتور ہوا۔ 1942ء میں 55 سال کی عمر میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ وظیفے سے علاحدگی کے سات سال بعد لکھنؤ پہنچے جہاں 4 فروری 1956ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ یگانہ کی نثری اور شعری یادگاریں ''نثر یائیں''۔ ''چراغ سخن'' شہرت کا ڈبہ المعروف بہ خرافاتِ عزیز۔ ''ترانہ'' (مجموعہ رباعیات) ''غالب شکن''۔ ''آیاتِ وجدانی'' اور ''گنجینہ'' بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ یاس یگانہ نے غزل کے موضوعات کے دائرے کو نئی جہت اور وسعت سے آشنا کیا۔ ایسے مضامین باندھے جو پہلی بار اپنی حقیقت پسندانہ کیفیت کے ساتھ غزل کے افق

پر نمودار ہوئے۔ ان کی زندگی تلخ و شیریں تجربات سے گذری۔ انہوں نے کسی مربوط فلسفہ سے وابستگی اختیار نہیں کی لیکن ان کی شاعری میں زندگی کو فلسفیانہ رنگ میں پیش کرنے کی کوشش ضرور ملتی ہے۔ اقبال کے معاصر شعرا کی غزل گوئی میں یگانہ کا انداز جداگانہ ہے۔ ان کے کلام کا انداز ملاحظہ ہو:

موت مانگی تھی ، خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

•••

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ راز پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

•••

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

•••

کارگاہِ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے
اک طرف اجڑتی ہے ایک سمت بستی ہے

•••

انسان کا انسان فرشتہ کا فرشتہ
انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

24.3.5 شاد عظیم آبادی

سید محمد علی شاد کے والد ماجد سید عباس مرزا الہ آباد سے عظیم آباد چلے گئے جہاں 1846ء میں شاد پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم کا سلسلہ چار سال کی عمر میں شروع ہوا۔ تربیت میر سید مرحوم کے سپرد تھی۔ جو اردو زبان کے بہت بڑے محقق تھے۔ سید فرحت حسین سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ نو برس کی عمر میں عربی پڑھنے لگے اور سید عبداللہ شاہ سے علمی استفادہ کیا۔ 1857ء کے ہنگاموں میں شاہ صاحب وطن چلے آئے۔ 1866ء میں شہر کے رئیس سید میر آغا عرف میر سنگی کی لڑکی سے شادی ہوئی۔ اس سے قبل عربی اور فارسی ناظرہ وزیر علی عبرتی اور انگریزی کی تعلیم فریزر سے حاصل کی۔ حکیم شیخ محمد علی سے طب میں قابلیت حاصل کی۔ حکومت نے 1891ء میں خان بہادر کے خطاب سے نوازا۔ 1889ء میں آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ کم عمری میں شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ ان کے استاد فریاد عظیم آبادی تھے۔ شاد عظیم آبادی کا انتقال 18 جنوری 1927ء کو ہوا۔ ان کے کلیات میں غزلیں، رباعیات، مثنویاں اور مراثی موجود ہیں۔ نثر میں بھی درسیات کے علاوہ مکتوبات اور خودنوشت سوانح بھی شائع ہو چکی ہے۔ ''فکر بلیغ'' ان کے کلام کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ ''میخانۂ الہام''۔ ''مثنوی مادر ہند''۔ ''مثنوی مادر وطن'' اور ''ظہور رحمت'' (نعتیں) شائع ہو چکی ہیں۔ شاد عظیم آبادی عمر میں علامہ اقبال سے تقریباً 30 سال بڑے تھے۔ ان کا عہد بلاشبہ اقبال کا عہد ہے۔ غزل گو شاعر کی حیثیت سے شاد نے اقبال کے عہد میں شعر گوئی کی۔ شاد عظیم آبادی کی شعری خصوصیات کو سمجھنے کے لیے کلام کی مثالیں پیش ہیں۔ ان کی غزلوں میں عاشقانہ رنگ اور تصوف کا انداز نمایاں ہے:

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

•••

دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم
میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

•••

سوچتا ہوں کہ جب آئے گی مری یاد تجھے
کون پونچھے گا ڈھلکتا ہوا آنسو تیرا

•••

نالوں کی کشاکش سہہ نہ سکا، خود تار نفس ہی ٹوٹ گیا
اک عمر سے تھی تکلیف جسے، کل رات وہ قیدی چھوٹ گیا

•••

جو مسکرا کے نظر کی تو جی گئے قاتل　　نگاہ پھر جو چرائی تو قتلِ عام کیا

•••

بشر حباب کی صورت ہمیں نظر آیا　　بھری جو قطرے کے اندر ہوا ابھر آیا

24.3.6　　سیماب اکبرآبادی

عاشق حسین سیماب اکبرآبادی 1885ء میں اکبرآباد (آگرہ) محلہ نائی منڈی کوکوگلی املی والے مکان میں پیدا ہوئے۔ سیماب کے والد مولوی محمد حسین صدیقی اجمیر شریف میں ''ٹائمز آف انڈیا'' پریس کی شاخ کے انچارج تھے۔ اسلام کے شیدائی اور متبحر عالم و فاضل تھے۔ سیماب نے ابتدا میں مولانا جمال الدین سرحدی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا قمر الدین اور مولانا عبدالغفور جیسے قابل فارسی و عربی ادب کے اساتذہ سے دینی علوم اور منطق کی تکمیل کی۔ جس کے بعد انگریزی برانچ اسکول میں داخلہ لیا۔ شعر و شاعری کا ذوق ابتدا ہی سے تھا۔ داغ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ ان کا کلام، صوفی نظام المشائخ، سالک، ہمدرد اور صبح بنارس میں شائع ہوتا رہا۔ غزل، نظم اور منظوم ترجمہ میں سیماب کو کمال حاصل تھا۔ سیماب بلاشبہ اقبال کے ہم عصر تھے۔ اقبال اور سیماب کے خطوط نہیں ملتے اور دونوں کی ملاقات کا ثبوت نہیں ملتا لیکن سیماب کو اقبال سے بے انتہا محبت تھی۔ اقبال کا ''شکوہ'' اور سیماب کی ''فریاد'' نظمیں ایک ساتھ شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے اقبال کے کلام کو ہدف بھی بنایا ہے۔ اقبال کے انتقال پر انہوں نے قطعات بھی لکھے اور نوادرات سیماب میں ایک نظم ''نذر اقبال'' ملتی ہے۔ سیماب کو غزل کے شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے اگرچہ انہوں نے نظمیں بھی لکھیں۔ ماہنامہ ''شاعر'' کے مدیر اور 1922ء میں ''قصر الادب'' انجمن کے بانی رہے۔ کلیم عجم، سدرۃ المنتہیٰ اور لوح محفوظ ان کی غزلیہ شاعری کے مجموعے ہیں۔

کہانی ہے تو اتنی ہے فریبِ خواب ہستی کی　　کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

•••

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر　　ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

•••

بدل گئیں وہ نگاہیں یہ حادثہ تھا اخیر　　پھر اس کے بعد کوئی انقلاب ہو نہ سکا

24.3.7　　ریاض خیرآبادی

لکھنو کے شمال میں سیتاپور سے کچھ فاصلے پر خیرآباد واقع ہے۔ سید ریاض احمد ضلع سیتاپور میں 1853ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب سید شاہ کرمانی کے ذریعہ امام حسین تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد سید طفیل احمد فارسی اور عربی کے عالم تھے۔ وہ پولس انسپکٹر تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں ریاض کو مولوی حافظ بنی بخش کے مدرسہ عربیہ میں داخل کیا گیا۔ ریاض خیرآبادی کو اچھا شاعر بنانے میں ایک خدارسیدہ درویش کی دعا کو بھی دخل ہے۔ مدرسہ عربیہ کو خیرباد کہہ کر مکتب کی چار دیواری کے باہر انہوں نے اپنے ذوق و شوق کی تکمیل کی۔ ریاض کی ادبی زندگی کا آغاز خیرآباد سے ہوا اور یہیں سے انہوں نے ''ریاض الاخبار'' جاری کیا۔ 1872ء میں ''لمعِ رخشاں'' کے نام سے ریاض نے پریس قائم کیا۔ ریاض کو صحافت سے دلچسپی تھی۔ اس اخبار کے سات سال بعد ''گل کدۂ ریاض'' منظر عام پر آیا۔ انہوں نے رشید کی شاگردی اختیار کی۔ والد کی پولس میں ملازمت کی وجہ سے تبادلے ہوتے رہے۔ جب ان کا تبادلہ گورکھپور ہوا تو وہ خاندان کے ساتھ گورکھپور چلے آئے۔ جہاں انہوں نے عشق کے کئی معرکے سر کیے۔ گورکھپور میں ریاض کو عوام و خواص میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ ریاض نے خاندان سے باہر دو شادیاں کیں۔ جن میں ایک رفیقہ حیات طوائف تھیں۔ 1907ء میں گورکھ پور کی سکونت ترک کر کے ریاض لکھنو آئے۔ ''ریاض الاخبار'' بھی لکھنو منتقل ہوا۔ 1910ء کے بعد وہ خیرآباد لوٹ گئے۔ دو دن کی بیماری میں 1934ء میں ریاض نے اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ اردو میں خمریات کے سب سے بڑے شاعر کی حیثیت سے ریاض کو منفرد مقام حاصل

ہے۔ ان کے اشعار میں عشقیہ تجربات' محبت کی کسک اور واردات عشق کی ترجمانی موجود ہے۔ ریاض ایک مترجم اور ناول نگار بھی تھے۔ ان کا دیوان ''ریاض رضواں'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ انگریزی ناولوں کے ترجمے حرم سرا' نظارہ' ناشاد اور تصویر شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی صحافتی صلاحیتوں کا اندازہ ریاض الاخبار' روزانہ برقی' ماہنامہ گل کدہ ریاض' گل چیں' فتنہ اور عطر فتنہ سے طنز و مزاح کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ خمریات میں انہیں کمال حاصل ہے۔ چند اشعار پیش ہیں:

آئے ہمارے آگے وہ ساغر شراب کا ساقی نے جس میں رنگ بھرا ہو شباب کا

•••

پی پی کے اس نے سجدے کیے ہیں تمام رات اللہ رے شغل ' زاہدِ شب زندہ دار کا

•••

یہ محشر ہے یہاں اب ہوش میں دیوانہ آتا ہے خداوندا مرے لب پر مرا افسانہ آتا ہے

•••

پاک و صاف ایسی کہ جس نے پی فرشتہ بن گیا زاہدو! یہ حور کے دامن کی ہے چھانی ہوئی

24.3.8 جگر مرادآبادی

غزل کی شاعری کو آب و تاب اور رنگینی و دلفریبی عطا کرنے میں جگر مرادآبادی ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے غزل کو نہ صرف سجایا سنورا بلکہ اسے حیاتِ نو بھی عطا کی۔ اقبال اور ان کے معاصر شعرا کی وجہ سے جب نظم گوئی کو اعتبار کا درجہ حاصل ہوگیا تو غزل کی ساکھ ماند پڑنے لگی۔ ایسے وقت جگر مرادآبادی نے غزل کے مضامین اور موضوعات کو شہرتِ دوام سے ہم کنار کیا۔ جگر کا گھرانہ مولویوں کا گھرانہ تھا۔ فرخ سیر کی وفات کے بعد یہ خاندان دہلی سے ہجرت کر کے مرادآباد میں آباد ہوگیا۔ جگر کا مولد یہی مرادآباد ہے۔ جہاں 1890ء میں ان کی پیدائش ہوئی۔ جگر کی تعلیم کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ انہوں نے لکھنؤ کے مشہور پبلک اسکول اور اسٹینلی اسکول میں تعلیم پائی۔ نویں جماعت میں دو مرتبہ ناکام ہونے سے تعلیم سے دل اچاٹ ہوگیا۔ محمد صدیق کی رہنمائی میں عربی اور فارسی میں استعداد پیدا کی۔ محمد عاقل چشمہ بنانے کے کارخانے کے مالک تھے۔ جگر ان کے یہاں ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ جگر کی پہلی رفیقۂ حیات وحیدن بیگم کا آگرہ سے تعلق تھا۔ ان سے علاحدگی کے بعد نسیم سے عقد ہوا۔ مئے نوشی میں غرق رہتے تھے۔ مئے سے توبہ بھی کی۔ 9 ستمبر 1959ء کی ابتدائی ساعتوں میں انتقال ہوا اور محمد علی پارک میں سپرد خاک ہوئے۔ 1953ء میں حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ نمونہ کلام پیش کیا۔

سب کو مارا جگر کے شعروں نے اور جگر کو شراب نے مارا

•••

حُسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے اہلِ دل کے لیے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

•••

دل کو سکون روح کو آرام آگیا موت آگئی کہ یار کا پیغام آگیا

•••

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ میں اپنا جام اٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

•••

وہ نوائے دلبری ہو' کہ ادائے عاشقانہ جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتحِ زمانہ

•••

ان کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

جگر کے شعری مجموعے ''داخ جگر'' شعلۂ طور اور ''آتش گل'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ دور اول کے نمونے ''داغ جگر'' میں موجود ہیں۔ دور ثانی کی ابتدا حضرت شاہ صاحب قبلہ اور حضرت اصغر مرحوم کی محبت سے شروع ہوتی ہے۔ ابتدا میں حضرت داغ اور بعد میں منشی امیر اللہ تسلیم سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ جگر حد درجہ ملنسار' منکسر المزاج اور مذہبی معتقدات میں راسخ العقیدہ تھے' ان کی تمام تر غزل گوئی بانکپن' شوخی اور سرمستی سے وابستہ ہے۔ ان کے بلند خیالات اور سادہ الفاظ جہاں غزل کے حسن میں اضافہ کر دیتے ہیں وہیں ان کے کلام پڑھنے کا انداز بھی دل آویز تھا۔ اقبال کے معاصر شعرا میں انہوں نے غزل کی ترقی میں اپنا اہم کردار نبھایا۔ ان کی غزلیں تاثیر کے حسین مرقعے پیش کرتی ہیں۔

24.3.9 عزیز لکھنوی

سید مسعود حسن ردولوی نے عزیز لکھنوی کی تاریخ ولادت 14 فروری 1883ء تحریر کی ہے۔ نو سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان نامساعد حالات میں بھی تعلیم جاری رکھی۔ عربی کی ابتدائی کتابیں محمد حسین سے پڑھیں۔ 1890ء میں مدرسہ مشارع الشرائع میں داخلہ لیا۔ 1894ء میں ''مولوی'' کا امتحان پاس کیا۔ تعلیم ترک کر کے لطف حسین اور سید ابوالحسین سے صرف ونحو' فقہ اور اصول کا درس لیا۔ معقولات کے لیے عبدالمجید فرنگی محلی اور محمد نعیم فرنگی محلی سے استفادہ کر کے تصوف میں درک حاصل کیا۔ وہ اپنے عہد کے ممتاز عالم دین تھے۔ انگریزوں کو فارسی پڑھاتے تھے۔ امین آباد ہائی اسکول میں اردو اور فارسی کے معلم مقرر ہوئے۔ راجہ محمود آباد کی یاد فرمائی پر ملازمت ترک کر کے ان کے صاحبزادوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ لکھنو یونیورسٹی میں ''شعبہ علوم شرقیہ'' کے ممتحن کے فرائض انجام دیے۔ 29 جولائی 1935ء کو انتقال کیا۔

عزیز اپنے عہد کے سربرآوردہ شاعر اور استاد سخن تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے دو مجموعے ''گل کدہ'' اور ''انجم کدہ'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ عزیز لکھنوی نے غزل گوئی میں کمال حاصل کیا۔ ان کی شاعری میں عاشقانہ اور عارفانہ تصورات ملتے ہیں۔ عزیز لکھنوی کی شاعری کی علامہ اقبال نے بڑی ستائش کی۔ عزیز کے کلام میں تجربات حیات کے متنوع احساسات اور آگہی و بصیرت کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہے۔ چند اشعار پیش ہیں۔

ہجر کی رات یاد آتی ہے پھر وہی بات یاد آتی ہے

•••

ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی اب تو دن رات یاد آتی ہے

•••

مئے سے توبہ تو کی عزیز مگر اکثر اوقات یاد آتی ہے

•••

واعظوں کی یہ حکومت یہ گھٹاؤں کا ہجوم اب کے دیوانہ بنا دے گی یہ برسات مجھے

•••

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

عزیز نے نظمیں بھی لکھیں ''نالۂ جرس'' ان کی منظومات کا مجموعہ ہے۔ نظمیں' رباعیات اور نثری تحریروں کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔

24.3.10 اصغر گونڈوی

سید اصغر حسین اصغر گونڈوی کو جدید غزل کے عناصر اربعہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ مارچ 1884ء میں منشی تفضل حسین کے گھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گونڈہ میں حاصل کی۔ 1898ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول گونڈہ میں داخل ہوئے۔ انٹرنس تک تعلیم جاری رکھی۔ انگریزی ادب کا مطالعہ

جاری رہا۔ ریلوے کے محکمہ میں ٹائم کیپر کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا۔ 1913ء میں قاضی عبدالغنی منگلوری سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ تصوف ان کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ 1916ء سے جگر مرادآبادی سے ملاقاتیں ہوئیں۔ جگر ان کے گرویدہ ہوگئے۔ اصغر غزل میں تصوف کو شامل کرنے والے شاعر ہیں۔ دو شعری مجموعے ''نشاطِ روح'' اور ''سرورِ زندگی'' شائع ہو چکے ہیں۔ علامہ اقبال نے خانگی چٹھیوں میں اصغر کے کلام کو سراہا ہے۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ 1936ء میں انتقال ہوا۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے — پردے میں مصور ہی تنہا نظر آتا ہے

•••

لو شمعِ حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے — فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

•••

لالہ و گل تم نہیں ' ماہ و انجم تم نہیں — رنگِ محفل بن کے لیکن کون اس محفل میں ہے

24.3.11 فراق گورکھپوری

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کی پیدائش 28 اگست 1896ء کو گورکھپور میں ہوئی۔ ان کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت کا شمار گورکھپور کے ممتاز وکیلوں میں ہوتا تھا۔ ان کے والد بھی اردو اور فارسی کے عالم تھے۔ مثنوی ''حسن فطرت'' ان کی یادگار ہے۔ فراق کا تعلق معزز کائستھ گھرانے سے تھا۔ فراق کی ابتدائی تعلیم و تربیت بھی اردو فارسی سے شروع ہوئی۔ انہیں نو سال کی عمر میں ماڈل اسکول گورکھپور میں داخل کیا گیا۔ 1915ء میں ایف اے پھر الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے اور آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔اے درجہ اول میں پاس کیا۔ ابتدائی عمر سے شاعری کا ذوق تھا۔ غزل، نظم اور رباعی میں طبع آزمائی کی۔ ان کے شعری مجموعے گل نغمہ، روپ، دھرتی کی کروٹ، گلبانگ، شبنستان، گل نغمہ وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ فراق نے ابتدائی دور میں امیر مینائی کے شاگرد وسیم خیرآبادی سے اصلاح لی۔ طویل غزلیں لکھنے میں فراق کا کوئی ہمسر نہیں۔ فراق تاثراتی انداز سے اقبال کے کلام سے متاثر ہیں۔ انہوں نے اقبال کے بے شمار اشعار کی مدح سرائی کی ہے بعض معاملات میں علامہ اقبال سے اختلاف بھی کیا ہے۔ انہوں نے اقبال کے اسلامی ادب کو مسلم عوام کی بیداری کا روشن ترین ادب نہیں قرار دیا۔ غزل کے مشہور شاعر ہونے کے علاوہ نظم اور رباعی کے اہم شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا انتقال 3 مارچ 1983ء کو دہلی میں ہوا۔ 1961ء میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، 1965ء میں سوویٹ روس سے نہرو ایوارڈ اور 1999ء میں ملک کا گیان پیٹھ ایوارڈ عطا ہوا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

اس دور میں زندگی بشر کی — بیمار کی رات ہوگئی ہے
مٹنے لگیں زندگی کی قدریں — جب غم سے نجات ہوگئی ہے
دنیا ہے یہ کتنی بے ٹھکانہ — عاشق کی برات ہوگئی ہے

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں — لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں
ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں — اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست — آہ! اب مجھ سے تجھے رنجشِ بیجا بھی نہیں

•••

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں — تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

•••

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست — ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

24.3.12 جمیل مظہری

جمیل مظہری کا اصلی نام سید کاظم علی اور تخلص جمیل تھا۔ ان کے بزرگوں میں مظہر حسین معروف گذرے ہیں۔ ان ہی کی نسبت سے مظہری کو جمیل نے اپنے نام کا جزو بنایا۔ ان کے والد خورشید حسین درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ تھے۔ اپنے نانا کے گھر عظیم آباد کے محلے مغل پورہ میں 1905ء کو جمیل مظہری پیدا ہوئے۔ جب والد کا تبادلہ موتہاری ہوا تو جمیل مظہری یہاں کے ضلع اسکول میں داخل ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کی منزلیں مظفر پور میں طے کیں۔ 1922ء میں میٹرک اور 1925ء میں بی۔اے درجہ اول میں پاس کرنے کے بعد کلکتہ یونیورسٹی میں فارسی سے ایم اے کرنے میں مصروف ہوگئے۔ روزنامہ ''عصر جدید'' میں مضامین لکھنے سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ باضابطہ صحافتی زندگی کا آغاز ''الہند'' کی ادارت سنبھالنے سے ہوا۔ جو مارچ 1932ء میں جاری ہوا۔ سیاسی اعتبار سے جمیل مظہری کانگریسی تھے۔ کانگریس کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ فلم پبلسٹی کے ڈپٹی ڈائرکٹر اور پھر پٹنہ کالج میں اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ پٹنہ یونیورسٹی میں 1950ء سے 1960ء کا عہد گزارا۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ریسرچ پروفیسر رہے۔ 23 جولائی 1980ء کو رحلت فرمائی۔ ان کا ادبی سرمایہ ''آثار جمیل''۔ ''آب و سراب''۔ ''جہنم سے''۔ ''وجدانِ جمیل''۔ ''عرفانِ جمیل''۔ ''فکرِ جمیل'' اور ''نقش جمیل'' کے عنوانات سے شائع ہو چکا ہے۔ وہ ایک اچھے غزل گو شاعر تھے۔ انہوں نے اقبال کے شکوہ کے رنگ میں مسدس ''فریاد'' لکھا۔ جس سے ان کی اقبال سے عقیدت ظاہر ہوتی ہے۔ غزل کے علاوہ نظمیں بھی لکھیں۔ غزل گو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ نمونہ کلام پیش ہے :

جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر
یہ کیا کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی

...

بہتے پانی کا کیا ٹھکانا ہے
آؤ دامن بھگو لیا جائے

...

بہار آئے نہ آئے مگر لہو نے مرے
چمن کے خواب کو اک اعتبار دے تو دیا

انہوں نے قصیدے، مرثیے، غزلیں، نظمیں اور رباعیات لکھ کر اردو شاعری کے ذخیرے کو مالا مال کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. یاس یگانہ چنگیزی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
2. شاد عظیم آبادی کے مجموعہ کلام کا نام بتایئے۔
3. جگر مرادآبادی کی غزل گوئی پر اظہار خیال کیجیے۔
4. فانی بدایونی کے کتنے شعری مجموعے شائع ہوئے؟
5. ''فصاحت جنگ'' کس شاعر کا خطاب ہے؟

24.4 عہد اقبال کے چند نظم گو شعرا

اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے نظم کو اس قدر شہرت دی کہ ثقہ قسم کے غزل گو شعرا بھی نظم نگاری کی جانب متوجہ ہوئے۔ اقبال کی شاعری میں فکر و فلسفہ سے متعلق نظمیں ہی نہیں بلکہ موضوعاتی نظموں کے ساتھ شخصی مرثیے بھی شامل ہیں۔ مناظر فطرت پر بھی اقبال کی نظمیں اپنے فن کا جادو جگاتی ہیں۔ اقبال کی نظمیہ شاعری کے اثرات اس دور کے شاعروں پر مرتسم ہوئے۔ اقبال کے عہد کے نظم گو شاعروں کا تعارف پیش ہے۔

24.4.1 علامہ اقبال

علامہ اقبال نے روایتی نظم سے بہت کچھ اکتساب کیا ہے۔ ان کی نظم گوئی میں جہاں فکر و فلسفہ، دل جوئی اور دانائی کے علاوہ جدید افکار کی

فراوانی دکھائی دیتی ہے وہیں اقبال کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ انہوں نے نظم کو سیاسی' سماجی' معاشی اور معاشرتی افکار کے لیے بیان کا سلیقہ دے دیا۔ ایک عام نظم گو شاعر کی حیثیت سے اقبال نے اپنی نظموں کو تعارفی' خیر مقدمی اور احتجاجی آہنگ ہی نہیں بخشا بلکہ حریت پسندی سے بھی وابستہ کیا انہوں نے اپنی نظموں کو ہمہ جہت موضوعات سے ہمکنار کر دیا۔ ان کی نظموں میں حمد' نعت' منقبت' شخصی مرثیہ' قومی و وطنی تصورات اور دورِ حاضر کی دانائی کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ اقبال کی نوعمری میں شائع ہونے والی نظم ''ہمالہ'' ہے جو 1901ء میں شائع ہوئی۔ اسے اقبال کی پہلی نظم کا درجہ حاصل ہے۔ اگر اقبال کی نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو ابتدائی دور میں اقبال فطری اور نیچرل شاعری سے متاثر نظر آتے ہیں۔ مناظر فطرت سے دلچسپی اور منظر نگاری ان کی نظموں کی خوبی ہے۔ اس دور کی اہم نظموں میں گل رنگیں' ابر کوہسار' آفتاب صبح' چاند' جگنو' شمع' ماہِ نو' انسان' بزمِ قدرت' ایک آرزو' موجِ دریا' ابر' کنارۂ راوی اہم نظمیں سمجھی جاتی ہیں۔ اقبال کی شاعرانہ مصوری کو ظاہر کرنے والی نظم ''ایک آرزو'' ہے۔ بانگ درا کے حصہ دوم میں موجود نظمیں فطرت کے حسن و جمال کی بہترین عکاس ہیں۔ تحریری تصورات کو جیتی جاگتی شکل میں پیش کرنے کا وصف اقبال کو خوب آتا ہے چنانچہ وہ غیر مرئی اشیا کی تجسیم کر کے خوبصورت پیکر بناتے ہیں۔ وہ بے جان اشیا کو اس طرح محسوس کرتے ہیں جیسے وہ ذی روح ہوں۔ حسنِ قدرت کے مظاہر میں وہ زبان سے زیادہ معنویت کو تلاش کرتے ہیں۔ ان کی فلسفیانہ نظموں میں بھی بہترین منظر نگاری موجود ہے۔ ''گورستان شاہی'' اور ''خضرِ راہ'' سے منظر نگاری کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مناظرِ قدرت کی نقاشی میں اقبال کو کمال حاصل ہے اور جب وہ نظم کے دوران فلسفہ کو شامل کرتے ہیں تو فلسفہ کی روح کو نظم میں اس طرح پیوست کر دیتے ہیں کہ نظم کا پیکر مجروح نہیں ہوتا بلکہ وہ احساسات کی تجسیم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ خودی' عشق' فقر اور مردِ مومن کی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے اقبال نے اپنی شاعری کو وسیلہ کے طور پر استعمال کیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال اپنے کلام کے ذریعے انسان کی انفرادی اور اجتماعی قوت عمل کو ابھارنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ زبان کی تمام تر خوبیاں جیسے تشبیہات' استعارات' صنائع و بدائع' موزوں قافیہ' ردیف' رمزیت' رومانویت اور علامتی اظہار موجود ہے۔ وہ جذبات و تخیل کے ساتھ امید آفرینی اور آزادی پر زور دیتے ہیں۔ اقبال کی وطنیہ اور قومی نظموں میں بھی ان کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔ انہوں نے مغربی شعرا سے متاثر ہو کر ان کی بہترین نظموں کے ترجمے بھی کیے۔ ان کی نظموں میں اخلاقی برتری کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ''گل پژمردہ''۔ ''زہد اور رندی''۔ ''طفل شیر خوار''۔ ''گورستانِ شاہی''۔ ''شبنم اور ستارے'' کے مطالعے سے اخلاقِ حسنہ پیدا کرنے کی تلقین ملتی ہے۔ مسجد قرطبہ' ساقی نامہ' ذوق و شوق' روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے اور ابلیس کی مجلس شوریٰ جیسے نظموں سے ان کے فکر و فلسفہ کی نمائندگی ہوتی ہے۔ مشاہیر اسلام کے تذکرے ان کی نظموں ''بلال''۔ ''صقلیہ''۔ ''غلام قادر روہیلہ''۔ ''حضور رسالت مآبؐ میں'' ''فاطمہ بنت عبداللہ۔ ''صدیق اکبر'' اور ''بلاد اسلامیہ'' میں دکھائی دیتے ہیں اور ان کی والہانہ وابستگی بھی ان نظموں میں نمایاں ہے۔ ترانۂ ہندی' ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اور نیا شوالہ جیسی نظمیں اقبال کی قومی اور وطنیہ شاعری کی دلیل بن جاتی ہے۔ ملت پروری' انسان دوستی اور ہمدردی ان کی نظموں میں خصوصی اوصاف کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسلام کی تاریخ اور مسلمانوں کے عروج و زوال پر بھی ان کی نظر ہے۔ اقبال نے ایک شاعر کی حیثیت سے نظم گوئی نہیں کی بلکہ ایک حکیم اور مصلح کی حیثیت سے شاعری کو اوصاف کی پرورش کے لیے استعمال کیا۔ علامہ اقبال کی نظموں میں روایتی اصناف کا پرتو اور فکر کی تازگی کا احساس موجود ہے۔ وہ مشرق اور مغرب کے فرق کو ختم کرنے کے لیے ایشیا اور یوروپ کے صالح اوصاف اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اقبال کی نظموں میں اسلامی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں کے دوران فن اور تکنیک سے سرمو انحراف نہیں کیا تاہم تازہ یوروپی افکار اور جدید تحقیقات کی روشنی کو نظموں کے ذریعے عام کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اسی بنیاد پر اقبال کو اسلامی افکار کے نظم نگار اور شاعری میں پہلی مرتبہ فکر و فلسفہ کو شامل کرنے والے ایسے جدت طراز شاعر کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے کہ جن کی مثال ساری اردو شاعری میں ملنی مشکل ہے۔ اقبال نے نظم کی روایت کی ایسی مثال چھوڑی ہے کہ جس کا کوئی ثانی نہیں اور اس قسم کی شاعری کی نقل کرنا بھی دشوار ہے۔

24.4.2 اکبر الہ آبادی

اردو میں طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے بانی اور اپنے کلام سے ''اودھ پنچ'' کی محفل سجانے والے اکبر حسین اکبر الہ آبادی 19 نومبر 1846ء کو

الہ آباد سے تقریباً بارہ میل دور ایک بستی میں بارا پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد سید تفضل حسین بڑے عالم اور صوفیانہ مزاج کے انسان تھے۔ انگریز عملداری میں تحصیلدار کے عہدے پر مامور تھے۔ اکبر نے فارسی اور عربی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی 1856ء میں جمنا مشن اسکول الہ آباد میں داخلہ لیا۔ تیرہ برس کی عمر میں اسکول کو خیر باد کہہ دیا۔ انگریزی، فلسفہ اور تصوف کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا۔ اکبر نے ابتدا میں معمولی ملازمتیں کیں۔ بعد میں وکالت کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار کے عہدے پر فائز ہوئے اور داروغہ آبکاری ہوگئے۔ 1870ء میں ہائی کورٹ کے چیف جج کے مثل خواں مقرر ہوئے۔ 1873ء میں وکالت کا اعلیٰ امتحان کامیاب کر کے 1880ء تک وکالت کی۔ 1880ء میں قائم مقام منصف مقرر ہوئے۔ 1884ء میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج ہوئے۔ 1903ء میں انہیں ہائی کورٹ کی ججی پیش کی گئی مگر آنکھوں کی تکلیف کے سبب اسے قبول نہ کر سکے اور ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ 9 ستمبر 1921ء کو اس جہانِ فانی سے رحلت کی۔ شاعری کا سلسلہ سترہ برس سے شروع ہوا۔ ان کی شاعری میں پند و موعظت، اخلاق، درویشی اور متصوفانہ خیالات کی کثرت ہے۔ انہوں نے شاعری کو طنز و ظرافت سے وابستہ کیا۔ غزل مسلسل اور نظم نگاری ان کا شعری مزاج رہا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

جب دین نہ ہو اصلاحِ بشر دنیا میں پھر آخر کون کرے
غفلت کے سوا اس محفل میں مہمان کی خاطر کون کرے

اک علم تو ہے بت بننے کا، اک علم ہے حق پر مٹنے کا
اُس علم کو سب دیتے ہیں سند، اس علم میں ماہر کون کرے

مذہب کی ہے دھوم اور ساتھ اس کے اعمال نہیں اخلاق نہیں
چپ چپ کی صدا ہے چار طرف، اس راز کو ظاہر کون کرے

جب علم ہی عاشق دنیا ہو، پھر کون بتائے راہِ خدا
جب خضر اقامت پر ہو فدا، تائیدِ مسافر کون کرے

اقبال کے کئی خطوط اکبر الہ آبادی کے نام موجود ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے خواجہ حسن نظامی کی جانب سے اقبال کی مخالفت پر ایسے قطعات لکھے جس میں اقبال کی حمایت تھی۔ اقبال کی شاعری پر اکبر الہ آبادی کے رنگ کی چھاپ بھی دکھائی دیتی ہے۔

24.4.3 برج نرائن چکبست

برج نرائن چکبست 19 جنوری 1882ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا مقام پیدائش محلہ راٹھ جوبلی (فیض آباد) ہے۔ ان کے والد پنڈت اودت نارائن بھی شاعر تھے اور یقین تخلص کرتے تھے۔ چکبست کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اردو اور فارسی کی تعلیم ایک مولوی صاحب سے حاصل کی۔ چکبست کے والد بہت جلد انتقال کر گئے۔ 1895ء میں کاظمین مڈل اسکول لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ آٹھویں درجہ پاس کرنے کے بعد 1898ء میں جبلی ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ 1903ء میں کیننگ کالج میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔ الہ آباد یونیورسٹی سے 1907ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ اور تربیت حاصل کرنے کے بعد باضابطہ وکالت شروع کی۔ ان کا انتقال فالج کے حملے سے رائے بریلی اسٹیشن پر 12 فروری 1926ء کو ہوا۔ چھوٹی عمر میں شاعری شروع کی۔ ابتدا میں اسیر لکھنوی کے چھوٹے صاحبزادے افضل لکھنوی سے اصلاح لی۔ اردو میں وطنیہ شاعری کے اہم ستون کا درجہ رکھتے ہیں۔ اپنی نظم نگاری کے ذریعہ اردو دنیا کو متاثر کیا۔ انہوں نے اقبال پر مضامین اور فارسی مثنوی ''رموز بے خودی'' پر تبصرہ شائع کیا جس سے ان کی اقبال سے وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا مجموعہ کلام ''صبحِ وطن'' 1918ء میں شائع ہوا۔ ان کی مشہور نظموں میں ''رامائن کا ایک سین'' اور

''خاکِ ہند'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔نظم ''خاکِ ہند'' کے چند بند پیش ہیں :

اے خاکِ ہند تیری عظمت پہ کیا گماں ہے　　دریائے فیضِ قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے　　اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عزوشاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری　　چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ تھا جب وحشت کا دور طاری　　چشم و چراغِ عالم تھی سر زمیں ہماری

شمعِ ادب نہ تھی جب' یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

24.4.4　سرور جہاں آبادی

درگا سہائے سرور جہاں آبادی ایک ممتاز سکسینہ کائستھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے والد پیارے لال طبیب تھے اور خاندانی پیشہ زمینداری تھی۔ دلی سے قریب جہاں آباد میں درگا سہائے دسمبر 1872ء کو پیدا ہوئے۔بچپن میں گھر پر فارسی' اردو اور سنسکرت کی تعلیم حاصل کی۔ درسیات کی تکمیل کے لیے اردو مڈل اسکول میں داخل کیا گیا۔ 1890ء میں اردو مڈل کا امتحان امتیاز سے کامیاب کیا۔اسی زمانے میں سرور کی شادی کردی گئی۔ 1897ء میں فرزند تولد ہونے کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کی اور انگریزی مڈل پاس کیا۔ 1897ء میں اخبار ''انیس ہند میرٹھ'' اور ''مطبع''۔''ودیادرپن'' کے ایڈیٹر اور اسسٹنٹ مینجر بنائے گئے۔راجہ صاحب نہوڑ کے بچوں کی تعلیم وتربیت کی۔دسمبر 1899ء میں رفیقہ حیات کا انتقال ہوا۔ یہ صدمہ جانکاہ ثابت ہوا۔ 1907ء میں سرور ''زمانہ'' کانپور سے وابستہ ہوئے۔ بیٹے کی موت کا صدمہ رہا۔اہلیہ کی وفات کے بعد نشہ میں مست رہنے لگے۔ 3 دسمبر 1910ء کی صبح رحلت کی۔سرور نے نثر ونظم کی خدمت کی۔جام سرور' خم خانۂ سرور اور خمکدۂ سرور شعری مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔نظم نگاری میں فطری مناظر کی پیش کشی میں کمال رکھتے ہیں۔علامہ اقبال کے معاصر رہے ہیں۔بچپن کی یاد۔لالۂ صحرا۔ بیر بہوٹی۔ فضائے برشگال سرور کی بہترین نظموں کا درجہ رکھتی ہیں۔نظم ''بیر بہوٹی'' کا بند ملاحظہ ہو :

کچھ عجلب عالم ہے تیرے حسن کے انداز کا　　سرخ ڈورا ہے کسی چشم فسوں پرداز کا
قطرہ مضطر ہے خونِ کشتگانِ ناز کا　　قلب خوں گشتہ ہے مژگاں پر کسی جانباز کا

یا شفق کا کوئی ٹکڑا ہے زمیں پر جلوہ گر
جامِ زریں میں ہے یا صہبائے احمر جلوہ گر

24.4.5　حفیظ جالندھری

شاہنامہ اسلام کے خالق محمد حفیظ (حفیظ جالندھری) 14 جنوری 1900ء کو صوبہ پنجاب کے ایک نہایت قدیم شہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حافظ شمس الدین تھا۔سات برس کی عمر میں نظم کہی۔شروع سے ہی قصہ کہانی اور شاعری کا ذوق تھا۔ 1911ء میں پہلی غزل لکھی۔ جالندھر اسکول کے ٹیچر سرفراز خاں سرور سے اصلاح لی۔ بعد میں گرامی سے تلمذ حاصل کیا۔بچپن سے ہی نعت خوانی اور قوالی کی محفلوں میں جانے کا شوق رہا۔وہ کئی رسالوں کے ایڈیٹر بھی رہے۔رسالہ ''اعجاز''۔''شبابِ لاہور''۔''زمیندار''۔''تبلیغ ہزار داستان''۔''نونہال''۔''پھول''۔''تہذیب

النسا''۔''حمایت اسلام'' اور''مخزن'' کے ادارتی فرائض انجام دیے۔''کارزار'' نام کا رسالہ جاری کیا۔حفیظ فوج میں سانگ پبلسٹی اڈوائزر رہے۔ انہیں کئی اعزازات اور خطابات بھی دیے گئے۔مولانا گرامی نے کپورتھلہ کے ایک مشاعرے میں ابوالاثر کی کنیت سے نوازا۔انہیں حسان الملک اور فردوسیٔ اسلام کا خطاب بھی ملا۔ پہلا شعری مجموعہ''نغمہ زار'' 1925ء میں شائع ہوا۔جس کے بعد''سوز و ساز''۔''تلخابۂ شیریں''۔''شاہنامۂ اسلام'' اور''چراغ صحرا'' شائع ہو چکے ہیں۔دو افسانوی مجموعے''مفت پیکر'' اور''معیاری افسانے'' شائع ہو چکے ہیں۔ پاکستان کا قومی ترانہ بھی انہیں کا لکھا ہوا ہے۔نظم گو شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔مختصر بحروں میں نظم لکھنے میں کمال رکھتے ہیں۔علامہ اقبال کے معاصر نظم گو شعرا میں شمار ہوتا ہے۔اقبال اور حفیظ کو وادیٔ کشمیر سے بڑی دلچسپی تھی۔حفیظ نے گیت کے انداز پر نظمیں لکھیں۔حفیظ نہ صرف علامہ اقبال کی ہستی سے متاثر تھے بلکہ ان کی شاعری کی عظمت کو بھی قبول کرتے تھے۔ان کا انتقال بمقام پاکستان 1983ء میں ہوا۔ایک نظم''جلوہ سحر'' کا بند پیش ہے :

نسیم سر سرا گئی　　چمن میں گل کھِلا گئی
کلی کو گد گدا گئی

طرب کے سیل نور سے　　جہاں کی نیند دھل گئی
حیات کے وفور سے　　خوشی کی آنکھ کھل گئی

گلوں کی نکہتیں اٹھیں
ہوا کے دوش پر چلیں

پڑی جو مہر کی نظر　　تو اُوس بن گئی گہر
نسیم سر سرا گئی　　چمن میں گُل کھلا گئی

حفیظ نے اقبال سے استفادہ کیا ہے۔اقبال نے اپنے دمِ آخر حفیظ کو طلب کیا تھا۔جس سے اقبال اور حفیظ کے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔ حفیظ عمر میں اقبال سے 23 سال چھوٹے تھے لیکن اقبال انہیں بے حد عزیز رکھتے تھے۔

24.4.6　سید علی حیدر نظم طباطبائی

نظم طباطبائی نے نظم، غزل اور انگریزی نظموں کے اردو میں ترجمے ہی کیے نہیں بلکہ علم عروض کی خدمت بھی انجام دی۔''گور غریباں'' جیسے منظوم ترجمہ اور دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے ناظر ادبی کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنے والے سید علی حیدر نظم طباطبائی کی واجد علی شاہ سے رشتہ داری تھی۔سید اعجاز حسین نے نظم کی تاریخ پیدائش 1852ء بتائی ہے۔ان کی ابتدائی تعلیم ننہال میں ہوئی۔ملا باقر اور ملا طاہر سے نحو اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ 1868ء میں طباطبائی اپنے والد کے ہمراہ میٹا برج چلے آئے اور وہاں مولانا محمد علی کی نگرانی میں انہوں نے فلسفہ، منطق اور درس نظامیہ پر عبور حاصل کیا۔محمد عسکری اودھ کے شہزادوں کو انگریزی پڑھاتے تھے۔نظم نے ان سے انگریزی پڑھی اور انہیں عربی سکھائی۔ 1880ء میں قائم الدین کے انتقال پر طباطبائی کا تقرر کام بخش کے اتالیق کی حیثیت سے ہوا۔ 1883ء میں انگریزوں نے شہزادگانِ اودھ کے لیے مدرسہ کھولا تو طباطبائی وہاں عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ 1887ء میں نظم پہلی مرتبہ بغرض تفریح حیدرآباد آئے۔پھر کلکتہ واپس گئے۔حیدرآباد آئے تو افضل حسین کے صاحبزادے کے اتالیق مقرر ہوئے۔ 1891ء میں کتب خانہ آصفیہ کے قیام کے بعد مہتمم مقرر ہوئے۔ 1891ء میں مدرسۂ عالیہ میں استاد مقرر ہوئے جہاں 1897ء تک کام کرتے رہے۔اکتوبر 1897ء میں عربی و فارسی کے استاد کی حیثیت سے نظام کالج میں تقرر ہوا۔ 1917ء میں ان کی خدمات صرفخاص میں منتقل ہوئیں اور آصف سابع کے صاحبزادوں کی عربی تعلیم کے لیے اتالیق مقرر ہوئے۔ 1918ء میں ان کی خدمات دارالترجمہ کو حاصل ہوئیں۔سہ شنبہ 23 مئی 1933ء کو انتقال ہوا اور تکیہ موسی شاہ قادری میں آسودہ ہیں۔ 1917ء میں انہیں حیدر یار جنگ کے

خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ 1922ء میں انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے ویمنس کالج میں بھی خدمات انجام دیں۔ ان کے دو دیوان یادگار ہیں جن میں اولین ''دیوانِ قصائد و منظومات'' اور ''صورت تغزل'' اہمیت کے حامل ہیں۔ تھامس گیرے کی انگریزی نظم کا ترجمہ کر کے شہرت حاصل کی۔ وہ غزل، نظم اور قصیدہ گوئی کے اہم شاعر ہیں۔ انہیں اقبال کے عہد میں اپنی خدمات پیش کرنے کا موقع ملا۔ اردو نظم میں ہیئت کے تجربے کرنے والے اولین تخلیق کاروں میں طباطبائی بھی ہیں۔ ان کی روایتی نظموں میں قومی نظم ''گلاب کا پھول''۔ ''بے ثباتی دنیا''۔ ''آہِ سرد''۔ ''پند سودمند''۔ ''نظم امداد باہمی''۔ ''آفتاب سے خطاب''۔ ''حسن شاعر کی نظر میں''۔ ''حسن فلسفی کی نظر میں'' اور ''نوعِ بشر کی خدمت'' میں مقصدیت کا عنصر غالب ہے جس کی وجہ سے ادبیت مجروح ہوگئی ہے۔ علی حیدر نظم طباطبائی کی شاعری میں نظم اور غزل دونوں کا امتزاج ہے لیکن اقبال کی طرح کسی فکر اور فلسفہ کو انہوں نے اپنی شاعری میں جگہ نہیں دی۔ اقبال کے عہد کے شاعر کی حیثیت سے نظم گو شاعروں میں نظم طباطبائی کو اہم مقام حاصل ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. اکبرالہ آبادی کی شاعری کی اہم خصوصیت کیا ہے؟
2. ''رامائن کا ایک سین'' کس کی نظم ہے؟
3. بچوں کے شاعر اور ادیب کے حیثیت سے کس نے شہرت حاصل کی؟
4. ''شاہنامۂ السلام'' کے مصنف کا نام بتایئے؟
5. شاعر شباب اور انقلاب کس کو کہا جاتا ہے؟

24.4.7 شبیر حسن جوشؔ ملیح آبادی

اردو کی نظمیہ شاعری میں موضوعات کا تنوع اور الفاظ کے تلاطم سے ہنگامہ برپا کرنے والے شاعروں میں شبیر حسن جوش ملیح آبادی کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ انہیں شاعر شباب اور شاعر انقلاب کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔ ترقی پسند قافلے کے جدید نظم گو شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ بمقام ملیح آباد 1896ء میں پیدا ہوئے یعنی جوش عمر کے اعتبار سے علامہ اقبال سے 19 سال چھوٹے تھے۔ فقیر محمد خاں گویا ان کے پردادا تھے۔ جوش کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ سینٹ پیٹر آگرہ میں تعلیم کے مراحل پورے کیے۔ سینئر کیمبرج تک جوش نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور ذاتی مطالعہ کی وجہ سے ان کی علمیت میں اضافہ ہوا۔ 1916ء میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ 9 سال کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ جوش کے والد نے انہیں عزیز لکھنوی کا شاگرد بنادیا۔ جوش کو معقول آمدنی کی ضرورت تھی۔ اس لیے ان کی نگاہیں حیدرآباد کی طرف گئیں۔ 1924ء میں انہوں نے مہاراجہ کشن پرشاد کے دربار میں باریابی حاصل کی۔ جس کے بعد حیدرآباد کی ادبی محفلوں میں جوش کے کلام کی دھوم رہی۔ اپنی ذاتی صلاحیت سے جوش نے شہزادگان تک رسائی حاصل کی اور ملازمت کے مواقع بھی حاصل ہوگئے۔ حیدرآباد میں جوش کی شاعری کا دور بڑا یادگار رہا۔ انہیں دارالترجمہ میں ملازمت کا موقع ملا اور ان کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہوا۔ جس کا اظہار جوش نے ''یادوں کی برات'' میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ جوش نے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں ناظر ادبی یا مشیر ادب کی حیثیت سے کام کیا۔ 1924ء سے 1934ء تک جوش کی زندگی حیدرآباد میں بسر ہوئی۔ دس سال کے قیام کے بعد جوش کو ریاست کے حدود سے باہر جانے کا حکم ملا۔ حیدرآباد سے دلی پہنچے۔ رسالہ ''کلیم'' جاری کیا۔ فلمی گیت لکھے۔ سرکاری رسالے ''آج کل'' کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے کام کیا۔ 1956ء میں جوش پاکستان چلے گئے۔ 22 فروری 1982ء کو اسلام آباد پاکستان میں انتقال کیا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ وہ بیک وقت غزل اور نظم کے شاعر ہیں۔ کلاسیکیت، رومانیت اور ترقی پسند میلانات کا اثر ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ ان کی شاعری میں لفظوں کا ترنم ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ منظر نگاری، مناظر کو مجسم بنا کر پیکریت کو ابھارنا اور حروف و الفاظ کی مزاج شناسی کی وجہ سے جوش کی شاعری میں مختلف نقوش زبانِ گویا کے علمبردار کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں میں دلکشی و رعنائی کے علاوہ شباب اور انقلاب کی حسن آمیزش اردو نظم گوئی کو ایک نئے جہت سے ہمکنار کر دیتی ہیں۔ ان کی انقلابی نظموں میں ''کسان'' ایسٹ انڈیا کمپنی

کے فرزندوں کے نام ''گرمی اور دیہاتی بازار''۔ ''پیغمبر فطرت' فتنۂ خانقاہ ' گلبدنی وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔ان کے شعری مجموعے (1) روح ادب (نثر ونظم) (2) شاعر کی راتیں (3) نقش ونگار (4) شعلہ وشبنم (5) فکر ونشاط (6) جنون وحکمت (7) حرف وحکایت (8) آیات ونغمات (9) عرش وفرش (10) رامش ورنگ (11) سنبل وسلاسل (12) سیف وسبو (13) سرو وسروش (14) سموم وصبا (15) قطرہ وقلزم (16) طلوعِ فکر (17) موجد ومفکر (18) الہام وافکار اور (19) نجوم وجواہر ہیں۔ 1955ء میں جوش کو حکومت ہند کی جانب سے پدم بھوشن کا اعزاز بخشا گیا۔

24.4.8 اسمٰعیل میرٹھی

اردو شاعری کو بچوں کے ادب سے روشناس کرنے والے شاعروں میں محمد اسمٰعیل میرٹھی کا شمار ہوتا ہے جنہوں نے اردو شاعری کو ترجموں سے بھی مالا مال کیا۔محمد اسمٰعیل کی پیدائش بمقام میرٹھ پیر بخش کے گھر 12 نومبر 1844ء کو ہوئی۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور والد سے فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ پرانی طرز کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اسمٰعیل میرٹھی نے میرٹھ کے ''نارمل اسکول'' میں داخلہ لیا جہاں سے تعلیم ختم کرنے کے بعد انجنئرنگ کالج میں داخل ہوگئے اور یہاں اورسیری'' کی تعلیم حاصل کی۔ 10 جولائی 1860ء کو میرٹھ سرکل کے لیے ''انسپکٹر آف اسکول'' مقرر ہوگئے۔جس سے 1867ء تک وابستہ رہے اس کے بعد ڈسٹرکٹ اسکول سہارن پور میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے کام کیا۔دسمبر 1899ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ان کی شادی 1862ء میں نعیم النساء سے ہوئی۔ 1870ء میں موسم گرما میں سرکاری کام سے مسوری جانے کا اتفاق ہوا۔وہاں کے ماحول سے متاثر ہوکر نظم ''کوہ ہمالہ'' لکھی۔ان کی نظمیں ''معارف'' اور ''نجم الاخبار'' میں شائع ہوتی رہیں۔وحید الدین سلیم۔محمد حسین آزاد اور مولانا ظفر علی خاں سے اسمٰعیل میرٹھی کے اچھے مراسم تھے۔غزل' قصیدہ' رباعی' مثنوی' قطعہ اور سلام میں طبع آزمائی کی۔یکم نومبر 1917ء کو انتقال ہوا۔ان کا مزار باغیچت غازی آباد میں ہے۔'' کلیات اسمٰعیل میرٹھی'' شائع ہو چکا ہے۔ان کی نصابی کتابیں اردو زبان کا قاعدہ' اردو کی پہلی' دوسری' تیسری' چوتھی اور پانچویں کتاب کافی مشہور ہیں۔بچوں کے لیے ان کی کتابیں کمک اردو' ادیب' سفینۂ اردو' سوادِ اردو' بچوں کی قواعد وغیرہ مشہور ہیں۔ان کی نظموں میں سچ کہو' جگنو' پن چکی' بچے کی باتیں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان کی نظموں میں سادگی ہے۔وہ علامہ اقبال کے عہد میں بچوں کے نظم گو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں اور ان کی انداز شاعری اقبال کی ان نظموں میں جھلکتا ہے جو بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔

24.4.9 تلوک چند محروم

تلوک چند محروم یکم جولائی 1887ء میں دریائے سندھ کے کنارے میانوالی کے ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں دریا برد ہوگیا۔ انہوں نے بچپن دیہاتی مسلمانوں کے ساتھ گذارا۔ باقاعدہ تعلیم کے لیے محروم نے ورنا کلر فائنل مڈل اسکول عیسی خیل میں داخلہ لیا۔ ہر جمعرات میں اول آئے اور وظیفہ حاصل کیا۔ضلع میں کوئی ہائی اسکول نہ ہونے کی وجہ سے ستر میل دور وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہال اسکول میں داخلہ لیا۔میٹرک پاس کرنے کے بعد لاہور چلے آئے۔سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں تعلیم کی منزلیں طے کیں۔ ملازمت کے دوران ایف۔اے اور بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ 1910ء میں شادی ہوگئی۔ پانچ سال بعد اہلیہ کے انتقال پر دوسری شادی کی۔کلورکوٹ کے مڈل اسکول میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ 1947ء میں تقسیم ملک کا ہنگامہ ہوا۔ وہ جالندھر آ گئے۔ لالہ دیش بندھو نے اخبار ''تیج'' میں ملازمت کا انتظام کیا۔ کچھ عرصہ بعد پنجاب یونیورسٹی کیمپ کالج نئی دہلی میں لکچرر مقرر ہوئے۔ مارچ 1962ء میں حکومت پنجاب نے ان کی علمی وادبی خدمات پر کسیہ زر پیش کیا۔ 6 جنوری 1966ء کو انتقال کیا۔ان کے شعری مجموعے ''گنج معانی''۔ ''رباعیات محروم''۔ ''کاروانِ وطن''۔ ''بہار طفلی''۔ ''شعلہ نوا''۔ ''نیرنگِ معانی'' اور بچوں کی دنیا کے نام سے یادگار ہیں۔محروم بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ان کی نظموں میں منظر نگاری خوب ہوتی ہے۔کلامِ اقبال سے متاثر تھے ان کے صاحبزادے جگن ناتھ آزاد کو ماہر اقبالیات کی امتیازی حیثیت حاصل ہے۔محروم کی بچوں کے لیے لکھی ہوئی نظم ''محنت'' کا بند ملاحظہ ہو :

محنت بغیر ممکن جینا نہیں جہاں میں　　محنت سے وہ بنا ہے رہتے ہو جس مکاں میں
محنت کا پھل ہیں پودے جتنے ہیں گلستاں میں　　محنت لگی ہوئی ہے بلبل کے آشیاں میں
محنت کرو عزیزو ' محنت سے کام ہوگا

24.4.10 عظمت اللہ خاں

عظمت اللہ خاں کا سنہ ولادت 1887ء ہے۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد نعمت اللہ خاں کے ساتھ پانچ سال کی عمر میں حیدرآباد آئے اور یہیں تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے۔ علی گڑھ سے واپس آ کر محکمہ تعلیمات میں ملازمت اختیار کی۔ ترقی کرتے ہوئے نظامت تعلیمات میں مددگار مقرر ہوئے۔ ادبی حلقوں میں کافی مشہور ہوئے۔ دق کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر 1927ء میں انتقال کیا۔ اردو شاعری میں پہلی بار ہندی پنگل کو شامل کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ نظم اور غزل میں اس نئے انداز کی شمولیت سے نئے امکانات روشن ہوئے۔ اقبال کی روایتی شاعری سے انحراف ان کا مقصد تھا۔ اس لیے ان کی نظموں میں جدید رنگ و آہنگ کا میلان ملتا ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کو انقلابی رجحان سے وابستہ کیا اور شاہی کے خلاف نظم گوئی کا طریقہ اپنایا۔ انہیں نئی توسیع یافتہ شاعری کا نقش اول قرار دیا جاتا ہے۔ وہ مترنم اور ہلکی پھلکی بحروں میں شعر کہنے کے عادی ہیں۔ ان کی نظموں کا سرمایہ کم ہے۔ کوئل' موہنی مورت' پیپل' بالی بیوی مجھے پریت کایاں کوئی پھل نہ ملا وغیرہ نظمیں ہندوستانی ماحول کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی نظموں میں حسن فطرت اور مظاہر قدرت کی متحرک تصویریں ملتی ہیں۔ شستہ اور سلیس زبان میں نظم کا یہ انداز ملاحظہ ہو:

بھور پھٹی ہے صبح کی دلہن　　نے سیج پر لی ہے انگڑائی
بگڑی بکھری رات کی بن ٹھن　　وہ سر کی تاروں کی دلائی
رات کے کالے بادلوں سے　　چاند کی صورت وہ مسکائی

ان کی نظموں میں نغمگی' امیجری' خلوص اور ندرت کا انداز اپنی بہار دکھاتا ہے۔

24.5 خلاصہ

اقبال نے جس دور میں شعر گوئی کا آغاز کیا' اس دور میں شعری اصناف میں محض غزل اور نظم کی ہی اہمیت باقی رہ گئی تھی۔ مثنوی اور قصیدہ جیسی اصناف کو اذال آ چکا تھا۔ کربلائی مرثیے کی جگہ شخصی مرثیے کو قبولیت حاصل ہو رہی تھی۔ اقبال نے ہر صنف شاعری کو اپنے کلام کا وسیلہ بنایا چنانچہ حمد' نعت' منقبت' مثنوی' ساقی نامہ' شہر آشوب' نظم اور شخصی مرثیہ جیسی اصناف ان کی شاعری میں موجود ہیں۔ اقبال نے شاعری کو فکر و فلسفہ سے وابستہ کیا۔ چنانچہ ان کی نظموں اور غزلوں میں اسی روش کی کارفرمائی موجود ہے۔ اقبال کی شاعری غزل کے ذریعہ بھی اپنا اثر دکھاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی نظم گوئی میں بھی انہوں نے اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا۔ اقبال کے عہد میں غزل گوئی کے تین رجحانات روایتی غزل' مسائلی غزل اور متصوفانہ غزل سامنے آتے ہیں۔ یہ رجحانات ظاہر کرتے ہیں کہ اقبال کی غزل گوئی نے اپنے عہد کو متاثر کیا۔ اقبال کے دور کے غزل گو شعرا میں فصاحت جنگ جلیل' فانی بدایوں' یگانہ چنگیزی' شاد عظیم آبادی' ریاض خیرآبادی' جگر مرادآبادی' سیماب اکبرآبادی' عزیز لکھنوی' اصغر گونڈوی' فراق گورکھپوری اور جمیل مظہری کی غزلوں اور ان کے کارناموں سے واقفیت کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بیشتر غزل گو شعرا تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے دانشورانہ فکر کے حامل تھے اور اقبال کی غزلوں کے فکری آہنگ نے انہیں متاثر کیا۔ یہی حال اقبال کے دور کے نظم گو شعرا کا ہے۔ اقبال کی فکر انگیز شاعری کے وہ مداح رہے چنانچہ اکبر الہ آبادی' نظم طباطبائی' اسمٰعیل میرٹھی' جوش ملیح آبادی' برج نرائن چکبست' سرور جہاں آبادی' حفیظ جالندھری' تلوک چند محروم اور عظمت اللہ خاں کی نظم نگاری کے پس منظر میں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اقبال نے اپنے عہد کے نظم نگاروں کو متاثر کیا۔ اس طرح عہد اقبال میں

غزل اور نظم کے شاعروں کے تعارف سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تمام دور اہل علم کا رہا اور انہیں اقبال کی غزلوں اور نظموں نے حد درجہ متاثر کیا اور خود اقبال اپنے معاصر شعرا سے حد درجہ یگانگت رکھتے تھے۔ اقبال کے خطوط اس قول کی تصدیق کرتے ہیں کہ اقبال نے اپنے ہمعصر شعرا سے رابطہ قائم کرنا ضروری سمجھا۔ اقبال کی شخصیت کا یہ بھی ایک اہم پہلو ہے کہ انہوں نے معاصرانہ چشمک کو خاطر میں نہ لا کر اردو شاعری کی تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔

24.6 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. عہد اقبال کی غزل گوئی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
2. عہد اقبال کے چند اہم نظم نگار شعرا کا تعارف کروائیے۔
3. عہد اقبال کی اردو شاعری کا اجمالی جائزہ لیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. علامہ اقبال کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔
2. عہد اقبال کے کن ہی دو غزل گو شاعروں کا تعارف کروائیے۔
3. عہد اقبال کے کن ہی دو نظم نگار شعرا کے بارے میں اظہار خیال کیجیے۔

24.7 فرہنگ

محروم = نہ پانے والا
متقاضی = تقاضہ کرنے والا
حضر = ایک جگہ قیام، سفری قید
رجحان = میلان، توجہ
مخزن = خزانہ، گودام
سرکوبی = سزا دینا، سر کچلنا
تلمذ = شاگرد ہونا
گیسو = زلف، لٹ، بال
افتاد = مصیبت، اچانک سانحہ
منسوخ = رد کیا گیا، نابود
قرائن = قرینہ کی جمع، سلیقہ
تلامذہ = تلمیذ کی جمع، شاگرد
نامساعد = ناموافق، ناہموار
معیت = ساتھی۔ ہمرہی
فیضان = فائدہ پہنچنا، فیض کی جمع
دشت = جنگل، صحرا

درون = اندرونی حصہ
ماند = چمک کم ہونا
رزمیہ = جنگی داستان
ہم عصر = ایک وقت یا زمانے کے
تقریظ = تعریفی تحریر برائے کتاب یا مصنف
پیروی = تقلید، نقل
مسدود = بند کیا گیا، بند
گریباں = پوشاک کا اوپری حصہ
یاسیت = ناامیدی، مایوسی میں اضافہ
مواضع = موضع کی جمع، دیہات
گور = قبر، تربت، مزار
ہدف = نشانہ، زد
معقولات = علم حکمت، فلسفہ، منطق
ہمسر = برابر کا، ہم رتبہ
رموز = رمز کی جمع، راز کی باتیں
مہمیز = جانور کو ایڑ لگانے کے لیے استعمال ہونے والا کانٹا

مژدہ	=	خوشی، خوش خبری	اسیر	=	گرفتار، قیدی
فسوں	=	جادو، فریب، مکر	گشتہ	=	پھرنا، چکر، گھومنا
صہبا	=	ایک قسم کی لال شراب	احمر	=	سرخ
غنچہ	=	پھول کی کلی، شگوفہ	نغمہ زن	=	گانے والا
مہر	=	محبت، دوستی، سورج، رحم	تاباں	=	روشن، نورانی
ہم صفیر	=	ہمدم، ساتھی، دوست	مضراب	=	ستار بجانے کا چھلہ

24.8 سفارشی کردہ کتابیں

.1	ڈاکٹر تسکینہ فاضل	اقبال اور ان کے معاصر شعرا و ادبا
.2	ڈاکٹر سید اعجاز حسین مرمہ ایڈیشن (عقیل رضوی)	مختصر تاریخ ادب اردو
.3	پروفیسر سیدہ جعفر	تاریخ ادب اردو (میر تا ترقی پسند تحریک) (جلد سوم، چہارم)
.4	رام بابو سکسینہ	تاریخ ادب اردو
.5	طاہر تونسوی	اقبال اور مشاہیر
.6	پروفیسر سید وقار عظیم	اقبال معاصرین کی نظر میں
.7	ڈاکٹر سلیم اختر	اقبالیات کے نقوش
.8	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار	اکبر اور اقبال
.9	بشیر احمد ڈار	انوارِ اقبال

اکائی: 25 اُردو نثر عہد اقبال میں

ساخت

25.1 تمہید

25.2 عہد اقبال کی نثر

25.3 عہد اقبال کی افسانوی نثر

25.3.1 عہد اقبال میں ناول نگاری

25.3.2 عبدالحلیم شرر لکھنوی

25.3.3 راشد الخیری

25.3.4 مرزا محمد ہادی رسوا

25.3.5 منشی فیاض علی ایڈوکیٹ

25.4 عہد اقبال میں مختصر افسانہ

25.4.1 منشی پریم چند

25.4.2 سجاد حیدر یلدرم

25.4.3 سدرشن

25.4.4 علی عباس حسینی

25.5 عہد اقبال میں اردو ڈراما

25.5.1 آغا حشر کاشمیری

25.5.2 حکیم احمد شجاع

25.5.3 سید مہدی حسن احسن

25.5.4 نرائن پرشاد بیتاب

25.5.5 امتیاز علی تاج

25.6 عہد اقبال میں غیر افسانوی نثر

25.6.1 مولانا ابوالکلام آزاد

25.6.2 نیاز فتح پوری

25.6.3 مہدی افادی

25.6.4 ظفر علی خاں

25.6.5 عبدالماجد دریابادی

25.6.6 مولوی عبدالحق

25.6.7 قاضی عبدالغفار

25.6.8 خواجہ حسن نظامی

25.6.9 برج موہن دتاتریہ کیفی

25.6.10 سید سلیمان ندوی
25.7 عہد اقبال میں طنز و مزاح
25.7.1 ملا رموزی
25.7.2 مرزا فرحت اللہ بیگ
25.7.3 شوکت تھانوی
25.7.4 پطرس بخاری
25.7.5 عظیم بیگ چغتائی
25.7.6 رشید احمد صدیقی
25.8 خلاصہ
25.9 نمونہ امتحانی سوالات
25.10 فرہنگ
25.11 سفارش کردہ کتابیں

25.1 تمہید

اقبال کے دور تک پہنچتے پہنچتے اردو نثر کو اس کا فطری اسلوب حاصل ہو چکا تھا۔ سادہ اور عام نثر کو مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ داستانوں کی مسجع اور مقفی نثر اور رنگین بیانی آہستہ آہستہ دم توڑ رہی تھی۔ ادب لطیف اور رومانی نثر کو شہرت حاصل ہو رہی تھی جس کے ساتھ ہی مرزا غالب اور سرسید کی نثر کو فطری نثر کا درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ اردو نثر عمومی طور پر افسانوی اور غیر افسانوی اصناف پر مشتمل تھی جس کے ساتھ ہی صحافت کے توسط سے صحافی نثر کا احیا ہونے لگا تھا۔ قصہ کہانی بیان کرنے کی نثر کو ڈپٹی نذیر احمد کی تحریروں سے فروغ حاصل ہو چکا تھا اور قصہ کہانی کے بجائے دنیا کی حقیقتوں کے اظہار کے لیے غیر افسانوی نثر کی مختلف اصناف کا عام رواج ہونے لگا تھا۔ علمی کتابوں کی تحریر کے ذریعے سائنسی اور تکنیکی علوم و فنون کی پذیرائی عام ہونے لگی تھی۔ اسی طرح ترجمے کے توسط سے مغربی ادبیات اور علوم و فنون کے ذخیرے اردو میں منتقل ہو رہے تھے۔ اس اعتبار سے اقبال کے عہد کو اردو نثر کی ترقی کا ہمہ جہتی دور کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ اس دور میں ہر شعبۂ حیات سے اردو نثر کا رابطہ مستحکم ہو چکا تھا۔ افسانوی، غیر افسانوی، صحافتی اور علمی نثر کے علاوہ ترجمے کے ذریعے بھی نثر کی مکمل ترجمانی ہونے لگی۔ سنجیدہ کے علاوہ مزاحیہ اور طنزیہ نثر کو فروغ حاصل ہوا۔ اس طرح اقبال کے عہد میں اردو نثر ہر جہت کے عمدہ اظہار کا وسیلہ بن گئی۔ ایسی مایہ ناز تحریروں کی پیش کش کے لیے اقبال کے دور کے نثر نگاروں کے کارناموں کو بہر حال قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

علامہ اقبال کی نثر کو ''غیر افسانوی نثر'' کی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ''تصوف'' پر مقالہ لکھا۔ پھر انھوں نے Reconstruction of Islamic Thoughts پر انگریزی میں لکچر دیے۔ لکچر یا خطبہ کو بھی غیر افسانوی نثر میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کے خطوط کو اردو نثر میں خاص مقبولیت حاصل ہے۔ خطوط اقبال کے مختلف مجموعے مختلف ادوار میں شائع ہوتے رہے اور اب مظفر حسین برنی نے کلیات مکاتیب اقبال'' چار جلدوں میں شائع کر دیا ہے جو اقبال کے تمام خطوط کا انتخاب ہے۔ جن کے مطالعے سے اقبال کی توضیحات و تشریحات کے علاوہ ان کی تفہیم و ترسیل کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال نے تمام عمر غیر افسانوی نثر کی نمائندگی کی اور ان کے بعض خطوط میں سفر نامہ کا انداز بھی جھلکتا ہے چنانچہ انھوں نے افغانستان کے جامعاتی نصاب کی ترتیب کے دوران جو سفر پاکستان سے افغانستان تک کیا تھا۔ اسے مکتوباتی سفر نامہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح اقبال کے خطوط میں صحافت کے انداز اور روداد نویسی Reporting کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ خطوط اقبال بنیادی طور پر غیر افسانوی نثر کے نمائندہ ہیں لیکن یہ خطوط ہونے کے ساتھ ساتھ یادداشت، روزنامچہ، روداد اور سفر نامہ کے علاوہ سوانحی اور خودنوشت طرز نثر کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔

21.2 عہد اقبال کی نثر

سر محمد اقبال کے تمام تر شعوری دور کو بیسویں صدی کی ابتدائی تین دہائیوں کے دور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس دور میں علمی و ادبی ہی نہیں بلکہ تخلیقی، افسانوی، غیر افسانوی نثر اور ترجمے کو فروغ حاصل ہوا۔ فلسفہ، منطق، عمرانیات، مذہبیات اور دیگر علوم وفنون پر بے شمار علمی کتابیں شائع ہونے لگیں۔ دارالمصنفین اعظم گڑھی یوپی کے توسط سے مذہبیات میں تحقیقاتی نثر کا احیا ہوا۔ سائنٹفک سوسائٹی کے توسط سے سائنسی علوم کی کتابوں کے اردو میں ترجمہ کی روایت کا آغاز کیا گیا تھا۔ 1917ء میں دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد کے قیام کی وجہ سے علوم سائنس جیسے کیمیا، طبیعیات، نباتیات، حیوانات پر اردو میں نصابی کتب شائع ہونے لگیں۔ طب (میڈیسن) انجینرنگ قانون اور علوم عمرانیات پر دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ سے ترجمہ شدہ کتب کی اشاعت سے عہد اقبال کی نثر میں انقلاب پیدا ہوا۔ عہد اقبال میں جہاں علمی نثر کو فروغ حاصل ہوا اور تحقیقات کے دروازے کھل گئے وہیں ادبی نثر میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ ناول، افسانہ، ڈراما اور ناولٹ لکھنے والے نثر نگاروں کی اقبال کے عہد میں کمی نہیں رہی۔ اسی طرح سوانح، خودنوشت، آپ بیتی، سفرنامہ، رپورتاژ، خاکہ، تحقیق، تنقید اور مکتوب نگاری جیسی اصناف کو شہرت حاصل ہوئی۔ اقبال کے عہد کی نثر میں صحافت کی وجہ سے تبدیلی رونما ہوئی۔ صحافت کے توسط سے اداریہ نویسی، روداد نویسی، کالم نویسی کی روایت کا آغاز ہوا۔ اخبارات اور رسائل میں خطوط کی اشاعت نے مراسلاتی نثر کو بھی فروغ دیا۔ غرض اقبال کے دور تک اردو نثر کی ہمہ جہت ترقی ہوئی۔ عربی، فارسی اور ترکی میں لکھی ہوئی تخلیقات کے ترجمے کا سلسلہ جاری تھا۔ ان مشرقی زبانوں کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور روسی زبان معرکتہ الآرا تصانیف کے اردو ترجموں کی وجہ سے مغربی زبانوں کی ترجمانی کا حق ادا ہوا۔ اس طرح اقبال کے عہد کی نثر میں ترجمہ کی نثر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے عہد میں شعری اور نثری ترجمے کی روایت نے وسعت اختیار کر لی۔ اس لیے اقبال کے عہد کو نثری کارناموں کا ایک زریں دور قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ اس دور میں اردو نثر افسانوی اور غیر افسانوی اصناف سے ہی وابستہ نہیں رہی بلکہ علمی نثر، تحقیقاتی نثر، صحافتی نثر، مراسلاتی نثر اور ترجمہ کی نثر سے وابستہ ہو کر نثر کی ہمہ جہت ترقی کا حق ادا کرنے لگی۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. عہد اقبال کی نثری اصناف کے نام لکھیے۔
2. عہد اقبال کی نثر کی قسمیں کیا ہیں؟

25.3 عہد اقبال کی افسانوی نثر

علامہ اقبال نے جس عہد میں اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا۔ اس پورے دور میں افسانوی نثر کا بول بالا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، راشد الخیری، منشی فیاض علی، مرزا محمد ہادی رسوا کی ناول نگاری عروج پر تھی۔ ان ناول نگاروں کے قافلے نے افسانوی نثر کو پروان چڑھایا۔ داستانوی نثر دم توڑ رہی تھی۔ ناول نگاری کی نثر کے ساتھ افسانہ نگاری نے سر ابھارنا شروع کر دیا تھا۔ پریم چند، سدرشن، سجاد حیدر یلدرم، اعظم کریوی اور علی عباس حسینی جیسے افسانہ نگاروں نے عہد اقبال میں کہانی یا افسانہ نگاری کے توسط سے افسانوی نثر کے فروغ میں حصہ لیا جب کہ عہد اقبال میں ڈرامے کی روایت امتیاز علی تاج سے فروغ پائی تاہم پریم چند (ڈراما کربلا) اور چکبست (ڈراما کملا) کی وجہ سے بھی ڈرامے کی ترقی کا ماحول پیدا ہوا۔ اس طرح اقبال کے عہد میں ناول، افسانہ اور ڈراما جیسی اصناف کے ذریعے افسانوی نثر کو فروغ حاصل ہوا۔ اس عہد تک ''ناولٹ'' کی صنف کو فروغ حاصل نہ ہو سکا تھا۔

21.3.1 عہد اقبال میں ناول نگاری

اقبال کے عہد تک اردو ناول کا ارتقا عمل میں آ چکا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد (وفات 1912ء) کے تمثیلی قصوں سے اردو ناول کا سفر شروع ہوا پھر عبدالحلیم شرر نے تاریخی ناول نگاری کی بنیاد رکھی۔ رتن ناتھ سرشار کے ناولوں میں لکھنوی زوال آمادہ تہذیب کی جھلکیاں محسوس کی جاسکتی ہیں۔ علامہ راشد الخیری نے غم انگیز ناولوں کے ذریعے اس صنف کو نئی جہت سے روشناس کرایا۔ منشی فیاض علی نے معاشرتی ناول کی بنیاد رکھی جب کہ مرزا رسوا کے ناول کے ذریعے طوائف کی زندگی کو بنیاد بنا کر ناول لکھنے کی روایت کا آغاز ہوا۔ منشی پریم چند کے ناولوں نے دیہاتی زندگی اور جدوجہد آزادی کی عکاسی کا کارنامہ انجام

دیا۔اسی دور میں نیاز فتح پوری نے رومانی ناول اور علی عباس حسینی نے سماجی ناول کی بنیاد رکھی۔اسی دوران انگریزی ناولوں کے اردو میں ترجمہ کی روایت کا بھی آغاز ہوا چنانچہ کئی سماجی، سیاسی، معاشرتی ناولوں کے علاوہ رومانوی، جاسوسی اور ہیبت ناک ناولوں کے ترجمے اردو میں کیے گئے۔اردو کے چند اہم ناول نگار اور ان کے کارناموں کا احاطہ ذیل میں پیش ہے۔

25.3.2 عبدالحلیم شرر

اردو میں ناول نگاری کو فنی اساس پر شروع کرنے کا سہرا عبدالحلیم شرر کے سر ہے۔انھیں اردو کے تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے۔لفظ ناول کو اردو میں رواج دینے اور اسلامی تاریخ کے اہم واقعات کو ناول کے انداز میں پیش کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ناول نگاری کے علاوہ آزاد نظم اور مضمون نگاری کی وجہ سے بھی انھوں نے نام کمایا۔لکھنؤ سے منفرد انداز میں رسالہ ''دلگداز'' شائع کیا۔وہ 1860ء میں اودھ دارالسلطنت لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔عمر میں علامہ اقبال سے سترہ سال بڑے تھے۔ایک مورخ، ڈراما نگار، صحافی، ادیب، ناول نگار اور شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔شرر کے والد حکیم تفضل حسین عربی اور فارسی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور واجد علی شاہ کے ہاں ممتاز خدمت پر مامور تھے۔شرر جب 9 سال کی عمر کے ہوئے تو ان کے والد انھیں کلکتہ لے گئے۔یہیں پر ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔سید علی حیدر طباطبائی سے منطق و فلسفہ پڑھا اور اسی زمانے میں مغربی علوم بھی حاصل کیے۔حکیم محمد مسیح سے طب پڑھی اور چند دن مطب بھی کیا۔اقبال کی پیدائش کے وقت 1877ء میں 19 سال کی عمر میں لکھنو آئے اور نظم طباطبائی سے شاعری میں تلمذ حاصل کیا۔1881ء میں ''اودھ اخبار'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے اور اپنی ادارت میں ایک ہفتہ وار رسالہ ''محشر'' نکالا'' پھر اودھ اخبار سے قطع تعلق کر کے پہلا ناول ''دلچسپ'' لکھا جو کافی مقبول ہوا۔1887ء میں رسالہ ''دلگداز'' جاری کیا جو ان کی زندگی تک جاری رہا۔1891ء میں حیدرآباد دکن تشریف لائے۔نواب وقار الامرا نے ریاست حیدرآباد سے دوسو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔1895ء میں نواب وقار الامرا کے صاحبزادے کے ساتھ انگلستان گئے۔انگلستان سے واپسی کے چھ ماہ بعد حیدرآباد دکن سے لکھنو تشریف لائے۔عبدالحلیم شرر اردو ادب کی دنیا میں ایک چابکدست مصور، ناول نگار اور جذبات انسانی پر حکومت کرنے والے تخلیق کار تھے۔آپ کثیر التصانیف ادیب ہیں دسمبر 1926ء میں انتقال ہوا اور لکھنو میں دفن کیے گئے۔ان کی تاریخی ناولوں کے نام درج ذیل ہیں۔

(1) ایام عرب (2) فتح اندلس (3) ماہ و ملک (4) یوسف و زلیخا (5) اومتہ الکبریٰ (6) مفتوح فاتح (7) فلپانا (8) فردوس بریں (9) قیس و لبنیٰ (10) لعبت چین (11) مقدس نازنین (12) جویائے حق (13) طاہرہ (14) مینا بازار (15) نیکی کا پھل (16) بابک خرمی (17) حسن انجلینا (18) فلورا فلورانڈا (19) ملک العزیز ورجینا (20) منصور و موہنا (21) آغا صادق کی شادی (22) حسن کا ڈاکو (23) خوفناک محبت (24) زوالِ بغداد (25) فسانہ تقیس (26) عزیزۂ مصر (27) ملکہ زنوبیہ (28) شیریں ملکہ عجم (29) غیب داں دلہن (30) دلچسپ (31) دلکش کامل (32) شہیدِ وفا (33) بدرالنساء کی مصیبت وغیرہ۔

ان ناولوں میں جہاں بہترین منظر نگاری، رومانویت اور دلچسپ انداز تحریر نمایاں ہے وہیں مسلمانوں کے جذبہ حریت اور جہاد کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔اقبال کی رحلت سے بارہ سال قبل شرر کا لکھنو میں انتقال ہوا تاہم عہد اقبال کے ناول نگار کی حیثیت سے ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

25.3.3 راشد الخیری

دہلی کے ایک ممتاز خاندان جسے شاہانِ مغلیہ کے استاد ہونے کا نسل در نسل فخر حاصل رہا ہے۔اسی خاندان سے علامہ راشد الخیری کا تعلق ہے۔ان کی پیدائش بمقام دہلی 1870ء میں ہوئی ابھی نو۔دس برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ان کی ابتدائی تعلیم دادا اور چچا کی نگرانی میں ہوئی۔وہ علامہ اقبال سے عمر میں صرف سات سال بڑے تھے۔اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی جب کہ انگریزی تعلیم دہلی کے عربک اسکول میں حاصل کی۔1891ء میں محکمہ بندوبست کے انگریزی دفتر میں ملازم ہوئے اور کچھ مدت بعد مستعفی ہو گئے۔مولانا کی سب سے پہلی تصنیف ''حیات صالحہ'' ہے۔اردو میں درد انگیز اور غمگین ناول نگاری کی وجہ سے مشہور ہیں۔عورتوں کی مظلومیت اور ظلم و ستم کے واقعات کو بیان کرنے میں کمال حاصل تھا۔ناول نگار کے علاوہ مضمون نگار۔انشا پرداز صحافی کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔68 سال کی عمر میں دو ماہ بیمار رہ کر 3 فبروری 1936ء کو اس دار فانی سے کوچ کیا۔وہ کثیر التصانیف ادیب ہیں۔ان کی تصانیف کی فہرست درج ذیل ہے۔

صبح زندگی۔شامِ زندگی۔سیدہ کا لال اور فاطمہ کا لال اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے علاوہ شبِ زندگی۔طوفان حیات۔جوہر خدمتِ۔منازل السائرہ۔نوحۂ زندگی۔امت شیطانی۔سات روحوں کے اعمال نامے۔بیلہ میں میلہ۔ستونتی۔مؤدودہ۔تفسیر عصمت۔بنت الوقت۔سرابِ مغرب۔انگوٹھی کا راز۔فسانۂ سعید۔ولائتی ننھی۔منازلِ ترقی۔بچہ کا کرتہ۔ویڈیا کی سرگزشت۔چہار عالم۔جوہر عصمت۔سیلابِ اشک۔طوفانِ اشک۔نانی عشو۔ نسوانی زندگی۔گلدستہ عید۔رودادِ قفس۔گرفتارِ قفس۔الزہرا۔وداعِ خاتون۔شب حزیں۔وداعِ ظفر۔امین کا دم واپسیں۔یاسمین شام۔عروس کربلا۔ محبوب خداوند۔تیغ کمال۔شہید مغرب۔درشہوار۔منظر طرابلس۔سودائے نقد۔شہنشاہ کا فیصلہ۔احکام نسواں۔محسنِ حقیقی۔دعائیں۔قرآنی قصے۔گڈری میں لعل۔چمنستان مغرب۔دلی کی آخری بہار۔مسلی ہوئی پتیاں۔داستان پارینہ۔عروسِ مشرق۔بزم رفتگان۔نالہ زار۔بےفکری کا آخری دن۔بلبل بیمار۔سیاحتِ ہند۔یادگار تمدن۔نشیب وفراز۔بساطِ حیات۔حوراورانسان۔دادالال بجھکو۔آفتابِ دمشق۔گوہر مقصود۔لڑکیوں کی انشا۔سوکن کا جلاپا۔ سنجوگ جیسی نثری تصانیف کے باعث علامہ راشد الخیری نے علامہ اقبال کے عہد کے نثر نگاروں میں افسانوی تخلیق کار ہونے کا ثبوت دیا۔

25.3.4 مرزا ہادی محمد رسوا

اردو کے مایہ ناز ادیب' خوش گو شاعر اور ایک اہم ناول نگار کی حیثیت سے مرزا محمد ہادی رسوا کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ان کی پیدائش 1858ء میں بمقام لکھنؤ ہوئی۔انھیں علامہ اقبال سے عمر میں 19 سال بڑے ہونے کا شرف حاصل ہے۔وہ آغا محمد تقی کے فرزند تھے۔مرزا صاحب کے اسلاف ماژندران سے دلی آئے تھے اور وہاں سے آکر لکھنو میں سکونت اختیار کی۔رسوا کو علم کا جس قدر شوق تھا۔اسی قدر علم کو قبول کرنے کا وصف بھی حاصل تھا۔عربی۔عبرانی۔یونانی۔انگریزی۔فارسی اور ہندی زبانوں پر گہرا عبور حاصل تھا اور فلسفہ کا مطالعہ بھی کافی گہرا تھا۔فن شاعری میں مرزا اوج مرحوم کے شاگرد تھے۔ناول نویسی میں شیریں بیانی ان کی خصوصیت ہے۔ان کے ناول ''امراؤ جان ادا کو ایک طوائف کی سوانح عمری کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے علاوہ بہرام کی رہائی۔شریف زادہ خونی عاشق۔اختری بیگم۔خونی بھید۔خونی شہزادہ۔ذات شریف۔ڈرامالیلیٰ مجنوں۔خونی جوروا ور مثنوی۔امید و بیم لکھی۔اقبال کی رحلت سے صرف سات سال قبل 1931ء میں بمقام لکھنو انتقال ہوا۔عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں بھی ملازم رہے۔ان کی ناول نگاری کی وجہ سے اردو میں اس صنف کو ایک نئے موضوع سے آگاہی حاصل ہوئی۔

25.3.5 منشی فیاض علی ایڈوکیٹ

امتیاز علی کے صاحبزادے فیاض علی فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔دس برس کی عمر میں علی گڑھ بھیج دیا گیا۔جہاں سے انٹرنس اور ایف۔اے پاس کیا۔16 برس کی عمر میں ایف۔اے امتیاز سے پاس کرنے پر گورنمنٹ سے بی۔اے اسکالرشپ ملی۔ایل ایل بی تک تعلیم حاصل کی اور والدہ کے ہمراہ وکالت شروع کی۔انگریزی اور اردو رسالوں میں مضامین لکھے۔وکالت کے دوران ناول ''شمیم'' تحریر کیا۔1937ء میں دوسرا ناول ''انور'' لکھا۔ان دو ناولوں کی وجہ سے منشی فیاض علی شہرت رکھتے ہیں اور ان کو علامہ اقبال کے دور کے ناول نگار کا درجہ حاصل ہے۔اقبال کی رحلت کے بعد بھی فیاض علی کے سماجی ناولوں کی شہرت تھی۔

علامہ اقبال کے عہد کے دوسرے ناول نگاروں میں حکیم محمد علی طیب جن کے مشہور ناول گورا۔عبرت۔اختر وحسینہ۔نیل کا سانپ۔حسنِ سدور۔رام پیاری اور دیول دیوی ہے۔مرزا محمد سعید دہلوی ایم۔اے آئی ای ایس کے ناول ''خواب ہستی اور یاسمین ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے ''مذہب اور باطنی تعلیم'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔قاضی سرفراز حسین کے ناول شاہد رعنا۔خمار عیش۔سزائے عیش۔سعادت۔سراب عیش۔انجام عیش۔سعید۔ ثروت دلہن اور بہار عیش ہیں۔مولوی مظہر الدین نے شیر دل خاتون۔سندھ کی راجکماری۔ظلمات کا دیوتا۔کامنی اور گجرات کی حسینہ جیسے ناول تحریر کیے۔ بیگم مرزا احمد علی کا ناول ''ماہ درخشاں'' شائع ہوا۔خلیل الرحمٰن کا ناول عذرا۔فدا علی کا ناول۔بس کا روگ۔سجاد مرزا بیگ کا ناول 'تمنائے دید' لطافت حسین کا ترجمہ ''دختر فرعون''۔چودھری افضل حق کا ناول ''زندگی''۔کشن پرشاد کول کا ''شاما''۔امین الدین کا ناول ''فانوسِ خیال''۔منشی عبدالغفور کا ناول ''حق بہ حقدار'' عبدالمجید حیرت کا ترجمہ شدہ ناول ''بنی اسرائیل کا چاند' محمود خاں محمود کا تاریخی ناول ''حیدر علی''۔ظہور احمد وحشی کا ترجمہ شدہ ناول ''حجاج بن یوسف'' شائع ہوا ۔اس کے علاوہ بے شمار مترجمین نے جرجی زیدان۔آرتھر کانن ڈائل۔وکٹر ہیوگو۔بروس کولیم۔رائیڈر ہیگر کے ناولوں کے ترجمے کر کے اردو ناول نگاری کی صنف میں اضافہ کیا۔اقبال کے عہد کا اردو داں طبقہ ان تمام ناول نگاروں کی تحریروں سے مستفید ہو رہا تھا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. عہد اقبال کے ناول نگاروں کے نام بتایئے۔
2. عہد اقبال کے چند اہم ناولوں کے نام لکھیے۔

25.4 عہد اقبال میں مختصر افسانہ

اقبال کے عہد میں جس طرح ناول کو فروغ حاصل ہوا۔ اسی طرح افسانہ کی صنف میں بھی ترقی ہوئی۔ اگر چہ اقبال کے عہد تک اردو میں افسانہ نگاروں کی تعداد کم تھی لیکن ایک صنف کی حیثیت سے افسانہ کی مقبولیت کا آغاز ہو چکا تھا۔ اقبال کے عہد میں ہی ترقی پسند تحریک کے نتیجے میں دوسری نثری اصناف کی طرح افسانہ کو بھی اعتبار کا درجہ حاصل ہوا لیکن ترقی پسند تحریک کے آغاز کے دو سال کے اندر ہی علامہ اقبال کی وفات ہوگئی۔ اقبال کے عہد کے اہم افسانہ نگاروں میں منشی پریم چند۔ سدرشن۔ سجاد حیدر یلدرم۔ اعظم کریوی۔ علی عباس حسینی کے نام لیے جاتے ہیں۔ جنھوں نے افسانے کی صنف میں عشق و عاشقی کے بجائے زندگی کی حقیقتوں کو شامل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ افسانہ ایک ایسی صنف ہے جو زندگی کے ہر رویے کے اظہار کا سلیقہ رکھتا ہے اور اس میں بیانیہ کی اس قدر طاقت ہے کہ متاثر کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

25.4.1 منشی پریم چند

بیسویں صدی کی ابتدا میں عصری حسیت، حقیقت پسندی اور عوامی زندگی کو ادب سے قریب کرنے والے قلم کاروں میں منشی پریم چند کا شمار ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت اردو کے افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ناول نگار بھی ہیں۔ بنارس کے قریب واقع گاؤں لمہئی میں 31 جولائی 1880ء کو پریم چند کی ولادت ہوئی۔ ان کے والد منشی عجائب لال ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ انھوں نے چچا کا دیا ہوا نام نواب رائے بھی پسند کیا۔ پریم چند نے گاؤں کے ماحول میں ابتدائی زندگی گزاری۔ آٹھ برس کی عمر میں والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور ان کے والد نے دوسری شادی کر لی۔ ملازمت کے سلسلے میں جب پریم چند کے والد کا تبادلہ گورکھپور میں ہوا تو پریم چند کو وہاں پرچھٹی جماعت میں داخلہ دیا گیا۔ بنارس سے انٹر پاس کیا اور محکمۂ تعلیمات میں ملازمت کر لی۔ 1901ء میں رسالہ ''زمانہ'' میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ 1904ء میں ناول ''ہم خرما و ہم ثواب''، ''جلوۂ ایثار'' 1912ء میں اور ''بازار حسن'' 1918ء میں تصنیف کیا۔ 1921ء میں تحریک آزادی میں حصہ لینے کے لیے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ 1903ء میں بنارس کے ہفتہ وار ''آوازۂ خلق'' میں ایک ناول ''اسرار معابد'' سلسلہ وار لکھنا شروع کیا۔ پریم چند کا پہلا افسانہ ''دنیا کا انمول رتن'' 1907ء میں شائع ہوا۔ 1909ء میں ان کے افسانوں کا مجموعہ ''سوز وطن'' شائع ہوا جس کو حکومت نے ضبط کر لیا تو انھوں نے پریم چند کے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا اور اسی نام سے ماہنامہ ''زمانہ'' کانپور میں ان کا افسانہ ''بڑے گھر کی بیٹی'' شائع ہوا۔ 1936ء میں ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس کی صدارت کی اور اسی سال لاہور میں ''آریا پرتھی ندھی سبھا'' میں شامل ہوئے۔ 8 اکتوبر 1936ء کو 56 سال کی عمر میں انتقال کیا۔ پریم چند کے افسانوں کے مجموعے ''سوزِ وطن''۔ ''پریم پچیسی'' حصہ اول و دوم ''پریم بتیسی''۔ ''پریم چالیسی'' حصہ اول و دوم۔ ''آخری تحفہ''۔ ''زادِ راہ''۔ ''دودھ کی قیمت'' اور آخری مجموعہ ''واردات'' 1938ء میں شائع ہوا۔ پریم چند کی افسانہ نگاری میں اس وقت کے سماجی، معاشرتی اور سیاسی حالات کی جھلکیاں موجود ہیں اور انھوں نے اپنے افسانہ کو زندگی سے قریب لا کر لازوال کر دیا ہے۔ ان کے ناول ''میدان عمل''۔ پردۂ مجاز۔ چوگانِ مستی۔ غبن۔ نرملا۔ فردوس خیال۔ جلوۂ ایثار۔ گوشۂ عافیت اور گئودان کے توسط سے ناول کے فن پر ان کی دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔

25.4.2 سجاد حیدر یلدرم

سید سجاد حیدر یلدرم کے آبا و اجداد وسط ایشیا سے ہندوستان آئے تھے۔ یلدرم 1888ء میں بمقام نہٹور ضلع بجنور پیدا ہوئے۔ جب یلدرم سنِ شعور کو پہنچے تو والد نے انھیں علی گڑھ بھیج دیا۔ 1897ء میں انھوں نے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا اور تبھی ترکی زبان سے رغبت پیدا ہوئی۔ اس دور میں علی گڑھ کالج، الٰہ آباد یونیورسٹی سے ملحق تھا۔ چنانچہ 1901ء میں یلدرم نے بی۔ اے کیا۔ ترکی کے سفارت خانۂ عراق میں ایک ترجمان کی جگہ خالی تھی تو علی گڑھ کالج کے پرنسپل کی سفارش پر یلدرم کا تقرر ہو گیا۔ بچوں کی تعلیم کے لیے لکھنؤ منتقل ہوئے اور 13 اپریل 1942ء کو انتقال ہوا۔ علامہ اقبال سے عمر میں

11 سال کم تھے اور اقبال کی رحلت کے چار سال بعد فوت ہوئے۔ سجاد حیدر یلدرم ایک کامیاب مترجم اور ترجمہ نگاری کے اصولوں سے واقف تھے۔ انھوں نے ترکی افسانوں کے اردو ترجموں کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے سب سے پہلے ترکی قلم کار خلیل رشدی کے افسانے کا ترجمہ ''نشے کی پہلی ترنگ'' کے نام سے کیا۔ ترکی کے مشہور مصنف نامق کمال کے ڈرامے ''جلال الدین خوارزم شاہ'' کو اردو میں منتقل کیا۔ ترکی کے ناول نگار احمد حکمت کی پہلی کہانی کا ''ثالث بالخیر'' کے زیر عنوان ترجمہ کیا۔ احمد حکمت کی کہانیوں کے مجموعے ''خارستاں وگلستاں'' کو اردو جامہ پہنایا۔ یلدرم کی تصنیف ''خیالستان'' کے چار افسانے بقول یلدرم ترکی سے ماخوذ ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں اور انشائیوں سے ادبِ لطیف کے نقوش ابھارے ہیں۔ اس کے علاوہ ''حکایات واحساسات'' ۔ ''پرانا خواب'' ۔ ''جنگ وجدال'' اور ''زہرہ'' جیسی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترکی ناول' افسانے اور ڈراموں کے ترجمے کر کے یلدرم نے اردو نثر کے دامن کو وسیع کیا۔

25.4.3 سدرشن

علامہ اقبال کے معاصر قلم کاروں میں سدرشن ایک ایسے نثر نگار ہیں جنھوں نے افسانہ نگاری کی وجہ سے نثر میں نام کمایا۔ ان کے افسانوں میں حقیقت پسندی' وطنیت کے جذبے کے علاوہ انسانی فطرت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ علامہ اقبال کی پیدائش کے سولہ سال بعد سدرشن کی پیدائش 1895ء میں پنجاب میں ہوئی۔ ان کے آباء واجداد کشمیر سے سیال کوٹ آ گئے تھے۔ سدرشن ایک برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کا اصلی نام پنڈت ہوری ناتھ تھا۔ پانچ سال کی عمر میں اسکول میں داخل ہوئے اور اینگلو ورنا کولر اسکول سیال کوٹ سے مڈل کی سند حاصل کی۔ مشن کالج سیال کوٹ سے ہائی اسکول اور ایف۔ اے پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ تیرہ سال کی عمر میں افسانہ نگاری شروع کی۔ ان کا پہلا افسانہ ''سدا بہار پھول'' شائع ہوا۔ وہ آریہ سماج سے وابستہ تھے۔ 1915ء میں مثالہ شریف کے ایک معزز گھرانے میں لیلاوتی سے شادی کی۔ 1913ء میں سیالکوٹ سے لاہور آئے۔ اخبار ''دیش'' کی مجلس ادارت میں شامل ہوگئے۔ 1916ء میں ہفتہ وار اخبار ''چندر'' نکالا لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہوگیا۔ احمد شجاع کے اخبار ''حق'' کی ادارت کی۔ 1927ء میں لاہور سے کانپور آ گئے اور لال املی اون فیکٹری میں ملازمت کر لی۔ 1930ء میں لال املی ملازمت سے علیحدہ کر دیے گئے۔ بنارس سے رسالہ ''ہنس'' اور 1981ء میں رسالہ ''کندن'' جاری کیا۔ 1932ء میں سدرشن کلکتہ پہنچے اور 1939ء میں تھیٹریکل کمپنی میں ماہانہ تنخواہ پر ڈرامے لکھنے لگے۔ انھوں نے اپنا ڈراما ''مزدور'' پیش کیا جو بے حد مقبول ہوا۔ انھوں نے فلموں میں کہانیاں لکھیں۔ ''رامائن'' ۔ ''دھوپ چھاؤں'' ۔ ''پتھروں کا سوداگر'' ۔ ''گرام فون سنگر'' ۔ ''پردیسی'' ۔ ''سکندر'' اور ''چندر ریکھا'' ان کی یادگار فلمیں ہیں۔ بمبئی میں سکونت اختیار کی اور 6 دسمبر 1967ء کو انتقال ہوا۔ اقبال کی رحلت کے زائد از 29 سال زندہ رہے

سدرشن نے ناول بھی لکھے' افسانے بھی تحریر کیے اور ڈرامے بھی پیش کیے۔ ان کے مضامین کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے ناولوں میں پتھروں کا سوداگر۔ گناہ کی بیٹی۔ راج سنگھ۔ قدرت کا کھیل۔ بے گناہ مجرم اور کنج عافیت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے افسانوں میں ''گل خارستان۔ رشوت کا روپیہ۔ آزمائش۔ تھوڑا سا جھوٹ شہری زندگی کے نمائندہ ہیں۔ دیہاتی زندگی پر مبنی افسانے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی کہانیوں کے مجموعے سولہ سنگار۔ سدا بہار پھول۔ صبح وطن۔ چندن۔ بہارستان۔ بنگال بتیسی۔ قوس قزح۔ من کی موج اور چشم وچراغ اہمیت کے حامل ہیں جب کہ ان کے ڈرامے ''محبت کا انتقال'' ۔ ''اندھے کی دنیا'' ۔ ''سنگیت'' ۔ ''مہابھارت'' ۔ ''رشی دیانند'' ۔ ''راجپوت کی شکست'' ۔ ''چھایا'' ۔ ''رستم سہراب'' ۔ ''گناہ کا پرائشچت کنڈ'' مشہور ہیں۔ ان کے مضامین ''چٹکیاں'' ۔ ''من کی موج'' ۔ ''امرت'' ہمارے رشی کے پیاری باتیں'' ۔ ''پاس'' ۔ ''پھول وتی'' اور ''پریم چالیسی'' قابل مطالعہ ہیں اور انھوں نے 1922ء میں ''تذکرہ گلدستہ سخن'' بھی مرتب کیا۔ دیہاتی اور شہری زندگی کی موثر نمائندگی کی وجہ سے سدرشن اردو ناول اور افسانہ نگاری میں انفرادی مقام رکھتے ہیں۔

25.4.4 علی عباس حسینی

علی عباس حسینی کی پیدائش 31 فروری 1898ء کو بمقام پارہ ضلع غازی آباد ہوئی۔ ان کا بچپن کھیت کھلیان اور گاؤں کے ماحول میں گزرا۔ گیارہ سال کی عمر میں مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ میں داخل ہوئے۔ بچپن میں والد کے کتب خانے سے استفادہ کر کے کئی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ 1915ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا پھر لکھنؤ کے کرسچین کالج میں تدریس کی منزلیں طے کیں۔ 1917ء میں ایف۔ اے اور اس کے بعد کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کامیاب

کیا۔وہ اپنے گاؤں کے پہلے گریجویٹ تھے۔الہ آباد کے ٹریننگ کالج میں 1921ء میں ایل ٹی کر کے گورنمنٹ اسکول رائے بریلی میں انگریزی اور تاریخ کے معلم مقرر ہوئے۔وہ مختلف تعلیمی اداروں میں برسر خدمت رہے۔1941ء میں حسین آباد انٹر کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ 3 جون 1954ء کو پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔فلموں کے لیے کچھ کہانیاں لکھنے کی کوشش کی۔ممبئی کا سفر کیا لیکن اس کام سے مطمئن نہ ہو سکے اور دہلی چلے آئے۔دل کے مریض تھے صحت خراب رہنے لگی۔27 ستمبر 1969ء کی صبح کو داعی اجل کو لبیک کہا۔طالب علمی کے زمانے سے ہی مغربی فکشن کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا تھا۔پریم چند کے انداز میں افسانہ لکھنے کی بنیاد رکھی۔پہلا افسانہ ''پژمردہ کلیاں'' 1918ء میں شائع ہوا۔علی عباس حسینی کے افسانوں کے مجموعے'' رفیق تنہائی۔باسی پھول۔گومتی۔ایک حمام میں۔ہمارے گاؤں۔آئی سی یس۔کچھ نہیں ہے۔پھولوں کی جھڑی۔گائے امان۔سیلاب کی راتیں اور ''ندیا کے کنارے'' ہیں۔انھوں نے دوسو سے زائد افسانے لکھے۔ابتدائی دور کی افسانہ نگاری پر رومانیت کا غلبہ ہے۔آغاز میں اصلاع کی دیہی زندگی کو پیش کیا۔ان کے افسانے ''آئی سی یس'' اور ''باسی پھول'' میں حقیقت پسندی نمایاں ہے وہ زندگی اور اس کی تلخ حقیقتوں کے مصور محسوس ہوتے ہیں۔علی عباس حسینی نے اپنی افسانہ نگاری کو بدلتے ہوئے میلانات سے ہم آہنگ کر کے اپنی عصری حسیت کا ثبوت دیا ہے۔''ایک حمام میں'' اور ''سیلاب کی راتیں'' میں ان کی حقیقت نگاری عریانیت کی حدوں کو چھو لیتی ہے۔اگست 1964ء میں ان کے افسانوں کا آخری مجموعہ ''ندیا کنارے'' شائع ہوا۔علی عباس حسینی کے ناول'' سید احمد پاشاہ'' یا ''قاف کی پری''۔''شائد کے بہار آئی۔''حکیم بانا'' یا ''انیٹوں کا بادشاہ 1919ء سے لے کر 1955ء تک کے عرصے میں لکھے گئے جن میں مختلف اسالیب موجود ہیں۔ان کے ڈراموں کا مجموعہ ''نورتن'' 1943ء میں شائع ہوا جو نو ڈراموں پر مشتمل ہے۔وہ ڈرامے کے فن سے خوب واقف تھے۔ان کی دیگر کتابیں ''ناول کی تاریخ وتنقید'' 1947ء میں شائع ہوئی۔''تذکرہ اردو مرثیہ'' انتقال کے بعد شائع ہوئی۔مشہور امریکی فلسفی ڈیوڈ تھورو کی کتاب ''والڈن'' کو انھوں نے اردو میں منتقل کیا۔عرض عہد اقبال کے ایک باشعور ناول' افسانہ نگار' ڈرامہ نویس' محقق اور مصنف کی حیثیت سے علی عباس حسینی کی خدمت نا قابل فراموش ہیں۔اقبال کی رحلت 31 سال بعد تک وہ حیات رہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. عہد اقبال کے افسانہ نگاروں کے نام لکھیے۔
2. اقبال کے عہد کے چند اہم افسانوں کے نام بتایے۔

21.5 عہد اقبال میں اردو ڈراما

سید آغا حسن امانت کی ''اندر سبھا'' کو ابتدائی دور میں شہرت حاصل ہو چکی تھی۔اسی کی پیروی اور اتباع میں اقبال کے ابتدا عہد تک کئی اندر سبھائیں لکھی گئیں۔اس دور میں مداری لال کی اندر سبھا کو فروغ حاصل ہوا۔کانپور کے شیخ فیض بخش نے ڈرامے کی حمایت میں ڈھاکہ کے قیام کے دوران نوابین ڈھاکہ کی سرپرستی میں اردو اسٹیج کا آغاز کیا جس میں محلہ سانچی مندر کے ارباب نشاط اور موسیقاروں نے مدد کی۔شیخ امام بخش کانپوری کا ڈراما ''ناگر سبھا'' کافی مقبول ہوا۔نواب علی نفیس کانپوری نے بھی ڈرامے کی ترقی میں مدد کی۔شیخ فیض بخش کی ذاتی کمپنی ''فرحت افزا تھیٹریکل کمپنی'' کے توسط سے اسٹیج ڈرامے کو فروغ ہوا۔اس کے ڈراما نگار نفیس کانپوری تھے اس کمپنی کے ذریعے تیس بتیس ڈرامے اسٹیج کیے گئے۔ماسٹر احمد حسن وافر کے ڈرامے ''بلبل بیمار'' کی پیش کش سے اردو ڈراما میں ایک نیا موڑ آیا۔1861ء سے بمبئی میں تھیٹریکل کمپنی کا وجود تھا۔اقبال کی پیدائش سے پانچ سال قبل 1872ء میں وکٹوریہ تھیٹر میں ''بے نظیر و بدر منیر'' اسٹیج کیا گیا۔اسی دور میں کنور جی ناظر یہ چاہتے تھے کہ طلسماتی اور حیرت ناک ڈرامے دکھائے جائیں۔انھوں نے ''الہ دین اور اس کا چراغ'' پیش کیا۔پارسیوں کی کئی تھیٹریکل کمپنیوں سے اس وقت تک مہدی حسن احسن لکھنوی' آغا حشر کاشمیری' اور بیتاب بنارسی جیسی ادبی ہستیاں وابستہ ہو چکی تھیں۔بمبئی۔دہلی۔آگرہ۔حیدر آباد۔کلکتہ۔بریلی۔لاہور اور ٹونک میں کئی تھیٹریکل کمپنیاں قائم ہو چکی تھیں جو ڈرامے کی ترقی میں حصہ لے رہی تھیں۔ممبئی کی تھیٹریکل کمپنیوں میں اور یجنل تھیٹریکل کمپنی (پسٹن جی فرام) وکٹوریہ ناٹک کمپنی (خورشید جی باٹلی والا) الفریڈ تھیٹریکل کمپنی اور اولڈ پارسی تھیٹریکل کمپنی قائم تھیں۔دی راجپوتانہ مالوہ تھیٹریکل کمپنی (جودھپور) لائٹ آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی (آگرہ) بے نظیر اسٹار آف تھیٹریکل کمپنی (آگرہ۔علی گڑھ) انڈین امپریل تھیٹریکل کمپنی (فتح پور) دی مون آف انڈیا تھیٹریکل کمپنی (حیدر آباد) مشہور تھیں۔شکسپیرین تھیٹریکل کمپنی (ممبئی) پارسی الگو بینڈر تھیٹریکل کمپنی (دہلی) سوریہ وجے ناٹک کمپنی (بریلی) گلوب تھیٹر آف پنجاب لاہور) اور سرکاری تھیٹریکل کمپنی (ٹونک) وغیرہ کمپنیوں کا

سلسلہ 1936ء تک ختم ہوگیا۔ان کمپنیوں میں منشی کی حیثیت سے رونق بنارسی ۔ جناب رامپوری اور طالب بنارسی جیسے قلم کار وابستہ تھے ۔مرزا شوق کے نواسے ''احسن'' میں نرائن پرشاد بے تاب۔ محشر انبالوی۔ آرزو لکھنوی۔نشتر اور احمد شجاع کے نام بطور ڈراما نگار قابل ذکر ہیں ۔آغا حشر کے بعد میر غلام علی نے تیس ڈرامے قلم بند کیے ۔محشر انبالوی اور آرزو لکھنوی نے بھی ڈراما نگاری میں شہرت حاصل کی یہ تمام ڈراما نگار اقبال کے عہد کی ڈراما نگاری کی نمائندگی کرتے ہیں۔

25.5.1 آغا حشر کاشمیری

اردو ڈراما نگاری کے شیکسپیر کی حیثیت سے مشہور آغا حشر کاشمیری کی تاریخ پیدائش یکم اپریل 1876ء بتائی جاتی ہے ۔ان کے والد کا نام غنی شاہ تھا۔ان کا نام آغا محمد شاہ اور آبائی وطن کشمیر تھا۔اپنے والد سے ابتدائی اردو، عربی اور فارسی زبانیں سیکھیں ۔باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بنارس کے ''راج نرائن ہائی اسکول'' میں داخلہ لیا۔سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں شاعری شروع کی ۔ 1897ء میں جب بمبئی کی الفریڈ تھیٹریکل کمپنی بنارس آئی ۔آغا حشر نے مہدی حسن احسن کا لکھا ہوا۔ڈراما ''چندراولی'' دیکھا اور اسی انداز میں ایک ڈراما ''آفتاب محبت'' لکھا۔جسے رد کر دیا گیا۔اپنے والد کے ہمراہ بمبئی آنے کے بعد آغا حشر نے ''مرید شک'' ڈراما 1899ء میں لکھا۔ جو اسٹیج کے جانے کے بعد بہت مقبول ہوا۔ 1901ء میں انھوں نے ڈراما ''اسیر حرص'' مکمل کیا۔1910ء میں وہ حیدر آباد پہنچے اور اپنی ذاتی ڈراما کمپنی قائم کی ۔اسی دوران ''سلور کنگ عرف نیک پروین'' تحریر کیا اور یہ ڈراما ''جرم وفا'' کے نام سے اسٹیج کیا گیا۔انھوں نے بہت جلد ڈراما کمپنی بند کر دی اور سہراب جی کی فرمائش پر تازہ ڈراما ''خود پرست'' لکھا جو ''باپ کا قاتل'' کے نام سے اسٹیج کیا گیا۔اصلاحی ڈراما ''نعرۂ توحید عرف شیر کی گرج'' تحریر کیا۔مدھر مرلی، بھاگیرت گنگا، ترکی حور اور آنکھ کا نشہ تحریر کیا۔1924ء میں بنارس آئے اور ''سیتا بن باس'' ڈراما پیش کیا۔1935ء کو مختصر سی علالت کے بعد انتقال کیا۔ان کے ڈراموں میں ''خوبصورت بلا'' اور ''یہودی کی لڑکی'' نا قابل فراموش ہیں۔

25.5.2 حکیم احمد شجاع

حکیم احمد شجاع کی تاریخ پیدائش 1893ء بتائی گئی ہے ۔ابتدائی تعلیم اپنے وطن لاہور میں حاصل کی ۔اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ کا رخ کیا۔تعلیم سے فارغ ہو کر وطن واپس ہوئے ۔وہ آغا حشر کے مداحوں اور قدر دانوں میں سے تھے ۔کالج کے زمانے میں چند ڈرامے لکھے ۔باقاعدہ ڈراما نگاری کا آغاز 1918ء میں کیا۔ان کے ڈرامے ''حسن کی قیمت''۔''باپ کا گناہ''۔''بھیشم پرتگیا''۔''آخری فرعون''۔''جانباز'' اور ''بھارت کا لال'' اور ''دلہن'' وغیرہ ہیں ۔گورنمنٹ کالج لاہور کی جانب سے ان کے ڈرامے ''مینا''۔''سنتوش'' اور ''تارا'' ترجمہ کر کے اسٹیج کیے گئے ۔ان کا پہلا ڈراما میلو ڈرامے کے انداز پر ہے جو آغا حشر کے تعاون سے اسٹیج بھی کیا گیا اور اس کی اشاعت بھی عمل میں آئی ۔ان کے ڈراموں میں اس عہد کی تہذیبی جھلک موجود ہے جب 1921ء میں میڈن تھیٹر کے پارسی سیٹھ نے آغا حشر سے ڈرامے لکھنے کی خواہش کی تو انھوں نے اپنے شاگرد حکیم احمد شجاع کی سفارش کی ۔چنانچہ انھوں نے کئی تھیٹریکل کمپنیوں کے لیے ڈرامے لکھے اور مقبولیت حاصل کی۔

25.5.3 سید مہدی حسن احسن

میر حسن جو اودھ کی شاہی فوج میں ملازم تھے ۔ان کے صاحبزادے سید مہدی حسن احسن کو شعر گوئی میں شہرت حاصل ہوئی اور وہ احسن لکھنوی کے نام سے مشہور ہوئے ۔نواب مرزا شوق کے بھائی حکیم نواب میر آغا حسن ازل نہ صرف مہدی حسن کے نانا تھے بلکہ ان کی تربیت میں معاون ہوئے ۔ان کے مکان کے قریب ''افضل محل'' تھا جہاں پارسی کمپنیاں ڈرامے اسٹیج کیا کرتی تھیں ۔وہ وہاں جاتے اور ڈرامے دیکھنے کی وجہ سے کم سنی سے ہی ڈرامے کا شوق ہوگیا۔ 1897ء میں الفریڈ کمپنی کے مستقل ڈراما نگار بن گئے ۔ان کا پہلا اسٹیج کیا جانے والا ڈراما ''چندراولی'' تھا۔انھوں نے انگریزی ڈراموں کی لطافت اور جاذبیت کو اردو والوں سے روشناس کروانے کے لیے شیکسپیر کے ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا۔احسن لکھنوی نے '' ہیملٹ'' کا ترجمہ ''خون ناحق''۔''رومیو جیولٹ'' کا ترجمہ ''گلنار فیروز'' اور ''کومیڈی آف ایرز'' کا ترجمہ ''بھول بھلیاں'' کے نام سے کیا۔''میکبیتھ'' کا ترجمہ بھی کیا۔ان کی سادہ اور عام فہم زبان نے ڈراموں کو بڑی مقبولیت بخشی ۔ان کے طبیفرادڈرامے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ۔''چندراولی''۔''چلتا پرزہ''۔''کنک تارا''۔''شریف بدمعاش''۔''گن سندری'' اور ''سیتا ہرن'' سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں ڈراما نگاری میں خاص مہارت حاصل تھی ۔انھوں نے شوق کی مثنوی ''زہر عشق'' سے ماخوذ ڈراما ''دستاویز محبت'' تحریر کیا۔احسن کے ڈرامے ابتدائی دور کی ڈراما نگاری کی بہت سی کوتاہیوں سے پاک ہیں ۔فنی اور ادبی اعتبار سے ان کے ڈرامے اپنے دور کے ترقی یافتہ ڈراموں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

25.5.4 نرائن پرشاد بیتاب

بلند شہر کے ایک موضع میں پیدا ہونے والے نرائن پرشاد بیتاب کے والد کا نام مہاراج ڈھالا رے تھا۔ انھوں نے حکیم سردار محمد خاں طالب سے اردو، فارسی پڑھی اور پنڈت ستیش چندر وید سے ہندی سیکھی۔ وہ سنسکرت بھی جانتے تھے۔ وہ اپنی مٹھائی کی دکان پر کام بھی کرتے اور تعلیم بھی حاصل کرتے تھے۔ کم عمری ہی سے بیتاب کو شعر گوئی کا شوق تھا۔ دہلی میں اپنے رشتہ دار پربھودیال کے پاس پہنچے تو اپنی زبان کو نکھارنے کا موقع ملا۔ منشی نظیر حسین سخا سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ بیتاب کو اپنے استاد کے ساتھ تھیٹریکل کمپنیوں میں جانے کا موقع ملا۔ جس کی وجہ سے ڈرامے سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ انھوں نے الفریڈ کمپنی کے لیے 1901ء میں ڈراما ''قتل نظیر'' اور 1902ء میں ''حسن فرنگ'' لکھا جسے پسند کیا گیا۔ یہ ڈرامے اسٹیج بھی ہوئے۔ احسن لکھنوی کے بعد وہ الفریڈ کمپنی میں ڈراما نگار کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ اسٹیج کے زوال کے بعد بولتی فلمیں متعارف ہوئیں۔ انھوں نے فلم سے وابستگی اختیار کی۔ انھوں نے بمبئی سے ''شیکسپیئر'' کے نام سے ماہنامہ جاری کیا۔ ان کے مشہور ڈرامے۔ قتل نظیر۔ زہریلا سانپ۔ میٹھا زہر۔ امرت اور گورکھ دھندا ہیں۔ ہندی ڈراموں میں کرشن اوتار۔ رامائن۔ پتنی پرتاب۔ کرشن سدھاما۔ گنیش جنم۔ شکنتلا۔ مدرانڈیا اور مہابھارت ہیں۔ وہ ڈراما نگاری میں خود کو آغا حشر کاشمیری سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ بمبئی میں ہی انتقال کیا۔ وہ اقبال کے عہد کے ڈراما نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش اور وفات کا علم نہیں لیکن ان کے ڈراموں کی تاریخ سے نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا تعلق اقبال کے عہد سے تھا اور انھوں نے شعر گوئی کے علاوہ ڈراما نگاری کی طرف خصوصی توجہ دی۔

25.5.5 امتیاز علی تاج

اردو ڈراما نگاری کی تاریخ میں امتیاز علی تاج کو بلند مقام حاصل ہے۔ وہ 13، اکتوبر 1900ء کو لاہور کے ایک ذی علم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اس اعتبار سے وہ اقبال سے 23 سال چھوٹے تھے۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے 1922ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ تاج کے والد نے ''تہذیب نسواں'' رسالہ جاری کیا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد تاج نے ''تہذیب نسواں'' کی ذمہ داری قبول کی۔ 1918ء میں ''کہکشاں'' رسالہ جاری کیا جس میں پریم چند کے افسانے شائع ہوئے۔ 1922ء میں ہی تاج کا مشہور ڈراما ''انارکلی'' عالم وجود میں آیا۔ اسے پہلی بار لاہور سے 1932ء میں شائع کیا گیا۔ امتیاز علی تاج نے نثریات میں کمال حاصل کیا چنانچہ ان کے نثری ڈرامے ''قرطبہ کا قاضی''۔ ''گونگی جورو''۔ ''ورجینا''۔ ''خوشی''۔ ''حریم قلب''۔ ''صرف کانوں کے لیے''۔ ''شیخ برادران''۔ ''اصفہان کے متشاعر''۔ ''الو کی زبان''۔ ''صید وصیاد''۔ ''امن وسکون''۔ ''کمرہ نمبر 5'' اور ''ان کے ابا'' ریڈیو سے نشر ہوئے۔ وہ 1958ء میں ''مجلس ترقی ادب'' کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ ''بزم اقبال'' کے معتمد اعزازی بھی رہے۔ انھیں حکومت پاکستان کا اہم اعزاز ''ستارۂ امتیاز'' عطا کیا گیا۔ امتیاز علی تاج نے ''شاہ جہاں'' اور ''روشن آراء'' ڈرامے بھی تحریر کیے لیکن ''انارکلی'' ڈرامے کی وجہ سے انھیں شہرت حاصل ہوئی۔ انھوں نے شعر گوئی بھی کی۔ وہ کثیر التصانیف نثر نگار ہیں۔ ''اسکول کی کہانیاں۔ ابوالحسن۔ بونوں کی دنیا۔ بیربل کی کہانیاں۔ خزانوں کی کہانیاں۔ خانہ بدوشوں کی کہانیاں۔ سانپوں کی کہانیاں۔ جنوں کی کہانیاں۔ طلسمات کی کہانیاں۔ کنجوسوں کی کہانیاں۔ سمندری شہزادہ۔ بچوں کی بہادری۔ پرستان۔ پھول باغ۔ پھولوں کی کلیاں۔ چڑیا خانہ۔ جامعہ کا برج۔ جھوٹ موٹ کا بھوت۔ کمک اردو۔ موت کا راگ۔ ہیبت ناک افسانے اور چچا چھکن ان کی نثری یادگاریں ہیں۔ وہ کلاسیکی ڈراموں کو مرتب کر کے منظر عام پر بھی لائے۔ طالب علمی کے زمانے سے امتیاز علی تاج کو تھیٹر سے دلچسپی تھی چنانچہ انھوں نے زبانی روایت پر مبنی ایک قصے کو ''انارکلی'' میں پیش کیا۔ 1922ء میں ان پر رومانویت کا غلبہ تھا۔ وہ ایک ڈراما نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ کسی نے انھیں 9 اپریل 1970ء کی رات کو حملہ کر کے قتل کر دیا جب کہ وہ محو خواب تھے۔ اردو ڈراما نگاری کے امتیاز علی تاج بے تاج بادشاہ ہیں۔ مختلف تھیٹریکل کمپنیوں نے ''انارکلی'' کو اسٹیج کرنے کے لیے مختلف تبدیلیوں کی خواہش کی تھی لیکن امتیاز علی تاج نے مناسب نہیں سمجھا۔ اسٹیج کی صلاحیتیں نہ رکھنے کے باوجود بھی ''انارکلی'' اردو ڈرامے کی تاریخ میں اہمیت کا حامل ہے اور عہد اقبال کے نثر نگاروں میں امتیاز علی تاج کو ایک ڈراما نگار کی حیثیت سے اہمیت حاصل ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. اقبال کے دور کے چند اہم ڈراما نگاروں کے نام بتائیے۔
2. اقبال کے عہد کے چند اہم ڈرامے کون سے ہیں؟

25.6 عہد اقبال میں غیر افسانوی نثر

اقبال نے جس دور میں زندگی گزاری۔اس عہد میں اردو نثر کا ارتقا عمل میں آ چکا تھا۔قصہ کہانی کی نثر کو افسانوی نثر کی حیثیت کا درجہ حاصل تھا اور دنیا کی حقیقتوں کو بیان کرنے والی نثر کو غیر افسانوی نثر کی حیثیت سے مقبولیت حاصل ہو چکی تھی اور بے شمار قلم کار سوانح نگاری، مضمون نویسی، انشائیہ نگاری، خطوط نویسی، خودنوشت، سفرنامے، صحافت، تحقیق وتنقید اور طنز ومزاح کے ذریعے اپنے فن کے جوہر دکھا رہے تھے۔صحافت کے توسط سے اداریہ نویسی، کالم نگاری، تبصرہ نگاری اور ایسے ہی بے شمار غیر افسانوی اصناف کا عروج ہو چکا تھا۔تاریخ، فلسفہ، منطق، اخلاق اور مذہبیات کے علاوہ جدید علوم وفنون پر کتابوں کی تحریر کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔جہاں غیر افسانوی اصناف کو عروج حاصل ہو چکا تھا وہیں دارالمصنفین، اعظم گڑھ، یوپی۔دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد اور فروغ اردو ادب کے ادارہ سے ہر عصری علوم پر کتابیں شائع ہونے لگی تھیں۔اقبال کے عہد میں ہی حیدرآباد میں انجمن ترقی اردو نے اردو کی نادر ونایاب کتابوں کی اشاعت پر توجہ دی جس کی وجہ سے علم وادب ہی نہیں بلکہ تحقیق وتنقید کے علاوہ صحافتی ادب میں بھی انقلاب رونما ہوا۔اقبال کے عہد میں جن نثر نگاروں نے غیر افسانوی نثر کی نمائندگی کر کے اس دور کے ادب میں بیش بہا اضافے کیے۔ان کے کارناموں کا جائزہ پیش ہے۔

25.6.1 مولانا ابوالکلام آزاد

اردو کے مکتوب نگار۔انشائیہ نگار۔کالم نگار۔صحافی اور تبصرہ نگار کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد کا مرتبہ کافی بلند ہے۔انھوں نے ادب، مذہب، صحافت اور تعلیم کے میدان میں اپنے خیالات پیش کر کے شہرت حاصل کی۔وہ شعلہ بیان مقرر۔انشا پرداز اور کثیر التصانیف ادیب تھے جنھوں نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں حصہ لیتے ہوئے جیل کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔ان کی کانگریس سے وابستگی اٹوٹ رہی۔ایک ادیب کی حیثیت سے وہ غیر افسانوی نثر کے نمائندہ ہیں۔ایک مفسر قرآن ہونے کے علاوہ مکتوب نگار۔مضمون نگار اور صحافی کی حیثیت سے انھوں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔مولانا آزاد کے والد مولوی خیر الدین ممتاز عالم دین تھے اور ان کے مریدین کی کثیر تعداد تھی۔1858ء میں علمائے دہلی کی زبوں حالی دیکھ کر مولوی خیر الدین نے مکہ معظمہ کا رخ کیا جہاں شیخ محمد طاہر وطری کی بھانجی سے خیر الدین کا عقد ہوا اور 1888ء میں مولانا آزاد کی ولادت ہوئی۔ان کا اصلی نام احمد تاریخی نام فیروز بخت لقب ابوالکلام اور تخلص آزاد تھا۔ان کے والد پنڈلی کی ہڈی کے علاج کے سلسلہ میں کلکتہ آئے اور وہیں بس گئے۔یہیں پر مولانا آزاد کی ابتدائی تربیت ہوئی۔عربی، فارسی اور منطق کا درس حاصل کیا۔1905ء میں تعلیمی مشاغل سے فارغ ہو کر موتی پت کے پیشہ ور گویے سے موسیقی سیکھی۔مولانا نے موسیقی پر کتاب ''معارف نغمات'' لکھی۔محمد یوسف جعفری سے انگریزی سیکھی 1908ء میں عراق۔مصر اور شام کا دورہ کیا۔عربی ان کی مادری زبان تھی۔اسی سنہ میں فرانس کا دورہ کیا تو فرانسیسی سیکھی۔13 جولائی 1912ء کو ''الہلال'' جاری کیا۔جس کی مسدودی پر 12 نومبر 1915ء کو ''البلاغ'' جاری کیا۔30 مارچ 1916ء کو انہیں رانچی میں نظر بند کیا گیا۔1920ء میں رہا ہوئے۔مولانا ابوالکلام آزاد کی علمیت اور ذہانت کی دلیل ان کے رسالے الہلال اور البلاغ سے ہی نہیں ملتی بلکہ ان کی کتابیں تذکرہ۔ترجمان القرآن۔غبارِ خاطر اور کاروان خیال بھی اس کی دلیل ہیں۔مولانا آزاد نے مضمون نگاری اور اداریہ نویسی کے ذریعہ سیاست، ادب، مذہب، اخلاق اور تہذیب کے امکانات کو روشن کر دیا۔غرض ایک عالم دین اور مبلغ اسلام کے علاوہ مکتوب نگار۔انشائیہ نگار۔صحافی۔مضمون نگار۔مفسر۔کالم نگار۔تبصرہ نگار اور اداریہ نویس کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو دنیا میں شہرت حاصل کی اور علامہ اقبال کے عہد میں انھیں اردو کے ایک اہم غیر افسانوی نثر نگار کا درجہ حاصل تھا۔مولانا آزاد کا انتقال 22 فروری 1958ء کو دہلی میں ہوا۔ان کی نثر نگاری نے ادب اور صحافت کو بے حد متاثر کیا۔مولانا آزاد کو اسلامی فکر اور جمہوریت کے ایک اہم علمبردار کا درجہ حاصل ہے۔

25.6.2 نیاز فتح پوری

علم وادب کی دنیا میں پانچ دہائیوں سے زیادہ عرصہ تک خدمت انجام دینے والے ادیب، شاعر، نقاد، انشا پرداز، صحافی اور روشن خیال فرد کی حیثیت سے نیاز فتح پوری اہم مقام رکھتے ہیں۔ان کی رومانوی افسانہ نگاری اور کالم نگاری اہمیت کی حامل ہے۔ان کا اصلی نام نیاز محمد خاں اور تاریخی نام لیاقت علی خاں تھا۔فتح پور (یوپی) میں 1887ء کو پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں ہوئی۔اس کے بعد رام پور اور ندوۃ العلما میں تعلیم کی تکمیل کی۔ان کے اساتذہ میں نور محمد۔سید ظہور الاسلام۔فاروق چڑیا کوٹی۔اور وزیر محمد خاں رامپوری مشہور ہیں۔فارسی اور عربی تعلیم کی تکمیل کے بعد ایف۔اے تک انگریزی پڑھی۔پولیس میں سب انسپکٹر کے لیے نامزد ہوئے۔1910ء میں تھانہ ہنڈیا ضلع الہ آباد میں تقرر عمل میں آیا۔سب انسپکٹر کے عہدے سے

سبکدوش ہونے کے بعد ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ مدرسہ اسلامیہ فتح پور سے وابستگی کے بعد 1910ء میں ظفر علی خاں کے جریدہ ''زمیندار'' سے وابستہ ہوئے۔ 1915ء میں بھوپال پہنچے اور گیارہ سالہ قیام کے دوران مشہور کتابیں گہوارۂ تمدن۔ صحابیات۔ مصطفیٰ کمال پاشا۔ تاریخ الدولتیں۔ تاریخ اسلام (ابتداء سے حملۂ تیمور تک) پیش کیں۔ 1927ء میں لکھنؤ منتقل ہوئے۔ 1922ء میں ''یاران بخد'' کے تعاون سے رسالہ ''نگار'' جاری کیا۔ نگار کے خصوصی نمبر آج بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ شہاب کی سرگزشت۔ جمالستان اور نگارستان کے توسط سے انھوں نے جمالیاتی اور رومانوی افسانہ نگاری کی بنیاد رکھی۔ وہ مہاراجہ کشن پرشاد کی مثنوی کو فلسانا چاہتے تھے۔ ''حسن کی عیاریاں'' میں 24 افسانے اور ''مختارات نیاز'' میں دس افسانے ہیں جو انگریزی سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ ان کی نثر پر رومانیت اور پر لطف ادب لطیف کا عکس نمایاں ہے۔ وہ ایک تاثراتی نقاد بھی ہیں ''انتقادیات'' اور ''مالہ وماعلیہ'' سے ان کے تنقیدی رویے کا پتہ چلتا ہے۔ نگار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے نیاز نے 44 سال کام کیا۔ نئے سال کا پہلا شمارہ خاص نمبر ہوتا تھا۔ ان کے خاص نمبر نظیر نمبر۔ ریاض خیر آبادی نمبر۔ مومن نمبر۔ حسرت نمبر۔ خدا نمبر وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ نیاز بعد میں پاکستان منتقل ہوئے۔ جنوری 1965ء میں کینسر کا عارضہ لاحق ہوا اور 27 مئی 1966ء کو صبح چار بجے نیاز نے اس دار فانی سے کوچ کیا۔ اردو نثر نگاری میں انھوں نے افسانے کی صنف پر توجہ دی اس کے علاوہ غیر افسانوی نثر میں مضمون نگاری۔ انشائیہ نگاری۔ تاریخ۔ تنقید۔ تحقیق اور صحافت پر خصوصی توجہ دی۔ رسالہ نگار کے خاص کالم شہرت کے حامل تھے۔ ترجمہ کی روایت کو فروغ دینے میں بھی نیاز کی خدمات نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ انھوں نے افسانوں کے علاوہ اہم مضامین کے ترجموں پر بھی توجہ دی۔ اقبال کے عہد کے ہمہ جہت نثر نگاروں میں نیاز فتح پوری کا مقام کافی بلند ہے۔ وہ اقبال سے عمر میں دس سال چھوٹے تھے اور اقبال کی رحلت کے 38 سال بعد تک حیات رہے۔ انھوں نے ''نگار'' کا اقبال نمبر شائع کر کے شاعر مشرق کے عہد اور کارناموں سے اپنی وابستگی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

25.6.3 مہدی افادی

اردو کو رومانی تحریک سے وابستہ کرنے اور نثر کو رنگینی' لطافت اور تابناکی سے روشناس کرنے والوں میں مہدی افادی کا شمار ہوتا ہے۔ وہ انشا پرداز اور منفرد طرز کے نمائندہ ادیب تھے۔ گورکھپور کے محلّہ بسنت پور کے ایک معزز گھرانے میں مہدی افادی نے 1870ء میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد حاجی حسن علی کا شمار اس زمانے کے تعلیم یافتہ افراد میں ہوتا تھا۔ گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عربی' فارسی اور اردو زبانیں سیکھیں اور ایسے مدرسہ میں داخل کیے گئے جہاں السنہ مشرقیہ کے علاوہ انگریزی کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔ پہلی شادی 1890ء میں ہوئی۔ اہلیہ کے داغ مفارقت دے جانے کے بعد دوسری شادی کی اور تیسری شادی عزیز النسا سے 1909ء میں ہوئی۔ وہ نائب تحصیل دار کے عہدے پر فائز تھے اور ترقی کرتے کرتے تحصیل دار ہو گئے۔ بنارس اور الہ آباد میں ملازمت کا سلسلہ قائم رہا۔ ان کا پہلا مضمون ''حکمائے یونان پر ایک سرسری نظر'' 1897ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے مطالعہ سے خود کو سنوارا۔ وہ فائدہ بخش تصورات کے قائل تھے۔ چنانچہ ''افادات مہدی'' میں یہی خیالات دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے بیشتر رسائل کو خطوط لکھے اور ان کی حیثیت مراسلے کی ہوگئی۔ مہدی افادی اردو نثر میں مضمون نگار۔ مراسلہ نویس اور خاص طور پر جمالیاتی نقاد کی حیثیت سے مشہور ہیں چنانچہ ان کی تحریریں غیر افسانوی نثر کی نمائندگی کرتی ہیں۔

25.6.4 ظفر علی خان

بیک وقت ادیب' خطیب' صحافی' شاعر اور سیاست داں کی حیثیت سے مشہور ظفر علی خاں کی ولادت 1870ء میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ میرٹھ میں ہوئی۔ وزیر آباد مشن اسکول سے مڈل پاس کیا اور پٹیالہ کے ہائی اسکول سے میٹرک کی سند حاصل کی۔ 1892ء میں علی گڑھ کالج میں شریک ہوئے اور یہاں سے ایف۔ اے کیا۔ ان کے والد کشمیر میں ڈاک وتار کے محکمے میں ملازم تھے۔ تعلیم ختم کر کے وہ کشمیر گئے اور ملازمت اختیار کر لی۔ ملازمت سے استعفیٰ دے کر علی گڑھ سے بی۔ اے کیا۔ اس وقت نواب محسن الملک کو پرائیوٹ سکریٹری کی ضرورت تھی۔ ظفر علی خان کی درخواست منظور ہوئی اور ان کی سفارش سے حیدر آباد آئے اور حیدر آباد میں اسسٹنٹ ہوم سکریٹری کے عہدے تک پہنچے۔ حیدر آباد میں ظفر علی خان نے لارڈ کرزن کی کتاب ''خیابانِ فارسی'' کا اردو ترجمہ کیا۔ وہ اپنے زمانے میں چوٹی کے ادیبوں میں شمار کیے جانے لگے۔ ان کی قومی نظموں کے مجموعے ''بہارستان۔ نگارستان اور چمنستان کافی مقبول ہوئے۔ روح معانی اور جنیات ان کی ادبی کاوشیں ہیں۔ ظفر علی خاں کا نام رسالہ ''زمیندار'' کی وجہ سے مشہور ہے۔ ان کی نثری تصانیف میں حقائق ومعارف۔ جواہر الادب۔ حقیقت و افسانہ ان کی یادگار ہیں۔ ان کے بیشتر مضامین اسلامی تاریخ وثقافت کے اطراف گھومتے ہیں۔ انھوں نے مغربی انشا پردازی سے سادگی و پرکاری' وضاحت اور روانی کو اپنی تحریروں میں شامل کیا۔ دورِ اقبال کے غیر افسانوی نثر نگاروں میں ایک صحافی' کالم نگار اور مضمون نگار کی حیثیت سے ظفر علی خاں کا مقام کافی بلند ہے۔

25.6.5 عبدالماجد دریابادی

اردو کے سوانح نگار۔انشائیہ نویس۔نقاد۔صحافی۔عالم دین اور مذہبی مضامین کے ذریعے اردو دنیا میں شہرت حاصل کرنے والے ادیبوں میں عبدالماجد دریابادی کا شمار ہوتا ہے۔انھوں نے مذہبی صحافت کو پروان چڑھا کر''صدق جدید'' کے توسط سے وسیع النظری اور مذہب کی صحیح فکر کو عام کیا۔ اقبال کے عہد کے غیر افسانوی نثر نگاروں میں مولانا عبدالماجد دریابادی امتیازی مقام رکھتے ہیں۔وہ مصلح، مفکر اور دانشور تھے۔صحافت، سوانح، تنقید، شاعری، ڈراما نگاری اور تفسیر کے میدان میں انھوں نے نام کمایا۔عبدالماجد دریابادی کی پیدائش 16 مارچ 1892 کو بمقام دریاباد ہوئی۔ان کے والد ''اودھ پنچ'' کے لیے مضامین لکھا کرتے تھے۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔عربی اور فارسی کی کتابیں پڑھیں۔ سیتاپور گورنمنٹ ہائی اسکول سے 1908ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔اعلیٰ تعلیم کے کیننگ کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا۔انٹرمیڈیٹ میں انگریزی، فلسفہ، تاریخ اور نفسیات کا نصابی مضامین کی حیثیت سے مطالعہ کیا۔تحصیل علم کے سلسلے میں علی گڑھ۔الہ آباد اور دہلی کا رخ کیا۔1912ء میں والد کے انتقال کے بعد تعلیم ترک کردی۔گھریلو ذمہ داریاں سنبھالیں۔مولوی عبدالحق نے انگریزی کتابوں کے ترجموں کا کام سپرد کیا۔شبلی نعمانی نے سیرت النبی ﷺ کے انگریزی ماخذات کی تحقیق کے لیے پچاس روپے ماہور مقرر کیا۔1916ء میں لکھنؤ میں شادی کی۔مولوی اشرف علی تھانوی کو عبدالماجد دریابادی کے مرشد کا درجہ حاصل ہے۔1919ء میں ''معارف'' سے ادارتی ربط پیدا کیا اور 1923ء تک یہ خدمت انجام دی۔1928ء میں ''ہمدرد'' کی نگرانی ان کے سپرد ہوئی۔ابتدا میں ''حقیقت'' اور ''سچ'' نام کے رسائل جاری کیے۔کچھ عرصہ کے بعد ''صدق'' جاری کیا۔یکم ستمبر 1917ء سے جولائی 1918ء تک وہ حیدرآباد میں سکونت پذیر رہے۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے وابستہ ہوکر منطق پر کتابوں کے ترجمے کیے۔حکومتِ حیدرآباد سے پولیس ایکشن 1948ء تک پنشن جاری رہی۔دسمبر 1950ء سے ''صدق جدید'' جاری کیا جو ان کے وصال تک جاری رہا۔1967ء کے بعد حکومت ہند نے علمی و ادبی خدمات کے پیش نظر تین ہزار روپے پنشن مقرر کی جو مرتے دم تک جاری رہی۔1976ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔دسمبر 1976ء میں فالج کے حملے سے متاثر ہوئے اور 5 جنوری 1977ء کو انتقال کیا۔عبدالماجد دریابادی کثیر التصانیف ادیب ہیں۔ابتدا میں انھوں نے ''غذائے انسانی''۔''محمود غزنوی''۔''فلسفۂ جذبات''۔''فلسفہ اجتماع''۔''سائیکالوجی آف لیڈرشپ'' (انگریزی) ''مکالمات برکلے''۔''فلسفیانہ مضامین''۔''مبادیِ فلسفہ'' (حصہ اول و دوم) ''فلسفہ اور اس کی تعلیم''۔''ہم آپ'' اور ''منطق'' ہیں۔1913ء میں انھوں نے ''فلسفۂ جذبات'' لکھی۔ترجمے کے فن پر انھیں عبور تھا۔ ''تاریخ اخلاقِ یورپ'' حصہ اول و دوم ''تاریخ یورپ'' اور ''پیام امن'' اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔تصوف کے موضوع پر ان کی کتاب ''تصوف اسلام'' اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہوئے۔مختلف نسخوں سے ملفوظات مولانا روم ''فیہ مافیہ'' شائع کیا۔ان کے سفرنامے ''سفرنامہ حجاز'' اور ڈھائی ہفتے پاکستان میں ''سیاحتی تاثرات'' کے آئینہ دار ہیں۔''زود و پشیماں'' بھی ان کی یادگار ہے۔مصحفی کی مثنوی ''بحرالمحبت'' کو عالمانہ انداز سے شائع کرکے تحقیق کا حق ادا کیا۔''مقالاتِ ماجد''۔''انشائے ماجد'' حصہ اول و دوم اور ''نشریات ماجد'' شائع ہو چکے ہیں رسالہ ''سچ'' اور ''صدق'' میں جو مضامین شائع ہوئے تھے انھیں ''مضامین ماجد'' کے نام سے شائع کیا گیا۔انھوں نے مشاہیر کے خطوط بھی مرتب کیے۔''خطوط مشاہیر'' حصہ اول اور ''مکتوبات سلیمانی'' حصہ دوم شائع ہو چکے ہیں۔اس کے علاوہ ''تفسیر ماجدی'' بھی شائع ہوئی۔اسلامیہ کالج پشاور کے خطبات کو ''قصص الانبیا'' اور رضا اکیڈمی رامپور کے خطبات کو ''قصص و مسائل'' کے نام سے شائع کیا گیا۔مولانا کی کتاب ''معاصرین''۔ان کی ہم عصر شخصیتوں کے خاکوں پر مبنی کتاب ہے۔سوانح نگاری کی نمائندگی کرنے والی ان کی کتابوں میں حکیم الامت۔اکبرنامہ۔محمد علی کی ڈائری کے چند ورق اور سیرت نبوی اہمیت کی حامل ہیں۔ان کی صحافت غیر جانبدار رہی۔اس کے علاوہ ان کی دیگر کتابوں میں مردوں کی مسیحائی۔سچی باتیں۔صابر رسول۔یتیم کی جنت۔یتیم کا راج۔تمدن اسلام کا پیام۔بیسویں صدی کے نام۔تمدن اسلام کی کہانی۔تحفۂ خسروی۔فرائض والدین۔مشاہیر سائنس۔مشکلاتِ قرآن۔خطبۂ استقبالیہ اور نورانی جہیز ہے۔عہد اقبال کے ایک سلجھے ہوئے ادیب کی حیثیت سے عبدالماجد دریابادی نے ادب اور مذہب کی بیک وقت نمائندگی کی اور ان کی تصانیف سے ان کی علمی و ادبی ہمہ گیری کا پتہ چلتا ہے

25.6.6 مولوی عبدالحق

ایک ادبی محقق، نقاد، مرتب متن، خاکہ نگار، ادبی صحافی، خطبہ نویس، مکتوب نگار، ماہر لسانیات کے علاوہ مبصر اور نصابی کتب کے مدون کی حیثیت سے عہد اقبال میں مولوی عبدالحق کی خدمات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔بابائے اردو کے خطاب سے نوازے گئے مولوی عبدالحق 20 اپریل 1870ء میں ہاپوڑ کے قریب سرادہ نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ان کی ابتدائی تعلیم سرادہ اور ہاپوڑ میں ہوئی۔اس کے بعد فیروز پور (پنجاب) چلے آئے اور وہاں سے

مڈل امتحان پاس کیا۔ 1888ء میں حصول علم کے لیے علی گڑھ آئے۔ جہاں پروفیسر آرنلڈ اور تھیوڈ ڈبیک جیسی شخصیتوں سے متاثر ہونے کے علاوہ سرسید۔ حالی اور شبلی جیسے اکابر قوم کی تربیت میں پروان چڑھے۔ بی۔اے کرنے کے بعد 1895ء میں تلاش روزگار میں بمبئی پہنچے۔ محسن الملک کے سکریٹری کے بعد حیدرآباد میں افسر جنگ کے رسالے ''افسر'' کی ادارت قبول کی۔ ہوم آفس میں مترجم کے عہدے پر مامور ہوئے۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ قائم ہوا تو اس کے ناظم مقرر ہوئے۔ 1924ء سے 1929ء تک اورنگ آباد کالج کے پرنسپل رہے۔ 1925ء میں کالج کا رسالہ ''نورس'' جاری کیا۔ جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ اردو کے صدر اور پروفیسر بنائے گئے۔ قیام اورنگ آباد کے دوران انجمن ترقی اردو کو منظم کیا۔ رسالہ ''اردو'' اور ''سائنس'' جاری کیا۔ کلاسیکی ادب کی کتابیں مرتب کرنے کے علاوہ آصف جاہی مدارس کے لیے نصابی کتابیں مدون کیں۔ دسویں جماعت تک کا اردو نصاب تیار کروایا اسی دوران ان کے خاکوں کا مجموعہ ''چند ہم عصر'' شائع ہوا۔ اردو کے متعدد تذکروں کو مدون کرکے شائع کرنے کا کارنامہ بھی مولوی عبدالحق نے انجام دیا۔ 1937ء میں الہ آباد یونیورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی اور 1941ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ پاکستان منتقل ہونے کے بعد 15 نومبر 1959ء کو انھیں ''ہلال قائداعظم'' عطا کیا گیا۔ 1948ء میں انجمن کے ساتھ پاکستان ہجرت کی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کی بنا ڈالی اور اردو کالج قائم کیا۔ کینسر کے مرض میں مبتلا ہوئے اور 16 اگست 1961ء کو انتقال کیا۔ ایک صحافی کی حیثیت سے مولوی عبدالحق نے رسالہ نورس' رسالہ حسن' رسالہ افسر' رسالہ اردو اور رسالہ سائنس کی ادارت سنبھالی۔ تذکروں کے مرتب کی حیثیت سے انھوں نے ''نکات الشعرا' تذکرۂ ریختہ گویاں' مخزن نکات' چمنستان شعرا' گل عجائب' تذکرہ ہندی' ریاض الفصحا اور ''مخزن الشعرا کو شائع کیا۔ 1916ء میں ''دریائے لطافت'' مرتب کرکے شائع کی۔ مولوی عبدالحق کو دکنی کے محقق کا درجہ حاصل ہے۔ انھوں نے گلشن عشق' معراج العاشقین' قطب مشتری اور سب رس کو وقیع مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ اثر کی مثنوی ''خواب وخیال'' کو مرتب کرکے 1926ء میں اورنگ آباد سے شائع کیا۔ ایک محقق کی حیثیت سے ان کے کارنامے کافی وسیع ہیں۔ ''اردو کی نشوونما میں صوفیاء کرام کا کام'' اور ''مرحوم دہلی کالج'' جیسی کتابیں لکھ کر ادبی تحقیق کو پروان چڑھایا۔ غرض مولوی عبدالحق ایک صحافی' خاکہ نگار' محقق' نقاد' مبصر اور مرتب کی حیثیت سے اپنے دور میں شہرت رکھتے ہیں اور یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ بابائے اردو کے تمام تحقیقی' تنقیدی' صحافتی اور ادبی کارنامے عہد اقبال میں انجام دیے گئے مولوی عبدالحق کی وجہ سے دکنی ادبیات کی تحقیق کے نئے گوشے وا ہوئے جنھیں کسی اعتبار سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

26.6.7 قاضی عبدالغفار

اردو تحریک کے بانی ایک پرجوش اور ہوش مند کارکن کی حیثیت سے قاضی عبدالغفار اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب' صحافی' انشائیہ نگار اور سوانح نگار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ قاضی عبدالغفار مرادآباد کے محلے تمباکو والا میں 1885ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی صاحبزادی فاطمہ عالم علی خاں نے ان کی تاریخ پیدائش دسمبر 1889ء بتائی ہے۔ مرادآباد کے انگلش مڈل اسکول میں داخل کیا گیا۔ 1902ء میں مڈل اور 1905ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایف۔اے سال اول میں داخلہ لیا۔ 1910ء میں ان کی شادی خالہ زاد بہن افضال بیگم سے ہوئی۔ علی گڑھ سے لوٹ کر نائب تحصیل دار کے عہدے پر فائز ہوئے اور بہت جلد اس عہدے سے مستعفی ہوگئے۔ ابتدا سے انھیں صحافت سے دلچسپی تھی۔ مرادآباد میں ابن علی کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے ''نیر عالم'' میں ابتدائی مضامین شائع ہوئے۔ 1913ء میں مولانا محمد علی نے رسالہ ''ہمدرد'' میں اپنا اسسٹنٹ مقرر کیا۔ ہمدرد کو پریس ایکٹ کے تحت بند کیا گیا تو قاضی عبدالغفار کلکتہ چلے گئے اور روزنامہ ''جمہور'' جاری کیا۔ اسی دوران ''ترجمان'' اور ''صداقت'' سے وابستہ رہے۔ انھوں نے دہلی سے روزنامہ ''صباح'' جاری کیا۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کا قرب حاصل ہوا۔ خلافت کمیٹی کے لندن جانے والے وفد کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ 14 فروری 1921ء کو وفد کے ساتھ لندن پہنچے اور 30 اپریل 1921ء کو ہندوستان لوٹے۔ 1925ء میں پیرس میں مرادآبادی برتنوں کی دکان کھولی۔ 1926ء میں میونسپل بورڈ کے چیرمین ہوئے۔ 1932ء میں حیدرآباد سے روزنامہ ''پیام'' جاری کیا۔ سر مرزا اسمٰعیل کی سفارش پر محکمہ اطلاعات کے ناظم مقرر ہوئے۔ تین سال تک اس عہدے پر فائز رہ کر 27 اکتوبر 1947ء کو استعفیٰ دے دیا۔ مولانا آزاد نے 1950ء میں عبدالغفار کو دہلی بلالیا اور دستور ہند کے ترجمہ کی ذمہ داری سونپی۔ انھوں نے ساہتیہ اکیڈیمی کے رکن اور انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری کی ذمہ داری نبھائی۔ 17 جنوری 1954ء کو اس جہاں فانی سے کوچ کیا۔ ''لیلیٰ کے خطوط''۔ ''مجنوں کی ڈائری''۔ ''تین پیسے کی چھوکری''۔ ''پندار کا صنم کدہ''۔ ''سیب کا درخت'' اس نے کہا ''نقش فرنگ'' اور ''عجیب'' ان کی تصانیف ہیں۔ ''آثار جمال الدین افغانی''۔ ''آثار ابوالکلام آزاد'' اور ''حیات اجمل'' کے علاوہ سوانحی مضامین بھی ہیں۔ وہ مضمون نگار۔ سوانح نگار۔ کالم نگار۔ صحافی اور مبصر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ عہد اقبال میں

عبدالغفار کی صحافت، مضمون نگاری اور کالم نگاری کا شہرہ عام تھا۔ حیدرآباد سے ''پیام'' جاری کر کے شہرت حاصل کی۔ ان کی تخلیقات ادبی معیارات متعین کرنے کی دلیل بنتی ہیں۔

25.6.8 خواجہ حسن نظامی

اردو میں انشائیے، سفرنامے، روزنامچے، صحافت، سوانح، مرقع نگاری، ترجمہ، تاریخ، تفسیر جیسے بے شمار اوصاف کو اختیار کر کے خواجہ حسن نظامی نے اردو کے صاحبِ طرز ادیبوں میں نام کمایا ہے۔ وہ کثیر التصانیف ادیب ہیں۔ حسن نظامی کا خاندانی سلسلہ مشہور صوفی حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کے داماد سید بدرالدین اسحاق سے ملتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی ولادت 25 دسمبر 1878ء کو ہوئی۔ ان کے والد نے نام قاسم علی رکھا جب کہ ماموں نے علی حسن کے نام سے یاد کیا۔ ان کے والد عاشق علی کے ذرائع محدود تھے۔ حسن نظامی کا بچپن عسرت میں گزرا۔ وہ عربی اور فارسی زبانوں سے بخوبی واقف تھے لیکن انگریزی سے نابلد رہے۔ گیارہ برس کی عمر میں شاہ الہ بخش (ڈیرہ غازی خاں) سے ارادت حاصل کی اور خواجہ غلام فرید کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان کا پہلا مضمون ''انڈیا کی نازک حالت''۔ ''انڈیا گزٹ'' بمبئی میں چھپا۔ حضرت جلال الدین سیوطی کے عربی رسالے کا ترجمہ ''مفلسی کا مجرب علاج'' ان کی پہلی تصنیف ہے۔ بھاولپور اور پنجاب کے سفر کے بعد 1905ء اور 1906ء میں متھرا۔ ایودھیا۔ بنارس۔ ہردوار اور رشی کیش کا سفر کیا۔ 1908ء میں ''حلقہ نظام المشائخ'' قائم کیا۔ 1909ء میں ملا واحدی کے اشتراک سے رسالہ ''نظام المشائخ'' جاری کیا۔ 1911ء میں مصر، شام اور حجاز روانہ ہوئے اور سفرنامہ ''نظام المشائخ'' میں شائع ہوا۔ 1913ء میں ''اخبار توحید'' جاری کیا۔ ''کہو تکبیر'' مضمون کی اشاعت پر انگریزوں نے اسے بند کر دیا۔ رسالہ ''منادی'' 1926ء میں جاری کیا۔ 1925ء میں نظام الاسلام کے نام سے مدرسہ 1939ء میں دہلی میں ''اردو کلب'' قائم کیا۔ 2 جنوری 1946ء کو حکومت برطانیہ نے انھیں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔ 31 جولائی 1955ء میں عیدالضحیٰ کے دن مغرب کی نماز کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی تخلیقی یادگاریں ''آپ بیتی''۔ ''بیگمات کے آنسو''۔ ''سی پارۂ دل''۔ ''بیوی کی تعلیم''۔ ''بہادر شاہ ظفر کا روزنامہ''۔ ''جگ بیتی کہانیاں''۔ ''چار درویشوں کا تذکرہ''۔ ''خوشی کی زندگی''۔ ''دلی کی جانکنی''۔ ''سفرنامۂ حجاز''۔ ''مصر و شام''۔ ''طب کی تاریخ''۔ ''طمانچہ بر خسار یزید''۔ ''لڑائی کا گھر''۔ ''عام فہم تفسیر''۔ ''فرعونی تاریخ'' وغیرہ ہیں۔ قلمی چہرے اور خاکے لکھنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے اللہ میاں۔ شیطان اور ماڈرن معشوق کے جو مرقع قلم بند کیے ہیں۔ وہ خاصے دلچسپ ہیں۔ ان کی سوانح نگاری بھی خاصہ کی چیز ہے۔ ''آپ بیتی'' ان کی خودنوشت سوانح ہے۔ منادی میں ان کے روزنامچے سلسلہ وار شائع ہوئے۔ کتابوں کے مطالعے سے ان کی فکر باریک مشاہدے اور ژرف نگاری کا ثبوت ملتا ہے۔ علامہ اقبال کے عہد کے وہ ایک ایسے قلم کار ہیں جنھوں نے اقبال کی مخالفت کی لیکن بعد میں اقبال کی حمایت پر توجہ دی۔ اس طرح وہ عہد اقبال کے ایک اہم نثر نگار کا درجہ رکھتے ہیں۔

25.6.9 برج موہن دتاتریہ کیفی

اردو کے ایک بہترین مترجم، تذکرہ نویس، ماہر زبان و قواعد، ڈراما اور ناول نگار، شاعر اور لسانیات کے مختلف میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے والے برج موہن دتاتریہ کیفی 1886ء کو دہلی میں کشمیری پنڈتوں کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ فرخ سیر کے زمانے میں کشمیر سے دلی چلے آئے تھے۔ ان کے والد پنڈت کہنیالال شہر نابھہ کے کوتوال تھے۔ بازار سیتارام محلہ کے مدرسہ سے کیفی کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ ان کے نانا نے فارسی کی معیاری کتابیں پڑھائیں۔ پرائمری اسکول میں انگریزی سیکھی۔ شاہ جی کے چھتے کے سرکاری اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسٹیفن کالج دہلی سے بی۔ اے کیا۔ انگریزی، عربی، فارسی اور سنسکرت زبانیں سیکھ لیں۔ لکھنو کے ایک قدیم گھرانے کی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی۔ انگریزی اخبار ''ٹری بیون'' لاہور میں کام کیا۔ کیفی نے یوروپ اور انگلستان کا دورہ کر کے 1916ء میں ہندوستان کا رخ کیا۔ جب راجا دلجیت سنگھ کشمیر کے وزیراعظم مقرر ہوئے تو کیفی کو کشمیر بلالیا اور وہ کشمیر میں اسسٹنٹ خازن سکریٹری مقرر ہوئے۔ وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد پہاڑی ریاست چینی میں مجسٹریٹ اور کلکٹر کے فرائض انجام دیے۔ 1939ء میں کشمیر میں انجمن ترقی اردو کی بنا ڈالی۔ لالہ سری رام نے ''خمخانۂ جاوید'' کی چار جلد مکمل کیں تھیں کہ 1930ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ مولوی عبدالحق نے بقیہ جلدوں کی تکمیل کا کام کیفی کے سپرد کیا۔ اس کی پانچویں جلدیں 1940ء دہلی میں شائع ہوئی۔ 1945ء میں پہلی بار کیفی کے قلب پر حملہ ہوا۔ 1954ء میں آنکھ کے آپریشن کے بعد کیفی نے اپنے بھتیجے کے مکان واقع غازی آباد میں سکونت اختیار کی اور وہیں یکم نومبر 1955ء کو اس دار فانی سے کوچ کیا۔ ان کی کتابیں ''کیفیہ'' اٹھارہ ابواب پر مشتمل اردو املا اور ادب کی مختصر تاریخ ہے جو 1942ء میں شائع ہوئی ''خمسہ کیفی''، تین مقالات اور ''منشورات'' لسانی جائزے پر مشتمل ہے۔ علامہ اقبال کے عہد میں علمی خدمات انجام دینے میں کیفی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

25.6.10 سید سلیمان ندوی

گراں قدر علمی خدمات اور تحقیقی وقار کی وجہ سے سید سلیمان ندوی اپنے عہد کے مصنفین میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ان کے خاندان کا تعلق بہار شریف کے گاؤں دسنہ سے تھا۔ان کے بزرگ اکبر کے زمانے میں وارد ہندوستان ہوئے اور ''دین الٰہی'' کی مخالفت کی بنیاد پر جام شہادت نوش کیا۔سلیمان ندوی کی تاریخ ولادت 22 نومبر 1884ء بتائی جاتی ہے۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ 1901ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور شبلی سے استفادے کا موقع ملا۔شبلی نے انھیں ''الندوہ'' کی ذمہ داری سونپی۔جولائی 1912ء میں کلکتہ سے ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' جاری کیا تو سلیمان ندوی اس کے عملے میں شامل ہوگئے۔دکن کالج پونے میں فارسی کے اسسٹنٹ لکچرر کی جگہ نکلی تو شبلی نے سلیمان ندوی کا تقرر کروادیا۔سلیمان ندوی نے وہاں انگریزی سیکھی اور علمی مشاغل جاری رکھے۔انھوں نے ''ارض القرآن'' کا پہلا حصہ مکمل کیا تھا کہ شبلی کا انتقال ہوگیا۔''سیرت النبی'' کا نامکمل کام سلیمان ندوی کے سپرد ہوا۔دارالمصنفین کے لیے شبلی نے اپنا گھر اور باغ مختص کیا تھا۔شبلی کے شاگردوں نے اس کام کو آگے بڑھایا۔علامہ اقبال چاہتے تھے کہ سلیمان ندوی کے علم وفضل سے اہل پنجاب مستفید ہوں چنانچہ اورینٹل کالج لاہور میں جب فارسی کی جگہ خالی ہوئی تو اقبال نے انھیں وہاں مدعو کیا۔سلیمان ندوی نے معذرت چاہی۔1916ء میں دارالمصنفین کا پریس قائم ہوا اور ماہنامہ ''معارف'' کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔انھوں نے مسلمانوں کا اعتماد حاصل کیا چنانچہ 1920ء کے خلافت کمیٹی کے وفد میں سلیمان ندوی شامل تھے جس نے لندن میں نمائندگی کی۔فروری 1942ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔والیِ ریاست بھوپال یہ چاہتے تھے سلیمان ندوی بھوپال میں رہ کر علمی وادبی کام کریں چنانچہ 1950ء تک وہ بھوپال میں رہے۔اسی سال پاکستان پہنچے۔کراچی یونیورسٹی کے سینٹ کے رکن رہے۔ان کی غیر معمولی ادبی تصانیف میں ''خیام'' اور ''نقوش سلیمانی'' کو اہمیت حاصل ہے جو تحقیقی بصیرت اور اعلیٰ ادبی صلاحیت کی غماز ہیں۔

سیرت نگاری پر سلیمان ندوی کی کتابیں ''سیرت عائشہ''۔''حیات شبلی''۔''سیرت النبی ﷺ''۔اہمیت کی حامل ہیں۔''خطباتِ مدراس''، تحقیقی انداز کی نمائندگی کرتی ہے۔عبدالقوی دسنوی نے بہار اردو اکادمی کی جانب سے 1984ء میں ''یادگار سلیمان'' شائع کی۔غرض سید سلیمان ندوی ایک کامیاب صحافی، شاعر، سوانح نگار، دانشور، محقق۔نقاد اور ادیب تھے جن سے اقبال کے دیرینہ تعلقات تھے اور اقبال کے عہد میں اسلامی روح کو پھیلانے میں انھوں نے اہم کارنامے انجام دیے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. عہد اقبال کی چند غیر افسانوی اصناف کون سی ہیں؟
2. اقبال کے عہد کے کوئی پانچ اہم غیر افسانوی نثر نگاروں کے بتائیے؟

25.7 عہد اقبال میں طنز ومزاح

علمی، ادبی اور صحافتی نثر کے علاوہ عہد اقبال میں ایسی نثر کا بھی شہرہ رہا جس کے ذریعہ طنز وظرافت کی نمائندگی کی گئی۔سرسید کے عہد میں ہی ''اودھ پنچ'' کی صحافت کے ذریعے طنز وظرافت کا آغاز ہو چکا تھا اور نثر نگاروں کے علاوہ شعرا نے بھی طنز وظرافت کے رویے کو اختیار کیا۔ایسی تحریریں جن کے ذریعے ہنسنے اور ہنسانے کے مواقع فراہم کیے جائیں انھیں مزاح یا ظرافت کی سرشت میں شمار کیا جاتا ہے اور اگر کسی تحریر کے مطالعہ کے بعد ہنسنے کے علاوہ افسوس اور ندامت کا عمل بھی ظرافت کے ساتھ شامل ہو جائے تو اسے طنز کہا جاتا ہے۔انگریزی میں Humour اور Satire کے الفاظ بطور متبادل استعمال ہوتے ہیں۔طنز اور مزاح کے دوران جس قدر تہہ داری اور معنویت ہوگی اسی قدر لطف کے مواقع فراہم ہوتے ہیں ورنہ طنز ومزاح پھکڑ پن یا دل آزاری کا ذریعہ بن جاتا۔جس سے پتہ چلتا ہے کہ نہ تو طنز وظرافت کا مقصد کسی کی دل آزاری ہے اور نہ خندہ آوری بلکہ اس کے ذریعے بھی قاری کی فہم وفراست کو تیز کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔''اودھ پنچ'' کے نثر نگاروں نے ہنسی، مذاق اور بذلہ سنجی کے لیے طنز ومزاح کو استعمال کیا لیکن رفتہ رفتہ شائستہ ظرافت اور لطیف جملوں سے طنز کو رواج دینے کا انداز اردو میں عام ہوتا گیا۔علامہ اقبال کے عہد تک لکھنوی طرز وانداز پر طنز ومزاح کے تیر برسانے میں پنڈت رتن ناتھ سرشار پیش پیش تھے۔منشی سجاد حسین، مچھو بیگ ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق، احمد علی شوق اور سید محمد آزاد نے اس دور کی مصنوعی زندگی اور تصنع

کا مذاق اڑایا۔ میاں آزاد۔ خوجی۔ حاجی بغلول افیونی۔ عیار۔ بہروپیے کے کرداروں سے سماج کے ناسور کریدنے کی کوشش کی گئی۔ غالب کی نثر اور اکبر الٰہ آبادی کی شاعری میں طنز و مزاح کے لطیف جذبات کی نمائندگی ہوتی ہے اور اسی روش پر عہد اقبال میں طنز و مزاح کا کارواں آگے بڑھتا ہے۔

25.7.1 مُلّا رموزی

مزاح کے میدان میں ''گلابی اردو'' کی معرفت سے جس نثر نگار کو انفرادیت حاصل ہے وہ ملا رموزی ہیں۔ ان کا اصلی نام صدیق ارشاد تھا۔ 31 مئی 1896ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ گھر پر اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی پھر کانپور کے ''مدرسۂ الٰہیات'' میں داخل ہوئے۔ اسی دوران مضمون نگاری کا آغاز کیا۔ 1918ء میں تعلیم سے فارغ ہو کر بھوپال لوٹے۔ 1921ء میں ملا رموزی کی کتاب ''گلابی اردو'' شائع ہوئی۔ جو کافی مقبول ہوئی۔ وحیدیہ ٹکنیکل اسکول میں مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ ان کی نثر میں چھوٹے چھوٹے فقرے بڑا مزے دے جاتے ہیں۔ رموزی نے کانگریس کی حمایت کی۔ ان کے ہر جملہ سے طنز ابھرتا ہے۔ 1928ء میں دارالاشاعت پنجاب سے ''نکات رموزی'' شائع ہوئی۔ انھوں نے اپنے مضامین میں سیاسی اور تہذیبی ناہمواریوں کو ہدف بنایا ہے۔ مزاح سے طبعی مناسبت کی وجہ سے ان کی تحریریں شگفتہ اور دلچسپ بن جاتی ہیں۔ سائنسی ایجادات ان کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں۔ ان کے مضامین کسان۔ ریل۔ لیڈر۔ تعلیم یافتہ خاتون۔ پبلک۔ ہندستان میں معقولیت بھی ہے اور طنز و مزاح کی لطافت بھی۔ اقبال کے عہد کے ایک اہم طنزیہ و مزاحیہ نثر نگار کی حیثیت سے ملا رموزی کی شہرت رہی۔

25.7.2 مرزا فرحت اللہ بیگ

مخصوص انداز میں مزاح نگاری کو فروغ دینے والے نثر نگار کی حیثیت سے مرزا فرحت اللہ بیگ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ 1883ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ان کے جد اعلیٰ شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ترکستان سے وارد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ 1905ء میں ہندو کالج سے بی۔ اے کیا اور دو سال بعد 1907ء میں ملازمت کی تلاش میں حیدر آباد کا رخ کیا۔ مختلف ملازمتیں کیں۔ اپنی محنت اور قابلیت سے اسسٹنٹ ہوم سکریٹری کے عہدہ پر تقرر ہوا۔ آگرہ کے رسالے ''افادہ'' میں ان کا پہلا مضمون 1919ء میں شائع ہوا۔ باضابطہ مضمون نگاری کا آغاز 1923ء میں ہوا۔ انھیں اردو دنیا میں مرزا الم نشرح کی حیثیت سے شہرت ہوئی۔ انھوں نے اخلاق، سوانح اور مزاح کے ذریعے اپنے خیالات اور افکار پیش کیے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی رحلت 27 اپریل 1947ء کو ہوئی۔ فرحت اللہ بیگ کے مضامین سات جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ محاورات اور روزمرہ کے استعمال سے مزاح پیدا کرنے کے قائل ہیں۔ انھیں دہلوی زبان پر دسترس حاصل ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی ''کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' ان کی مزاح نگاری کی شاہکار کتاب ہے جس میں قلمی خاکہ اور مرقع نگاری کا حسن پیوست ہے۔ زندہ دلی، انبساط اور تبسم ریزی ان کی نثر کی خصوصیات ہیں۔ بے ساختہ جملوں سے مزاح پیدا کرنے میں انھیں کمال حاصل ہے۔ ان کی مضامین میں ''مردہ بہ دست زندہ''۔ ''ایک وصیت کی تکمیل''۔ ''پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر''۔ ''صاحب بہادر'' اور ''دہلی کی آخری شمع'' کافی مقبول ہیں۔ پھول والوں کی سیر سنجیدہ مضمون کی علامت بن جاتا ہے۔ غرض عہد اقبال میں مزاحیہ نثر نگار کی حیثیت سے مرزا فرحت اللہ بیگ اپنی انفرادی شناخت رکھتے تھے۔

25.7.3 شوکت تھانوی

عام قاری کے پسندیدہ اور محبوب مزاح نگار کی حیثیت سے شوکت تھانوی کا نام کافی بلند ہے۔ ان کا نام محمد عمر تھا۔ ان کی پیدائش 2 فروری 1904ء کو ہوئی۔ ان کا آبائی وطن تھانہ، مظفر نگر تھا۔ اس لیے نام کے ساتھ تھانوی کا لاحقہ لگایا۔ ان کے والد صدیق احمد نے پنشن لے کر بھوپال میں قیام کیا پھر لکھنؤ چلے آئے۔ شوکت تھانوی کی ذہنی تربیت لکھنو میں ہوئی۔ ابتدا میں مختلف اخبارات میں کام کرتے رہے پھر لکھنو چلے آئے۔ شوکت تھانوی کی ذہنی تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ ابتدا میں مختلف اخبارات میں کام کرتے رہے پھر محکمۂ نشر و اشاعت میں ملازمت مل گئی۔ ملک تقسیم ہوا تو پاکستان ریڈیو میں کام کرنے لگے اور 4 مئی 1963ء کو لاہور میں انتقال کیا۔ ان کے مضامین کی تعداد کم نہیں۔ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کے ساتھ مزاحیہ ناول نگاری کی طرف بھی توجہ دی۔ مزاحیہ غزل گوئی میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ''گہرستان۔ موج تبسم۔ بحر تبسم۔ سیلاب تبسم اور طوفان تبسم ہیں۔ خاکوں کی شکل میں انھوں نے ''شیش محل'' پیش کیا۔ انشائیہ نما تحریریں۔ افسانہ نگاری اور ناول نگاری کے ذریعہ انھوں نے ہنسی مذاق کے مواقع فراہم کیے۔ خدا نخواستہ۔ بکواس۔ پگلی۔ نیلوفر۔ ڈھونگ۔ کتیا اور سسرال وغیرہ ان کے مزاحیہ ناول ہیں۔ ان کا ہلکا پھلکا طنز و مزاح سودیشی ریل۔ تعزیت اور چھلانگ وغیرہ

میں نمایاں ہوتا ہے۔شوکت تھانوی نے مزاحیہ ظرافت کے اچھے نمونے پیش کیے۔عہد اقبال کے طنزیہ ومزاحیہ نثر نگار کی حیثیت سے شوکت تھانوی کے کارناموں کونظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

25.7.4 پطرس بخاری

اردو نثر میں مزاحیہ ادب کے ذریعے اعلیٰ درجے کی تصویر کشی اور مزاح کے مرقع تحریر کرنے میں سید احمد شاہ بخاری پطرس کو اہم مقام حاصل ہے۔ وہ یکم اکتوبر 1898ء کو بمقام پشاور پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام اسد اللہ شاہ بخاری تھا۔ابتدائی تعلیم پشاور میں ہوئی۔گورنمنٹ کالج لاہور میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔تعلیم سے فراغت کے بعد لندن کا رخ کیا اور کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم کے چھ سال بعد ہندوستان لوٹے۔ٹریننگ کالج اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا۔1937ء میں آل انڈیا ریڈیو کا محکمہ قائم ہوا تو اس کے اسسٹنٹ کنٹرولر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر بنے اور تقسیم ہند کے بعد وہیں مقیم رہے۔انھوں نے پاکستان کی بین الاقوامی کانفرنس میں حصہ لیا۔1955ء میں اقوام متحدہ کے شعبۂ اطلاعات کے سکریٹری بنا دیے گئے۔پطرس نے 5 دسمبر 1958ء کی صبح کو نیویارک میں انتقال کیا اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ پطرس نے سفرنامے بھی لکھے اور علمی وتنقیدی مضامین کی طرف بھی توجہ دی۔ان کی شہرت کا انحصار ''مضامین پطرس'' پر ہے جو طنزیہ ومزاحیہ ادب میں اہمیت کی حامل کتاب ہے۔اردو کے بلند پایہ مزاح نگاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے اور انھوں نے زندگی کی ناہمواریوں کو مزاح کے انداز میں نمایاں کیا ہے۔ان کے مضامین میں ''کتے''۔''مرحوم کی یاد میں''۔''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی''۔''ہاسٹل میں پڑھنا''۔''مرید پور کا پیر''۔''سینما کا عشق'' میں زندہ دلی، خوش طبعی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔جن کے مطالعے سے ان کے شعوری عمل کا پتہ چلتا ہے۔اردو طنز ومزاح کی تاریخ میں پطرس کا نام بے حد اہم ہے۔

25.7.5 مرزا عظیم بیگ چغتائی

1895ء میں جودھپور میں پیدا ہونے والے مرزا عظیم بیگ چغتائی ایک ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔حالانکہ ان کی تحریروں میں طنز ومزاح کا عنصر نمایاں ہے۔کم عمری میں افسانہ نگاری کی بنیاد رکھی۔ان کا پہلا افسانہ ''انگوٹھی کی مصیبت''۔''نیرنگ خیال'' کے سالنامے میں شائع ہوا۔دوران تعلیم ان کی شادی ہوگئی۔انٹرنس اور بی۔اے پاس کرنے کے بعد وکالت کی تعلیم حاصل کی اور جودھپور میں وکالت شروع کی۔بعد میں نواب آف جاورہ نے انھیں اپنی ریاست کا چیف جج بنا دیا۔ان کی تخلیقات میں مرقع کشی موجود ہے۔انھوں نے 32 تصانیف سپرد قلم کیں۔تحریروں کے دوران شوخی، چلبلا پن۔شگفتہ مزاجی۔زندہ دلی اور توانائی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ان کا پہلا ناول ''شیریں بیوی'' ہے۔''چغتائی'' کو ان کا بہترین ناول قرار دیا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ ''خانم''۔''کولتار''۔''کمزوری'' اور ''کھرپا بہادر'' ہیں جن میں طنز وظرافت کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔افسانوں میں ''روح ظرافت''۔''روحِ لطافت''۔''خاتم''۔''پھریری''۔''انگوٹھی کی مصیبت''۔''چینی کی انگوٹھی'' اور ''لوٹے کا راز''۔''خطوط کی ستم ظریفی''۔''شہزادی''۔''جنت کا بھوت'' ''سوانہ کی روحیں''۔''فرض مقراض محبت است'' سے خود اندازہ ہوتا ہے کہ عظیم بیگ چغتائی نے افسانوی نثر کے دوران طنز ومزاح نگاری کی روایت کو فروغ دیا۔لکھنو کی مٹتی ہوئی تہذیب کو ہدف بنا کر ڈراما 'مرزا جنگی' لکھا۔اسی طرح سنجیدہ موضوع پر کتاب ''قرآن اور پردہ'' تحریر کی۔ان کی تحریروں میں ظرافت اور مزاح کے ساتھ ہی پھکڑ پن بھی اثر دکھاتا ہے۔فضلِ حق قریشی نے انھیں ''مصور ظرافت'' کے نام سے موسوم کیا۔انتہائی نحیف تھے اور صحت پر توجہ نہ دینے کی وجہ سے علالت میں اضافہ ہوا اور 1961ء میں انتقال کیا۔

25.7.6 رشید احمد صدیقی

متوازن مزاح اور طنز کے تیر برسانے کے لیے مضمون نگاری، خاکہ نگاری اور مرقع کاری کو وسیلہ کے طور پر استعمال کرنے والے ادیبوں میں رشید احمد صدیقی کا شمار ہوتا ہے۔وہ 25 دسمبر 1894ء میں قصبہ پریا ضلع بلیا میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم قدیم رواج کے مطابق گھر پر مولوی صاحب سے دینیات، اردو، عربی اور فارسی کے ذریعے ہوئی۔جس کے بعد جونپور کے اسکول میں داخل کیے گئے۔1905ء میں چوتھی جماعت میں شریک ہوئے۔ 1914ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔انھیں کرکٹ، ہاکی اور فٹبال سے بڑی دلچسپی تھی۔علی گڑھ سے ایم۔اے پاس کیا۔وائس چانسلر ضیاء الدین نے 1923ء میں انھیں اردو پڑھانے پر مامور کیا۔1926ء میں ملازمت مستقل ہوئی۔علی گڑھ اور جامعہ عثمانیہ میں اردو کے استاد رہے۔1963ء میں ادبی

خدمات کے اعتراف میں رشید احمد صدیقی کو پدم شری عطا کیا گیا۔ 1971ء میں غالب اکیڈیمی ایوارڈ اور 1974ء میں اتر پردیش اردو اکاڈمی کا ادبی اعزاز حاصل ہوا۔ انھوں نے 1977ء میں وفات پائی اردو کے بلند پایہ طنز و مزاح نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں ''طنزیات و مضحکات''۔ ''مضامین رشید''۔ ''خنداں''۔ ''گنج ہائے گرانمایہ''۔ ''آشفتہ بیانی میری''۔ ''جدید غزل''۔ ''ذاکر صاحب''۔ ''سہیل کی سرگزشت'' اور ''ہم نفسانِ رفتہ'' ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔ مزاحیہ تاثراتی انداز کی وجہ سے رشید احمد صدیقی ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ موضوعات کا تنوع اور تہہ دار معنویت ان کے طنز و مزاح کی سب سے بڑی دلیل ہے وہ روزمرہ اور اپنے گرد و پیش کے ماحول سے بذلہ سنجی کا ماحول پیدا کر دیتے ہیں۔ ''وکیل''۔ ''چار پائی''۔ ''دیہاتی ڈاکٹر''۔ ''ارہر کا کھیت'' مزاحیہ تاثر پیدا کرنے کے اہم ذرائع ہیں۔ فقروں کی چستی، جملوں کی در و بست اور لفظوں کے مناسب استعمال سے ان کی تحریروں میں ظرافت پیدا ہوتی ہے۔ عہد اقبال میں رشید احمد صدیقی کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کی دھوم تھی۔ اگر چہ وہ دورِ اقبال کے نثر نگاروں میں کم عمر تھے لیکن ادبی محفلوں میں ان کی تحریروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ غرض عہد اقبال کے طنز و مزاح نگاروں کے قافلے میں رشید احمد صدیقی اپنی انفرادیت رکھتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. طنزیہ و مزاحیہ نثر کسے کہتے ہیں؟
2. طنزیہ و مزاحیہ نثر کی چند اصناف لکھیے۔
3. اقبال کے عہد کے نامور طنز و مزاح کے نثر نگار کون ہیں؟

25.8 خلاصہ

علامہ اقبال کے عہد میں ہندوستان کی فضاؤں میں جہاں نثر و شاعری کے چرچے تھے وہیں کئی شعری و نثری اصناف کے فروغ کا سلسلہ جاری تھا۔ علامہ اقبال نے اپنے دور میں مضمون، مقالہ، مراسلہ، مکتوب نگاری کے توسط سے غیر افسانوی نثر کی نمائندگی کی اور انھوں نے تمام عمر افسانوی نثر کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی لیکن اقبال کے عہد کو سمجھنے کے لیے اس دور کی تمام تر نثر کا احاطہ ضروری ہے عہد اقبال کی نثر کو تین زمروں میں تقسیم کر کے سب سے پہلے افسانوی نثر کے نمائندہ قلم کاروں کے کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اقبال کے دور میں ناول، افسانہ اور ڈراما جیسی اصناف کی نمائندگی کرنے والے تخلیق کاروں اور ان کے کارناموں کے ذریعے ثابت کیا گیا کہ عبدالحلیم شرر۔ منشی پریم چند۔ علامہ راشد الخیری۔ مرزا محمد ہادی رسوا اور منشی فیاض علی ایڈوکیٹ کی ناول نگاری عروج پر تھی اور اسی وقت اقبال نے مکتوب نگاری کی روایت کو پروان چڑھایا۔ اقبال کے عہد میں جن افسانہ نگاروں نے شہرت حاصل کی ان میں پریم چند۔ سجاد حیدر یلدرم۔ سدرشن۔ علی عباس حسینی کے نام پیش پیش ہیں جن کی تخلیقات اردو دنیا میں منظر عام پر آ چکی تھیں۔ اس دور کے ڈراما نگاروں میں آغا حشر کاشمیری۔ حکیم احمد شجاع۔ سید مہدی حسن احسن۔ نرائن پرشاد بے تاب کے علاوہ امتیاز علی تاج نے اس فن کی آبیاری میں حصہ لیا تھا جس کی وجہ سے افسانوی نثر میں کئی اصناف کی باریابی ہو سکی۔ اسی طرح غیر افسانوی نثر میں خاکہ، سوانح، سفرنامہ، خودنوشت، تحقیق، تنقید، مضمون، انشائیہ، مکتوب نگاری وغیرہ جیسی اصناف کے نمائندہ تخلیق کاروں کا جائزہ لیتے ہوئے ثابت کیا گیا ہے کہ عہد اقبال میں مولانا ابوالکلام۔ نیاز فتح پوری۔ مہدی افادی۔ ظفر علی خاں۔ عبدالماجد دریابادی۔ مولوی عبدالحق۔ قاضی عبدالغفار۔ خواجہ حسن نظامی۔ برج موہن دتاتریہ کیفی اور سید سلیمان ندوی جیسے ادیبوں نے ادبی اصناف کے علاوہ صحافت اور اس کے کالموں کے ذریعے قلم کے جوہر دکھائے عہد اقبال میں افسانوی اور غیر افسانوی نثر کے علاوہ طنز و مزاح کو بھی فروغ حاصل ہوا چنانچہ اس طرز کو فروغ دینے والے نثر نگاروں کا تعارف کرتے ہوئے یہ بات واضح کی گئی کہ عہد اقبال نثر کے فروغ میں اہمیت کا حامل ہے۔ اقبال کے عہد میں جن طنز و مزاح نگاروں نے نثر کی خدمت کی ان میں ملا رموزی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ۔ شوکت تھانوی۔ پطرس بخاری۔ عظیم بیگ چغتائی اور رشید احمد صدیقی کی طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات کے احاطے سے ثابت کیا گیا ہے کہ اقبال کے عہد میں اردو نثر نہ صرف افسانوی، غیر افسانوی، طنزیہ و مزاحیہ بلکہ سنجیدہ طرز سے مالا مال تھی اور اس دور میں نثر کی ہر صنف اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ جس کی وجہ سے اقبال کی نثر میں بھی اس دور کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔

25.9 نمونۂ امتحانی سوالات

1. اقبال کے عہد کی نثر کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؟
2. اقبال کے دور کی افسانوی نثر کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
3. عہدِ اقبال کی غیر افسانوی نثر کا تعارف کروایے۔
4. اقبال کے عہد میں طنزیہ و مزاحیہ نثر کا فروغ کیسے ہوا؟
5. اقبال کے دور کے چند اہم ناول نگاروں کے بارے میں اظہار خیال کیجیے۔
6. اقبال کے دور کے اہم افسانہ نگاروں کا تعارف کیجیے۔
7. اقبال کے دور میں ڈراما کی ترقی پر ایک نوٹ لکھیے۔
8. عہدِ اقبال کی غیر افسانوی نثر کا جائزہ لیجیے۔
9. طنزیہ اور مزاحیہ نگاروں نے عہدِ اقبال میں کیا کارنامے انجام دیے؟

25.10 فرہنگ

الفاظ	=	معنی
توسط	=	ذریعہ۔وسیلہ
مایہ ناز	=	فخر کا سبب
توضیح	=	کھول کر بیان کرنا
نصاب	=	پڑھائی کا کورس
حریت	=	حقانیت کا جذبہ
سراب	=	دھوکہ۔فریب
عبور	=	پل پر سے گزرنا' مہارت حاصل کرنا
عصری	=	زمانے سے متعلق
ولادت	=	پیدائش
حرص	=	خواہش۔ہوس
غلبہ	=	برتری۔فوقیت
ثقافت	=	تہذیب۔کلچر
مدون	=	جمع کیا ہوا۔مرتب
بذلہ سنجی	=	خوش طبعی۔لطیفہ گوئی

الفاظ	=	معنی
مستحکم	=	پکا۔مضبوط۔
ترجمانی	=	نمائندگی
تشریح	=	وضاحت
مرقع	=	تصویروں کی کتاب
جہاد	=	جدوجہد' کوشش
قفس	=	پنجرا۔پھندا۔جیل
سکونت	=	مستقل قیام
حسیت	=	محسوس کرنے کا عمل
مؤثر	=	کارگر۔اثر کرنے والا
مداح	=	تعریف کرنے والا
صعوبت	=	سختی۔تکلیف
ملفوظات	=	زبان سے ادا شدہ جملے
وفد	=	نمائندہ جماعت

الفاظ	=	معنی
ہمہ جہتی	=	تمام طریقے
جہت	=	سمت
تفہیم	=	سمجھانا
چابکدستی	=	چالاکی۔تیزی
نسوانی	=	عورتوں سے متعلق
شرف	=	بزرگی۔برتری
مستفید	=	فائدہ اٹھانا
فوت	=	معدوم
فراموش	=	بھولا ہوا
جانباز	=	جان پر کھیلنے والا
گویا	=	گانے والا۔حقیقی
اکابر	=	بڑے لوگ۔مقتدر آدمی
ژرف نگاہی	=	گہری نظر

25.11 سفارش کردہ کتابیں

.1	سید اعجاز حسین	مختصر تاریخ ادب اردو
.2	حالی بک ڈپو	مصنفین اردو
.3	پروفیسر سیدہ جعفر	تاریخ ادب اردو (جلد اول تا سوم)۔عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک
.4	ابواللیث صدیقی	آج کا اردو ادب
.5	نامی انصاری	بیسویں صدی میں طنز و مزاح
.6	پروفیسر یوسف سرمست	بیسویں صدی میں اردو ناول
.7	فرمان فتح پوری	اردو نثر کا فنی ارتقا
.8	عشرت رحمانی	اردو ڈراما
.9	سنبل نگار	اردو نثر کا تنقیدی جائزہ

اکائی 26 : بیسویں صدی کے چند اہم تصنیفی اور تعلیمی ادارے

ساخت

26.1 تمہید

26.2 تعلیمی و تصنیفی اداروں کا مفہوم

26.3 بیسویں صدی کے چند اہم تصنیفی ادارے

26.4 انجمن ترقی اردو ہند

26.5 دارالمصنفین ' اعظم گڑھ' یو۔پی

26.6 دارالترجمہ' جامعہ عثمانیہ' حیدرآباد

26.7 قومی کونسل برائے فروغ اردو اور دیگر تصنیفی ادارے

26.8 بیسویں صدی کے چند اہم تعلیمی ادارے

26.9 خلاصہ

26.10 نمونۂ امتحانی سوالات

26.11 فرہنگ

26.12 سفارش کردہ کتابیں

26.1 تمہید

دور حاضر میں ترسیل اور ابلاغ کے ذرائع کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔شعر و ادب کی ترسیل لازمی طور پر تصنیفی اور تعلیمی اداروں کی وساطت سے ہوتی ہے۔ استاد کی جانب سے شعر و ادب کی تفہیم کو تدریس کہا جاتا ہے جو تعلیمی اداروں میں ممکن ہے۔اس طرح کتابوں کی اشاعت کی وجہ سے قاری کو مطالعہ کا موقع دستیاب ہوتا ہے اور اس اشاعت کے عمل کو تصنیف کا درجہ دیا جاتا ہے۔ تعلیمی اور تصنیفی ادارے عہد حاضر میں تدریس اور مطالعے کی ضروریات پوری کر رہے ہیں۔ تعلیمی اداروں کے ذریعہ زبان و ادب اور علوم وفنون کو سمجھنے اور سمجھانے کا مقصد پورا ہو رہا ہے جب کہ تصنیفی اداروں کی جانب سے مختلف مضامین اور موضوعات اور کتابوں کی اشاعت سے علم وفن کے مطالعہ کے لیے سازگار ماحول پیدا ہو رہا ہے۔ اردو زبان و ادب کی ترقی اور ترویج میں تعلیمی اور تصنیفی اداروں مثلاً' فورٹ سینٹ جارج کالج' فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج وغیرہ کے قیام سے تعلیم کا رواج عام ہوا ہے۔ سرسید احمد خاں نے مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ قائم کر کے خانگی تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی اور سائنٹفک سوسائٹی کے توسط سے تعلیمی کارنامے انجام دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس طرح اردو میں تعلیمی و تصنیفی اداروں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا چنانچہ بیسویں صدی میں کئی تعلیمی اور تصنیفی ادارے سرکاری' غیر سرکاری اور خانگی سطح پر اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور یہ ادارے اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں اہمیت کے حامل ہیں۔ اس اکائی میں ایسے چند ہی اداروں کی تفصیلات پیش کی جائیں گی جو بیسویں صدی میں اردو زبان و ادب اور ثقافت کو پھیلانے کا وسیلہ بنے ہوئے ہیں۔

26.2 تعلیمی و تصنیفی اداروں کا مفہوم

ادارہ' انجمن' مجلس اور بزم جیسے الفاظ کا استعمال بیسویں صدی کی دین ہے۔ یہ الفاظ درحقیقت اجتماعیت کو ظاہر کرتے ہیں اور اجتماعیت کا

مفہوم بھی یہی ہے کہ کسی ایک مقصد کی تکمیل کے لیے کئی افراد ہم خیال ہو کر کام انجام دیں تو اس ہم خیالی کی وجہ سے کسی ادارے کا وجود ہوتا ہے۔ اگر اس ادارے کا کام تعلیم کا فروغ ہو تو اُسے تعلیمی ادارے کا درجہ دیا جائے گا اور اگر تصنیف و تالیف کی ترقی کی غرض سے ادارہ قائم ہو تو اسے تصنیفی ادارہ کہا جاتا ہے۔ ادارے کے قیام کے لیے عام طور پر کئی اشخاص کی ضرورت ہوتی ہے۔

تعلیمی و تصنیفی اداروں کا قیام سرکاری سطح پر بھی ہوسکتا ہے اور خانگی سطح پر بھی۔ حکومت کی امداد سے اور حکومت کے نامزد افراد کی وجہ سے کوئی ادارہ چلایا جائے تو اسے سرکاری تعلیمی و تصنیفی ادارے کا درجہ دیا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اردو اکاڈمیوں کا قیام اس بات کی دلیل ہے کہ اردو کی ترقی کے لیے حکومتی سطح پر سرکاری ادارہ اردو اکاڈمی کا قیام عمل میں لایا گیا جو سرکاری سطح پر عہدے دار کا انتخاب انجام دیتا ہے۔ جس کے ذمہ تعلیم و تصنیف دونوں شعبوں کی نگرانی ہوتی ہے۔ غیر سرکاری سطح پر کئی اشخاص آپسی رائے سے کوئی ادارہ قائم کریں تو اس کی کارکردگی کی بنیاد پر ایسے اداروں کو حکومتی امداد فراہم کی جاتی ہے۔

اس طرح تعلیمی اور تصنیفی ادارے سرکاری سطح پر بھی کام کرتے ہیں اور غیر سرکاری سطح پر بھی۔ اگر اداروں کی درجہ بندی کی جائے تو ان کی مختلف حیثیتیں ہوسکتی ہیں۔ حکومت کی جانب سے قائم کیے جانے والے اداروں کو سرکاری ادارے کہا جائے گا اور ایسے ادارے جن میں حکومت کسی قسم کی امداد دیتی ہے لیکن خانگی طور پر قائم کیا جائے تو اسے نیم سرکاری ادارے کا درجہ دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ خانگی اور شخصی ادارے بھی قائم کیے جاتے ہیں۔ ایسے ادارے جو حکومت کی امداد کے بغیر آپسی امداد کے ذریعہ قائم کیے جائیں انہیں خانگی ادارے اور کسی شخص کے نام پر یا کسی ایک شخص کی جانب سے قائم کیے جانے والے ادارے کو شخصی ادارے کا درجہ دیا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو سرکاری ادارے کا درجہ حاصل ہے۔ انجمن ترقی اردو ایک نیم سرکاری ادارہ ہے اس کے علاوہ سارے ہندوستان میں کئی خانگی اور شخصی ادارے قائم ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو کو خانگی ادارے کا درجہ حاصل ہے جب کہ دہلی کی غالب اکاڈمی شخصی ادارے کا درجہ رکھتی ہے۔

تصنیفی اداروں کا تعارف

ہندوستان میں سرکاری سطح پر اور خانگی بنیادوں پر تصنیفی ادارے قائم کرنے کا سلسلہ کافی پرانا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام اور فورٹ سینٹ جارج کالج کی شروعات کی وجہ سے سرکاری سرپرستی میں اٹھارویں صدی کے دوران کلکتہ اور مدراس میں تصنیفی اداروں کا آغاز ہوا۔ پھر اس کے بعد دلی کالج سے ہوتے ہوتے تصنیفی اداروں کی تاریخ علیگڑھ تحریک سے وابستہ ہوتی ہے۔ آزادی سے قبل تک ہندوستان میں لاتعداد شخصی، خانگی اور حکومت کی نگرانی میں کام کرنے والے تصنیفی ادارے موجود تھے۔ آزادی سے قبل مولانا شبلی نعمانی نے دارالمصنفین، اعظم گڑھ، یوپی کا ادارہ قائم کیا تھا۔ جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ حالی پبلشنگ ہاؤس کے نام سے ایک خانگی تصنیفی ادارہ قائم کیا گیا لیکن آزادی کے قبل ہی حکومت کی سرپرستی میں پبلیکیشن ڈویژن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ہندوستانی میں شائع ہونے والے ادبی رسالوں کے بذات خود تصنیفی ادارے موجود تھے۔ رسالہ ''دلگداز''، لکھنو، رسالہ ''نگار'' اور رسالہ ''ہمایوں'' کی جانب سے کتابیں شائع ہوتی تھیں۔ جو شخصی تصنیفی اداروں کی دلیل تھیں۔ خانگی تصنیفی اداروں میں انجمن ترقی اردو، حالی پبلشنگ ہاؤس، دارالمصنفین اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے علاوہ سرسید بک ڈپو اہمیت کے حامل ہیں۔ اس طرح بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ہندوستان کی سرزمین میں کتابوں، رسالوں اور تحقیقی کارناموں کو پیش کرنے کے لیے مختلف تصنیفی اداروں کا سلسلہ شروع ہوا جس کی توسیع آج کے دور تک جاری ہے۔

تعلیمی اداروں کا تعارف

ہندوستان میں مغل دور تک فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل رہا ہے۔ اس ملک پر انگریزوں کے قبضے کے بعد پہلی مرتبہ 1832ء میں ملک کی عدالتوں کی زبان اردو قرار دی گئی جس کے بعد ہندوستان کے مختلف خطوں میں اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ تصنیفی اداروں کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ، فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس اور دلی کالج کے بعد اگر کسی ادارے نے اردو تعلیمی

خدمات کو فروغ دینے میں حصہ لیا ہے تو وہ انجمن پنجاب ہے۔ انجمن پنجاب نے پہلی مرتبہ اردو ذریعۂ تعلیم سے نصاب تیار کرنے اور اس نصاب کے مطابق کتابیں شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ چنانچہ ادیب، ماہر، عالم، فاضل جیسے درجوں کے امتحانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس کے بعد سرسید تحریک کے زیر اثر مدرسۃ العلوم مسلمانان علیگڑھ کا قیام عمل میں لایا گیا جو ترقی کرتے ہوئے مسلم اورینٹل کالج سے آگے بڑھ کر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے بڑے تعلیمی ادارے میں تبدیل ہوگیا۔ شہر حیدرآباد میں اردو ذریعۂ تعلیم کو فروغ دینے کے لیے جامعاتی سطح پر آرٹس، سائنس اور کامرس کے علاوہ میڈیکل اور انجینئرنگ کی تعلیم کی سہولت اردو میں فراہم کرنے کے لیے جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس جامعہ نے اردو ذریعہ تعلیم سے میڈیکل انجینئرنگ اور قانون کی تعلیم کو فروغ دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ جامعہ عثمانیہ سے وابستہ دارالترجمہ نے کتابوں کی اشاعت کے لیے تصنیفی ادارے کی حیثیت سے اردو کتابیں شائع کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ اس طرح بیسویں صدی میں شہر حیدرآباد کے ذریعہ تعلیمی اداروں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس کی طویل تاریخ، ریاست حیدرآباد کے سربراہ میر عثمان علی خاں آصف سابع کی کارکردگی کی داد دیتی ہے۔

تعلیمی و تصنیفی اداروں کے مشترکہ کارنامے

بیسویں صدی میں اردو کے تعلیمی اور تصنیفی اداروں نے اہم کارنامے انجام دیے۔ کچھ ادارے تو ایسے تھے جنہوں نے صرف تعلیم کا حق ادا کیا جب کہ بے شمار اداروں نے صرف تصنیف کی طرف توجہ دی۔ جبکہ کئی ادارے ایسے تھے جنہوں نے تعلیم اور تصنیف کی طرف خصوصی توجہ دی۔ بیسویں صدی میں دارالمصنفین اعظم گڑھ، یوپی ایک ایسا ادارہ ہے جس نے معرکۃ الاراء تاریخی اور اسلامی کتابوں کی اشاعت کی ذمہ داری پوری کی جب کہ انجمن ترقی اردو نے اورنگ آباد منتقلی کے بعد اردو ذریعۂ تعلیم کی تحریک بھی چلائی اور تصنیفی ضروریات کی تکمیل بھی کی۔ چنانچہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لیے اول تا دسویں جماعت تک کی نصابی کتابوں کی اشاعت کا کام انجام دیا جب کہ بے شمار علمی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری رکھا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ بیسویں صدی کی ابتدائی تین دہائیوں کے دوران ہندوستان میں اردو کے کئی ایسے اہم ادارے قائم ہوگئے تھے جو اردو ذریعہ تعلیم کے فروغ اور اردو کتابیں شائع کرنے کی خدمت پر مامور تھے جن کے ذریعہ تصنیف و تالیف اور تعلیم کے کام انجام دیے جاتے رہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. تصنیفی ادارے سے کیا مراد ہے؟
2. اردو ذریعۂ تعلیم کا آغاز کب ہوا؟
3. چند تصنیفی اداروں کے نام بتایئے؟
4. سرسید نے کون سا مدرسہ قائم کیا تھا؟
5. جامعاتی سطح کی اردو تعلیم کہاں شروع کی گئی؟

26.3 بیسویں صدی کے چند اہم تصنیفی ادارے

آزادی کے قبل تک ہندوستان کو برصغیر کا درجہ حاصل تھا اور یہ ملک تہذیب اور تمدن علم و ادب کی وجہ سے عالمی شہرت کا حامل رہا۔ چوں کہ سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ اس لیے سارے ملک میں تصنیفی مراکز اور ادارے موجود تھے جو خوبصورت اور پُر از معلومات کتابیں شائع کر کے اردو کی شان میں اضافہ کر رہے تھے۔ ایسے اداروں میں تاج کمپنی لاہور کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔ تصنیف کو فروغ دینے کے لیے مختلف مطبع قائم کیے گئے تھے۔ جہاں کتابوں کی اشاعت کا کام انجام دیا جاتا تھا۔ مطبع نول کشور کا سلسلہ انیسویں صدی عیسوی میں شروع ہو کر بیسویں صدی تک جاری رہا۔ اگر بیسویں صدی کے تصنیفی اداروں کی درجہ بندی کی جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بعض تصنیفی

ادارے صرف چھاپہ مشینوں کی حد تک محدد تھے جہاں صرف کتابیں شائع ہوتی تھیں اور بعض تصنیفی اداروں میں کتابیں ترجمہ کرنے کا عمل بھی جاری تھا۔ جب کہ بے شمار تصنیفی ادارے ایسے تھے جو ادب تہذیب و ثقافت کو فروغ دینے کا کام انجام دے رہے تھے۔ ایسے اداروں میں سب سے اہم نام دارالمصنفین اعظم گڑھ کا تھا۔ جس کے بعد انجمن ترقی اردو نے تصنیف و تالیف کی دنیا میں نام کمایا' پھر دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ملک گیر شہرت ہوئی۔ اس کے علاوہ کئی خانگی تصنیفی ادارے جیسے حالی بک ڈپو' اعجاز پبلشنگ ہاؤس' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' فروغ اردو جیسے اداروں نے صرف تصنیفی خدمات کو اپنے ذمہ لے کر اردو کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آج کے دور میں حکومت کی جانب سے پبلیکیشن ڈویژن اور ہر ریاست میں حکومت کی جانب سے قائم کردہ ٹکسٹ بک بیورو کا قیام اور ان کے ذریعہ ہر ریاست کی تعلیمی ضروریات کے مطابق شائع ہونے والی نصابی کتابیں خود اس بات کی دلیل ہیں کہ بیسویں صدی میں تصنیفی اداروں کا احاطہ کافی وسیع ہوگیا ہے اور ہر بڑے شہر میں اشاعتی ادارے قائم ہیں۔ تصنیفی خدمات انجام دینے میں اردو کے اہم رسالوں نے بھی اپنی خدمات انجام دیں۔ ماہنامہ ''نگار'' کا اپنا پبلشنگ ہاؤس تھا۔ رسالہ شمع کا بذات خود شمع بک ڈپو اور اس طرح بیسویں صدی پبلشنگ ہاؤس' تجلی بک ڈپو اور ندوۃ العلما نے بیسویں صدی میں تصنیف و تالیف کی خدمات انجام دیں۔ سب سے زیادہ تصنیفی خدمات انجمن ترقی اردو اور دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد' ادارہ ادبیات اردو' حالی پبلشنگ ہاؤس' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' فروغ اردو لکھنو' سرسید بک ڈپو کے ذریعہ انجام دی گئیں اور یہ ادارے آج بھی اردو کتابوں کی اشاعت کے ذریعہ تصنیفی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

26.4 انجمن ترقی اردو ہند

انجمن ترقی اردو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک ادارہ تھا جس کو مولوی عبدالحق نے علیگڑھ سے الگ کر کے ایک مکمل ادارہ کی حیثیت سے حیدرآباد پھر شہر اورنگ آباد میں منتقل کیا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد اس انجمن کے دو حصے ہوگئے۔ ہندوستان میں انجمن ترقی اردو ہند اور پاکستان میں انجمن ترقی اردو پاکستان کا وجود رہا۔ مولوی عبدالحق کی نگرانی کی وجہ سے انجمن ترقی اردو کو فروغ حاصل ہوا۔ سب سے پہلے انجمن نے اردو ادبیات کی قدیم کتابیں مرتب کر کے شائع کرنی شروع کیں جس کی وجہ سے اس انجمن کی شہرت ہوئی پھر حکومت حیدرآباد کی جانب سے انجمن ترقی اردو کو نصابی کتابوں کی اشاعت کے لیے امداد دی گئی اور اردو انگریزی ڈکشنری تیار کرنے کے لیے بھی حیدرآباد کے بادشاہ آصف سابع میر عثمان علی خاں نے امداد کا اعلان کیا۔ اس طرح انجمن ترقی اردو کی خدمات سے ایک بہت بڑا انقلاب آیا اور اس ادارے کی کتابیں سارے ملک میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جانے لگیں۔ کتابوں کی اشاعت کے لیے مولوی عبدالحق نے اورنگ آباد میں اس انجمن کا مطبع قائم کیا جس کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت میں تیزی پیدا ہوئی۔ انجمن ترقی اردو کی بے شمار شاخیں ملک کے شہروں میں قائم ہوئیں۔ جس کا صدر مقام اورنگ آباد تھا۔ انجمن کی شاخوں کی وجہ سے اس کی کتابوں کی نکاسی کے لیے سہولت حاصل ہوئی۔

انجمن ترقی اردو کے تصنیفی کارنامے

اورنگ آباد میں انجمن ترقی اردو کی منتقلی کے بعد اس ادارے کی کارکردگی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ مولوی عبدالحق نے اعزازی ارکان' ہمہ وقتی ارکان اور مشاورتی ارکان کی ترتیب کے ذریعے انجمن کی ترقی کے لیے کام کیا اور اس کی شاخیں سارے ملک میں قائم ہونے لگیں۔ انجمن ترقی اردو سے وابستگی کے بعد مولوی عبدالحق نے اس ادارے کے ذریعے جو تصنیفی کارنامے انجام دیے انہیں چار مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے پرانے تذکروں اور نایاب کتابوں کی ترتیب و اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جس کے ذریعے نکات الشعرا' عقد ثریا اور ایسے ہی بے شمار تذکرے شائع ہوئے۔ انجمن ترقی اردو کی تصنیفی خدمات میں دوسرا طریقہ تحقیق سے متعلق تھا۔ مولوی عبدالحق نے تحقیق پر توجہ دی اور تحقیقی کام کرنے والوں کی کتابوں کو شائع کرنے کا منصوبہ بنایا جس کی وجہ سے مشہور کتابیں مثلاً سب رس' نصرتی اور معراج العاشقین وغیرہ' ادارے کی جانب سے شائع ہوئیں۔ انجمن ترقی اردو کی تصنیفی خدمات میں تیسرا مرحلہ نصابی کتابوں کی اشاعت کا تھا۔ مولوی عبدالحق نے ریاست حیدرآباد کے تعلیمی نصاب کی کتابیں شائع کر کے اس تصنیفی ادارے کو فروغ دیا اور انجمن ترقی اردو کا چوتھا اور آخری کارنامہ یہ ہے کہ مولوی عبدالحق نے

اصطلاحات کی اشاعت اور انگریزی اور اردو لغت کی ترتیب کا کام انجام دیا۔ اس طرح اس ادارے کے ذریعہ مختلف تصنیفی کارنامے انجام دیے گئے۔

انجمن کی مطبوعہ نصابی کتابیں

انجمن ترقی اردو نے پہلی مرتبہ 'درس آصفیہ' کے زیرعنون اردو کے قاعدے کو چھوڑ کر پہلی سے لے کر نویں جماعت تک کی نصابی کتابیں شائع کیں۔ یہ نصابی کتابیں تدریجی ارتقا کی علمبردار تھیں۔ ہر کتاب کے پیش لفظ میں مولوی عبدالحق نے خود یہ لکھا ہے کہ سابق کتاب میں کس قدر الفاظ طلبا کو سکھائے گئے اور نئی کتاب علم کے اضافے کے ساتھ ساتھ کس قدر نئے الفاظ سکھانے کا وسیلہ بنتی ہے۔ ان نصابی کتابوں کی کتابت و طباعت منفرد تھی۔ مولوی عبدالحق نے چھوٹی جماعتوں کی نصابی کتابیں ترتیب دینے کے لیے بھوپال سے کاتبین کو مقرر کیا تھا تاکہ وہ نمایاں اور واضح الفاظ کے ذریعہ کتاب ترتیب دیں جس سے کہ طلبا کو پڑھنے میں آسانی ہو یعنی مولوی عبدالحق نے بچوں کے مزاج' ان کی نفسیاتی ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ نصابی کتابیں ترتیب دیں جسے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کا ایک اہم کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔

انجمن کی مطبوعہ تحقیقی وتنقیدی کتابیں

انجمن ترقی اردو کے قیام کے طویل عرصہ بعد تک بھی تحقیق کے فن پر اردو میں کوئی مبسوط کتاب موجود نہیں تھی۔ خود مولوی عبدالحق نے اپنے ذوق کی تکمیل کے نتیجہ میں تحقیق کے فن کو اختیار کیا تھا۔ انہوں نے تحقیقی کتابیں شائع کرنے کے لیے انجمن ترقی اردو کو ایک وسیلہ کے طور پر استعمال کیا۔ ایک جانب قدیم شعرا کا کلام محفوظ کرنا اور ان کے کلام کے محاسن کو نمایاں کرنا مولوی عبدالحق کے پیش نظر رہا جس کے نتیجہ میں ترتیب کے ذریعہ تحقیق کا حق ادا کیا گیا۔ مولوی عبدالحق کی مرتبہ کتابیں ''انتخاب کلام میر'' اور مرحوم دہلی کالج تحقیقی وتنقیدی ژرف نگاہی کی علامت بن گئی ہیں۔ کافی تحقیق کے بعد مولوی عبدالحق نے اردو کے قدیم تذکرے مرتب کر کے شائع کیے۔ ان کا یہ کارنامہ اہمیت کا حامل ہے۔ مولوی عبدالحق نے شخصی تحقیق کی بنیاد رکھتے ہوئے انجمن ترقی اردو سے نصرتی' سب رس جیسی کتابیں شائع کیں جو تحقیق کے میدان میں بڑی اہمیت کی حامل کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ مولوی عبدالحق کی تحقیقی خدمات پر طویل مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ اس موقع پر صرف ان کی کارکردگی کا اظہار مقصود ہے۔

انجمن کی مطبوعہ علوم وفنون کی کتابیں

انجمن ترقی اردو کے قیام کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ صرف شعروشاعری کو فروغ دینے کو مقصد نہ بنایا جائے بلکہ شعروادب کے ساتھ علوم وفنون کے فروغ پر بھی توجہ دی جائے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق نے فنون کی ترقی کے لیے سب سے پہلے کتاب اصطلاحات پیشہ وران کئی جلدوں میں شائع کی۔ سائنسی شعور کو عام طور پر فروغ دینے کے لیے انجمن کی جانب سے رسالہ ''سائنس'' جاری کیا۔ ادب کے علاوہ تاریخ فلسفہ' نفسیات' اسلامیات اور دیگر شعبہ جات سے متعلق کتابیں شائع کرنے پر توجہ دی جس کے لیے کئی مترجمین کا تقرر عمل میں آیا۔ عبدالحق نے علوم وفنون کی کتابیں شائع کرنے کا تجربہ سرسید سے حاصل کیا تھا۔ چونکہ ان کے دور میں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے ذریعہ علوم وفنون پر نصابی کتابیں شائع ہو رہی تھیں۔ اس لیے عبدالحق نے علوم وفنون کے ایسے گوشوں کو انجمن کے لیے مختص کیا جن کا تعلق خاص فن سے تھا جس کے نتیجہ میں اصلاحات پیشہ وروں جیسی کتابیں ہی نہیں بلکہ خود مولوی وحیدالدین سلیم کی کتاب ''وضع اصلاحات بھی'' انجمن ترقی اردو سے شائع ہوئی۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. اردو کا پہلا تصنیفی ادارہ کون سا ہے؟
2. انجمن ترقی اردو کی مطبوعہ نصابی کتابیں کون سی ہیں؟
3. انجمن نے کون سی تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں؟
4. علوم وفنون پر انجمن ترقی اردو کی چند کتابوں کے نام بتایئے۔

26.5 دارالمصنفین اعظم گڑھ یوپی

اسلامیات اور اسلامی علوم کی تحقیق و ترویج کے علاوہ ان علوم وفنون کو اردو میں متعارف کروانے کے لیے علامہ شبلی نعمانی کی تحریک پر قائم کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کو ایک تصنیفی ادارے کا درجہ حاصل ہے جہاں تحقیق' تصنیف' تالیف' ترتیب اور تلخیص کا کام انجام دیا جاتا ہے۔ اسی ادارے سے مشہور زمانہ رسالہ ''معارف'' کا اجرا عمل میں لایا گیا۔ جو برسوں سے آج تک جاری ہے۔ دارالمصنفین نے تحقیق کو اپنا بنیادی پیشہ بنایا جس کی وجہ سے اس ادارے کی بیشتر کتابیں تحقیق و تلخیص سے متعلق ہوتی ہیں۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دارالمصنفین نے اپنی تصنیف و تالیف کے ذریعہ ٹھوس تحقیق کی بنیاد رکھی ہے۔ اس ادارے نے مشرقی ادبیات' مشرقی شعریات اسلام اور اسلامی علوم' اسلامی تاریخ اور فنون پر سلسلہ وار کتابیں شائع کرکے سارے ہندوستان میں ان کی پذیرائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ دارالمصنفین کی تصانیف میں عربی' فارسی اور انگریزی زبان سے استفادہ کا رجحان بکثرت دکھائی دیتا ہے۔ اس ادارے سے وابستہ افراد میں سید سلیمان ندوی' عبدالسلام ندوی' صباح الدین' عبدالرحمٰن جیسے محققین قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے ٹھوس تحقیق کے ذریعہ مشرقی علوم وفنون کی ترقی و ترویج میں حصہ لینے کے لیے اپنی نادر و نایاب کتابوں کا اضافہ کیا۔

دارالمصنفین کی مطبوعہ تصانیف

اعظم گڑھ میں قائم اس ادارے نے افسانوی اور غیر افسانوی ادب کے علاوہ تحقیق پر توجہ دی اور تحقیقی کتابیں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا جس کی وجہ سے خاص کتابت اور طباعت کے ذریعہ دارالمصنفین کی کتابیں شائع ہونے لگیں اور ان کتابوں کی طویل فہرست ہے جن کا تعلق اسلام کی عظمت رفتہ اور اسلامی علوم وفنون سے ہے۔ اس ادارے سے وابستہ قلمکاروں کی فہرست بھی کافی طویل ہے اور یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ تحقیقی ذہن رکھنے والا تخلیق کار ہی دارالمصنفین سے وابستگی رکھ سکتا ہے جس کا ذہن اسلام اور اسلامیات سے فطری طور پر وابستہ ہو۔ غرض بے شمار محققین نے دارالمصنفین کے ذریعہ اپنی عمدہ تحریروں کے نمونے پیش کیے۔

دارالمصنفین کی تاریخ اسلام اور ہند پر تصانیف

دارالمصنفین اعظم گڑھ کا یہ کارنامہ رہا ہے کہ اس نے تاریخ اسلام اور ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار پر کیے جانے والے اعتراضات کے جوابات کے بجائے تاریخی پس منظر میں حقائق کو پیش کرنے کے لیے تاریخی سیریز کا سلسلہ شروع کیا جس کے تحت اسلام' صحابہ اور صحابیات' امہات المومنین' مسلمان مورخین اور اسلامی علوم جیسے تفسیر' فقہ' حدیث اور اجتہاد پر دارالمصنفین کی کئی کتابیں شائع ہوئیں جن کی فہرست معارف کے شماروں میں شائع ہوتی رہتی ہے۔ تاریخِ اسلام کے اس تعارف کے ساتھ ساتھ دارالمصنفین نے ہندوستانی تاریخ لکھنے پر بھی توجہ دی۔ چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار پر لاتعداد کتابیں شائع ہوئیں۔ علامہ عبدالسلام ندوی اور صباح الدین عبدالرحمٰن کی بے مثل تحقیقی کتابیں ہندوستانی تاریخ سے متعلق ہیں اور ہندوستان میں فن تعمیر' فنِ موسیقی اور فنِ تقریر کو فروغ دینے والے مسلمانوں کی تاریخی حقیقت و اہمیت کو بھی دارالمصنفین نے نمایاں کیا۔

دارالمصنفین کی عام مطبوعات

تحقیق کو بنیاد بنا کر دارالمصنفین میں تاریخ' تاریخ اسلام' اصول تاریخ اور تاریخ ہند' فقہ وعقائد' تفسیر اور تعلیم و تربیت کے علاوہ دارالمصنفین میں ایسی کتابیں بھی لکھی گئیں جن کا تعلق عام موضوعات سے ہے۔ ''اسلام میں رواداری'' دارالمصنفین کی ایک ایسی کتاب ہے۔ اسلامی شخصیات اور اہم کارنامے انجام دینے والے مصنفین پر شائع ہونے والی کتابیں بھی دارالمصنفین کی عام مطبوعات میں شامل ہیں۔ اس ادارے نے ادبی ذوق وشوق سے متعلق علوم پر کتابیں نہیں شائع کیں بلکہ ٹھوس حقائق سے وابستہ علوم وفنون کو فروغ دینے کے لیے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا اور یہ ادارہ اب بھی اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. دارالمصنفین کہاں واقع ہے اور اسے کس نے شروع کیا؟
2. دارالمصنفین نے کس قسم کی کتابیں شائع کیں؟
3. دارالمصنفین کے رسالہ کا نام بتایئے؟
4. درالمصنفین کی مطبوعات کون کون سے فن پر ہیں؟

26.6 دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی

ریاست حیدرآباد کی تعلیمی ترقی کے لیے آصف سابع میر عثمان علی خان نے اپنے ایک فرمان کے ذریعے اردو ذریعۂ تعلیم کی ایک یونیورسٹی کے قیام کا اعلان کیا۔ اس یونیورسٹی کی نصابی کتابوں کی اردو میں اشاعت کے لیے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ 1912ء کے فرمان کے ذریعہ دارالترجمہ کے قیام کا اعلان کیا گیا جس میں سائنس' انجینئرنگ' میڈیسن' قانون اور علوم عمرانیات کی کتابیں انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ کرکے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس محکمہ کو آزادانہ طور پر کام کرنے کی سہولت فراہم کی گئی۔ چنانچہ محکمہ کا سربراہ ناظم کی حیثیت سے کام کرتا جو مختلف علوم وفنون کے مترجمین کے تقرر کا مجاز تھا۔ دارالترجمہ سے وابستہ تمام ملازمین کی تنخواہ اور جز وقتی ملازمین کی یافت کی ذمہ داری حکومت کے سپرد تھی۔ ملک کے کونے کونے سے قابل اور ماہر اساتذہ کا دارالترجمہ میں تقرر کیا گیا جنہوں نے مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا ترجمہ کرکے خوبصورت طباعت اور جلد سازی کے ذریعہ کتابیں پیش کیں۔ دارالترجمہ کی کتابیں اس لیے اہمیت کی حامل ہیں کہ علوم وفنون کی یہ کتابیں ملک بھر میں پہلی مرتبہ سرکاری سرپرستی میں شائع ہورہی تھیں۔ اس ادارے سے (7) ناظم اور (129) مترجمین وابستہ رہے جنہوں نے مختلف علوم وفنون کی (386) کتابیں ترجمہ کرکے شائع کیں۔ ریاست کی سرکاری زبان اردو تھی اور جامعہ عثمانیہ میں انٹرمیڈیٹ سے لے کر ایم۔اے کی سطح تک اور میڈیکل' انجینئرنگ' قانون اور سائنسی علوم کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ اور اسی زبان میں نصاب کی تکمیل کے لیے دارالترجمہ نے اردو میں کتابیں ترجمہ کیں جن کی اشاعت دارالطبع سرکار عالی کے ذریعہ عمل میں لائی جاتی تھی۔ پولیس ایکشن کے بعد جامعہ عثمانیہ کے اردو ذریعہ تعلیم کا خاتمہ ہوگیا۔ چنانچہ اردو نصابی کتب کی ضرورت باقی نہ رہی۔ دارالترجمہ کے ملازمین کو دوسرے شعبہ جات میں ضم کردیا گیا اور 18 دسمبر 1952ء کی رات کو دارالترجمہ کے ذخیرے میں آگ لگنے کی وجہ سے نادر ونایاب کتابیں جل کر خاکستر ہوگئیں۔ اس طرح 1917ء سے لیکر 1950ء تک اردو میں کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی لیے دارالترجمہ کی ساری کارکردگی کو 33 سالہ خدمات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سائنسی علوم اور علوم عمرانیات کے علاوہ طب' قانون اور انجینئرنگ پر دارالترجمہ کی جانب سے شائع شدہ نادر ونایاب کتابیں آج بھی مختلف کتب خانوں میں اپنے دور کی داستان سناتی ہیں۔

دارالترجمہ کے مترجمین اور تراجم

چونکہ جدید علوم وفنون پر انگریزی میں بے حساب کتابیں دستیاب تھیں اور ملک میں پہلی مرتبہ ایک ملکی زبان کو تعلیمی سطح پر رائج کرنے کا تجربہ جامعہ عثمانیہ میں کیا گیا تھا۔ اس لیے اردو نصابی کتابوں کی اشاعت کے لیے دارالترجمہ میں تین قسم کے مترجمین کا تقرر عمل میں آیا۔ (1) ہمہ وقتی مترجمین (2) جز وقتی مترجمین اور (3) وقتی مترجمین۔ جن کے ذمہ یہ کام ہوتا تھا کہ متعلقہ مضمون کی نصابی کمیٹی جس کتاب کی سفارش کرلے اور اس کا اردو ترجمہ کرکے پیش کیا جائے۔ ترجمہ شدہ مسودوں پر ناظر ادبی اور مذہبی کی رائے طلب کی جاتی اور مترجم کو یہ تاکید کی جاتی تھی کہ کوئی نئی اصطلاح کتاب میں شامل ہو تو اس اصطلاح اور اس کے متبادل ترجمہ کو حاشیہ پر لکھ دیا جائے تاکہ اس اصطلاح کے بارے میں اصطلاحات کمیٹی غور کرسکے۔ ناظر ادبی اور ناظر مذہبی کتاب کے ترجمہ کے بعد اس میں کسی قسم کی مذہبی اور ادبی بے ضابطگی کے باضابطہ ذمہ دار تھے۔ مترجمین کا کام یہی ہوتا تھا کہ وہ ترجمہ شدہ مسودہ ناظم کے حوالے کردیں۔ دارالترجمہ سے وابستہ مترجمین کی طویل فہرست ہے جن میں عبداللہ عمادی' سید ہاشمی

فرید آبادی، عبدالماجد دریابادی، عبدالحلیم شرر، مرزا محمد ہادی رسوا اور جوش ملیح آبادی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں جنھوں نے علوم عمرانیات، سائنسی علوم، میڈیکل، انجینئرنگ اور قانون کی کتابیں شائع کر کے دارالترجمہ کے معیار و مرتبہ کو بلند کیا۔

دارالترجمہ اور علوم وفنون کی خدمات

جامعہ عثمانیہ میں جن علوم وفنون کی تعلیم و تدریس کا انتظام تھا ان کی تمام کتابیں دارالترجمہ سے اردو میں شائع کی جاتی رہیں۔ اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ اور گریجویشن کی تعلیم کی اہمیت تھی۔ اس لیے آرٹس، سائنس، کامرس، انٹرمیڈیٹ اور اس طرح آرٹس اور سائنس، گریجویشن، قانون کے علاوہ میڈیکل اور انجینئرنگ کی بے شمار معیاری کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ یہ کتابیں درحقیقت دارالترجمہ کے ذریعہ شائع ہوئیں لیکن ان کی حیثیت جامعہ عثمانیہ کے نصاب کی تھی۔ یورپ کی مشہور یونیورسٹیاں جیسے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی وغیرہ کے نصاب کو سامنے رکھ کر جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبہ جات کے بورڈ آف اسٹڈیز کے ذمہ داروں نے جس کتاب کو معیاری نصاب کا درجہ دیا اسے مترجم کے حوالے کیا جاتا اور ترجمے کے لیے وقت مقرر کردیا جاتا تھا تاکہ وہ مناسب وقت میں ترجمہ پیش کرسکے۔ اس طرح دارالترجمہ میں علوم وفنون کی کتابیں بھی ترجمہ کی گئیں۔

دارالترجمہ میں وضع اصطلاحات

کسی علم سے متعلق ایک زبان میں موجود لفظ کے لیے دوسری زبان میں نیا لفظ وضع کرنے کو اصطلاح وضع کرنا کہتے ہیں۔ دارالترجمہ کے ذریعہ انجینئرنگ، میڈیسن، قانون، سائنس اور علوم عمرانیات کی ایک لاکھ سے زیادہ اصطلاحات تیار کی گئیں۔ مترجم پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی تھی کہ کوئی بھی نیا لفظ ترجمہ کے دوران محسوس کیا جائے اور اس کا متبادل اردو میں نہ ہو تو اس انگریزی لفظ کا معنی اور اس کی مختصر تفصیل حاشیہ میں درج کردی جائے۔ ایسے الفاظ کی فہرست تیار کر کے ایک کمیٹی کے سپرد کیا جاتا۔ اس کمیٹی کو دارالترجمہ کی وضع اصطلاحات کمیٹی کا نام دیا گیا تھا۔ اس کمیٹی نے عینت، تپش پیما، باد پیما، حیہ اور مائع جیسی نئی اصطلاحات اردو زبان کو دیں۔ ہر علم وفن کی اصطلاحات کو حروف تہجی سے ترتیب دے کر اس کی کتابیں تیار کی جاتی تھیں اور کتاب کے آخر میں ان اصطلاحات کا اندراج ہوتا تھا۔ کتابی شکل میں اصطلاحاتِ طب، اصطلاحاتِ کیمیا، اصطلاحاتِ فلسفہ جیسی کتابیں دارالترجمہ سے شائع ہوچکی ہیں۔ دارالترجمہ کی جانب سے اصطلاحاتِ علمیہ، اعلام و اسما اور ترقیمات کے مترادفات اردو میں تیار کیے گئے اور دارالترجمہ کی 32 سالہ کارکردگی میں ان کی تعداد (91,000) تصور کی جاتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق (12) سب کمیٹیوں نے (32) علوم وفنون کی نئی اصطلاحات مرتب کر کے اردو الفاظ کے ذخیرے میں نیا اضافہ کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. دارالترجمہ کب قائم ہوا؟
2. علوم وفنون کی دارالترجمہ نے کس طرح خدمت کی؟
3. دارالترجمہ کی اصطلاحات کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
4. دارالترجمہ کی چند مترجمین کے نام بتائیے۔
5. دارالترجمہ کیسے ختم ہوا؟

26.7 کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی

ہندوستان کی آزادی کے بعد اردو کی ترقی اور اس زبان میں علوم وفنون پر شعر و ادب کی کتابوں کی اشاعت کے لیے حکومتی اعلامیہ کے ذریعہ ایک ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس کا نام ''ترقی اردو بیورو'' رکھا گیا جس کے ذمہ نایاب اردو کتابیں شائع کرنا، تحقیقی کتابوں کی اشاعت اور علوم وفنون پر شائع ہونے والی انگریزی کتابوں کے ترجمہ کے علاوہ تاریخ، ثقافت، بچوں کا ادب جیسے موضوعات پر ادیبوں سے کتابیں

طلب کر کے اس کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کرنا ہے۔ اس ادارے نے علم وادب کی بے شمار کتابیں شائع کیں۔ طویل عرصہ بعد اس کے نام میں تبدیلی لائی گئی اور دور حاضر میں اس کا نام ''قومی کونسل برائے فروغ اردو'' رکھا گیا۔ مختلف علوم وفنون پر اس ادارے کی جانب سے 500 سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس ادارے کی حیثیت آزادانہ ہے اور ادارے کی کارکردگی کو فعل اور مستحکم رکھنے کے لیے مختلف عہدوں پر تقررات عمل میں لائے جاتے ہیں اور اس ادارے کی کارکردگی کو نمایاں کرنے کے لیے عوامی نمائندے بھی منتخب کیے جاتے ہیں۔ اس ادارے کی شائع شدہ کتابوں کو ملک کے کونے کونے میں پھیلانے کے لیے پبلیکیشن ڈویژن جیسا حکومتی ادارہ اس کی مدد کرتا ہے اور خود کونسل کے مختلف مراکز شمالی ہند اور جنوبی ہند میں موجود ہیں۔ آندھرا پردیش کی نصابی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرا کے ان کی اشاعت کی ذمہ داری بھی کونسل نے قبول کی ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

حالی بک ڈپو

آزادی سے قبل اردو دنیا میں کتابوں کی اشاعت کے لیے حالی بک ڈپو کو غیر معمولی شہرت حاصل تھی۔ اردو کا یہ واحد ادارہ تھا جو اردو کتب کی اشاعت کی ذمہ داری انجام دیا کرتا تھا۔ اس ادارے نے ابتدا سے لے کر 1926ء تک اردو کے تمام نثر نگار، شاعر، مورخ، مفسر، سوانح نگار اور دوسرے علوم وفنون کی نمائندگی کرنے والے قلمکاروں کی ایک جامع کتاب ''مصنفین اردو'' شائع کی تھی جس میں حروف تہجی کے اعتبار سے ہر فن کے بہترین ادیبوں کی سوانح اور ان کی تمام کتابوں کا تعارف موجود تھا۔ مولانا حالی کے نام سے قائم کردہ اس بک ڈپو نے صرف حالی کی کتابیں ہی نہیں بلکہ بے شمار عملی و ادبی کتابیں شائع کر کے انہیں اردو دنیا میں شہرت دلائی۔ اردو کے قدیم تصنیفی اداروں میں حالی بک ڈپو کے اشاعتی کارناموں کی بڑی اہمیت ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی نمائندگی کرنے والے اس ادارے نے سب سے پہلے جامعہ کی نصابی کتابیں اردو میں شائع کرنے کی طرف توجہ دی لیکن پھر رفتہ رفتہ اس ادارے نے مختلف علوم وفنون کی کئی کتابیں شائع کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ اس ادارے کے کاروبار میں جب خاطر خواہ اضافہ ہوا تو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی کی مختلف شاخیں قائم ہوئیں، چنانچہ آج بھی علیگڑھ اور ممبئی میں اس کی شاخیں موجود ہیں جو کتابوں کی نکاسی کا کام انجام دے رہی ہیں۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے بچوں کے لیے ایک رسالہ ماہنامہ پیام تعلیم اور اردو ادب کی صورت حال کو نمایاں کرنے کے لیے کتاب نما شائع کرنا شروع کیا۔ ابتدا میں کتاب نما کی حیثیت کتابوں کی فہرست اور اہم کتابوں پر تبصرے شائع کرنے کی حد تک محدود تھی لیکن دور حاضر میں ''کتاب نما'' ایک ادبی رسالہ کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ بچوں کے ادب پر مکتبہ کی خوبصورت اور بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور سب سے پہلے خوبصورت نصابی کتابیں شائع کرنے کا سلسلہ بھی مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے شروع کیا اور اس ادارے کی شائع شدہ نصابی کتابیں سارے ہندوستان کے اردو مدارس میں نصابی ضرورتوں کی تکمیل کیا کرتی تھیں۔ 1956ء کے بعد ملک میں ریاستوں کی تنظیم جدید کی وجہ سے ہر ریاست نے اپنا نصاب علیحدہ ترتیب دیا تو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نصابی کتابوں کی اہمیت میں کمی واقع ہوئی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو کے تصنیفی اداروں میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کا بھی قابل قدر مقام ہے۔ اس ادارے نے خوبصورت طباعت اور مصور کتابوں کی اشاعت کے ذریعہ اردو دنیا میں نام کمایا اور اس ادارے کی تصانیف کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور اس کی جانب سے ہر ماہ شائع ہونے والا رسالہ ''کتاب نما'' بہت معروف ہو گیا ہے

سرسید بک ڈپو، علی گڑھ

اگرچہ سرسید احمد خاں کی ایما پر اردو میں علوم وفنون کی کتابیں شائع کرنے کے لیے انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ لیکن 1903ء کے بعد اس ادارے کو مولوی عبدالحق نے ملک گیر ادارے کا درجہ دے دیا۔ جس کے بعد علیگڑھ کی تصنیفی و تالیفی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اس جامعہ سے وابستہ مختلف قلمکاروں نے سرسید بک ڈپو کی بنیاد رکھی جس کے اغراض و مقاصد علیگڑھ کے ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف کی اشاعت قرار

پائے۔اگرچہ کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ ہی میں علوم وفنون کو بھی اہمیت دی گئی لیکن سرسید بک ڈپو کو ادبی تصانیف پیش کرنے کے باعث بڑی قدر ومنزلت سے دیکھا جانے لگا۔اس ادارے سے علیگڑھ کے بیشتر اساتذہ وابستہ رہے ہیں جن کی علمی وادبی خدمات پر پیش کردہ اہم کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔اس ادارے نے ایک دو ماہی رسالہ ''الفاظ'' کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا لیکن وہ بند ہوگیا۔ادب اور ادبی موضوعات کے علاوہ تاریخ ادب اور تحقیق وتنقید میں سرسید بک ڈپو کی جانب سے شائع شدہ کتابیں ساری اردو دنیا میں شہرت رکھتی ہے۔اس ادارے نے کئی کتابیں مرتب کرکے شائع کیں۔جس کی وجہ سے اردو شعرا وادبا کے منتخبہ ادبی کارناموں کی اشاعت عمل میں آئی۔

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی

اردو کتابوں کی اشاعت اور ان کی نکاسی کی غرض سے دہلی میں قائم شدہ اس ادارے نے شعر وادب اور تحقیق وتنقید کی نمایاں خدمات انجام دیں۔خاص طور پر تاریخ ادب کی تحقیقی کاوشوں کو منظرِ عام پر لانے میں اس ادارے کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ابتدا میں اس ادارے نے کتابوں کی فروخت کا سلسلہ شروع کیا لیکن رفتہ رفتہ اردو کتابوں کی اشاعت کی ذمہ داری بھی اسی ادارے نے قبول کی۔خاص طور پر وپ تخلیقات جو پاکستان میں ادب اور ادبیات کے تعلق سے منظر عام پر آرہی ہیں انہیں ہندوستان گیر شہرت دلانے میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس کے کارناموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

فروغ اردو لکھنؤ

اردو کے تصنیفی اداروں میں فروغ اردو لکھنؤ کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔اس ادارے کے توسط سے ایک رسالہ ''فروغِ ادب'' بھی شائع ہوتا تھا۔جس کے خاص نمبروں میں حالی، شبلی اور چکبست نمبر اہمیت کے حامل ہیں۔اس ادارے کی جانب سے ادبی تنقید اور ادبی تاریخ کے علاوہ بے شمار کتابیں شائع ہوتی رہیں جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔فروغ اردو نے جہاں نئی کتابوں کی اشاعت پر توجہ دی وہیں قدیم نادر و نایاب کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا۔اس ادارے کا مقصد ادب کی خدمت رہا ہے۔اردو کے بیشتر نقادوں کی کتابیں، قدیم تذکرے، مختلف ناول اور لغات کی اشاعت کا کام اس ادارے نے انجام دیا اور آزادی کے بعد اس ادارے کی خدمات کا سلسلہ وسیع ہوتا گیا لیکن ادارہ فروغ اردو لکھنو کے کتب خانے میں آگ لگ جانے کی وجہ سے اس ادارے کی اشاعتی خدمات میں تعطل پیدا ہوگیا ہے۔رسالہ فروغ ادب کی بھی مسدودی کے باعث اس ادارے کی خدمات کا سلسلہ دراز ہوتا نظر نہیں آتا۔تاہم اس ادارے کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

نسیم بک ڈپو، لکھنو

اردو کی تاریخی اور نیم تاریخی، علمی وادبی کتابوں کی اشاعت کا ذمہ اپنے سر لیتے ہوئے نسیم بک ڈپو نے لکھنؤ میں اپنی خدمات کا آغاز کیا۔اس ادارے سے عبدالحلیم شرر لکھنوی، صادق حسین سردھنوی، اسلم جیراجپوری، آل احمد اور ایسے ہی بے شمار تاریخی ناول نگاروں کی تصانیف کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔اس ادارے نے بچوں کے ادب پر بھی توجہ دی اور انتہائی خوبصورت کتابیں شائع کیں۔تنقید وتحقیق کے سلسلے میں بھی اس ادارے کی تصانیف اعتبار کا درجہ رکھتی ہیں لیکن خاص طور پر افسانوی ادب کی اشاعت میں اس ادارے نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ضخیم اور قدیم تاریخی ناولوں کی اشاعت اور پھر اس کی دوبارہ اشاعت کا کام نسیم بک ڈپو نے بہ حسن وخوبی انجام دیا۔اس ادارے کی بے شمار کتابیں مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

شگوفہ پبلکیشن، حیدرآباد

زندہ دلان حیدرآباد کا ایک ترجمان ماہنامہ شگوفہ ابتدا میں ڈیڑھ ماہی تھا۔اس ادارے نے جہاں طنز ومزاح کے فروغ میں حصہ لیا وہیں طنزیہ اور مزاحیہ ادب اور دوسری ادبی تخلیقات کی اشاعت کی طرف بھرپور توجہ دی۔مختلف حیدرآبادی ادیبوں جسے مسیح انجم، یوسف ناظم، پرویز یداللہ

مہدی، ڈاکٹر حبیب ضیا، ڈاکٹر عباس متقی وغیرہ کی کتابیں شگوفہ کے ادارے سے شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ ماہنامہ شگوفہ کے خاص نمبروں میں ڈرامہ نمبر اور ہندوستانی ادب نمبر کے علاوہ مختلف طنز و مزاح نگاروں کی رحلت پر شائع ہونے والی خصوصی اشاعتیں اہمیت کی حامل ہیں۔ ادارہ شگوفہ نے طنز و مزاح کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے مقالے بھی شائع کیے اور بے شمار تصانیف کی اشاعت بھی کی۔ شہر حیدرآباد ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر اردو کے طنز و مزاح نگاروں کو متحد کرنے میں ادارہ شگوفہ ایک اہم کردار کا حامل ادارہ ہے جس نے حیدرآباد کے سنجیدہ کاموں کی ہمت افزائی کی ذمہ داری بھی قبول کی۔ چنانچہ حیدرآباد میں بیرونی مشاہیر و ہندوستان میں طنز و مزاحیہ ادب جیسے موضوعات کو بھی اپنے دائرہ کار میں شامل کیا۔ چنانچہ اس قسم کی تحقیقی کتابیں بھی شگوفہ پبلکیشن کے یادگار کارناموں کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس ادارے نے شعری مجموعوں کے بجائے نثری کتابوں کی اشاعت پر توجہ دی اور بلاشبہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ شگوفہ پبلکیشن کی اشاعتی کاوشوں کے باعث کئی طنزیہ اور مزاحیہ نثر نگار و شعرا منظر عام پر آئے اور انہوں نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے توسط سے جاری اس ادارے نے اگرچہ مالی اعانت کا طریقہ اختیار نہیں کیا لیکن ادیبوں کی کتابوں کی اشاعت کے ذریعہ مختلف ادیبوں کے کارناموں کو اردو دنیا میں متعارف کروانے کا کارنامہ انجام دیا۔

ادبی ٹرسٹ حیدرآباد

حیدرآباد کی ادبی شناخت کو برقرار رکھنے اور اس علاقے کے مصنفین کی کتابوں کی اشاعت اور ان کی نکاسی کی غرض سے ادارہ سیاست نے ادبی ٹرسٹ کی بنیاد رکھی۔ روزنامہ سیاست کے توسط سے بھی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ جن کی نکاسی کے لیے ادبی ٹرسٹ کے وسیلے کو استعمال کیا گیا۔ روزنامہ سیاست نے ''حیدرآباد تب اور اب''۔ ''گذشتہ حیدرآباد''۔ ''جامعہ عثمانیہ''۔ ''پیغمبرانِ حق'' اور ایسی ہی بے شمار کتابیں شائع کیں تو ان کتابوں کو عوام تک پہنچانے کے لیے ادبی ٹرسٹ کی خدمات حاصل کیں۔ اردو کتب خانے اردو مدارس اور اردو اداروں کی مالی اعانت کے لیے ادبی ٹرسٹ کی جانب سے سالانہ مشاعرہ کا انعقاد اور اس کی آمدنی عملی اور تعلیمی اداروں کے لیے مختص کرنے کا کارنامہ بھی ادبی ٹرسٹ کے ذریعہ انجام دیا گیا۔ مشاعرے سے ہونے والی آمدنی ادارہ ادبیات اردو اور اردو آرٹس ایوننگ کالج کی ترقی کے لیے استعمال کی گئی۔ اور اس کے علاوہ کئی اداروں کی امداد کے لیے ادبی ٹرسٹ نے اپنا دستِ تعاون دراز کیا۔ کتابوں کی اشاعت کے لیے اردو کے تعلیمی، علمی اداروں کی بقا کے لیے مالی اعانت ادبی ٹرسٹ کا مقصد ہے اور یہ ٹرسٹ باضابطہ ایک نگراں کمیٹی کے تحت کام کرتا ہے۔ اسی ٹرسٹ کے توسط سے اردو گھر کی تعمیر اور اردو کتب خانوں کی شروعات کا سلسلہ ساری ریاست میں پھیلنے لگا۔ ادبی ٹرسٹ کے ذریعہ منعقد ہونے والا مشاعرہ حیدرآباد میں تاریخی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے جس کو معیاری کل ہند مشاعروں میں اولین مقام حاصل ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. دلی کے سب سے بڑے تصنیفی ادارہ کا نام بتایئے؟
2. حیدرآباد کے چند تصنف اداروں کے نام بتایئے؟
3. مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے کارنامے بیان کیجیے؟
4. مکتبہ جامعہ کے رسالے کا نام بتایئے؟
5. کسی ایک تصنیفی ادارہ کا تعارف کروایئے؟

26.8 بیسویں صدی کے اہم تعلیمی ادارے

اردو کی ترقی کے لیے بیسویں صدی کو اس وجہ سے اہمیت حاصل ہے کہ اس صدی میں نہ صرف اردو کے اہم تعلیمی ادارے قائم ہوئے بلکہ ان تعلیمی اداروں سے وابستہ افراد نے ممکنہ طور پر شعر و ادب کی خدمات کے لیے اہم کارنامے انجام دیے۔ آزادی سے قبل بھی اردو کے کئی تعلیمی ادارے تھے جنہوں نے اردو کی ترقی و ترویج میں حصہ لیا۔ ایسے اداروں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ اردو علیگڑھ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد اور ادارہ

ادبیات اردو کا شمار ہوتا ہے۔ آزادی سے قبل بھی مختلف دینی ادارے ہندوستان میں قائم ہوئے جنھوں نے اردو میں مذہبی ادب کے فروغ میں حصہ لیا۔ ایسے اداروں میں ندوۃ العلماء لکھنؤ، مصباح العلوم پھلواری شریف اور دارالعلوم دیوبند کے نام پیش پیش ہیں۔ ان تعلیمی اداروں نے بھی اردو کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد ریاستوں کی تنظیم جدید عمل میں آئی۔ 1956ء کے بعد ہندوستان کے مختلف ریاستوں میں یونیورسٹیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو حکومت کی طرف سے یونیورسٹیوں میں شعبہ اُردو قائم کیا گیا۔ اسی طرح اردو کی ترقی و ترویج کے لیے (13) ریاستوں میں اردو اکاڈمیوں کا قیام عمل میں لایا گیا جن کے ذریعہ مشاعروں کا انعقاد، سمینار، شاعروں اور ادیبوں کو امداد اور اعزازات، مسودوں کی اشاعت اور اردو صحافت کے علاوہ ڈرامے کی ترقی کی طرف توجہ دی گئی۔ مختلف اردو اکاڈمیوں کی جانب سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی دہلی اردو اکاڈمی، مہاراشٹرا اردو اکاڈمی اور آندھرا پردیش اردو اکاڈمی نے اپنے سرمائے سے اہم اردو کی کتابیں شائع کیں۔ اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کی اشاعت کے لیے فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کی جانب سے مالی اعانت کا سلسلہ بھی جاری ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ بیسویں صدی اردو میں نہ صرف اہم تعلیمی ادارے قائم کیے گئے بلکہ کئی اکاڈمیوں کے قیام کی وجہ سے تعلیم کی ترویج کے مواقع بھی فراہم ہوئے۔ اردو مدارس کے قیام اور تعلیم میں اردو کے موقف کو منوانے کے لیے کئی تحریکیں بھی بیسویں صدی کی دین ہیں۔ اس طرح بیسویں صدی میں اردو کی ترقی کے لیے ہمہ جہت کوشش کی گئی اور ملک کی ہر ریاست میں خود حکومتی سطح پر قائم محکمہ تعلیمات اور ٹکسٹ بک بیورو کے ذریعہ اردو نصابی کتابوں کی اشاعت اور اردو تعلیم و تدریس کے علاوہ امتحانات کا سلسلہ بھی جاری ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد تعلیمی اداروں کے قیام کے علاوہ اردو کتابوں کی فراہمی کے لیے ہر ریاست نے اپنی ذمہ داری نبھائی ہے۔ بیسویں صدی کے چند اہم تعلیمی اداروں کا تعارف پیش ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ

بیسوں صدی کے تعلیمی اداروں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک اہم کردار کا حامل ادارہ ہے۔ اس ادارے کے توسط سے اسلامی علوم و فنون اور جدید علوم کی تعلیم و تدریس کا انتظام کیا گیا۔ عرصہ دراز تک اس ادارے کے انتظامی امور دہلی کے نامور مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے اور مسلمانوں کے سرمائے سے اس ادارے کے کاروبار جاری و ساری تھے۔ 1923ء سے یہ ادارہ کارگر ہے لیکن آزادی کے بعد ہندوستانی حکومت نے نہ صرف اس ادارے کے لیے گرانٹ کا اجرا کیا بلکہ اس کو خود مختار (Autonomous) یونیورسٹی کا درجہ دیا اور تمام مالی مصارف یو۔ جی۔ سی کے ذمہ کر دیے جس کے نتیجہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی کارکردگی میں مزید اضافہ ہوا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں جہاں اسلامی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے وہیں علوم السنہ اور جدید علوم کی تعلیم کا اہتمام بھی کیا گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مشرقی شعبہ کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہے اور اس ادارے سے اردو کے بے شمار شاعر و ادیب وابستہ رہے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر نے اس ادارے کے قیام کے ذریعہ جو خواب دیکھا تھا اور حکیم اجمل خاں نے اپنی مالی اعانت کے ذریعہ اس ادارے کو جس مقام تک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے خوابوں کی تعبیر اس ادارے سے نمایاں ہوتی نظر آتی ہے۔ جامعہ ملیہ میں تدریس کے علاوہ تحقیق کا کام بھی انجام دیا جاتا ہے اور اس ادارے سے وابستہ اساتذہ کی تعلمی و ادبی تحقیقات کو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی جانب سے شائع کیا جاتا رہا ہے۔ اس تعلیمی ادارے کے شعبۂ تاریخ، شعبۂ سیاست، شعبۂ اسلامیات، شعبۂ عربی، شعبۂ اردو اور فارسی کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہے اور ادارے سے وابستہ اساتذہ اپنے تبحر علمی کی وجہ سے عالمی دورے کر کے اپنی علمیت کا لوہا منواتے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سائنس، ٹکنالوجی، آرٹس، کامرس اور علوم شرقیہ کی تعلیم و تدریس کا انتظام بھی کیا گیا ہے جبکہ اس ادارے سے انجینئرنگ، میڈیسن اور قانون کے شعبے وابستہ نہیں ہیں اس کے علاوہ اس یونیورسٹی سے کسی کالج کا بھی الحاق نہیں کیا گیا۔ اس کے باوجود بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک یونیورسٹی کا درجہ رکھتا ہے۔

جامعہ اردو علی گڑھ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام چلائے جانے والا ادارہ جامعہ اردو علی گڑھ اس وجہ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس ادارے کے ذریعہ

ادیب فاضل اور ادیب کامل کے امتحانات منعقد کیے جاتے ہیں جس کا مقصد یہی ہے کہ ایسا اردو داں طبقہ جو صرف اردو کے توسط سے اپنی علمی صلاحیتوں کو پڑھانا چاہیے اسے اپنی صلاحیتوں کے استعمال کا موقع فراہم کیا جائے۔ جامعہ اردو علیگڑھ ایک مکمل طور پر آزاد ادارہ ہے جس کے شعبہ نصاب اور شعبہ امتحانات کے علاوہ وائس چانسلر اور چانسلر بھی علی گڑھ کے چانسلر اور وائس چانسلر سے الگ ہوتے ہیں۔ عام طور پر اردو کے نامور ادیب اور شاعر کو حکومت کی جانب سے اس ادارے کا چانسلر اور وائس چانسلر مقرر کیا جاتا ہے۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحانات کے مراکز ہندوستان کے مختلف شہروں اور علاقوں میں موجود ہیں جہاں ہر سال امتحانات منعقد ہوتے ہیں۔ جامعہ اردو علی گڑھ کی ان ڈگریوں کو ملک کی یونیورسٹیوں نے قبول کیا ہے۔ اسی لیے ان امتحانوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس جامعہ کا نصاب بھی حد درجہ جدید ہے جس میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ سائنس، ریاضی اور جغرافیہ جیسے تکنیکی علوم کو نصاب سے مربوط نہ کیا جائے بلکہ علم زباں، علم تاریخ، علم ثقافت اور تہذیب وتمدن کو نصاب میں شامل کر کے طلبا کی ذہنی سطح کو بلند کیا جائے۔ اس مقصد سے جامعہ اردو علی گڑھ اپنی کارکردگی کو سارے ہندوستان میں وسعت دے رہا ہے اور یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ اس ادارے کے امتحانات میں ہر سال لاکھوں طلبا شریک ہوتے اور ڈگری حاصل کر کے جدید یونیورسٹیوں میں داخلے حاصل کرتے ہیں۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے ملک بھر میں کئی مراکز ہیں جو جامعہ کی نصابی کتب کی فراہمی کے ذمہ دار ہیں اس اس یونیورسٹی کو سارے ہندوستان میں پہلی مرتبہ اردو فاصلاتی طرز تعلیم کو فروغ دینے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں حیدرآباد کے نظام میر عثمان علی خان نے اردو ذریعۂ تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے 1918ء میں ایک ملکی یونیورسٹی کے قیام کا اعلان کیا جسے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا نام دیا گیا۔ اس یونیورسٹی میں علوم عمرانیات، علوم السنہ سائنس، طب، انجینئرنگ، قانون اور تدریسیات کی تعلیم اردو ہی میں دی جاتی تھی چنانچہ انٹرمیڈیٹ سے لے کر گریجویشن اور پھر پوسٹ گریجویشن کی نصابی کتابوں کی اردو میں فراہمی کے لیے جامعہ عثمانیہ میں دارالترجمہ کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے ذریعہ نصابی کتابیں اردو میں ترجمہ کی جاتی تھیں جو اردو ذریعہ تعلیم کو فروغ دینے میں مددگار ثابت ہوئیں۔ جامعہ عثمانیہ کا ایک طویل تاریخی پس منظر ہے جس کے ذریعہ سارے ملک میں سب سے پہلے اردو کو جامعاتی سطح پر ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال کیا گیا اور یہ ایک انتہائی کامیاب تجربہ رہا۔ اردو ذریعۂ تعلیم سے انٹرمیڈیٹ، گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کے علاوہ انجینئرنگ، میڈیسن اور قانون کی تعلیم کو عام کر کے عوام میں تعلیم وتدریس سے رغبت پیدا کرنے کا غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔ جامعہ عثمانیہ کے آرٹس کالج کی عمارت کی طرز تعمیر نے اسے دنیا کی اہم عمارتوں میں شامل کرادیا ہے۔ اس کے علاوہ اس جامعہ کے تعلیمی معیار نے ساری دنیا کو جامعہ عثمانیہ کی طرف متوجہ کردیا۔ 1918ء سے 1948ء تک جامعہ عثمانیہ کا ذریعۂ تعلیم اردو رہا اور اس جامعہ کے فارغ طلبا اور طالبات اردو ذریعہ تعلیم سے وابستگی کے باوجود دوسرے علوم وفنون میں اس قدر مہارت رکھتے تھے کہ انہیں عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے ملک کے کونے کونے سے قابل افراد کو حیدرآباد بلایا گیا اور انہیں جامعہ عثمانیہ سے وابستہ کیا گیا تاکہ جامعہ کا معیارِ تعلیم بلند ہوسکے۔ اس جامعہ میں جہاں مسلمانوں کو دینیات کی تعلیم لازمی تھی وہیں غیر مسلموں کے لیے اخلاقیات کی تعلیم نصاب کا درجہ رکھتی تھی جس میں ناکامی تمام مضامین میں ناکامی شمار کی جاتی تھی۔ 1948ء میں پولیس ایکشن کے بعد حکومت کی تبدیلی سے جامعہ عثمانیہ کے طرز تعلیم میں بھی تبدیلی آئی اور سینٹ کے احکام کے ذریعہ جامعہ عثمانیہ کا ذریعۂ تعلیم انگریزی کردیا گیا۔ اس وقت جامعہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی تھے جس کے بعد جامعہ عثمانیہ کے طریقۂ تعلیم کی اردو حیثیت ختم ہوگئی چنانچہ آج بھی جامعہ عثمانیہ موجود ہے لیکن اس کا ذریعۂ تعلیم اردو باقی نہیں رہا۔ جامعہ عثمانیہ کے طلبا کا ترجمان ''مجلّہ عثمانیہ'' برسہابرس تک شائع ہوتا رہا۔ جس کے خاص نمبر بھی شائع ہوتے تھے۔ اس جامعہ سے تحقیقی جریدہ ''اردوئے قدیم'' بھی شائع ہوتا رہا۔

ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد

جامعہ عثمانیہ کے سپوت ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور 1931ء میں لندن سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے حیدرآباد واپسی کے بعد اہل قلم حضرات کے تعاون سے ادارہ ادبیات اردو کا قیام عمل میں لائے جس کے ذریعہ ایک ماہنامہ رسالہ 'سب رس' کی اشاعت شروع کی اور ایک مشرقی

کتب خانہ کی ضرورت پر زور دیا گیا چنانچہ آج ادارہ ادبیات اردو کی نہ صرف ذاتی عمارت ہے بلکہ کتاب خانے میں لاتعداد کتابیں موجود ہیں اور اس کتب خانے سے شعبہ مخطوطات بھی وابستہ ہے جس میں ہزار ہا قلمی کتابیں موجود ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو کی قلمی کتابوں کی فہرست پانچ جلدوں میں اور مطبوعہ کتب کی فہرست دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس ادارے سے منسلک ایک شاندار میوزیم بھی ہے جس میں دکن کے بادشاہوں کے لباس، ظروف اور ان کی یادگار چیزوں کو محفوظ کیا گیا ہے۔ ابتدا سے ہی ادارہ ادبیات اردو نے اردو کی ترقی کے لیے جدوجہد کی۔ چنانچہ اردو امتحانات کا سلسلہ شروع کیا جس کے ذریعہ اردو دانی، اردو زبان دانی، اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات منعقد کیے جانے لگے۔ ان امتحانات کے مراکز ابتدا میں ریاست حیدرآباد کے تمام اضلاع میں قائم رہے جب کہ آزادی کے بعد آندھرا پردیش اور کرناٹک اور مرہٹواڑے کے علاقوں میں اس کی شاخیں کارکرد ہیں۔ ہر سال ہزار ہا طالب علم اس ادارے سے امتحانات دیتے اور اردو کے فروغ میں حصہ لیتے ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو سے منسلک ایک بک ڈپو اور اشاعتی مرکز بھی ہے۔ ڈاکٹر زور کے زمانے سے ہی اہل دکن کی تصانیف کی اشاعت اس ادارے کی جانب سے عمل میں لائی جاتی رہی ہے۔ اس کا سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ ادارے کے بک ڈپو میں ہندوستان کے مختلف پبلیشروں کی کتابیں محفوظ رکھی جاتی ہیں تاکہ اردو کتابیں خریدنے کے رجحان کو پروان چڑھایا جائے۔ اس ادارے کے انتظامات کے لیے ایک دستوری اور قانونی جماعت کام کرتی ہے۔ ادارے کے اپنے اصول اور قوانین مدون ہیں اور اس ادارے کو ریاستی سطح پر امداد بھی فراہم کی جاتی ہے۔ حال ہی میں ریاست آندھرا پردیش نے اس ادارے کے امتحان اردو فاضل کو انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دیا ہے جس کی وجہ سے اردو فاضل کامیاب امیدوار کسی بھی یونیورسٹی کے گریجویشن میں داخلہ لے کر اپنی تعلیم کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اس ادارے سے بے شمار ہستیاں وابستہ رہی ہیں اور آج بھی اس ادارے کا مجلّہ ماہنامہ ''سب رس'' پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ ادارے کے عہدے داران اور اراکین اس کی ترقی میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔

اردو آرٹس ایوننگ کالج، حمایت نگر

آزادی کے بعد شہر حیدرآباد میں انجمن ترقی اردو کی فعال کارکردگی اور جستجو کے نتیجہ میں پروفیسر حبیب الرحمٰن کی تحریک کے نتیجہ میں اردو ذریعۂ تعلیم کے کالج کے قیام پر توجہ دی گئی جس کے نتیجہ میں جدید علوم وفنون کی تدریس کا انتظام کیا گیا اور اردو آرٹس ایوننگ کالج کے نام سے حمایت نگر میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا گیا جسے جامعہ عثمانیہ سے الحاق حاصل ہوا۔ اس ادارے نے پی۔ یو۔ سی اور گریجویشن کے لیے آرٹس اور کامرس کے مضامین کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ جامعہ عثمانیہ کے اصول وقوانین اور نصاب کو روبہ عمل لاتے ہوئے اردو آرٹس ایوننگ کالج نے طلبا کے داخلے کا اعلان کیا۔ ابتدا میں اس ایوننگ کالج سے وابستہ ہونے والے طلبا کی تعداد کم رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ اردو ذریعہ تعلیم سے رغبت رکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا جس کے نتیجہ میں کالج کے طلبہ کی تعداد بھی بہ تدریج بڑھنے لگی۔ اس کالج میں اساتذہ کا تقرر جامعہ عثمانیہ کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے اور نصاب بھی جامعہ عثمانیہ کا رائج کردہ ہے لیکن اس کالج کی خصوصیت یہی ہے کہ تدریس اردو میں ہوتی ہے اور کتابیں بھی اردو میں فراہم کی جاتی ہیں۔ طلبا کو آرٹس اور کامرس کے مضامین کی جوابی بیاض اردو میں لکھنے کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔ اس طرح انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام اردو آرٹس ایوننگ کالج ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اسے شہر حیدرآباد کے منفرد کالج ہونے کا اعزاز حاصل ہے جو اردو ذریعہ تعلیم کے توسط سے نصابی اغراض کی تکمیل کرتا ہے اس کے سب سے فعال پرنسپل ڈاکٹر حسینی شاہد رہے جو اردو کے نامور محقق تھے۔ ان کی رحلت کے بعد مختلف اشخاص پرنسپل کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور اس کالج کو ریاست گیر اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ اردو ذریعہ تعلیم کا جامعہ عثمانیہ سے ملحق واحد کالج ہے۔

اردو اورینٹل کالج

ہندوستان میں تعلیم کا ایک ایسا نظام بھی جاری ہے جس کے ذریعہ اورینٹل اسٹڈیز (علوم شرقیہ) کو روا رکھا جاتا ہے۔ شہر حیدرآباد میں ایسے کئی کالج ہیں جو عربی، سنسکرت اور اردو کو اورینٹل لینگویج کی حیثیت سے فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ حیدرآباد میں حمایت نگر اور ناپلی میں اردو کے دو اورینٹل کالج قائم ہیں۔ ان کالجوں میں نصاب کے طور پر تمام تر اردو زبان و ادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ عرصہ دراز تک انٹرنس،

ڈپ۔او۔ایل' بی۔او۔ایل' اور ایم۔او۔ایل کی تعلیم ان اداروں میں دی جاتی تھی جس میں اردو کے علاوہ کسی دوسری زبان کا دخل نہیں تھا۔ البتہ بی۔او۔ایل کامیاب طلبا بی۔اے کے انگریزی امتحان میں شریک ہوکر کامیابی کے بعد بی۔اے۔ کی ڈگری حاصل کرسکتے تھے اور اسی بی۔او۔ایل کی بنیاد پر راست ایم۔اے میں داخلہ دیا جاتا تھا۔ اپنے دور کے تعلیمی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اورینٹل کالجوں کے نصاب میں تبدیلی لائی گئی اور پرانی ڈگریوں کو جدید انداز سے وضع کیا گیا۔ چنانچہ انگریزی کے ایک مضمون کو نصاب میں شامل کرکے انٹرنس کے بعد بی۔اے (لینگویجس) اور ایم۔اے (لینگویجس) کی شروعات کی گئی۔ ایسے کالجوں کو یونیورسٹی کی نگرانی میں دینے کے لیے کالج آف لینگویجس کا بورڈ آف اسٹڈیز علیحدہ قائم کیا گیا تاکہ کالجس آف لینگویجس کے تعلیمی مسائل اسی بورڈ اف اسٹڈیز کے توسط سے حل کئے جاسکیں۔ چونکہ کسی بھی تعلیمی ادارے کا تعلق اس کے اپنے نصاب سے ہوتا ہے اور نصاب کو بہتر سے بہتر بنانے میں بورڈ آف اسٹڈیز ہی کارکرد ہوسکتا ہے۔ کالج کو اپنے انداز سے نصاب مرتب کرنے کی آزادی دی گئی اور اس نصاب کے مطابق کتابوں کی فراہمی اور طلبا کو معلومات فراہم کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ عرض اردو کی تدریس کے سلسلہ میں اورینٹل کالجوں کی اپنی علیحدہ شناخت ہے اور ان اداروں نے بھی بیسویں صدی میں تعلیمی اداروں کی حیثیت سے اہم کردار نبھایا ہے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

آزادی سے قبل تک اردو ذریعہ تعلیم کو پوسٹ گریجویٹ سطح تک فروغ دینے کے لیے شہر حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کا وجود تھا۔ جب کہ آزادی کے بعد اس طریقہ کو ختم کردیا گیا۔ تاہم یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ ہر ریاست میں جہاں ریاستی زبانوں کے اعتبار سے یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ وہیں پارلیمنٹ کے ایک حکم نامے کے ذریعہ 1998ء میں شہر حیدرآباد میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی قائم کی گئی۔ اس سے قبل ریاست آندھراپردیش میں سنٹرل یونیورسٹی آف حیدراباد اور ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ امبیڈکر یونیورسٹی نے انگریزی' تلگو اور ہندی کے علاوہ اردو میں بی۔اے کرنے کی سہولت فراہم کی جب مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو اس یونیورسٹی نے بی۔اے کا نصاب ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر اوپن یونیورسٹی سے حاصل کیا اور دوسرے کئی کورسس اردو میں شروع کیے جس کے لیے دہلی کی اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی سے نصابات حاصل کیے گئے۔ گذشتہ پانچ سالوں سے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں بی۔اے اور بی۔کام کی تعلیم اردو کے ذریعہ فراہم کی جاری ہے۔ اس یونیورسٹی کے سارے ملک میں نوے (90) سے زیادہ مراکز قائم ہیں جہاں عام تعطیلات کے دوران خواہش مند طلبا کو تدریس کی فراہمی کا انتظام کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی کے قیام کے تیسرے سال ہی مختلف زبانوں میں ایم۔اے کی تعلیم کی سہولت فراہم کرنے کا اعلان کیا گیا تھا جو ممکن نہ ہوسکا لیکن یونیورسٹی کے قیام کے پانچ سال بعد ایم۔اے اردو اور انگریزی نصاب کی ترتیب نیز تقررات کا عمل جاری ہے جس کی تعلیم کیمپس اور فاصلاتی دونوں طرز تعلیم سے فراہم کی جارہی ہے اور اسی یونیورسٹی کے ذریعہ مختلف ڈپلوما کورسس کا آغاز بھی ہوچکا ہے اور یونیورسٹی کے اربابِ مجاز یہ چاہتے ہیں کہ تمام علوم وفنون کی تعلیم اسی یونیورسٹی کے ذریعہ سارے ہندوستان میں بذریعہ اردو فراہم کی جائے۔ چنانچہ اس یونیورسٹی سے بی۔ایڈ کی تعلیم کا آغاز ہوچکا ہے اور ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں بی۔ایڈ کی تعلیم بھی عام ہوجائے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کئی تکنیکی کورسس اور جدید تعلیم کے نظام کو سارے ہندوستان میں پھیلانا چاہتی ہے۔ اس کا دائرہ کار صرف ریاست نہیں بلکہ سارا ہندوستان ہے اس لیے یہ توقع کی جاتی ہے کہ اس یونیورسٹی کے ذریعہ شروع کی جانے والی فاصلاتی تعلیم اور کیمپس تعلیم سے اردو داں طبقہ کو ضرور فائدہ ہوگا۔

فاصلاتی طرزِ تعلیم کے ادارے

ہر ریاست میں کیمپس تعلیم کے علاوہ فاصلاتی تعلیم کا طریقہ رائج ہے۔ جامعہ عثمانیہ نے عرصہ دراز تک ایک نشست میں بی۔اے اور ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کا طریقہ رائج کیا تھا جو فاصلاتی طرز کا تھا جس پر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی پابندی عائد ہونے کے بعد تین سالہ فاصلاتی طرز کا گریجویشن اور دو سالہ ایم۔اے کورس رائج کیا گیا ہے۔ اس مرکز کو ڈاکٹر جی۔رام ریڈی مرکز برائے فاصلاتی تعلیم کا نام دیا گیا ہے جس کے ذریعے طلبا کو نصاب سے متعلق کتابیں فراہم کی جاتی ہیں اور انہیں امتحان میں کامیابی کے بعد ڈگری دی جاتی ہے۔ اسی قسم کی فاصلاتی تعلیم

کو عام کرنے میں ریاست کی مختلف یونیورسٹیوں نے اہم کردار نبھایا ہے۔شہر حیدرآباد میں بی۔آر۔امیڈکر اوپن یونیورسٹی نے تین سالہ فاصلاتی کورس بی۔اے' بی۔ایس سی' بی۔کام کی شروعات کی اور اس یونیورسٹی سے ہر سال لاکھوں طلبا نے استفادہ کیا ہے۔اس طرح دورِ حاضر میں فاصلاتی طرزِ تعلیم کے ذریعہ عام سطح پر تعلیم کو فروغ دیا جارہا ہے اور اس کی نمائندگی کرنے والے کئی ادارے ملک میں قائم کیے گئے ہیں جس میں سب سے اہم نام اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی نئی دہلی کا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. جامعہ اردو علی گڑھ کیا ہے۔
2. جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
3. جامعہ عثمانیہ پر نوٹ لکھیے۔
4. ادارہ ادبیات اردو کے بارے میں لکھیے۔
5. مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
6. فاصلاتی تعلیم کے ادارے سے کیا مراد ہے؟

26.9 خلاصہ

ہندوستان کو علم و ادب کی ترقی و ترویج کے ایک اہم ملک کا درجہ حاصل رہا ہے۔صدیوں سے اس ملک کی علمی و ادبی خدمات قابل ستائش رہی ہیں۔بیسویں صدی کی ابتدائی دہائی سے ہی اس ملک کی ہمہ جہت ترقی کا آغاز ہوا اور 1947ء کے بعد ہندوستان کی آزادی نے اس ملک کی ترقی کو چار چاند لگا دیئے۔علم و ادب کی ترقی میں تعلیمی اور تصنیفی اداروں کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ہندوستان میں اٹھارویں صدی سے ہی تعلیمی اور تصنیفی اداروں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔فورٹ ولیم کالج' فورٹ سینٹ جارج کالج اور دلی کالج کے بعد مطبع نول کشور لکھنؤ نے تصنیف و تالیف کے میدان میں اہم خدمات انجام دیں۔اردو کے تصنیفی اداروں میں انجمن ترقی اردو ایک ایسا ادارہ ہے جس نے پہلی مرتبہ خانگی تصنیفی ادارے کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔اس کا دفتر علی گڑھ سے اورنگ آباد منتقل ہوا اور مولوی عبدالحق کی نگرانی میں انجمن کی جانب سے ریاست حیدرآباد کی نصابی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شرع ہوا۔جس کے ساتھ ہی قدیم تذکرے اور تحقیقی کتابوں کے علاوہ انجمن کی جانب سے علوم وفنون کی کتابیں بھی شائع کی گئیں۔انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ ''اردو'' اور ''سائنس'' شائع ہوتے رہے۔اس ادارے کے بعد اردو کی خدمت انجام دینے والے اہم اداروں میں دارالمصنفین اعظم گڑھ یوپی کا شمار ہوتا ہے جس کی بنیاد مولانا شبلی نعمانی نے رکھی اور جس سے سید سلیمان ندوی جیسے قابل ادیب نے وابستگی اختیار کی۔اس ادارے نے تاریخِ اسلام اور تاریخ ہند پر بے شمار تحقیقی کتابیں تیار کرائیں اور اس ادارے کی جانب سے رسالہ ''معارف'' بھی شائع ہوتا رہا۔دارالمصنفین کو تحقیقی کتابیں پیش کرنے کے ایک اہم تصنیفی ادارے کا درجہ حاصل ہے۔شہر حیدرآباد کے آخری بادشاہ میر عثمان علی خاں کی کوشش سے 1917ء میں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔جس نے جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرنے کی روایت کا آغاز کیا۔اس ادارے کے ذریعے علومِ سائنس' علومِ عمرانیات' میڈیکل' انجینئرنگ اور قانون کی بے شمار کتابیں شائع ہوئیں اور اس ادارے نے اردو میں اصطلاحات کی روایت کا آغاز کیا۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد اردو کی ہمہ جہت ترقی کے لیے مرکزی حکومت کی جانب سے کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی کا قیام عمل میں لایا گیا۔اس ادارے کی جانب سے طلبا و خواتین کے لیے کتب کے علاوہ تاریخ' سائنس اور دیگر علوم پر کتابیں شائع کی جاتی ہیں کیونکہ اس ادارے کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔اسی لیے کئی طبع زاد اور ترجمہ شدہ کتابیں اس ادارے سے شائع کی گئیں جن کی قیمت انتہائی کم رکھی جاتی ہے۔اردو کتابوں کی اشاعت اور ان کی نکاسی میں حالی بک ڈپو' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' سرسید بک ڈپو' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس' فروغ اردو' نسیم بک ڈپو' حسامی بک

ڈپو اور شگوفہ پبلکیشن نے اہم خدمات انجام دی ہیں ۔ ان تصنیفی اداروں سے لاتعداد قدیم کتابیں جدید نثری اور کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی۔ بیسویں صدی میں شاعروں اور ادیبوں کے کارناموں کو اردو دنیا میں پھیلانے کے لیے ان اداروں کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

بیسویں صدی میں اردو ذریعہ تعلیم کو فروغ دینے والے کئی ایسے ادارے عالم وجود میں آئے جنھوں نے اردو درس و تدریس کے علاوہ اردو زبان و ادب کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بیسویں صدی کی ابتدائی نصف صدی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نئی دہلی میں قیام عمل میں لایا گیا۔ اس ادارے سے ایک رسالہ ''جامعہ'' بھی شائع ہوتا رہا۔

اسلامی علوم اور جدید علوم کے علاوہ اردو زبان اور ادب کے فروغ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اہم خدمات انجام دیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے جدید علوم اور مغربی علوم وفنون کو فروغ دینے میں اہم کردار نبھایا تو دوسری طرف جامعہ اردو علی گڑھ نے اردو عالم' اردو فاضل اور اردو کامل کے کورسس کا آغاز کر کے اردو ذریعہ تعلیم کے فروغ میں حصہ لیا۔ شہر حیدرآباد میں اردو ذریعۂ تعلیم کی پہلی درس گاہ جامعہ عثمانیہ کا قیام 1918ء میں عمل میں آیا۔ اس یونیورسٹی میں انٹرمیڈیٹ سے لے کر پوسٹ گریجویشن تک علوم عمرانیات' سائنس' والسنہ کی تعلیم اردو میں دی جاتی رہی۔ اس جامعہ کا سہ ماہی رسالہ ''مجلّہ عثمانیہ'' اردو کی ترقی میں ایک اہم کردار ادا کرتا رہا۔ 1948ء کے بعد جامعہ عثمانیہ کے ذریعۂ تعلیم کو انگریزی میں تبدیل کر دیا گیا۔

ادارۂ ادبیات اردو کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے شروع کیا جس کا کتب خانہ' میوزیم اور شعبہ اردو امتحانات اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو دانی' اردو زبان دانی' اردو عالم' اردو فاضل کے علاوہ اردو کامل کے امتحانات اسی ادارے کی جانب سے ساری ریاست میں منعقد ہوتے ہیں۔ اس ادارے کے اردو فاضل کے امتحان کو ریاستی حکومت نے انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دیا ہے۔ حیدرآباد میں اردو آرٹس ایوننگ کالج اور اردو اورینٹل کالجس کے علاوہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اردو زبان کو اعلیٰ تعلیم تک فروغ دینے میں پیش قدمی کی ہے۔ اس کے علاوہ جامعہ عثمانیہ' بی۔ آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کے ذریعہ اردو میں فاصلاتی ذریعۂ تعلیم کے ذریعہ ایم۔ اے تک تعلیم حاصل کرنے کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔ اس طرح بیسویں صدی کے تصنیفی اور تعلیمی اداروں کی وجہ سے اردو زبان اور ادب کے فروغ میں اہم پیش رفت ہوئی ہے۔ اس لیے ان اداروں کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

26.10 نمونۂ امتحانی سوالات

1. تصنیفی اداروں سے کیا مراد ہے؟
2. تعلیمی ادارے کسے کہتے ہیں؟
3. بیسویں صدی کے کن ہی دو اہم تصنیفی اداروں پر نوٹ لکھیے۔
4. انجمن ترقی اردو کے تصنیفی کارناموں کا جائزہ لیجیے۔
5. دارالمصنفین نے کون سی تصنیفی کارنامے انجام دیے۔
6. دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی خدمات کا احاطہ کیجیے۔
7. کونسل برائے فروغ اردو کے کیا کارنامے ہیں ۔
8. کن ہی تین بک ڈپو کے کارنامے بیان کیجیے۔
9. جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعلیمی خدمات کا احاطہ کیجیے۔
10. جامعہ اردو کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
11. ادارۂ ادبیات اردو کی خدمات پر نوٹ لکھیے ۔
12. اورینٹل کالجوں پر اظہار خیال کیجیے۔

13. فاصلاتی طرز تعلیم کی تعریف کیجیے۔
14. مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے کیا کارنامے ہیں؟

26.11 فرہنگ

ترسیل = بھیجنا
ذرائع = ذریعہ کی جمع
دستیاب = میسر، موجود
قاری = پڑھنے والا
اجتماعیت = ایک جگہ اکٹھا ہونا
ترویج = رواج دینا
توسیع = وسیع کرنا، بڑھانا
ملک گیر = سارے ملک میں
السنہ = لسان کی جمع، زبان
مماثل = برابر
اراکین = رکن کی جمع
جوابی بیاض = جواب لکھنے کی کاپی، جوابی پرچہ
درس گاہ = پڑھانے کی جگہ، مدرسہ
طبع زاد = ایجاد یا اختراع، طبیعت سے وجود میں آنے والا
مجلّہ = رسالہ، میگزین

ابلاغ = پہنچانا، بھیجنا
تفہیم = سمجھانا
تصنیف = کتاب لکھنا
ثقافت = تہذیب، کلچر
نامزد = منتخب کرنا
نصاب = پڑھائی کا کورس
برصغیر = چھوٹا براعظم
فروغ = روشنی، نور، رونق
کاوش = کوشش
خاطر خواہ = عرضی کے مطابق
کارگرد = کارگزار، بہت کام کرنے والا
فعل = کام
اصطلاح = کسی لفظ کے لیے نیا لفظ تیار کرنا
موقف = ٹھہرنے کا مقام

26.12 سفارشی کتب

1. از شہاب الدین ثاقب — انجمن ترقی اردو کی ادبی خدمات
2. خورشید نعمانی — دارالمصنفین اعظم گڑھ کی خدمات
3. ڈاکٹر مجید الاسلام — دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ
4. ڈاکٹر مجید بیدار — دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ادبی خدمات
5. حسن الدین احمد — جامعہ عثمانیہ

اکائی : 27 ترقی پسند تحریک

ساخت

27.1 تمہید

27.2 پس منظر

27.3 آغاز

27.4 عروج

27.5 زوال

27.6 شاعری

27.7 افسانہ

27.8 ناول

27.9 تنقید

27.10 خلاصہ

27.11 نمونہ امتحانی سوالات

27.12 فرہنگ

27.13 سفارش کردہ کتابیں

27.1 تمہید

ترقی پسند تحریک اردو کی سب سے مقبول تحریک ہے۔ اس تحریک نے ہندوستانی ادب اور خصوصیت سے اردو ادب پر گہرا اثر ڈالا۔ اس اکائی میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ یہ تحریک ہندوستان میں ایک ادبی تحریک کی حیثیت سے کب رونما ہوئی۔ اس نے ادب کے مزاج اور اسلوب کا رخ کس طرح بدلا۔ یہ تحریک ادب برائے زندگی کا فلسفہ لے کر آئی تھی۔ ہم اس کے بارے میں واقفیت حاصل کریں گے۔

27.2 پس منظر

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جرمنی میں ہٹلر کی سرکردگی میں فاشزم کی جڑیں مضبوط ہونے لگیں۔ پورا یورپ ایک سیاسی بحران سے گزر رہا تھا۔ بین الاقوامی فضا تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی۔ جرمنی نے ابی سینا (حبش) پر حملہ کر دیا تھا۔ جاپان نے چین پر حملہ کر کے اس کے شمالی علاقوں پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ چند سامراجی طاقتیں پوری دنیا کو آپس میں بانٹ لینا چاہتی تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بادل ساری دنیا میں منڈلا رہے تھے۔ ہٹلر نے ملک کے اعلیٰ درجے کے فنکاروں، سائنس دانوں اور دانش وروں کو قید کر لیا تھا یا جلا وطن کر دیا تھا۔ ٹامس مان اور ارنسٹ ٹولر جیسے عظیم ادیب اور آئن سٹائن جیسے سائنس داں جلا وطن ہو کر بے سروسامانی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان ادیبوں کی گرفتاری کے خلاف یوروپ کے ادیبوں میں فاشزم کے خلاف غم و غصے کی لہر دوڑ رہی تھی۔ یوروپ اور امریکہ کے دانش ور متحد ہو کر انسانیت دشمن طاقتوں کے خلاف نبرد آزما تھے۔

جولائی 1935ء میں پیرس میں کلچر کے تحفظ کے لیے تمام دنیا کے ادیبوں کی ایک کانفرس بلائی گئی۔ پہلی بار دنیا کے سارے ادیب ایک تحریک کی شکل میں متحد ہوئے۔ اس کانفرس میں یہ طے کیا گیا کہ ادیب کو اپنے ذاتی خانوں سے نکل کر انسانوں کے اجتماعی مفاد اور تہذیب وثقافت کی اعلیٰ قدروں کے تحفظ کے لیے رجعت پسند قوتوں کے مقابل آنا چاہیئے اور اپنے فن کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہیئے۔

24 نومبر 1934ء میں ہندوستانی نوجوانوں کا ایک گروپ لندن یونیورسٹی کے ایک رسٹورنٹ نان کنگ کے پیچھے ایک کمرے میں جمع ہوا۔ ان ادیبوں نے ہٹلر کے فاشزم کی مخالفت کی۔ اس گروپ نے 1935ء میں ایک ادبی حلقے کی شکل اختیار کر لی۔ اس حلقے میں سجاد ظہیر تھے جنہوں نے 1932 میں اپنے ہم خیال ادیبوں احمد علی رشید جہاں اور محمود الظفر کے ساتھ مل کر کہانیوں کا ایک مجموعہ ''انگارے'' شائع کیا تھا۔ ان کہانیوں کے موضوعات اور لہجے میں ایسی تیزابیت تھی کہ ہندوستان کے روایتی معاشرے میں اسے قبول نہیں کیا گیا اور اس کتاب کو ضبط کر لیا گیا۔ سجاد ظہیر کے علاوہ انگریزی کے ناول نگار ملک راج آنند' بنگالی کے ادیب جیوتی گھوش اور پرمود سین گپتا اور اردو کے شاعر ڈاکٹر دین محمد تاثیر شامل تھے۔ ان لوگوں نے ایک انجمن بنائی اور اس کا نام انڈین پروگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن (Indian Progressive Writers Association) رکھا اور ملک راج آنند کو اس کا صدر مقرر کیا گیا۔ انجمن کے مینی فیسٹو کا مسودہ لندن ہی میں تیار ہوا۔ اس کی نقل سجاد ظہیر نے ہندوستان میں اپنے دوستوں ڈاکٹر اشرف' محمود الظفر اور ان کی اہلیہ ڈاکٹر رشید جہاں کے علاوہ احمد علی اور ہیرین مکرجی کو بھیجا۔ اس مینو فیسٹو میں جو تجاویز پیش کی گئیں تھیں وہ یہ ہیں :

1) ہندوستان کے مختلف لسانی صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قائم کرنا۔

2) ان ادبی جماعتوں سے میل ملاپ پیدا کرنا جو اس انجمن کے مقاصد کے خلاف نہ ہوں۔

3) ترقی پسند ادب کی تخلیق کرنا' صحت مند ادب کا ترجمہ کرنا جس سے ہم تہذیبی پسماندگی کو مٹا سکیں اور ہندوستانی آزادی اور سماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں۔

4) ہندوستانی کو قومی زبان اور انڈو رومن رسم الخط کو قومی رسم الخط تسلیم کرنے کا پرچار کرنا۔

5) فکر ونظر اور اظہار خیال کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا۔

6) ادیبوں کے مفاد کی حفاظت کرنا۔ عوامی ادیبوں کی مدد کرنا جو اپنی کتابیں طبع کرانا چاہتے ہیں۔

انجمن کے اغراض ومقاصد کو پریم چند نے اکتوبر 1935ء میں سے اپنے رسالے ''ہنس'' میں شائع کیا اور ایک اداریہ لکھا اور ان مقاصد کی حمایت کی اور لکھا'' یہ ہمارے ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہے''۔ دوسری مرتبہ فروری 1936ء میں لفٹ ریویو (Left Review) لندن نے شائع کیا۔

1935ء میں سجاد ظہیر ہندوستان آئے تو انہوں نے مولوی عبدالحق' منشی پریم چند' جوش ملیح آبادی اور منشی دیا نرائن نگم سے ملاقات کی جو دسمبر 1935ء میں ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ ان ادیبوں اور دانشوروں نے مینی فیسٹو کے مقاصد سے اتفاق کیا اور اس پر دستخط کیے۔

الہ آباد میں احمد علی کے علاوہ فراق گورکھپوری اور ڈاکٹر اعجاز حسین تھے۔ ہندی کے ادیب شیودان سنگھ چوہان اور نریندر شرما تھے۔ احتشام حسین اور سید وقار عظیم اس وقت ایم۔اے کے طالب علم تھے۔ ان سب نے سجاد ظہیر کے منصوبے کی تائید کی۔ پنڈت امرناتھ جھا' وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی اور ڈاکٹر تاراچند نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ الہ آباد میں ترقی پسند ادیبوں کا ایک حلقہ بن گیا۔ جس میں ہندی اور اردو کے ادیب شامل تھے۔

علی گڑھ میں ترقی پسند مصنفین کا پہلا اجلاس 1936ء کے اوائل میں خواجہ منظور حسین کے مکان پر ہوا۔ سردار جعفری، جان نثار اختر، حیات اللہ انصاری، اسرار الحق مجاز، اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، شاہد لطیف اور سبط حسن وغیرہ اشتراکیت میں دلچسپی رکھتے تھے۔ سبط حسن ان دنوں حیدرآباد میں قاضی عبدالغفار کے اخبار "پیام" میں کام کررہے تھے۔ انہوں نے حیدرآباد میں اس کو منظم کیا۔ ہرین مکرجی نے کلکتہ میں انجمن کی تشکیل کی۔ پنجاب میں محمود الظفر، رشید جہاں، فیض احمد فیض نے انجمن بنائی۔ پنجاب میں میاں افتخار الدین و فیروز الدین منصور نے بھی اس تحریک کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ بہار میں سہیل عظیم آبادی اور اختر اورینوی نے ایک حلقہ قائم کرلیا۔ اس طرح یہ تحریک سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. لندن میں ہندوستانی نوجوانوں نے اپنی انجمن کا نام کیا رکھا؟

(ا) انڈین رائٹرز ایسوسی ایشن (ب) پروگریسیو ایسوسی ایشن (ج) انڈین پرگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن (د) پروگریسیو انڈین ایسوسی ایشن

2. افسانوں کا مجموعہ "انگارے" کس سنہ میں شائع ہوا

(ا) 1932ء (ب) 1935ء (ج) 1936ء (د) 1938ء

3. علی گڑھ میں ترقی پسند مصنفین کا پہلا اجلاس کس کے مکان پر ہوا۔

(ا) سردار جعفری (ب) حیات اللہ انصاری (ج) شاہد لطیف (د) خواجہ منظور حسین

27.3 آغاز

ترقی پسند تحریک پہلی ادبی تحریک تھی جس میں مختلف زبانوں کے ادیب نظریاتی اتحاد کی وجہ سے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہورہے تھے۔ اس بات کو محسوس کیا جانے لگا کہ ایک کانفرنس بلائی جائے جس میں دمک کے ادیب جمع ہوکر ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کریں اور انجمن کا ایک لائحہ عمل تیار کریں۔ انجمن کا دستور مرتب کریں۔ پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کے پیدا کردہ سیاسی بحران سے تہذیب و کلچر کو جو خطرات درپیش ہیں ان کے تدارک کے لیے تمام ادیب متحد ہوکر ایسی سیاسی قوتوں کا ساتھ دیں جو ترقی پسند خیالات رکھتی ہوں۔ ترقی پسند ادیبوں نے پہلی کانفرنس اپریل 1936ء میں لکھنو میں بلائی۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر صاحب طرز ادیب چودھری محمد علی ردولوی منتخب کیے گئے۔ اس کانفرنس میں پریم چند، مولانا حسرت موہانی، جئے پرکاش نرائن، کملا دیوی چٹوپادھیائے، میاں افتخار الدین، یوسف علی مہر، اندولال یاجنک وغیرہ نے شرکت کی۔ بنگال، گجرات، مہاراشٹرا اور مدراس کے ادیب شریک ہوئے اور اپنی زبان و ادب کے مسائل پر تقریریں کیں۔ اس کانفرنس کو دو چیزوں کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے۔ ایک اعلان نامہ دوسرا پریم چند کا خطبہ صدارت!

اعلان نامہ میں کہا گیا کہ ہندوستانی مصنفین کا یہ فرض ہے کہ ملک میں جو ترقی پذیر رجحانات ابھر رہے ہیں ان کی ترجمانی کریں اور ان کی نشوونما میں حصہ لیں۔ بے بنیاد روحانیت اور تصور پرستی چھوڑ کر عقلیت کو اختیار کریں۔ ادبیات اور دیگر فنونِ لطیفہ کو قدامت پرستوں سے نجات دلا کر عوام کے دکھ سکھ اور جدوجہد کا ترجمان بنائیں۔ نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کو موضوع بنائے۔ انجمن کے مقاصد یہ ہوں گے:

1. تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشاورتی جلسے منعقد کرنا اور لٹریچر شائع کرکے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔
2. ترقی پسند مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدوجہد کی کوشش کرنا۔

3. ترقی پذیر مصنفین کی مدد کرنا۔

4. آزادئ رائے اور آزادئ خیال کی حفاظت کی کوشش کرنا۔

پریم چند نے خطبۂ صدارت میں کہا:

''ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے .....ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک کا معیار امیرانہ اور عیش پرور آنہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا انہیں کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی.....

ہمارا آرٹ شہابیات کا شیدائی ہے اور نہیں جانتا کہ شباب سینے پر ہاتھ رکھ کر شعر پڑھنے اور صنف نازک کی کج ادائیوں کے شکوے کرنے یا اس کی خود پسندیوں اور چونچلوں پر سر دھننے میں نہیں ہے۔ شباب نام ہے آئیڈیل کا' ہمت کا' مشکل پسندی کا' قربانی کا.....

پریم چند نے اس یادگار جملے پر اپنے خطبے کو ختم کیا:

''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو' آزادی کا جذبہ ہو' حسن کا جوہر ہو' تعمیر کی روح ہو' زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے' سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی''

اس کانفرنس میں مولانا حسرت موہانی نے بھی تقریر کی۔ انہوں نے کہا ''محض ترقی پسندی کافی نہیں ہے' جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنی چاہیئے اور انقلابی ہونا چاہیئے۔ اسلام اور کمیونزم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسلام کا جمہوری نصب العین اس کا متقاضی ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان اشتراکی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں.....

پرانی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔ وہ محض دل بہلانے کی چیزیں ہیں۔ شاعری کے معاملے میں آپ کو میری تقلید کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں خود اس قسم کے نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق میں آپ کی پوری مدد کروں گا۔ (سجاد ظہیر ''روشنائی'' ص ۱۱۲)

اس کانفرنس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا دستور اساسی پیش کیا گیا جو بالاتفاق منظور ہوا۔ اس دستور کا مسودہ سجاد ظہیر' ڈاکٹر عبدالعلیم اور محمود الظفر نے مل کر تیار کیا۔ اس کانفرنس میں سجاد ظہیر کو کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سکریٹری چنا گیا۔ لکھنؤ کی کل ہند کانفرنس کے پورے ملک میں چرچے ہونے لگے۔ پریم چند نے اپنے خطبۂ صدارت کا ہندی میں ترجمہ کیا اور رسالہ ہنس جولائی 1936ء میں شائع کیا۔ پریم چند جہاں بھی جاتے اس تحریک کا ضرور تذکرہ کرتے۔ دہلی میں اختر حسین رائے پوری نے انجمن کی شاخ قائم کی۔ ڈاکٹر عابد حسین نے تحریک کی سرپرستی کی۔ شاہد احمد دہلوی نے انجمن کے مقاصد کے لیے ایک علحدہ ماہنامہ ''شاہ جہاں'' جاری کیا۔ کانپور میں انجمن قائم ہوئی اور مولانا حسرت موہانی کو صدر منتخب کیا گیا۔ لکھنؤ اور حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن سے متاثر ہو کر نوجوان اس کے قریب آنے لگے۔ سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف نے لاہور کا سفر کیا اور وہاں علامہ اقبال سے ملاقات کی۔ اس تحریک کے مقاصد پیش کیے۔ علامہ اقبال نے ہمت افزائی کی اور کہا:

''ظاہر ہے کہ مجھے ترقی پسند ادب یا سوشلزم کی تحریک کے ساتھ ہمدردی ہے' آپ لوگ مجھ سے ملتے رہیں''

(روشنائی' سجاد ظہیر ص ۱۷۰)

ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادیب بھی انجمنیں قائم کرنے لگے۔ اس طرح یہ تحریک ہندوستان گیر حیثیت اختیار کرنے لگی۔

1937ء میں اردو اور ہندی کے ترقی پسند ادیبوں نے الہ آباد میں ایک کانفرنس کی۔ مجلس صدارت میں آچاریہ نریندر دیو' پنڈت رام نریش ترپاٹھی اور مولوی عبدالحق شامل تھے۔ مولوی عبدالحق اس کانفرنس میں شرکت نہ کر سکے لیکن اپنا خطبۂ صدارت بھیج دیا۔ انہوں نے ترقی پسندوں کی حوصلہ افزائی کی۔

الہ آباد میں 1938ء میں پھر ایک کانفرنس بلائی گئی۔ مجلس صدارت کے لیے جوش ملیح آبادی' آنند نرائن ملا اور ہندی کے مشہور شاعر سمترانندن پنت کا نام منتخب کیا گیا۔ اس کانفرنس میں پنڈت نہرو نے تقریر کی۔ انہوں نے کہا:

''ادیب کی پہنچ جہاں ہوتی ہے وہاں سیاست داں کی نہیں۔ اس کے پاس عام لوگوں کی زبان ہوتی ہے' اس سے مدد لے کر وہ خیالی دنیا اور موجودہ دنیا کے درمیان ایک پُل بناتا ہے جس پر ہو کر عام لوگوں کے دماغ خیالی دنیا تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر واقعی پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں .....

آنے والے انقلاب کے لیے ملک کو تیار کرنا' اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوتی ہے۔ آپ لوگوں کے مسئلوں کو حل کیجیے' ان کو راستہ بتائیے لیکن آپ کی بات آرٹ کے ذریعہ ہونی چاہیئے نہ کہ منطق کے ذریعے۔ آپ کی بات ان کے دل میں اتر جانی چاہیئے۔ ہندوستان میں ادیبوں نے بڑا اثر کیا ہے مثلاً بنگال میں ٹیگور نے لیکن ابھی تک ایسے ادیب کم پیدا ہوئے جو ملک کو زیادہ آگے لے جاسکیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور اس سے ہمیں بڑی امیدیں ہیں۔ (نیا ادب جنوری/فروری 1941)

الہ آباد کی اس کانفرنس میں ٹیگور نے جو پیغام بھیجا اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اپنے پیغام کے آخر میں انہوں نے لکھا۔

''یاد رکھو تخلیق ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ حق اور جمال کی تلاش کرنا ہے تو پہلے 'انا' کی کینچلی اتارو' کلی کی طرح سخت ڈنٹھل سے باہر نکلنے کی منزل طے کرو پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے' روشنی کتنی سہانی ہے اور پانی کتنا لطیف ہے۔'' (نیا ادب جنوری/فروری 1941)

اپنی معلومات کی جانچ

1. پریم چند نے خطبۂ صدارت میں کیا کہا؟

(ا) ادب کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ (ب) ادب دل بہلانے کی چیز ہے۔
(ج) ادب برائے ادب ہی سچا نظریہ ہے۔ (د) آزادی کا جذبہ ادب کے لیے مضر ہے۔

2. شاہد احمد دہلوی کے رسالے کا کیا نام تھا۔

(ا) پیام (ب) نیا ادب (ج) ادب لطیف (د) شاہ جہاں

3. پنڈت نہرو نے الہ آباد کی کس کانفرنس میں تقریر کی۔

(ا) 1938ء (ب) 1937ء (ج) 1939ء (د) 1935ء

27.4 عروج

دسمبر 1938ء کے آخری ہفتے میں ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس کلکتہ میں ہوئی۔ اس کی صدارت ملک راج آنند نے کی۔ اس کانفرنس میں بنگالی زبان کے کئی اہم ادیب و شاعر شریک ہوئے۔ اردو' بنگالی' گجراتی' مراٹھی اور تامل ادب کے رجحانات پر تقریریں ہوئیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کو اس کانفرنس میں کل ہند انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

دو ڈھائی سال کے اندر ترقی پسند ادیبوں کی تحریک تمام ہندوستانی زبانوں میں مقبول ہوگئی۔ اقبال' ٹیگور' پریم چند' عبدالحق' جواہر لال نہرو' سروجنی نائیڈو' آچاریہ نریندر دیو اور جئے پرکاش نرائن جیسے دانشوروں نے ترقی پسندوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ہندوستان بھر کے نوجوان اس رجحان

سے متاثر ہورہے تھے۔ بنگالی زبان کے مشہور رسالے ''پرچے'' نے ترقی پسند ادیبوں کے مضامین اور نظموں کو اہتمام سے شائع کرنا شروع کیا۔ حیات اللہ انصاری جو کانگریس کے ترجمان ''ہندوستان'' کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے ترقی پسند ادیبوں وشاعروں کی تخلیقات کو شائع کیا۔ ترقی پسندوں نے خود اپنا رسالہ ''نیا ادب'' لکھنو سے جاری کیا۔ مجلس ادارت میں سبط حسن' علی سردار جعفری اور مجاز شامل تھے۔ ''نیا ادب'' بے حد مقبول ہوا۔ اس کی مقبولیت سے حوصلہ پاکر نوجوان ادیبوں نے اپنا ایک اشاعتی ادارہ امدادِ باہمی کے اصولوں پر'' حلقہ ادب'' کے نام سے قائم کیا۔ جس کے تحت سجاد ظہیر کی ''لندن کی ایک رات'' (ناول) حیات اللہ انصاری کی کہانیوں کا مجموعہ ''انوکھی مصیبت'' مجاز کا مجموعہ کلام ''آہنگ'' اور سردار جعفری کے افسانوں کا مجموعہ ''منزل'' شائع کیے گئے۔ جوش ملیح آبادی اپنا رسالہ ''کلیم'' بند کرکے نیا ادب کے ادارے میں شامل ہوگئے۔ ''نیا ادب'' عروج پر تھا۔ ملک راج آنند' ڈاکٹر عبدالعلیم اور احمد علی کی ادارت میں انگریزی ماہنامہ انڈین لٹریچر شائع کیا گیا۔ بنگالی زبان کا ''پرچھوٹیا'' اور ''پرگتی'' مراٹھی کا ''چترا'' ہندی کا ''روپاب'' اور ''ویلو'' بھی مقبول حاصل کرنے لگے۔ ہندوستان کی ساری زبانوں میں ترقی پسند مصنفین کی تحریریں مقبول ہونے لگیں۔

تیسری کل ہند کانفرنس :

ترقی پسند مصنفین کی تیسری کل ہند کانفرنس مئی 1942ء میں دہلی میں منعقد ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم کا خطرہ سر پر تھا۔ بین الاقوامی سیاسی حالات بہت ہی نازک موڑ پر آگئے تھے۔ ترقی پسند ادیب فاشزم کے خلاف اور جمہوریت کی تائید میں پہلے ہی آواز اٹھا چکے تھے۔ اس کانفرنس میں وہ ادیب بھی شریک ہوئے جو ترقی پسند تحریک سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ خاص طور پر حلقہ اربابِ ذوق جو ترقی پسند ادب کی تحریروں کو پروپگنڈہ کہتا تھا اور جو اشاریت و ہیئت پرستی سے متاثر تھے وہ بھی شریک ہوئے۔ اس میں سجاد ظہیر' ڈاکٹر عبدالعلیم' کرشن چندر' مجاز' سردار جعفری' سبط حسن اور رشید جہاں ایک طرف تھے تو دوسری طرف راشد' میراجی' مولانا صلاح الدین احمد مدیر ''ادبی دنیا'' اور قیوم نظر وغیرہ تھے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالمجید سالک اور حفیظ جالندھری اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اس میں ترقی پسند ادیبوں نے قرار داد پیش کی کہ وہ فاشزم کے مخالف ہیں اور اتحادی اقوام کے ساتھ ہیں۔ لیکن ساتھ ہی برطانوی سامراج کے اس رویے کی مذمت بھی کی کہ وہ ان نازک حالات میں بھی ہندوستان کو آزادی دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ایک طرف تو ترقی پسند تحریک کو سراہا گیا لیکن چار پانچ سال میں نوجوان ادیبوں نے جس طرح کا ادب تخلیق کیا انہیں دیکھ کر ترقی پسند ادیبوں کے خلاف غلط فہمیاں پھیلنے لگیں۔ اس وقت اردو ادب میں کئی میلانات تھے کچھ لوگ مقصدیت کے حامی تھے۔ کچھ جدید ادبی تحریکوں سے متاثر تھے مثلاً اشاریت اور اظہاریت' فرائڈ' بودلیر' ملارمے وغیرہ کے نظریات انہیں اپنی طرف متوجہ کررہے تھے۔ افسانوں میں تحلیل نفسی' لاشعوری کیفیات کا رجحان' شاعری میں ابہام' نئی ہیئت کی تلاش کا رجحان پرورش پانے لگا۔ شاعری میں ہیئت کے تجربے کیے جانے لگے جس کے نتیجے میں ترقی پسندی ایک مبہم اصطلاح بن گئی تھی۔

ترقی پسند ادب کے خلاف مضامین اور اس کے جواب میں وضاحت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی' رشید احمد صدیقی نے ترقی پسند ادب کے خلاف اعتراضات کیے۔ رشید احمد صدیقی نے انقلابی شاعری میں تخریبی رجحانات' نعرہ بازی پر اور فحاشی وعریاں نویسی پر سخت اعتراضات کیے۔ رشید احمد صدیقی نے ترقی پسند ادب کی تاریخ میں اہم رول ادا کیا جو رجحانات خلط ملط ہورہے تھے انہیں پہچانا گیا۔ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند میں تمیز کی جانے لگی۔ ترقی پسند ادب اور نیا ادب یا جدید ادب کو الگ الگ دیکھا جانے لگا۔ رشید احمد صدیقی اور اثر لکھنوی وغیرہ کے مضامین کے جوابات احتشام حسین' سجاد ظہیر' علی جواد زیدی وغیرہ نے دیے۔ ترقی پسند تحریک کے بارے میں دوسری بحث اس وقت شروع ہوئی جب ماہر القادری نے ''اردو اصلاح ادب کانفرنس'' منعقد کی۔ اس کانفرنس میں بلینک درس کی مخالفت کی گئی۔ آزاد نظم کے شاعروں کی پیروڈی کی گئی۔ آزاد نظم کے خلاف مضامین لکھوائے گئے۔ عندلیب شادانی مسعود حسن رضوی اور نیاز فتح پوری نے آزاد نظم کو اردو شاعری کے مزاج کے خلاف بتایا۔ محمد حسن عکسری نے آزاد نظم کی پیروڈی کی سخت مذمت کی۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے بھی ایک تفصیلی مضمون تین قسطوں میں ''ترقی پسند ادب کے بارے میں چند غلط فہمیاں'' لکھا۔ انہوں نے بڑے مدلل انداز میں لکھا کہ آزاد نظم اردو مزاج کے خلاف نہیں ہے۔ انہوں نے آزاد نظم نگاروں کے

یہاں ابہام اور فراریت کے جو رجحانات تھے ان کا بھی تجزیہ کیا۔ انہوں نے یہ بھی وضاحت کی کہ ہیت اور اسلوب کے سلسلے میں ترقی پسندوں کا رویہ کیا ہونا چاہیئے۔ انہوں نے لکھا کہ انہیں ایسا اسلوب اختیار کرنا چاہیئے جو حال اور مستقبل کی ضروریات کو پورا کر سکے۔

جن دنوں یہ مباحث چل رہے تھے حیدرآباد میں کل ہند اردو کانگریس کا اجلاس ہوا۔ جس میں سجاد ظہیر کو ترقی پسند تحریک پر مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ اس مقالے میں سجاد ظہیر نے غلط فہمیوں کا انسداد کرنے کی کوشش کی اور ترقی پسند تحریک کی پالیسی بھی واضح کی۔

1944-43ء میں قحط بنگال کا اہم واقعہ ہوا۔ ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے ادیبوں و شاعروں نے اسے موضوع بنا کر ظلم اور بہیمیت کے خلاف سخت احتجاج کیا۔

اکتوبر 1945ء میں ترقی پسند اردو مصنفین نے حیدرآباد میں ایک کانفرس بلائی چوں کہ اردو زبان اور ادب کے مسائل پر تفصیلی مباحث کا موقع نہیں مل رہا تھا اس لیے یہ کانفرنس منعقد کی گئی۔ یہ کانفرنس پانچ دن تک چلتی رہی۔ اس میں اردو کے تقریباً تمام اہم ادیب موجود تھے۔ اس کا افتتاح سروجنی نائیڈو نے کیا۔ ڈاکٹر تاراچند نے اردو ہندی کے اجلاس کی صدارت کی۔ فراق گورکھپوری نے شاعری کے اجلاس کی' قاضی عبدالغفار نے صحافت کے اجلاس کی' احتشام حسین نے تنقید کے اجلاس کی اور مولانا حسرت موہانی نے عام اجلاس کی صدارت کی۔ اس کانفرنس کے متعلق کرشن چندر نے ایک دلچسپ رپورتاژ ''پودے'' لکھا۔

اس کانفرنس کی اہم قرارداد ڈاکٹر عبدالعلیم نے فاشی کے خلاف پیش کی۔ اس قرارداد میں کہا گیا کہ اردو ادب میں جو فاشی کے رجحانات پرورش پا رہے ہیں اس کا ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادب کے نظریے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ترقی پسند ادیب فاشی کے خلاف ہیں اور اس کے اظہار کو ادب کے لیے غیر صحت مند اور مضر سمجھتے ہیں۔ اس تجویز کی قاضی عبدالغفار نے مخالفت کی اور کہاں ہمیں اس قسم کی کوئی تجویز پاس کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ کسی قسم کے سخت احتساب کی ضرورت ہے۔ جنسی موضوعات پر بھی ادب کی تخلیق ہوسکتی ہے۔ بشرط یہ کہ لکھنے والے کا زاویہ نگاہ تعمیری اور ترقی پسندانہ ہو۔ جنس بھی ہمارے سماج کے اہم مسائل میں ہے۔ اس تجویز سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے کہ ترقی پسند نوجوان اس موضوع اور زندگی کے اس پہلو کو خارج سمجھ کر اس سے قطع تعلق کرلیں۔ اس قرار کی سب سے زیادہ مخالفت مولانا حسرت موہانی نے کی۔ انہوں نے کہا کہ ''ادبی تخلیقات میں لطیف ہوسنا کی کا اظہار' کوئی مضائقہ نہیں'' اس پر قرارداد مسترد ہوگئی۔

تقسیم ہند کے بعد ترقی پسند ادیبوں نے دسمبر 1947ء میں لکھنو میں ایک کانفرنس منعقد کی۔ تین دن تک مختلف اجلاس ہوئے اور ایک شاندار مشاعرہ بھی ہوا۔ کانفرنس کے افتتاح کے لیے مولانا آزاد کو مدعو کیا گیا لیکن وہ کسی وجہ سے شرکت نہ کرسکے۔ افتتاح کی رسم ڈاکٹر سید محمود نے ادا کی۔ عام جلسے کی صدارت قاضی عبدالغفار نے کی' مجلس مقالات کی صدارت رشید احمد صدیقی نے کی۔ ایک اجلاس خاص طور پر زبان کے مسئلے پر کیا گیا جس کی صدارت نیاز فتح پوری نے کی۔ مشاعرے کی صدارت حضرت اثر لکھنوی نے کی۔ انجمن کا تنظیمی جلسہ بھی ہوا جس میں یہ طے ہوا کہ ایک مرکزی دفتر بمبئی میں باقاعدہ قائم کیا جائے اور سردار جعفری کو عارضی طور پر جنرل سکریٹری بنایا جائے۔

مئی 1949ء میں ترقی پسند ادیبوں نے پانچویں کل ہند کانفرنس بھیمڑی میں منعقد کی۔ اس کانفرنس کے بعد ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں ایک نیا موڑ آیا۔ کیوں کہ 1936ء کے مینی فیسٹو کو ناکافی سمجھ کر ایک نیا مینی فیسٹو منظور کیا گیا۔ اس زمانے میں تلنگانہ اور بنگال کی عوامی تحریکوں اور حکومت کی سیاسی پالیسی کی وجہ سے بہت سے ترقی پسند ادیب قید تھے جو جیل سے باہر تھے' وہ کشمکش میں تھے کہ حکومت کا ساتھ دینا چاہیئے یا نہیں۔ سب سے اہم مسئلہ تیسری جنگ عظیم کا خطرہ تھا۔ ترقی پسند علی الاعلان امن پسند طاقتوں کا ساتھ دینے اور سرمایہ دارانہ مفاد کی خاطر دنیا کو جنگ کے جہنم میں جھونکنے والی طاقتوں سے کنارہ کشی کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ نئے منشور میں ان تمام مسائل کا احاطہ کیا گیا۔

نئے منشور میں کہا گیا کہ آج ترقی پسند اور رجعت پسند ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہیں۔ اس میں وہ جدوجہد صاف دکھائی دے رہی ہے جو ہندوستان کے عوام جمہوریت اور اشتراکیت کے لیے کر رہے ہیں۔

حکومت ہند کے اس فیصلے کی مخالفت کی گئی جس میں حکومت نے برطانوی کامن ویلتھ میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کو آزاد خودمختار اور عوامی جمہوریت قائم کرنا چاہیئے۔

سرمایہ دار ممالک امریکہ اور برطانیہ' سوویت یونین' پوربی یورپ کی عوامی جمہوریتوں اور ایشیا کے عوام کی جدوجہد کے خلاف جھوٹی خبریں پھیلا رہے ہیں۔

ہندوستان کا سرمایہ دارانہ طبقہ مزدوروں' کسانوں' فن کاروں پر ظلم ڈھا رہا ہے اور حکومت ان کے ساتھ ہے۔ مزدوروں' کسانوں اور متوسط طبقے کی جدوجہد کو دبانے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے۔ حکومت جمہوری اخباروں اور رسالوں کو بند کررہی ہے۔

سوویت یونین کی تعریف کی گئی جہاں اشتراکی سماج میں سرمایہ داروں کی آزادی ختم کی جاچکی ہے کہ وہ عوام کو دبا سکیں اس لیے وہاں جمہوریت پسندوں کو پوری آزادی ہے۔ سوویت یونین کا ادب اس وقت دنیا بھر کے ترقی پسندوں کی رہنمائی کرتا ہے۔

ترقی پسند ادیبوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ عوام کے قریب آئیں۔ اعلیٰ سماجی مقصد کے بغیر ادب عظیم نہیں ہوسکتا۔ ادیبوں کو اپنی تحریروں میں سنجیدگی اختیار کرنے کے لیے کہا گیا۔ عوامی ادب اور کلچر کا مستقبل ترقی پسندوں کے ہاتھوں میں ہے اس کا یقین دلایا گیا۔ ترقی پسند ادیبوں سے کہا گیا کہ وہ عوام سے رشتہ جوڑیں۔ مزدوروں اور کسانوں کی زندگی اور جدوجہد کی عکاسی کریں۔ رومانوی اور رجعت پرست ادیبوں کے نظریے اور عمل کے ساتھ سمجھوتہ بازی سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا۔ اس کانفرنس میں ہندی کے مشہور نقاد رام بلاس شرما کو کل ہند انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

نئے منشور کی اشاعت کے بعد سردار جعفری نے ایسے شاعروں سے بیزاری کا اظہار کیا جو رمزیت اور تغزل کے قائل تھے۔ انہوں نے فیض احمد فیض کی نظم ''یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر'' پر اعتراض کیا۔ سردار جعفری نے فیض اور جذبی پر اعتراض کیا اور کیفی اعظمی و جان نثار اختر کو ترقی پسند قرار دیا۔ اس منشور اور سردار جعفری کے رویّے سے لکھنے والے تذبذب کا شکار ہوگئے۔

نقوش' ماہ نو' آج کل اور نیا دور جیسے ادبی رسائل کا بائکاٹ کیا گیا۔ بعض ادیبوں نے اس زمانے میں لکھنا چھوڑ دیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ترقی پسند تحریک کے ترجمان ''شاہراہ'' کا تنزل شروع ہوگیا۔ ترقی پسندوں میں ''ادبی جمود'' پر بحث ہونے لگی۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ترقی پسندوں کے رسالے کا نام کیا تھا؟

(ا) پرچم (ب) نیا ادب (ج) سرخ سویرا (د) حیات

2. مسعود حسن رضوی' عندلیب شادانی اور نیاز فتح پوری نے کس صنف کو اردو کے مزاج کے خلاف بتایا؟

(ا) غزل (ب) مثنوی (ج) آزاد نظم (د) نظم معریٰ

3. نیا منشور کس کانفرنس میں جاری کیا گیا؟

(ا) حیدرآباد کانفرنس (ب) بھیمڑی کانفرنس (ج) لکھنؤ کانفرنس (د) الہ آباد کانفرنس

27.5 زوال

مارچ 1952ء میں ترقی پسند ادیبوں نے دہلی میں ایک کانفرنس منعقد کی۔ خوب مباحث ہوئے اور ایک نیا منشور منظور کیا گیا۔ اس میں کہا گیا کہ :

''ہندوستان کے لوگ چاہتے ہیں کہ ان کا ادب اور آرٹ ان کی قومی روایات کے مطابق ترقی کرے۔ ہمارے عوام کی خواہش ہے کہ ایک آزاد اور خوش حال زندگی انہیں حاصل ہو۔ وہ چاہتے ہیں کہ دنیا کی تمام قوموں کے ساتھ دوستی اور برادارانہ امن قائم رکھیں۔ ہمارا ادب انسان دوستی کے جذبے کا' زندگی پر یقین اور اعتماد کا روشن مستقبل کی امیدوں کا علم بردار ہو۔ بے مقصد زندگی' شکست پسندی' فنا پسندی اور جبر پرستی ایسے رجحانات ہیں جو ہماری تہذیب کی ترقی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ ہم اس ادب کے مخالف ہیں جو عریانی' فحاشی' دہشت پسندی اور غارت گری پھیلاتا ہے۔ ہمارا ادب فنی اعتبار سے خوب صورت ہونا چاہئیے۔ قومی اور عام پسند ہونا چاہئیے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک کی تمام زبانوں میں ادب کے پھلنے پھولنے کے لیے تمام سہولتیں دی جائیں۔

اس کانفرنس میں کرشن چندر کو کل ہند انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

بہت سے ادیب اس تحریک سے بدظن ہوگئے کیوں کہ انتہا پسند ادیبوں نے تحفظ ذہنی کا مظاہرہ کیا تھا۔ کرشن چندر نے تنظیم میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ ان کی حیثیت ایک تجارتی ادیب کی ہوتی جارہی تھی۔ شعرا بین الاقوامی مسائل پر نظمیں لکھنا چھوڑ کر غزل گوئی کی طرف راغب ہوگئے۔ مختلف شہروں سے تنظیمیں ختم ہونے لگیں۔ اسی دوران سجاد ظہیر' راول پنڈی سازش کیس سے رہا ہو کر مستقل طور پر ہندوستان واپس آ گئے۔ انہیں انجمن کو پھر سے سرگرم کرنے پر آمادہ کیا گیا۔ مارچ 1956ء میں مینو (ضلع اعظم گڑھ) میں ترقی پسند ادیب جمع ہوئے۔ یہ طے کیا گیا کہ احتشام حسین سارے ادیبوں سے خط و کتابت کر کے یہ مسئلہ طے کریں کہ کیا اردو کی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی الگ ضرورت ہے؟ انجمن کا نام ترقی پسند مصنفین ہی رہے یا تبدیل کر دیا جائے؟

مئی 1956ء میں حیدرآباد میں کل ہند کانفرنس ہوئی۔ بہت سے ترقی پسند مصنفین نے اس میں شرکت کی۔ مباحث ہوئے اور تحریک کے بانیوں سجاد ظہیر اور ڈاکٹر عبدالعلیم نے اس خیال کا اظہار کیا کہ موجودہ حالات میں ادیبوں کے تقاضے بدل گئے ہیں اور چوں کہ ترقی پسند نظریہ ادب اب اتنا عام ہو چکا ہے کہ اس کی تشریح یا اس کے پرچار کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اس دور میں کم و بیش ہر ادیب اسے تسلیم کرنے لگا ہے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

''میرا اپنا خیال ہے کہ برا یا بھلا جو بھی کام کرنا تھا انجمن کر چکی۔ اب اس تنظیم پر توجہ دینے کے بجائے ایک کل ہند اردو ادیبوں کی انجمن بنائی جائے۔ بلا لحاظ اس کے اراکین کے معاشی' سیاسی یا مذہبی نظریے کچھ بھی ہوں ہمارے پاس صرف ایک معیار ہو اور وہ یہ کہ ہر رکن لکھنے والا ہو۔ لکھنے والوں میں بھی ہم کوئی معیار یا سطح مقرر نہیں کر سکتے۔ ہر شخص کو رکن بننے کا حق ہونا چاہئیے .....

پہلے میری رائے تھی کہ انجمن کو دوبارہ منظم کرنا چاہئیے۔ مرکز اور شاخوں میں ربط پیدا کر کے اسے باعمل بنانا چاہئیے لیکن اب میں اس رائے پر قائم نہیں ہوں۔ اس کو بدلنے کے لیے تیار ہوں۔

..... آج ہند کی نئی تعمیر جمہوریت اور اشتراکیت کی بنیادوں پر قائم ہو رہی ہے جس پر عظیم اکثریت کو اتفاق ہے۔ اس نظام کو قائم کرنے کے لیے سارا ہندوستان کوشاں ہے۔ ترقی پسند مصنفین کی بنیاد یہ تھی کہ ہم آزادی حاصل کریں اور انگریز سامراج کو ہندوستان سے باہر نکالنے کی جدوجہد میں ادبی جنگ کریں۔ آج ہمارے پاس متحد ہونے کے لیے دوسری بنیاد اتحاد موجود ہے۔ ان بنیادوں پر آج تمام لکھنے والوں کو متحد کیا جاسکتا ہے۔

ہماری تنظیم کوئی سیاسی تنظیم نہیں ہوگی۔ ہمارا مقصد ادب کے ذریعہ اپنے خیالات کی ترویج ہے.....''

اس طرح ترقی پسند مصنفین کی تحریک انجام کو پہنچی۔ 1936ء سے 1956ء تک اس تحریک نے ایک اہم رول ادا کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. 1952ء کی دہلی کانفرنس میں کس بات کی مخالفت کی گئی؟

(ا) شکست پسندی وفنا پسندی کی (ب) امن و دوستی کی

(ج) فنی خوب صورتی کی (د) قومی اور عام پسند ادب کی

2. سجاد ظہیر کس کیس سے رہا ہو کر آئے؟

(ا) اسلام آباد کیس (ب) راول پنڈی سازش کیس

(ج) بھاولپور کیس (د) لاہور سازش کیس

3. مئی 1956ء میں حیدر آباد کی کانفرنس میں کیا فیصلہ کیا گیا؟

(ا) ترقی پسند تحریک کا نام بدل دیا جائے (ب) انجمن کو دوبارہ منظم کیا جائے

(ج) نئی تنظیم قائم کی جائے (د) سیاسی تنظیم بنائی جائے

27.6 شاعری

ترقی پسند شاعروں نے اختر شیرانی کی رومانیت اور جوش ملیح آبادی کی انقلابی شاعری سے متاثر ہو کر شاعری کی۔ ان کے یہاں بغاوت اور دہشت انگیزی کے ساتھ ساتھ ملک کی آزادی کا جذبہ بھی ملتا ہے۔ وہ انقلاب کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔ شمیم کرہانی، شہاب ملیح آبادی، وقار ابنالوی وغیرہ نے جذباتی شاعری کی جو اس دور کے نوجوانوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ شمیم کرہانی کی نظم ''قومی سپاہی کا گیت'' ''جوان جذبے'' اور ''جگاوا'' میں شدید وطنی جذبہ ہے۔ شہاب ملیح آبادی کی نظم ''ہٹو آتا ہے مرد انقلابی'' بھی اسی جذبے کا اظہار کرتی ہے۔ ترقی پسند شاعروں نے انقلاب اور آزادی کو ہی اپنا محبوب قرار دیا تھا۔ ان کے انقلاب کا تصور رومانی تھا۔ وہ اکثر نظمیں اپنی محبوب کو مخاطب کر کے لکھتے تھے۔ اس سے معذرت کرتے تھے کہ ان کے پاس محبت سے زیادہ اہم کام ہیں۔ اس لیے وہ محبت کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ سردار جعفری کی ''انتظار نہ کر''، علی جواد زیدی کی نظم ''میری راہ میں'' ایسی نظمیں ہیں جن میں شاعر اپنی محبوبہ سے کہتا ہے کہ وہ ان سنگین مسائل کو سمجھ نہیں سکتی اور نہ اس کا نازک حسن ان حالات میں ساتھ دینے کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد شاعروں نے اپنے محبوب کو بغاوت اور انقلاب کی تلقین کرنی شروع کر دی۔ سلام مچھلی شہری کی نظم ''شرائط'' میں وہ کہتے ہیں:

اٹھا کے ہاتھ کہے انقلاب زندہ باد
لہو سے مثل دلہن مہندیاں رچائے ہوئے

مجاز کی نظم ''نوجوان خاتون سے خطاب'' یہ شعر بے حد مشہور ہوا

تیرے ماتھے کا یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

ان تمام نظموں میں انقلاب کا ایک معصوم تصور ملتا ہے۔ عنفوان شباب کا جوش بھی ہے۔

ترقی پسند شاعروں نے فرسودہ نظام کو ختم کر کے ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کے بھی خواب دیکھے۔ ان کے یہاں ایک جذباتی ہیجان، غصہ اور انتقام کی آگ بھڑکتی نظر آتی ہے۔

مجاز کی نظم ''انقلاب'' میں یہ جذبہ عروج پر نظر آتا ہے۔

جھونپڑوں میں خوں، محل میں خوں، شبستانوں میں خوں
دشت میں خوں، وادیوں میں خوں، بیابانوں میں خوں

جاں نثار اختر نظم ''ساقی'' میں کہتے ہیں :

جو ممکن ہو تو، تو بھی آج رنگیں جام کے بدلے
لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم اٹھا ساقی

سردار جعفری کی ایک نظم ''جوانی'' کا شعر ہے :

مرے ہونٹوں پہ نغمے کانپتے ہیں دل کے تاروں کے
میں ہولی کھیلتا ہوں خون سے سرمایہ داروں کے

جذبی کی نظم ''دعوت جنگ''۔ مخدوم کی نظم ''موت کا گیت'' اور ''مشرق'' ایسی ہی نظمیں ہیں۔ اس طرح کی نظموں کے سلسلے پر سجاد ظہیر نے بروقت روک لگائی۔ انہوں نے لکھا ''نوجوانوں سے خطاب، طالب علموں سے خطاب، سپاہی سے خطاب، مزدوروں سے خطاب اور کسانوں سے خطاب اب بند ہونا چاہئیے۔ اگر آپ کو کچھ لکھنا ہے تو آپ ملاّ پن چھوڑیے، لوگ آپ کا بھی مذاق اڑانے لگیں گے جبر تو یہ ہے کہ آپ کسی کو مخاطب نہ کیجیے۔ زمانے پر نظر ڈالیے، حالات کو سمجھیے اور جو کہنا ہو کہہ ڈالیے۔''

سجاد ظہیر کی اس تنقید کے بعد بہت سے شاعر سنبھل گئے۔ بعض نے اسی روش کو جاری رکھا۔ آگے چل کر جن شاعروں کو استحکام حاصل ہوا ان میں مجاز، مخدوم، فیض، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری وغیرہ شامل ہیں۔ سلام مچھلی شہری، علی جواد زیدی، مسعود اختر جمال، شہاب ملیح آبادی، شمیم کرہانی کی شہرت ان کا دور گزرنے کے بعد ختم ہوگئی۔

اسرار الحق مجاز نے ترقی پسند شعرا میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ عزیز احمد نے مجاز کی شاعری کو انقلاب اور تغزل کا حسین امتزاج قرار دیا۔ مجاز کی رومانی نظموں میں ''طفلی کے خواب''، نذر دل، ان کا جشن سالگرہ، نورا، کس سے محبت ہے ''ایک غمگین یاد''۔ ''آج کی رات'' شامل ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں ''مجاز کی غنائیت میں چشمے کی روانی، شادابی اور عنفوان شباب کی وارفتگی اور والہانہ پن ملتا ہے''۔ مجاز کی انقلابی شاعری میں رومانیت نے خاص دل کشی پیدا کی۔ ''آوارہ، اندھیری رات کا مسافر''۔ ''رات اور ریل''۔ ''نذر خالدہ''۔ ''ایک جلاوطن کی واپسی''۔ ''نوجوان خاتون سے''۔ ''خواب سحر'' اور ''آہنگ نو'' انقلابی نظمیں ہیں۔ مجاز کی انقلابی شاعری کے بارے میں فیض نے لکھا مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے، اس کے نغمہ میں برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی اور بہار کی رات کی سی گرم جوش تاثیر آفرینی ہے۔''

فیض احمد فیض کا پہلا مجموعۂ کلام ''نقش فریادی'' ہے جس کے بارے میں ن۔م۔ راشد نے لکھا تھا ''یہ ایک ایسے شاعر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے''۔ فیض کی رومانی نظموں میں 'آخری خط' سرد دیار شبانہ' تہ نجوم شامل ہیں۔ مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ' رقیب سے' تنہائی' موضوع سخن' بول کے لب آزاد ہیں تیرے' میں انہوں نے اردو شاعری کو ایک نئے آہنگ سے آشنا کیا۔ فیض بلند بانگ شاعری کے قایل نہیں تھے۔ وہ رمز و کنائے میں اپنی بات کہتے تھے۔ صبح آزادی' دو عشق' نثار میں تیری گلیوں پہ' شیشوں کا مسیحا' زنداں کی ایک شام' یاد' ملاقات' ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے اور دریچہ وغیرہ ان کی مشہور نظمیں ہیں۔

مخدوم نے ابتدا میں رومانی نظمیں لکھیں۔ ان نظموں میں ایک تازگی' شادابی' جمالیاتی کیف اور انداز بیان کی ندرت ہے۔ سجدہ' انتظار' محبت کی چھاؤں' نامۂ حبیب' پشیمانی ان کی رومانی نظمیں ہیں۔ مخدوم انقلاب کا انتظار بھی محبوب کے انتظار کی طرح کرتے ہیں۔ مخدوم کی شاعری میں غنائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کی نظمیں ''اندھیرا' زلف چلیپا' چاند تاروں کا بن' چارہ گر'' فنی اعتبار سے مکمل نظمیں ہیں۔ مخدوم کے کلام کے بارے میں عزیز احمد لکھتے ہیں کہ'' خالص شاعرانہ حیثیت سے بھی اس کے کھرے ہونے میں کوئی کلام نہیں''۔

سردار جعفری کا پہلا مجموعہ کلام'' پرواز'' ہے۔ سردار جعفری کی نظموں میں وجدان اور تخلیقی عناصر کی کمی ہے۔ ان کے انداز بیان میں ایک کرختگی ہے۔ سال نو ' ٹوٹا ہوا ستارہ' آخری خط ان کی کامیاب نظمیں ہیں۔ بعد میں سردار جعفری نے طویل نظمیں لکھیں ان کے یہاں الفاظ کی تکرار ہونے لگی اور تمام مصرعے ایک ہی لفظ سے شروع ہونے لگے۔ ان کی نظمیں سیلاب چین' آنسوؤں کے چراغ' موت' نیا ودھان' زنداں بہ زنداں ' کوریا ترقی پسند حلقوں میں بے حد مقبول ہوئیں۔ ان کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' بھی بہت مشہور ہوئی۔ سردار جعفری نے تشبیہات میں ندرت کو ملحوظ رکھا۔

کیفی اعظمی کی ابتدائی نظمیں بھی رومانی اور ہلکی پھلکی ہیں۔ اندیشہ' پشیمانی' ٹرنک کال' پامسٹ' حوصلہ اور تبسم ان کی خوب صورت نظمیں ہیں۔ کیفی اعظمی نے بھی ہنگامی موضوعات پر نظمیں لکھیں لیکن ان کے یہاں سردار جعفری کی طرح کرختگی نہیں ہے بلکہ ایک دھیمے دھیمے بہاؤ کی کیفیت ہے۔ ایسی نظموں میں مولانا آزاد اور خضر حیات' خانہ جنگی' قومی اخبار' کوریا کا نعرہ وغیرہ ہیں۔ لیکن کیفی کو جلد ہی ہنگامی شاعری کا احساس ہوگیا اور انہوں نے اس انداز کو ترک کر دیا۔

جان نثار اختر نے بھی اپنی شاعری کا آغاز ہلکی پھلکی نظموں سے کیا۔ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوکر انہوں نے انقلابی نظمیں لکھیں جن میں بگولا' یہ ہوکر رہے گا' میں ان کے گیت گاتا ہوں' سجاد ظہیر کے نام' روس کو سلام وغیرہ شامل ہیں' روس کو سلام میں 34 مصرعے لفظ ہزار ہا سے شروع ہوتے ہیں۔ امن نامہ' ستاروں کی صدا ان کی طویل نظمیں ہیں۔ خاک دل اور خاموش آواز میں انہوں نے اپنی انفرادیت کو پالیا۔ ان کی رباعیات کا مجموعہ'' گھر آنگن'' بھی کافی مقبول ہوا۔ ان کی غزلوں کے مجموعے'' پچھلے پہر'' سے ایک نئی تبدیلی کا احساس ہوا۔

ساحر لدھیانوی کی شاعری میں بے ساختگی اور تغزل ہے۔ ساحر نے متوسط طبقے کے عام تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بے حد متاثر کیا۔ ان کے اسلوب میں ایک وضاحت بے ساختگی اور شرینی ہے جو نوجوانوں کو متاثر کرتی ہے۔ ساحر کا مجموعہ کلام سب سے زیادہ پڑھا گیا۔ تاج محل کے علاوہ ''گریز' چکلے' لمحۂ غنیمت' بنگال' فن کار' کل اور آج ' ایک تصویر رنگ' جاگیر' لہو ندر دے رہی ہے حیات'' ساحر کی مشہور نظمیں ہیں۔ ساحر نے امن کے موضوع پر ایک طویل نظم'' پرچھائیاں'' لکھی جو اس موضوع پر لکھی گئی سب سے عمدہ نظم سمجھی جاتی ہے۔

مجروح سلطان پوری نے نظم کے بجائے غزل کو اپنایا وہ سب کچھ جو ترقی پسند شعرا نظم کے پیرایہ میں کر رہے تھے مجروح نے غزل میں کہا۔ مجروح کا لب ولہجہ اردو تغزل کا مستند لب ولہجہ ہے جس میں انہوں نے نئی کیفیات کو سمویا ہے۔ مجروح نے بہت کم لکھا لیکن جو بھی لکھا وہ یاد رہ جانے والا ہے۔

ان کے علاوہ فراق گورکھپوری' مطلبی فرید آبادی' اختر انصاری' احمد ندیم قاسمی' قتیل شفائی' اختر الایمان' شاد عارفی' پرویز شاہدی' منیب الرحمٰن' عزیز حامد مدنی' ظہیر کاشمیری کے علاوہ وامق جون پوری' غلام ربانی تاباں' نیاز حیدر' مخمور جالندھری' سلیمان اریب وغیرہ بھی اہم شاعر ہیں۔

ترقی پسند شاعری کے لیے جو ضروری شرطیں طے کی گئیں وہ اس طرح تھیں۔ شاعر غم دوراں کو موضوع بنائے غم جاناں اور غم ذات کو موضوع بنانا رجعت پسندی ہے۔ شاعر انقلاب کی جدوجہد میں بین الاقوامی سیاست پر نظر رکھے۔ اس کا کینوس وسیع ہو۔ جمالیاتی قدریں' ہیت کا تناسب وغیرہ رجعت پسند نقادوں کی اصطلاحیں ہیں۔ ادب میں اشاریت' رمزیت' استعارہ' تشبیہ' علامت زوال پسندوں کا رجحان ہے۔ غم افسردگی' اداسی اور تنہائی کا اظہار ناپسندیدہ ہے۔ شاعری کو امید افزا ہونا چاہیئے جو شاعر عالم گیر عوامی جدوجہد کو موضوع نہیں بناتا اس کا سیاسی شعور خام ہے۔

اس فارمولے کے زیر اثر جو شاعری کی گئی وہ یکسانیت کا شکار ہوگئی۔ دنیا کے ہر ملک کو موضوع بنایا گیا۔ نظموں میں لفظوں کی تکرار، مصنوعی رجائیت، احساس اور جذبے کے فقدان نے شاعری کو ہنگامی بنادیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح کی شاعری سے لوگ اوب گئے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ''نوجوانوں سے خطاب، طالب علموں سے خطاب، سپاہی سے خطاب، مزدوروں سے خطاب، کسانوں سے خطاب اب بند ہونا چاہئیے'' کس نے کہا؟

(ا) رشید احمد صدیقی (ب) اثر لکھنوی (ج) سجاد ظہیر (د) سردار جعفری

2. مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے'' کس کا قول ہے؟

(ا) آل احمد سرور (ب) خلیل الرحمٰن اعظمی (ج) عزیز احمد (د) فیض احمد فیض

3. ترقی پسند شاعروں میں کس شاعر نے صرف غزل کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا؟

(ا) مجروح سلطان پوری (ب) ساحر لدھیانوی (ج) کیفی اعظمی (د) مخدوم محی الدین

27.7 افسانہ

ترقی پسند تحریک سے قبل افسانے میں دو واضح میلانات ملتے ہیں۔ ایک حقیقت نگاری اور دوسری رومانیت اور تخیل پرستی کا۔ 1932ء میں ''انگارے'' کے نام سے جو افسانے لکھے گئے ان میں وہ سارے امکانات تھے جو آگے چل کر اردو افسانے کے واضح رجحانات بنے۔ قدیم معاشرے اور اخلاق وقوانین کے خلاف بغاوت کے علاوہ نفسیاتی مسائل کو بھی پہلی بار برتا گیا تھا۔ اس کے لکھنے والے ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے تھے۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے انگارے کی توسیع کی۔

1936ء کے بعد اردو افسانہ نگاروں کی جو کھیپ سامنے آئی اس میں کرشن چندر کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ کرشن چندر نے ابتدا میں رومانی افسانے لکھے لیکن یہ رومانیت فراریت نہیں بلکہ زندگی کو بدلنے کی آواز ہے۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں ''جہلم میں ناؤ پر، آنگی، جنت و جہنم'' وغیرہ ہیں۔ ''دو فرلانگ لمبی سڑک'' سے وہ سماجی حقیقت نگاری کی طرف آئے۔ کرشن چندر کو کشمیر سے خاص دلچسپی تھی۔ کرشن چندر نے ہیت کے تجربے بھی کیے۔ ''زندگی کے موڑ پر، گرجن کی ایک شام اور بالکونی'' ان کے طویل افسانے ہیں۔ قحط بنگال پر انہوں نے ناقابلِ فراموش افسانہ ''ان داتا'' لکھا۔ کرشن چندر بعد میں بسیار نویسی کا شکار ہوگئے۔ ان کی افسانہ نگاری پر انشائیے کا رنگ حاوی ہونے لگا۔ اس کے باوجود انہوں نے ''آدھے گھنٹے کا خدا، تائی ایسری، کالو بھنگی، شہزادہ، اشوک کی موت، پورے چاند کی رات'' جیسے افسانے لکھے۔ کرشن چندر کے افسانے ادب عالیہ کا حصہ رہیں گے۔

سعادت حسن منٹو نے تلخ حقیقتوں، عورت مرد کے تعلقات اور ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ انہوں نے ابتدا میں سیاسی موضوعات پر افسانے لکھے جن میں کامیاب افسانہ ''نیا قانون'' ہے۔ منٹو کو بمبئی میں بسنے والے نچلے طبقے پر لکھے گئے افسانوں سے شہرت ملی۔ جسم فروش عورتوں پر منٹو نے بے مثال کہانیاں لکھیں ''کالی شلوار، ہتک، جانکی، سوکینڈل پاور بلب، سرکنڈوں کے پیچھے اس موضوع پر لکھی ہوئی کامیاب کہانیاں ہیں۔ منٹو نے اردو افسانے کو بہترین کردار دیے۔ کرداروں پر مبنی افسانوں میں بابو گوپی ناتھ، سہائے، سوگندھی، موذیل، ایشر سنگھ، مد بھائی ٹوبہ ٹیک سنگھ، تقی کاتب، جانکی، راج کشور اور باسط غیر معمولی کردار ہیں۔ منٹو نے فسادات پر بھی یادگار افسانے لکھے۔ منٹو کا اسلوب کفایت شعارانہ اور طریقہ کار سلیقہ مندانہ تھا۔ وہ فطرت انسانی کے رمز شناس اور اعمال انسانی کے پراسرار نفسیاتی محرکات کے نباض تھے۔ منٹو کے افسانوں کا انجام غیر متوقع اور تعجب خیز ہوتا تھا۔

راجندر سنگھ بیدی نے بہت کم لکھا لیکن فنی اعتبار سے مکمل افسانے لکھے۔ مواد' ہیت اور کردار نگاری کے سلسلے میں ان کے ہاں ایک خاص توازن پایا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں فلسفیانہ فکر اور نفسیاتی باریک بینی ملتی ہے۔ بیدی نے متوسط طبقے کے مسائل اور ان کے دکھ درد سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انہوں نے کئی خوب صورت افسانے لکھے۔ دس منٹ بارش میں' گرم کوٹ' ہڈیاں اور پھول' من کی من میں' رحمٰن کے جوتے اور آلو وغیرہ۔ بیدی نے کسی خاص فارمولے پر افسانے نہیں لکھے۔ انسانی جبلی معصومیت ان کا بنیادی موضوع ہے۔ بیدی کے افسانوں میں کردار نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ گرہن' لاجونتی' اپنے دکھ مجھے دے دو' اغوا' دیوالہ' لمبی لڑکی کے کرداروں کا دیو مالائی داستانوں سے گہرا تعلق ہے۔ بھولا جیسا بچہ بھی ان کے کرداروں میں شامل ہے۔ بیدی نے شعور کی پختگی اور گہری بصیرت کے ساتھ جنسی موضوعات کو برتا ہے۔ بیدی رمزیت' تہہ داری اور مشکل پسندی کے قائل تھے۔

عصمت چغتائی نے متوسط طبقے کی عورتوں کی زندگی اور ان کے نفسیاتی مطالعے کو اپنی افسانہ نگاری کا محور بنایا۔ وہ عورت کی نفسیاتی نشوونما اور اس کے پیچ وخم کو بڑی مہارت کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ اس میں رمزیت اور طنزیہ انداز ہوتا ہے۔ گیندا' اُف یہ بچے' ساس' جوانی' ایک شوہر کی خاطر قابل ذکر ہیں۔ جنسی موضوعات پر بھی انہوں نے سنبھل کر لکھا لیکن 'لحاف' کی وجہ سے کافی بدنام ہوئیں۔ حقائق کی پیش کشی کے لحاظ سے پردے کے پیچھے' کیڈل کورٹ' قابل ذکر ہیں۔ ان کا جو نقطہ نظر تھا وہ دو ہاتھ' بے کار' عشق پر زور نہیں اور گلدان میں واضح انداز میں ملتا ہے۔ ''چوتھی کا جوڑا'' ان کا یادگار افسانہ ہے۔ اس کے علاوہ پنکچر' یار' نفرت' بیمار' خدمت گزار قابل ذکر ہیں۔ عصمت چغتائی کا سب سے بڑا وصف ان کا اسلوب ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں'' ان کے افسانوں سے اردو افسانوں کی لغت میں بے شمار نئے الفاظ' نئے محاورات' نئی تشبیہات اور علامات کا اضافہ ہوا ہے جو محض عورتوں کی معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں''۔

ان چار افسانہ نگاروں کے علاوہ حیات اللہ انصاری' سہیل عظیم آبادی' اوپیندر ناتھ اشک' اختر حسین رائے پوری' اختر اورینوی' اختر انصاری' احمد ندیم قاسمی' دیوندر ستیارتھی' بلونت سنگھ' خواجہ احمد عباس' مہیندر ناتھ' ابراہیم جلیس' ہاجرہ مسرور' خدیجہ مستور' شکیلہ اختر' صدیقہ بیگم سیوہاروی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ترقی پسند تحریک میں اردو افسانے نے عالمی معیار تک رسائی حاصل کی۔ عورتوں کے مسائل' فسادات' بین الاقوامی مسائل اور نفسیاتی کردار نگاری' ترقی پسند افسانے کے خاص اوصاف رہے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. بمبئی میں بسنے والے نچلے طبقے' جسم فروش عورتوں اور دلالوں پر کس نے بے مثال کہانیاں لکھیں؟

(ا) کرشن چندر (ب) راجندر سنگھ بیدی (ج) عصمت چغتائی (د) سعادت حسن منٹو

2. عورتوں کی معاشرت سے تعلق رکھنے والے محاورات' تشبیہات و الفاظ سے کس افسانہ نگار نے اردو افسانے کو مالا مال کیا؟

(ا) صدیقہ بیگم سیوہاروی (ب) عصمت چغتائی (ج) شکیلہ اختر (د) ہاجرہ مسرور

3. قحط بنگال پر کرشن چندر نے جو نا قابل فراموش افسانہ لکھا اس کا نام کیا ہے؟

(ا) بالکونی (ب) زندگی کے موڑ پر (ج) آدھے گھنٹے کا خدا (د) ان داتا

27.8 ناول

ترقی پسند تحریک میں ناول اس درجے کے نہیں لکھے گئے جس معیار کی شاعری یا افسانہ نگاری کی گئی۔ ترقی پسند تحریک امراؤ جان ادا یا گئودان جیسے بڑے ناول پیش نہ کر سکی۔

ترقی پسند ناول کا نقشِ اول سجاد ظہیر کا ''لندن کی ایک رات'' ہے۔ یہ ناول 1936ء میں لکھا گیا مگر اس کی اشاعت 1938ء میں عمل میں آئی۔ سجاد ظہیر نے یہ ناول سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ 16 جون 1904ء کی صبح آٹھ بجے سے شروع ہوتا ہے اور دوسری صبح دو بجے ختم ہوتا ہے۔ ''لندن کی ایک رات'' شام کو چھ بج کر دس منٹ پر شروع ہوتا ہے اور صبح کی پھیکی روشنی پر ختم ہوتا ہے۔ اس ناول میں ان ہندوستانی طلبا کی ذہنی و جذباتی کشمکش کی عکاسی کی گئی ہے جو برطانوی حکومت کے دور میں بغرض تعلیم جاتے تھے۔ سجاد ظہیر نے مختلف کرداروں کے ذریعہ ہندوستان کے متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی عکاسی کی ہے اور اس دور کے سیاسی و تہذیبی مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

کرشن چندر کا ناول ''شکست'' 1943ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں کرشن چندر نے برہمنی سماج کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ معاشی اور طبقاتی نظام میں محبت کی ناکامی اس ناول کا موضوع ہے۔ کرشن چندر نے معاشی کشمکش فرسودہ رسوم و عقائد اور ذات پات کے بندھنوں کی عمدہ عکاسی کی ہے۔

اس دور کے سب سے کامیاب ناول نگار عزیز احمد ہیں۔ انہیں ناول نگاری کے فن پر پوری گرفت حاصل تھی۔ ''ہوس'' اور ''مرمر اور خون'' ان کے ابتدائی ناول ہیں۔ ''گریز'' ایسی بلندی ایسی پستی ''آگ'' اور ''شبنم'' ان کے دوسرے ناول ہیں۔ ''گریز'' ایک اہم ناول ہے۔ اس کا کردار بھی متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد اسے یوروپ کے مختلف مقامات میں جانے کا موقع ملتا ہے۔ عزیز احمد نے یوروپ کی زندگی اور وہاں کا اخلاقی و تہذیبی انحطاط اور ہندوستان کے بے بس متوسط طبقے کی ذہنیت کی بڑی کامیاب عکاسی کی ہے۔ ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں انہوں نے حیدرآباد کے جاگیردارانہ نظام کی تصویر کشی کی ہے جو زوال پذیر تھا۔ یہ ناول اس دور کی تہذیب کے کھوکھلے پن کو عیاں کرتا ہے۔ ''آگ'' کشمیر کی معاشی کشمکش کے پس منظر میں لکھا گیا اور ''شبنم'' میں یونیورسٹی کے پروفیسروں کی اخلاقی کمزوریوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔

عصمت چغتائی کا پہلا ناول 'ضدی' ہے۔ یہ ناول جذباتیت اور رومانیت پر مبنی ہے اور فلم کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر لکھا گیا۔ ان کا اہم ناول ''ٹیڑھی لکیر'' ہے۔ اس ناول میں عصمت نے ایک نسوانی کردار کو پیدائش سے جوانی تک جو مختلف منزلیں پیش آتی ہے انہیں کامیابی کے ساتھ اور ایک قطرۂ خون پیش کیا۔ اس میں مصنفہ کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ چھلکتا ہے۔ یہ ناول ایک کامیاب نفسیاتی ناول ہے۔ عصمت نے معصومہ' عجیب آدمی' جنگلی کبوتر بھی لکھے۔

ابراہیم جلیس نے ''چور بازار'' لکھا۔ سعادت حسن منٹو نے ''بغیر عنوان کے'' لکھا۔ قرۃ العین حیدر نے ''میرے بھی صنم خانے'' (1947ء) اور احسن فاروقی نے ''شام اودھ'' (1948ء) لکھا۔ یہ ناول ترقی پسند ناولوں کے زمرے میں نہیں آتے۔ راجیندر سنگھ بیدی کا ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' ایک اہم ناولٹ ہے۔ حیات اللہ انصاری کا ناول ''لہو کے پھول'' 2608 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں 1911ء سے 1950ء تک کی سماجی' معاشرتی اور سیاسی زندگی کی ترجمانی کی گئی ہے۔ کرشن چندر نے ''جب کھیت جاگے'' جیسا ناول لکھا جس میں کسانوں کی تلنگانہ تحریک کو موضوع بنایا گیا۔ فسادات کے موضوع پر رامانند ساگر کا ناول ''اور انسان مر گیا'' اہم ہے۔ دراصل اچھے ناول ترقی پسند تحریک کے بعد لکھے گئے جن میں خدیجہ مستور کا ''آنگن'' قرۃ العین حیدر کا ''آگ کا دریا'' عبداللہ حسین کا ''اداس نسلیں'' شوکت صدیقی کا ''خدا کی بستی'' شامل ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. عزیز احمد کے کس ناول میں حیدرآباد کے جاگیردارانہ نظام کی تصویر کشی کی گئی ہے؟

(ا) آگ (ب) ایسی بلندی ایسی پستی (ج) شبنم (د) گریز

2. عصمت چغتائی کے کس ناول کو نفسیاتی ناول قرار دیا گیا؟

(ا) ضدی (ب) ٹیڑی لکیر (ج) معصومہ (د) عجیب آدمی

3. راجندر سنگھ بیدی کے ناولٹ کا نام کیا ہے؟

(ا) ایک چادر میلی سی (ب) شام اودھ (ج) آگ کا دریا (د) لہو کے پھول

27.9 تنقید

ترقی پسندوں نے حسن کے معیار کو بدلا اور ادب کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے نئے نئے اصول وضع کیے۔ ان کا خیال تھا کہ ادب سماجی زندگی کی پیداوار ہے۔ اس لیے سماجی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کا بدلنا بھی ضروری ہے۔ وہ ادب کے تنقید حیات ہونے کے قائل تھے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو تنقید کے مزاج اور ذہن میں نئی نئی تبدیلیاں آئیں۔ بحث مباحثے کے لیے راہیں نکلیں' سوچنے سمجھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوا۔ ادب میں مواد' ہیت اور اظہار و اسلوب میں نئے تجربات کی ہمت افزائی کی گئی۔ جن نقادوں نے ترقی پسند تنقید کے اصول وضع کیے اور معترضین کا تسلی بخش جواب دیا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جو نظریاتی مسائل سامنے آئے انہیں سوجھ بوجھ کے ساتھ حل کیا اور اردو تنقید کو واضح' سائنٹفک اور معروضی انداز بخشا ان میں اختر حسین برائے پوری' سجاد ظہیر' ڈاکٹر عبدالعلیم احتشام حسین اور مجنوں گورکھپوری شامل ہیں۔

اختر حسین رائے پوری کا مضمون ''ادب اور زندگی'' (رسالہ اردو۔ جولائی 1995ء) ترقی پسند ادب میں پہلی تنقیدی کوشش ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے ادب کا مقصد ذوقِ جمال تفنن طبع اور ہنسی مذاق اور تفریح کو نہیں بلکہ ادب میں افادیت و مقصدیت اور نئی معنویت کو قرار دیا۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''ادب اور انقلاب'' کے نام سے شائع ہوا۔ اختر حسین رائے پوری نے نذر الاسلام کی شاعری کو ترقی پسند ادب کا بہترین نمونہ قرار دیا۔ اختر حسین رائے پوری کی انتہا پسندی نے انہیں بہت دور تک چلنے نہیں دیا۔ وہ ترقی پسند تنقید سے علحدہ ہو گئے۔

سجاد ظہیر مارکسی نظریات کے حامی تھے۔ تنقید پر انہوں نے کوئی باضابطہ کتاب نہیں لکھی لیکن جہاں جہاں ضرورت پڑی انہوں نے اپنے تنقیدی نظریات کا اظہار کیا۔ ایک ایسے وقت جب نوجوان جوش اور نذر الاسلام کے زیر اثر انقلاب کا دہشت ناک خونین تصور پیش کر رہے تھے۔ سجاد ظہیر نے ''اردو کی جدید انقلابی شاعری'' لکھ کر نوجوانوں کو انتہا پسندی سے روکا اور اعتدال کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔ سردار جعفری نے فیض پر سخت تنقید کی تھی۔ وہ رمز و اشاریت کے خلاف تھے۔ انہوں نے فیض کو رجعت پسند شاعر قرار دیا۔ سجاد ظہیر نے فیض کی انفرادیت نرم شیریں مترنم اندازِ کلام کو قرار دیا۔

ڈاکٹر عبدالعلیم کا رویہ سخت اور ایک طرفہ تھا۔ لیکن بعد میں انہوں نے اس کو تبدیل کیا۔ اس تبدیلی کا احساس ان کے مضمون ''ادب اور ماکسزم'' میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم عوامی شاعری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ ادب میں رمز و ایما کو جائز قرار نہیں دیتے۔

احتشام حسین کو ترقی پسند تنقید میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کا رویہ متوازن اور غیر جذباتی' ان کا علم گہرا اور مطالعہ وسیع تھا۔ انہوں نے نظری اور عملی تنقید پر مضامین لکھے۔ تنقیدی جائزے' روایت اور بغاوت' ادب اور سماج' تنقید اور عملی تنقید' ذوق ادب و شعور' تنقیدی نظریات ان کی اہم کتابیں ہیں۔ احتشام حسین کارل مارکس کے جدلیاتی مادیت کے فلسفے سے متاثر تھے۔ وہ ادب کے ذریعہ عوام کو بیدار کرنے کے قائل تھے۔ احتشام حسین جمالیاتی اور ادبی قدروں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ فن پارہ اشتراکیت سے کتنا قریب ہے اور محنت کش مزدوروں کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ شعر و ادب پر جتنی بے لاگ باتیں احتشام حسین نے کی ہیں۔ دوسرے مارکسی نقادوں کے یہاں نہیں ملتیں۔

مجنوں گورکھپوری نے ابتدا میں تاثراتی تنقید کی لیکن انقلاب روس کے بعد ان کا زاویہ فکر بدل گیا۔ مجنوں کا خیال تھا کہ ادب صرف زندگی کا ترجمان ہی نہیں بلکہ زندگی کا نقاد بھی ہوتا ہے۔ مجنوں کے یہاں ادب میں اجتماعیت و انفرادیت ماضی کے ادبی اکتسابات کے سلسلے میں صحت مند رویہ' ہنگامی ادب کی نوعیت فن اور رمز و ایما کی ضرورت پر ایک متوازن اور سلجھا ہوا انداز فکر ملتا ہے۔ مجنوں نے عملی تنقید کا اظہار بہت کم کیا۔

آل احمد سرور نے خود کو کسی خاص دبستاں یا گروہ سے وابستہ نہیں کیا۔ آل احمد سرور مارکسی نظریہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ترقی پسندانہ

رجحانات کی خوبی بیان کرنے ادب کے افادی' مقصدی' عوامی اور اجتماعی کردار پر زور دینے کے باوجود وہ دوسرے مارکسی نقادوں کی طرح پہلے سے طے شدہ نظریے کی روشنی میں ادب کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ آل احمد سرور کے یہاں ذہنی توازن فکری بصیرت اور فنی رمز شناسی کا جوہر یکجا ہوگیا ہے۔ تنقید سے اشارے' نئے اور پرانے چراغ' تنقید کیا ہے۔ نظر اور نظریے ان کی اہم تصانیف ہیں۔

عزیز احمد نے ترقی پسند ادب کو ایک متوازن نقطۂ نظر دیا۔ انہوں نے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو انتہا پسندی کا شکار ہونے سے بچالیا۔ وہ ادب کو زندگی کا ترجمان سمجھتے تھے۔ وہ پرانے ادب کو رد نہیں کرتے بلکہ پرانے ادب میں ترقی پسند عناصر تلاش کرتے ہیں۔ ''ترقی پسند ادب'' ان کی اہم کتاب ہے۔

ممتاز حسین ادب کے مارکسی نقطۂ نظر کے حامی تھے۔ انہوں نے سماجی زندگی کو اس کے تاریخی ارتقا کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی اور مارکسی نظریۂ تنقید کو جامعیت کے ساتھ پیش کیا۔ ابتدا میں ممتاز حسین کا انداز بیان مشکل اور پیچیدہ تھا بعد میں انہوں نے اس پر قابو پالیا۔ ان کا مضمون ''ماضی کے ادب عالیہ سے متعلق'' بہت ہی اہم ہے۔ اس میں انہوں نے مارکسی نقطۂ نظر کی بڑی خوبی سے وضاحت کی ہے۔

علی سردار جعفری خود کو نقادوں کی صف میں شامل نہیں کرتے لیکن انہوں نے اپنی تنقید سے بھی متاثر کیا۔ سردار جعفری نے کبیر' میر' غالب' اقبال اور مخدوم کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے اس دور کے سماجی و سیاسی حالات' تہذیب و تمدن' طبقاتی کشمکش اور عوامی زندگی سے ان کے گہرے رشتے کو اہمیت دی۔ ان کی اہم کتاب ''ترقی پسند ادب'' ہے۔ علی سردار جعفری ایسی شاعری کو ترقی پسندی کے دائرے سے خارج قرار دیتے ہیں جس میں رمزیت' اشاریت' تشبیہہ و استعارہ اور تہہ داری ہو۔ اسی نقطۂ نظر کی وجہ سے انہوں نے فیض کی نظم ''صبح آزادی'' پر سخت تنقید کی۔ اسی طرح انہوں نے منٹو پر بھی سخت تنقید کی تھی۔ انہوں نے فیض اور جذبی کے مقابلے میں کیفی اعظمی اور جان نثار اختر وغیرہ کی شاعری کی تعریف کی۔ علی سردار جعفری کی تنقید نے لکھنے والوں کو تذبذب میں مبتلا کردیا۔

محمد حسن نے بھی مارکسی نقطۂ نظر سے ادب کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ محمد حسن ادب کی عصریت' انفرادیت اور آفاقیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ تنقید کے لیے سائنٹفک طریقوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ جمالیات اور فکر کے درمیان توازن قائم رکھنے کے قائل ہیں۔ انہوں نے اپنی تنقید کو غیر جانب دار بنانے کی کوشش کی۔ شعر نو' عرض ہنر' ادبی سماجیات' شناسا چہرے' معاصر ادب کے پیش رو' جدید اردو ادب اور دہلی میں اردو شاعری کا فکری و تہذیبی پس منظر ان کی اہم تصانیف ہیں۔

قمر رئیس نے زیادہ تر فکشن پر لکھا۔ انہوں نے مارکسی نظریے کا اطلاق فن پارے پر بڑی ہنرمندی سے کیا۔ وہ سماجی عوامل کے ساتھ ساتھ داخلی محرکات اور فنی خوبیوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ وہ ادب اور سماج کے گہرے رشتے کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ناولوں میں ہم عصر حالات' تہذیب' معاشرت' سماجی' سیاسی اور اقتصادی حالات کا جتنا اچھا اور مفصل بیان ہوتا ہے اردو کی دوسری صنف اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ تلاش و توازن اور تنقیدی تناظر ان کی اہم کتابیں ہیں۔

سید محمد عقیل رضوی بنیادی طور پر سماجی اثرات کو اہمیت دیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ جدید حسیت اور زندگی کے اس کرب پر بھی نگاہ رکھتے ہیں جس نے ادب میں پرانے اصولوں کو توڑا۔ وہ جدیدیت کے سخت مخالف ہیں۔ وہ اپنے مضمون ''جدید قدر اور نظر'' میں لکھتے ہیں:

> ''ادب میں فن کار کی ذات اور اس کے انفرادی احساسات کا اظہار ضرور ہوتا ہے لیکن اس کا شعور جماعتی شعور ہے۔ اس طرح اس کو روح عصر سے الگ نہیں پیش کیا جاسکتا ہے اور روح عصر سے جدلیت تک راستہ جاتا ہے''۔

ان نقادوں کے علاوہ اختر انصاری' احمد ندیم قاسمی' عبادت بریلوی' وقار عظیم' اعجاز حسین' اختر اورینوی' اسلوب احمد انصاری' خورشید الاسلام'

ظ۔انصاری، شکیل الرحمٰن، باقر مہدی، وحید اختر، ہنس راج رہبر، عالم خوندمیری، عتیق اللہ، صادق وغیرہ نے بھی اپنی تحریروں میں ترقی پسند نظری و عملی تنقید کا احاطہ کیا۔

ترقی پسند تحریک میں ڈراما بھی لکھا گیا اور طنز و مزاح بھی۔ سجاد ظہیر نے اپنے لندن میں قیام کے دوران ڈراما ''بیمار'' لکھا تھا۔ رشید جہاں نے ''عورت''، محمود الظفر نے ''ایک شام'' لکھا۔ احمد علی نے ''آزادی'' لکھا۔ ڈاکٹر دین محمد تاثیر نے ''مرزا غالب کے گھر ایک شام'' لکھا۔ کرشن چندر نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران ریڈیائی ڈرامے لکھے جو ''دروازہ'' کے نام سے مجموعے کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں ''سرائے کے باہر'' زیادہ مقبول ہوا۔ منٹو کے ڈراموں کے مجموعے ''تین عورتیں'' اور ''آؤ'' عصمت چغتائی کے ڈراموں کا مجموعہ ''شیطان'' کے نام سے راجندر سنگھ بیدی کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ''سات کھیل'' شائع ہو چکے ہیں۔ اوپیندر ناتھ اشک نے بے شمار ڈرامے لکھے اور ایک ایکٹ کے ڈراموں کو مرزا ادیب نے مقبول بنایا۔ ڈاکٹر محمد حسن کے ڈراموں کا مجموعہ پیسہ اور پرچھائیں'' ہے۔ ریوتی سرن شرما اور حبیب تنویر نے ڈرامے کی صنف کو اپنایا۔ حبیب تنویر کا ڈراما آگرہ بازار کافی مقبول ہوا۔

طنز و مزاح میں کنھیالال کپور، کرشن چندر، ابراہیم جلیس اور فکر تونسوی نے گہرے نقش چھوڑے۔ کرشن چندر کا ناول ''ایک گدھے کی سرگذشت'' بہت مقبول ہوا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. ترقی پسند تنقید میں کس کو نمایاں مقام حاصل ہے؟

(ا) اختر حسین رائے پوری (ب) مجنوں گورکھپوری (ج) احتشام حسین (د) عزیز احمد

2. رمزیت، اشاریت، تشبیہہ و استعارہ اور تہہ داری کی مخالفت کس نے کی۔

(ا) سردار جعفری (ب) ممتاز حسین (ج) مجنوں گورکھپوری (د) سجاد ظہیر

3. قمر رئیس نے زیادہ تر کس صنف پر لکھا۔

(ا) ڈراما (ب) ناول و افسانہ (ج) غزل (د) مرثیہ

27.9 خلاصہ

1934ء میں لندن میں زیر تعلیم نوجوانوں کے ایک گروہ نے انڈین پروگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن بنائی۔ یہ نوجوان سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا اور دین محمد تاثیر تھے۔ انہوں نے ایک مینی فیسٹو بنایا اور اپنے دوستوں کو ہندوستان بھیجا۔ پریم چند نے اپنے رسالے ''ہنس'' میں یہ مینی فیسٹو شائع کیا۔ 1945ء میں سجاد ظہیر ہندوستان آئے تو انہوں نے ترقی پسندوں کا ایک حلقہ بنالیا۔ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس اپریل 1936ء میں لکھنو میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں پریم چند نے یادگار خطبہ دیا۔ ایک اعلان نامہ جاری کیا گیا جس میں تلقین کی گئی کہ بے بنیاد روحانیت اور تصویر پرستی چھوڑ کر عقلیت اختیار کریں۔ پریم چند نے اپنے خطبے میں حسن کا معیار بدلنے پر زور دیا۔ تفکر، آزادی کے جذبے، تعمیر کی روح اور زندگی کی حقیقتوں، حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرنے والے ادب پر اصرار کیا۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی انجمنیں قائم ہونے لگیں۔ 1938ء میں دوسری کل ہند کانفرنس کلکتے میں بلائی گئی۔ دو ڈھائی سال کے اندر ترقی پسند ادیبوں کی تحریک تمام ہندوستانی زبانوں میں مقبول ہوگئی۔ ترقی پسندوں نے اپنا رسالہ ''نیا ادب'' لکھنؤ سے جاری کیا۔ ملک راج آنند، ڈاکٹر عبدالعلیم اور احمد علی کی ادارت میں ماہنامہ ''انڈین لٹریچر'' شائع ہوا۔ تیسری کل ہند کانفرنس مئی 1942ء میں دہلی میں منعقد ہوئی اس میں ایک قرار داد پاس کی گئی کہ وہ فاشزم کے خلاف ہیں اور اتحادی اقوام کے ساتھ ہیں۔ برطانوی سامراج کے اس رویے کی گئی مذمت کی کہ وہ نازک حالات میں بھی ہندوستان کو آزادی دینے کے لیے تیار

نہیں۔ چار پانچ سال میں جس طرح کا ادب لکھا گیا اس کی تعریف تو ہوئی لیکن تنقید بھی ہونے لگی۔ آزاد نظم کی سخت مخالفت کی گئی اور فحاشی کا الزام عاید کیا گیا۔ اکتوبر 1945ء میں حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین نے ایک کانفرنس بلائی۔ فحاشی کے خلاف قرارداد پیش کی گئی لیکن قاضی عبدالغفار اور مولانا حسرت موہانی نے اس کی مخالفت کی' یہ قرارداد مسترد ہوگئی۔ ڈسمبر 1947ء میں لکھنو میں ایک کانفرنس بلائی گئی جس میں طے ہوا کہ بمبئی میں باقاعدہ دفتر قائم کیا جائے۔ مئی 1949ء میں پانچویں کل ہند کانفرنس بھیمڑی میں منعقد کی گئی۔ ایک نیا مینی فیسٹو بنایا گیا۔ ہندی کے مشہور نقاد رام بلاس شرما کو جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ نئے منشور کی اشاعت کی وجہ سے لکھنے والے تذبذب میں پڑ گئے۔ مارچ 1952ء میں دہلی میں کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس میں کرشن چندر کو کل ہند انجمن کا سکریٹری چنا گیا۔ اس دوران سجاد ظہیر راول پنڈی کیس سے رہا ہو کر مستقل طور پر ہندوستان آ گئے۔ مئی 1956ء میں حیدرآباد میں کل ہند کانفرنس ہوئی۔ اس میں فیصلہ کیا گیا کہ ترقی پسند تحریک اپنا رول ادا کر چکی۔ اب اس کی مزید تنظیم ضروری نہیں۔

ترقی پسند شاعروں میں اسرار الحق مجاز' فیض احمد فیض' مخدوم محی الدین ' سردار جعفری' کیفی اعظمی' جان نثار اختر' ساحر لدھیانوی' مجروح سلطان پوری نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ افسانہ نگاروں میں کرشن چندر' سعادت حسن منٹو' راجندر سنگھ بیدی' عصمت چغتائی نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ ان کے علاوہ اپیندر ناتھ اشک' خواجہ احمد عباس' ہاجرہ مسرور' خدیجہ مستورت دیویندر ستیارتھی۔ مہیندر ناتھ' شکیل وغیرہ بھی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ناول نگاروں میں سجاد ظہیر' کرشن چندر' عصمت چغتائی' ابراہیم جلیس' راجندر سنگھ بیدی' حیات اللہ انصاری وغیرہ نے اچھے ناول لکھے۔ تنقید میں سجاد ظہیر' ڈاکٹر عبدالعلیم' اختر حسین رائے پوری' احتشام حسین' مجنوں گورکھپوری' آل احمد سرور' عزیز احمد' ممتاز حسین' قمر رئیس' سید محمد عقیل نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ترقی پسند مصنفین نے ڈراما اور طنز و مزاح میں بھی گہرے نقوش چھوڑے۔

27.11 نمونہ امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل ہر سوال کا جواب تقریباً تیس سطروں میں لکھیے۔

1. ترقی پسند تحریک کا پس منظر کیا ہے۔ تفصیلی نوٹ لکھیے۔
2. ترقی پسند تحریک کے آغاز اور عروج کی تفصیلات تحریر کیجیے۔
3. ترقی پسند تحریک کے زوال کے اسباب کیا ہیں؟

مندرجہ ذیل ہر سوال کا جواب تقریباً پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. ترقی پسند شاعری کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔
2. ترقی پسند افسانے کو عالمی معیار تک پہنچانے والے افسانہ نگاروں کے بارے میں نوٹ لکھیے۔
3. ترقی پسند تنقید کے اہم خدوخال واضح کیجیے۔

27.12 فرہنگ

اشتراکیت = جائیداد و وسائل میں عوام کی مساویانہ حصہ داری کا فلسفہ

غاصبانہ = زبردستی

مینی فیسٹو = منشور

لائحہ عمل = طریقۂ عمل

عقلیت = دلائل پر مبنی طرز فکر و عمل

مشاورتی = صلاح و مشورہ کا عمل

رجعت پسند = قدامت پسند

بہیمیت = بے رحمی

بدظن ہونا = خفا ہونا

عنفوان شباب = جوانی کی اٹھان

تغزل = غزل کے خمیر کو تغزل کہتے ہیں

27.13 سفارش کردہ کتابیں

1. اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ..... خلیل الرحمٰن اعظمی
2. ترقی پسند ادب ..... عزیز احمد
3. ترقی پسند ادب ..... علی سردار جعفری
4. روشنائی ..... سجاد ظہیر

☆☆☆

اکائی : 28 حلقہ اربابِ ذوق

ساخت

28.1 تمہید

28.2 حلقۂ اربابِ ذوق: پس منظر، قیام، سرگرمیاں

28.3 حلقۂ اربابِ ذوق: رجحانات

28.4 خلاصہ

28.5 نمونہ امتحانی سوالات

28.6 فرہنگ

28.7 سفارش کردہ کتابیں

28.1 تمہید

یہ اکائی اردو شعر و ادب کے ایک اور نظریاتی ادارہ ''حلقہ اربابِ ذوق'' سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم اس اکائی میں آپ کو اُس پس منظر سے واقف کرائیں گے جس کے باعث حلقۂ اربابِ ذوق کا وجود ہوا۔ حلقہ کے قیام اور اس کی سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالی جائے گی اور اسی کے ساتھ حلقۂ اربابِ ذوق کے شعری و ادبی میلانات اور رجحانات پر بھی گفتگو کی جائے گی۔ حلقہ کے امتیازی پہلو بھی زیر بحث آئیں گے۔ ہم اس اکائی کا خلاصہ بھی پیش کریں گے۔ آپ اپنی معلومات کی جانچ بھی کریں گے۔ امتحانی سوالات بھی درج کیے گئے ہیں اور آپ کے مزید مطالعہ کے لیے سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی جارہی ہے۔ امید ہے آپ ان سب سے استفادہ کریں گے۔

28.2 حلقۂ اربابِ ذوق: پس منظر، قیام، سرگرمیاں

1935ء کے لگ بھگ بلکہ یوں کہیے کہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی، ہندوستانی معاشرہ میں انتشار، اختلال، افراتفری، پریشانی، بکھراؤ اور خلجان کا زمانہ تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز بلکہ اس سے کچھ پہلے بھی دیکھیں تو حالات کچھ اور سمت، کچھ اور موڑ اور کچھ اور رنگ اختیار کرتے جارہے تھے۔ 1830ء کے اس واقعہ کا ہلکا سا تذکرہ ہو جائے کہ راجہ رام موہن رائے، یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے تو انھوں نے فرانسیسی جہاز سے جانے پر اصرار کیا کہ وہ فرانسیسی انقلاب سے متاثر تھے۔ پھر 1905ء اور 1917ء میں روسی انقلاب ہوئے۔ بلقان کے ہنگامے بھی اسی زمانے کی بات ہیں جس میں ہندوستانیوں نے ترکوں سے عدم تعاون کیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے اثرات ساری دنیا پر ترتیب پائے۔ 1933ء کی بات ہے کہ ہٹلر نے جرمنی میں فاشزم کی تحریک کی سرگردگی کی۔ ہونے والی دوسری جنگ عظیم کے خطرات منڈلانے لگے تھے۔ سیاسی کشمکش کا دور تھا۔ اقتدار کے لیے آویزش افزوں ہوتی جارہی تھی۔ بڑی طاقتیں دنیا کے زیادہ سے زیادہ حصہ کو اپنی گرفت میں رکھنے کے جنون میں تھیں، بین الاقوامی بحران شدت اختیار کرتا جارہا تھا اور اسلحہ کی دوڑ نے ترقی یافتہ ممالک کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں نے آواز بلند کی۔ یورپ کے روشن خیال اور ترقی پسند حلقوں میں فاشزم کے خلاف ردعمل ہوا۔ ہٹلر نے کئی شاعروں، ادیبوں اور سائنس دانوں وغیرہ کو یا تو قتل کرادیا تھا یا جلاوطن۔ ایسے میں 1935ء میں ادیبوں وغیرہ کی کانفرنس ہوئی ہے۔ بعد ازاں لندن میں مقیم ہندوستانی طلبہ جنھوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی اپنی کانفرنس کرتے ہیں اور ترقی پسند تحریک کا مینی فیسٹو تیار کیا جاتا ہے۔ یہ طلبہ جب ہندوستان واپس ہوتے ہیں تو لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقد ہوتی ہے اور یہ سلسلہ چل نکلتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں علم نفسیات کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ فرائیڈ اور یونگ کے نظریات عام ہونے لگتے ہیں۔ ترقی پسندوں نے فرد کے جذبات و احساسات کو کم اہمیت دی تھی بلکہ نظر انداز کردیا تھا۔ ترقی پسند مصنفین کو کمیونسٹ پارٹی کی سرپرستی حاصل تھی اور ترقی پسند فنکار، پارٹی پروگرام اور اس کی حکمتِ عملی کو روبہ عمل لانے کے پابند۔

معاشرہ کو اہمیت دی جارہی تھی اور فرد کو معاشرہ کا آلہ کار بنا دیا گیا تھا۔ اس کا ردعمل ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ درون کی سیاحت کا رجحان عام ہوا۔ فرد کے جذبات و احساسات کو پہچاننے اور ان کا احترام کرنے پر زور دیا گیا۔ حالات بھی کچھ ایسے ہی موڑ کے متقاضی ہوتے جارہے تھے اور کچھ ترقی پسند تحریک کے ردعمل کے طور پر حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام عمل میں آیا۔

''بزم افسانہ گویاں'' کے نام سے پہلے ایک انجمن قائم کی گئی اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ بزم صرف افسانے تک محدود تھی لیکن بعد میں یعنی 29 اپریل 1939ء کو ترقی پسند تحریک کے قیام کے لگ بھگ تین سال بعد نام تبدیل کر کے حلقہ اربابِ ذوق کی تشکیل کی گئی اور قیوم نظر اور یوسف ظفر کے حلقہ میں شامل ہونے کے بعد شاعری اور شاعری کی تنقید کو بھی یہاں جگہ ملی اور اس کے دائرہ کار میں بتدریج توسیع ہوتی گئی۔ ڈرامے نے بھی جگہ پائی۔ معریٰ اور آزاد نظم کو مقام ملنا ہی تھا۔ غزل کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ غرض جلد ہی ایک جامع پیرایہ میں حلقہ اربابِ ذوق نے اپنی سرگرمیوں کو آگے بڑھایا۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ حلقہ اربابِ ذوق کا قیام چونکہ لاہور میں عمل میں آیا تھا اس لیے اس کو عموماً پنجاب کا حلقہ متصور کیا گیا لیکن جلد ہی یہ غلط فہمی دور ہوگئی اور برصغیر کے دیگر علاقے کے قلم کاروں نے بھی اس میں یا تو شرکت کی یا اپنا تعاون دیا۔ ''بزم افسانہ گویاں'' کے بانی ارکان میں شیر محمد اختر، تابش صدیقی اور نصیر احمد وغیرہ تھے لیکن پھر میراجی، ممتاز مفتی، مختار صدیقی اور دیگر نے بھی اس میں شمولیت اختیار کر لی۔ ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ میراجی نے بعد میں حلقہ اربابِ ذوق کی رکنیت لی۔ حلقہ کے ریکارڈ کے مطابق میراجی نے سب سے پہلے 25 اگست 1940ء کو حلقہ کے جلسہ میں شرکت کی لیکن چونکہ میراجی کی وجہ سے حلقہ کو ایک واضح ادبی رجحان ملا اور اس کی کشش کا باعث وہی ہوئے اس لیے حلقہ اربابِ ذوق کا نام لیتے ہی میراجی کا نام آجاتا ہے۔ ہر چند کہ اس کے ارکان میں بیدی، ہنس راج رہبر، کنہیالال کپور، پرکاش پنڈت اور بیگم سکینہ محمود کے نام بھی ہیں اور دہلی میں اس کی جو شاخ قائم ہوئی اس کے معتمد ڈاکٹر عبادت بریلوی ہوئے۔ بعد ازاں دھیرے دھیرے خاص طور پر شمالی ہند کے کئی علاقوں میں حلقہ کو وسعت حاصل ہوتی گئی۔ حلقہ کے ارکان کی ہمیشہ یہ مساعی رہی کہ حلقہ کے مقاصد میں توسیع کی جائے اور ارکان کی تعداد میں اضافہ ہو۔

حلقہ کا اہم مسئلہ جلسوں کے لیے مقام کا حصول تھا۔ ابتدا یہ جلسے ارکانِ حلقہ کی رہائش گاہوں پر ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ پہلا جلسہ نصیر احمد جامعی کی رہائش گاہ عقب لکشمی منشن پر منعقد ہوا۔ پھر یہ جلسے کبھی بدرالزماں کے دفتر پر ہوئے جو امپورٹ، اکسپورٹ کا کاروبار کرتے تھے اور کبھی مصری شاہ میں واقع تابش صدیقی کے مکان پر۔ 1944ء میں کہیں یہ طے کیا گیا کہ یہاں وہاں جلسے کرنے کی بجائے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں جلسے ہوا کریں۔ یہ سلسلہ تادیر چلتا رہا۔

حلقۂ اربابِ ذوق نے صرف ادبی اجتماعات ہی کا انعقاد نہیں کیا بلکہ عملی طور پر بھی شعر و ادب کے فروغ میں اپنا حصہ ادا کرنے کی کوشش کی۔ اس رجحان کو آگے بڑھانے کے لیے میراجی کے غیر معمولی حصہ کو سب ہی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ 1941ء کی بہترین نظموں کا انتخاب کیا گیا اور اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس انتخاب میں (24) نظمیں ہیں جو احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، مختار صدیقی، ن۔ م۔ راشد، جوش، عدم، اختر شیرانی، سلام مچھلی شہری، شاد عارفی، میراجی، اختر الایمان اور راجہ مہدی علی خاں جیسے فن کاروں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ احمد ندیم قاسمی اور فیض جیسے شاعروں کی شمولیت اس امر کی غماز ہے کہ حلقہ نے ابھی ایسی صورت نہیں لی تھی اور ترقی پسندوں اور حلقہ کے افراد کے درمیان کوئی خطِ فاصل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ اس انتخاب کا ابتدائیہ (پیش لفظ) میراجی نے لکھا تھا میراجی کے باعث حلقہ کے رنگ روپ میں فرق ضرور آیا لیکن بنیادی طور پر جیسا کہ یونس جاوید نے لکھا ہے: ''1941ء تا 1947ء تک حلقۂ اربابِ ذوق کی مجالس میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہوئی نہ مباحث کے رنگ بدلے نہ ہی تنقید میں کوئی نقطۂ نظر واضح ہو کر سامنے آسکا۔ البتہ 1941ء تا 1949ء تک کی بہترین نظمیں'' کے عنوان سے منتخب نظموں کے جو مجموعے شائع کیے گئے ان میں ہم حلقہ سے منسلک ادیبوں کی فنی بصیرت اور شعری ادراک کا عکس ضرور دیکھتے ہیں۔ ابتدا میں حلقہ ان شعری انتخابات کو اپنے طور پر ہی شائع کرتا تھا اور ناشر اس طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے کہ نئی نظم ابھی تک ان کے ہاں اعتبار نہیں پائی تھی لیکن ''1943ء کی بہترین نظمیں'' کو مکتبہ اردو نے شائع کیا۔ گویا اب وہ بھی نئی نظم کی توانائی، تازگی اور مقبولیت سے متاثر ہو چکے تھے۔ نئی نظم کی مقبولیت اور حلقہ کے بڑھتے ہوئے اثر کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ ناشروں نے حلقہ سے پانچ سال تک کے انتخابات شائع کرنے کا معاہدہ کر لیا اور مشمولات کے تعلق سے ناشروں کے اعتراضات اور تجاویز کو ملحوظ رکھتے ہوئے انتخابات کی اشاعت عمل میں آنے لگی۔ تقسیم ہند کا وقت قریب آرہا تھا، شمالی ہند میں فسادات شروع ہو چکے تھے اس کا اثر حلقہ کے جلسوں اور شرکا کی تعداد پر بھی پڑا۔ چنانچہ مارچ 1947ء میں منعقدہ جلسے میں وحید قریشی، یزدانی ملک اور حفیظ ہوشیار پوری نے جن کو اس جلسہ میں مضامین پڑھنے تھے اس لیے شرکت نہیں کی کہ لاہور میں فسادات کی وجہ سے

حالات اچھے نہیں تھے۔ اس کے بعد بھی دو، تین جلسے فرقہ وارانہ فسادات اور ناگزیر حالات کی بنا پر منعقد نہیں ہو سکے۔ فسادات کے بعد پہلا جلسہ 14 ستمبر 1947ء کو منعقد ہوتا ہے اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ بعد ازاں 3 نومبر 1949ء کو میراجی کے انتقال نے حلقہ کے موقف، اس کے استحکام اور امیج کو نقصان پہنچایا۔ یوں بھی تقسیم ہند کے بعد بدلے ہوئے حالات میں حلقہ کو اپنا توازن برقرار رکھنا دشوار تھا۔ بہترین نظموں کا ہر سال جو انتخاب شائع ہوتا تھا، اس سلسلے میں 1949ء کی بہترین نظموں کا انتخاب شائع ہوا جو میراجی کے انتقال کے بعد پہلا اور اس سلسلے کا آخری انتخاب تھا۔ اس کے بعد نہ تو کوئی ناشر اس کے لیے آمادہ ہوا اور نہ ہی حلقہ اس کے مصارف برداشت کر سکا۔

منتخب نظموں کی اشاعت کا سلسلہ تو مسدود ہو گیا لیکن ادبی ذوق کی تسکین کے لیے حلقہ نے اپنا مرتب کردہ جریدہ ''نئی تحریریں'' شائع کیا جس کی پہلی جلد 1948ء میں کراچی سے اور دوسری جلد 1954ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ حلقہ کے ترجمان ''نئی تحریریں'' کے صرف چار شمارے لاہور سے شائع ہوئے۔ البتہ اس دوران 1956ء میں "1955ء کی بہترین نظمیں'' کی اشاعت عمل میں آئی جس پر حلقہ کا نام تو درج نہیں تھا البتہ اس کے مرتب قیوم نظر تھے۔ حلقہ کا نام نہ ہونے کی اور کوئی وجہ نہیں تھی سوائے اس کے کہ حلقہ میں گروہ بندی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اختلافات شدت اختیار کرنے لگے تھے۔ اس کا اظہار یوں ہوا کہ انتظار حسین، عبادت بریلوی، اور سید وقار عظیم کو ان کی ''انتہا پسندانہ سرگرمیوں'' کی بنا پر حلقہ کی رکنیت سے علحدہ کر دیا گیا۔

حلقہ کے جلسوں میں نظموں کے ساتھ افسانے بھی پیش کیے جانے لگے۔ چنانچہ اعجاز حسین بٹالوی نے افسانہ ''گرل فرینڈ'' 27 نومبر 1955ء کے جلسہ میں پیش کیا۔ سعادت حسین منٹو نے بھی 3 ستمبر 1950ء سے کئی جلسوں میں اپنے افسانے سنائے جن پر کھل کر تنقید ہوئی۔ شاہ دولے کا چوہا'' منٹو کا آخری افسانہ تھا جو انہوں نے حلقہ کے 30 مئی 1954ء کے اجلاس میں پڑھا۔ پھر منٹو کے انتقال کے بعد ہی 23 جنوری 1955ء کو حلقہ کا اجلاس ہوا۔ اس مدت میں نہ صرف بہترین نظموں کے انتخابات شائع ہوئے بلکہ ''بہترین شاعری، بہترین افسانے'' اور بہترین مقالے بھی شائع کیے گئے۔ ان سب کے ناشر تھے مکتبہ جدید لاہور۔ ابھی چند سال بھی گزرنے نہیں پائے تھے کہ حلقہ کے اختلافات مزید ابھرے اور 12 مارچ 1972ء کو حلقہ دو حصوں میں منقسم ہو گیا اور جس گروہ نے قطع تعلق کیا اس نے اپنا نام حلقہ اربابِ ذوق (ادبی) رکھا۔ یہ گروہ ادب کو خالص ادب کے حوالے سے جانچتا پرکھتا تھا۔ دوسرا خالص سیاسی نقطہ نظر سے۔ اس طرح ادب اور سیاست ان کی شناخت بن گئی۔ اس کے بعد کے اتوار سے حلقہ اربابِ ذوق (ادبی) کے جلسے پاک ٹی۔ ہاؤس میں منعقد ہونے لگے جن میں 1977ء تک باقاعدگی رہی۔ بعد میں 1979ء تک بے قاعدگی سے چلتے رہے۔ یہی شب و روز تھے کہ 1980ء میں حلقہ ارباب ذوق (پاکستان) شاخ لاہور کا قیام عمل میں آیا جس کے اجلاس 30 مئی 1980ء سے 4 اگست 1980 تک منعقد ہوئے لیکن یہ حلقہ جلد ہی معطل ہو گیا اور مارچ 1982ء میں یہ صورت رہی کہ تین حلقے اپنے جلسے منعقد کرنے لگے۔ حلقۂ اربابِ ذوق لاہور (پاکستان) حلقۂ اربابِ ذوق (سیاسی) اور حلقۂ اربابِ ذوق (قیوم گروپ)۔ ان میں حلقۂ اربابِ ذوق (پاکستان) اور حلقۂ اربابِ ذوق (سیاسی) کو ایک دوسرے میں ضم کرنے کی کوشش اپریل 1983ء میں شروع ہوئی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ یہ دونوں حلقے اپنے اپنے اجلاس منعقد کرنے اور ایک دوسرے کو غیر آئینی بھی قرار دیتے رہے آج بھی حلقۂ ارباب ذوق کسی نہ کسی نام اور رنگ سے موجود ہے اور کئی ہیں۔ ان کی حیثیت آئینی ہے یا نہیں یہ اور بات ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ ترقی پسند تحریک کی طرح اس کی سرگرمیاں بھی برائے نام رہ گئی ہیں اور ترقی پسند تحریک ہی کی طرح حلقہ اربابِ ذوق ہماری ادبی تاریخ کا حصہ بن کر رہ گیا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام کب عمل میں آیا اور کہاں؟
2. حلقۂ کے ابتدائی ارکان کے نام لکھیے۔
3. میراجی سے حلقۂ اربابِ ذوق کا کیسا تعلق رہا؟

28.3 حلقۂ اربابِ ذوق: رجحانات

بیسویں صدی کے آغاز ہی سے ہمارا قومی ہی نہیں، سیاسی، معاشرتی اور ادبی منظر نامہ بدل رہا تھا۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے آتے آتے یہ پوری طرح واضح اور روشن تر ہو گیا۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز ہونا ہی تھا سو ہوا اور اس کے ردِ عمل کے طور پر حلقۂ اربابِ ذوق کے قیام پر بھی کسی کو

متعجب ہونے کی ضرورت نہیں۔ وقت بلاشبہ اس موڑ کا متقاضی تھا ترقی پسند تحریک کا آغاز خاصے زور وشور سے ہوا۔ ترقی پسندوں نے ادب برائے زندگی کا نعرہ مخلصانہ طور پر بلند کیا ہوانہوں نے فرد کے جذبات واحساسات کو نظر انداز نہ بھی کیا ہو بہر کیف ان کو کم اہمیت ضرور دی۔ ویسے نثر اور شاعری سے ایسی مثالیں مل جائیں گی جن میں فرد کے جذبات واحساسات کی دلنواز تصویر کشی اور موثر ترجمانی کی گئی ہے لیکن یہ ترقی پسند تحریک نہیں ہندوستان کے عوامی مزاج اور ہندوستانی زبانوں کے ادب کی صدیوں پرانی روایات کا اثر تھا جو ادیبوں اور شاعروں کے ضمیر اور خمیر میں شامل تھیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک ہندوستان کی نئی نسل کے ذہنوں کی نمائندگی کرتی ہو لیکن اس پر پیرس اور لندن کی فضاؤں کا بھی اثر تھا۔ اس پس منظر کے باوجود ترقی پسند تحریک کی یہ زبردست کامیابی تھی کہ اس نے کئی دلوں کو مسخر کر لیا۔ تاہم کئی ذہن ایسے بھی تھے جو اس کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایسے نقاط نظر رکھنے والوں کے نزدیک اظہار ذات' انفرادی جذبات اور احساسات کی ترجمانی' انسانی نفسیات کی تحلیل' واردات قلبی کا انکشاف اور اس کی ترسیل کے بغیر ادب کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ لہذا ایسے فن کار جو اِن میلانات کے حامل تھے ترقی پسند تحریک میں ان کو نہ پاتے ہوئے حلقہ اربابِ ذوق کے قیام پر مائل ہوئے۔ ترقی پسندوں نے اور ان میں خاص طور پر سردار جعفری اور سجاد ظہیر نے حلقۂ اربابِ ذوق کو شدت سے نشانہ بنایا۔ سردار جعفری نے ''ترقی پسند ادب'' میں حلقۂ اربابِ ذوق کے ادیبوں کو ہیئت پرست' ابہام پرست اور جنس پرست ادیب قرار دیا جو یورپ کے انحطاطی ادب سے متاثر تھے سجاد ظہیر نے ''روشنائی'' میں ''میراجی'' کو انگلستان کے جدید رجعت پرستوں کا چربہ قرار دیتے ہوئے حلقہ اربابِ ذوق کی مجہولیت کا ذکر کیا۔ یہ زاویہ حلقۂ اربابِ ذوق کے قابل قبول نہیں رہا۔

حلقۂ اربابِ ذوق کو یورپ اور انگلستان سے وابستہ کر دینا درست نہیں۔ خارجی اثرات کی اہمیت مسلم لیکن داخلی محرکات بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں جس طرح ترقی پسندوں نے روس اور فرانس کے اثرات قبول کیے حلقہ اربابِ ذوق والوں نے بھی فرانس اور انگلستان کے اثرات زیادہ قبول کیے۔ ہاں زندگی اور ادب کے بارے میں حلقۂ اربابِ ذوق کا رجحان قدرے بدلا ہوا تھا۔ انہوں نے زندگی کی کشاکش اور خارجی حالات کی کشمکش میں راست اور بھرپور حصہ نہ لیا ہو جس طرح نظریاتی طور پر ترقی پسند چاہتے تھے' حلقہ اربابِ ذوق نے ادبی اقدار کو ملحوظ رکھا اور چاہا کہ ادب پہلے ادب ہو اور ادبی اقدار کا احترام کیا جائے۔ آیئے ہم ادب کے بارے میں حلقہ ہی کے ایک ترجمان کے خیالات سے واقفیت حاصل کریں۔

> ''ہمارے خیال میں ادب کی اولین خصوصیت یہی ہے کہ وہ اول اور آخر ادب ہو۔ ترقی پسندی اور رجعت پسندی بعد کی باتیں ہیں۔ جو چیز معیار پر پوری نہیں اترتی حلقہ کے نزدیک درخورِ اعتنا نہیں۔''
>
> (ادبی دنیا'' لاہور جولائی 1945 ص 44)

یہ اول وآخر والی بات حلقہ کے بعض ارکان میں انتہا پسندانہ حد تک ملتی ہے۔ ایسے افراد ادب کے ساتھ زندگی کو حشو وزاید میں شمار کرتے ہیں۔ اس انتہائی پسندی نے جو ایک طرح کی شدید داخلیت پسندی یا اس کا ردعمل تھی حلقہ کو روشن خیال لوگوں میں معروف ہونے نہیں دیا۔ یہ رجحان انفرادی طور پر حلقہ کے سرگرم رکن میراجی کے یہاں بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ ایک موقع پر انہوں نے لکھا ہے:

> ''اگر دو ایک لمحوں کے لیے فن برائے حیات کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو ہم کہیں گے کہ فن برائے فن کے بغیر فن ہی نہیں ہوسکتا۔ پھر یہ برائے حیات کا دم چھلا کیسا۔ حقیقت میں تہذیب وتمدن نے جن حشو وزواید کو ہم پر طاری کر دیا ہے ان ہی میں سے برائے حیات کا تصور بھی ایک چیز ہے لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ اس زمانے کے لوگوں کی باتیں زندگی کی ترجمان نہیں تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ حال کے بعض سیاسی نظریے اور سماجی واقتصادی نظام کے موجودہ رنگوں سے واقف نہ تھے۔'' (میراجی: ''دیباچہ'' 1941ء کی بہترین نظمیں۔ مرتبہ: حلقہ اربابِ ذوق' لاہور۔ صفحہ 11)

بہر کیف بڑی حد تک یہ بات طے ہے کہ حلقہ اربابِ ذوق کی ادبی اقدار کو معاشرہ کے سرد وگرم سے اس نوع کا تعلق نہیں تھا جو ادب برائے زندگی کے کٹر حامیوں کا تصور ہے۔ ویسے ن۔م۔ راشد نے جن کا حلقہ سے خاص تعلق خاطر تھا حلقہ کے رویہ کو نہایت معتدل اور متوازن انداز میں یوں بیان کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

''جدید شاعری کی جس تحریک سے میں وابستہ ہوں اس کے دو بنیادی مقاصد تھے۔ فارم کی جکڑ بندیوں سے اردو شاعری کو آزاد کرانا اور دوسرے

معاصر زندگی کی حقیقتوں سے قریب لانا۔'' اس سے حلقہ اربابِ ذوق کے نصب العین کا اظہار ہوتا ہے کہ اس نے شعر و ادب اور معاصر زندگی کے رشتہ کو کس حد تک سمجھا اور اس پر زور دیا ہے اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ حلقہ اربابِ ذوق نے فنکار کے انفرادی احساس پر زور دیا جس کی وجہ سے خارجیت اور بیرون کی داخلیت داخل اور درون کو اہمیت دی گئی۔ انھوں نے شعور کو نظر انداز کیا ہو لیکن تحت الشعور اور لاشعور کی باتیں ان کے یہاں زیادہ پائی جاتی ہیں اور ترقی پسند شاعروں کے مقابلے میں حلقہ کے شاعروں کے یہاں احساس ذات شدید ہے۔ حلقہ کے شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ فرد اور معاشرہ کی کشمکش میں حلقہ اربابِ ذوق نے معاشرہ کے مقابلہ میں فرد اور ذات کو اہمیت دی۔ تحلیل نفسی اور تحت الشعور اور لاشعور کے رجحانات نے ان فکاروں کو اپنے درون میں جھانکنے اور داخل کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دی۔ انہوں نے اسی کے ساتھ اپنی ذاتی کیفیات اور وارداتِ قلبی کو ظاہر کرنے کے لیے اسلوب میں نئے نئے تجربے کیے اور اوزان و بحور میں تبدیلیاں لائیں۔ چونکہ وہ اپنے تجربات اور واردات اور کیفیات کو من و عن اور تجریدی پیرایہ میں بیان کرنا چاہتے تھے اس لیے ان کو روایت کا سہارا لیتے ہوئے بھی روایت سے بغاوت کرنی پڑی۔ انھوں نے مروجہ اصطلاحات، استعارات، تشبیہات اور اشارات وغیرہ کو یا تو قطعی طور پر رد کر دیا یا ان کو نئے مفاہیم سے آشنا کیا۔ یہ تبدیلیاں اردو شاعری میں نئی ہی نہیں حیرت انگیز بھی تھیں چنانچہ اسی کے ساتھ یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ حلقہ اربابِ ذوق نے افادیت اور مقصدیت سے اپنے رشتہ کو قطعی طور پر نہیں توڑا بات صرف اتنی ہے کہ انھوں نے ترقی پسندوں کی طرح موضوع کو مقصدیت کی زنجیر نہیں پہنائی۔ بلکہ عملی طور پر خود کو زندگی کے چند موضوعات تک محدود رکھا۔ میرا جی نے ''1941ء کی بہترین نظمیں'' میں لکھا ہے کہ ''خیال یا موضوع کے اعتبار سے اس کی افادیت کو ملحوظ بھی رکھا گیا خواہ وہ افادیت انسانی زندگی کے کسی بھی پہلو یا شعبہ سے تعلق رکھتی ہو یعنی نظری ہو یا عملی۔'' اس صراحت کی روشنی میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حلقہ اربابِ ذوق کے ارکان نے زندگی سے اپنا تعلق منقطع کر لیا۔ حلقہ اربابِ ذوق کے ارکان نے اپنی ذات اور نج کو اہمیت ضرور دی لیکن خارج اور سماج کو نظر انداز بھی نہیں کیا۔ انھوں نے باغیانہ روش اختیار کی لیکن روایت کے احترام اور سماجی رشتہ کی پاسداری سے بھی گریز نہیں کیا اور تو اور میرا جی کے یہاں بھی ''ابوالہول'' جیسی منظومات ملتی ہیں جن میں سماجی ورثہ کی تکریم پائی جاتی ہے اور ان پر اظہار افتخار بھی.....

الطاف گوہر نے جن کا حلقۂ اربابِ ذوق میں خاصا عمل دخل رہا، حلقہ کی تشکیل کے چھ سال بعد حلقہ کے شعری طریقۂ کار کی صراحت کرتے ہوئے جن باتوں کی نشان دہی کی ہے ان میں سے چند درج کی جاتی ہیں کہ ان سے حلقہ کے موقف کا اظہار ہوگا۔

1. اچھی شاعری وہ ہے جو اپنے ماحول سے آشنا ہوتے ہوئے ہمہ گیر تاثیر کی حامل ہو۔
2. شاعری اگر شاعری نہیں تو پھر جدید ہو یا قدیم سوختنی ہے۔
3. ہمارا احتجاج جمود کے خلاف ہے، روایات کے خلاف نہیں۔
4. شاعر کا واحد مقصد اپنے شدید طور پر محسوس کیے ہوئے تجربات کا مکمل اظہار ہے۔

واضح ہے کہ حلقہ کے نزدیک ماحول سے آگہی، نفسِ شاعری، روایات کی پاسداری اور شدید احساسات کی اہمیت ہے میرا جی نے بھی ''اس نظم میں'' کے دیباچہ میں ادب کو زندگی کا ترجمان قرار دیا ہے وہ اپنے زاویہ سے ادب کو پیش کرنا چاہتے تھے اور ترقی پسند ادبی رجحانات سے فکری اختلاف کے باوجود ادب میں عصری زندگی کی عکاسی کے قائل تھے البتہ وہ اس کے خواہاں ضرور تھے کہ عصری مسائل اس طرح نہ پیش کیے جائیں کہ ادب صحافت بن جائے۔ اسی طرح ان کے ملحوظ نظر یہ بات بھی تھی کہ ادب پہلے ادب ہو، فن پہلے فن ہو۔ شاعری میں شاعر کی ذاتی زندگی کے تجربات کی جھلک ہو۔ حلقہ نے تجربے پر زور دیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ تجربہ نیا اور منفرد ہو۔ اسی طرح حلقہ نے موضوع کے انتخاب اور شاعر کے اندازِ نظر کو بھی اہمیت دی اور اس امر کی وضاحت کر دی کہ موضوع اچھوتا ہونا چاہیے اور اگر موضوع اچھوتا نہ بھی ہو تو کم از کم نظریہ جدید ہونا چاہیے۔ گویا حلقہ اربابِ ذوق کے قلم کار یہ رجحان رکھتے تھے کہ جدت یا انفرادیت ہو تو کوئی فن پارہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔ چونکہ ترقی پسندوں نے ایسی کسی جدت پر زور نہیں دیا اس لیے میرا جی اس کمی کو ترقی پسند تحریک کا المیہ قرار دیتے ہیں۔ ان باتوں سے حلقہ اربابِ ذوق کے اس میلان پر روشنی پڑتی ہے کہ تجربہ اور انفرادیت فن کے لیے بنیادی چیزیں ہیں۔ وہ اس معروف خیال سے اتفاق نہیں کرتے کہ شاعری نقل کی نقل کا نام ہے بلکہ وہ شاعری کو تخلیق قرار دیتے ہیں اور پھر بات وہیں پر آ جاتی ہے کہ فن پارے میں احساس، جذبہ یا تجربہ ہو اور اس کے اظہار میں جدت تا کہ جو بات ہو شاعر اپنے انداز سے کہے۔ حلقہ نے صرف تجربہ، جدت اور انفرادیت ہی پر زور نہیں دیا بلکہ اظہار اور ہیئت اسلوب میں بھی ان چیزوں کو ضروری قرار دیا۔ اس طرح نئی ہیئت اور نئے اسالیب کی گنجائش خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔

ہر چند کہ نظم نگاری کا تصور پہلے بھی تھا اور ترقی پسندوں نے بھی اس طرف توجہ دی تھی لیکن حلقہ والوں نے نظم کو ''عضویاتی وحدت'' کی شکل دیتے ہوئے اس کو غزل سے آزاد رکھنے کی کوشش کی اور اس کو ایک جمالیاتی تجربے کی حیثیت بھی دیدی۔ جہاں تک نظم کی ہیئت کا تعلق ہے اس بحث سے قطع نظر کہ آزاد نظم کو وسیلہ اظہار بنایا اور اس میں ایسے کئی تجربے کیے جس کی آزاد نظم متحمل ہو سکی تھی چنانچہ قافیہ در قافیہ اور اندرونی قافیوں کا استعمال بھی عام ہوا' طویل اور مختصر مصرعوں کی طرف بھی توجہ دی گئی' جملوں' سطروں اور اصوات کی تکرار ہوئی۔ نیز موضوعات کے تعلق سے بھی حلقۂ اربابِ ذوق کا رجحان الگ رہا۔ ترقی پسندوں کی طرف سے حلقہ کے شاعروں پر جنس پرستی کا الزام عائد کیا گیا اور یہ بھی کہ وہ سماجی موضوعات کو رد کرتے ہیں لیکن ایسا نہیں کیونکہ میراجی 'مختار صدیقی' قیوم نظر' ضیا جالندھری اور خاص طور پر راشد کے ہاں سماجی اور سیاسی حالات کو نہایت اہتمام کے ساتھ موضوع بنایا گیا اور اس حد تک کہ سیاسی اور سماجی موضوعات سے بے توجہی کا الزام یکسر رد ہو جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ حلقہ ارباب ذوق کے شاعروں کے یہاں انفعالی کیفیات ملتی ہیں۔ ہیئت' موضوعات اور اظہار و اسالیب کے ضمن میں انھوں نے بعض منفی صورتوں سے کام لیا لیکن انتہا پسند ترقی پسندوں نے جیسا کہ حلقہ کے شاعروں کو بدنام کرنے کی سعی کی یہ کوئی مستحسن اقدام نہیں تھا۔ اردو شاعری کو نئے افق سے روشناس کرانے' نئی جہات سے آشنا کرانے' نئی راہوں پر گامزن کرنے اور نئی بلندیوں کی سمت رواں کرنے میں حلقۂ اربابِ ذوق کا رویہ بھی ممتاز' نمایاں اور اہم ہے۔ اردو شعر و ادب میں اور کئی تحریکات' نظریات اور میلانات کی طرح حلقہ اربابِ ذوق کی اہمیت بھی لائق ذکر ہے۔ ہماری ادبی تاریخ میں حلقہ کے نام اور کام کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہی نہیں بعد ازاں بیسویں صدی کے ساتویں دہے میں جدیدیت وغیرہ کے جو رجحانات منظر عام پر آئے ان کی ساخت و پرداخت میں بھی حلقہ اربابِ ذوق کے رجحانات اور شعری سرمایہ کا گراں قدر حصہ ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ترقی پسند تحریک کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔
2. ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق کے مابین فرق تحریر کیجیے۔
3. حلقہ اربابِ ذوق کے ہم رجحانات تحریر کیجیے۔

28.4 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے آپ کو حلقۂ اربابِ ذوق کے بارے میں بتایا۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے قیام کے پس منظر اور قیام کے بارے میں آپ نے واقفیت حاصل کی۔ حلقہ اربابِ ذوق کا قیام 29 اپریل 1939ء کو لاہور میں عمل میں آیا بعد ازاں دھیرے دھیرے دہلی میں بھی اس کی ایک شاخ قائم ہوئی اور شمالی ہند کے کئی علاقوں میں اس کو وسعت حاصل ہوئی۔ حلقے نے صرف ادبی اجتماعات ہی منعقد نہیں کیے بلکہ عملی طور پر شعر و ادب کے فروغ کے لیے بھی کام کیا۔ آپ کے علم میں بات بھی آئی کہ حلقہ نے کس طرح اپنے اجلاسوں کا انعقاد کیا اور پھر کس طرح اختلافات کے باعث حلقہ زوال کی سمت رواں ہوا۔ ایک کی بجائے تین حلقے منظر عام پر آئے۔ اور اب بھی برائے نام حلقہ اربابِ ذوق کا وجود ہے۔ ہم نے حلقہ کے ادبی رجحانات کا بھی تفصیلی جائزہ لیا اور بتایا کہ حلقہ کے فن کاروں کے نزدیک اچھا ادب وہ ہے جو اپنے ماحول کا عکاس و ترجمان بھی ہو اور جس میں روایات کی پاس داری بھی موجود ہو۔ ادبی تخلیقات میں شدید احساسات اور انفرادی یا ذاتی تجربات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگی لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ فن بہر حال فن رہے صحافت نہ بن جائے۔

حلقہ نے ہیئت اور داخلیت پر زیادہ زور دیا لیکن سیاسی اور سماجی حالات سے بھی حلقہ کے شاعر بیگانہ نہیں رہے انھوں نے سیاسی' تہذیبی اور سماجی موضوعات پر اظہار خیال کیا اور اپنے زاویے کو کام میں لے آئے۔ آپ نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ حلقہ اربابِ ذوق کی مجموعی طور پر ہماری ادبی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔ آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی۔ آخر میں امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں اور فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ کے معنی بھی ہیں۔ سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی جا رہی ہے کہ آپ اس موضوع پر اپنے مطالعہ کو اور آگے بڑھائیں۔

28.5 نمونہ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے۔

1. حلقۂ اربابِ ذوق کی سرگرمیوں کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. حلقۂ اربابِ ذوق کے رجحانات پر سیر حاصل مضمون لکھیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے۔

1. حلقۂ اربابِ ذوق کے قیام کا پس منظر بیان کیجیے۔
2. ترقی پسند تحریک کن معنوں میں حلقۂ اربابِ ذوق کی ضد تھی؟ لکھیے۔

28.6 فرہنگ

الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی	الفاظ	=	معنی
خلجان	=	اندیشہ، خلش	آویزش	=	لڑائی، فساد	فاشزم	=	جمہوریت دشمن نظریہ
بصیرت	=	دانائی، دل کی بینائی	ادراک	=	عقل، فہم	ناگزیر	=	ضروری، لازم
مسدود	=	ختم، بند کیا گیا	مصارف	=	اخراجات	غیر آئینی	=	بنیادی قوانین کے خلاف
ضم	=	ملانا، شامل کرنا	خمیر	=	فطرت، مزاج	مسخر	=	تسخیر کیا گیا، فتح کیا گیا
انحطاط	=	زوال، کمی گھٹاؤ	مجہولیت	=	سستی، نکماپن	درخور اعتنا	=	توجہ کے قابل
حشو و زواید	=	زاید، بے ہودہ کلام	تجریدی	=	مشکل، پیچیدہ	پاسداری	=	مروت، لحاظ، حمایت
المیہ	=	دردناک واقعہ	انفعالی	=	شرمندہ کرنے والی			

28.7 سفارش کردہ کتابیں

1. یونس جاوید — حلقہ اربابِ ذوق
2. سردار جعفری — ترقی پسند ادب

اکائی 29 : جدیدیت اور اردو شاعری

ساخت

29.1 تمہید

29.2 جدیدیت کی فکری اور فلسفیانہ بنیادیں

29.3 جدت پسند یا فیشن پسند شاعری

29.4 جدیدیت پسند غزلیں

29.5 جدیدیت پسند نظمیں

29.6 خلاصہ

29.7 نمونۂ امتحانی سوالات

29.8 فرہنگ

29.9 سفارش کردہ کتابیں

29.1 تمہید

بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے ترقی یافتہ ملکوں کا سیاسی، سماجی اور اقتصادی منظر نامہ بڑی تیزی سے بدلنے لگا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی، نئے انکشافات اور ایجادات کا سبب بنی۔ تحقیق و تدقیق سے نہ صرف کئی مخفی حقیقتوں کی بازیافت ہوئی بلکہ مستقبل کے خواب کا ایک لامتناہی سلسلہ ترتیب پایا۔ یہ ضرور ہے کہ اس طرح انسانی فلاح و بہبود کے نئے امکانات پیدا ہوئے مگر ساتھ ہی ساتھ انسانیت کو ضرر بھی پہنچا۔ سیاسی اور اقتصادی برتری کے ساتھ ساتھ مذہبی اور نسلی تفوق کی جدوجہد ایک خطرناک دہانے پر پہنچ گئی۔ سیاسی انقلابوں، صنعتی ارتقا اور جنگی معرکوں سے کئی ملکوں میں اتھل پتھل ہوئی۔ چھٹی دہائی آتے آتے امریکہ اور روس کی سرد جنگ اور روس اور چین کے آپسی اختلافات سے الجھاؤ اور بحران شدت اختیار کر گیا۔ عالمی اصول اور ضابطے نئے سرے سے رقم ہونے لگے۔ سماجی اور تہذیبی قدریں بھی بکھراؤ کا شکار ہوئیں اور ان کا گہرا اثر فکر و فلسفہ اور شعر و ادب پر ہوا۔ عدم تحفظ، تذبذب، خوف، گمنامی، تنہائی، اجنبیت، بے چہرگی، بے رشتگی، لافردیت، لایعنیت، فراریت، انکاریت، وہم اور تشکیک وغیرہ ایسے احساسات تھے جو اس عہد کے دانشوروں اور قلمکاروں کو بے چین کیے ہوئے تھے اور وہ یوروپی مفکروں اور فلسفیوں کے تصورات و نظریات کی چھاؤں میں پناہ لینے پر مجبور ہونے لگے۔ برصغیر میں آزادی کے بعد ہونے والے ہولناک فرقہ ورانہ فسادات سے سماج پرستی، اجتماعیت اور مذہبی اشتراک کے کھوکھلے نعروں کی اصلیت ظاہر ہوگئی۔ 1962ء میں رہا سہا بھرم ہندوستان پر چینی حملے سے کھل گیا۔ اشتراکی سیاست کے ساتھ ساتھ ترقی پسند ادبی تحریک بھی تعطل اور انتشار میں مبتلا ہوگئی۔ سرمایہ دارانہ نظام، سماجی نابرابری اور غریبوں اور محنت کشوں کے استحصال کے خلاف آواز اٹھانے والے قلمکار مایوس ہوتے گئے نیز حلقۂ ارباب ذوق، سے منسلک قلمکار زیادہ توانائی اور آزادی کے ساتھ اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے لگے۔ انہیں یورپی تصورات اور نظریات سے سہارا ملنے لگا جس سے عصری قلمکاروں نے یہ مطمح نظر بنایا کہ فرد سماج کا محض ایک پرزہ نہیں ہے۔ وہ اپنی ایک حقیقت، اہمیت اور وجود رکھتا ہے۔ اسی وجود سے سماج میں رنگینی اور گہما گہمی ہے۔ ترقی پسندی میں سماج کے ذریعے فرد کی پہچان بنتی تھی۔ جب کہ اس نئے خیال سے معاملہ الٹ گیا۔ فرد کے توسط سے سماج ہی نہیں پوری کائنات کی شناخت ہونے لگی۔ طبیعاتی اور مابعد الطبیعیاتی، مادی اور روحانی منطقوں کی بازدید بھی ہوئی۔ اس نئی حقیقت یا رجحان کو جدیدیت کا نام دیا جاتا ہے۔

29.2 جدیدیت کی فکری اور فلسفیانہ بنیادیں

ہر ادبی تحریک کسی مرکزی نظریے یا مقصد سے وابستہ ہوا کرتی ہے مگر جدیدیت کوئی تحریک نہیں ہے۔ یہ ایک رجحان یا رویہ ہے اور کسی ایک نظریے تک محدود نہیں ہے بلکہ یوروپی مفکروں اور فلسفیوں کے مختلف النوع تصورات اور نظریوں پر مبنی ہے۔ اسپنسر، بارتھ، اسٹاک مان، ارنسٹ ماخ، برٹرینڈ رسل، ہیوم، فرائڈ، اڈلر، ینگ، کروچے، کرکے گارو ڈ اور سارتر وغیرہ نے اپنے خیال اور نظریے سے علمی اور ادبی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ ایسے نظریوں میں معرفت پسندی (Theosophism) انفرادیت پسندی (Individualism) ماورائے حقیقت پسندی (Surrealism) ماورائیت (Transcendentalism) انکاریت (Nihilism) پیکریت (Imagism) تاثریت (Impressionism) عملیت (Pragmatism) نراجیت (Anomat) لایعنیت (Absurdism) شعور کی رو (Stream of Consciousness) تحت الشعور (Sub consciousness) لاشعور (Collective Unconsciousness) وجودیت (Existentialism) وغیرہ خاصے مقبول ہوئے۔ ان سب کا تعلق انسان کے باطن سے تھا اور ان کے اثرات بڑے دوررس تھے۔ یہی سبب ہے کہ صنعتی، اقتصادی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی انقلابات سے دوچار ہونے والا انسان اندر سے اور مضطرب ہوا۔ وہ ایک قسم کی ذہنی، محسوساتی اور نفسیاتی کشمکش اور پیچیدگی میں مبتلا ہو کر اپنے آپ میں گم ہوتا گیا اور اس داخلی شکست و ریخت سے جو نئی حسیت پیدا ہوئی، جدیدیت پسند ادب میں اس کی کلیدی حیثیت ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. جدیدیت تحریک ہے یا ادبی رجحان؟
2. دو ایسے مفکروں کے نام بتائیے جن سے جدیدیت متاثر ہوئی۔
3. ایسے دو نظریوں کے نام لکھیے جو جدیدیت کے محرک ہیں۔
4. جدیدیت میں داخلیت حاوی ہے یا خارجیت؟
5. جدیدیت کیا ہے؟

29.3 جدت پسندی یا فیشن پرست شاعری

جدیدیت کے زیر اثر اردو شاعری کے موضوع، اسلوب اور ہیئت تینوں سطحوں پر واضح تبدیلیاں آئیں۔ ترقی پسندوں نے نظم پر زیادہ توجہ دی تھی مگر جدیدیت پسند شاعروں نے نظم اور غزل دونوں صنفوں میں اپنے فکر و خیال کی ترجمانی بھی کی اور نئے تجربے بھی کیے۔ ہیئت میں نیا پن لانے کے لیے آزاد نظم، نثری نظم، آزاد غزل اور نثری غزل کے امکانات پر غور کیا گیا ہے۔ آزاد نظم پہلے سے رائج تھی اسے مزید تقویت ملی مگر دوسرے ہیئتی تجربے کامیاب نہ ہو سکے۔ کچھ عرصہ بعد نثری نظم جڑ پکڑنے لگی۔ آزاد اور نثری غزل کا تجربہ برائے تجربہ ہی رہا۔ جدت پسندی یا فیشن پرستی کی یہ لہر نئی ہیئتوں تک محدود نہ رہی بلکہ روایتی صنف غزل کی اسلوبیاتی سطح پر بھی ابھر کر سامنے آئی۔ جدیدیت کی شروعات کے دوران بعض شاعروں نے غزل کے بنے بنائے مزاج اور لفظیاتی نظام پر کاری ضرب لگائی نیز ایک بالکل نیا اور انوکھا علامتی اور استعاراتی پیرایہ اختیار کیا جس میں خاصا تنوع بھی تھا اور ابہام بھی۔ غزل نہ اس کی خوگر تھی نہ متحمل۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھے جا سکتے ہیں

سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہوگئی

(ندا فاضلی)

بھاگی چلی آرہی ہے دیکھو تو
بستی ہے شکار ' شام چیتا ہے (شمس الرحمٰن فاروقی)

مرجھا کے کالی جھیل میں گرتے ہوئے بھی دیکھ
سورج ہوں میرا رنگ مگر دن ڈھلے بھی دیکھ
(شکیب جلالی)

گلدان میں گلاب کی کلیاں مہک اٹھیں
کرسی نے اس کو دیکھ کے آغوش وا کیے (محمد علوی)

اس قسم کے شعروں کی مختلف انداز سے تعبیر وتشریح کی گئی۔ پھر بھی 'سورج کی چونچ میں مرغا' شام کا چیتا ہونا' 'سورج کا کالی جھیل میں گرنا' اور 'کرسی کا آغوش وا کرنا' کسی بھی طرح غزلیہ اسلوب اور لہجے سے لگا نہیں کھاتے ہیں۔ اس لیے ان نمونوں یا اس طرح کے دوسرے نمونوں کو محض ایک جدت پسند بیانیہ کہا جائے گا۔ صنف نظم میں بھی اس کی پیروی کی گئی۔ شہریار کی یہ نثری نظم اس کی ایک مثال ہے

لیکن تم یہ نہیں جانتے تھے کہ
تلوار کی چمک خون سے قائم رہتی ہے
اور خون بھی دشمن ' دوست کا نہیں
لیکن تم اپنے دشمن سے ناواقف تھے
اس لیے تمہاری تلوار زنگ آلود ہے !

(مجموعہ۔ ''ساتواں در'')

ہر چند یہ نظمیہ اسلوب مذکورہ غزلیہ اسلوب سے مختلف ہے اور اس میں لفظوں کی انوکھی ترتیب نہیں ہے اور نہ گمبھیر علامت یا استعارہ ہے مگر یہ اکہرا اسلوب نہ احساس کی جلوہ نمائی کرتا ہے نہ ہی شعریت بداماں ہے۔ اسی بنا پر اسے بھی جدت پسندی یا روایت شکنی کا نمونہ قرار دیا جائے گا۔ ایسی مثالیں ابتدائی دور میں ملتی ہیں۔ جدیدیت کے استحکام کے بعد انہیں ناپسند کیا جانے لگا اور آہستہ آہستہ ان کا خاتمہ ہو گیا۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. کسی ایک جدت پسند غزل گو کا نام بتائیے۔
2. جدت پسندی یا فیشن پرستی کس دور میں ابھری؟
3. جدت پسندی کی اہم خصوصیت کیا ہے؟
4. جدت پسندی کا مظاہرہ کن شعری ہیئتوں میں کیا گیا؟
5. جدت پسندی کا خاص تعلق موضوع سے تھا یا اسلوب سے۔
6. جدت پسندی کا آئینہ دار ایک شعر لکھیے۔

29.4 جدیدیت پسند غزلیں

جدیدیت پسند شاعروں نے اردو غزل میں موضوع اور اسلوب کی سطح پر بڑی خوشگوار اور دلکش تبدیلیاں کیں۔ حالانکہ غزل کے کلاسیکی مزاج میں

تبدیلی لانے کی کوشش 1857ء کے بعد خاص طور پر حالی کے ذریعے ہو چکی تھی اور فکر و خیال کو ایک نیا موڑ دے کر آسان لفظوں میں ڈھالا گیا تھا جس سے غزل میں قدرے اکہرا پن آ گیا تھا پھر بھی اسے اجتہادی اقدام ماننا ہوگا۔ جدیدیت پسند شاعروں کی اہم دین یہ ہے کہ انہوں نے فرد کے حوالے سے کائنات کی بے شمار صداقتیں اپنی شعری کائنات میں سمیٹ لیں نیز ان کی پیش کش میں یہ اہتمام کیا کہ موسیٰ و طور، مریم و عیسیٰ یوسف و زلیخا، شیریں و فرہاد، قفس و آشیاں، کعبہ و کلیسا، صیاد و گلچیں، ساغر و مینا، ساقی و میخانہ اور واعظ و محتسب جیسی کثرت سے استعمال ہونے والی کلاسیکی تلمیحوں، اشاروں اور استعاروں سے شعوری طور پر گریز کیا۔ شاعری کا رشتہ اپنی دھرتی سے استوار کرتے ہوئے تخلیقی سطح پر ایسی علامتیں اور تلازمے وضع کیے جن میں صداقتوں کے نئے گوشے بھی ضم ہو جائیں اور بیان کی تہہ داری اور پہلو داری بھی موجود رہے۔ سورج، چاند، رات، اندھیرا، اجالا، دھوپ، پرچھائیں، دھند، حصار، سمندر، جھیل، دریا، کشتی، بادبان، جزیرہ، شہر، بستی، گھر، مکان، پتھر، ریت، راکھ، درخت، پتا، پھول، تتلی، مچھلی وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جنہیں مختلف معنی میں بالتکرار استعمال کیا گیا۔ نئی شعری روایت میں ان کی حیثیت کہیں اشارے کی ہے، کہیں علامت کی اور کہیں استعارے کی۔ اصل خصوصیت یہ ہے کہ یہ بالکل سامنے کے ہیں، ان کی توجیہہ کے لیے ایک قاری کو ماضی کی ورق گردانی نہیں کرنا پڑتی ہے اور مفہوم اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اس خوبصورت غزلیہ آہنگ سے ابھرتا ہے۔ ذیل کے شعروں سے یہ بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔

زمیں پہ چاند اُترتا دکھائی دیتا ہے
ترا خیال بھی تجھ سا دکھائی دیتا ہے

(خورشید احمد جامی)

اپنی ہی یادوں کی بوسیدہ ردا لے جائے گا
میرے گھر تک بھی وہ گر آیا تو کیا لے جائے گا

(مظہر امام)

شہر تمنا کے باشندے آ پھنسے کس بستی میں
نیچے کانٹے، آگے پیچھے، دائیں بائیں سر پر دھوپ

(مظفر حنفی)

دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے

(ناصر کاظمی)

اجڑ چکی ہے یہ بستی مگر وہ شخص ابھی
بڑے خلوص سے دل کے کھنڈر میں رہتا ہے

(محمد علی اثر)

ابھی میں اپنے گھر میں سو رہا تھا
ابھی گھر سے میں بے گھر ہو گیا ہوں

(محمد علوی)

نہ جس کا نام ہے کوئی، نہ جس کی شکل ہے کوئی
اک ایسی شے کا کیوں ہمیں ازل سے انتظار ہے

(شہریار)

آگے آگے کوئی مشعل سی لیے چلتا تھا
ہائے کیا نام تھا' اس شخص کا پوچھا بھی نہیں

(شاذ تمکنت)

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے
انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

(بشیر بدر)

یہ چاہا تھا کہ پتھر بن کے جی لوں
سو اندر سے پگھلتا جارہا ہوں

(سلیم احمد)

دلوں کی اُور دھواں سا دکھائی دیتا ہے
یہ شہر تو مجھے جلتا دکھائی دیتا ہے

(احمد مشتاق)

ان شعروں کے موضوعات نئے نہیں ہیں۔ان میں عشق کی آنچ ہے' کسک ہے۔محرومی کا احساس ہے۔محزونی کا ذائقہ ہے۔عشق ومحبت کی ناکامی' یادوں کی ایک چلمن چھوڑ جاتی ہے جس سے حزن آمیز کرنیں بکھرتی رہتی ہیں۔اس طرح کے احساسات اور اس نوع کی داخلیت کی ملفوظی مصوری کلاسیکی شاعروں نے بھی کی ہے اور بعد کے شاعروں نے بھی۔پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر مرقومہ بالا شعروں کی ندرت کیا ہے؟ جدیدیت پسند شاعروں نے اپنی تخلیقی نادرہ کاری کا جوہر کہاں دکھایا ہے؟ ایک باشعور قاری کے لیے یہ سوال مشکل نہیں۔اظہار وبیان کی لفظیات عہد کی جدید حسیت اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور داخلیت کی ملفوظی مصوری کی ایک نئی صورت اور نئی جہت عکس پذیر ہوئی ہے۔ساتھ ہی ساتھ معنیاتی افق میں کشادگی آئی ہے۔اس عمل میں کہیں بھی تکدر یا ناگواری پیدا نہیں ہوئی بلکہ غزلیہ اسلوب میں معیاری اور باوقار اضافہ ہوتا ہے۔

جدیدیت پسند شاعری میں احساس تنہائی اپنے مضمرات کے ساتھ ایک اہم اور کلیدی وصف بن گیا ہے۔اس سے کئی مثبت اور منفی احساسات پے در پے جنم لیتے ہیں اور اصلاً یہ سب نظریۂ وجودیت کی کہکشاں ہیں۔وجود کی سطح پر فرد کے ذہن میں تنہائی کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں مثلاً

1. بیگانگی (Alienation)
2. علاحدگی (Isolation)
3. گوشہ نشینی (Solitude)
4. اکیلاپن (Aloneness)
5. تنہائی (Loneliness)

یہ ساری صورتیں ایک دوسرے سے منسلک ہیں لیکن ان کے مدارج الگ الگ ہیں:

شہر وفا میں دھوپ کا ساتھی کوئی نہیں
سورج سروں پہ آیا تو سائے بھی گھٹ گئے

(بیگانگی۔پروین شاکر)

اب میں اک موج شب تار ہوں ساحل ساحل
راہ میں چھوڑ گیا ہے مرا مہتاب مجھے

(بیگانگی۔شہاب جعفری)

دم بخود تھے لوگ اپنے آپ سے سہمے ہوئے
گھر کے اندر عافیت کا ایک بھی گوشہ نہ تھا

(علاحدگی۔نشتر خانقاہی)

آج محصور ہیں دیمک زدہ دیواروں میں
ہم جو شامل تھے کبھی شہر کے معماروں میں

(علاحدگی۔پرت پال سنگھ بیتاب)

اتنا مانوس ہوں سناٹے سے
کوئی بولے تو برا لگتا ہے

(گوشہ نشینی۔احمد ندیم قاسمی)

رہتے ہیں اہل شہر کے سایے سے دور دور
ہم آہوانِ دشت کی صورت ڈرے ڈرے

(گوشہ نشینی۔احمد فراز)

اس اکیلے پن کے ہاتھوں ہم تو فکری مر گئے
وہ صدا جو ڈھونڈلی تھی جنگلوں میں کھوگئی

(اکیلا پن۔پرکاش فکری)

اکیلا چاند آئینے کو ترسے
بھرے تالاب میں کائی پڑی ہے

(اکیلا پن۔شاہین غازی پوری)

ایک مدت سے چراغوں کی طرح جلتی ہیں
ان ترستی ہوئی آنکھوں کو بجھادو کوئی

(تنہائی۔ساقی فاروقی)

اپنی عظمت کی داستاں لے کر
گاؤں میں رہ گیا کھنڈر تنہا

(تنہائی۔ملک زادہ جاوید)

احساس تنہائی کی صورتوں کے علاوہ ایک صورت اجنبیت ہے۔اسے احساس تنہائی کی پہلی سیڑھی بھی کہا جاسکتا ہے۔جدیدیت پسند غزل میں اس کا بھی پُر اثر عکس ملتا ہے:

خوشیوں کی دھوپ، درد کے سائے کہاں گئے
وہ لوگ جو تھے اپنے پرائے کہاں گئے

(معنی تبسم)

اب تو اپنے آپ کو بھی اجنبی لگتا ہوں میں
کون مجھ سے چھین کر میری نشانی لے گیا

(سلطان اختر)

زندگی کی بے معنویت اور بے ہمتی، رشتوں کی بے رشتگی، چہروں کی بہ چہرگی، مایوسی، خوف، فنا پرستی، لایعنیت، بے وطنی، ہجرت، انفعالیت، احتجاج، تشدد، حسرت تعمیر، اثبات ذات وغیرہ ایسے بے شمار موضوعات ہیں، جنہیں جدیدیت پسند غزل گوؤں نے بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ مثلاً چند شعر دیکھیے

خنجر بکف تھے لوگ کھڑے اس کے اردگرد
نکلا نہ ایک شخص بھی جلتے مکان سے

(پرکاش فکری)

بارش کی بوند بوند سے ڈرتا تھا میرا دل
اک ریت کے مکان کا معمار میں بھی تھا

(مخمور سعیدی)

عجیب خواب تھا تعبیر کیا ہوئی اس کی
کہ ایک دریا ہواؤں کے رخ پہ بہتا تھا

(آشفتہ چنگیزی)

یہ اک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے
نہ اتنی تیز چلے سرپھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتا دکھائی دیتا ہے

(شکیب جلالی)

مرے خدا مجھے تو اتنا معتبر کردے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کردے

(افتخار عارف)

ہر نئی نسل کو ایک تازہ مدینے کی تلاش
صاحبو! اب کوئی ہجرت نہیں ہوگی ہم سے

(افتخار عارف)

اب کے ہم بچھڑیں تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

(احمد فراز)

دن کی دیکھی ہوئی ہر شکل بدل جائے گی
رات کے ساتھ ذرا گھر سے نکل کر دیکھو

(مخمور سعیدی)

جسم اپنا ہے کوئی اور نہ سایہ اپنا
جانے اس زیست سے ہے کون سا رشتا اپنا

(مصورؔ سبزواری)

منیرؔ اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے پا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

(منیرؔ نیازی)

دھوپ نکلی دن سہانے ہوگئے
چاند کے سب رنگ پھیکے ہوگئے

(ناصرؔ کاظمی)

یہ اشعار اپنے خالق کے زمینی رشتے کے ترجمان ہیں۔ ان کی بنت میں عصری آگہی ہے جو ان گنت مسائل اور داخلی کیفیتوں کے خمیر سے ابھری ہے۔ انسان جب خارجی دنیا میں اپنی نامرادیوں' ناکامیوں اور ناآسودگیوں سے تنگ آ کر ایک نوع کی بے نیازی اور لاپرواہی میں گرفتار ہونے لگتا ہے۔ لاچاری اور فطری مایوسی' ذاتی اور داخلی کرب کی شکل اختیار کرنے لگتی ہے تو اس کی آنکھیں اندر کی طرف کھلنے لگتی ہیں۔ وہ اپنے آس پاس کی دنیا سے ناامید ہوجاتا ہے اور خود اپنا چارہ گر بن جاتا ہے۔ اسے نہ کسی نشان راہ کی تلاش ہوتی ہے نہ خواب ناک دنیا کی۔ وہ اپنے آپ میں مگن رہتا ہے۔ اکتاہٹ' اضطراب' بے سمتی' بے معنویت' استعجاب اور خالی پن کے احساسات اسے ایک مسلسل اذیت میں مبتلا رکھتے ہیں اور وہ اندر ہی اندر گھلتا رہتا ہے مگر اس اذیت میں ایسی لذت ملتی ہے کہ اس کے لیے اپنے خول سے نکلنا کٹھن ہوجاتا ہے۔ جدیدیت پسند غزلوں میں عہد کی یہ کھری سچائیاں بڑی کربناکی کے ساتھ منکشف ہوئی ہیں:

رہ گذر سونی' سیہ' اندھی مسافت ہے بہت
یہ کہ ہے دشت انا' اس میں اذیت ہے بہت

(لطف الرحمٰن)

آئینہ توڑ کے چہرا دیکھوں
عکس کمرے میں تڑپتا دیکھوں

(باقر مہدیؔ)

دشائیں چھوڑ رہی ہیں آج مجھ کو
نکل کر خود سے باہر آ گیا ہوں

(کمار پاشیؔ)

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے

(خلیل الرحمٰن اعظمیؔ)

مجو ہجوم بے کراں کچھ بھی نہ تھا
منظروں کے درمیاں کچھ بھی نہ تھا

(علیم اللہ حالیؔ)

یوں تو ان موضوعات میں گونا گونی اور تنوع ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ایک ہی عہد میں فکر و احساس کی ایک یلغار ہوگئی ہو' ایک طوفان آ گیا ہو مگر اس کثرت میں وحدت کی تلاش کی جائے تو انسان کی باطنی تاریخ کا ایک نگار خانہ ترتیب پا جائے گا جس میں زندگی کی تہہ داری' گہرائی' پھیلاؤ' تسلسل' ردو قبول اور عمل اور ردعمل سب کچھ نظر آئے گا اور یہ سب کچھ وجود کے معنی خیز داخلی سفر سے عبارت ہے۔ جس کے لمحے لمحے کی جمالیاتی اور ملفوظی تصویریں اور حسّی پیکر جدیدیت پسند غزلوں میں ملتے ہیں۔ ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ نازک حسّی تجربوں اور پر پیچ داخلی سفر کی جستہ جستہ روداد پیش کرنے کے لیے شیریں' سلیس اور رواں الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ان کی نشست و برخاست' ترتیب اور تنظیم سے ایک نغمہ بار اکائی بنتی ہے۔ جس میں آسان ڈکشن' شگفتہ علامتیں' موثر استعارے اور سجیلے رمز و اشارے سمائے ہوئے ہیں۔ ان ہی خصوصیتوں کی بنا پر جدیدیت کے زیر اثر اردو غزل موضوع و اسلوب اور لب و لہجے کے اعتبار سے نئی سمت سے بھی آشنا ہوتی ہے اور اپنی ایک شناخت بھی بناتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. جدیدیت کے زیر اثر غزل میں کس سطح پر تبدیلی آئی؟
2. ایسے پانچ الفاظ لکھیے جنہیں جدیدیت پسند غزل گوؤں نے بالتکرار برتا ہے۔
3. کسی بڑے جدیدیت پسند غزل گو کا نام لکھیے۔
4. جدیدیت پسند غزلوں کا محور کیا ہے؟
5. دو جدیدیت پسند شعر تحریر کیجیے۔
6. جدیدیت پسند غزل میں نئی حسّیت سے کیا مراد ہے؟

29.5 جدیدیت پسند نظمیں

نظم ایک بیانیہ صنف شاعری ہے۔ اس میں اشاروں' کنایوں اور علامتوں کا نظام تو ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے مگر اس میں ہم آہنگی استحکام اور گٹھاؤ ویسا نہیں ہوتا ہے جیسا غزل میں ہوتا ہے کیوں کہ نظم میں ارتقا اور تسلسل کی گنجائش ہے۔ جدیدیت کے زیر اثر اس صنف میں بھی خوشگوار موڑ آیا ہے۔ نئی حسّیت علی الخصوص احساس تنہائی اپنے تمام مضمرات اور پیچیدگیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آئی ہے :

میں نے زہد و تقویٰ کا ملبوس اتار دیا ہے
اور پراگندہ مٹی میں دفن گنہ سے صدہا صد سالوں پوشیدہ تن
کو میلا کر کے عریاں کر ڈالا ہے
لیکن اب تو شب کا نور نکھر آیا ہے
سورج جاگ پڑا ہے
سارے سائے خاک ہوئے ہیں
اور بدن آلائش سے آلودہ نہیں
دیواریں ہیں دیواریں جو تنہائی کا چہرہ ہیں (تنہائی کا چہرہ۔ افتخار جالب)

یہ علاحدگی اور گوشہ نشینی کا وہ شدید روپ ہے جو بدلے ہوئے سماج اور بدلی ہوئی تہذیب کے ردعمل میں سامنے آیا ہے' زہد و تقویٰ کا ملبوس' نمائشی اصول اور بندھن کی علامت ہے۔ اس کے ساتھ بلکہ متقابل' پراگندہ مٹی میں دفن گنہ' نمائش اور کھوکھلے اصولوں سے چھٹکارے کا علامیہ ہے۔ ظاہر ہے چھٹکارا پانے کے بعد من کے اندر اترنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جہاں روشنی ہے اور سکون ہے۔ دراصل تنہائی کا احساس محض جسمانی یا جذباتی سہارے کی عدم موجودگی سے پیدا ہوتا بلکہ ایک نوع کے تہذیبی اور نفسیاتی ردعمل کے طور پر بھی ابھرتا ہے اور یہ ردعمل زندگی کی ناہمواریوں یا نامساعد حالات میں ہوتا ہے:

عمر اک چیخ کی میعاد ہے
تم بھی چیخو
اتنی شدت سے کہ اک مدت تک
وقت کو یاد رہے
جنگلوں اور پہاڑوں میں یہ فریاد رہے (وقت۔قاضی سلیم)

کبھی کبھی ردعمل کا ایک اور رنگ ابھرتا ہے۔ناموافق ماحول سے مفاہمت نہ کرنے کی بنا پر فرد آس پاس کی ہر چیز سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔اس کے لیے ہر دیکھی بھالی موجود چیز اجنبی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اس کا اپنا وجود بھی اسے اجنبی لگنے لگتا ہے

میں منظر ہوں تسلسل ہوں
مگر میں اجنبی کیوں ہوں
یہ فرش آب وگل میرے لیے اک سلسلہ کیوں ہے
پرندہ آسماں کی نیلگوں محراب کے اس پار جاتا ہے
پرندہ فاصلہ کیوں ہے
پرندہ ماورا کیوں ہے

(پرندہ۔بلراج کومل)

اجنبیت ہی کا ایک پہلو بیگانگی ہے۔اس کی منظوم شکل بھی دیکھی جا سکتی ہے:

سنسان ہیں مکان کہیں در کھلا نہیں
کمرے سجے ہوئے ہیں مگر راستہ نہیں
ویراں ہے پورا شہر کوئی دیکھتا نہیں
آواز دے رہا ہوں کوئی بولتا نہیں

(میں اور شہر۔منیر نیازی)

شارع عام پر حادثہ ہو گیا
آدمی کٹ گیا
اس کا سر پھٹ گیا
بھیڑ بہتی رہی
بات کرنے میں جو تھے مگن
بات کرتے رہے
قہقہے چیخ کے پر کرتے رہے
اور اکثر جو خاموش تھے
چپ گذرتے رہے
آدمی مر گیا! (سندباد۔عمیق حنفی)

صنعتی سماج کی تیز رفتار زندگی نے آدمی کو آدمی سے جدا کر دیا ہے۔ آدمی کے اندر کا انسان ہار چکا ہے۔ ماضی اور حال سے اس کا بڑا ڈھیلا ڈھالا ناتا رہ گیا ہے۔ بس ایک دوڑ ہے مستقبل کی طرف جس میں بیشتر لوگ شریک ہیں۔ کسی پل جین، سکون اور آسودگی نہیں ہے۔ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر متحرک اور فعال رہنے کا نام زندگی ہے اور زندگی کا یہی روپ بیگانگی اور اکیلے پن کا احساس پیدا کر رہا ہے

ہم اجنبی تھے شہر میں، ہمارا کون تھا وہاں
قطار در قطار سامنے تھے ان گنت مکاں
مگر ہمارے سر پہ چیختا رہا تمام شب مہیب آسماں (سائے کے ناخن۔ بلراج کومل)

ان نظمیہ ٹکڑوں میں جدید دور کے فرد کے اندر سے ٹوٹنے کی چیخ ہے، ایک اندوہناک اور دردناک چیخ، جو قاری کا ذہن جھنجھوڑتی ہوئی رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے اور داخلی طور پر فرد کے ریزہ ریزہ بکھرنے کی آڑی ترچھی تصویریں ترتیب دے جاتی ہے۔ واقعہ کی یکسانیت یا مرکزیت کے باوجود جدیدیت پسند شاعر اپنے اپنے ذہن و مزاج کے لحاظ سے اس کا اثر لیتے ہیں۔ ان کا ردعمل بھی الگ الگ زاویوں سے ہوتا ہے۔ شاعر اور سماج کے درمیان ہم آہنگی نہیں ہو پاتی اور نہ سماج سے اس کی اپنی ذات کی پہچان ہو پاتی ہے تو اس میں برگشتگی پیدا ہوتی ہے اور برگشتگی اس کی نفسیات پر ایسا اثر ڈالتی ہے کہ وہ بیگانگی، علاحدگی، اکیلے پن اور تنہائی کے احساسات سے دوچار ہوتا ہے اور کبھی کبھی گوشہ نشینی اختیار کر کے سکون حاصل کرتا ہے۔ یہ سب داخلی عمل کے مرحلے ہیں جنہیں شاعروں نے طے کیا اور اپنے اپنے لفظوں میں جلوہ گر بھی کیا

مگر یہاں کی بستیوں میں کون ہے؟
جو آس کی شکھا لیے، سپاٹ سرد ریت پر کھڑا رہے
کوئی نہیں
کوئی نہیں
تو کیوں نہ ان بجھی دشاؤں کو سمیٹ لیں!
تو کیوں نہ اور سو رہیں!

(میں سو گیا۔ احمد ہمیش)

اے رنگ برنگی شامو
کیوں دامن میرا تھامو
تم آوازوں کی بستی
میں سناٹوں کا صحرا
تم بہتے وقت کی موجیں
پل بھر میں گذر جاؤ گی
میں سوچ کا پیاسا پتھر
آپ اپنی ہی گہرائی میں
ڈوبا ہوا رہ جاؤں گا (شہاب جعفری)

شاعروں نے اپنے حسّی تجربوں کے دوسرے رنگوں کی بھی ترجمانی کی ہے اور شعری پیکروں کی تخلیق کی ہے۔ حسی اظہار کے اس رجحان کا تعلق پیکریت (Imagism) سے ہے۔ ذیل کا نمونہ دیکھا جا سکتا ہے :

تمہاری رگوں میں میری رگوں کی طرح
کتنی صدیوں کا خوں، کتنی نسلوں کا خوں موج زن ہے
اور یہ ساری نسلیں، شکستہ مگر اونچی دیوار کی طرح استادہ ہیں
یونہی کب تلک فون پر بات کرتے رہیں گے
یونہی فاصلہ جسم کا، لمس کا
ایک رشتہ فقط صوت و آواز کا
یہ رشتہ بھی حصہ ہے گونگے سفر کا
جو کب ٹوٹ جائے
کسے یہ پتا ہے!
کاش یہ رشتۂ صوت و آواز ہی دائمی ہو
کہ گونگے سفر کے سبھی سلسلے عارضی ہیں (مظہر امام)

تحت الشعور اور لاشعور میں موجود بہت ہی موہوم سچائیوں اور واہموں کی ملی جلی کیفیت کے اظہار میں ابہام اور اشاریت کا پیدا ہونا فطری ہے۔ فی نفسہٖ ایسے تجریدی خیال زمینی علاقہ نہیں رکھتے۔ ذہن کی کسی تہہ میں پُر اسرار طریقے سے آ جاتے ہیں اور کبھی کبھی اچانک کہیں ظاہر ہوتے ہیں۔ شاعروں نے بسا اوقات اپنے خیال کا ہلکا پھلکا عکس پیش کیا ہے۔ ان کی بنت میں ماورائے حقیقت پسندی (Surrealism) کا میلان بھی شامل ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر نظم کا یہ حصہ درج ہے:

سورجوں کی بستیوں میں
ہر طرف سورج ہی سورج
میرے اپنے لوگ
میری آتما کے ان گنت انجانے روپ
اک دوسرے سے اس قدر سب آشنا
سارے روپ اک دوسرے میں نور کی مانند یوں تحلیل
جیسے میرے اندر میرا میں (وجدان۔ شہاب جعفری)

یہاں بات نئی، انوکھی اور پر اسرار ہے۔ علامتی اور اشاراتی اظہار اسے مزید مبہم بنا دیتا ہے۔ جس کی بنا پر وہ تخلیقی تاثر مرتسم نہیں ہوتا جو قاری کے وجود میں ایک پر مسرت حسّی ارتعاش پیدا کر دے اور معنویت کی روشنی پھوٹے۔

جدیدیت پسند شاعروں نے ہیئتی سطح پر آزاد نظم میں اپنی عصری حسیت کا جادو جگایا۔ اس کے علاوہ بصری نظم (Concrete poetry) اور نثری نظم (Prose-poem) کی ہیئتوں میں بھی تجربے کیے۔ آزاد نظم اور نثری نظم لکھنے کا چلن اردو میں بہت پہلے سے تھا۔ حلقۂ ارباب ذوق کے شاعروں نے پابند کے ساتھ ساتھ آزاد نظمیں بھی کہی تھیں پھر ترقی پسندوں نے بھی اسے اپنایا۔ نثری نظم رومانی اور ترقی پسند شاعروں کے ذریعے ارتقا پذیر ہوئی تھی۔ لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ آزاد نظم اور نثری نظم کی ہیئتوں کو تقویت اور استحکام جدیدیت پسند شاعروں نے دیا ہے۔ بہر حال کنکریٹ نظم کا یہ نمونہ زیر نظر رہے:

بدن کے کیپسول میں
عجیب سا سفوف ہے بھرا ہوا
کثیف ہے لطیف ہے غلیظ ہے
[illegible]
[illegible]
گل و ثمر ملے جلے
[illegible]
جو کش مکش تمام ہو
بدن سوائے خول کے نہیں ہے کچھ
خلا
خلا
خلا

(خلا۔ زرینہ ثانی)

یہاں چھوٹے بڑے مصرعے یا شعری سطریں بغیر کسی ترتیبی حسن کے اوٹ پٹانگ طور پر لکھی گئی ہیں جو خیال کی لہروں اور شعور کی رو کے اُتار چڑھاؤ اور ابھرنے ڈوبنے کی مثال ہے۔ اس کے پس پردہ زندگی کی بے ترتیبی، بے معنویت اور بے سمتی منعکس ہو رہی ہے۔ ان عوامل کی بصری تصویر لفظوں کی آڑی ترچھی سجاوٹ سے ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہیئت کے اس تجربے میں یہ موضوع در آیا ہے کہ زندگی کے اتار چڑھاؤ اور کش مکش ہی کی بنیاد پر وجود قائم ہے اور اس کے بغیر وجود بالکل خلا کی طرح بے معنی ہے۔

نظمیہ شاعری میں اس طرح کے ہیئتی تجربے تو ہوئے مگر اردو شاعری کے مزاج میں یہ ضم نہیں ہو سکے اور تاریخ کا حصہ بن کر محفوظ ہو گئے۔ اس کے مقابلے میں نثری نظم آہستہ آہستہ پھلنے پھولنے لگی۔ اس کے ذریعے قدیم عروضی آہنگ کو توڑنے اور ایک متبادل آہنگ بنانے کی سعی کی گئی ہے۔ لفظوں، سطروں اور پیراگراف کی ترتیب سے آہنگ بنایا گیا اور کسی قدر کامیابی بھی ملی مگر نغمگی اور شعریت کی کمی کھٹکتی رہی۔ اس نظم کے مطالعے سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے:

تمہارا شعلہ بجھ چکا ہے
اس لیے نہیں کہ ہوا تیز تھی اور مخالف
بلکہ اس لیے کہ تم نے
اسے ہوا سے دور رکھا

('ساتواں در' کی ایک نظم۔ شہریار)

اعجاز احمد، احمد ہمیش، حسن شہیر اور افتخار جالب وغیرہ نے بھی اس دور میں نثری نظمیں کہیں اور جدیدیت کے مخصوص علامتی اور اشاراتی انداز اظہار میں عصری حسیت سمونے کی کوشش کی۔ ہیئتی سطح پر مختصر، اوسط اور طویل ہر طرح کے تخلیق پارے وجود میں آئے۔ جن میں مختصر نثری نظمیں قدرے موثر ثابت ہوئیں۔

جدیدیت کے دور میں وجودیت کے تناظر میں ابھرنے والے تمام موضوعات نظموں میں داخل ہوتے گئے اور تخلیق کی چمک دمک میں اضافہ کرتے رہے۔ احساس تنہائی' بیگانگی' اجنبیت' خوف' بے سمتیت' لایعنیت' انفعالیت وغیرہ نظمیہ افق پر چھائے رہے۔ دراصل یہ دور ہی داخلیت پسندی کا ہے۔ اس میں فکری سفر ظاہر سے باطن کی طرف تھا۔ تمام مظاہرات خارجی کا ردعمل فرد کی ذات میں محسوساتی سطح پر ہوتا ہے۔ ہر فرد کی محسوساتی سطح اس کے ذہن اور مزاج کے مطابق ہے نیز ہر مظہر کو دیکھنے کی اپنی نگاہ ہے اس لیے داخلی ردعمل بھی منفرد ہے۔ بالکل اسی طرح جدیدیت کی ایک پہچان علامتی اور اشاراتی اسلوب ہے۔ ہر تخلیق کار اور شاعر نے اپنے اظہار کے لیے یہی اسلوب اپنایا ہے مگر اس میں بھی انفرادی تخلیق کار کی خصوصیت موجود ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ کرنا درست ہے کہ جدیدیت پسند نظموں میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی طور پر شاعروں نے اپنی انفرادی چھاپ چھوڑی ہے جس سے نظمیہ سرمائے میں اکتا دینے والی یکسانیت نہیں آتی ہے بلکہ تنوع اور تلون بھی پیدا ہوتا ہے اور ہمہ گیری بھی آتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. دو جدیدیت پسند نظم نگاروں کے نام بتائیے۔
2. نظم کا ایک اہم موضوع بتائیے۔
3. پانچ جدیدیت پسند نظموں کے نام لکھیئے۔
4. جدیدیت پسند نظم کی اسلوبیاتی خوبیوں پر روشنی ڈالیئے۔
5. دور جدیدیت میں نظم کی کون کون سی ہیئتیں سامنے آئیں؟
6. بصری نظم کا تجربہ کیوں ناکام ہوگیا؟
7. جدیدیت پسند نظموں کی مجموعی شناخت کیسے ہوگی؟

29.6 خلاصہ

بیسوی صدی انقلاب اور تغیر کی صدی تھی اس کے وسط تک سارے عالم میں سیاسی' سماجی' اقتصادی اور صنعتی تبدیلیاں آئیں۔ اقتدار کی تبدیلیوں' آزادی کے نعروں اور جنگ کے دھماکوں سے فضا گونجنے لگی۔ روس پر سرخ پرچم لہرانے لگا۔ دو عالمی جنگیں لڑی گئیں۔ ہندوستان آزاد ہوا' پاکستان وجود میں آیا۔ چین میں عوامی حکومت بنی' برصغیر میں جنگیں ہوئیں۔ مذہبی اور لسانی ٹکراؤ ہوا۔ غرض ہر چہار طرف ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ ترقی پسند ادبی تحریک میں انتشار پیدا ہوگیا۔ سماجی حقیقت نگاری کا زور ٹوٹ گیا۔ فرد خارجی دنیا سے بیزار ہوکر داخلی دنیائیں آباد کرنے لگا۔ سماجی اور کائناتی حقائق اور عوامل کی بازیافت ذات کے حوالے سے ہونے لگی۔ اس دوران یوروپی فلسفیوں کے افکار سے اس رجحان کے پھلنے پھولنے میں مدد ملی۔ جس کے نتیجے میں عدم تحفظ' خوف' گمنامی' تنہائی' بے چہرگی' لایعنیت' فراریت' انکاریت وغیرہ جیسے احساسات عام ہوتے گئے اور شعر وادب میں ان کا داخلہ تیزی سے ہونے لگا۔ شعر وادب کے اسی رجحان کو جدیدیت کا نام دیا جاتا ہے۔

اسپنسر' بارتھ' اسٹاک مان' ارنسٹ ماخ' ہیوم' فرائڈ' ینگ' کروچے' سارتر وغیرہ کے نظریات کی جدیدیت کے رجحان میں بڑی اہمیت ہے۔ معرفت پسندی' انفرادیت پسندی' ماورائے حقیقت پسندی' ماورائیت' انکاریت' پیکریت' تاثریت' نراجیت' لایعنیت' لاشعور' اجتماعی لاشعور وغیرہ مقبول نظریے ہیں جو فرد کی ذہنی کیفیت' نفسیاتی کشمکش اور محسوساتی نزاکتوں پر مبنی ہیں۔ ان ہی کی بالکل ذاتی اور انفرادی ترجمانی سے نئی حسیت عبارت ہے۔

ابتداً جدیدیت پسند شاعروں نے بالخصوص غزل گوؤں نے اردو کی شعری روایت شکنی کرتے ہوئے انوکھا اور البیلا علامتی اور اشاراتی اسلوب اختیار کیا۔ اس میں خاصا ابہام بھی تھا اور ناپسندیدہ الفاظ وتراکیب بھی تھے۔ ندا فاضلی' شمس الرحمٰن فاروقی' شکیب جلالی' محمد علوی وغیرہ نے اس طرح کے اشعار کہے تھے مگر جلد ہی یہ لہر ختم ہوگئی اور جدیدیت کا متعدل غزلیہ رنگ ابھرنے لگا۔ موضوعات کے ساتھ ساتھ شعری اسلوب میں بھی خوشگوار تبدیلی کی گئی۔ موسیٰ وطور' مریم وعیسیٰ' یوسف وزلیخا' شیریں وفرہاد' قفس وآشیاں' کعبہ وکلیسا' صیاد وگلچیں' ساقی ومیخانہ وغیرہ جیسی **تلمیحیں**' استعارے اور اشارے سے جان بوجھ کر گریز کیا گیا اور ان کی جگہ بالکل سامنے کی زمین سے جڑے ہوئے تلازمے' اشارے اور علامتیں وضع کی گئیں۔ سورج' چاند' رات' اندھیرا'

اجالا' دھوپ' پرچھائیں' سمندر' جھیل' کشتی' جزیرہ' شہر' گھر' بستی' پتھر' تتلی' مچھلی وغیرہ اس کثرت سے استعمال ہوئے کہ جدید شعروں کی پہچان بن گئے۔ یہاں تک کہ عشقیہ معاملے اور مرحلے بھی ان نئے لفظوں سے بننے والے اسلوب میں بخوبی سمانے لگے۔ ان ہی میں تخلیقی نادرہ کاری کا بھرپور مظاہرہ ہونے لگا۔ مظہر امام' مظفر حنفی' ناصر کاظمی' شہریار' شاذ تمکنت' معین تبسم' بشیر بدر' محمد علوی' احمد فراز' پرکاش فکری' شہاب جعفری' سلیم احمد' شکیب جلالی' آشفتہ چنگیزی' ساقی فاروقی' افتخار عارف' محمد علی اثر' باقر مہدی' کمار پاشی' لطف الرحمٰن' خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ نے اپنے عہد کے فکر و احساس کی بڑی خوبصورت ترجمانی کی ہے۔ زندگی کی تہہ داری' پیچیدگی' لمحہ بہ لمحہ بدلتا رنگ اور ظاہر اور باطن کی آویزش سے جو جمالیاتی اور ملفوظی چنگاریاں پھوٹتی ہیں' وہ غزلیہ شاعری میں جان ڈال دیتی ہیں۔ نئی لفظیات' ڈکشن' علامتیں' استعاروں اور اشاروں سے حسّی تجربوں کا ایک نگار خانہ سج جاتا ہے اور اردو غزل کے مزاج و معیار میں خوشگوار اضافہ ہوتا ہے۔

جدیدیت پسند غزلوں کی طرح نظمیں بھی نئی حسیت کی کہکشاں سے آراستہ ہیں۔ علامتی' استعاراتی اور اشاراتی تسلسل اور ارتقا ان کی معنویت میں کئی دلفریب موڑ لاتا ہے اور اختتامیہ کے استفہام یا انکشاف کی زمین ہموار کر دیتا ہے۔ افتخار جالب' وزیر آغا' قاضی سلیم' بلراج کومل' منیر نیازی' عمیق حنفی' احمد ہمیش' مظہر امام' زرینہ ثانی' شہریار وغیرہ نے نظمیہ شاعری میں نئی حسیت کی روح پھونکی ہے اور اسے نئے افق سے آشنا کرایا ہے۔ تجربے کے طور پر بصری اور نثری نظمیں بھی لکھی گئیں مگر ان کا رواج نہ ہو سکا۔ آزاد نظم کی ہیئت ہی چھائی رہی۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جدیدیت پسند غزلوں اور نظموں میں نئے انسان کے فکری سفر کے پر اثر علامتی اور اشاراتی نشانات ملتے ہیں۔ یہ سفر ظاہر سے باطن کی طرف ہوتا ہے اس لیے تمام مظاہرات خارجی کا ردعمل فرد کی ذات میں محسوساتی سطح پر ہوتا ہے اور اس داخلی ردعمل میں بڑی گونا گونی اور تنوع ہے۔ یکساں خیالات اور احساسات کا شعری عکس بھی انفرادی طور پر ابھرا ہے۔ اسلوبیاتی لحاظ سے شاعروں نے اپنی چھاپ چھوڑی ہے اور شاعری کو ہمہ جہت' ہمہ رنگ اور وسیع کرتے ہوئے ایک نئی شعری روایت بنائی ہے جو شاعری کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

29.7 نمونۂ امتحانی سوالات

ذیل کے سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں دیجیے:

1. جدیدیت کے زیر اثر اردو غزل میں کیا تبدیلی آئی؟ مثالوں کے ساتھ لکھیے۔
2. جدیدیت پسند نظموں کی خصوصیات بیان کیجیے اور مثالیں دیجیے۔
3. جدیدیت سے اردو شاعری میں کن سطحوں پر تبدیلی آئی؟ مفصل لکھیے۔
4. جدیدیت میں کیسے کیسے ہیئتی تجربے ہوئے؟ مثال دے کر واضح کیجیے۔

ذیل کے سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں دیجیے:

1. جدیدیت پسند شاعری کے محرکات کی تفصیل لکھیے۔
2. جدیدیت کے رجحان میں کن یوروپی مفکروں اور فلسفیوں کے کون کون سے نظریے شامل ہیں؟
3. جدت پسندی یا فیشن پرستی کیا ہے؟ شعری مثالوں سے واضح کیجیے۔

29.8 فرہنگ

مطمعِ نظر = مرکزِ نظر' اصلی مقصد

منطقہ = دائرہ' حلقہ

داخلی شکست و ریخت = جذباتی اور احساساتی اتار چڑھاؤ

علامت = symbol

استعارہ = Metaphor

اشارہ = Reference

تلمیح=Allusion کسی تاریخی یا نیم تاریخی بات کا ایک دو لفظ میں حوالہ

حسیت=Sensibility

شعری عکس=شاعرانہ آئینہ داری

ملفوظی=لفظوں میں چھپا ہوا

برگشتگی=Defiance' انحراف

شعری روایت=شاعری کے متعلقات کا رواج

29.9 سفارش کردہ کتابیں

1. شمیم حنفی — جدیدیت کی فلسفیانہ اساس
2. لطف الرحمٰن — جدیدیت کی جمالیات
3. مظفر حنفی — جدیدیت۔ تجزیہ و تفہیم
4. شمیم حنفی — نئی شعری روایت
5. بشیر بدر — آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ
6. وزیر آغا — نظم جدید کی کروٹیں
7. فضیل جعفری — چٹان اور پانی

اکائی: 30 جدیدیت اور اُردو نثر

ساخت

30.1 تمہید
30.2 پس منظر
30.3 آغاز
30.4 افسانہ
30.4.1 داستانوی فضا
30.4.2 علامتی اظہار
30.4.3 تجریدو ابہام
30.5 تنقید
30.6 خلاصہ
30.7 نمونۂ امتحانی سوالات
30.8 فرہنگ
30.9 سفارش کردہ کتابیں

30.1 تمہید

جدیدیت ایک رجحان ہے۔ اس رجحان نے اردو نثر پر گہرا نقش چھوڑا۔ اس اکائی میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ یہ رجحان کس قسم کا تھا' ادب میں یہ کب رونما ہوا اور اس نے ادب پر کیا اثر ڈالا نیز افسانے اور تنقید میں جو بہت بڑی تبدیلی آئی اس کے بارے میں ہم واقفیت حاصل کریں گے۔

30.2 پس منظر

جدید سائنس اور ٹکنالوجی نے بے پناہ ترقی کی ہے جہاں وسائل کا دائرہ کار وسیع ہوا ہے وہیں دنیا قومی و ملکی مسائل کے ساتھ بین الاقوامی مسائل سے بھی دوچار ہے۔ آدمی ایک طرف بین الاقوامی انسانی برادری کا رکن ہے اور بین الاقوامی سماج میں جی رہا ہے اور دوسری طرف صنعتی تمدن کی وجہ سے اس کی آدمیت ختم ہوتی جارہی ہے۔ انسانی رشتے اور قدریں میکانکی ہوتی جارہی ہیں۔ آدمی کی شناخت ختم ہوتی جارہی ہے۔ ہر فرد اپنے حصار میں گم ہے۔ مشترک خاندان اور باہمی ذاتی رشتے سے کٹے ہوئے لوگوں کے احساس تنہائی و محرومی میں ناقابل برداشت اضافہ ہوا ہے۔ ہر شعبۂ زندگی میں حد سے زیادہ مقابلہ و مسابقت نے انسان کو خودغرض بنادیا ہے۔ اخوت اور ایثار جیسے الفاظ بے معنی ہوگئے ہیں۔ مشینوں کی صحبت میں انسان بھی

مشین ہوتا جارہا ہے۔ بڑے ملوں میں کام کرنے والے مزدور مکمل تخلیق کی سیرت سے بے گانہ ہیں۔ اگر کوئی مزدور کسی مشین کا ایک پرزہ بناتا ہے تو کام کے تمام اوقات میں وہ صرف وہی پرزہ بناتا ہے۔ اس طرح وہ پوری مشین بنانے کی تخلیقی مسرت سے محروم ہے۔ بار بار ایک ہی عمل (Process) کی تکرار سے اکتاہٹ' بے زاری' بوریت' یکسانیت اور بے کیفی کا احساس جڑ پکڑتا ہے۔ اس کے اندر تنہائی' اکیلا پن' جلاوطنی' بیگانگی اور اپنی جڑ سے اُکھڑنے کا احساس گہرا ہونے لگتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ بھیڑ میں بھی وہ اکیلا ہے۔ گھر کے افراد کے بیچ تنہا ہے' وہ کسی کا نہیں ہے اور کوئی اس کا نہیں ہے۔ اس کے اندر گھٹن کا احساس بڑھتا جارہا ہے۔

موجودہ دور میں انسان ہر لحہ مٹ جانے کے خوف سے پریشان ہے۔ مذہب' زبان' رنگ' قوم وملّت اور نسل کی بنیاد پر ساری دنیا میں فسادات' تصادم اور خوں ریزی کا ایک سلسلہ بڑے پیمانے پر جاری ہے۔ نسلی تعصّبات کے بے بنیاد احساس برتری نے فرد اور ملت دونوں ہی کو نفرت و حقارت اور آزردگی وحسد کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ ضمیر فروشی' حق تلفی' جھوٹ' بے ایمانی' بزدلی اور مکاری کو سیاست اور مصلحت کے اہم معنی قرار دینے کا عالم گیر رجحان اس عہد کے کھوکھلے پن' سطحیت اور خودغرضی کا آئینہ دار ہے۔

بڑی طاقتوں نے جنگ مسلط کردی ہے۔ جنگ اور جنگ کے ماحول کے باعث اسلحہ سازی میں خطرناک مسابقت نیز مسلسل ایٹمی دھماکوں نے فضا' سمندر اور زمین کو اس طرح آلودہ و پراگندہ کردیا ہے کہ اس کا اثر موسموں کی سمت ورفتار پر تو پڑا ہی زمین کی بنیاد بھی ہل گئی ہے۔

کثرتِ آبادی کا مسئلہ پیچیدہ ہوتا جارہا ہے۔ دولت کی فراوانی کے امکانات کے ساتھ ساتھ غربت اور افلاس' ذات پات' رنگ ونسل اور قومیت کی تفریق کی بنا پر ذرائع معاش اور مواقعۂ روزگار کی کمی نے بے کاری' سماجی دباؤ' گھٹن اور تشدد کی نفسیات کو بڑھاوا دیا ہے۔

انتشار و بحران کی بنیادی وجہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے مقابلے میں روحانی اور اخلاقی قدروں کی سست روی ہے۔ موجودہ بحران کو دور کرنے کے لیے نیا اخلاقی نظام پوری طرح سامنے نہیں آیا۔

یہ وہ پس منظر ہے جس کی وجہ سے جدیدیت کے رجحان کا آغاز ہوا۔ جدیدیت کی جڑیں' وجودیت کے فلسفے سے ملتی ہیں۔ مغرب میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہی یہ نقطۂ نظر مقبول ہوا۔ اردو میں ترقی پسند تحریک کے زوال کے دور میں اس طرز فکر کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سامراجی آمریت اور تحریکاتِ آزادی کی وجہ سے ہمارے ملک میں اشتراکی نقطۂ نظر کا استقبال کیا گیا لیکن تقسیم ہند کے خونین ڈراموں اور عالمی سطح پر انسانی ہلاکتوں اور سرمایہ داری کے بول بالے کے باعث ترقی پسند تحریک کا اثر بتدریج کم ہوتا گیا۔ ترقی پسند تحریک کے دور زوال ہی میں وجودیت و تجریدیت کے رجحان نے اپنی جگہ بنانی شروع کی۔ یہاں تک کہ 1960ء کے آس پاس ایک نیا رجحان سامنے آیا جسے جدیدیت سے موسوم کیا گیا۔ اس نئے رجحان کا خمیر وجودیت اور تجریدیت سے تیار ہوا۔

وجودیت عہد زوال کا فلسفہ ہے۔ اس فلسفے کو سمت ورفتار عطا کرنے میں کانٹ' ہیگل' ڈیوڈ ہیوم اور سارتر کا اہم حصہ ہے۔ وجود کی عام تعریف یہ ہے کہ کسی چیز کا کسی زمانے میں کسی جگہ پر ہونا یہ اس شئے کے وجود سے عبارت ہے۔ وجودیت پسند مفکرین اس تعریف کو رد کرتے ہیں ان کے نزدیک وجود سے مراد ہر لحہ کچھ ہوتے رہنا' کچھ بنتے رہنا' وجود کا مفہوم ''یہ ہے'' ہو ہی نہیں سکتا بلکہ ہو رہا ہے' بن رہا ہے' بننے کا عمل جاری ہے۔ ہر لحہ ہر گھڑی یہ پروسس روبہ عمل ہے۔ اس اعتبار سے صرف آدمی کا وجود ہے۔ آدمی ہی وہ وجود ہے جو ہر لحہ بننے اور ہونے کے عمل سے گزرتا ہے۔ وجودیت کا فلسفہ صرف آدمی یا فرد سے بحث کرتا ہے۔ وہ بھی منفرد آدمی سے۔ جس کو ہائیڈگر Dascien کہتا ہے اور سارتر انسانی حقیقت Human Reality اور کرگے گارڈ انسانی وجود Human Existence کہتا ہے۔

وجودیت کا فلسفہ انسان کی داخلیت کے ارتقا کو پیش کرتا ہے۔ فرد کے وجود کو سمجھنے کے لیے داخلیت کی گہرائیوں میں اترنا ضروری ہے۔ فرد اپنے احساس وادراک کی روشنی میں دیکھتا ہے کہ داخلیت کا ارتقا کن راہوں اور وادیوں کا رہین منت ہے۔ داخلیت کے تجربے میں فرد اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتا ہے۔ اکیلے پن میں پہلا احساس اپنے وجود کا ہوتا ہے۔ اکیلے پن کے احساس سے فرد کو دکھ ہوتا ہے۔ اکیلے پن کا احساس آزادی کا

احساس دلاتا ہے۔ آزادی کی وجہ سے فرد کو قوت فیصلہ کی آزادی حاصل ہوتی ہے اور قوت ارادی کا احساس بھی ابھرتا ہے لیکن انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ محدود ہے اس کی صلاحیتیں اور امکانات محدود ہیں۔ اپنی خواہش اور منشا کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ خدا کی مرضی اور رحم و کرم کے بغیر ایک قدم بھی چلنا دشوار ہے تو اپنے محدود ہونے کے احساس سے اسے دکھ ہوتا ہے۔

جب فرد سوچتا ہے کہ دنیا میں ہر شئے ممکن ہے وہ کوئی بھی کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن عملی سطح پر تجربے سے دو چار ہونے کے بعد اسے لگتا ہے کہ اسے امکانات کے مقابلے میں بہت کم حاصل ہوا ہے یعنی جو ہے اور جو ہونا چاہئیے میں کوئی ہم آہنگی اور نسبت نہیں ہے تو اسے دکھ ہوتا ہے۔

فرد جب محسوس کرتا ہے کہ دنیا میں ہر شئے پہلے سے متعین اور طے شدہ ہے۔ اس کے بس میں کچھ نہیں ہے۔ اس کی صلاحیتیں، توانائی اور طاقت پہلے سے طے شدہ اور مقررہ اصولوں کے سامنے مات کھا جاتی ہے اس کی تقدیر پہلے سے لکھ دی گئی ہے اس سے اسے فکر ہوتی ہے۔

فلسفۂ وجودیت میں ساری باتوں کی بنیاد فرد کا شعورِ ذات ہے۔ فرد سوچتا ہے کہ وہ ادھورا ہے۔ اس میں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ اس کی زندگی میں ایک خلا ہے۔ اس میں نفی کا احساس جاگتا ہے اور اس سے دکھ ہوتا ہے۔ سب سے بڑا دکھ موت کا احساس ہوتا ہے کہ سب کچھ ختم ہونے والا ہے۔ یہ دکھ اسے تنہائی کا احساس دلاتا ہے۔ موت کا احساس فرد کے اندر خوف و دہشت اور پریشانی و بے قراری پیدا کرتا ہے۔ اصل حقیقت تو موت کی ہے اور وہ ابدیت کے ایک خیالی اور قیاسی تصور میں جی رہا ہے۔ وہ ایک وہم ایک گمان کے سہارے جی رہا ہے۔

جدید لکھنے والے فلسفۂ وجودیت کو سب سے موثر قوت تسلیم کرتے ہیں۔ جدید افسانہ نگاروں کے یہاں ایسے ہی رجحانات ملتے ہیں جیسے ڈر، خوف، ذہنی انتشار، ہجرت، جلاوطنی، سفر، داخلی و ذہنی کیفیات، کرب، تنہائی، احساس محرومی و مایوسی، احتجاج اور ماضی کی بازیافت کھوئے ہوئے انسانوں کی تلاش وغیرہ۔

یاسمین فاطمہ کے مطابق 1960ء کے لگ بھگ جدید ذہن کے ادیبوں نے ترقی پسند مصنفین کی جماعت بندی اور نظریاتی وابستگی کے خلاف آواز بلند کی۔ انہوں نے کہا کہ ادیب کی وابستگی مخصوص سیاسی جماعت یا نظریے سے نہیں بلکہ اپنی ذات سے ہونی چاہئیے۔ ادیب جو کچھ محسوس کرتا ہے اسے اپنی تخلیقات میں پیش کرے۔ جدید لکھنے والوں نے فرد کو انبوہ سے نکال کر اس کی ذات کے مسائل کا جائزہ لیا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے عہد کی حسیت کی ترجمانی کی، عصری حسیت اپنے عہد کی ایسی صورت حال سے آگاہی کا نام ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ادیب اور فن کار اپنے سماجی اور معاشرتی مسائل کے سیاسی، معاشرتی، محرکات سے گہری واقفیت رکھیں اور جدید ٹکنالوجی سے پیدا ہونے والے مسائل کا بھی انہیں شعور ہونا چاہئیے"۔ (اردو افسانے میں عصری حسیت)

آل احمد سرور نے 1967ء میں "جدیدیت اور ادب" کے موضوع پر شعبۂ اردو، علیگڑھ یونیورسٹی کی جانب سے ایک سمینار منعقد کروایا تھا جس میں پیش کیے گئے مقالات کا انتخاب "جدیدیت اور ادب" کے نام سے اگست 1969ء میں شائع ہوا۔ اس میں جدیدیت کی تعریف مختلف انداز و اسالیب میں کی گئی ہے۔

آل احمد سرور کے الفاظ میں جدیدیت آدمی کی تلاش کا نام ہے۔ جدید دور میں یہ کسی بھی آئیڈیالوجی کے خلاف ردِ عمل ہے۔ آج کا ادیب اس غلامی کو قبول کرنا نہیں چاہتا۔ وہ انسانی زندگی کو آزادانہ دیکھنے اور برتنے کا حق مانگتا ہے۔ اسی کا نام جدیدیت ہے۔ وحید اختر کہتے ہیں "جدیدیت کی مختصر ترین تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ جدیدیت اپنے عہد کی زندگی کا سامنا کرنے اور تمام خطرات اور امکانات کے ساتھ برتنے کا نام ہے۔ جدیدیت ایک مستقل عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ وحید اختر جدیدیت کو جدلیاتی مادیت یا ترقی پسندی کی توسیع سے تعبیر کرتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی تمام فلسفوں اور نظریوں کی حدود توڑنے کا نام جدیدیت بتاتے ہیں۔ ناوابستگی اس کی وہ خصوصیت ہے جو اسے پچھلے تمام رویوں سے ممتاز کرتی ہے۔ جدیدیت نہ صرف انحراف بلکہ تنسیخ کا نام ہے۔ جدیدیت نے کھل کر تنسیخ کا اظہار کیا اور وجود میں آئی۔ ڈاکٹر محمد حسن جدیدیت کو رومانیت کی توسیع اور صحت مند جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع سمجھتے ہیں۔ بعض نقاد جدیدیت کا سلسلہ حالی، نظیر اکبر آبادی اور محمد حسین آزاد سے ملاتے ہیں۔ ان کے علاوہ

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کہتے ہیں کہ ہر عہد میں جدیدیت کے اپنے معنیٰ ہوتے ہیں اور جو اس دور کے سماجی عمل سے مرتب ہوتے ہیں لہذا ہر عہد اپنی مخصوص جدیدیت رکھتا ہے۔ بعض نقاد جدید طرزِ احساس اور زندگی کے بدلتے ہوئے مسائل کے ادراک کو جدیدیت سمجھتے ہیں۔ بعض صرف فارم کے انوکھے تجربے تک جدیدیت کو محدود رکھتے ہیں۔

ان تمام مباحث کے بعد جدیدیت کی آسان تعریف یہ ہوسکتی ہے کہ جدیدیت ایک رویے اور اندازِ فکر کا نام ہے۔ جدید کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ ہر نقشِ کہن کو مٹا دیا جائے یا ہر روایت کو ختم کر دیا جائے۔

جدیدیت ایک ادبی اصطلاح ہے اس کا اطلاق 1957ء کے بعد کے ادب پر ہوتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. موجودہ دور میں انسان کو ہر لمحہ کس بات کا خوف ہے؟

(ا) لٹ جانے کا (ب) مٹ جانے کا (ج) کٹ جانے کا (د) اجڑ جانے کا

2. جدیدیت کا خمیر کس سے تیار ہوا؟

(ا) وجودیت اور تجریدیت سے (ب) حقیقت پسندی اور اشتراکیت سے

(ج) رومانیت سے (د) خارجیت کے تصور سے

3. جدید لکھنے والوں نے کس کے خلاف ردعمل کا اظہار کیا؟

(ا) وجودیت کے (ب) نظریاتی وابستگی کے (ج) عصری حسیت کے (د) ذہنی انتشار کے

30.3 آغاز

1936ء سے 1956ء تک ترقی پسند تحریک کا دور رہا۔ تقسیم ہند کے المیے نے اس تحریک کو کمزور کر دیا۔ انسانیت سوز واقعات اور ان کا ردعمل، ہجرت کا کرب نیز معاشرتی انتشار نے نظریاتی وابستگی اور جدلیاتی مادیت کے تصور کو پسِ پشت ڈال دیا۔ 1947ء سے 1957ء تک ترقی پسندوں اور ان کے بعد کے ادیبوں نے تقسیم ہند، فرقہ وارانہ فسادات، ہجرت اور جاگیردارانہ معاشرے کے زوال کو موضوع بنایا۔ اس ادب نے جلاوطنی، بے زمینی، بے جڑی اور بے تعلقی کے احساس کو زمین فراہم کی۔ انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر نے ان موضوعات کو خوب برتا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں ''دونوں کے فن کی پہچان تقسیم کے تہذیبی المیے سے پیدا ہونے والے مسائل کے ذریعہ ہوئی ..... قرۃ العین حیدر صدیوں کے رشتوں، ماضی کی بازیافت اور وقت کے تسلسل کو گرفت میں لینے میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں، انتظار حسین کا فن، فضا آفرینی کا فن ہے۔ وہ ماضی کی روح اور انسانی وجود کے اس حصے کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو کٹ کر ماضی میں رہ گیا ہے اور جس کے بغیر انسانی وجود مکمل نہیں'' (اردو افسانہ روایت اور مسائل ص ۷۳)۔ قرۃ العین حیدر کے یہاں وقت کا تصور اور اس کا جبر موضوع ہے۔ انتظار حسین آج کے انسان کے مسائل کا رشتہ کتھا، حکایت اور جاتک کہانیوں سے جوڑتے ہیں۔ آزادی کے بعد لکھنے والوں کی ایک ایسی نسل سامنے آئی جو کسی نظریاتی یا ادبی وابستگی کے بغیر ادب تخلیق کرنے لگی لیکن اس نے بغاوت کی ہمت نہیں کی۔ ایسے افسانہ نگاروں میں رام لال، جوگندر پال، اقبال متین، اقبال مجید، رتن سنگھ، غیاث احمد گدی، جیلانی بانو، آمنہ ابوالحسن، کلام حیدری، شرون کمار، قاضی عبدالستار، ستیش تبرا، قیصر تمکین، عوض سعید وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے بعض نے تجربے بھی کیے علامتی اور تمثیلی رنگ بھی ان کے یہاں مل جاتا ہے۔ لیکن بغاوت نہیں ملتی۔

1960ء کے بعد اردو افسانے میں نئی فکر اور نئے احساس کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان افسانوں میں پریم چند اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کی حقیقت

نگاری سے انحراف اور آدرشوں کے باطل ہونے کی مایوسی ملتی ہے۔ افسانے کا اسٹرکچر پوری طرح توڑ دیا گیا۔ کہانی سے انحراف' پلاٹ' کردار' آغاز' انجام اور وحدت ثلاثہ اور ربط ضروری نہیں سمجھا گیا۔ زماں و مکاں کا ماورائی تصور اور انسان کا مابعد الطبعیاتی تصور پیش کیا گیا۔ زبان کی شکست و ریخت اور شخصی علامات کا استعمال کیا جانے لگا۔ ہندی' ریاضیاتی اور علمی اشکال کے استعمال کی کوشش کی گئی۔ انور سجاد' بلراج مین را' سریندر پرکاش اور احمد ہمیش نے افسانے کے اسٹرکچر کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ نئے تجربات کیے' نیا پیرایۂ اظہار وضع کیا۔ لسانی سطح پر بھی شکست و ریخت کے عمل کو روا رکھا۔ اور ایک نیا اسٹرکچر فراہم کیا۔ یہ افسانہ ترقی پسند افسانے سے مختلف تھا۔ وہ انسان کی خارجی زندگی کا سیدھا سادہ بیان نہ ہو کر انسان کے ظاہر و باطن کا امتزاج پیش کرتا ہے۔ یہ افسانہ کوئی سماجی حل پیش نہیں کرتا صرف سماجی صورت حال کو سامنے لاتا ہے۔ افسانہ نگار کسی خاص نظریے یا مقصد کے حصول کے تحت افسانہ نہیں لکھتے۔ معمول سے الگ کوئی انوکھی یا سنسنی خیز بات کہہ کر یا کوئی غیر متوقع انجام پیدا کر کے قاری کو حیران کرتا ہے۔ افسانے میں غیر ضروری تفصیلات سے گریز کیا گیا۔ نثری لوازم کی بجائے شعری لوازم کی طرف مراجعت کی گئی اور شاعری و نثر کی حدیں توڑنے کی کوشش کی گئی۔ حقیقت کو نظر انداز کر کے اس کو ماورائے حقیقت بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے لیے ایسا اسلوب منتخب کیا گیا جو داستانوی' خواب نویسی جیسا ہو۔ اس کے لیے بیان کے منطقی تسلسل کو توڑ کر پیش کیا جانے لگا۔ شہروں کے نام نہیں لکھے گئے تا کہ افسانے میں مقامی رنگ نہ آنے پائے۔ کرداروں کی جگہ 'ا' ب' ج یا پھر اس کے صفات معمر آدمی' سرخ بالوں والا' نجات دہندہ استعمال کیے جانے لگے شمس الحق لکھتے ہیں :

> ''اردو افسانے کی نئی ہیئت' تصادم' تخریب اور تخلیقی آویزش کے ایسے ہی پیچیدہ لیکن زندہ و متحرک استعارے کی تخلیق کرتی ہے' اس نئی ہیئت کی تشکیل وہ چند استثنائی فن کار ہیں جنھوں نے خود کو انشائیت اور لفاظی پر مشتمل اردو کے عمومی اور مقبول افسانے کے اثر سے محفوظ رکھا اور غیر ادبی فنی تاویلات و تشریحات کو نظر انداز کر کے اپنے اسلوب کو اپنی انفرادیت کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔
>
> (نیا اردو افسانہ۔ تفہیم اور تجزیہ : اردو افسانہ روایت اور مسائل : ص ۶۱۵)

ایسے فن کاروں میں انور سجاد' احمد ہمیش' بلراج مین را' سریندر پرکاش شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کمار پاشی' بلراج کومل' راج اے' دیویندر اسر' خالدہ اصغر وغیرہ نے جدید افسانے کو آگے بڑھایا۔ جدید افسانے کی خصوصیات یا رجحانات کی تقسیم اس طرح ہو سکتی ہے۔ داستانوی' علامتی اور ابہامی یا تحریدی۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. جدید افسانے میں کس سے انحراف کیا گیا؟

(ا) کہانی پلاٹ اور کردار سے (ب) منظر نگاری سے (ج) مکالمے سے (د) علامتوں سے

2. جدید افسانہ

(ا) مقصدیت کے حصول کو پیش کرتا ہے (ب) سماجی حل پیش نہیں کرتا

(ج) سنسنی خیزی پر زور دیتا ہے (د) چونکا دینے والے کلائمکس کو پسند کرتا ہے

3. جدید افسانے کا اسلوب

(ا) منطقی اور وضاحتی (ب) داستانوی و خواب نویسی (ج) مسجع و مقفیٰ (د) صحافتی

30.4.1 داستانوی فضا

حقیقت نگاری اور مقصدیت نے افسانے کو اکہرا کر دیا تھا۔ کسان مزدور اور طوائف کے بارے میں ہم ادب کے ذریعے معلومات حاصل

کررہے تھے۔جن ادیبوں نے ان کے مسائل پیش کیے وہ ان کا تجربہ بھی نہیں تھا۔اس طرح حقیقت نگاری بالواسطہ بیانیہ میں بدل کر صحافیانہ رنگ اختیار کرنے لگی تھی۔اس کی معنویت ایک سطحی ہوگئی تھی۔ نئے افسانہ نگار نے افسانے میں تہہ داری پیدا کرنے کے لیے نئے اسلوب کی بازیافت کی۔ اس نے ماضی کے موثر اسلوب کو آزمایا۔افسانے میں حکایتی اسلوب کو بروئے کار لاکر فن کار اس صنف کی مختصر ہیئت میں جدید زندگی کے مسائل کی گہرائیوں اور وسعتوں کو اس طرح سمو دیتا ہے کہ افسانے کے خاتمے پر قاری کو اپنے کسی مسئلے کا عکس نظر آنے لگتا ہے۔سلیم شہزاد لکھتے ہیں '' افسانے میں دیو مالائی کہانیوں کی کارفرمائی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔صرف داستانی فضا تخلیق کرنے سے الگ بھی جدید افسانے میں اسطور بیانی کا رجحان پسندیدہ رجحان ہے۔یہ کبھی حقیقت نگاری کی طرح اسطور بیانی برائے اسطور بیانی ہوتی ہے۔کبھی ایک مکمل اسطوری واقعہ کسی عصری حقیقت کے بیان کا ذریعہ بن جاتا ہے اور کبھی اسطور کے علامتی معنوں کے ذریعے لمحۂ موجود میں وقوع پذیر ہونے والے کسی سانحے کو حال اور ماضی کے ایک دوسرے پر انطباق سے ہمعصر صورت واقعہ کے بیان اور اظہار کا روپ دیا جاتا ہے'' (قصہ جدید افسانے کا : ص ۷۷۔۷۸) یعنی ماضی میں گزری ہوئی صورتِ حال سے مماثل دور حاضر کی صورت حال کو حکایتوں اور داستانوں کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے۔ نئے افسانہ نگار نے داستانوی واقعات کو جدید زندگی کی تہہ داریوں اور ان میں گھرے ہوئے فرد کے مسائل کے لیے برتا۔جاتک تمثیلیں بھی ہر عہد میں بامعنی رہی ہیں۔انتظار حسین نے اس تکنک کو مہارت سے برتا۔

داستانوں میں درخت اور پرندے کی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔ نئے افسانہ نگار نے مختلف سیاق وسباق میں اسے برتا۔یہ فرد کا استعارہ اور تہذیب کی علامت بن جاتا ہے۔پرندہ اپنی خوش رنگینیوں اور خوش الحانیوں کے سبب فطرت کی خوش رنگینیوں اور خوش الحانیوں کا استعارہ ہے۔فرد کے جذبات وخواہشات کی تمثیل ہے جسے داستانوں میں بڑی اہمیت دی گئی۔خاص طور پر طوطا ۔۔۔۔۔! پنچ تنتر کا استعمال کرکے افسانہ نگاروں نے جانوروں اور پرندوں کی زبانی انسانی حقائق کی رمز کشائی کی ہے۔شہروں کے نام کی جگہ بستی، طلسم آباد کا استعمال، تمثیل کے استعمال میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ان بستیوں کے ذریعہ خوف، جبر، تسلط، غلامی، پسماندگی اور بے چارگی کو پیش کیا گیا۔اس ایک مثال سے افسانے کی داستانوی فضا کا تصور کیا جاسکتا ہے :

> '' کیا دیکھتا ہے کہ ایک لق ودق صحرا ہے، چار سو ریت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور پھونکتا سورج۔ وہ آنکھیں جھپکاتا ہے۔اب کیا دیکھتا ہے کہ بھرا بازار ہے، کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ خریداروں کا ہجوم، دکانیں رنگا رنگ اشیا سے لدی پڑی ہیں۔کیا دیکھتا ہے کہ باغ باغیچے ہیں۔ پھل دار پودے ہیں۔رنگا رنگ پھول ہیں۔بھوک سی محسوس ہوتی ہے۔آگے بڑھ کر پھل توڑتا ہے۔منہ میں ڈالنے لگتا ہے تو پھل پتھر کا نکلتا ہے۔بازار میں آتا ہے تو دکانیں چیزوں سے بھری نظر آتی ہیں۔ہاتھ لگاتا ہے تو مٹی ہو جاتی ہیں۔ (بے دروازہ سراب : رشید امجد)

یہاں داستانوی انداز میں افسانہ نگار کردار وعمل کا فقدان، ہجوم میں رہ کر فرد کی تنہائی، مصنوعات کی فراوانی لیکن سب میں اصلیت اور فطری پن کی عدم موجودگی کا اظہار کرتا ہے۔زبان اور اسلوب داستانوی ہیں۔اس داستانوی فضا کی تخلیق میں افسانہ نگار تخیل اور فنطاسیہ دونوں کا استعمال کرتا ہے۔قدیم کے ذریعہ جدید کے نئے معنی تلاش کرتا ہے۔جدید افسانے میں داستانوی روایات کی بازیافت کبھی براہِ راست داستانوی اسلوب میں 'کبھی الہامی کتابوں کی زبان میں' کبھی ذاتی اسطور سازی سے کرتا ہے۔افسانے میں بیانیہ آپ بیتی اور جگ بیتی کا امتزاج ہوتا ہے۔جدید افسانے میں کسی ایک واقعے کے فن کارانہ بیان کی بجائے واقعے کی تہہ دار کیفیت اسے داستاں سے قریب کردیتی ہے۔کثرت خیال میں وحدت خیال کا تاثر پیدا کیا جاتا ہے۔خالدہ اصغر، رشید امجد، قمر احسن، شرون کمار ورما، انور قمر، سلام بن رزاق، حسین الحق، بیگ احساس، مطہر الزماں خاں، حمید سہروردی نے اس انداز کو کامیابی سے برتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. داستانوی افسانے میں کیسا اسلوب برتا جاتا ہے؟

(ا) حکایتی (ب) روایتی (ج) شاعرانہ (د) حقیقت نگاری

2. جدید زندگی کی تہہ داریوں اور مسائل میں گھرے فرد کی صورت حال کو کیسے پیش کیا جاتا ہے؟

(ا) لطیفوں کے ذریعہ (ب) حکایتوں اور داستانوں کے ذریعہ

(ج) شاعرانہ انداز سے (د) راست بیانیہ کے ذریعہ

3. داستانوی فضا کی تخلیق میں افسانہ نگار کس سے کام لیتا ہے؟

(ا) تخیل اور فنطاسیہ (ب) مافوق الفطرت عناصر سے

(ج) قصہ در قصہ سے (د) اشترا کی حقیقت نگاری سے

30.4.2 علامتی اظہار

''تشبیہہ اور استعارے کی طرح علامت بھی فنی اظہار کا ایک اضافی وسیلہ ہے۔ ذہنی مفہوم کو ایجاز و اختصار کے پیرائے میں بیان کرنے کے لیے علامت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ وزیر آغا کہتے ہیں'' اشاراتی عنصر تمام اصناف ادب میں اہمیت حاصل کر رہا ہے اور افسانے نے بھی اسے اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ دراصل تہذیبی ارتقا کے ساتھ ساتھ فرد کی تیز نگاہی بھی پروان چڑھ رہی ہے۔ اب وہ پلک جھپکتے میں بات کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے اور اس لیے واشگاف انداز کا کچھ زیادہ دلدادہ نہیں رہا'' علامتی افسانے کے بارے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کہتے ہیں'' علامتیں ایک طرح کے وسیع استعارے ہیں جن کے شعوری اور نیم شعوری رشتوں کو ابھار کر افسانہ نگار معنوی تہہ داری پیدا کر دیتا ہے۔ علامتوں کے حسی پیکر ہوتے ہیں لیکن بعض علامتوں سے افسانہ نگار فضا آفرینی کا یا محض خاص طرح کے تاثر ابھارنے کا کام لیتا ہے۔ ایسے افسانے کا کمال یہ ہے کہ وہ لغوی اور علامتی دونوں سطحوں پر پڑھا جاسکتا ہے''۔

(اردو افسانہ روایت و مسائل ص ۵۰۱)

علامت لفظ ہے جو اپنے سیاق و سباق سے نمودہ معنوی ابعاد اور وسعت و اختصار کے سبب بالترتیب کبھی افسانے کے لیے اور کبھی شعر کے لیے موزوں ہوتی ہے۔ افسانہ چوں کہ وسیع لسانی تناظر رکھتا ہے اور اضافی وسائل کے بغیر نثر بے جا انتشار و بے ربطی کا شکار ہوسکتی ہے۔ اس لیے افسانہ نگار کم سے کم لفظوں میں اظہار خیال کرنے کے لیے اشارتی زبان کا سہارا لیتا ہے۔ علامت کثیر المفہوم ہوتی ہے۔ علامت کا انتخاب شعوری نہیں ہوتا۔ بلکہ افسانے کے موضوع کے اعتبار سے علامت اخذ ہو جاتی ہے۔ علامت بیک وقت پیکر، تمثیل اور استعارہ بھی ہوسکتی ہے۔ علامت کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ علامت کے سامنے آتے ہیں معنی کی ترسیل ہو جائے۔ افسانے میں بیان واقعہ سے ایک خاص افسانوی تاثر پیدا کرنا افسانہ نگار کا مقصد ہوتا ہے۔ صورت واقعہ کی مناسبت سے کوئی علامت تاریخ انسانی کے کسی عہدہ سے متعلق یا عصری مشینی زندگی کے کرب اور غیر حسی آلات و لوازم سے ماخوذ ہوتی ہے۔ افسانے پر علامتیں لادی نہیں جاسکتیں۔ لفظی اور معنوی دونوں زاویوں سے علامت ایک فنی مظہر ہونے کے ناطے افسانے میں اخذ و انتخاب کے متعلق سے ایک خود کار ذریعۂ ترسیل ہوتی ہے۔ بلراج مین را کے افسانے'' ماچس'' کے بنیادی کردار کی آنکھ بے وقت کھل جاتی ہے، وہ سگریٹ

سلگانا چاہتا ہے لیکن ماچس خالی ہے وہ پورے کمرے کو چھان مارتا ہے لیکن ماچس کی سب ڈبیاں خالی ہیں۔ سرد رات میں وہ باہر نکلتا ہے کئی جگہوں پر ماچس کی تلاش کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ پھر وہ ایک مرمت شدہ پُل پر پہنچتا ہے یہاں سرخ کپڑے سے لپٹی لالٹین سے وہ سگریٹ سلگانا چاہتا ہے کہ ایک سپاہی سے پکڑ کر تھانے لے جاتا ہے وہاں کئی لوگ میز کے گرد بیٹھے سگریٹ پی رہے ہیں اور کئی ماچسیں رکھی ہیں لیکن اس پر آوارہ گردی کا الزام لگا کر اس کو وہاں سے فوراً نکل جانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ واپسی پر اس کو ایک آدمی ملتا ہے جس سے وہ ماچس مانگتا ہے لیکن وہ شخص خود ماچس ہی کی تلاش میں گھر سے نکلا ہے دونوں ایک دوسرے کے چھوڑے ہوئے راستے پر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

یہاں ماچس علامت ہے تلاش کی، زندگی کی معنویت کی یا تڑپ کی، کسی مقصد یا آئیڈیل کو پانے کی جس کے لیے پورا وجود سلگ رہا ہے۔ ان میں ایسے کردار بھی آتے ہیں جو اسے ماچس نہیں دے پاتے۔ اور وہ سگریٹ سلگانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ وہ زندگی کے اندھیرے میں جگہ جگہ بھٹکتا ہے لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا۔

انسان زندگی کی معنونیت کی تلاش میں سرگرم ہے وہ مسلسل چل رہا ہے، جستجو و تجسس کی اس سڑک پر جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔

گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں :

> ''علامتی تیز روشنی (Flash) کی طرح سامنے آتی ہیں اور ایک ساتھ ان گنت معنوی امکانات جھلمل جھلمل کرنے لگتے ہیں ہم اپنے تجربے اور احساس کی بنا پر ایک دو معنی کو فوری طور پر لیتے ہیں اور باقی کو تحت الشعور کی دھند میں روشنی اور تاریکی کے بلبلوں کی طرح ابھرنے اور مٹنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے افسانوں میں علامتیں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے استعاروں کا مرتبہ رکھتی ہیں اور ایک نظام کی حیثیت سے کافرما ہوتی ہیں۔ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو اس نظام تک رسائی حاصل کرنا اور اس کی کڑیاں ملانا چنداں مشکل نہیں ہے۔'' (اردو افسانہ روایت و مسائل ۵۰۲۔ ۵۰۳)

سلیم شہزاد لکھتے ہیں :

> ''ہر جدید افسانہ علامتی افسانہ نہیں ہوتا۔
>
> افسانے کی علامت شعر کی علامت سے جدا ہوتی ہے۔
>
> علامت لفظ، فقرہ یا جملہ ہے۔
>
> علامتی افسانے کی زبان نجی اشارتی زبان ہوتی ہے۔
>
> علامت ہیئتی اور معنوی دو سطحیں رکھتی ہیں۔
>
> افسانے سے باہر علامت کے معنی کچھ اور افسانے میں کچھ اور ہوتے ہیں۔
>
> یہ علامت کی وہ عملی خصوصیت ہے۔
>
> بیرون سے ماخوذ علامات کو ان کے روایتی مفاہیم سے جدا معنی دیے جاسکتے ہیں
>
> اور علامت کی کثیر المفہومی ابہام پیدا کرتی ہے۔''

اپنی معلومات کی جانچ

1. علامت

(ا) ایک وسیع استعارہ ہے (ب) تشبیہ کی بدلی ہوئی شکل ہے

(ج) تمثیل کی توسیع ہے (د) پیکر کا دوسرا نام ہے

2. علامتوں سے افسانہ نگار کیا کام لیتا ہے؟

(ا) فضا آفرینی اور تاثر ابھارنے کا (ب) جزوئیات نگاری اور تفصیلات کا

(ج) کردار نگاری کا (د) مکالموں کی تشریح کا

3. افسانے کی علامت

(ا) شعر کی علامت ہوتی ہے (ب) شعر کی علامت سے جدا ہوتی ہے

(ج) گنجلک ہوتی ہے (د) واضح ہوتی ہے

30.4.3 تجرید وابہام

جدید افسانہ روایتی تصور سے انحراف کرتا ہے' بے ماجرا' بے کردار' بے واقعہ افسانہ ابہام پیدا کرتا ہے۔ کردار یا واقعے کی تجرید سے افسانے میں ابہام پیدا ہوتا ہے۔ کردار کی تجرید یہ ہے کہ انسانی یا حیوانی صفات سے جدا صفات رکھنے والے بے شناخت کردار افسانے میں لائے جائیں۔ ناموں کی جگہ الف۔ یے' جیم یا سرخ بالوں والا انسان' بے سر کا آدمی لکھا جائے۔ واقعے کی تجرید یہ ہے کہ فطری یا غیر فطری طور پر واقع ہونے والا عمل غیر منطقی' لاشعوری اور زماں و مکاں سے عاری ڈھنگ سے وقوع پذیر ہو۔ کردار کی تجرید سے کردار کے خاکے یا ہیولے حاصل ہوتے ہیں۔ افسانے میں جن کی موجودگی سے ابہام رونما ہوتا ہے۔ کردار کی تجرید سے بالواسطہ طور پر افسانے کے ماحول منظر اور پس منظر کی بھی تجرید ہوتی ہے۔ افسانے میں بے ہیئتی سے ایک ہیئت تشکیل پاتی ہے۔ افسانوی واقعے کی منطقیت یعنی آغاز' وسط اور انجام کے تصورات بے معنی ہو جاتے ہیں اور بے ماجرا' بے کردار یا بے واقعہ افسانے سے یہی مراد ہے کہ افسانے میں منطقی تسلسل مفقود' کرداروں کی جگہ ان کے ہیولے اور واقعات کے بجائے ذہنی وقوعی تصورات پائے جاتے ہوں۔ تجریدی افسانے کا بیانیہ جو افسانوی اظہار کے وسیلے زبان سے متعلق ہے غیر مربوط' روایتی' لسانی قواعد سے روگرداں اور بہ ظاہر بے معنویت کا غماز ہوتا ہے اس سے بھی ابہام پیدا ہوتا ہے۔ تجریدی افسانے کے نام سے نقطوں' آڑی ترچھی لکیروں اور قوسوں کے استعمال سے ابہام اور اشکال پیدا کرنے کی ایسی کوششیں بھی ملتی ہیں جن کی وجہ سے افسانے میں ہندسی اور ریاضیاتی وغیرہ خاکوں اور علمی اصطلاحوں کا چلن ہوتا ہے۔

تجریدی افسانے کی اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:

کردار کی تجرید سے افسانے میں ابہام رونما ہوتا ہے۔

کردار کی تجرید ماحول اور منظر و پس منظر کی بھی تجرید ہے۔

واقعے کی تجرید کردار کے تعملات کو متاثر کرتی ہے۔

کردار اور واقعے کی تجرید سے افسانے کی خارجی اور داخلی ہیئتیں متاثر ہوتی ہیں۔

شعری اظہار اور شعری ہیئت افسانے کو مبہم بناتے ہیں۔

چند مثالیں پیش ہیں:

اور پھر دن رات کے ساتھ کئی چکر کاٹنے کے بعد مان لیجیے کہ وہ اب ایک دائرہ ہے

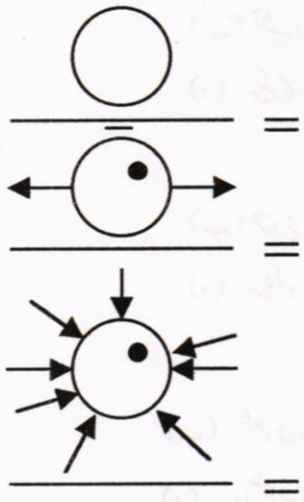

بریکٹوں کے درمیان ایک دائرہ: شوکت حیات

افسانہ نگار نے اپنی تخلیق کا عنوان اس طرح لکھا ہے

( ) { } [ ] کے درمیان ایک ○

شام	کا	دیپک	جلا	من	کا
دیا	بجھنے	لگا	یا	ربوس	شام
کا	دیپک	ج	من	کا	دیا

ہوزا۔میم۔فیہ=قمر احسن

افسانے کی خارجی ہیت کو بدلنے کی مثال

دوستی اس مثلث سے پہلے یوں تھی

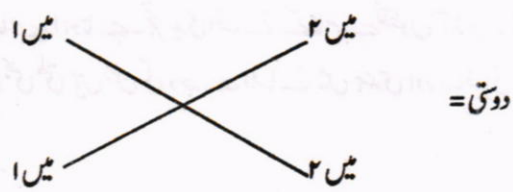

اب یوں ہوگئی ہے

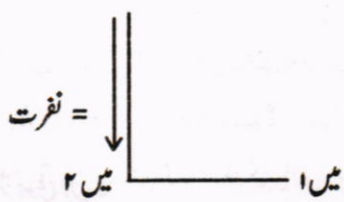

(رخشِ پا: اکرام باگ)

افسانے میں ان خاکوں سے پہلے ایک مثلث (△) دیا گیا ہے جس کے ماضی کی تفصیل یہاں درج ہے۔

تم بالکل صفر ہو، یہ نقشہ دیکھو:



- (درست) لیکن + (فیوز)

ایسی حالت میں .....؟

عمل = 0 (تم منشور ہو۔ تمہارا اپنا رنگ کون سا ہے)

..... سرخ .....

(0 = + x -) (بجلی کی رو نہیں دوڑتی: انور امام)

زندگی کی طبعی میزان پر عمل اور حالت کو وزن کرنے کا مظاہرہ یا تجرید ہے

(انہیں زندگی کی گاڑی کے دو پہیے بھی کہا جاسکتا ہے) افسانے کے عنوان میں ریاضی کی علامتوں کے استعمال کو لسانی اظہار سے مماثل کیا گیا۔

اس نے لکھا

علم	زوال	حسن
		دنیا
گمراہی		

غیر مرئی وجود نے لکھا

علم	زوال	حسن
		دنیا
گمراہی		فکر

(برف باری: انور خاں)

''غیر مرئی وجود'' فرد کے کردار کی تجرید ہے جس کے ''لکھنے'' کے عمل سے ماورائے حقیقی معنویت اخذ ہوتی ہے۔ یہ دراصل فرد اور اس کے ضمیر کی کشمکش کا مظاہرہ ہے جو خانوں میں لفظوں کے کھیل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور جس سے افسانے میں بے ہیئتی کی ایک ہیئت تشکیل پاتی ہے۔ افسانے میں اس قسم کی مظاہراتی کوششوں میں کہیں کہیں ایک قسم کا بیان ضرور ملتا ہے لیکن جسے افسانوی بیان یا بیانیہ کہتے ہیں وہ کہیں پایا نہیں جاتا۔ واضح رہے بیانیہ مربوط یا غیر مربوط ہونے سے قطع نظر افسانے کی اولین شرط ہے اس کے بغیر افسانہ واقع نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ ابہام و تجرید کے نام پر افسانے میں نقطے، لکیریں، قوسیں اور خاکے وغیرہ شامل کردینے سے افسانہ نگار اپنی تخلیق کی بنیادی خصوصیت گنوا دیتا ہے جو

تجریدی افسانے بیانیہ کے سہارے لکھے گئے ہیں ان میں شکستہ لسانی اظہار، منتشر خیالی کا اسلوب، ہذیائی کیفیت اور قبیح خوابی کے اثرات نمایاں ملتے ہیں۔افسانے میں نثری نظم کا استعمال ابہام پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

(یہ ساری مثالیں سلیم شہزاد کی کتاب ''قصہ جدید افسانے کا'' سے لی گئی ہیں) اردو افسانے میں عصری حسیت پر بھی زور دیا گیا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. افسانے میں ابہام کیسے پیدا ہوتا ہے؟

(ا) مربوط پلاٹ سے (ب) واقعاتی تسلسل سے

(ج) کردار کی تجرید سے (د) واضح مکالموں سے

2. بے معنویت کب محسوس ہوتی ہے؟

(ا) غیر مربوط روایتی، لسانی قواعد سے روگردانی سے (ب) رنگین بیانی سے

(ج) شاعرانہ نثر سے (د) انشائیہ کی زبان سے

3. تجریدی افسانے میں کیا تجربہ کیا گیا؟

(ا) جغرافیائی ماحول کا (ب) سائنسی ادب کا (ج) ریاضیاتی شکلوں کا (د) مصوری کا

30.5 تنقید

جدیدیت کے رجحان کی حوصلہ افزائی کرنے میں آل احمد سرور کا نام سرفہرست ہے۔انہوں نے خود کو کسی خاص نظریے کا اسیر نہیں ہونے دیا۔ وہ تنقید کے مختلف نظریوں سے استفادہ کرتے رہے۔انہوں نے جدید رجحان کا کھلے دل سے استقبال کیا۔آل احمد سرور نے ''جدیدیت اور ادب'' پر ایک سمینار کیا۔اس سمینار میں انہوں نے مقالہ پڑھا اور جدیدیت کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے نے کہا کہ گذشتہ دور میں نظریے کو فیشن اور فارمولے کے طور پر برتا گیا اور ادب کو نظریے کی غلامی میں دے دیا گیا تھا۔اس کا ردعمل ہر طرف ہو رہا ہے۔جدید انسان جکڑ بندی سے نکل کر زندگی کے حقائق کو اپنی نظر اور اپنے تجربے کے واسطے سے دریافت کرنا چاہتا ہے۔۔۔۔ادب اور شاعری مجرد خیالات اور بندھے ٹکے اصولوں کی تبلیغ کا نام نہیں ہے۔ادب اور شاعری محسوس حقائق کی معنی خیز مصوری ہے۔نظر اور نظریے، مسرت سے بصیرت تک، فکر روشن اور دانش ور اقبال، آل احمد سرور کی تنقیدی مضامین کے اہم مجموعے ہیں۔

اردو میں ہیئتی تنقید کی بنیاد مسعود حسین خاں نے رکھی۔انہوں نے تنقید کو ایک نیا زاویۂ نظر دیا۔انہوں نے اردو میں ہیئتی تنقید کی بنیاد استوار کی۔مسعود حسین خاں نے پہلی بار لسانی نقطۂ نظر سے اسلوب شناسی کے اصول اور چند عملی نمونے پیش کیے۔مسعود حسین خاں کہتے ہیں ''لسانی مطالعہ شعر دراصل شعریات کا جدید ہیئتی نقطہ نظر ہے لیکن یہ اس سے کہیں زیادہ جامع ہے اس لیے یہ شعری حقیقت کا کلی تصور پیش کرتا ہے۔ہیت اور موضوع کی قدیم بحث اس نقطہ نظر سے بے معنی ہو جاتی ہے۔یہ کلاسیکی نقد و ادب کے اصولوں کی تجدید کرتا ہے اور قدما کے مشاہدات اور اصطلاحات ادب کو سائنسی بنیاد عطا کرتا ہے۔لسانیاتی مطالعۂ شعر صوتیات کی سطح سے ابھرتا ہے اور ارتقائی صوتیات، تشکیلیات، صرف نحو اور معنیات کی پر پیچ وادیوں سے گزرتا ہوا اسلوبیات پر ختم ہوتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی بھی ہیئتی تنقید کو فروغ دینے والے نقاد سمجھے جاتے ہیں۔وہ اس خیال کے حامی ہیں کہ ''شعر کے اصلی معنی تک پہنچنے کے

لیے شاعر کے حالات اس کے محرکات' اس کا ماحول' اس کا معاشرہ اور نفسیاتی کیفیات وغیرہ بے معنی اور غیر ضروری ہیں'' شعر کی تعریف' تنقید و تنقیص صرف فن شعر کے حوالے سے ہوسکتی ہے۔ فن کی قدر و قیمت کا تعین وہ فن میں مضمر تجربے کو بتاتے ہیں۔ اس نظریے کی بنیاد پر انہوں نے عملی تنقید کی۔ فاروقی نے ہیئت کے مطالعے کو اولیت دی لیکن معاشرتی اور تہذیبی عوامل کو نظر انداز نہیں کیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے تجربے' ہیئت اسلوب' علامت' پیکر' استعارہ' شعریت' ترسیل' ابلاغ معنی' ابہام جیسے بنیادی تصورات کی توضیح کا اہم کام انجام دیا اور ہیئتی تنقید کی بنیادوں کو استوار کیا۔ انہوں نے مشرقی شعریات کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اس کا عملی نمونہ ان کی کتاب ''شعر شعور انگیز'' میں ملتا۔ اس کے علاوہ شعر' غیر شعر اور نثر' لفظ و معنی' عروض' آہنگ اور بیان' افسانے کی حمایت میں' تنقیدی افکار ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔

گوپی چند نارنگ اسلوباتی طریق کار سے فن کی معنیاتی سطحوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کی اسلوبیاتی تنقید کے بہترین نمونے'' اسلوبیات میر'' اور'' اقبال کا فن'' ہیں۔ انہوں نے میر کے اسلوب کا صوتیاتی' صرفی اور نحوی مطالعہ کر کے میر کی شاعری کی منفرد خصوصیات کا احاطہ کیا ہے۔ اقبال کی شاعری کے صوتیاتی نظام کا بھی انہوں نے گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے نثر پر خصوصی توجہ کی ہے۔ افسانے پر انہوں نے قابلِ قدر کام کیا ہے۔ انتظار حسین کی افسانہ نگاری' جدید افسانے کے اہم فن کار مین را اور سریندر پرکاش کے علاوہ سلام بن رزاق کے افسانے'' انجام کار'' کے تجزیے کے اہم کارنامے ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ جدید افسانہ نگاروں کو گمراہی سے بچایا۔'' خواجہ حسن نظامی کی نثری ارضیت'' ذاکر صاحب کی نثر' میں انہوں نے ان مصنفین کے اسالیب کا لسانیاتی مطالعہ کیا ہے۔ بیدی کی افسانہ نگاری میں استعاراتی جڑیں بھی تلاش کی ہیں۔ گوپی چند نارنگ نے لسانی تنقید کے بدلتے ہوئے رجحانات کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے ساختیات' پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کے تصورات کے نظریات سے اردو والوں کو روشناس کروایا بلکہ عملی تنقید کے نمونے بھی پیش کیے۔ ان نظریات کا مشرقی شعریات سے تقابل کرتے ہوئے ان کی جڑیں مشرق میں دریافت کیں۔ ان کی اہم تصانیف' ادبی تنقید اور اسلوبیات' ساختیات' پس ساختیات اور مشرقی شعریات' اسلوبیات میر' اقبال کا فن سانحۂ کربلا بطور ایک شعری استعارہ وغیرہ ہیں۔

مغنی تبسم کا شمار بھی ہیئتی نقادوں میں ہوتا ہے۔ وہ تنقید میں لسانی تجزیے سے کام لیتے ہیں اور اسلوبیاتی طریق کار کو برتتے ہیں جہاں ضرورت ہو نفسیاتی اور سماجی عوامل سے بھی کام لیتے ہیں۔ وہ شعر کے موضوع اور مفہوم پر زور دیتے ہیں اور شاعر کے عصری حالات و واقعات کی باز آفرینی اس کے شعری ذہن کے حوالے سے کرتے ہیں وہ شعر میں خارجی عوامل کے بالواسطہ اظہار کے قائل ہیں۔ ان کی توجہ شعر کی ہیئت پر مرکوز ہوتی ہے۔ وہ ہیئت کے مختلف عناصر کا تجزیہ کر کے شاعر کے شعور کا ادراک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی اہم تصانیف' بازیافت' آواز اور آدمی اور لفظوں سے آگے ہیں۔

ہیئتی نقادوں میں ایک اہم نام حامدی کاشمیری کا بھی ہے۔ وہ مواد اور ہیئت کی دوئی کے قائل نہیں ہیں۔ وہ شاعر اور ادیب کی داخلی واردات اور تجربے کے تلاش و تعین پر زور دیتے ہیں اور اسے اکتشافی تنقید کا نام دیتے ہیں۔ اکتشافی تنقید کی تعریف و وضاحت اس طرح کرتے ہیں'' اس نظریۂ تنقید کی مدد سے نقاد صحیح معنوں میں تخلیق کے بطن میں اترتا ہے اور قاری کو بھی اپنے تجربے میں شریک کرتا ہے'' اس طریقۂ کار کو انہوں نے عملی تنقید میں برتنے کی کوشش کی ہے' نئی حسیت اور عصری اردو شاعری''۔'' ناصر کاظمی کی شاعری''۔'' کارگہہ شیشہ گری''۔'' تفہیم و تنقید'' اور'' معاصر تنقید'' ان کی اہم تصانیف ہیں۔

شمیم حنفی نے اپنے مقالے'' جدیدیت کی فلسفیانہ اساس'' اور'' نئی شعری روایات'' کے ذریعہ جدیدیت کی نظریاتی بنیاد کو مستحکم کیا۔ انہوں نے ہیئتی طریق کار کی بجائے ادبی تخلیق کے سماجی و تاریخی محرکات کے مطالعہ کو فوقیت دی۔ وہ خیال کو اہمیت دیتے ہیں لیکن اس بات کے قائل ہیں کہ جذبے اور احساس کے بغیر خیال فن کا حصہ نہیں بن سکتا۔ شمیم حنفی کے خیال میں نئی حقیقت پسندی پورے انسان کے بسیط تجربے کو پیش کرتی ہے اور یہی جدیدیت کا اولین مقصد ہے''۔ وہ لسانی صداقت کے بارے میں کہتے ہیں کہ'' لسانی صداقت کی ایک ساتھ کئی پرتیں ہوتی ہیں اور اس صداقت کا حوالہ جب ادب ٹھہرتا ہے تو پوری انسانی کائنات اپنی نیکی بدی اپنے سناٹے اور شور شرابے کے ساتھ آن موجود ہوتی ہے۔ تخلیقی اظہار کا جزو بننے کے بعد لفظ'

لفظ نہیں رہ جاتا' تجربہ اور واردات اور وقوعہ بن جاتا ہے۔ شمیم حنفی کی تنقیدی تصانیف ''جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' نئی شعری روایات' غزل کا نیا منظر نامہ اور قاری سے مکالمہ'' اہم ہیں۔

جدید تنقید میں وارث علوی کا نام بھی اہم ہے۔ وارث علوی نے تاثراتی تنقید کے طریق کار کو اپنایا۔ اچھے تاثراتی نقاد کی پہچان وارث علوی کے مطابق یہ ہے کہ وہ صاحب فکر اور صاحب ذوق ہو' اس کا مطالعہ نہایت وسیع ہو' ادب کو پرکھنے اور خیالات کو دل کش اور موثر اسلوب میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ وارث علوی اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ وارث علوی نے اکثر تاثراتی تنقید سے انحراف بھی کیا ہے۔ وہ صرف تاثرات کو ہی کافی نہیں سمجھتے بلکہ تجزیے پر بھی زور دیتے ہیں۔ وارث علوی کا خاص میدان فکشن ہے۔ اردو افسانے اور ناول پر ان کی گہری نظر ہے۔ انہوں نے منٹو اور بیدی کے فن کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ ان کی چند اہم تصانیف ''تیسرے درجے کا مسافر' اے پیارے لوگو' حالی مقدمہ اور ہم' خندہ ہائے بے جا' منٹو ایک مطالعہ بورژوا ثری بورژوا ثری' ادب کا غیر اہم آدمی' لکھتے رقعے لکھے گئے دفتر وغیرہ ہیں۔

عالم خوندمیری نے وجودیت پسندانہ طرز فکر کو مطالعۂ ادب کی اساس بنا کر اردو تنقید کو ایک جہت عطا کی۔ وہ کلیدی الفاظ اور علائم کے ذریعہ کسی فن پارے کے بنیادی تجربے تک پہنچ جاتے ہیں۔ بقول مغنی تبسم جدید شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے تہذیب کے عصری بحران' موجودہ صدی کے انسانی شعور میں تشویش اور تردد کے عناصر اور شعر و ادب پر ان کے اثرات کا جس طرح تجزیہ کیا اس سے جدید حسیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے''۔ انہوں نے غالب' اقبال' مخدوم اور ن۔م راشد کے فکری میلانات کو ایک نئے زاویے سے دیکھا۔ عالم خوندمیری کے مضامین کے دو مجموعے ''اقبال اور عشق'' اور مضامین عالم خوندمیری'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

جدید نقادوں میں ایک گروپ ایسا بھی ہے جو فن پارے کو موضوع بحث بناتا ہے۔ اسی کی بنیاد پر اس کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ فنی خصوصیات کے علاوہ وہ تاریخی' تہذیبی و سماجی عوامل پر زور دیتا ہے۔ ایسے تنقیدی رویے کو تمدنی تنقید کہا جاسکتا ہے۔ فیضل جعفری اور وحید اختر کے نام ایسے ہی نقادوں کے زمرے میں آتے ہیں۔

جدیدیت کے فروغ کے ساتھ تنقید کے نئے زاویے سامنے آئے۔ ان میں سب سے اہم نظریہ ہیئتی تنقید کا ہے۔ اس کے ساتھ لسانیاتی اہمیت کو تسلیم کیا گیا اور اسلوبیاتی تنقید کے کامیاب تجربے کیے گئے۔ اس سے آگے کی منزل ساختیات' پس ساختیات' رد تشکیل اور قاری اساس تنقید ثابت ہوئی۔ ادھر 1985ء سے مابعد جدیدیت نے ایک رجحان کی صورت اختیار کر لی۔ نئی تاریخیت اور تانیثی تنقید پر بھی لکھا جانے لگا ہے۔ سماجی اور تاریخی مطالعہ دوبارہ اہمیت اختیار کر رہا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. آل احمد سرور نے جو سمینار کروایا اس کا کیا نام تھا؟

(ا) جدیدیت کی فلسفیانہ اساس (ب) جدیدیت ایک رجحان

(ج) جدیدیت مسائل و تجزیہ (د) جدیدیت اور ادب

2. ہیئتی تنقید کی بنیاد کس نے رکھی۔

(ا) احتشام حسین (ب) مسعود حسین خاں (ج) شمس الرحمٰن فاروقی (د) گوپی چند نارنگ

3. مغنی تبسم کا شمار کن نقادوں میں ہوتا ہے؟

(ا) ہیئتی نقادوں میں (ب) تاثراتی نقادوں میں (ج) اشتراکی نقادوں (د) نفسیاتی نقادوں میں

30.6 خلاصہ

جدید سائنس اور تکنالوجی نے بے پناہ ترقی کی ہے۔ صنعتی ترقی کی وجہ سے آدمی کی شناخت ختم ہوتی جارہی ہے۔ انسانوں کو ہر لمحہ مٹ جانے کا خوف ہے۔ کثرت آبادی کا مسئلہ ہے۔ سائنس اور تکنالوجی کے مقابلے میں روحانی اور اخلاقی قدریں سست رو ہیں۔ جدیدیت کی جڑیں فلسفۂ وجودیت سے ملتی ہیں۔ فلسفۂ وجودیت یہ ہے کہ سب کچھ ختم ہونے والا ہے۔ موت اصل حقیقت ہے انسان ابدیت کے ایک خیالی تصور میں جی رہا ہے۔

1960ء کے لگ بھگ جدید ذہن کے ادیبوں نے ترقی پسند مصنفین کی جماعت بندی اور نظریاتی وابستگی کے خلاف آواز بلند کی' انہوں نے کہا کہ ادیب کی وابستگی مخصوص سیاسی جماعت یا نظریے سے نہیں بلکہ اپنی ذات سے ہونی چاہئیے۔ جدیدیت کی مختلف تعریفیں کی گئیں لیکن اس کی آسان تعریف یہ ہے کہ جدیدیت ایک روئے' ایک اندازِ فکر کا نام ہے۔ اس کا مطلب ہر نقش کہن کو مٹانا نہیں ہے۔

1960ء کے بعد اردو افسانے میں پریم چند اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کی حقیقت نگاری سے انحراف کیا گیا۔ کہانی سے انحراف' پلاٹ' کردار' آغاز' انجام اور وحدت تاثر کو ضروری نہیں سمجھا گیا۔ نئے نئے تجربے کیے گئے۔ شاعری اور نثر کی حدیں توڑنے کی کوشش کی گئی۔ جدید افسانے کو اس طرح تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ داستانوی' علامتی' ابہامی یا تجریدی داستانوی افسانے میں حکایتی اسلوب کو بروئے کار لاکر اسطور اور دیو مالائی کہانیوں کے ذریعہ کسی ہم عصر واقعے کو بیان کیا جاتا ہے۔ علامتی اظہار کے ذریعہ شعوری اور نیم شعوری رشتوں کو ابھار کر افسانہ نگار معنوی تہہ داری پیدا کرتا ہے۔

بے ماجرا' بے کردار' بے واقعہ افسانہ ابہام پیدا کرتا ہے۔ کردار یا واقعے کی تجرید سے افسانے میں ابہام پیدا ہوتا ہے۔ غیر مربوط' روایتی' لسانی قواعد سے روگردانی کرکے بے معنویت پیدا کی جاتی ہے۔ شعری اظہار اور ہیئت بھی افسانے کو مبہم بناتی ہے۔ تجریدی افسانوں میں یہی طریقے برتے گئے۔ ریاضیاتی شکلیں بنائی گئیں۔

جدیدیت میں تنقید نے بے حد ترقی کی۔ آل احمد سرور نے جدیدیت کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ ہیئتی تنقید کی بنیاد پروفیسر مسعود حسین خاں نے رکھی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی ہیئتی تنقید کو فروغ دیا۔ انہوں نے مشرقی شعریات کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ گوپی چند نارنگ نے اسلوبیاتی تنقید کے بہترین نمونے پیش کیے۔ انہوں نے افسانے پر خاص توجہ دی۔ ساختیات' پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کے تصورات کو اردو والوں سے روشناس کروایا۔ مغنی تبسم کا شمار بھی ہیئتی نقادوں میں ہوتا ہے۔ حامدی کاشمیری بھی ہیئتی نقاد ہیں لیکن وہ اس تنقید کو اکتشافی تنقید کا نام دیتے ہیں۔ شمیم حنفی نے سماجی و تاریخی محرکات کے مطالعے کو فوقیت دی۔ وارث علوی نے تاثراتی طریق کار کو اپنایا۔ وہ فکشن کے نقاد ہیں۔ منٹو اور بیدی پر انہوں نے خصوصی توجہ صرف کی۔ عالم خوندمیری نے وجودیت پسندانہ طرز فکر کو مطالعۂ ادب کی اساس بنا کر اردو تنقید کی۔ فیضل جعفری اور وحید اختر نے ''تمدنی تنقید'' کی۔

30.7 نمونہ امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل ہر سوال کا جواب تقریباً تیس سطروں میں لکھیے۔

1. جدیدیت کا پس منظر تحریر کیجیے۔
2. افسانے میں تجرید و ابہام کے جو تجربے کیے گئے ان پر روشنی ڈالیے۔
3. جدید تنقید پر تفصیلی نوٹ لکھیے۔

مندرجہ ذیل ہر سوال کا جواب تقریباً پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1. فلسفۂ وجودیت پر مختصر نوٹ لکھیے۔
2. افسانے میں داستانوی فضا کو کس طرح برتا گیا؟
3. ہیئتی تنقید کے اہم نقادوں کے اہم کارناموں کا مختصر جائزہ لیجیے۔

30.8 فرہنگ

وجودیت = احساس وجود کا فلسفہ

تنسیخ = منسوخ کرنا

مافوق الفطرت = فطرت سے پرے

کثیر المفہومی = کئی مفاہیم کا حاصل

غیر مرئی = جو دکھائی نہ دے

ہزیائی = بڑ، بیہودہ گوئی، شدت بخار کی حالت میں بے ربط گفتگو

قبیح = مشکل

30.9 سفارش کردہ کتابیں

1. جدیدیت اور ادب ..... آل احمد سرور
2. جدیدیت کی جمالیات ..... لطف الرحمٰن
3. اردو افسانہ روایت اور مسائل ..... گوپی چند نارنگ
4. اردو افسانے میں عصری حسیت ..... یاسمین فاطمہ
5. قصہ جدید افسانے کا ..... سلیم شہزاد

☆☆☆

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

نصاب

ایم اے اُردو (فاصلاتی تعلیم)

سال اول :

پہلا پرچہ غزل، قصیدہ اور رباعی

دوسرا پرچہ مثنوی، مرثیہ اور نظم

تیسرا پرچہ اردو زبان وادب کی تاریخ

چوتھا پرچہ فارسی اور ہندی

سال دوم :

پانچواں پرچہ ادبی تنقید

چھٹا پرچہ ترجمہ نگاری اور ابلاغیات

ساتواں پرچہ داستان، ناول، افسانہ اور ڈراما

آٹھواں پرچہ غیر افسانوی ادب (خاکہ نگاری/انشائیہ سوانح/خطوط نویسی/طنز و مزاح)

تیسرا پرچہ : اردو زبان وادب کی تاریخ

حصہ اول

اکائی 1 زبان کی تعریف اور ہند آریائی کا ارتقا

اکائی 2 اُردو زبان کا آغاز وارتقا، مختلف نظریے

اکائی 3 اُردو زبان کا ارتقا: پایۂ تخت کی تبدیلی کے اثرات

اکائی 4 دکنی اُردو کی لسانی خصوصیات

اکائی 5 لسانیات کا مفہوم۔ مصوتے و مصمتے

اکائی 6 اُردو املا کے مسائل اور صحتِ املا کی جدید سفارشیں

اکائی 7 اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیاء کرام کی خدمات

اکائی 8 بہمنی دور میں اُردو ادب

اکائی 9 قطب شاہی دور میں اُردو ادب

اکائی 10 عادل شاہی دور میں اُردو ادب

اکائی 11 ولی اور سراج کے عہد میں اُردو شاعری

اکائی 12 شمالی ہند میں اُردو شاعری

اکائی 13 فورٹ ولیم کالج سے پہلے اُردو نثر

اکائی 14 دہلی کا دبستان شاعری

حصہ دوم

اکائی 15 فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات

اکائی 16 فورٹ سینٹ جارج کالج کی اردو خدمات

اکائی 17 دلی کالج کی اُردو خدمات

اکائی 18 اردو شاعری کا دبستان لکھنؤ

اکائی 19 نظیر اکبر آبادی۔ ہندوستانی تہذیب کا نمائندہ

اکائی 20 اردو شاعری۔ 1857ء کے بعد

اکائی 21 اردو نثر 1857ء کے بعد

اکائی 22 انجمنِ پنجاب کی تحریک

اکائی 23 علی گڑھ تحریک

اکائی 24 اردو شاعری عہد اقبال میں

اکائی 25 اردو نثر عہد اقبال میں

اکائی 26 بیسویں صدی کے چند اہم تصنیفی اور تعلیمی ادارے

اکائی 27 ترقی پسند تحریک

اکائی 28 حلقہ اربابِ ذوق

اکائی 29 جدیدیت اور اردو شاعری

اکائی 30 جدیدیت اور اردو نثر

BOOK NO 095